تاش گھر

ایمل رضا









تاش گھر

ایمل رضا

نوٹ:۔

اس ناول کے جملہ حقوق بنام مصنفہ ایمل رضا محفوظ ہیں۔ یہ ناول قسط وار کرن ڈائجسٹ میں شائع ہو رہا ہے اور مصنفہ نے کتاب گھر (http://kitaabghar.com) کو آن لائن پبلشنگ کے لیے اجازت دی ہے۔ لہٰذا اس تحریر کی کسی بھی اور رسالے، ڈائجسٹ، میگزین، ویب سائٹ، سیل فون ایپ یا انٹرنیٹ پر کسی بھی شکل میں کاپی کرنا خلافِ قانون ہے۔ خلاف ورزی کرنے والے کو قانونی کارروائی کا سامنا اور بھاری جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔

قسط نمبر 1

۱۹۴۷ء

حویلیاں شہر میں ایک حویلی......

صدر دروازہ اس قدر چوڑا اور اتنا اونچا تھا کہ دیکھ کر گمان ہوتا تھا جیسے وہ ہاتھیوں اور اونٹوں کی آمد و رفت کے لیے بنایا گیا ہو۔ آبنوس کی سیاہ موٹی لکڑی سے بنا وہ دروازہ کسی اکہری اینٹ سے بنی دیوار جتنا موٹا اور کسی پرانے سالم درخت جتنا وزنی تھا۔ اس پر لگا پیتل کا وزنی کنڈا بھی ایسا دہشت انگیز تھا کہ دیکھ کر ہی لگتا تھا کہ اگر غلطی سے انگلی اس کنڈے کے نیچے آ گئی تو بے چاری نازک انگلی پچک کر رہ جائے گی۔ کنڈے سے لکڑی پر پڑنے والی ضرب سے اٹھنے والی ''ٹھک'' کی آواز بھی کچھ خوف زدہ سی کر دینے والی تھی جیسے زمین کے بھیتر کسی نے بلند آواز میں ''ہوم'' کہہ دیا اور اس ہوم کی ارتعاش اوپر کی دھرتی پر زلزلے کی صورت سنائی دی۔ ہلکا سا ہی مائل دروازہ خود میں ہی پوری ہیبت تھا۔ لیکن دیگی لوہے کے مضبوط قبضے اور موٹے سروں والے کیل اس قدر عمدگی سے نصب تھے کہ منوں وزنی دروازہ ہاتھ کے ہلکے سے زور سے کھل جاتا تھا۔ جیسے اس بار کھل گیا تھا۔ دین بابا کے ہاتھ کی ہلکی سی جنبش سے......

بڑے محرابی دروازے کے کھلتے ہی ''لکشمی حویلی'' اپنی پوری شان و شوکت سے ان سب کے سامنے عیاں ہوئی تھی۔

دروازے کے کھلتے ہی سامنے وسیع صحن نظر آیا تھا۔ سرخ رنجیت شاہی اینٹوں سے سجا ہوا صحن اتنا وسیع تھا کہ وہاں مزید ایک نئی حویلی بن سکتی تھی لیکن اس صحن پر اینٹیں سیدھ میں نہیں لگی ہوئی تھیں بلکہ کچھ

آڑھی ترچھی سی نصب تھیں۔ درمیان میں ایک چھوٹا پھول اور پھر اس پر تکونی اینٹوں کا دائرہ، اس پر پھر سے ذرا بڑا دائرہ...... دائرے پر دائرہ...... اور پھر ان دائروں سے نکلتی ہوئی بہت سی کلیاں...... جو صحن کے اختتام تک جاتی تھیں۔ ذرا غور کرنے پر سب کو محسوس ہوا کہ فرش پر اینٹوں سے سورج مکھی کا پھول ابھارنے کی کوشش کی گئی تھی اور یہ کوشش ایسی کامیاب رہی تھی کہ فرش پر چلتے ہوئے یوں ہی دل جھومنے سا لگتا تھا۔ قدم سیدھے نہ پڑتے تھے بلکہ آپ ہی آپ گھومنے لگتے تھے۔

حویلی کی باقی عمارت ایک قدم اونچی تھی، یا یوں کہیے کہ صحن ایک زینہ نیچے تھا۔ دائیں بائیں اور سامنے تین اطراف لمبے اور وسیع دالان تھے۔ جن کے پیچھے کمرے ہی کمرے تھے۔ دالان کو اور صحن کو جوڑنے والی چیز ستون تھے جو پوری حویلی میں نچلی منزل پر بارہ تھے اور اوپر کی منزل پر بھی بارہ ہی تھے۔ دو ستونوں کے درمیان اوپری منزل کو چھوتی ہوئی اونچی محراب تھی جس نے دالانوں کو سایہ دار بھی کر دیا تھا اور حویلی کی خوب صورتی میں اضافہ بھی کیا تھا۔

محرابوں کی گہرائیوں سے زنجیر کے ساتھ جھولتے ہوئے، نیچے تک آتی قندیلیں لٹک رہی تھیں جو ایک عرصہ حویلی بند رہنے کے باعث گندی اور مکڑی کے جالوں سے اٹی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کی بناوٹ اور ان کی دھات ان کی اعلیٰ پائیگی اور نفاست کا ثبوت دے رہی تھی۔ سرخی مائل محرابوں سے ملے ہوئے سفید ستون اتنے موٹے تھے کہ آدمی ایک طرف سے پورے ستون کو گلے نہ لگا سکتا تھا۔ دوسری طرف سے ہاتھ آپس میں مل ہی نہیں سکتے تھے۔

چھوٹا سا قافلہ اندر داخل ہو کر بھی ابھی تک دروازے پر ہی کھڑا تھا۔ سب مبہوت کھڑے اس دو منزلہ حویلی کو دیکھ رہے تھے۔

''اللہ...... ! کیا سندر حویلی ہے۔'' چاند نے بے ساختہ ہو کر کہا تھا اور پھر باقی سب میں سے جب سب سے پہلے اس نے سورج مکھی کی شبیہ ابھارتے فرش پر قدم رکھا تو ناچاہتے ہوئے بھی وہ ایک

بار گھوم سی گئی۔

دین بابا اسے دیکھ کر ہنسنے لگے تھے۔ بستام اور رحبان بھی حویلی کو آنکھیں کھولے دیکھ رہے تھے۔ تینوں پھوپھو اور ان کی ننھی ننھی بیٹیاں بھی......

''کیا یہ حویلی واقعی ہی میں ہمیں الاٹ ہو چکی ہے بابا......؟''

چاند کو تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں بابا یہ نہ کہہ دیں کہ ایسا نہیں ہے۔ ہم تو یہاں چند دن کے مہمان بن کر آئے ہیں۔ چاند اس جگہ کے بعد اب کہیں اور نہ جانا چاہتی تھی۔ اسے نئی سرزمین پر ایک نیا گھر مل گیا تھا جو پہلے والے گھر سے کہیں زیادہ بڑا اور خوب صورت تھا۔

''بولیے بابا!'' اس نے اپنے پیچھے کھڑے دین بابا سے پوچھا تھا۔

جواباً دین بابا کے لبوں پر مسکراہٹ آئی تھی۔ بیٹی کے دل میں کیا چل رہا تھا، وہ جانتے تھے۔

''ہاں......! اب یہ حویلی ہماری ہے۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے بتایا تھا۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا...... یہ نئی دھرتی کے باسی تو واقعی ہی میں بہت اچھے ہیں بابا...... انہوں نے ہمیں اتنی بڑی حویلی دے دی۔''

''ہم بھی تو وہاں اپنا اتنا سب کچھ چھوڑ کر آئے ہیں۔'' دین بابا لمحے بھر میں اداس ہو گئے تھے۔ ہجرت کا دکھ اور اس دوران بچھڑ جانے والے ان گنت رشتے دار اور دوست احباب انہیں جیسے ایک دم سے سب یاد آ گیا تھا۔

''لیکن یہ حویلی تو ہمارے دہلی والے گھر سے بہت بڑی ہے۔'' چاند سے دو سال چھوٹا بستام بولا تھا۔

''یہ خدا کی رحمت ہے۔ کچھ چھن گیا ہے تو کچھ زیادہ مل گیا ہے۔'' بابا کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے۔

''ہم اس حویلی کو پھر سے آباد کریں گے بابا......!''

''ہاں بیٹی...... کیوں نہیں...... اسے آباد کرنے کے لیے ہی تو ہم سب یہاں پر آئے ہیں۔''

''میں اس پر اپنی مرضی کی سجاوٹ کروں گی۔'' وہ اشتیاق سے بولی تھی۔

''تمہارا اور بستام کا جو دل چاہے کرنا میری جان......''

''نہیں...... بستام کے ساتھ نہیں...... بھائی کو تو ان کاموں میں کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔ میں رحبان کے ساتھ یہ سب کروں گی۔''

چاند نے بستام کے ساتھ ہی کھڑے رحبان کا نام لیا تھا۔ گھر کے ملازم لڑکے کا...... جسے لاوارث ہو جانے کے بعد دین بابا ہندوستان سے اپنے ساتھ ہی یہاں لے آئے تھے۔

''ہاں چاند...... کیوں نہیں...... میں تمہارے ساتھ اس حویلی کو سجاؤں گا۔ جیسے جیسے تم کہو گی۔''

رحبان جوش سے چہک کر بولا تھا۔ چاند کے کام کرنے میں اسے ویسے بھی بہت خوشی ہوا کرتی تھی۔

''بیٹا بستام اور رحبان......! تم دونوں باہر سے آہستہ آہستہ سارا سامان اندر لے کر آؤ...... اور کسی بھی کمرے میں رکھ دو......'' بابا نے بستام اور رحبان سے کہا تھا۔

دونوں اگرچہ چھوٹے تھے لیکن گھر کے تمام افراد میں بابا کے علاوہ واحد لڑکے تھے۔ بابا کے وجود پر تو ہجرت کی کمزوری پھیل چکی تھی۔ ان سے تو ان دنوں ہاتھوں کے نوالے بھی مشکل سے پکڑے جا رہے تھے۔ کہاں سامان اندر منتقل کرتے......

''جی اچھا......!'' دونوں دیرینہ دوستوں کی جوڑی جی اچھا کہہ کر باہر چلی گئی تھی جہاں تانگے والا ان کے سارے ٹرنک اور گٹھڑیاں نیچے اتار چکا تھا۔ دونوں ایک ایک کر کے ساری چیزوں کو اندر لانے لگے تھے۔ بابا لاٹھی ٹیکتے اندر حویلی کی سیڑھیاں چڑھنے لگے تھے اور چاند اندر بند کمروں میں گھوم رہی تھی۔ ایک ایک کمرے کو دیکھتے ہوئے وہ اس اجڑ چکی حویلی کو سجانے کے منصوبے بنانے لگی تھی۔

☆......☆......☆

حویلیاں شہر اپنے نام کی طرح ہی خوب صورت تھا۔ اتنا خوب صورت کہ بار بار اور بہانے بہانے سے ''حویلیاں'' کہنے کو دل چاہتا تھا۔ چاند بھی یہ ہی کر رہی تھی۔ اس نے ہندوستان اور پاکستان اپنے سارے جاننے والوں کو خط لکھے تھے اور انہیں بتایا تھا کہ کیسے ایک جنت نظیر شہر ''حویلیاں'' میں انہیں ایک شاندار حویلی الاٹ ہوئی ہے۔ اس نے بلاوجہ ہی کچھ ایسے رشتے داروں کو بھی خط لکھ دیے تھے جن سے ان کا کوئی ایسا خاص تعلق نہ تھا لیکن حویلیاں اور حویلی کا بتانے کے لیے اس نے بہت دور کے رشتے داروں کے نام بھی لمبے چوڑے خط لکھ ڈالے تھے۔

اس نے انہیں بتایا تھا کہ یہ سارا شہر درختوں، پودوں اور سبزے سے ڈھکا ہوا ہے۔ یہاں کی تو جیسے مٹی کا رنگ بھی سبز ہی ہے۔ گرمی، برسات حتیٰ کہ جاڑے کے دنوں میں مٹی کا اصل رنگ دیکھنے کو نہیں ملتا تھا اور حقیقت میں بھی ایسا ہی تو تھا۔ گھاس تو جیسے اس خطے کی پہلی محبوبہ تھی۔ پگڈنڈیوں کو بھی چند ہی دنوں میں ڈھک دیا کرتی تھی۔ مٹی گچ سے بنے پرانے ہو چکے مکانوں کی دیواروں پر چڑھ جایا کرتی تھی۔ جا بجا پودے تھے۔ درخت تو بے شمار تھے۔ کچھ گھروں کی چھتوں پر مکینوں سے آنکھ بچا کر پیپل بھی اُگے ہوئے تھے۔

چاند حویلی کی چھت پر چڑھ جاتی اور دور دور تک نظر آتے اونچی نیچی پہاڑیوں پر بنے ہوئے گھر دیکھا کرتی۔ یہ منظر ایسا تھا کہ نہ تو وہ اوبتی تھی نہ تھکتی تھی۔ یہ تو ایک سحر انگیز نظارہ تھا۔ جیسے اس دھرتی پر بنگال کے کسی ماہر جادوگر نے اپنے سارے جادو کا وار چلا دیا ہو اور اب اس کے مرید مسلسل یہ کام جاری رکھے ہوئے ہوں۔ چاند کو لگتا کہ الف لیلیٰ داستان میں جو جنت نظیر خیالی شہروں کا ذکر ہے تو وہ اسی حویلیاں شہر کا ذکر ہے۔ جیسے الہ دین نے اپنی محبوبہ کے لیے جو شہر بسایا ہو وہ یہ حویلیاں ہی تو ہو۔

ہندوستان میں وہ سب دہلی میں رہتے تھے۔ جو کہ ایک میدانی علاقہ تھا اور کسی حد تک گرم مرطوب بھی...... سردی ہوتی تھی لیکن کم...... برسات بھی اتنی دلکشی سے نہ آتی تھی۔ کاہی رنگ والی

برسات جو در و دیوار کو کالا ہی کرتی چلی جاتی تھی، وہ دیکھنے کا اتفاق تو کم ہی ہوتا تھا۔ چاند نے ایسی برساتیں بھی کسی سال اتفاق سے اپنے رشتے داروں کی طرف دیکھی تھیں لیکن جہاں انہیں یہ حویلی ملی تھی یہ جگہ بالکل نئی تھی۔ میدان تو کہیں تھا ہی نہیں......اونچے نیچے پہاڑ تھے بس۔ کہیں جگہ اتنی نشیبی تھی کہ نظروں سے اوجھل ہی ہو جاتی تھی تو کہیں چڑھائی ہی چڑھائی تھی۔ جہاں ان کی حویلی تھی وہ جگہ حد نگاہ کی زمین میں سب سے اونچی تھی۔ جیسے کسی نے حویلی کی آن بان شان کو مزید بڑھانے کے لیے چن کر اس کے لیے شہر کی اونچی جگہ کا مقام ڈھونڈا ہو۔

شام ہونے کے وقت سے پہلے ہی مارگلہ کے پہاڑوں سے سرد ہوائیں چلنا شروع ہو جاتی تھیں۔ جس میں نم حویلی مزید ٹھنڈی ہو جاتی تھی۔ موٹی دیواروں اور اونچی چھتوں والے کمرے یخ بستہ سے معلوم ہوتے تھے۔ ہجرت کے دکھ کو بھول کر وہ سب نئی جگہ سے خوب لطف اندوز ہونے لگتے تھے۔

حویلی میں کمروں کی تعداد بیس سے بھی اوپر تھی۔ اناج کا کمرا، پانی ذخیرہ رکھنے کا کمرا، بستر اور سامان رکھنے کا کمرا اس سے الگ تھے۔ وہ کل تیرہ افراد تھے۔ دین بابا، چاند، بستام، تین پھوپھیاں اور ان کی دو دو بیٹیاں......جو ابھی کافی چھوٹی تھیں۔ چاند سے بہت چھوٹی......اور ایک ان کا ملازم بچہ رحبان......جو حالات کی کشیدگی میں اپنے سارے عزیز و اقارب کھو بیٹھا تھا۔ اور دین بابا پاکستان آتے وقت اسے بھی اپنے ساتھ ہی لیتے آئے تھے۔

سب کو الگ الگ ایک ایک کمرا مل چکا تھا۔ پھر بھی بہت سے کمرے ابھی اضافی تھے۔ کچھ کمرے خالی تھے۔ کچھ میں سامان تھا اور کچھ میں بہت زیادہ سامان تھا۔ لوگ جو اس آس میں گھر بار چھوڑ کر جا رہے تھے کہ کچھ عرصے کے بعد واپس اسی سرزمین پر آ جائیں گے وہ سارا سامان اکٹھا کر کے کمرے میں بند کر کے جا رہے تھے۔ جنہیں یقین تھا کہ انہوں نے واپس نہیں آنا، وہاں ہی رہنا ہے۔ نئی زمین پر، نئے دیس میں تو وہ لوگ بھی کس قدر سامان اپنے ساتھ لے کر جا سکتے تھے؟ سونا موتی تو

گٹھڑیوں میں بندھ سکتا تھا، لیکن برتن فرنیچر کو کون اپنے ساتھ اٹھاتا پھرتا...... پھر حویلیوں میں رہنے والے فیاض لوگ...... جو جہاں جاتے ہیں وہاں پھر سے شہر آباد کر لیتے ہیں۔ جو شکار کرنے ایک دو دن کے لیے صحرا میں بھی جائیں تو دو تین روز کے لیے وہاں بھی میلہ لگا لیتے ہیں۔ ان کے لیے بھلا کیا مشکل نئی جگہ جا کر پھر سے سارا سامان اکٹھا کرنا......

اس حویلی میں بھی بہت سا سامان موجود تھا۔ کمروں میں موٹے پاؤں والے ساگوان کے تخت موجود تھے جو بڑے سائز کے قالین جتنے بڑے تھے۔ باقی فرنیچر شیشم کا تھا۔ کرسیاں صوفے جتنی بڑی تھیں۔ اور صوفہ دو نشستوں جتنا ایک...... دبیز پردے پہلے سے ہی ہر ہر کمرے میں لگے ہوئے تھے۔ الماریوں میں مزید بھی موجود تھے۔ ہر کمرے میں قالین بچھا ہوا تھا اور غالیچوں کی تعداد تو ان گنت تھی۔ نجانے حویلی کے پرانے باسی کس قدر سامان اپنے ساتھ لے کر گئے تھے۔ دیکھ کر تو لگتا تھا کہ کچھ لے کر ہی نہیں گئے ہیں۔ سب یہاں ہی چھوڑ گئے ہیں۔

گھر کے صدر دروازے کے بالکل سامنے صحن عبور کرنے کے بعد جو کمرا آتا تھا وہ بہت خاص کمرا تھا۔ کمرے کے دروازے پر لگے تالے کو توڑنے کے بعد اس کے خاص ہونے کا احساس ہوا تھا۔ وہ کمرا باقی کے سارے کمروں میں سب سے بڑا تھا اور سب سے آراستہ بھی تھا۔ جب اس کا تالا توڑا گیا اور سب اس کمرے کے اندر داخل ہوئے تو اندر موجود سامان دیکھ کر سب ہی کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے تھے۔

دروازے کے بالکل سامنے استھان پر درگا ماں کی بڑی سی مورتی موجود تھی۔ اپنی پوری آن بان شان کے ساتھ...... شیر کے اوپر براجمان، اپنے دس ہاتھوں میں دس مختلف ہتھیار پکڑے ہوئے۔ کنول، تلوار، تیر کمان، عصا، وجرا، کلہاڑا، سانپ، سنکھ، سدرراشن اور ترشول...... گوٹے کنارے سے مزین سرخ جوڑا پہنے ہوئے۔ سر پر سونے کا تاج اور گلے، بازو میں سونے کے زیورات پہنے ہوئے......

شاید حویلی کے مکینوں کو یہ بات گوارا نہیں تھی کہ وہ درگا ماں کی موتی کو زیورات سے عاری کر کے

یہاں سے جائیں۔ اسی لیے وہ اس مورتی کو مع زیورات کے ہی یہاں چھوڑ گئے تھے جو کہ بہت زیادہ تھے اور یقیناً بہت قیمتی بھی...... مورتی کے اردگرد گلاب کے پھولوں کا ڈھیر موجود تھا، لیکن سارے پھول اب سوکھ چکے تھے۔ اس کے باوجود مدھر خوشبو دے رہے تھے۔ سارے کمرے میں پھیلے ہوئے پھولوں پر سواستک آسن ترتیب دیے ہوئے دیے بھی رکھے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ان کے اندر کا سیاہی پن اس بات کا غماز تھا کہ وہ بہت دیر تک جلتے رہے ہیں۔ ان کے اندر موجود تیل ان کے پیندوں سے جا لگا تھا اور لمبی باتیاں ساری کی ساری جل چکی تھیں۔ شاید حویلی کے سابقہ مکین جاتے جاتے انہیں اپنی حفاظت کے لیے جلتا چھوڑ گئے ہوں کہ جلتے دیے اور درگا ماں ہندوستان تک کے سفر میں ان کی حفاظت کرے۔

کمرے میں بہت سا موسیقی کا سامان بھی موجود تھا۔ دو ستار، تین منجیرے، ایک سرود...... کچھ سامان لکڑی کے بھاری صندوقوں میں موجود تھا جو شاید پوجا سے ہی متعلق تھا یا کسی بھی طرح کی مذہبی رسومات کے لیے...... بچوں نے صندوق کھول لیے تھے اور اب ان سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگے تھے۔ ہر ہر کمرے کو کھولنے کے بعد وہاں کی پوری پوری تلاشی لینا چاند، بستام اور رحبان کا ان دنوں من پسند کھیل بنا ہوا تھا۔

"یہ میں لوں گا۔" رحبان نے نجانے کس صندوق سے ایک سنکھ نکال لی تھی۔

صدف کی سنکھ جو ہاتھ کے باریک کام سے مزین تھی اور دیکھنے میں بہت سندر نظر آ رہی تھی، ہاتھ میں لیے رحبان نے بابا سے کہا تھا۔ ایک طرح سے پوچھا تھا۔ دین بابا اس کی طرف دیکھ کر رہ گئے تھے۔

"یہ سب کسی کی چیزیں ہیں میرے بچے...... ہماری نہیں......"

"وہاں دو تین اور بھی پڑی ہوئی ہیں۔" رحبان نے ایسے کہا تھا کہ وہاں اور بھی موجود ہیں ایک میرے لے لینے سے کچھ زیادہ کمی نہیں ہو جائے گی۔

رحبان کے معصومانہ انداز میں کہنے پر بابا کو ہنسی آ گئی تھی۔

بابا ویسے بھی رحبان کے معاملے میں بہت نرم دل تھے۔ اسے کم ہی ڈانٹتے تھے کہ بن ماں باپ کا بچہ ہے۔ کہیں کوئی بات دل پر نہ لے لے...... اسی باعث بستام اور رحبان کی مشترکہ شرارتوں میں زیادہ ڈانٹ بستام کو ہی پڑا کرتی تھی۔

"ٹھیک ہے لیکن اور کوئی کچھ نہیں لے گا یہاں سے...... جن کی امانت ہے وہ کسی روز آ کر لے جائیں گے۔ ہمیں زیب نہیں دیتا کہ کسی کے مذہب کی مقدس چیزوں کی بے حرمتی کریں۔"

"جی بابا......! بالکل ٹھیک کہا آپ نے......" چاند نے بابا کی بات کی حمایت کی تھی۔

باہر نکل کر بابا نے اس کمرے کے دروازے پر ایک نیا تالا ڈال دیا تھا۔

"اس کمرے کو اب کوئی نہ کھولے...... اس کی چابی میرے پاس رہے گی۔" انہوں نے چابی اپنے چوغے کی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا تھا۔ بابا منع نہ بھی کرتے تو اس کمرے میں جا کر کسی نے کرنا ہی کیا تھا۔

اس دن کے بعد سے بڑے کمرے کی طرف کسی نے رخ نہیں کیا تھا۔ لیکن درگا ماں کی مورتی والا وہ بند کمرا ہمیشہ ہی سب کو مبہوت کیے رکھتا تھا۔ وہ سب کو خوف میں مبتلا رکھتا تھا۔ سب اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے نجانے کیوں ڈر ڈر جاتے تھے۔ خاص کر کے چاند...... اسے لگتا کہ اس کمرے میں بہت سے راز دفن ہیں یا آنے والے وقت میں دفن ہوں گے۔ دیسی تالا لگے دروازے کے آگے سے گزرتے ہوئے چاند کا دل ہول ہول جاتا تھا۔ لیکن وہ اس سب کو اپنا وہم سمجھا کرتی تھی بس......

☆......☆......☆

ان دنوں عجیب وغریب رواج دیکھنے کو مل رہے تھے۔ جو ہندو یا سکھ ہندوستان کے مسلم گھروں میں تھے، وہ وہاں مسلمانوں کے کھانے پینے کے برتنوں کو گھر سے باہر پھنکوا دیتے تھے۔ بدلے میں مسلمان بھی اسی ہتک کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ وہ بھی غیر مذاہب کی استعمال شدہ چیزوں کو گھر سے باہر

پھینک دیتے تھے۔ایسے برتن مہوس بھی نہ خریدتے، بلکہ وہ کوڑے پر ہی پڑے پڑے کوڑے کا روپ دھار لیتے تھے۔

لیکن یہ مظاہرہ پھر چند دن ہی چلا، کیونکہ بٹوارے نے سب ہی کے حالات تنگ کیے ہوئے تھے۔کام تو عرصے سے بند ہوئے پڑے تھے۔مزید کام کب ملنا تھا یہ بھی کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔جہاں ہزاروں گھروں سے بے گھر ہوئے تھے وہاں لاکھوں جیب سے خالی ہو چکے تھے۔ایسے حالات میں ناگزیر کے ساتھ سمجھوتا کرنا ضروری تھا۔پھر انسان اپنی فطرت میں لالچی بھی واقع ہوا ہے۔کچھ برتن اور استعمال شدہ چیزیں دل کو بھانے لگتی تھیں۔ایسے میں ہندو خاندانوں میں انہیں گنگا جل سے دھولیا جاتا تھا۔سکھ سات جوتے مار کر برتن پوتر کرتے تھے۔

مسلمانوں میں بھی کچھ ایسے ہی رواج عام ہو رہے تھے۔یا تو وہ برتنوں کو آب زم زم سے دھو لیتے تھے یا مختلف جگہ کے پانی کے سات گھڑے لے کر برتنوں کو ان پر ڈالتے جاتے اور ساتھ ساتھ اللہ کا نام پڑھتے جاتے......یوں ناپاک برتن پاک کر کے دونوں خطوں کے عوام نے خود کو مطمئن کیا ہوا تھا۔

گویا اس نفرت کو پاک کرنے کی کوشش کی تھی جواب دونوں طرف کے عوام کو ایک دوسرے سے ہو چکی تھی۔

☆......☆......☆

حویلی میں بھی بہت سے برتن موجود تھے۔بلکہ نعمت خانے میں تو برتنوں کا ایک ڈھیر موجود تھا۔ پیتل، اسٹیل، چینی، بون اور گلاس کے بہت سے برتن...... کتنا ڈھیر سامان تو ڈبوں میں ہی بند تھا۔ سارے برتن کمال حد تک حسین اور فیاضی کی حد تک مہنگے لگتے تھے۔سب سے خوب صورت پیتل کے برتن تھے۔جن کی اعلیٰ معیار کی پیچ در پیچ گڑھت ماہر استاد کی استادی کا منہ بولتا ثبوت تھی۔برتنوں کی گڑھت مندروں سے ملتی جلتی لگتی تھی۔چاند کا ان کو باہر پھینکنے کا دل نہ چاہتا تھا۔

تینوں پھوپھیاں سارے برتن پھینکنے یا کسی کو دے دینے کی غرض سے نعمت خانے سے نکال نکال کر باہر صحن میں اکٹھا کر رہی تھیں۔اور چاند انہیں یہ سب کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

"برتنوں کو باہر پھینکنا کیوں ضروری ہے بابا......؟"

"تو پھر ہم ان کا کیا کریں گے میری جان......؟"

"انہیں ہم استعمال کرلیں گے۔" وہ لجاجت سے بولی تھی۔

"ہم انہیں کیسے استعمال کر سکتے ہیں میری بچی...... کیسے ان میں کھانا پکا اور کھا سکتے ہیں۔"

"وہ بھی تو اسی سب میں کھانا کھاتے تھے۔پھر ہم کیوں نہیں؟"

"وہ دوسرے مذہب کے تھے۔"

"انسان تو تھے ناں...... جانور تو نہیں......"

چاند کی بات نے بابا کو لاجواب کیا تھا۔

بچوں کو دین مذہب میں فرق سمجھانا قدرے مشکل ہوتا ہے شاید...... سمجھا دو بھی تو انہیں اس نزاکت کا احساس نہیں ہو پاتا جو بڑوں کو ہوتا ہے۔لیکن دوسرے دھرم والوں کے برتن استعمال کرنے پر وہ ابھی بھی راضی نہیں تھے۔باہر پھینکنے کے لیے نکالے گئے برتنوں کا صحن میں انبار اکٹھا ہو چکا تھا۔اور چاند دین بابا سے بحث کیے جا رہی تھی۔

تینوں پھوپھیاں صحن سے ایک قدم اونچے دالان میں کھڑی تھیں۔وہ چاند اور بابا کے معاملے میں کم کم ہی بولتی تھیں۔ویسے بھی جب سے تینوں اجڑی تھیں، ان کی مانگ بس روٹی کپڑے تک آ کر ختم ہو چکی تھی۔نہ کوئی التجا تھی نہ منت...... وہ کم بولتی تھیں، کم مسکراتی تھیں اور کبھی نہ ہنستی تھیں۔قہقہے نہ لگانے کی تو انہوں نے جیسے قسم کھالی تھی۔وہ بنا حیثیت کے وجود تھیں، جو حویلی میں کسی سائے کی طرح رہ رہی تھیں۔ان کے ہونے یا نہ ہونے سے حویلی کو کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا۔خود بخود ہی انہوں نے اپنی

حیثیت حویلی کے خادموں کے سے انداز کی کر لی تھی۔

''میں تو اتنے پیارے برتنوں کو باہر نہ پھینکوں گی۔'' چاند ضدی پن سے اٹل انداز میں بولی تھی۔

''لیکن چاند......!''

''بس بابا...... میں نے کہہ دیا ہے۔اب یہ برتن ہم استعمال کریں گے۔''

''سمجھ نہیں رہی ہو میری بچی...... یہ برتن ہمارے لیے ناپاک ہیں۔''

''پھر ان کو پاک کر لیتے ہیں ناں......''

چاند کے کچھ بولنے سے پہلے ہی رحبان کی آواز گونجی تھی۔فاصلے پر کھڑا وہ کب سے دونوں باپ بیٹی کی گفتگو سن رہا تھا اور دین بابا کے چاند کی بات مان جانے کا تمنائی تھا۔لیکن بابا چاند کی بات ماننے کے موڈ میں نہیں تھے۔اسی لیے مجبوراً اسے بولنا پڑا۔وہ بھلا کیسے یہ بات برداشت کرتا کہ چاند کی کوئی خواہش ادھوری رہ جائے۔اسے چاند سے انسیت ہی بہت تھی۔وہ چاند کو ہر صورت خوش دیکھنا چاہتا تھا۔

رحبان کی بات پر سب نے گردنوں کے رُخ رحبان کی طرف کیے تھے۔

''پاک کیسے کر لیں؟''

''سب ہندو، مسلم، سکھ یہ ہی کر رہے ہیں۔برتنوں اور دوسری استعمال کی چیزوں کو پاک کر کے استعمال کر رہے ہیں۔''

''وہ کیسے؟''

''ہندو گنگا جل سے برتن دھو کر انہیں پاک کر رہے ہیں۔سکھ سات جوتے مار کر برتن پاک کر رہے ہیں۔اور مسلمان سات گھڑے پانی کے ڈال کر اور اللہ کا نام لے کر......''

رحبان کی بات پر دین بابا نے حیرت سے رحبان کو دیکھا تھا۔یہ کیا عجیب و غریب رواج چل نکلے تھے۔

''میں جھوٹ نہیں کہہ رہا...... دائیں بائیں کے لوگ یہی کر رہے ہیں۔'' رحبان نے وضاحت دی تو سب ہی کو یہ بات بھا گئی۔ دین بابا بھی کچھ کچھ ایسی باتیں سن تو رہے تھے دائیں بائیں سے...... کچھ مولویوں نے بھی لوگوں کی آسانیوں کے لیے اسی طرح کے فتوے دے رکھے تھے ان دنوں......

''ٹھیک ہے پھر...... جو میری بیٹی چاہے۔'' بابا نے آمادگی دے دی تھی۔

پھر تینوں پھوپھیوں نے اور چاند نے سارے برتنوں پر سات مختلف جگہوں سے گھڑے میں پانی اکٹھا کر کے اور بسم اللہ پڑھتے ہوئے ان پر ڈال دیا تھا۔ یوں دوسرے دھرم والوں کے برتن خود کے استعمال کے لیے پاک ہو گئے تھے۔

شام میں چاند رحبان کے کمرے میں گئی تھی۔

''تمہارا شکریہ رحبان...... تم بہت اچھے ہو۔ ہمیشہ میری خوشی کا خیال کرتے ہو۔''

وہ بے شک گھر کا ملازم لڑکا تھا۔ یتیم مسکین تھا، لیکن اب کسی حد تک سب کے دلوں میں گھر کر چکا تھا اور گھر میں ایک مقام بنا چکا تھا۔

''تمہیں اداس کیسے دیکھ سکتا ہوں چاند......'' رحبان نے پیار سے کہا تھا۔ چاند جواباً مسکرا دی تھی۔

''تم اداس ہوتی ہو تو مجھے لگتا ہے کہ آسمان والا چاند بھی اداس ہو گیا ہے۔'' رحبان نے مزید کہا تو چاند کھلکھلا کر ہنسنے لگی تھی۔

''اب اتنا جھوٹ بھی مت بولو رحبان......'' اور کھلکھلا کر ہنستے ہوئے چاند کا جیسے پورا وجود ہنسنے لگا تھا۔ گلے میں پہنی ہوئی چاندی کی چوکور ٹکڑی تھرتھرا رہی تھی اور کانوں میں پہنی ہوئی بالیاں جھول جھول جا رہی تھی۔ گلابی شفون کا دوپٹا اس کے سر سے ڈھلک گیا تھا اور اس کے سیاہ چھلیے ہوئے بال عیاں ہوئے تھے۔ رحبان یک ٹک اسے دیکھتا جا رہا تھا۔

''سچ کہہ رہا ہوں۔ تمہارے چہرے پر اداسی دیکھ لوں تو رات میں نیند نہیں آتی......'' اب کے

رحبان جذب سے بولا تھا۔

چاند کی ساری چہک ایک دم سے تھمی تھی۔

"یہ کس انداز میں بات کی تھی رحبان نے؟" رحبان کے اس جذب بھرے انداز پر اندر ہی اندر چاند کی سوچوں میں پریشانی کی لہر نے اونچی اٹھان دکھائی تھی۔

رحبان کا انداز دن بدن اتنا محبت بھرا کیوں ہوتا جا رہا تھا؟ یا شاید یہ چاند کی غلط فہمی تھی۔ اس کے لیے تو رحبان بھی ایسا ہی تھا جیسا کہ بستام...... اس کے بھائی کی طرح...... تینوں بچپن سے ایک ہی گھر میں پلے بڑے تھے۔ چاند بھلا کیسے رحبان کے بارے میں ایسا سوچ سکتی تھی۔ اور رحبان......؟ وہ بھی ایسا کیونکر سوچ سکتا تھا۔

چاند نے جلدی سے اپنا دوپٹا درست کیا تھا اور اس کے اس عمل نے رحبان کو اس کی نظروں میں شرمندہ کر دیا تھا۔

"میں اب چلتی ہوں۔" وہ جلدی سے وہاں سے کھسک گئی تھی۔

کمرے میں آ کر چاند نے اپنی ہی سوچ پر خود کو ملامت کی تھی۔

"میں بھی کتنی بے وقوف ہوں، نجانے کیا کیا سوچتی رہتی ہوں۔" اس نے اپنی بے وقوفانہ سوچ پر اپنے سر پر ہلکی سی چپت ماری تھی اور ہلکی پھلکی ہو کر مسکرا دی تھی۔

لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ چاند کو گمان تک نہیں تھا کہ گھر کا یہ ملازم لڑکا دن بدن اس کی چاہت میں آگے نکل رہا ہے۔ ہر روز وہ اس کی محبت میں ایک قدم آگے بڑھ رہا ہے۔ ممنوع علاقے میں...... جس کی زمین اس کے نام نہیں ہونے والی تھی۔ وہ جانتا تھا۔ پھر بھی اس نے چاند سے محبت کرنے کے عمل کو اپنی زندگی میں جگہ دے دی تھی۔ یتیم مسکین لڑکا...... نہیں جانتا تھا کہ اس کا انجام کیا ہونے والا تھا۔

چاند بے قصور تھی۔ وہ رحبان کے جذبات سے ناواقف تھی۔ واقف ہوتی بھی تو وہ بھلا کیا کر سکتی تھی۔ اس کی نسبت بچپن سے طے تھی۔ التمش کے ساتھ...... جو نا صرف اس کا منگیتر تھا بلکہ اسے جان سے زیادہ عزیز بھی تھا۔

التمش تعلیم کی غرض سے پچھلے تین سال سے لندن میں مقیم تھا۔ التمش کے تعلیم مکمل کر لینے کے بعد واپس پاکستان آ جانے پر چاند اور التمش کی شادی ہونا طے تھی۔

☆......☆......☆

حویلی میں آمد کے بعد بہت سے دن تو اس کو سجانے بنانے، کمروں اور چیزوں کو پاک کرنے میں گزر گئے۔ پھر اپنے حساب سے رہائش کا انتظام کرتے، نئی آب و ہوا اور نئی جگہ کو اپنا بناتے بناتے گزر گئے۔ وقت میں افراتفری بھی تھی اور فراغت بھی...... عجیب سے دن تھے۔

وہ سب...... چاند، بستام اور رحبان تو نئی جگہ سے جلد ہی مانوس ہو چکے تھے۔ تینوں پھوپھیوں کی کیا کیفیت تھی، وہ تو شاید ان کو بھی نہیں معلوم تھی۔ کم عمری میں بہت سے غم اٹھا لینے کے بعد وہ اب جھگیوں میں رہتیں یا حویلیوں میں، انہیں کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا۔ اور ان کی بیٹیاں ابھی کچھ بھی محسوس کرنے کے لیے بہت چھوٹی تھیں۔ اور بابا...... ان کی کیفیت کس سے چھپی ہوئی تھی بھلا...... جبکہ وہ سب سے چھپانے کی کوشش ضرور کرتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں دکھ کا ایسا اثر آیا تھا جو اب ساری زندگی ان کی آنکھوں میں سے نہیں جانے والا تھا۔

وہ روتے نہیں تھے، لیکن قباحت تھی کہ اب وہ ہنستے بھی نہیں تھے۔ بٹوارے کے دکھ کو انہوں نے اجاڑے کے دکھ کی طرح محسوس کر لیا تھا۔ ہمہ وقت اداسی کا ایک عنصر ان کی پوری ذات پر چھا چکا تھا۔ بات وہ پہلے بھی مختصر کرتے تھے لیکن اب کچھ زیادہ ہی چپ چپ رہنے لگے تھے۔ اس پر حویلی کا خالی پن...... جو دور ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

حویلی کے بہت سے کمرے ابھی غیر آباد تھے۔ان میں سامان تو موجود تھا،لیکن رہنے کوافراد نہ تھے۔کچھ الگ سرزمین پر جانے کے غم میں خدا کو پیارے ہو گئے۔کچھ ہجرت کی قتل وغارت گری میں اپنوں سے بچھڑ گئے۔جس قدر افراد تھے اتنے کمرے کھول لیے گئے تھے۔باقی کمرے بند تھے۔ان پر تالا تھا۔اور ان بند کمروں کی وحشت اور ان پر لگے تالوں کی دہشت ساری حویلی میں پھیلی ہوئی تھی۔حویلی اور کمروں کو اپنی اپنی پسند اور مرضی کے مطابق سجوا لینے کے باوجود بھی سب گم صم پھرتے رہتے تھے۔خاص کر کے بابا...... چاند کی ان پر توجہ بہت دیر سے گئی تھی۔

''کیا ہمارے پاس بہت سے پیسے محفوظ ہیں بابا؟''

''کیوں...... تمہیں یہ خیال کیسے آیا؟''

''یہ خیال تو آنا ہی تھا۔آپ ہی تو کہتے ہیں کہ میں بہت سمجھدار ہوں۔'' اس نے بات بنائی۔

''کچھ پیسے ہیں ابھی...... گزارا ہو جائے گا کافی دن...... باقی زیورات بھی بہت سے ہیں میرے پاس...... انہیں بیچ کر بستام اور رحبان کو کوئی کام شروع کروا دیتا ہوں۔''

''بستام اور رحبان کیوں...... آپ کیوں نہیں؟''

''مجھ سے اب کوئی کام نہیں ہو سکے گا چاند......'' جہاندیدہ بابا سمجھ گئے تھے کہ ان کی سمجھدار بیٹی انہیں دنیا داری میں مصروف کر کے دکھ کی اذیت سے باہر نکالنا چاہتی ہے۔

''ایسے مت کہیں بابا......'' اس نے اداس ہوتے ہوئے کہا تھا۔

''ٹھیک کہہ رہا ہوں۔میں کچھ بھی نیا کام سوچنے سے قاصر ہوں۔''

''پھر ہم وہی کام کر لیتے ہیں جو دہلی میں کرتے تھے۔'' چاند نے مشورہ دیا تھا۔

''لیکن وہ کام یہاں کیسے کر سکتے ہیں۔یہاں کی تو ہر چیز سے ابھی شناسائی ہی نہیں ہوئی۔''

''آپ بستام اور رحبان سے بات کریں۔شناسائی شروع کرنے سے ہی تو پیدا ہو گی۔''

''ٹھیک ہے۔ بستام اور رحبان مان جائیں گے تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔'' بابا نے نیم دلی سے آمادگی دے دی تھی۔

چاند مسکرا دی تھی۔ بستام اور رحبان سے اس نے پہلے ہی بات کر لی تھی کہ انہوں نے ہر صورت بابا کی ہاں میں ہاں ملانی ہے۔

دہلی میں ان لوگوں کا ایک بہت بڑا کارخانہ تھا۔ جہاں کپڑے پر زری اور سلمٰی ستارے کا کام ہوتا تھا۔ کارخانہ گھر کی نچلی منزل پر تھا۔ جہاں ہر وقت تقریباً بیس کے قریب لکڑی کے چوکھٹوں پر کام ہوتا رہتا تھا۔ ملازم دوگنا ہوتے تھے جن میں مرد بھی ہوتے تھے اور عورتیں بھی...... کام کرنے والے ماہر بھی اور سیکھنے والے شاگرد بھی...... صبح سے شام تک کام ہوتا، دوپہر کا کھانا گھر میں بنتا تھا جو چاند کی والدہ بتول بی بی بناتی تھیں اور تقریباً ایک دیگ کے حساب سے بناتی تھیں۔ ایک رونق میلہ لگا رہتا تھا ہر وقت جس میں دن گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ لیکن اب وہ دن رخصت ہو چکے تھے۔ کچھ بچھڑ گئے تھے۔ کچھ وہاں ہی رہ گئے تھے اور نجانے کس سمت کو نکل گئے تھے۔ چاند چاہتی تھی کہ اس حویلی میں بھی ویسا ہی ماحول بن جائے جیسا ان کے دہلی والے گھر میں تھا۔ بابا بھی مصروف ہو جائیں اور گھر کے باقی بوکھلائے اور سہمے ہوئے افراد بھی......

بستام اور رحبان نے چند ہی دنوں میں اس کام کے حوالے سے منڈی کا حساب کتاب لگا لیا تھا۔ ویسے بھی منڈی سے مکمل ناواقفیت نہیں تھی۔ دہلی میں رہتے ہوئے ان کا کام لاہور، کراچی اور پشاور کی مارکیٹوں میں جاتا تھا۔ دین بابا نے لکڑی کے بہت سے چوکھٹے بنوا لیے تھے اور کرمانی بوا کے ذریعے دائیں بائیں کے لوگوں کو یہ کام سیکھنے، کرنے اور کر کے کمانے کی طرف راغب کیا تھا۔

غربت ویسے بھی ان دنوں زوروں پر تھی۔ پرانے کام ہی مشکل سے چل رہے تھے۔ لوگ کم پیسوں کے عوض کسی بھی طرح کا کام کرنے کو تیار تھے۔ دین بابا کی ترغیب پر لوگ جوق در جوق کام سیکھنے

کے لیے حویلی کا رخ کرنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے حویلی کے بے آباد کمرے پھر سے آباد ہو گئے۔ چاند نے ہر ہر کمرے میں پانچ پانچ چوکھٹے لگا دیے تھے۔ ایک چوکھٹے پر بیک وقت چار لوگ بیٹھتے تھے۔ جن میں سے دو کام سیکھنے والے ہوتے تھے اور دو کام کرنے والے......ان ساری چیزوں کو چاند نے ترتیب دیا تھا اور چاند کی دانائی اور سمجھ داری پر بابا اس پر رشک کیا کرتے تھے۔

شروع میں کام زیادہ نہیں تھا۔ ابھی لوگ بٹوارے کی بوکھلاہٹ سے ہی نہیں نکل پائے تھے۔ لیکن چاند جانتی تھی کہ جلد ہی زندگی پہلے کی طرح پھر سے رواں دواں ہو جائے گی۔ اسی باعث وہ کام کو رکنے نہیں دے رہی تھی۔ اس کا ماننا تھا کہ جیسے ہی حالات بہتر ہوں گے ان چیزوں کی طلب ایک دم سے بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔ ٹلی ہوئی شادیاں ہونے لگیں گی اور پھر سے عید تہوار جوش وخروش سے منائے جانے لگیں گے۔ اسی لیے چاند بہت سا کام کروا کے اکٹھا کرتی جا رہی تھی۔

بستام اور رحبان منڈی کے حساب کتاب میں مشغول تھے۔ جو کہ دونوں ہی اس کام کو دل جمعی سے کر رہے تھے یا ایسا ظاہر تو ضرور ہی کر رہے تھے۔ بستام پر جہاں دین بابا کو اعتماد تھا وہیں بستام کے حوالے سے ان کے دل میں ڈر بھی موجود تھے۔ انہیں شروع ہی سے بستام عقل مند ہونے کے ساتھ ساتھ ضرورت سے زیادہ چالاک لگتا تھا۔ اس کے ہر کام میں چالاکی، عیاری نمایاں ہوتی تھی۔ دین بابا اپنی اولاد کو اس نظر سے دیکھنا نہ چاہتے تھے لیکن بستام نے خود انہیں کئی بار یہ موقع فراہم کیے تھے کہ دین بابا اس کے حوالے سے شک میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ایک واقعہ تو دہلی سے روانگی کے وقت ہی ہوا تھا۔

گھر چھوڑنے سے پہلے دین بابا نے گھر کا بہت سا سامان ایک کمرے میں بند کر کے وہاں تالا لگا دیا تھا۔ بہت سے لوگوں کی طرح ان کا بھی خیال تھا کہ وہ جلد ہی اپنے گھر واپس آ جائیں گے۔ لیکن بستام ان کو بتائے بنا اس سامان کو بیچ چکا تھا۔

سفر کے دوران جب تہمینہ پھوپھو نے روٹی پکانے کی غرض سے ایک کنستر کا ڈھکن کھولا تو اندر

آٹے تلے دبے ہوئے انہیں چاندی کے سکے نظر آئے۔ انہوں نے اس بابت دین بابا سے پوچھا اور دین بابا نے چاند سے...... لیکن وہ سکے بستام سے منسوب نکلے تھے۔

اس نے بتایا کہ وہ ایک ہندو ساہوکار کو گھر کا سارا سامان بیچ چکا ہے۔ جس کے بدلے میں اس نے چاندی کے یہ ڈھیروں سکے دیے ہیں۔

بات کچھ ایسی انوکھی نہیں تھی۔ ان دنوں افراتفری ہی بہت تھی لیکن دین بابا کو بستام کی حرکت پر اس طرح حیرت ہوئی تھی کہ کیسے اس نے ایک ساہوکار سے گھر کے سامان کا سودا بھی کر لیا اور انہیں بتانا مناسب بھی نہیں سمجھا۔ اس سے پہلے بھی بہت سے ایسے واقعات ہو چکے تھے جس پر انہیں یقین ہو چکا تھا کہ بستام ہر جائز اور ناجائز طریقے سے دولت کما لینا چاہتا تھا۔ اس کے نزدیک حلال اور حرام میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اس پر یہ کہ رحبان بھی دن بدن اسی کے رنگ میں رنگتا جا رہا تھا، دونوں کی دوستی بھی خوب تھی۔

چاند سب سے الگ تھی۔ وہ زیادہ تر خاموش رہتی تھی۔ اس کی ہنسی میں بھی ایک نفاست تھی اور قہقہے میں بھی ایک ادا تھی۔ گھر کے بچوں میں چونکہ سب سے بڑی تھی اس لیے سب پر ہی رعب جما لیا کرتی تھی۔ سب بچوں پر حکم چلایا کرتی تھی سوائے بستام کے...... بستام کو تو بابا کا رعب بھی گوارا نہیں تھا کہاں وہ چاند کی کوئی بات سنتا......

چاند بھی بستام کو کم ہی بلاتی تھی۔ بستام اور رحبان میں ویسے بھی اس کی زیادہ رحبان سے بنتی تھی جبکہ بستام کو لڑکیوں سے دوستی کرنے کا کوئی شوق نہیں تھا، پھر چاہے وہ اس کی بہن ہی کیوں نہ ہو۔

دیکھتے ہی دیکھتے کام چل نکلا۔ چوکھٹوں کی تعداد بھی زیادہ ہو چکی تھی اور کاریگروں کی بھی...... مال کم ہی سہی لیکن متواتر سپلائی ہونے لگا تھا۔ لوگ خوش ہونے کے بہانے ڈھونڈ رہے تھے۔ اچھے کپڑے پہننے اور کھل کر ہنسنے کے موقع تلاش کر رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو بھی اہتمام سے منانے لگے تھے۔ اسی سب میں ان کا کام خوب ترقی کر رہا تھا۔ چاند خوش تھی اور کام کرنے والے بھی......

پھر جلد ہی چاند نے کپڑوں کی رنگائی کا کام بھی حویلی میں ہی شروع کروا دیا تھا۔ یہ کام چھت پر ہوتا تھا۔ سارا سارا دن رنگ برنگے کپڑے حویلی کی چھت سے اس کی لمبی دیواروں پر گرے سوکھتے رہتے تھے اور حویلی کے حسن میں مزید اضافہ کرتے تھے۔

کمروں کے ساتھ نعمت خانہ بھی آباد ہو چکا تھا۔ کچھ لڑکے محض کھانے پینے کا سامان لانے کے لیے رکھ لیے گیے تھے۔ دو باورچی بھی تھے جو سارے کاریگروں کا کھانا بناتے تھے۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس حویلی میں بھی ویسا ہی ماحول بن گیا جو ان کے دہلی والے گھر میں تھا لیکن فرق یہ تھا کہ دین بابا کی بہت سی ذمہ داریاں چاند نے اب اپنے ذمے لے لی تھیں۔ کاریگروں کی تنخواہوں کا حساب کتاب رکھنا، کپڑے کی کمی بیشی کا خیال رکھنا، نگینے موتی سب کی فراہمی کو یقینی بنانا...... کھانے کے لیے اناج اور ہر طرح کی ضرورت کا حساب کتاب رکھنا۔ یہ سب چاند کے ذمے تھا جبکہ ابھی وہ محض بارہ برس کی تھی لیکن بابا کے بقول اپنی عمر کی باقی لڑکیوں کی نسبت کافی زیادہ سمجھدار تھی۔

ساری حویلی کو اس نے بڑے طریقے سے سنبھال لیا تھا۔ پھوپھیوں سمیت بابا بھی اب کسی بھی کام کے حوالے سے چاند کو ہی پوچھتے تھے۔ یہ کام پھر سے شروع کرنا بھی تو چاند ہی کا مشورہ تھا جس میں اب دن بدن بابا کا بھی دل لگتا جا رہا تھا اور وہ ہجرت کے دکھ کو بھولنے لگے تھے۔ سب کمروں میں رونق لگ چکی تھی۔ سوائے صحن کے سامنے والے کمرے میں...... جہاں درگا ماں کی مورتی پڑی تھی اور جہاں جانے کی کسی کو اجازت نہیں تھی۔

اور اس طرح وہ ''دلکشی حویلی'' جو اجڑ چکی تھی۔ اب ''دین حویلی'' کے نام سے پوری شان و بان سے آباد ہو چکی تھی۔

انتظار کریں۔ اس حویلی کا برباد ہونا ابھی باقی ہے۔



حویلی برباد ہو چکی تھی۔

سفید ململ کے پردے جو اس کے دالان کی محرابی کھڑکیوں پر لہرایا کرتے تھے۔ اب گند سے اٹے ہوئے اور چھیدوں سے بھرے ہوئے ٹاٹ سے بھی ابتر حالت میں نظر آ رہے تھے۔ دیواروں کی گچ اتر چکی تھی اور ایک ایک اینٹ اپنی الگ الگ حیثیت بیان کرتی نظر آتی تھی۔ تکونی اینٹوں سے بنا رتن سورج مکھی کے پھول کی طرز پر بنا فرش جس پر پاؤں رکھتے ہی گھوم جانے کو دل چاہا کرتا تھا اب ایک جیسا نہ رہا تھا۔ کہیں سے اونچا ہو چکا تھا اور کہیں سے نیچا ہی نیچا...... اس کی رنجیت شاہی اینٹیں بھی اکثر جگہوں سے اکھڑ چکی تھیں اور اب وہاں نیچے کی مٹی باہر جھانکتی منہ چڑھایا کرتی تھی۔

صدر دروازے پر لگا پیتل کا وزنی کنڈا اب کے بجنے پر ''ٹھک'' کے بجائے ''چھن'' کی آواز دیا کرتا تھا جیسے اس کے بھیتر اور بیرون بہت کچھ ٹوٹ چکا ہو اور وہ بے بس مجرم کچھ بھی نہ کر سکا ہو۔ دروازے کی لکڑیاں اپنے اپنے جوڑوں سے اکھڑنے کے قریب تھیں۔ بہت سوں پر تو دیمک راج کر رہی تھی۔ لوہے کے قبضوں پر زنگ چڑھ چکا تھا، حویلی کا لال رنگ بھی عجیب کاہی میں بدل چکا تھا جیسے بہت جلد ہی سیاہ ہو جانے کے قریب ہو۔

وہ حویلی جہاں ایک وقت میں سو لوگوں کا کھانا بنا کرتا تھا اب وہاں صرف ایک فرد موجود تھا۔ اور اس ایک فرد کی خوراک بھی اتنی کم تھی جیسے کسی چڑیا کے بچے کی خوراک ہو۔ بوڑھی چاند بی بی صرف زندہ رہنے کے لیے ہی تو کھاتی تھی۔

پچاس سال گزر چکے تھے اور پچاس سال کا عرصہ کسی کے عروج یا زوال کے لیے کافی سے زیادہ ہوتا ہے۔

لیکن اس حویلی پر بربادی کی آنچ ہی کیوں آئی تھی؟ ترقی اور خوش حالی کی کیوں نہیں؟ دین بابا نے تو ہمیشہ حلال کمایا تھا۔ اپنے تینوں بچوں کو حلال کھلایا تھا۔ چاند کو، بستام کو اور رحبان کو...... کسی کے

ساتھ کبھی زیادتی نہیں کی تھی۔ کسی کا حق نہیں کھایا تھا۔ کسی سے حسد نہیں کیا تھا۔ پھر بربادی کا بیج کیسے لگ گیا تھا اس حویلی میں......

یا شاید وہ سمجھ نہیں سکے تھے کہ اس بیج کو وہ اپنے ساتھ ہی دہلی سے لیتے آئے تھے۔ اور حویلیاں شہر کی نم آب و ہوا میں وہ بیج اتنی تیزی سے پھلا پھولا تھا کہ حویلی سمیت گھر کے سب افراد کو بھی نگل گیا تھا۔

صحن سے ایک قدم اونچے دالان پر پاؤں لٹکائے، سوچوں میں گم بیٹھی بوڑھی چاند بی بی نے موٹے ستون کے ساتھ ٹیک لگا لی تھی۔ اس میں ویسے بھی اب کمزوری بہت بڑھ چکی تھی۔ ساٹھ سال سے زیادہ عمر ہو چکی تھی اس کی...... ہمت کے باوجود بھی وہ بنا سہارے کے زیادہ دیر بیٹھ نہ سکتی تھی۔ ایک تو عمر رسیدگی، پھر اس پر بھاری غموں کی بوجھل یادوں کا بوجھ...... اور دکھوں کی نقاہت اس سے بھی بڑھ کر...... روگ تھے کہ ختم ہونے میں نہ آتے تھے۔ صدمے تھے کہ گزر کر نہ جاتے تھے۔

چاند بی بی کو اب اندازہ ہوا تھا کہ دین بابا کی آنکھوں میں ہمیشہ دکھ کیوں موجود رہا کرتا تھا۔ انہوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے عزیزوں کو مرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ آنکھیں کیسے نہ اداس رہتیں۔ جن آنکھوں نے یہ منظر دیکھے ہوں وہ مسکرانا کیسے نہ بھولیں۔

چاند بی بی نے بھی تو کتنا کچھ دیکھا تھا۔ عزیزوں کے ہاتھوں عزیزوں کا قتل ہوتے...... سرعام ہوتے......

اس نے ضمیر بکتے دیکھے تھے۔ احساس روندے جاتے دیکھے تھے۔ اس نے خون کی سرخی کو سفیدے میں بدلتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ کیسے نہ روگی ہوتی۔ اس کی آنکھیں کیسے نہ پتھر چاٹ لیتیں۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ کیسے نہ روپوش ہوتی۔ رہبر رہزنوں سے جا ملے تھے۔ دنیا کا عظیم ترین گناہ ہو چکا تھا۔ اب دامن لٹتے یا نہ لٹتے...... بھروسے لٹ چکے تھے۔

موٹے ستون سے پشت ٹکائے چاند بی بی نے یاد کرنے کی کوشش کی تھی کہ اس حویلی کی بربادی

کی شروعات کہاں سے ہوئی تھی......؟

کب......؟ کس لمحے......؟ کس گھڑی......؟ کس ساعت......؟

تب ہی چاند بی بی کے کانوں میں ایک آواز اتری تھی۔ دور کہیں سے کسی کے رونے کی آواز......

☆......☆......☆

رات کے کسی پہر چاند کی آنکھ کھل گئی تھی۔ کچھ مبہم سا شور تھا۔ غیر واضح آوازیں، گڈمڈ ہوتے الفاظ......سرگوشیوں بھرے تیزی تیزی میں بولے جانے والے جملے......پھر الفاظ اور جملے تو بند ہو گئے لیکن مبہم سا شور جاری رہا۔ پہلے پہل تو چاند کو لگا کہ شاید کوئی قافلہ ہندوستان جا رہا ہے۔ بٹوارا ہوئے چھ ماہ ہو چکے تھے لیکن یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں قافلوں کی آمد و رفت ابھی تک جاری تھی۔ تاہم اب جگہ جگہ پولیس اور فوج تعینات تھی اور لوگ نڈر ہو کر نکلتے تھے۔ کوئی قافلہ اس طرف آ رہا ہوتا تو ان کے ''اللہ اکبر'' کے نعرے دور سے ہی سنائی دیتے تھے۔ کوئی جو قافلہ جا رہا ہوتا تو ''جے بھوانی'' کی صدائیں فضا میں بلند ہونے لگتی تھیں۔ قافلہ سکھوں کا ہوتا تو ''واہ گرو دی جے'' کے نعرے اور کرپان کے زمین پر پڑنے کی آوازیں فضا میں گونجتی تھیں۔ قافلے اپنے نعروں سے اپنے مذاہب کی نمائندگی کرتے دھرتیاں بدل رہے تھے۔ حویلیاں شہر کی رات اور دن کی مدھر خاموشی اور نم ہوا میں یہ ساری آوازیں بہت دور سے بھی سنائی دیتی تھیں۔

عجیب طلسم تھا اس سب میں......دکھ اور خوشی ساتھ ساتھ گوندھی ہوئی تھی۔ جانے والے دکھی تھے اور آنے والے امیدوں سے بھرے ہوئے۔ آنے والے وقت کو کسی نے نہیں دیکھا ہوا تھا۔ ورنہ نہ جانے والے دکھی ہوتے اور نہ آنے والے پر امید...... مذاہب کے نام پر بننے والے خطوں میں زندگیاں پہلے جیسی ہی گزرنے والی تھیں۔ اس بات کا کسی کو گمان تک نہ تھا۔ کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہونے والی تھی۔ حق ویسے ہی غبن ہونے والے تھے۔ عزتیں ویسے ہی لٹی جانے والی تھیں۔ دھوکے پہلے کی

طرح ہی رواں رہنے والے تھے۔ لیکن آنے والے وقت سے انجان لوگ تھے کہ قافلوں کی صورت جوق در جوق آ اور جا رہے تھے۔

چاند کو لگا کہ یہ آواز بھی شاید کچھ ایسی ہی آواز ہے۔ کوئی قافلہ جا رہا تھا یا شاید آ رہا تھا۔ لیکن اسے نہ تو اللہ اکبر کی آواز سنائی دے سکی اور نہ ہی جے بھوانی کی...... شاید یہ ان کبوتروں کا شور تھا جسے بستام اور رحبان آج کبوتر منڈی سے خرید لائے تھے اور جن کے بارے میں انہوں نے دین بابا کو بتایا تھا کہ کبوتروں کی نایاب نسل ہے۔ اس کا تو ایک انڈا ہی ہنس کر سو روپے میں بک جاتا ہے۔ کبوتروں کی دس جوڑیوں کے ساتھ وہ ایک بڑا سا پنجرا بھی لائے تھے۔ جسے انہوں نے چھت پر چھاؤں والی جگہ پر رکھ دیا تھا۔ چاند کا کمرا اسی جگہ سے نیچے دوسری منزل پر واقع تھا۔ اس لیے اسے لگا کہ یہ شور شاید انہیں دس جوڑیوں کا ہے۔ جو نئے ماحول سے ہم آہنگ نہیں ہو پا رہی تھیں لیکن دھیان لگا کر سننے پر اسے احساس ہوا کہ یہ کبوتروں کی غٹرغوں کی آواز نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ تو شاید کسی کے رونے کی آواز تھی۔

"کس کے رونے کی......؟"

تینوں پھوپھیوں کی چھ عدد بیٹیاں اتنی چھوٹی عمر کی نہیں تھیں کہ ایسی گھٹی گھٹی مدھم آواز میں روتیں۔ پھر یہ کون رو رہا تھا؟ وہ بھی رات کے اس پہر؟ اور کیوں......؟

چاند اپنے پلنگ سے نیچے اتر آئی تھی۔ پاس ہی طاقچے میں رکھی لالٹین کو اس نے دیا سلائی دکھائی تھی اور اندھیرے کمرے میں روشنی پھیل گئی تھی۔ خود پر موٹی شال اوڑھ کر روشن لالٹین تھامے وہ کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔ دالان خالی تھے۔ روشنی ڈال کر اس نے دوسری اور تیسری طرف کے دالان بھی دیکھ لیے تھے۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ پھوپھیوں کے کمرے بند تھے اور آواز وہاں سے بھی نہ آ رہی تھی۔ چاند نے دروازے پر کان لگا کر سن لیا تھا۔ بابا بھی بے خبر ہو کر سو رہے تھے اور بستام اور رحبان بھی دونوں ایک پلنگ پر آڑھے ترچھے ہو کر بے خود پڑے تھے۔ کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔

نچلی منزل کا صحن اور دالان بھی رات کی طرح سنسان تھے۔ ماسوائے سفید ریشم کے پردوں کے جو ہلکی ہوا میں دبے دبے سرسرا رہے تھے۔ چاند نے باری باری سارے کمرے دیکھے۔ نعمت خانہ دیکھا، اناج کا کمرا، پانی کا کمرا...... کہیں کوئی بھی تو نہیں تھا اور آواز تھی کہ مسلسل آتی جارہی تھی۔ مدھم اور غیر واضح آواز...... کبھی ہنسنے کی اور کبھی رونے کی......

چاروں طرف اچھی طرح سے دیکھ کر روشن لالٹین پکڑے وہ صحن کے درمیان آکھڑی ہوئی تھی۔ روشن چانداس کے سر پر چمک رہا تھا۔ چاند کی چاندنی اتنی زیادہ تھی کہ صحن کی تکونی اینٹوں کی ایک ایک درز واضح تھی۔ اور رات کی خاموشی تھی کہ مالکوس راگ کی طرح ساری حویلی پر چھائی ہوئی تھی۔ وہ جو آدھی نیند سے جاگ اٹھی تھی، اب پھر سے نیند محسوس کر رہی تھی۔ آواز کو اس نے اپنا وہم خیال کرلیا تھا۔ سب سو رہے تھے، آواز واقعی ہی میں موجود ہوتی تو حویلی کے باقی مکینوں میں سے کوئی تو اٹھتا...... ظاہر ہے کہ کسی نے آواز کو سنا ہی نہیں تھا۔

سونے کے لیے جانے سے پہلے آخری بار چاند نے آواز کی سمت توجہ دی تھی اور تب ہی اسے اصل مقام کا ادراک ہو پایا تھا۔ بھاگ کر وہ بابا کے کمرے سے حویلی کے صدر دروازے کے تالے کی چابی لے آئی تھی۔ جلدی سے اس نے حویلی کے بڑے دروازے میں موجود چھوٹے دروازے کا تالا کھول کر اسے کھول دیا تھا۔ شک درست تھا۔ آواز باہر سے ہی آرہی تھی۔

کین سے بنی وہ چھوٹی سی ٹوکری گز بھر لمبی تھی اور آدھ گز برابر چوڑی...... ایسی ٹوکریاں ان دنوں ماما لوگ استعمال کر رہی تھیں۔ صاحب لوگوں کے لیے سبزی ترکاری لانے کے لیے...... لیکن اس ٹوکری میں نہ تو کوئی سبزی موجود تھی اور نہ ہی کسی طرح کا پھل...... سرخ اونی کمبل میں لپٹی ہوئی ایک ننھی سی بچی ٹوکری میں موجود تھی۔ جو مسلسل روئے جارہی تھی۔ لیکن بچی بلند بانگ نہیں رو رہی تھی بلکہ ایسے رو رہی تھی جیسے دودھ پیتے پیتے کسی نے اس سے اس کا دودھ چھڑوا دیا ہو۔

چاند نے آگے بڑھ کر فوراً سے بچی کو اپنی گود میں بھر لیا تھا اور اسے اپنی موٹی شال تلے چھپا لیا تھا۔ سردی کافی تھی اور ایسے میں ننھی سی بچی کو ہلکے اونی کمبل میں سردی لگ سکتی تھی۔ بچی بھی شاید کسی کے وجود کی گرمی کی ہی متلاشی تھی۔ چاند کے وجود سے لگتے ہی وہ خاموش ہو چکی تھی اور فوراً سے ہی نیند کی آغوش میں چلی گئی تھی۔

چاند نے دائیں بائیں دیکھا تھا۔ تاریک رات اور سنسان علاقے میں دور دور تک نہ تو کوئی موجود تھا، نہ ہی کسی کے قدموں کے نشان نظر آ رہے تھے۔ نشان ہوتے بھی تو وہ کیا کر سکتی تھی۔ ظاہر ہے کسی سے وہ ٹوکری انجانے میں تو وہاں نہیں گر گئی تھی۔ کوئی فیصلہ کر لینے کے بعد ہی تو اسے حویلی کے دروازے پر چھوڑ گیا تھا کیونکہ ان کی حویلی اس مقام پر تھی کہ دائیں بائیں کوئی راستہ نہیں لگتا تھا۔ جو بھی حویلی تک آتا تھا، اسے حویلی تک آنا ہی مقصود ہوتا تھا۔ شاید کوئی کسی درخت کے پیچھے چھپ کر کھڑا دیکھ رہا ہو کہ اس کی بچی کو کسی نے گود میں بھر لیا ہے یا نہیں...... اور اب چاند کے باہر آ جانے اور بچی کو اپنی گود میں بھر لینے پر اس نے سکون کا سانس لیا ہو۔

چاند نے آگے بڑھ کے کین کی ٹوکری بھی پکڑ لی تھی اور بچی اور ٹوکری کو اندر لے آئی تھی۔

''رات کے اس پہر...... یہاں کیا کر رہی ہو چاند......؟'' وہ چھوٹے دروازے کا تالا پھر سے لگا رہی تھی جب اسے اپنے پیچھے بابا کی آواز سنائی دی تھی۔

چاند پلٹی تھی۔ گود میں اٹھائی بچی کے ساتھ......

''یہ...... یہ کیا ہے؟'' بابا ایک دم سے اتنے حیران ہوئے تھے کہ سامنے کی چیز کی بابت چاند سے پوچھ رہے تھے۔

''بچی ہے۔ کوئی اسے ہماری دہلیز پر چھوڑ گیا ہے۔'' وہ سوتی ہوئی بچی کو محبت سے دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

''کون......؟'' بابا ابھی تک اپنی حیرت پر قابو نہ پا سکے تھے۔

''نجانے کون...... میں باہر نکلی تو یہ بچی ٹوکری میں پڑی رو رہی تھی۔'' اس نے وضاحت دی تھی۔

اور پھر رات کے اس پہر ساری حویلی ہی جاگ اٹھی۔ بستام، رحبان، تینوں پھوپھیاں، ان کی چھ عدد بیٹیاں......اور کچھ شاگرد پیشہ ملازم بھی......

سب بڑے کمرے میں جمع تھے۔ شیر کی کھال کے نیچے پڑی بڑی کرسی پر بابا بیٹھے تھے اور سوچ رہے تھے کہ اب کیا کرنا ہے۔ باقی سب بھی خاموش اور بے حس و حرکت بیٹھے تھے۔ سوائے چاند کے......جو چھوٹے سے چمچے سے ننھی بچی کو دودھ پلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''کیا کرنا ہے اب اس بچی کا......؟'' بابا نے سب ہی سے پوچھا تھا اور کسی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ کسی کو کچھ سمجھ میں آتا تو وہ بولتے...... یہ بات تو واضح تھی کہ جو بھی اس بچی کو حویلی کی دہلیز پر چھوڑ کر گیا تھا وہ اسے پال نہ سکتا تھا۔

غربت کی وجہ سے یا کسی بھی اور وجہ سے......

یا پھر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ لڑکی ہندو ہو جسے اس کے ماں باپ اپنے ساتھ ہندوستان نہ لے کر جا سکتے ہوں۔ لیکن اب حالات کافی بہتر ہو چکے تھے۔ قتل و غارت کم ہو چکی تھی۔ سب پولیس اور فوج کی نگرانی میں ہو رہا تھا۔ اس لیے دوسرا قیاس زیادہ درست نہ تھا۔

''تم بتاؤ چاند...... کیا کرنا ہے اس بچی کا......؟'' بابا نے چاند سے پوچھا تھا کیونکہ بچی سب سے پہلے اسی نے دیکھی تھی اور اب اسے دودھ پلاتے ہوئے وہ ایک طرح سے خود کو اس کی سرپرست تصور کیے ہوئے تھے۔

''چند دن میں کچھ سوچ لیں گے بابا......''

''دائیں بائیں کوئی بے اولاد ہو تو وہ بھی لے سکتا ہے۔'' تہمینہ پھوپھو نے اپنی رائے دی تھی۔

''دائیں بائیں تو ایسا کوئی گھر نہیں......''

''پھر صبح کسی یتیم خانے میں دے آئیں گے۔'' بستام نے کہا تھا۔

چانداس کی بات پر چونکی تھی۔

''کیوں......؟ یتیم خانے میں کیوں؟''

''تو اور کیا کرنا ہے اس بچی کا......'' وہ تڑخ کر بولا تھا۔

''یہ اب اس حویلی میں رہے گی۔'' چاند نے دوٹوک انداز میں کہا تھا۔ سب چاند کی بات پر چونکے تھے۔

''جس نے بھی اسے حویلی کی دہلیز پر چھوڑا ہے اسی نیت سے چھوڑا ہے کہ حویلی والے اس بچی کی پرورش کریں۔''

''لیکن ہم اسے نہیں پال سکتے بیٹا......''

''کیوں بابا......؟''

''کون پالے گا اسے......؟ کون دیکھ بھال کرے گا اس کی......؟''

''گھر میں اتنے افراد ہیں......سب مل کر دیکھ بھال کرلیں گے۔''

''میں تو ہرگز نہیں کروں گی۔ میری تو ابھی خود کی بچیاں چھوٹی ہیں۔'' سب سے چھوٹی زہرہ پھوپھو نے فوراً سے کہہ دیا تھا۔

''اور مجھ سے بھی اب یہ جھنجھٹ نہیں ہوتے......'' منجھلی والی شکیلہ پھوپھو بھی بولی تھیں۔ چاند نے بڑی پھوپھو کی طرف دیکھا تھا۔ انہوں نے کہا تو کچھ نہیں تھا لیکن بہت سرد سے انداز میں منہ پھیر لیا تھا۔ ایسے جیسے کہہ رہی ہوں کہ ان سے بھی اس کام کی کوئی امید نہ رکھی جائے۔

''تو پھر ٹھیک ہے۔ بچی کو میں پالوں گی۔'' چاند نے فیصلہ کن کہا تھا۔

''تم...... تم کیسے پال سکتی ہو اس کو چاند......''

''کیوں......؟ میں کیوں نہیں پال سکتی؟''

''تم تو ابھی خود ایک بچی ہو...... عمر ہی کیا ہے تمہاری......''

''آپ ہی تو کہتے ہیں کہ میں چھوٹی سی عمر میں ہی کتنی سمجھدار ہوں۔'' چاند نے بابا کو لاجواب کیا تھا۔

''لیکن......''

''بس بابا...... میں نے کہہ دیا ہے۔ اس بچی کو میں ہی پالوں گی۔''

''کب تک......؟''

''کیا مطلب...... کب تک؟''

''تم نے ساری زندگی اس حویلی میں تھوڑی نہ رہنا ہے۔ کل کو تمہاری شادی ہوگی۔ پھر اس کو کون سنبھالے گا۔''

بابا کی بات پر چاند لمحے بھر کو خاموش ہوگئی تھی۔ اس نے اس رخ پر تو سوچا ہی نہیں تھا۔

''میں اس کو اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔'' پھر لمحے بھر میں اس نے اس مسئلے کا بھی حل نکال لیا تھا۔

''تمہارے سسرال والوں نے اسے قبول نہ کیا تو......؟ التمش کو اعتراض ہوا تو پھر کیا کرو گی؟''

''اگر التمش کو کوئی اعتراض نہ ہوا تو پھر آپ کو تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟''

''نہیں...... پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''ٹھیک ہے...... میں کل ہی التمش کو خط لکھ کر پوچھ لیتی ہوں۔ اگر اسے اعتراض ہوا تو پھر بے شک آپ اس بچی کو کسی یتیم خانے میں دے دیجیے گا۔'' چاند نے کہا تھا اور بچی کو گود میں اٹھائے کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ باقی سب کچھ دیر وہاں ہی بیٹھے رہے تھے پھر ایک ایک کر کے سب ہی کھسک گئے تھے سوائے بابا کے......

بابا کی نیند اڑ چکی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ چاند التمش کو بچی گود لینے پر راضی کر لے گی۔ دونوں کی محبت کو وہ جانتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ دونوں ایک دوسرے کی کوئی بات نہیں ٹالتے۔ اور یہ ہی بات انہیں پریشان کر رہی تھی۔ وہ جہاندیدہ تھے۔ پرانی سوچوں کو ذہن سے خارج نہیں کر سکتے تھے۔ جانتے تھے کہ سونے کا ملنا اور گم ہونا...... دونوں ہی اچھے شگون نہیں ہوتے۔ پھر کین کی ٹوکری میں ایسے خوب صورت لعل کا ملنا...... یہ کیا تھا؟ اچھا شگون یا بری قسمت......؟ بٹوارے کے بعد ان کا خود کا تو زندگی سے دل اچاٹ ہو چکا تھا۔ لیکن چاند نے جو نئی ضد پال لی تھی، اس پر نجانے کیوں انہیں وسوسے آ رہے تھے۔ نجانے اس پرائی بچی سے چاند کو کتنی خوشیاں ملنے والی تھیں یا کتنے دکھ......

انہیں آنے والے وقت کا علم ہوتا تو وہ چاند کو یہ قدم ہرگز نہ اٹھانے دیتے۔

☆......☆......☆

چاند نے اگلے ہی دن لندن التمش کو خط لکھ دیا تھا۔ اسے سارا حال کہہ سنایا تھا۔ حویلی کے باہر ایک لاوارث بچی کا ملنا...... اور پھر چاند کا اس کو پالنے کا فیصلہ کرنا...... یہ سب چاند نے کچھ اس انداز میں لکھا تھا کہ سات سمندر پار بیٹھے التمش کو خط پڑھتے ہوئے چاند پر بے تحاشا پیار محسوس ہوا تھا۔ چاند نے جان بوجھ کر جذباتی خط لکھا تھا۔ وہ ہر صورت التمش کو اپنی بات پر راضی کرنا چاہتی تھی۔ اور اسے یقین تھا کہ خط پڑھ لینے کے بعد التمش اس کی بات نہیں ٹالے گا۔

التمش کے خط کا جواب آنے میں ایک ماہ سے کچھ زیادہ کا وقت لگا تھا۔ تب تک وہ بچی چاند کے پاس ہی رہی تھی۔ ایک ایک دن اس نے اس انتظار میں بہت مشکل سے کاٹا تھا۔ بچی سے اسے روز بروز پیار ہونے لگا تھا۔ کچھ وہ تھی بھی ایسے نین و نقش کی کہ اسے دیکھتے ہی اس پر پیار آ جاتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں التمش اس کے اتنی محبت سے مطالبے کے باوجود بچی کو گود لینے سے انکار نہ کر دے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔

بڑے کمرے میں سب کی موجودگی میں چاند نے التمش کا خط پڑھا تھا۔ جس میں صاف صاف

لکھا تھا کہ چاند بچی کو گود لے سکتی ہے۔ اسے اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ وہ بچی کا باپ بننے کے لیے تیار تھا۔ اسے اپنا نام دینے کے لیے بھی تیار تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنے گھر والوں کو بھی اس بات پر خود ہی راضی کر لے گا۔ بلکہ اس نے کمال فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چاند کو دو تین نام بھی لکھ بھیجے تھے کہ وہ اس میں سے جو چاہے بچی کا نام رکھ سکتی ہے۔ التمش کے اس خط پر چاند اور رحبان دونوں کو ہی بہت خوشی ہوئی تھی۔

چاند کو تو اس لیے کہ وہ بچی کو اب خود ہی پالنا چاہتی تھی۔ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اسے اب اس بچی سے الگ کرے۔

اور رحبان کو اس لیے کہ اس سے چاند کی اداس صورت دیکھی نہ جاتی تھی۔

"اب تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہے ناں بابا......شادی کے بعد میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔"

"ہاں......لیکن......"

"اب کیا......؟"

بابا کے ذہن میں جو چل رہا تھا وہ زبان تک نہیں آپا رہا تھا۔

"بولیے بابا......اب کیا اعتراض ہے آپ کو؟"

"پتا نہیں......کس مذہب کی ہے، کس عقیدے کی......اس کا ہمارے بچوں میں پلنا ٹھیک بھی ہو گا یا نہیں......" بابا نے جیسے جھجکتے ہوئے کہا تھا۔

انہیں یقین تھا کہ چاند کو ان کی بات بری لگے گی لیکن اب وہ یہ بات چاند سے نہ کرتے تو کس سے کرتے......

"بچوں کا کون سا مذہب بابا......اب یہ میرے ہی عقیدے پر ہو گی۔"

''جنم گھٹی تو خون کے قطرے قطرے میں شامل ہوتی ہے۔'' بابا کو تامل تھا۔

چاند خاموش ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا باپ عقیدوں کو لے کر کتنا سخت ہے۔ اس نے تو گھر کے برتن بھی پاک کروائے بنا گھر میں رکھنے نہیں دیے تھے۔

''تو پھر اس بچی کو بھی پاک کر لیتے ہیں۔'' کمرے کی خاموشی میں رحبان کی آواز گونجی تھی۔ وہ کافی دیر سے چاند کو پریشان حال دیکھ رہا تھا اور اس بے چارے کی کمزوری یہ تھی کہ اس سے چاند کی پریشانی ہی تو نہیں دیکھی جاتی تھی۔

سب نے ایک بار پھر حیرت سے رحبان کو دیکھا تھا۔

''میں نے سنا ہے کہ جو لاوارث بچے ہندوؤں کو مل رہے ہیں وہ ان کے سر کے سارے بال اتار کر ان کے ماتھے پر تلک لگا کر اپنا بنا لیتے ہیں۔ مسلمان بھی یہی کر رہے ہیں۔ بچوں کے سارے بال اتار کر بسم اللہ پڑھتے ہوئے نہلا کر وہ انہیں اپنا بنا رہے ہیں۔ یتیم خانے والے بھی یہ ہی کر کے ایسے بچوں کو مسلمان کر کے رکھ رہے ہیں۔ مولویوں کا فتویٰ ہے یہ......'' رحبان نے کچھ حقیقت اور تھوڑی مبالغہ آرائی سے بات بتائی تھی۔

''تو ہم بھی اس بچی کو پاک کر کے اسے خود میں شامل کر لیتے ہیں۔'' چاند نے چہک کر کہا تھا اور مسکراہٹ اور شکر کے سے انداز میں رحبان کی طرف دیکھا تھا۔ اس نے کمال کا خیال پیش کیا تھا جس نے اس کی مشکل آسان کر دی تھی۔

سورج مکھی والے صحن میں ننھی بچی کو تختے پر لٹا کر رحبان نے پیار سے اس کے سر کے سارے بال اتارے تھے۔ اور چاند بسم اللہ پڑھتے ہوئے بچی کے گنجے ہوتے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گھڑے سے ہلکے ہلکے پانی ڈال رہی تھی۔ ہلکا گرم پانی پڑتے ہی بچی کھلکھلانے لگی تھی۔ اور اسے دیکھتے ہوئے چاند مسکراتی جا رہی تھی۔ یہ عمل آدھا گھنٹہ جاری رہا تھا۔ دائیں بائیں کھڑے بابا، بستام اور تینوں

پھوپھیاں اس عمل کو ہوتے دیکھ رہی تھیں۔ رحبان کو، چاند کو اور ننھی بچی کو...... جو پاک ہو جانے کے بعد ان ہی کی حویلی کا حصہ بننے جا رہی تھی۔

پاک کر کے اس نے بچی کو بڑے اونی تولیے میں لپیٹ لیا تھا۔

''اب تو میں نے آپ کے سارے اعتراض دور کر دیے ہیں ناں بابا......؟'' چاند نے بابا سے پوچھا تھا۔

''تم نے بالآخر اپنی مرضی کر ہی لی اور التمش بھی تمہارے ساتھ جا ملا......'' دین بابا ہنسے تھے۔

''اس بچی کا نام صندل ہے۔ التمش کا دیا ہوا نام......'' اس نے اونچی آواز میں سب کو بتایا تھا۔

''خدا تمہیں اس بیٹی کی اچھے سے پرورش کرنا نصیب کرے۔'' بابا نے دعا دی تھی۔

''آمین......!''

بچی کو خود سے لگائے چاندا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

☆......☆......☆

سورج مکھی والے فرش کو دیکھتے ہوئے بوڑھی چاند بی بی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ اسے جیسے سب کچھ ابھی تک یاد تھا۔ جیسے سب لمحہ بھر پہلے ہی تو ہوا ہو۔ رحبان ننھی صندل کے بال اتار رہا ہو اور وہ اس کے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے، پانی ڈال کر اسے پاک کرتے ہوئے مسکرا کر اسے کھلکھلاتے ہوئے دیکھ رہی ہو۔

لیکن یہ لمحہ بھر پہلے کی بات نہیں تھی۔ پچاس سال گزر چکے تھے اس بات کو...... فرش پر بچھی اینٹیں خستہ ہو چکی تھیں۔ ان کی درزیں بڑھ چکی تھیں پھر بھی پانی تھا کہ اندر جذب نہیں ہو رہا تھا۔ اوپر ہی اوپر تیر رہا تھا۔ چاند بی بی کو لگا کہ سارا صحن اس کی سوچ کی قوت کی وجہ سے پانی سے بھر گیا ہے۔ بے اختیار ہی اس نے پاؤں اوپر کر لیے...... اسے ڈر تھا کہ کہیں اس پانی سے اس کے پاؤں بھیگ نہ جائیں۔ یہ پانی

اسے لے ڈوبنے والا تھا۔ وہ جانتی تھی ۔ اور ابھی اسے مرنا نہیں تھا۔ انتظار کرنا تھا۔ بہت سی باتوں کے پورا ہو جانے کا......

دور کہیں اذان کی آواز سنائی دی تو چاندبی بی نے سر پر رکھا اپنا سفید دوپٹا درست کیا تھا۔ تب ہی اس کا ہاتھ اپنے ہی سر کی جلد کو چھو گیا تھا اور ٹھٹک کر وہاں ہی رک گیا تھا۔

چاندبی بی کے سر پر ایک بھی بال موجود نہیں تھا۔ چاندبی بی پچھلے کئی سالوں سے سر سے گنجی تھی۔



قسط نمبر 2

حویلیاں شہر میں ایک حویلی......

حویلیاں شہر میں ٹھنڈی دھوپ آج پورے جوبن پر تھی۔ سردیاں رخصت ہو رہی تھیں اور سورج کسی شرمیلی دلہن کی طرح چپکے چپکے سے گھونگٹ کی اوڑ سے دھرتی کو دیکھ رہا تھا۔ سردیوں کی وجہ سے ٹھنڈے ہو چکے درو دیوار اب گرمی کی حدت کو اپنے اندر جذب کرنے لگے تھے۔ ایسی کھلی کھلی دھوپ میں سب کچھ نکھرا نکھرا اور تازہ تازہ لگ رہا تھا جیسے سارے پودے درخت چرند پرند آج صبح ہی اس دھرتی پر نمودار ہوئے ہوں۔

گھر کے ملازم رنگے ہوئے کپڑے کے گیلے تھانوں کو حویلی کی پچھلی دیواروں پر ڈال رہے تھے۔ آج ماٹ میں پیلا رنگ پکایا گیا تھا۔ سارے کپڑے پیلے رنگ میں رنگے گئے تھے۔ پیلے رنگ کے لمبے لمبے تھان سرخ حویلی کی چھت سے نیچے زمین تک گرے ہوئے لہرا رہے تھے جس سے عجیب خوش رنگ سا امتزاج پیدا ہو گیا تھا۔ پرانی دیواروں کا سرخ اور نئے اجلے پیلے کا......

بستام اور رحبان بھی چھت پر ہی موجود تھے، لیکن وہ کسی طرح کا کوئی کام نہیں کر رہے تھے بلکہ وہ پتنگیں اڑانے میں مصروف تھے۔ ماحول کو متوازن ہونے میں وقت لگ رہا تھا، لیکن یہ ہو رہا تھا۔ لوگ اچھا کھانے پینے لگے تھے۔ اچھے کپڑے پہننے لگے تھے۔ لوگ بلا وجہ ہی ہنستے ہوئے ہجرت کے دوران ہوئے جانی مالی نقصان کو بھولنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ لوگ بلا وجہ ہی باغوں میں نکل جاتے، چھتوں

پر چڑھ جاتے، زیادہ مقدار والے کھانے بنا کر دائیں بائیں بھجوانے لگتے......سب کو "حلیم" کھائے عرصہ ہو گیا تھا۔ بٹوارے کی افراتفری میں ہر سالن "حلیم" بن رہا تھا۔ بہتر تھا کہ اب روگ کو ختم نہ سہی تو کم کر لیا جاتا......جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی گیا تھا۔

چاند ملازموں کو دیکھنے اوپر آئی تھی جب اس نے دونوں کو پتنگیں اڑاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسے نہیں اندازہ تھا کہ بستام بھی اوپر ہی ہوگا۔ اس نے رحبان کو اوپر جاتے دیکھ لیا تھا تب ہی تو وہ یہاں آئی تھی۔ بستام کو بھی وہاں دیکھ کر اس نے ہاتھ میں پکڑے چاندی کے چھلے کو اپنے دوپٹے کے پلو میں چھپا لیا تھا۔

"اوئے...... پیچھے رکھ اپنی پتنگ کو میرے گڈے سے......" بستام رحبان پر چلایا تھا۔

"تو اور کس سے پیچ لڑاؤں؟ آسمان میں صرف ہم دونوں کی ہی تو پتنگیں ہیں۔"

"ٹھیک ہے، آجا پھر بچے......دیکھ لیتا ہوں تجھے......" بستام نے بڑک مارنے والے انداز میں کہا تو رحبان کو بھی جوش آیا اور اسی جوش اور جیت جانے کی امید میں اس نے بستام کی پتنگ سے پیچ لڑا لیا۔ آسمان میں دونوں کی پتنگیں آپس میں الجھ گئیں۔ دونوں ہی ماہر تھے۔ ایک دوسرے کو جانے نہیں دے رہے تھے۔

"کیا ہو رہا ہے؟" چاند دونوں کے قریب ہوئی تھی۔ رحبان نے اس کی طرف دیکھا تھا اور تب ہی بستام نے پوری طاقت سے اپنی ڈور کو جھٹکا دیا تھا۔ اگلے ہی لمحے نہ صرف رحبان کی پتنگ کٹ گئی تھی بلکہ اس کی انگلی پر چیرا بھی آ گیا تھا جس پر وہ مدھم سی سسکی بھر کر رہ گیا تھا۔

"اب آیا مزا مجھ سے پنگا لینے کا......" بستام نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"کیا ہوا......؟" گو کہ چاند کو علم تھا کہ کیا ہو چکا ہے، لیکن اس نے رحبان کی دل جوئی کے لیے پوچھ لیا تھا۔

"پتنگ کٹ گئی اور کیا......" وہ ڈور لپیٹتے ہوئے منہ بناتے ہوئے بولا تھا۔

''کوئی نہیں...... پتنگ ہی تو ہے۔اور آجائے گی۔''

''اور کہاں سے آجائے گی۔خالد نے اتنی مشکل سے یہ دی تھیں۔کہہ رہا تھا کہ بٹوارے کا دکھ ہی نہیں ٹلا اور تم کو پتنگ بازی سوجھ رہی ہے۔یہ کسی پرانے گودام سے نکال کر دی تھیں اس نے......اتنی منتیں کرنے کے بعد......اب دوبارہ تو ہرگز نہ دے گا۔''

''چلو میں تمہیں بنا دوں گی۔اور تمہاری انگلی سے خون نکلنا شروع ہو گیا ہے۔لاؤ میں اس پر کپڑا باندھ دوں۔''

''رہنے دو، اتنا بھی نہیں ہے۔''

''ادھر بیٹھو......''

چاند چھت پر پڑے تخت پر بیٹھ گئی تھی۔اپنے پاس اس نے رحبان کو بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔رحبان کی انگلی پر چیرا کچھ ایسا بھی گہرا نہیں پڑا تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ چاند اس پر لپیٹنے کے لیے اپنے دوپٹے کی کترن پھاڑنے لگی ہے تو وہ ساری ڈور لپیٹ کر، اسے ایک طرف رکھ کر چاند کے برابر بیٹھ گیا۔وہ بھلا ایسا موقع کیسے ضائع کر سکتا تھا۔چاند نے اپنے دوپٹے کو ایک طرف سے پھاڑا تھا اور اب اسے رحبان کی انگلی پر لپیٹنے لگی تھی۔رحبان چاند کو دیکھنے لگا تھا۔رات کا چاند...... جو دن میں بھی چمک رہا تھا۔

''تمہیں بنانی آتی ہے پتنگ......؟''

''ہاں! ایک بار بنائی تھی۔زیادہ اچھی تو نہیں بنی تھی لیکن اب کوشش کروں گی کہ اچھے سے بناؤں۔تم مجھے ایک بانس لا دینا کہیں سے......''

''لا دوں گا۔سڑک کنارے جگہ جگہ اگے ہوئے ہیں۔''

''گڈی کاغذ تو مل ہی جائے گا آسانی سے......ورنہ مٹھائی والے کے پاس جانا اور اسے کہنا کہ دھنک والا کاغذ دے دے۔تمہاری دھنک والی پتنگ جب آسمان میں اڑے گی ناں تو سب اسے رشک

سے دیکھیں گے۔"

چاند کی بات پر رحبان مسکرایا تھا۔ کتنا خیال تھا چاند کو اس کا......

اس دوران بستام بھی اپنی پتنگ کو نیچے اتارتے ہوئے ڈور لپیٹ چکا تھا۔

"میں نیچے جا رہا ہوں۔" کہہ کر اگلے ہی پل وہ سیڑھیوں کو کودنے کے حساب سے اترتے ہوئے نیچے چلا گیا۔ ملازم بھی گیلے تھانوں کو دیواروں پر ڈال کر اور ان کے اڑ جانے کے خدشے کے پیش نظر ان پر ایک ایک اینٹ رکھ کر سب کے سب نیچے چلے گئے تھے۔ چھت پر چاند اور رحبان دونوں اکیلے رہ گئے تھے۔

"وہ...... مجھے تمہارا شکریہ کہنا تھا رحبان......" اس کی انگلی پر اپنے دوپٹے کا کپڑا لپیٹ دینے کے بعد وہ بنا اسے دیکھے لجاجت سے بولی تھی۔ رحبان اس بات پر جیسے چونکا تھا۔

"کس بات پر......؟"

"تم نے صندل کو گھر میں رکھنے میں میری مدد کی...... اس لیے......"

چاند کی بات پر رحبان کے لبوں پر مسکراہٹ آئی تھی۔

"تم صندل کو نہ رکھنے کے خیال سے اداس ہو رہی تھیں اور میں تمہیں اداس دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔" وہ جذب سے بولا تھا۔

"پاک کرنے والی بات تم نے اپنے پاس سے کی تھی نا...... سچ سچ بتانا۔"

چاند کی بات پر رحبان دل کھول کر ہنسنے لگا تھا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا......؟"

"کیونکہ ایسی بات میں نے کہیں نہیں سنی...... بچوں کو پاک کرنے والی...... ان کے بال اتار کر انہیں نہلاتے ہوئے......"

"لیکن اب یہ بات کسی سے کہہ مت دینا......ورنہ دین بابا پھر سے منحرف نہ ہو جائیں۔"

"نہیں کہتی......"

چاند نے بھی آگے سے ہنس کر کہا تھا۔ اس کی ہنسی مختصر ہونے کے باوجود بھی اتنی طویل تھی کہ رحبان اس میں اپنی پوری زندگی جی سکتا تھا۔ چاند نے دوپٹے کے پلو میں بندھا ہوا چاندی کا چھلا نکال کر رحبان کے آگے کیا تھا۔

"یہ لو......"

"یہ کیا ہے؟"

"تمہارے شکریے کے طور پر یہ چھلا لائی ہوں۔ چاندی کا ہے۔"

"اچھا ہے۔" رحبان نے چھلے کو دیکھتے ہوئے کہا تھا، لیکن چھلا پکڑا نہیں تھا۔

"پکڑو......"

"چھلے پکڑے نہیں جاتے......پہنائے جاتے ہیں۔" اس نے چاند کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ سورج کی تیز روشنی میں چاند کے چہرے پر ایک سایہ آ کر رک گیا تھا۔

"پہنا سکتی ہو تو پہنا دو......" وہ کچھ کچھ نڈر انداز میں بولا تھا۔ چاند کے چہرے پر موجود سائے کا رنگ کچھ زیادہ گہرا ہو گیا تھا۔ یہ کیا بات کی تھی رحبان نے......اور کس انداز میں......اس سے پہلے کہ وہ سوچوں کے گرداب میں دھنستی، اگلے ہی پل سمجھ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ ہنس دی۔ اور اس کی یہ ہنسی کس قدر بناوٹی تھی۔

"تم بھی ناں......بہت فرمائشیں کرتے ہو رحبان......میں تو کبھی نہ پہناؤں۔ ویسے بھی لڑکیاں زندگی میں بس ایک ہی بار کسی کو چھلا پہناتی ہیں اور میں پہنا چکی ہوں التمش کو......اب کسی دوسرے کو تو خواب میں بھی نہ پہناؤں۔"

اس بے موقع التمش کے ذکر پر رحبان کا خون کھول کر رہ گیا تھا۔ بے اختیار ہی اس کی نظر چاند کی انگلی پر پڑی تھی جہاں التمش کے نام کا چھلا موجود تھا، اور اس کا دل کیا تھا کہ وہ اس چھلے کو زبردستی ہی سہی چاند کی انگلی سے اتار کر کہیں دُور پھینک دے۔

چاند نے چاندی کا چھلا رحبان کے قریب تخت پر رکھ دیا تھا۔

''یہ لو...... سنبھال لینا...... تمہاری جس سے شادی ہوگی۔ اسے کہنا...... وہ پہنا دے گی تمہیں۔''

چاند ہنس کر کہتی ہوئی اٹھی تھی۔ اس کی ہنسی کھوکھلی تھی، یہ بات چاند بھی جانتی تھی اور رحبان بھی......

چاند پھر جلدی سے وہاں سے نیچے چلی گئی تھی۔ رحبان سنجیدگی سے تخت پر پڑے چاندی کے چھلے کو دیکھتا رہا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ چاند نے اس کی بات سمجھ کر بھی ناسمجھی کا مظاہرہ کیا ہے اور یہ ہی بات اسے بے چین کر دیتی تھی۔ وہ جتنا اپنے دل کا حال چاند کے آگے بیان کرنا چاہتا تھا، چاند اتنی ہی چالاکی سے دامن بچا کر نکل جاتی تھی۔ کئی بار تو اس کا ضبط جواب دے جاتا تھا۔

اس کا دل کرتا تھا کہ وہ چاند کو گردن سے دبوچ لے اور اسے بتائے کہ وہ اسے کتنا چاہتا ہے۔ اور اتنی سختی سے بتائے کہ چاند اس کی بات کو ہنسی میں نہ ٹال سکے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا، وہ جانتا تھا۔ اور پھر سب سے بڑا کانٹا...... التمش...... رحبان، التمش سے بہت سال پہلے ملا تھا۔ اور وہ اس وقت بھی ایسا جواں مرد نظر آتا تھا کہ اگر اسے ذرا سا بھی علم ہو جاتا کہ چاند کو لے کر رحبان کے دل و دماغ میں کیا چل رہا ہے تو وہ رحبان کو قتل کرنے میں ایک منٹ کی بھی دیر نہ کرتا۔

نیچے چاند اپنے کمرے میں بے چینی سے ٹہلتی روتی ہوئی صندل کو خود سے لگائے تھپک تھپک کر سلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس سے رحبان کی بات اور انداز دونوں ہی ہضم نہیں ہو رہے تھے۔ یہ دن بدن کیا ہوتا جا رہا تھا رحبان کو......

یا شاید میں ہی غلط فہمی کا شکار ہو رہی ہوں۔ بھلا رحبان کیوں میرے بارے میں ایسا ویسا سوچے

گا۔ وہ جانتا تو ہے کہ مجھے التمش سے کس قدر محبت ہے۔ میرے خط وہ ہی تو ڈاک خانے لے کر جاتا ہے۔

صندل کے سوتے سوتے چاند سارے خیالات کو دُور کرتے ہوئے اپنے پلنگ پر لیٹ گئی تھی۔

چاند کی ساری غلط فہمی جلد ہی دور ہونے والی تھی۔

☆......☆......☆

ایک ماں بننے کا سلیقہ شاید ایک عورت کے اندر اس کے بچپن سے پروان چڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ چاند جس کی ابھی خود کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی، صندل کو ایسے پال رہی تھی جیسے نجانے کتنے بچے پال چکی ہو۔ صندل چھ ماہ کی ہو چکی تھی اور چھ ماہ کی ہو کر بھی وہ جیسے ابھی ایک ماہ کی ہی لگتی تھی۔ اس کی جسامت میں زیادہ فرق نہیں پڑا تھا۔ یا شاید چاند کو ہی وہ ابھی تک بچی لگتی تھی۔ وہ اپنے طور پر اس کی ہر ممکن بہترین طریقوں سے پرورش کر رہی تھی۔ اس کے رونے پر اسے علم ہو جاتا تھا کہ اسے اب دودھ کی ضرورت ہے یا خوراک کی......اس کو پیار سے نہلانا، کپڑے بدلنا، تھپک تھپک کر سلانا......سب اس نے آسانی سے سیکھ لیا تھا۔ رات میں وہ صندل کو لوریاں دیتی تھی۔ اتنی میٹھی آواز میں کہ تینوں پھوپھیاں حیرت سے اس کی لوریاں سنتی تھیں۔

باقی گھر میں دین بابا اور رحبان کے علاوہ اور کسی کو صندل سے انسیت نہیں ہوئی تھی۔ تینوں پھوپھیوں کو اپنی ہی بچیوں سے فرصت نہیں تھی۔ کہاں وہ صندل پر توجہ دیتیں۔ کچھ شاید ان کے دل میں صندل کو لے کر ابھی بھی یہ ہی بات تھی کہ یہ ایک ''پرائی'' بچی ہے۔ ان کا خون نہیں ہے۔ چاند کو اس سے کچھ غرض نہ تھی۔ وہ ویسے بھی رخصت ہو کر بہت جلد اپنے اصل گھر جانے والی تھی۔ بابا جلد از جلد اس کی شادی کر دینا چاہتے تھے۔

رحبان اکثر صندل کو تھام لیا کرتا تھا۔ اسے ہوا میں اچھالا کرتا تھا۔ جس پر چاند کو خوشی محسوس ہوتی تھی۔ کبھی کبھی وہ صندل کو لوریاں بھی سناتا تھا۔ جو اس نے اپنی ماں سے سیکھی تھیں۔ رحبان کی ماں

گجرات سے تھی۔ اس لیے رحبان کو ایک گجراتی لوری آتی تھی۔ بہت بعد میں پتا چلا تھا کہ وہ کوئی لوری نہیں تھی بلکہ وہ تو اداس کر دینے والا ایک لوک گیت تھا۔ جسے جب جب رحبان اپنی پرسوز آواز میں گایا کرتا تھا تو نجانے کیوں حویلی کے سارے مکین غمگین سے ہو جاتے تھے۔

بابا بتاتے تھے کہ اپنے ماں باپ کے قتل ہو جانے پر رحبان کس طرح ان کے سینے سے لگ کر بلک بلک کر رویا تھا۔ بابا نے تب ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس لڑکے کو کبھی تنہا نہیں ہونے دیں گے۔ شاید رحبان اس لیے بھی صندل سے بہت پیار کرتا تھا کیونکہ وہ خود بھی کبھی لاوارث رہا تھا۔ یتیم و مسکین...... جسے بابا نے اپنی گود میں لے لیا تھا۔

بستام سے تو کسی طرح کی امید کرنا ہی بے کار تھا۔ اسے صندل نامی لڑکی سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ وہ سخت مزاج کا لڑکا بنتا جا رہا تھا۔ جوں جوں وہ جوان ہو رہا تھا توں توں اس کے چہرے کی سختی بڑھتی جا رہی تھی۔ امید تھی کہ مرد بننے تک وہ درخت کی چھال کی طرح کرخت ہو جانے والا تھا۔ گھر کے ملازموں سے اس کا رویہ برا نہیں تھا پھر بھی سب اس سے ڈرتے تھے۔ پھر دین بابا نے اسے جس طرح کے کام پر لگا دیا تھا اس نے اس کے مزاج کو مزید سختی دی تھی۔ منڈی کے بڑے بڑے آدمیوں سے بھاؤ تاؤ کرتے کرتے وہ وقت سے پہلے خود بھی پورا ایک مرد ہی بن چکا تھا۔ جبکہ ابھی اس کی عمر کے باقی لڑکے شرارتیں کرنے میں ہی مصروف تھے۔ لیکن وہ ایسے رعب داب سے بات کرتا تھا جیسے نجانے کتنی جاگیروں کا مالک ہو اور کتنے ہی مرد و زن اس کی رعایا میں شمار ہوتے ہوں۔

چھوٹا ہونے کے باوجود بھی چاند کو کبھی کبھی اس سے خوف محسوس ہوتا تھا۔ کیونکہ ایک خوف زدہ کر دینے والی پرچھائیں ہر وقت بستام کی آنکھوں میں نظر آنے لگی تھی۔ رحبان بھی اگرچہ ہر دم بستام کے ساتھ ہی رہتا تھا لیکن وہ کسی حد تک بستام سے مختلف تھا۔ اور بستام تو اتنا تبدیل ہوتا جا رہا تھا کہ دین بابا کی تمام پرچھائیاں بھی اس کی ذات پر سے ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگی تھیں۔ اسی نے دین بابا پر

دباؤ ڈالا تھا کہ وہ حویلی کے ساتھ والا سیب کا باغ خرید لیں۔ جبکہ دین بابا کے دل میں ایسی کوئی خواہش نہیں تھی۔

''ہم نے کیا کرنا ہے بیٹا باغ...... یہ حویلی ہی اتنی بڑی ہے کہ ابھی تک ہم اسے ہی ٹھیک سے نہیں دیکھ سکے ہیں۔ باغ خرید کر کیا کریں گے۔''

''آگے آگے ان زمینوں کی قیمتیں کم نہیں ہوں گی۔ بلکہ مزید بڑھیں گی۔ نقصان نہیں ہوگا۔''

''زمینیں تو وہاں بھی بہت تھیں، کیا فائدہ دے دیا اس نے...... کون سا ساتھ لے آئے ہم ان زمینوں کو۔'' وہ اداسی سے بولے تھے۔

''اب آپ تو اپنی پسند سے اپنی عمر گزار چکے ہیں بابا...... بہتر نہیں کہ بچے جیسے چاہ رہے ہیں آپ ان کی خوشی میں خوش ہو جائیں۔''

بستام کی بات پر بابا نے فوراً سے اپنی گردن کو جھکا لیا تھا۔ بستام کی بات جو انہیں بے حد ناگوار گزری تھی تو وہ نہیں چاہتے تھے کہ بستام ان کے چہرے کے تاثرات دیکھے۔

''ٹھیک ہے، جیسا تم چاہو۔'' انہوں نے آمادگی دے دی تھی۔ باقی کا کام بستام نے خود کیا تھا۔ زمین کے مالک سے بات چیت، قیمت میں بھاؤ تاؤ...... جب سب طے ہو گیا تو بابا نے اسے اتنی رقم دے دی تھی جس قدر اس نے مانگی تھی۔ اور باغ کو بستام اور چاند کے نام لگوانے کو کہا تھا۔

''مجھے باغ کی ضرورت نہیں ہے بابا...... آپ اسے بستام کے نام ہی رہنے دیں۔''

''تمہیں ضرورت نہیں ہے لیکن التمش کو شاید ضرورت ہو۔''

''نہیں! التمش کو بھی ان چیزوں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ آپ جانتے تو ہیں اسے اچھے سے......''

''ہاں...... جانتا ہوں۔ التمش بہت اچھا لڑکا ہے۔ ذرہ برابر لالچ نہیں ہے اس کے دل میں...... لیکن...... اتنی لمبی زندگی میں اس کے دل میں کبھی نہ کبھی یہ خیال تو آ ہی سکتا ہے ناں کہ بوڑھے

سسر نے ساری زمین بیٹے کے نام لگادی اور بیٹی کے ساتھ سوتیلوں جیسا سلوک کیا۔''

''لیکن بابا......''

''اسے شادی کا تحفہ سمجھ لو میری بیٹی......'' دین بابا نے بات کاٹتے ہوئے کہا تھا۔ چاند مسکرا کر خاموش ہوگئی تھی۔

''التمش کا کوئی خط آیا۔ جس میں اس نے بتایا ہو کہ وہ کب واپس آ رہا ہے؟''

''نہیں بابا......''

''پھر تم خط لکھو تو پوچھ لینا کہ وہ کب تک واپس آ رہا ہے۔''

''جی اچھا......''

☆......☆......☆

کافی دنوں سے التمش کا کوئی خط نہیں آ رہا تھا۔ چاند نے دن گنے تو اسے اندازہ ہوا کہ بات ہفتوں سے نکل کر مہینوں سے جا لگی تھی۔ جبکہ ایسا پچھلے تین سالوں میں نہیں ہوا تھا۔ اس لیے چاند نے اسے تفصیل سے خط لکھنے کا سوچا تھا۔

سلام......!

جان سے بھی عزیز التمش!

امید ہے کہ تم خیریت سے ہو گے۔

تمہیں یاد ہو گا کہ میں تمہارے لندن جانے کے ہمیشہ خلاف رہی تھی۔ میں نے تمہیں روکا بھی......لیکن تم نے اپنی ضد پوری کی......چار سال کے لیے تم وہاں چلے گئے۔ لیکن جانے سے پہلے تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ ہر ہفتے نہیں تو ہر مہینے میں ایک بار ضرور خط لکھو گے۔ شروع میں تمہارے خط تواتر سے آئے بھی......لیکن اب دو ماہ سے تمہارا کوئی خط نہیں آیا ہے۔ دیکھ رہی ہوں کہ لندن کی فضا نے تم پر اپنا

اثر ڈالنا شروع کر دیا ہے۔ یا تو تم تعلیم میں بہت زیادہ مصروف ہو چکے ہو یا تم نے مجھے نظر انداز کرنا شروع کر دیا ہے۔ مجھے تو دونوں ہی باتیں منظور نہیں ہیں۔ اس لیے جلدی سے وقت نکال کر مجھے خط لکھو۔

یہاں ہماری شادی کی باتیں ہونے لگی ہیں۔ پچھلی بار جب تمہاری والدہ آئی تھیں تو وہ بھی یہ ہی بات کر رہی تھیں۔ بابا بھی کہہ رہے ہیں کہ جیسے ہی تم آ جاؤ گے تو بس فوراً سے ہماری شادی ہو جائے گی۔ میں اسی حوالے سے تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں لیکن تم میرے لیے شاید کچھ وقت نہیں نکال پا رہے۔ جلدی سے وقت نکال کر مجھے خط لکھ کر بتاؤ کہ تم کہاں مصروف ہو اور تمہاری واپسی کب تک ممکن ہے۔

ہماری بچی بھی خیر سے بڑی ہو رہی ہے۔ آج پورے چھ ماہ کی ہو چکی ہے اور اپنے نین نقش واضح کرنے لگی ہے۔ کوشش کروں گی کہ اگلے خط میں تمہیں اس کی تصویر بھیج سکوں۔ جب سے وہ میں نے گود لی ہے تم نے اسے ایک بار بھی نہیں دیکھا ہے۔ اپنی خیریت کی جلد اطلاع کرنا......

صرف تمہاری چاند!

خط مکمل کر کے اس نے اسے ایک بار پھر سے پڑھا تھا اور کونے میں ایک چھوٹا سا دل بھی بنا دیا تھا۔ پھر اسے تہ کر کے لفافے میں ڈالا تھا۔ گوند سے لفافے کو بند کیا تھا۔ اور پتا لکھ کر باہر دالان میں نکل آئی تھی۔

"رحبان...... رحبان!" چاند نے رحبان کو پکارا تھا۔ اس کے کمرے کے بالکل سامنے دوسرے دالان کے پیچھے بستام اور رحبان کا کمرہ تھا۔ دونوں ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔

"کیا بات ہے چاند......" رحبان کسی جن کی طرح فوراً سے نمودار ہوا تھا۔

"ذرا ادھر آ کر میری بات تو سنو......"

"ابھی آیا۔" وہ تیز تیز قدموں سے دالان ناپتا ہوا چاند تک پہنچا تھا۔

"ہاں...... بولو......"

''یہ لو...... یہ خط پوسٹ کر آؤ...... خاموشی سے جانا...... بابا کو پتا نہ چلے۔ ویسے تو وہ کچھ کہتے نہیں ہیں لیکن مجھے ایسی باتوں سے شرم آ جاتی ہے۔'' وہ شرماتے اور مسکراتے ہوئے بولی تھی۔ خط پکڑے رحبان بٹر بٹر چاند کو دیکھ رہا تھا۔

''التمش کو لکھا ہے؟'' پوچھتے ہوئے رحبان کا لہجہ کٹیلا تھا۔

''ہاں...... ظاہر ہے اور میں نے کس کو خط لکھنا ہے۔''

رحبان نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ خط پکڑے اس کے ہاتھ ایسے جنبش کر رہے تھے جیسے ابھی اس خط کو توڑ مروڑ کر رکھ دیں گے۔

''اور میری بات سنو...... تم خط پر ڈاک ٹکٹ وغیرہ ٹھیک سے تو لگاتے ہو ناں...... التمش کا کوئی جوابی خط نہیں آ رہا۔ میں سوچ رہی ہوں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ میرے ہی خط اس تک نہ پہنچ رہے ہوں۔''

''تمہارے خط اس تک نہ بھی پہنچیں تب بھی اس کے خط تو آنے چاہئیں کہ نہیں...... ''بہت محبت'' جو کرتا ہے وہ تم سے......'' رحبان زہر خند سے لہجے میں بولا تھا۔ جسے چاند محسوس نہیں کر سکی تھی یا وہ محسوس کرنا نہیں چاہتی تھی۔

''ہاں...... کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔'' رحبان کی بات پر چاند اداس ہو گئی تھی۔ التمش کو لے کر اس کے دل میں وسوسے آنے لگے تھے۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ وہاں اسے کوئی انگریزنی مل گئی ہو۔''

''بدشگونی تو مت کرو......'' وہ جلدی سے بولی تھی۔

''میں تو بس اندیشہ ظاہر کر رہا ہوں۔''

''تم یہ خط پوسٹ کر کے آؤ......''

''ابھی کر کے آتا ہوں۔'' خط پکڑے رحبان وہاں سے نیچے کی طرف چلا گیا تھا۔

چاند وہاں ہی کھڑی رہی تھی اور اداسی سے رحبان کی بات پر غور کرنے لگی تھی۔

"کہیں...... رحبان کا اندیشہ سچ نہ ہو۔ دو ماہ ہو گئے۔ التمش نے ایک بھی خط نہیں لکھا۔ ایسی بھی کیا مصروفیت کہ وہ مجھے ہی بھول بیٹھا ہے۔"

اس کا دل کم پانی والے کنویں کی طرح خوف سے بوجھل ہو چکا تھا۔

☆......☆......☆

دریائے دوڑ بہہ رہا تھا۔ معمول کی طرح...... نہ اس میں طغیانی تھی اور نہ سستی...... حویلیاں شہر کی نرم سرد فضا کی طرح وہ بھی ہمیشہ مدھرتا سے بہتا تھا۔ یہ دریا قراقرم کی بہت سی آبشاروں سے مل کر بنتا تھا اور پھر آگے جا کر دریائے سندھ کے ساتھ مل جاتا تھا۔ حویلیاں شہر کو دوسرے شہر سے ملانے کے لیے اس پر ایک بڑا پل بھی بنا دیا گیا تھا۔ باقی کچھ چھوٹے ذیلی پل تھے جس پر سے عام آمد و رفت جاری رہتی تھی۔

رحبان نے اپنی سائیکل پل شروع ہونے سے بہت پہلے ہی ایک درخت کے نیچے کھڑی کر دی تھی۔ پیدل چلتے ہوئے وہ اس مقام تک آیا تھا جہاں نیچے دریائے دوڑ کا پانی بڑی ہی تیزی سے گزر رہا تھا اور پانی کو دیکھتے ہوئے نظریں بھی بہتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ چند لمحے پانی کو دیکھنے پر رحبان کو محسوس ہوا کہ کسی دریا کی روانی کم ہو یا زیادہ...... لیکن اتنی طاقت تو ضرور ہوتی ہے کہ اگر کوئی آدمی اس میں کود جائے تو پانی لمحوں میں اسے اپنے ساتھ بہا کر لے جائے اور لمحے بھر میں اس کا نام و نشان باقی نہ رہے۔

لیکن رحبان کا پانی میں کودنے کا اور اپنا نام و نشان ختم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اسے ابھی زندہ رہنا تھا۔

قمیص کی جیب سے رحبان نے وہ خط نکالا جو چاند نے التمش کے نام لکھا تھا۔ خط کو آنکھوں کے سامنے کرتے ہوئے اس نے اس کے چار حصے کیے تھے۔ پھر نفرت سے اسے ہوا میں اچھالتے ہوئے نیچے دریا میں پھینک دیا تھا۔

"تم صرف میری ہو چاند...... صرف میری...... میں تمہیں کسی اور کی نہیں ہونے دوں گا۔ کبھی بھی نہیں......" رحبان کے چہرے پر سختی تھی اور آنکھوں میں وحشت......

☆......☆......☆

تو ہے پھول میرے گلشن کا

تو ہے چاند میرے آنگن کا

غم نہ کبھی تیرے پاس آئے

عمر میری تجھے لگ جائے

چاند صندل کو لوری دیتے ہوئے سلا رہی تھی۔ رات کی خاموشی میں چاند کی لوری کی آواز پوری حویلی میں گونج رہی تھی۔ بابا اپنے کمرے میں بستر پر لیٹے اس لوری کو سن رہے تھے۔

تیرے بدلے میں جیون بھر

تیرا ہر ایک دکھ جھیلوں

میں اپنی سب خوشیاں دے کر

تیرے سارے غم لے لوں

خوشیوں میں میری تو لہرائے

عمر میری تجھے لگ جائے

لوری سنتے سنتے صندل سو چکی تھی اور بابا اداس ہو چکے تھے۔

"خدا کرے کہ اس لڑکی سے تمہیں کبھی کوئی دکھ نہ ملے چاند...... نجانے کیوں میرا دل کہتا ہے کہ اس لڑکی سے تمہیں زندگی کے بڑے بڑے غم ملیں گے۔ خدا میرے اندیشے فنا کرے۔ میرے وسوسوں کو جھوٹا کرے۔ ایسا کچھ نہ ہو۔ یہ لڑکی تمہارے لیے خوشیوں کا سبب بنے۔"

وہ دعا مانگا کرتے تھے لیکن انہیں لگتا تھا ان کی دعائیں آسمان تک جانے کے بجائے کسی بد روح کی طرح حویلی میں ہی بھٹک رہی ہیں۔ ان کی بیٹی کو بڑے بڑے دکھ ملنے والے ہیں۔ ان کی چھٹی حس انہیں کہتی رہتی تھی اس لیے وہ جلد سے جلد چاند کی شادی کر کے اسے التمش کے حوالے کر دینا چاہتے تھے، لیکن التمش نے واپس کب آنا تھا کسی کو یہ ہی نہیں معلوم ہو پا رہا تھا۔

زرتاری کا کام خوب چل نکلا تھا۔ حالات رفتہ رفتہ معمول پر آ رہے تھے۔ قافلے آنا اور جانا بند ہو چکے تھے۔ جس نے ہجرت کرنی تھی وہ کر چکا تھا اور اب زندگی پھر سے رواں دواں تھی۔ بابا نے کاریگروں کی تعداد بڑھا دی تھی اور چوکھٹوں کی بھی...... ارد گرد سے عورتیں اور لڑکیاں بھی خوب آنے لگی تھیں۔ حویلی کیا تھی، اب اس کی نچلی منزل تو پورا کارخانہ ہی بن چکی تھی۔ صبح سے شام تک آمد و رفت جاری رہتی۔ کسے ہوئے کپڑوں پر ''آر'' چلتی رہتی...... جس کی مدھم آواز پوری حویلی میں گونجتی رہتی...... کمروں میں چوکھٹوں پر کام ہوتا رہتا تھا اور باہر صحن میں کپڑوں کی رنگائی کا...... ایک رونق سی ہر وقت لگی رہتی تھی اور چاند ان سب کے درمیان حکم صادر کرنے والی میڈم بنی گھومتی رہتی تھی۔ لیکن اس کے حکم صادر کرنے میں بھی اتنی اپنائیت تھی کہ سب ہی ملازموں کو اس سے بہت لگاؤ تھا اور سب ابھی سے بابا کے آگے فرمائش ڈال چکے تھے کہ چاند کی شادی پر نہ صرف انہوں نے شرکت کرنی ہے بلکہ انہیں ایک عدد نیا سوٹ بھی چاہیے۔ بابا نے ہنستے ہوئے سب کو ہاں کر دی تھی۔

بستام اور رحبان کے ذمے باہر کے معمولات تھے۔ منڈی والوں سے لین دین کرنا، کپڑوں کو بیچنا، نیا کپڑا خریدنا، وہ یہ سب بخوبی کر رہے تھے۔ لیکن بابا کو بس دونوں سے ایک شکایت تھی کہ وہ یہ کام لگے بندھے انداز میں کر رہے تھے جیسے مجبوری میں کر رہے ہوں۔ بابا کہہ دیتے تھے تو وہ کر دیتے تھے۔ خود جیسے ان کی اس کام میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

''میرے بعد جب ان کے سر پر پڑے گی تو خود ہی اس کام میں دل بھی لگ جائے گا۔'' دین بابا

سوچ کر خود کو تسلی دے لیا کرتے تھے۔

زندگی بہت پرسکون سے انداز میں رواں دواں تھی، لیکن پھر ایک دن اسی پرسکون زندگی کے بند کمرے کا تالا ٹوٹ گیا۔

☆......☆......☆

صحن کے سامنے والے بڑے کمرے کا تالا ٹوٹا ہوا تھا۔ دین بابا حسبِ عادت صبح جلدی اٹھ گئے تھے۔ مسواک کرتے ہوئے وہ چہل قدمی کر رہے تھے جب ان کی نظر صحن کے سامنے والے بڑے کمرے کے دروازے پر پڑی تھی۔ ٹوٹا ہوا تالا دروازے کے کنڈے میں پھانسی چڑھے کسی مجرم کی طرح جھول رہا تھا۔ تالے کی چابی صرف دین بابا کے پاس تھی۔ جسے انہوں نے بہت احتیاط سے سنبھال کر صندوق میں رکھا ہوا تھا اور صندوق کو الگ سے ایک تالا لگا دیا تھا کہ جن کی امانت ہے وہ کسی دن آ کر اپنی چیزیں لے جائیں گے۔ لیکن یہ کون چور تھا جو تالا توڑ کر کسی کی امانتوں پر غاصب ہوا تھا۔

جلدی سے وہ دروازے کے قریب ہوئے تھے۔ غور سے دیکھنے پر انہیں احساس ہوا تھا کہ تالا نہ تو چابی کی مدد سے کھولا گیا تھا اور نہ ہی کسی وزنی چیز سے توڑا گیا تھا۔ بلکہ تالے کو کسی تیز دھار اوزار سے کاٹا گیا تھا۔ جھٹ سے انہوں نے کمرے کا دروازہ کھول دیا تھا۔ سامنے وہ نظر آیا تھا جس کی انہیں توقع تھی۔ درگا مورتی کے سارے سونے کے زیورات اس کے وجود پر سے غائب تھے اور بنا زیورات کے درگا مورتی کچھ ادھوری سی دکھ رہی تھی۔

دین بابا یہ منظر دیکھ کر دھک سے رہ گئے تھے۔

''کیا بات ہے بابا......آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟'' چاند بھی وہاں ہی چلی آئی تھی۔ اس کو بھی صبح جلدی اٹھ جانے کی عادت تھی۔ کمرے کا دروازہ کھلا دیکھ کر اس کا وہاں چلے آنا فطری تھا۔

بابا نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ یک ٹک زیورات سے عاری درگا مورتی کو دیکھے جا رہے تھے۔

''بابا..... کچھ بولیے.....آپ پریشان دکھ رہے ہیں۔'' چاند فکرمندی سے بولی تھی۔

''چوری ہو گئی ہے۔''

''کیا.....؟ کیا چوری ہو گیا ہے؟''

''درگا مورتی کے زیورات.....''

بابا نے کہا تو چاند نے مورتی پر غور کیا تھا۔اس کے تمام تر زیورات اتر چکے تھے۔

''لیکن چوری کیسے ہو سکتی ہے۔اس کمرے کی چابی تو بس آپ کے پاس ہے۔''

''کسی نے تالے کو کاٹ دیا ہے۔''

''کس نے.....؟ ہمیں پولیس کو خبر کرنی چاہیے بابا!''

''نہیں.....میں نہیں چاہتا کہ حویلی میں پولیس آئے۔میں خود ہی معلوم کر لوں گا کہ یہ کس کا کام ہے۔''

بابا کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئے تھے اور دروازہ پھر سے بند کر کے انہوں نے بس کنڈی لگا دی تھی۔

وہ جانتے تھے کہ اب وہاں تالا لگانے کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔

☆......☆......☆

درگا مورتی کے سارے سونے کے زیورات مہنگے داموں بک گئے تھے۔بستام اور رحبان دونوں وہ پیسے پکڑ کر خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔اگرچہ دونوں جانتے تھے کہ عیار سنار نے ان دونوں کو کم عمر اور نا تجربہ کار جان کر ان کے ساتھ بے ایمانی کی ہے۔لیکن اس کی بے ایمانی کے بعد بھی جو رقم دونوں کے ہاتھ آئی تھی وہ اتنی زیادہ تھی کہ دونوں پورا سال کھلے ہاتھوں سے عیاشی کر سکتے تھے۔بلکہ اس سے زیادہ بھی وقت......

دکان سے باہر نکلتے ہی دونوں نے اس رقم کو آدھا آدھا برابر تقسیم کر لیا تھا۔جب چوری دونوں نے مل کر کی تھی تو رقم بھی دونوں کی برابر ہی بنتی تھی۔دونوں کی دوستی ویسے بھی کافی گہری تھی۔ایک

دوسرے کا حق نہیں مارتے تھے۔ نہ مستقبل میں ایسا کچھ ہونے کا اندیشہ تھا۔

''سب سے پہلا کام کیا کرنا چاہیے ان پیسوں سے......''بستام نے سوچتے ہوئے کہا تھا۔

''مینا گلی چلتے ہیں۔'' رحبان نے مشورہ دیا تھا۔

''وہاں کیا ہے؟''

''کل بتایا تو تھا۔'' رحبان کے یاد دلانے پر بھی بستام کو کچھ یاد نہیں آیا تھا۔ پھر رحبان نے اپنی بائیں آنکھ اٹھاتے ہوئے ذو معنی سا اشارہ کیا تھا۔ تب بستام کو بھی جیسے کچھ یاد آ گیا تھا۔ وہ ہنسنے لگا تھا۔

''چل پھر......وہاں ہی چلتے ہیں۔'' کندھے پر ہاتھ ڈالتے ہوئے بستام نے کہا تھا۔ دونوں بدنام زمانہ مینا گلی کی طرف چل دیے تھے۔

☆......☆......☆

مینا گلی ایک بدنام علاقہ تھا۔ ایسا علاقہ جہاں راتیں حاملہ ہو کر جاگتی تھیں اور دن بانجھ ہو کر سوتے تھے۔ سرِ شام سے بند بازار کھلنا شروع ہو جاتا تھا۔ سارا دن جو گلی سنسان رہتی تھی وہاں چہل پہل ہونے لگتی تھی۔ لڑکیاں تیار شیار ہو کر بالکونیوں میں کھڑی ہو جاتی تھیں۔ کچھ اپنے گھر کے دروازوں تک چلی آتی تھیں۔ اس سے زیادہ وضاحت کیا ہو گی ان کے اشاروں کی......لیکن دروازوں میں کھڑی لڑکیوں کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس انداز سے ان کے گھر کی غربت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ تربیت یافتہ اور خاندانی طوائفیں یا تو بالکونیوں میں کھڑی ہوتی تھیں یا وہاں پر بھی نہیں موجود ہوتی تھیں۔ ان تک رسائی کے تین راستے ہوتے تھے۔ ان کے حسن کی شہرت، ان کی سریلی آواز اور ان کے دلال......

پہلے پہل تو مینا گلی میں بس ناچ گانا ہوا کرتا تھا، رقص و سرور کی محفلیں سجائی جاتی تھیں۔ سنا کرتے تھے کہ بہت عزت ہوا کرتی تھی ایسی عورتوں کی جو گانے بجانے میں ماہر ہوتی تھیں۔ سروں کی پکی ہوتی تھیں۔ نواب لوگ گھر کی دعوتوں میں انہیں بہت عزت سے بلایا کرتے تھے۔ تب ایسی عورتوں میں بھی

ایک رکھ رکھاؤ ہوتا تھا۔ بے پردہ ہونے کے باوجود ذات میں سے ایسا طمطراق جھلکتا تھا کہ کسی مرد کی مجال نہیں ہوتی تھی کہ ان کو کچھ کہہ سکے۔

لیکن اب حالات بدل چکے تھے۔ بٹوارے نے ساری وضع داری کو چاٹ کھایا تھا۔ بیگمات ماما کی نوکریاں کر رہی تھیں اور مامائیں بیگمات بن چکی تھیں۔ اوپر کا نیچے اور نیچے کا اوپر ہو چکا تھا۔ جو جتنا غبن کر سکتا تھا اس نے کر لیا تھا۔ جو جتنا لٹ سکتا تھا اپنا آپ لٹوا چکا تھا۔ وہ عورتیں جو صرف گانا گایا کرتی تھیں اور ان میں سے کچھ صرف رقص کیا کرتی تھیں، اب بے ہنگم رقص کرنے لگی تھیں۔ مرد بھی بے لگام ہو چکے تھے۔ آتے جاتے ایسی عورتوں پر آوازیں کسا کرتے تھے۔ جن پر طوائفیں بدگمان ہونے کے بجائے انہیں ستائش سے دیکھا کرتی تھیں جیسے ان کی تعریف کی جا رہی ہو۔ زمانہ بگاڑ کا شکار ہو چکا تھا۔ نوٹوں پر رقص کرنے والیاں اب ہر طرح کا مطالبہ پورا کرنے کے لیے تیار نظر آتی تھیں۔ کچھ ہجرت نے بہت سی لڑکیوں کو بے گھر کر دیا تھا۔ کچھ اپنی عزت گنوا چکی تھیں اور اب ان کے ماں باپ، بھائی شوہر انہیں قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ اس لیے وہ سب ادھر آ جمع ہوئی تھیں۔ جہاں ہر دوسرا کوٹھا انہیں پناہ دینے کو تیار تھا۔

چھوٹی مینا گلی اب بڑھ کر پورا بازار بن چکی تھی۔

بستام اور رحبان دونوں اس گلی میں پہلی بار داخل ہو رہے تھے۔ دونوں کی جیبیں نوٹوں سے بھری ہوئی تھیں اس لیے چال میں ایک الگ ہی تفاخر نظر آ رہا تھا۔ بازار ابھی پوری طرح سے نہیں کھلا تھا، بلکہ کھل رہا تھا۔ جھرونکوں میں لگی قندیلیں روشن کی جا رہی تھیں۔ چلمنیں اوپر کو سرک رہی تھیں۔ صبح سے بند دکانوں کے بھاری دروازے کھولے جا رہے تھے۔ بستام اور رحبان سب کھوجتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

گلی کے کونوں میں کھڑے دلال ویسے تو اتنی کم عمر کے بچوں کو اس طرف کا رخ نہ کرنے دیتے تھے کہ ایسے بچے صرف تفریح کے لیے وہاں آتے تھے۔ لیکن بستام اور رحبان کی چال سارے ہی دلال

تاڑ چکے تھے کہ دونوں فقرے باز نہیں ہیں۔ اگر یہاں آئے ہیں تو کچھ لٹا کر ہی جائیں گے۔ اس لیے کسی نے انہیں نہیں روکا تھا۔

''کدھر جانا ہے لالہ......؟'' ایک دلال ان کے پاس چلا آیا تھا۔

''یہ راستہ کدھر کو جاتا ہے؟'' بستام نے پوچھا تھا۔

''ویسے تو یہ گلی آگے سے بند ہے۔ لیکن آپ چاہیں تو یہ راستہ جنت تک بھی لے کر جا سکتا ہے۔''

''جنت میں تو حوریں ہوتی ہیں۔''

''دیکھ کر خود ہی فیصلہ کر لیجیے گا کہ حور ہے یا عورت......''

''ٹھیک ہے، پھر وہاں لے چلو جہاں کی حوروں کا پورے بازار میں کوئی ثانی نہ ہو۔''

''ایسی سندر حوریں تو روشن بیگم کے چوبارے پر ہیں۔ چلیے وہاں ہی لے چلتا ہوں آپ کو......''

روشن بیگم کا چوبارہ شام کے دھندلکے میں روشن ہو چکا تھا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہی ایک بڑا ہال ان کے سامنے تھا۔ جہاں سارے فرش پر سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ قالین کا تالم بہار کے پھول اور خزاں کے پتوں کی عکاسی کر رہا تھا۔ دیواروں میں جا بجا طاقچے تھے اور ان طاقچوں میں قندیلیں روشن تھیں۔ ہال کے چار کونوں میں چار چھوٹی میزیں دھری تھیں جن پر شربت، خشک میوے اور مٹھائی رکھی گئی تھی۔

''آپ یہاں بیٹھیے......میں روشن بیگم کو بھیجتا ہوں۔'' دلال کہہ کر ہال کی ایک دیوار پر لگا جالی دار پردہ پیچھے کر کے دوسری طرف چلا گیا تھا۔ بستام اور رحبان وہاں دیوار کے ساتھ بچھے اونی گدے پر بیٹھ گئے تھے جس کے پیچھے اور اطراف میں گاؤ تکیے موجود تھے۔ اور کمرے کا جائزہ لینے لگے تھے۔ کمرے کی چھت سے ایک وسیع فانوس نیچے تک جھول رہا تھا جہاں لاتعداد ننھے دیے روشن تھے۔ کچھ کھڑے فانوس دروازے اور کھڑکیوں کے اطراف میں بھی رکھے گئے تھے۔ روشن بیگم کا چوبارہ ان کے نام کی طرح روشن ہی روشن تھا۔

چند لمحوں کے بعد جب دلال واپس آیا تو اس کے ساتھ روشن بیگم بھی دھیمی چال سے چلتی ہوئی

مہکتی ہوئی آ رہی تھی۔ ایک ڈھلتی عمر کی مسکراہٹ سے لبریز خاتون...... جسے دیکھ کر لگتا نہیں تھا کہ اس نے ساری زندگی کبھی کسی پر غصہ کیا ہوگا۔ اپنی اس مسکراہٹ کی بدولت روشن بیگم اپنی اس عمر سے کافی کم دکھتی تھی جو اس پر ان دنوں بیت رہی تھی۔

''سلام......!'' اس نے آتے ہی دونوں پر سلامتی بھیجی تھی۔

''وعلیکم السلام......!'' رحبان نے کہا تھا۔

''پہلی بار دکھے ہیں یہ چہرے......'' پازیب کی چھم چھم پر چلتی وہ دونوں کے پاس آئی تھی۔ اور اس نے ان دونوں کے چہروں کو غور سے دیکھا تھا۔

''پہاڑی خون نہیں لگتے آپ دونوں......''

''ہم دہلی سے ہیں۔''

''بٹوارے نے سب کو دائیں بائیں کر دیا ہے۔ خیر سنا ہے کہ دہلی والے دو چیزیں بہت پسند کرتے ہیں۔ امیر خسرو اور...... کشمیری سیب......'' روشن بیگم نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

بستام اور رحبان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف ناسمجھی سے دیکھا تھا۔ روشن بیگم دل کھول کر ہنسی تھی۔

''اگر نہیں بھی پسند تو آج چکھ کر دیکھ لیں۔'' وہ راغب کرتے ہوئے بولی تھی۔ بستام اس کی بات سمجھ کر مسکرایا تھا۔

''انتظار کریں۔ بھجواتی ہوں۔ کشمیری سیب......'' وہ ایک بار پھر سے ذومعنی انداز میں کہتے ہوئے ہنسی تھی اور اسی طرف چلی گئی تھی جہاں سے آئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد دلال بھی بستام سے دس روپے لے کر سیڑھیوں کے راستے واپس نکل گیا تھا۔

☆......☆......☆

دن طلوع ہوئے کافی جگ بیت چکے تھے۔ پھر بھی ایسے لگتا تھا جیسے صبح آنے کا نام نہ لیتی ہو۔ رات کے بعد پھر سے رات آنے والی ہو۔ بڑی کھڑکی سے شام ترچھی ہو کر کمرے میں اتری ہوئی تھی۔ قالین پر ملگجی شام کا نمونہ کڑھا ہوا تھا۔ جسے دیکھتے ہوئے راک چیئر پر خاموشی سے جھولتے دین بابا اپنے منتشر ذہن کو پرسکون کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کے ہونٹ آپس میں ایسے جڑے ہوئے تھے جیسے اب ساری زندگی کچھ نہ بول پائیں گے۔ ان کے چہرے کا سکون رخصت ہو چکا تھا اور اب وہاں قدیم پتھروں کی کرختگی نظر آتی تھی۔

چاند کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں طشتری تھی جس میں کچھ کھانے پینے کا سامان اور پھل موجود تھے۔ طشتری کو اس نے بابا کے پاس پڑی میز پر رکھ دیا تھا اور خود نیچے ہی قالین پر بیٹھ گئی تھی۔ اپنا ہاتھ پیار سے اس نے بابا کے گھٹنے پر رکھا تھا۔

''کچھ کھالیں بابا...... آپ نے صبح ناشتا بھی نہیں کیا آج...... نہ ہی دوپہر کو کچھ کھایا ہے۔''

''بھوک نہیں ہے چاند......''

''تھوڑی کوشش کریں۔ اس طرح بھوکا رہنا بھی تو ٹھیک نہیں ہے ناں......''

''میں نے ساری زندگی ہی کھانا کھایا ہے چاند...... ایک دو دن نہیں کھاؤں گا تو مر نہیں جاؤں گا۔'' بابا نے بیزاری سے کہا تھا۔ چاند نے خاموشی سے ان کی بات سنی تھی اور پھر خاموشی سے سیب کاٹنے لگی تھی۔

''نجانے کیسا دن نکلا ہے آج...... سب ہی پریشان ہیں۔ تہمینہ پھوپھو کی طبیعت خراب ہے۔ کوثر پھوپھو کی بچیوں کے پیٹ خراب ہیں۔ بستام اور رحبان ابھی تک سامان نہیں لائے۔ شام ہونے کو آئی ہے۔ کاریگر فارغ بیٹھے تھے تو میں نے سب کو چھٹی دے دی۔'' سیب کاٹتے ہوئے اس نے بابا کو سارے حالات سے آگاہ کیا تھا۔

''کہاں ہیں وہ دونوں......؟''

''معلوم نہیں......صبح سے غائب ہیں۔'' چاند نے کٹے ہوئے سیبوں کی پلیٹ بابا کے سامنے کی تھی۔ ناچار انہوں نے ایک قاش اٹھائی تھی اور بے دلی سے کھانے لگے تھے۔

''آپ کیوں اتنے افسردہ ہو گئے ہیں بابا...... چوری والی بات پر آپ کو اتنی ہی پریشانی لگ گئی ہے تو پولیس کو بلوا لیتے ہیں۔ وہ خود ہی چور کو تلاش کر لے گی۔''

''نہیں......اس کی ضرورت نہیں......''

''پھوپھو وغیرہ سے تو بات کریں۔ کیا پتا انہیں کچھ معلوم ہو اس بارے میں......''

''جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ پھر سب کو بتانے کا کیا فائدہ......''

''شاید اس طرح ہمیں چور ڈھونڈنے میں مدد مل جائے۔ گھر کے ملازم وغیرہ کچھ جانتے ہوں۔ میں تو کہتی ہوں کہ سب کو الگ الگ بلا کر بات کریں۔''

چاند کی بات پر بابا خاموش رہے تھے۔ انہوں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔

''یہ سیب کھا لیجیے گا۔ میری خاطر......'' وہ ایک اور سیب کاٹ کر پلیٹ ان کے پاس رکھ کر کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔ بابا اداس نظروں سے کٹے ہوئے سیبوں کو دیکھ رہے تھے جن کی سفید پرتیں بہت جلد رنگ بدلنے والی تھیں۔ سیاہ ہونے والی تھیں۔ جیسے شاید اس حویلی کی قسمت ہونے لگی تھی۔

وہ پولیس کو کیسے بلاتے......کیا بتاتے کہ حویلی کے مکینوں نے ہی حویلی میں نقب لگایا ہے۔ بستام اور رحبان نے درگا مورتی والے کمرے کا تالا توڑا ہے۔ اس کے زیورات چوری کیے ہیں۔ یہ تو ایسا داغ تھا جو پھر حویلی کی محراب سے صدیوں تک نہیں جانے والا تھا۔

انہوں نے رات کے پچھلے پہر نیند کے عالم میں دونوں کی سرگوشیوں کی آوازیں سن لی تھیں جس کا مفہوم وہ تب تو نہ سمجھ سکے تھے لیکن صبح انہیں سارے مطلب سمجھ میں آ گئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ درگا

مورتی کے زیورات ان دونوں نے ہی چرائے ہیں اس لیے انہوں نے پولیس کو نہیں بلایا تھا۔ اور چاند کو بھی منع کر دیا تھا کہ وہ اس بات کا ذکر کسی سے نہ کرے۔

لیکن اس سوچ نے انہیں افسردہ کر دیا تھا کہ کیوں......؟ بستام اور رحبان کو چوری کرنے کی کیا ضرورت محسوس ہوئی۔ گھر میں پیسے کی فراوانی تھی۔ بابا دونوں کو ہر مہینے ایک معقول رقم جیب خرچ کے طور پر دیتے تھے۔ پھر انہوں نے چوری کرنے کی منصوبہ بندی کیوں کی......اور ایسا کر بھی گزرے۔ اگر ان دونوں کو مزید پیسوں کی ضرورت تھی تو وہ بابا سے مانگ سکتے تھے۔ بابا کبھی ان کے ساتھ سخت مزاجی سے پیش نہیں آئے تھے۔ لیکن چوری......وہ بھی درگا مورتی کے زیورات......جو اس حویلی کے اصل مکینوں کی امانت تھی۔ بابا کی جان پر قرض تھا ان مکینوں کا......

دل تو بابا کا چاہ رہا تھا کہ جیسے ہی بستام اور رحبان گھر میں داخل ہوں وہ دونوں کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے باندھ کر انہیں اتنے جوتے لگائیں کہ دونوں کے جسم لال ہو جائیں۔ لیکن پھر انہیں احساس ہوا کہ وہ اب قدرے کمزور ہو چکے ہیں۔ دس جوتے بھی پورے نہ لگا پائیں گے کہ ہانپنے لگیں گے۔ اور یہ دس جوتے بھی اتنی کمزوری سے لگیں گے کہ دونوں کو درد ہونے کے بجائے گدگدی ہوگی اور وہ ڈھٹائی سے ہنسنے لگیں گے۔

اس لیے وہ خاموش تھے۔ جانتے تھے کہ وہ بے بس ہیں۔ بوڑھے ہو چکے ہیں۔ جوان ہوتی اولاد نے مروت میں انہیں اقتدار کی کرسی پر تو بٹھا رکھا تھا لیکن وہ جانتے تھے کہ اب اقتدار کی منتقلی کا وقت آ چکا ہے۔ خوشی سے، ناخوشی سے انہیں یہ کام کرنا ہوگا۔ لیکن بہتر ہوتا کہ بستام اس کرسی پر بیٹھنے کے کچھ آداب سیکھ جاتا......

"جو کچھ ہے انہی کا ہے۔ جیسے مرضی استعمال کریں۔ چاہے عقل مندی سے برباد کریں، چاہے ہوش مندی سے استعمال کریں۔" یہ سوچ کر انہوں نے خود کو تسلی دے دی تھی۔ لیکن ایک سوچ انہیں پریشان کیے جا رہی تھی۔ انہوں نے کبھی حرام نہیں کھایا تھا۔ ان کے والد نے بھی ایک لقمہ حرام کا گھر میں نہیں آنے دیا تھا۔ پھر ان کی اولاد میں حرام کی خواہش کیوں کر جاگی تھی۔ یا شاید یہ ہجرت کے اثرات

تھے۔خون خرابا، مار کٹائی، لڑائی جھگڑا دیکھ کر سب اپنی فطرت سے ہٹ کر چلنے لگے تھے۔گھر بار چھوڑتے ہوئے سب اپنا اصل بھی پیچھے چھوڑ آئے تھے۔

شام سے رات ہونے لگی تھی اور وہ کرسی پر بیٹھے اس ایک مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ان کی اولاد میں حرام کی خواہش کیوں کر پیدا ہو گئی۔

انہیں باقی کی ساری زندگی اس بات کا جواب نہیں ملنے والا تھا۔

☆......☆......☆

رات انگڑائیاں لے کر بیدار ہو رہی تھی۔شام کے بوجھل رنگ تاریک ہونے لگے تھے۔روشن بیگم کے چوبارے پر جلتی قندیلیں بھی مزید روشن لگنے لگی تھیں۔بڑے قالین کے ایک طرف سازندے بیٹھ چکے تھے اور اب اپنے اپنے ساز جانچ رہے تھے۔ایک ملازمہ بستام اور رحبان کے آگے کچھ موسمی پھل، پان اور خشک میوے طشتری میں رکھ کر چلی گئی تھی۔لیکن جب کافی دیر گزرنے کے بعد دونوں میں سے کسی نے کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا تو روشن بیگم کے اشارے پر وہ لڑکی دونوں کے پاس بیٹھ کر پھل کاٹ کر انہیں پیش کرنے لگی تھی۔جسے بستام اور رحبان دونوں نے ہی بے دلی سے قبول کیا تھا کیونکہ ان کا دھیان پھلوں کے بجائے کسی اور کے انتظار میں تھا۔

پھر کمرے میں جیسے دو چاند ایک ساتھ داخل ہوئے تھے۔ہلکے گلابی اور ہلکے سبز رنگ کے پہناوے پہنے ہوئے۔ان کی فراکیں کمر سے جس قدر تنگ تھیں، نیچے سے اتنی ہی کھلی تھیں۔دونوں نے اپنے لبوں کو سرخ کیا ہوا تھا، لیکن ایسا نہیں کہ حد سے تجاوز ہوتا معلوم ہو، بلکہ ایک نفاست سے یہ رنگ دونوں کے ہونٹوں پر چڑھا ہوا تھا۔کانوں میں بالیاں تھیں اور کلائیوں میں کہنیوں تک جاتی چوڑیاں...... جو سونے کی تو نہیں تھیں لیکن اسی ہی کی طرح کی کسی دھات کی تھیں۔ہتھیلیوں پر گول ٹکیاں مہندی کی...... جو انگلی کی پوروں کو بھی ڈھکی گئی تھی اور جوان کے سرخ وسفید ہاتھوں پر لگی غضب ڈھا رہی تھی۔

سر جھکائے، نظریں گرائے دونوں لڑکیاں اتنی آہستگی اور اتنی سستی سے اندر داخل ہوئی تھیں کہ ایسا

لگتا تھا جیسے قدموں پر چل کر نہیں بلکہ کسی رتھ پر سوار ہو کر آ رہی ہوں۔ یہ ان کے لباس کی نزاکت تھی یا شاید ان کی ذات کی نفاست کہ ان کے اٹھتے قدموں نے ان کے جسم کے توازن میں کوئی بگاڑ پیدا نہ کیا تھا۔

بستام اور رحبان تو چند لمحے بنا پلکیں جھپکائے بدتہذیبی سے ان دونوں کو دیکھتے رہے تھے جو ہم عمر ہونے کے ساتھ ساتھ ہم شکل بھی دکھتی تھیں۔

''یہ کومل ہے اور یہ ایمن......'' روشن بیگم نے دونوں کا تعارف کروایا تھا۔ دونوں لڑکیوں نے جن کے نام ''سروں'' پر تھے جھک کر اپنے صاحبان کو آداب پیش کیا تھا اور پھر جیسے لمحے بھر میں فیصلہ ہو گیا کہ بستام کی منظور نظر کون سی ہے اور رحبان کی کون سی......اور یہ بات جہاندیدہ روشن بیگم بھی سمجھ گئی۔ کیونکہ بستام کی نظریں کومل کے وجود کا طواف کر رہی تھیں اور رحبان کی ایمن کو کھوجتی جا رہی تھیں۔

لڑکیاں ہال کے وسط میں چھت پر لگے فانوس کے بالکل نیچے گانے والیوں کے ایک مخصوص انداز میں بیٹھ گئی تھیں۔ اس طرح سے کہ ان کا وجود ان کی اپنی پنڈلیوں کے اوپر تھا، لیکن دائیں طرف کو قدرے ڈھلکا ہوا۔ روشن بیگم کے اشارہ کرنے کے بعد سازندوں نے ساز چھیڑے تھے۔ پھر دونوں نے ایک ساتھ گانا شروع کیا تھا۔ پہلے چند لمحے تو راگوں کے سر بلند ہوئے تھے۔ پھر ''امیر خسرو'' کی شاعری کے کچھ کچھ بول سننے کو ملے تھے۔

سکل بن پھول رہی سرسوں

بن بن پھول رہی سرسوں

امبوا پھوٹے ٹیسو پھولے

کوئل بولے ڈار ڈار

اور گوری کرت سنگار

ملنیاں گڈھوا لے آئیں کرسوں

سکل بن پھول رہی سرسوں

دونوں نے سرسوں مہکانی شروع کی تھی۔اور بستام اور رحبان دونوں اس بن موسم کی بہار کو دیکھتے جارہے تھے۔دونوں کے ہاتھ خود بخود ہی ان کی جیبوں تک گئے تھے اور پھر وہاں سے پیسے نکل نکل کر مہندی سے رنگی مہارانیوں پر گرنے لگے تھے۔ حیرت سے روشن بیگم کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ جتنے پیسے دونوں بچوں نے اپنی جیبوں سے نکال کر لٹائے تھے، اتنے تو یہاں نوابوں کی لٹانے کی ہمت نہیں تھی۔اس نے سازندوں کو اشارہ کیا کہ گانا جلدی ختم نہ ہونے پائے۔

طرح طرح کے پھول کھلائے

لے گڈھوا ہاتھن میں آئے

نجام الدین کے دروجے پر

آون کہہ گئے عاشق رنگ

اور بیت گئے برسوں

سکل بن پھول رہی سرسوں

کومل اور ایمن اب اٹھ کر گھومنے لگی تھیں۔ ہاتھوں کے ساتھ ساتھ پاؤں بھی تھرکنے لگے تھے جن سے پازیبوں کی چھنکار سازندوں کے ساتھ مل سروں کو بڑھا رہی تھی۔ان کے لباس لہرا رہے تھے۔ دوپٹے جو سر پر بڑے سلیقے سے براجمان تھے اب ڈھلکنے کے قریب تھے۔اور بستام اور رحبان کے ہاتھ تھے کہ پیسے ہی لٹائے جاتے تھے۔

”بس......“ روشن بیگم نے ہاتھ کے اشارے سے دونوں کو منع کیا تھا۔سازندے راگ اٹھاتے اٹھاتے رکے تھے اور لڑکیاں قدم اٹھاتے اٹھاتے......بستام اور رحبان روشن بیگم کو دیکھنے لگے تھے۔

”بس صاحب......ہم غریبوں کے آج کے لیے اتنے پیسے بہت ہیں۔گانا سننا چاہتے ہیں تو بے شک ساری رات سینے۔لیکن اب پیسے لٹا کر ہمیں لالچی مت بنائیں۔ ہمارے ہنر کی قیمت آپ دے چکے ہیں بلکہ زیادہ دے چکے ہیں۔آج کی رات آپ کی ہوئی۔ جب تک چاہیں یہاں قیام کریں۔“

روشن بیگم چالاک عورت تھی۔ جانتی تھی کہ سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو ذبح نہیں کیا کرتے۔

پھر باقی کی رات میں سے انہوں نے تھوڑا سا حصہ لیا تھا اور دل بھر جانے پر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"امید ہے دوبارہ بھی آئیں گے۔" کومل نے بستام سے پوچھا تھا۔ اور ایمن رحبان کو ایک ادائے دلربائی سے دیکھتی رہی تھی۔

"دوبارہ نہیں...... باربار......" بستام بولا تھا۔

"اور اگر کبھی ہمارے دل کو آپ کی طلب ہوئی تو کہاں پیغام بھجوائیں؟" وہ عاجزی سے پوچھ رہی تھی۔

"دین حویلی......!" بستام نے بتایا تھا۔

☆......☆......☆

سکل بن پھول رہی سرسوں

بن بن پھول رہی سرسوں

ایک دوسرے کی کمروں میں ہاتھ ڈالے دونوں اونچی آواز میں گاتے ہوئے رات گئے حویلی واپس لوٹے تھے۔ دونوں نے کوئی ممنوع مشروب نہیں پیا تھا لیکن ان کی بے سری آواز سے ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے نجانے کتنی چڑھا چکے ہوں۔

اور گوری کرت سنگار

ملنیاں گڈھوا لے آئیں کرسوں

دونوں مستی میں لہکتے ہوئے صحن عبور کرتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے جب اندھیرے میں ایک وجود ہاتھ میں لالٹین پکڑے کسی اور سے نکل کر دونوں کے سامنے ہوا تھا۔

"کہاں تھے تم دونوں......؟" بابا کی آواز پر دونوں چونکے تھے۔ بابا اتنی دیر تک جاگ سکتے تھے انہیں اس بات کا اندازہ نہیں تھا۔

''لائل پور گئے تھے بابا......'' بستام نے جھوٹ بولا تھا۔ اور بابا بھلا ان سے سچ کی توقع بھی کہاں کر رہے تھے۔

''وہاں کی منڈی کا حساب کتاب لگانا تھا۔ اس لیے صبح ہی صبح چلے گئے اور واپسی میں بھی دیر ہو گئی۔'' رحبان نے بھی بستام کے جھوٹ میں اس کا ساتھ دیا تھا۔

بابا نے لالٹین اونچی کر کے دونوں کے چہروں کو غور سے دیکھا تھا اور ان کے اندر جیسے کچھ ٹوٹ سا گیا تھا۔ وہ تجربہ جو جوان ہوتے لڑکے کو جوان کر دے، وہ ان دونوں کے چہروں پر رقم تھا۔

''صبح جلدی اٹھ جانا...... بہت کام ہیں۔'' برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بابا کہہ کر اپنے کمرے کی طرف چلے گئے تھے۔

''جی اچھا......'' دونوں نے یک زبان ہو کر کہا تھا۔ اور اپنے کمرے میں پہنچ کر پھر سے سرسوں کے کھیتوں میں گم ہو گئے تھے۔



''چاند...... او چاند...... بات سن......!''

نیچے صحن میں کھڑی ماما اوپر کی طرف منہ کیے چاند کو آوازیں دے رہی تھی۔ چاند اپنے کمرے سے نکل کر باہر بالکونی میں آئی تھی۔

''جی...... کہیے حاجی بوا!''

''تمہارا خط آیا ہے۔'' حاجی بوا نے ہاتھ میں پکڑا خط اسے دکھاتے ہوئے کہا تھا۔

''کہاں سے......؟''

''التمش کا خط آیا ہے۔ جلدی سے نیچے آؤ۔'' اب کے حاجی بوا نے مسکراتے ہوئے بتایا تھا۔

''کیا...... التمش کا خط......؟'' وہ بے یقینی سے خوشی سے چور لہجے میں چہک کر بولی تھی۔ اور پھر

دین بابا کی تاکید کے باوجود دو دو سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے نیچے آئی تھی۔ تیزی سے آنے کے باعث پوری حویلی میں اس کی پائلوں کی جھنکار گونجنے لگی تھی۔

''لائیں دیں......'' خوشی سے اس کا سانس پھول چکا تھا۔

''اتنی جلدی کس بات کی ہے۔'' شرارت سے حاجی بوا نے خط اپنے پیچھے کر لیا۔

''دیں نا، بوا......'' شرماتے ہوئے وہ اصرار کر رہی تھی۔ بوا نے اسے مزید تنگ کرنا مناسب نہ سمجھا اور خط اسے پکڑا دیا۔

''تمہارے سسرال سے کوئی ملازم آیا تھا۔ وہ دے کر گیا ہے۔''

''میرے سسرال سے...... مجھے تو لگا کہ ڈاکیا دے کر گیا ہوگا۔'' اسے حیرت ہوئی تھی۔

''نہیں......ڈاک سے نہیں آیا۔''

''جی اچھا......'' خط پکڑ کر وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی تھی۔ جلدی سے اس نے خط کو کھولا تھا اور دھڑکتے دل کے ساتھ پڑھنا شروع کیا تھا۔

پیاری چاند!

دعا کرتا ہوں کہ تم خیریت سے ہو۔

پچھلے چھ ماہ سے تمہارا کوئی خط نہیں آیا تو مجھے فکر ہونے لگی۔ اس لیے یہ خط اپنے گھر کے پتے پر ارسال کر رہا ہوں۔ وہاں سے کوئی تمہیں خط دینے آجائے گا۔ پہلے پہل تو مجھے لگا کہ تم مصروفیت کی وجہ سے مجھے خط نہیں لکھ پا رہیں۔ لیکن پھر جب تم نے میرے شکوے بھرے خطوط کا جواب بھی نہیں دیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ میرا کوئی بھی خط تم تک پہنچ ہی نہیں رہا ہے۔ شاید ڈاک کا کوئی مسئلہ ہو گیا ہو کیونکہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم فرصت نکال کر مجھے خط نہ لکھو۔ تمہاری محبت کو اتنا تو جانتا ہی ہوں میں......

اتنے عرصے میں مجھ تک ہماری بیٹی صندل کی بھی کوئی خبر نہیں پہنچ سکی۔ جبکہ میں تو اس کی تصویر کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اس کے لیے یہاں سے بہت سی خریداری بھی کی ہے۔ بہت سے کپڑے،

جوتے اور کھلونے لیے ہیں۔ مجھے ان سب چیزوں کا زیادہ پتا تو نہیں لیکن اپنی طرف سے سب بہترین لینے کی کوشش کی ہے۔

خط مل جائے تو نیا خط لکھنے کا تردد مت کرنا...... کیونکہ جو بھی باتیں کرنی ہیں اب مل کر ہی کریں گے۔ میں بہت جلد پاکستان واپس آرہا ہوں۔ ہمیشہ کے لیے......

تمہارا التمش!

آخری بات پر فرطِ جذبات سے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ چاند نے خط کو سینے سے لگا لیا تھا۔ التمش واپس آرہا تھا۔ اس بات کی خوشی نے اس کے دل کی دھڑکنوں کو تیز کر دیا تھا۔ یعنی اب دونوں کی شادی کے دن نزدیک تھے کیونکہ بابا تو بس التمش کی آمد کے ہی انتظار میں تھے۔ وہ جلد سے جلد دونوں کی شادی کر دینا چاہتے تھے۔

خط کو دوبار پڑھ لینے کے بعد اس نے اسے تہ کر کے الماری میں اپنے کپڑوں کے نیچے رکھ دیا تھا۔ تب ہی ایک سوچ نے اسے لمحاتی طور پر پریشان کر دیا تھا۔ وہ سوچنے لگی تھی کہ پچھلے چھ ماہ سے لکھے جانے والے اس کے بہت سے خطوط اگر التمش تک نہیں پہنچے تو پھر وہ آخر گئے کہاں......؟ وہ مسترد ہو کر حویلی میں واپس تو آتے......

سوچتے ہوئے چاند کی سماعتوں میں دریائے دوڑ کی لہروں کا شور سا گونجنے لگا تھا۔



ناول تاش گھر ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 1 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 3

صدف کی اس سنکھ (گھونگے سے بنایا جانے والا باجا جو قدیم زمانے میں مندروں میں پوجا پاٹ کے اعلان کے وقت بجایا جاتا ہے) پر کام بے حد باریک بینی اور نفاست سے کیا گیا تھا۔ باریک اوزاروں سے اس کی کھدائی کرتے ہوئے اس پر مختلف نقش ابھارے گئے تھے جو پرانے وشنو مندروں کی دیواروں سے ملتے ہوئے لگتے تھے۔ پھر اس کی کھدائی پر سیاہ سیاہی بھری گئی تھی۔ سفید سنکھ پر سیاہ چتر کاری نے اسے بے حد خوب صورت بنا دیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اسے تھام لینے کو دل کرتا تھا اور اسے پر کھتے ہی اسے بجانے کی طرف من مائل ہو جاتا تھا۔

اپنے کمرے میں تخت پر بیٹھا رحبان اسی سنکھ کو بجانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کافی مہینے بیت چکے تھے۔ اسے یہ سنکھ ابھی تک بجانی ہی نہیں آئی تھی۔ دہلی میں اس نے اپنے بہت سے ہندو دوستوں اور ان کی ماؤں کو مختلف تہواروں پر سنکھ بجاتے دیکھا تھا۔ وہ سنکھ کے ایک سرے پر ہلکی سی پھونک مارتے تھے اور دوسری طرف سے سنکھ میں سے ایک مدھر سی آواز نکلتی تھی۔

مدھر آواز...... جو تھوڑی خوف زدہ کر دینے والی بھی ہوتی تھی۔

وہ بھی نقل کرتے ہوئے سنکھ کے ایک سرے پر پھونک مار رہا تھا لیکن پھونک دوسری طرف سے پھس پھس سی آواز دے رہی تھی۔ وہ بات نہیں بن رہی تھی جو سنکھ کا خاصا تھی۔ اپنے دوستوں کو یہ بجاتے ہوئے دیکھتے ہوئے رحبان کو یہ بہت آسان لگا کرتی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اسے بجانے کے لیے

باقاعدہ ماہر ہونا پڑتا ہے۔ وہ تو اسے ایک سیٹی سمجھا تھا کہ جسے وہ آسانی سے بجالے گا لیکن اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ اتنی آسان نہیں تھی۔ وہ جس قدر بھی قوت سے پھونک مار رہا تھا، سنکھ میں سے سُر نہیں نکل رہے تھے۔

یا وہ بے سرا تھا یا سنکھ......

''کیا کر رہے ہو؟''

چاند اس کے کمرے میں آئی تھی۔ آسمانی رنگ کی شلوار قمیص پر ہلکے آسمانی رنگ کا شفون کا دوپٹا اوڑھے، تنگ پائجامے کے نیچے سیدھی چپل اور چاندی کی پازیبیں، جو پوری حویلی میں مدھم سا شور کرتی رہتی تھیں۔ رحبان نے سر اٹھا کر چاند کو دیکھا تھا اور پھر نظروں کے زاویے بدلنا بھول گیا تھا۔ چاند پر تو ہر رنگ ہی خوب لگتا تھا۔ جیسے سارے رنگ اسی کے لیے بنے ہوں۔ چاند کے چہرے کو دیکھتے ہوئے وہ اس کے گالوں، ناک، آنکھوں کو دیکھنے لگا تھا اور پھر آخر میں...... اس کے ہونٹوں کو......

چاند نے رحبان کو خود کو یوں دیکھتے ہوئے دیکھا تو خود میں سمٹی تھی۔ پھر تخت پر بیٹھتے ہوئے اس نے رحبان کی آنکھوں کے آگے چٹکی بجائی تھی۔

''کہاں کھو گئے؟''

رحبان چونکا تھا۔

''ہاں...... کیا پوچھ رہی تھیں تم......؟'' وہ چونک کر کچھ شرمسار سا ہوا، اور بے مقصد سنکھ کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ چاند کے چہرے اور ہونٹوں کو دیکھتے رہنے سے اسے خود پر بے اعتباری ہونے لگی تھی کہ کہیں وہ کچھ غلط حرکت نہ کر بیٹھے۔

''بجانی نہیں آئی ابھی تک یہ تمہیں......؟''

''نہیں...... کوشش تو بہت کی لیکن بات نہیں بنی...... کسی ہندو لڑکے سے پوچھوں گا۔''

''اب کہاں سے ملے گا ہندولڑکا......سب تو چلے گئے۔''

''ہاں......یہ بھی ہے۔''

''باتوں باتوں میں اصل بات کرنا تو بھول ہی گئی۔تم یہ بتاؤ......تم التمش کو ہر خط ٹھیک سے پوسٹ کرتے رہے ہونا......؟''

''ہاں......کیوں......؟''رحبان نے مختصر بات کی تھی۔طویل جملہ اس کی گھبراہٹ کو ظاہر کر سکتا تھا۔

''کیونکہ میرا کوئی بھی خط پچھلے کئی مہینوں سے التمش کے پاس نہیں پہنچ سکا ہے۔''

''شاید پوسٹ میں کچھ گڑبڑ ہو۔''اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا تھا۔دریائے دوڑ کا پانی اس کے حلق میں داخل ہونے لگا تھا۔''خیر!اب کے پوسٹ آفس جاؤں گا تو ان سے بات کروں گا۔''

''اب پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔اب میں نے مزید کوئی خط التمش کو نہیں لکھنا ہے۔''وہ کچھ شرماتی ہوئی سی بولی تھی۔

''کیوں......؟''

''کیونکہ آج التمش کا خط آیا ہے۔وہ......''

''التمش کا خط کیسے آسکتا ہے؟''رحبان نے اس کی بات کاٹی تھی۔وہ حیران ہوا تھا۔اس نے ڈاکیے کو منہ مانگی رقم دی تھی تب وہ اس بات پر راضی ہوا تھا کہ وہ التمش کا کوئی بھی خط حویلی تک پہنچنے نہیں دے گا۔

''التمش کا خط کیوں نہیں آسکتا؟''حیرت زدہ تو چاند بھی ہوئی تھی۔

''نہیں......میرا مطلب ہے کہ کافی عرصے سے اس کے خط جو نہیں آرہے تھے۔''اس نے حاضر دماغی سے بات بنائی تھی۔

''آیا تو ابھی بھی نہیں......التمش نے اپنے گھر خط لکھا تو میرے لیے بھی ایک خط لکھ دیا۔وہاں سے آج ملازم آیا تھا خط دینے......''

"اچھا......!" رحبان نے کچھ مایوسی سے کہا تھا۔

التمش نے یہ نیا راستہ ڈھونڈ لیا تھا۔ اپنے گھر خط لکھنے کا......

"تم نے مجھے بات ہی مکمل نہیں کرنے دی۔ میں تمہیں ایک بہت ہی خاص بات بتانا چاہتی ہوں۔"

"ہاں...... بولو...... کیا بات ہے۔ میں تمہیں ہی تو سن رہا ہوں چاند......"

"التمش واپس آرہا ہے۔" چاند نے مسکراتے ہوئے، سنکھ کو کھوجتے ہوئے رحبان کو بتایا تھا۔

"کب......؟" شدید غصے کے باعث رحبان نے سنکھ کو اتنی مضبوطی سے اپنے دونوں ہاتھوں میں بھینچ لیا تھا کہ اگر وہ مضبوط صدف کی نہ بنی ہوتی تو جھٹکے سے ٹوٹ جاتی۔

"بہت جلد...... بابا نے کہا ہے کہ آتے ہی میری اور التمش کی شادی کی تاریخ رکھ دی جائے گی۔"

رحبان خاموش رہا تھا۔

"میں تو ابھی سے اداس ہونے لگی ہوں رحبان...... یہ حویلی بہت یاد آئے گی مجھے!"

رحبان اب بھی خاموش تھا۔

سنکھ کوئی کٹاری ہوتی تو اس کا ہاتھ خونم خون ہو گیا ہوتا۔

"تم مجھے رنگ لا دو گے رحبان......؟" کچھ خیال آنے پر چاند نے کہا تھا۔

"کس لیے؟"

"میں صحن میں رنگولی بناؤں گی۔ وہاں میری ہندو سہیلیاں بناتی تھیں۔ تمہیں بھی یاد ہوگا۔ انہی سہیلیوں کے بھائی ہی تو تمہارے اور بستام کے دوست تھے۔ سوچ رہی ہوں کہ التمش کی آمد پر میں بھی ویسی ہی رنگولی بناؤں۔ یہاں سے رنگ مل جائیں گے ناں......؟"

"پتا نہیں......"

"اگر رنگولی والے رنگ نہ ملے تو پھر ہم کپڑوں کو رنگنے والے رنگ استعمال کر لیں گے۔ انہیں

پانی میں گھول کر لکڑی کے باریک برادے میں ملا دو تو تقریباً ویسی ہی چیز بن جاتی ہے۔لیکن تم پہلے رنگولی والے رنگ پتا کرنا......"

"کسی ملازم کو بھیج کر منگوا لینا......میرے پاس وقت نہیں ہے۔"

رحبان نے رکھائی سے کہا تو چاند نے اچنبھے سے اس کی طرف دیکھا تھا۔وہ رحبان جو چاند کا ایک ایک کام کر کے خوش ہوا کرتا تھا، آج اس نے کیسے منہ بھر کر چاند کو انکار کر دیا تھا۔چاند حیرت سے رحبان کو دیکھے گئی۔

"ٹھیک ہے۔ملازم سے منگوا لوں گی۔" کہتے ہوئے اس کی آواز گری تھی۔

"اب جاؤ یہاں سے......مجھے تھوڑی دیر آرام کرنا ہے۔"

چاند نے مزید حیرت سے رحبان کو دیکھا تھا۔لیکن اب کے اس نے کچھ کہا نہیں تھا۔چپ چاپ وہ کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

چاند کے جانے کے بعد رحبان نے چند لمحے تو اپنے غصے کو ضبط کرنے میں لگا دیے تھے۔پھر اپنی پوری قوت سے ایک زوردار غصیلی پھونک سنکھ کے دہانے پر چھوڑی تھی۔

پھونک ایسی طاقت ور تھی کہ سنکھ کے دوسرے سرے سے اتنی بلند آواز فضا کو چیرتی ہوئی چلی گئی تھی کہ سیڑھیاں اترتی چاند کے پاؤں اپنے آپ ہی رک گئے تھے۔نعمت خانے میں کھانا بناتی پھوپھو ٹھٹک کر رکی تھیں۔دین بابا ملازم کو کام کی ہدایت دیتے چپ ہوئے تھے۔حویلی میں کام کرتے باقی افراد بھی اس زوردار طبل پر چند لمحے کو رک سے گئے تھے۔چالیس چوکھٹوں پر چلتی "آر" رک رک گئی تھی۔

"رحبان کو کیا ہو گیا ہے ان دنوں......" بے چینی سے سوچتے ہوئے چاند نیچے اتری تھی۔

☆......☆......☆

التمش پاکستان آچکا تھا۔دو دن ہو چکے تھے اسے پاکستان آئے۔چاند کی آنکھیں چوکھٹ میں

گڑی ہوئی تھیں کہ وہ حویلی میں کب اپنے قدم رکھتا ہے۔آج صبح ان کے گھر سے ایک ملازم پیغام دینے آیا تھا کہ کل التمش صاحب، دین بابا سے ملنے حویلی آئیں گے۔

حاجی بوا نے آکر چاند کو یہ بات بتائی تھی اور چاند کا دل لمحے بھر کے لیے دھڑکنا بھول گیا تھا۔وہ جانتی تھی کہ یہ پیغام دین بابا کے لیے نہیں، بلکہ اس کے لیے بھیجا گیا ہے۔اپنے دوپٹے پر کرن کی ڈوری لگاتے اس کے ہاتھ رک سے گئے تھے۔

''لاؤ مجھے دو......میں دوپٹے میں کرن لگا دیتی ہوں۔اب تم سے تو یہ کام شاید ٹھیک سے ہو نہیں پائے گا۔'' حاجی بوا نے شوخ سے انداز میں کہا تھا۔چاند ہنستے ہوئے دوپٹا اور ڈوری وہاں ہی چھوڑ کر باہر چلی گئی تھی۔

اگلے دن دوپہر تک وہ التمش کی آمد کے سلسلے میں مختلف تیاریوں میں مصروف رہی تھی۔اسے ایک لمحے کی بھی فرصت نہیں ملی تھی۔بڑے کمرے کے سارے فرش پر اس نے قالین بچھوا دیے تھے۔اور ان کے اوپر اور کمرے کے وسط میں ایک سب سے خوب صورت قالین الگ سے بچھایا تھا۔دیوار کے ساتھ ساتھ اس نے بیٹھنے کے لیے راج ہنس کے پنکھوں والے دبیز گدے ڈال دیے تھے۔اور ان کے پیچھے گاؤ تکیے رکھ دیے تھے۔کمرے کے چاروں کونوں میں اس نے چھوٹے چھوٹے ٹیبل رکھ کر ان پر گلدان رکھے تھے اور حاجی بوا کو کہہ دیا تھا کہ ان سب میں تازہ پھول لگوانے ہیں۔اگرچہ التمش کے لیے دوپہر کے کھانے کا اہتمام تھا لیکن دیر سویر میں شام گہری ہو جانے کے خیال سے اس نے طاقچوں میں قندیل صاف کروا کے رکھوا دی تھیں۔موم بتیوں کے اسٹینڈ بھی جگہ جگہ رکھوا کر ان پر سرخ اور سفید موم بتیاں لگا دی گئی تھیں۔

خود اس نے چندن سے منہ دھویا تھا۔سر پر ناریل کے تیل کی مالش کروا کر مہندی کے پتوں والے نیم گرم پانی سے سر دھویا تھا۔حاجی بوا نے اسے کہا بھی تھا کہ اسے ان سب تردد کی بالکل ضرورت

نہیں ہے۔التمش کی آمد کی خبر سے ہی اس کے چہرے پر جو نور آچکا ہے وہ چندن ابٹن سے کہیں بڑھ کر ہے۔لیکن پھر بھی وہ سب کیے جا رہی تھی۔لباس بھی اس نے آج کے دن کے لیے خاص بنوایا تھا۔کسم کے رنگ والا فراک...... التمش کا پسندیدہ رنگ...... جو اسے چاند پر بہت اچھا لگا کرتا تھا۔

سارے کام مکمل کر کے وہ باہر صحن میں آئی تھی۔

''رنگ مل گئے ہیں؟'' اس نے ملازمہ سے پوچھا تھا۔

''جی بی بی...... وہاں طاقچے میں رکھے ہیں۔اور صحن کو بھی دھلوا دیا تھا۔اب خشک ہو چکا ہے۔''

''اندر سے ایک پرات اور چھوٹی بڑی ہر طرح کی تھالی لے آئیں اور حاجی بوا کو کہیں کہ چاند انہیں باہر بلا رہی ہے۔''

''جی اچھا......'' ملازمہ اندر چلی گئی تھی اور وہ رنگوں کو دیکھنے لگی تھی۔

ملازم لڑکا نجانے کہاں سے ڈھیر سارے اور طرح طرح کے رنگ لے آیا تھا۔ایسے رنگ تو اس نے دہلی میں بھی نہیں دیکھے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ہی ملازمہ چھوٹی بڑی ہر طرح کی تھالی، کٹوری اور پرات پکڑے وہاں آئی تھی۔ساتھ ہی حاجی بوا بھی تھیں۔

''حاجی بوا! میری مدد کریں ناں...... پہلی بار بنا رہی ہوں۔اچھی نہ بنی تو فائدہ...... التمش تو ساری زندگی مجھے بدسلیقہ ہونے کے طعنے دے گا۔''

''ٹھہرو...... مجھے کچھ کچھ آتی ہے۔اس بڑی پرات کو درمیان میں رکھ دو۔''

حاجی بوا نے بڑی پرات کو صحن کے درمیان میں رکھ دیا تھا۔پھر اس کے کناروں پر بڑی تھالیوں کو رکھا تھا۔بڑی تھالیوں کے دائرے کے اوپر چھوٹی تھالیاں، پھر اس سے چھوٹی تھالیاں اور پھر آخری دائرے میں کٹوریاں...... پھر ان سب پر سیاہ رنگ ڈال دیا گیا تھا۔اس کے بعد ساری تھالیوں اور

کٹوریوں کو ہٹا دیا تھا۔ نیچے ایک خوب صورت سا جال بچھا ہوا تھا۔

''اب ان سب میں مختلف رنگ بھر دو......''

دونوں نے مل کر سارے خانوں میں مختلف رنگ بھرے تھے۔ سرخ، پیلا، نارنجی، نیلا اور سفید...... حاجی بوا نے کمال مہارت سے چھوٹی چھوٹی پتیاں بھی بنائی تھیں اور پھول بھی...... سفید رنگ سے نقطے بھی ڈالے تھے۔ اس سارے کام میں ایک پہر نکل گیا تھا۔ جب رنگولی بن گئی تو چاند نے کھڑے ہو کر اسے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں رشک ہی رشک تھا۔

''التمش کو یہ پسند آئے گی ناں......''

''کیوں نہیں...... تم شادی کے بعد جب پہلی بار آؤ گی ناں تو پھر میں مور والی رنگولی بناؤں گی۔'' حاجی بوا نے کہا تھا۔ چاند شرما کر رسوئی گھر میں چلی گئی تھی۔

اندر رسوئی میں مختلف کھانے پک رہے تھے۔ قورمہ تھا، حیدر آبادی بریانی تھی۔ دم کباب، بخارا پلاؤ، کشمیری گوشتابہ، تافتان، اور میٹھے میں کھیر، سمرقندی حلوہ اور شیر خورمہ...... جو کہ التمش کو بہت پسند تھا۔

''کیا سب چیزیں تیار ہیں؟''

''مسالے والے کھانے تو تیار ہیں بی بی...... میٹھا بھی تیار ہے۔ بریانی اور پلاؤ کو کھانے سے پہلے دم پر لگایا جائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ دہی میں زیرہ ڈال دیجیے گا۔ اور یاد سے...... زیرے کو پہلے توے پر بھون لیجیے گا۔''

''جی بہتر......!'

''اور سلاد کے لیے ٹماٹر پیلے یا ہرے والے نہ ہوں۔ التمش کو سخت چڑ ہوتی ہے۔''

''جی اچھا......!''

''شربت میں شہد ڈالنا ہے۔ گڑ یا شکر نہیں۔''

''جیسا آپ کہیں......!''

''کیا بات ہے۔ ابھی تو التمش کے گھر نہیں گئیں اور اس کی ساری پسند ناپسند کا علم ہے تمہیں۔'' تہمینہ پھوپھو نجانے کب وہاں چلی آئی تھیں۔ انہوں نے چاند کی ہدایات سن لی تھیں اور اب اسے چھیڑ رہی تھیں۔

''آپ بھی ناں تہمینہ پھوپھو...... حاجی بوا کی طرح بہت تنگ کرتی ہیں مجھے......'' شرما کر ہنس کر کہتی ہوئی وہ رسوئی گھر سے باہر نکل کر صحن میں آئی تو دھک سے رہ گئی۔ کسی نے جیسے اس پر کھولتا ہوا پانی ڈال دیا تھا۔

چند لمحے پہلے صحن کے وسط میں بنائی گئی رنگولی ساری کی ساری برباد ہوئی پڑی تھی۔ رنگ ایک دوسرے کے اوپر چڑھے ہوئے تھے۔ دائرے، پھول، پتیاں، نقطے سب ایک دوسرے میں مدغم ہو چکے تھے۔ سب نادانستگی میں نہیں ہوا تھا بلکہ کسی نے جیسے اسے پاؤں سے ٹھوکریں مار مار کر خراب کیا تھا اور اب سارے رنگ آپس میں ملے ہوئے عجیب گدلے سے دکھ رہے تھے۔

''یہ...... یہ کس نے کیا ہے؟'' دکھ، غصہ اور حیرت کے باعث چاند کی آواز ہی تو نہیں نکل پا رہی تھی۔

''وہ...... رحبا......'' ملازمہ رحبان کا نام لیتے لیتے رکی تھی۔ ''پتا نہیں جی...... میں اندر تھی۔ باہر آئی تو دیکھا کہ اسے کوئی خراب کر چکا تھا۔''

چاند کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ ساری محنت اور احتیاط اکارت گئی تھی۔ محبت سے بنائی گئی رنگولی چولہے کی راکھ جیسا منظر پیش کر رہی تھی۔ ملازمہ کے نام نہ بتانے سے کچھ چھپا نہیں رہنے والا تھا۔ وہ بے ترتیب رنگوں کے جال پر رحبان کی جوتیوں کے نشانات دیکھ چکی تھی۔

''اب کیا کروں جی اس صحن کا......؟''

''اسے دھلوا دیں۔'' اس نے کہا تھا اور پھر تیزی سے رحبان کے کمرے کی طرف گئی تھی۔

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کا غصہ انتہا کو چھونے لگا تھا۔

''سمجھتا کیا ہے یہ خود کو...... آج میں اس کی اچھے سے خبر لیتی ہوں۔''

رحبان اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھا سامنے پڑی میز پر پاؤں دھرے دراز تھا۔ اس کا ایک پاؤں دوسرے کے اوپر تھا۔ جوتیاں پاؤں میں تھیں اور ان جوتیوں پر نیچے صحن کی برباد ہو چکی رنگولی کے سارے رنگ چڑھے ہوئے تھے۔ اس نے رنگوں کو چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بہت چھپا لی گئی تھیں باتیں...... اب بس، بہت ہوا۔ وہ تنگ آ چکا تھا اس چھپن چھپائی کے کھیل سے......

چاند بے انتہا غصے کی حالت میں رحبان کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ وہ اس پر سخت ترین لفظوں میں بولنا چاہتی تھی۔ تنبیہی انداز میں اس کی سرزنش کرنا چاہتی تھی لیکن کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کے ہونٹ جیسے جامد ہو گئے تھے اور آواز پتھر ہو چکی تھی۔ اس کی نظر رحبان کی جوتیوں پر پڑی تھی جہاں رنگولی کے رنگ نظر آ رہے تھے۔ ٹھوکریں مارنے کے باعث جوتی سے اس کے پاؤں اور سفید شلوار کے پائنچوں پر بھی چڑھے ہوئے تھے۔ ایک اجڑی دھنک رحبان کی سفید شلوار پر بے ترتیبی سے اتری ہوئی تھی۔

اس نے اپنے عمل کو چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اسی بات نے چاند کو سہا کر رکھ دیا تھا۔

ساکت و جامد رحبان اپنے سامنے کی دیوار کو گھور رہا تھا۔ اس نے جیسے جان لیا تھا کہ چاند وہاں آ چکی ہے۔ اسے اسی کی آمد کا تو انتظار تھا۔ اس نے چاند کو اپنی جوتیوں کی طرف دیکھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ پھر دونوں کی نظریں ملی تھیں۔ رحبان کی آنکھوں میں بغاوت تھی۔ چاند اس ایک نظر میں ہی سمجھ گئی تھی کہ گھر کا وہ لڑکا جو کبھی ملازم ہوا کرتا تھا، اب بڑا ہو چکا ہے۔ اور قدرے نڈر بھی...... وہ اس سے اس طرح بات نہیں کر سکتی جیسے وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے سوچ کر آئی تھی۔ اسے احتیاط سے کام لینے کی ضرورت تھی۔

''رحبان!'' اس نے کسی حد تک نرم آواز میں اس کو پکارا تھا۔ ''یہ کیا حرکت تھی؟ تم نے رنگولی کیوں خراب کی؟''

اسے رنگولی کے خراب ہونے سے زیادہ ''کیوں'' کا جواب درکار تھا۔

''کیوں...... تمہیں برا لگا؟'' رحبان نے دانت پیستے ہوئے غصے سے چاند کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

اس کے دیکھنے میں طنز ہی طنز تھا......

بات میں زہر ہی زہر......

لہجے میں کوڑ ہی کوڑ......

''ہاں...... برا تو لگا۔ تم مجھ سے کسی بات پر ناراض تھے تو مجھ سے بدلہ لیتے......لیکن وہ تو التمش کے لیے تھی۔''

''التمش......التمش......التمش......'' جھٹکے سے وہ کرسی سے اٹھا تھا اور غصے سے پھنکارتے ہوئے اس نے التمش کا نام لیا تھا۔ چاند نے حیرت سے رحبان کو دیکھا تھا۔

''تمہیں التمش کے نام سے کب سے چڑ ہونے لگی؟''

''تمہیں کس نے کہا کہ مجھے التمش کے نام سے چڑ ہے؟''

''پھر......؟''

''اس کی ذات سے ہے۔''

''لیکن کیوں......؟ کیا کہا ہے اس نے تم سے......؟''

''اس نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہو رحبان......؟'' وہ کچھ بھی تو نہیں سمجھی تھی۔

''اس نے مجھ سے تمہیں چھین لیا ہے۔ اس کی وجہ سے تم مجھے نظر انداز کر رہی ہو۔''

''یہ تم سے کس نے کہا؟''

''تمہیں اس کے علاوہ کوئی اور نظر ہی نہیں آتا۔'' رحبان نے چاند کو کندھوں سے پکڑا تھا۔''اپنے سامنے کی چیز بھی نہیں...... میں بھی نہیں۔''

رحبان کی بات پر چاند ایک قدم پیچھے ہوئی تھی۔ لیکن زیادہ نہیں ہو سکی تھی۔ رحبان نے اسے کندھوں سے مضبوطی سے تھاما ہوا تھا۔

''یہ...... یہ تم کیا کہتے جا رہے ہو رحبان......؟''

''تم سے محبت کرتا ہوں چاند...... بہت زیادہ......'' رحبان نے جذب سے کہا تھا۔

وہ جو تھوڑی دیر پہلے غصے سے بھرا بیٹھا تھا اب اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ بے چارہ لڑکا...... جتنا مرضی بہادر رہو۔ بے چارگی سے محبت کا اعتراف کرتے وقت اس کی آنکھوں میں آنسو کیوں بھر آتے ہیں۔ رحبان کو دیکھتے ہوئے چاند کی آنکھیں بھی بھر آئی تھیں۔

رحبان کی بات اس کے لیے کچھ زیادہ انوکھی نہیں تھی۔ پچھلے کافی دنوں سے جڑتے اس کے بہت سے شک اب یقین میں بدل چکے تھے۔

''پتا نہیں کب سے...... لیکن شاید تب سے جب سے تمہیں دیکھا ہے۔ تمہارا چہرہ ہمیشہ میری آنکھوں میں بسا رہا چاند......! میرے خوابوں میں، میری نیند میں، میرے ہوش میں...... میں نے خود کو بہت روکا، خود کو بہت سمجھایا کہ اپنی اوقات سے بڑھ کر کی طلب نہ کروں، لیکن دل پر اختیار نہیں ہوتا چاند...... تم سمجھ سکتی ہو۔ دلوں پر کبھی بھی اختیار نہیں ہوتا...... ورنہ غم ہی کیا ہے۔'' رحبان بولتا جا رہا تھا اور چاند آنسو بھری آنکھیں اور اداس چہرہ لیے اسے سنتی جا رہی تھی۔

''میں نے کبھی تمہیں غلط نظروں سے نہیں دیکھا، لیکن محبت سے نہ دیکھوں، میں ایسا بھی نہیں کر سکا ہوں۔ تمہاری ہنسی سے میری سانسیں چلتی ہیں۔ تمہاری مسکراہٹ میرے دل کی دھڑکنیں بڑھا دیتی ہے۔ تمہاری آواز......''

"بس کر دو رحبان...... خدا کے لیے بس کر دو۔" اس نے منت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ چہرے کا رخ بدل لیا تھا۔ اس کے آنسو جھلک آئے تھے۔

"بہت مشکل سے بولا ہوں میں چاند...... مت روکو مجھے......"

"اب بولنے کا کوئی فائدہ نہیں رحبان...... میں بچپن سے التمش کی امانت ہوں۔ تم جانتے ہو۔ تم نے جان بوجھ کر لا حاصل کی خواہش کی......"

"ہاں...... جانتا ہوں۔ تم بچپن سے اس کی امانت ہو۔ اس سے محبت کرتی ہو۔ اس کی ایک پرانی تصویر کو دیکھ کر...... اور اس کے لکھے ہوئے خطوں کو پڑھ پڑھ کر......" وہ طنزیہ سے انداز میں بولا تھا۔

"محبت میں دل پر اختیار نہیں ہوتا...... تم نے خود ہی تو کہا۔"

"تم ایک سالوں پہلے دیکھے ہوئے شخص سے محبت کرتی ہو اور اپنے سامنے کے لوگوں کو نظر انداز کرتی ہو۔"

"مجھے تو اس خواب سے بھی محبت ہو جاتی ہے جس میں وہ نظر آ جائے۔" چاند نے کہا تھا۔ رحبان غصہ بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا تھا۔

"تمہارے لیے یہ ہی بہتر ہے کہ تم مجھے بھول جاؤ رحبان......"

"اور اگر میں یہ کہوں کہ تم التمش کو فراموش کر دو تو......"

"یہ میرے لیے ناممکن ہے۔"

"پھر تمہیں بھول جانا میرے لیے بھی ناممکن ہے۔" اس نے ضدی پن سے کہا تھا۔ "تو پھر ٹھیک ہے۔ دونوں ممکن کام کیے جاتے ہیں۔ تم التمش سے محبت کیے جاؤ اور میں تم سے کیے جاتا ہوں۔"

رحبان کے بات ختم کرنے والے انداز پر وہ چند لمحے جھکی آنکھوں سے اس کے جوتے پر چڑھے رنگوں کو دیکھتی رہی تھی، پھر آہستگی سے کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ چاند کے جاتے ہی رحبان نے ضبط

سے آنکھیں بند کی تھیں۔اس کے رکے ہوئے آنسو جاری ہوئے تھے۔

محبت کا اعتراف کرتے ہوئے محبوبہ کے سامنے رونا اسے بہت بڑی نامردانگی لگتی تھی، ورنہ وہ چاند کے سامنے ہی پھوٹ کر رونے لگ پڑتا......

دور میدانی علاقوں سے بادلوں کے قافلے اڑتے ہوئے حویلیاں شہر میں داخل ہونے لگے تھے۔ ان بادلوں میں بارشوں کا طوفان تھا، بجلی کی کڑک، خوف زدہ کردینے والی گھن گرج، اندھا کردینے والی لشک، اور بہرہ کردینے والی آندھیاں......

تیز ہوا نے اس سب کی نوید سناتے ہوئے فضا میں بانسری کی آواز چھیڑ دی تھی۔

اداس اور رلا دینے والی بانسری کی آواز......

☆......☆......☆

بڑے کمرے میں چاند اور رحبان کے علاوہ باقی سب ہی موجود تھے۔حویلی کا ہونے والا داماد ان کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ایک خوش شکل اور خوش مزاج نوجوان...... جو دھیمے انداز میں بات کر رہا تھا اور مدھم انداز میں مسکرا رہا تھا۔اسے دیکھ کر اس پر بے تحاشا ہی پیار آتا جا رہا تھا۔دین بابا اس سے بات کرتے ہوئے مسلسل مسکرا رہے تھے۔ان کی لاڈلی بیٹی کا ہونے والا شوہر نہ صرف حسین ترین تھا بلکہ لڑکیوں کی طرح معصوم بھی تھا۔

التمش نے قدرے تنگ پتلون پہنی ہوئی تھی جو پائنچوں سے کسی حد تک کھلی تھی۔سیاہ پینٹ پر سفید شرٹ اور اس کے اوپر موٹے کپڑے کا کوٹ...... جو اس پر بہت بھلا لگ رہا تھا۔اس کے ایک ہاتھ میں سنہری گھڑی تھی اور اسی ہاتھ میں منگنی کی انگوٹھی......اپنے بھاری اور وزنی جوتوں کو اس نے دہلیز کے باہر ہی اتار دیا تھا، کیونکہ سارے کمرے میں قالین اور چاندنیاں بچھی ہوئی تھیں۔قالین نہ بھی بچھے ہوتے تو یہ بات خلافِ تہذیب تھی کہ جوتے لے کر کمروں میں داخل ہوا جائے۔

التمش کے بالوں کی تراش خراش جدید تھی اور اس کے چہرے پر سارے بال صاف کیے گئے تھے۔ نہ اس نے داڑھی رکھی ہوئی تھی اور نہ مونچھیں...... جس پر بابا کو گمان ہوا کہ لندن اس پر کافی اثر انداز ہوا ہے۔ اس کا لہجہ بھی قدرے اجنبی ہو چکا تھا۔ جیسے اردو سے اس کی شناسائی رہی ہی نہ ہو۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ یہاں کے رسم و رواج، طور طریقے بھول گیا تھا۔ بلکہ جیسے وہ وہاں سے یہاں کے رواجوں کے لیے زیادہ پاسداری سیکھ کر آیا تھا۔ بابا سے بات کرتے ہوئے اس کی نگاہیں نیچی تھیں اور وہ قالین پر پڑی پھلوں اور خشک میوؤں کی ان ٹوکریوں کو دیکھ رہا تھا جنہیں وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ ٹوکریوں کے ساتھ بہت سے تحائف بھی پڑے ہوئے تھے جو حویلی کے ہر فرد کے لیے تھے۔

''اس سب کی کیا ضرورت تھی بیٹا......؟''

''اتنے عرصے کے بعد آ رہا تھا۔ امی نے کہا کہ خالی ہاتھ نہیں جانا۔''

''بہت بہت شکریہ اس سب کا التمش......'' تہمینہ پھوپھو نے کہا تھا۔ ''یقیناً ان تحائف میں سے بہت سے صرف چاند کے لیے ہوں گے۔'' انہوں نے التمش کو چھیڑا تھا۔

وہ جو پہلے سے شرمایا شرمایا سا بیٹھا تھا، اس بات پر تو اس نے سر کو بالکل ہی جھکا لیا تھا۔ اس کے گال کشمیری سیب کی طرح سرخ ہو گئے تھے۔

''لندن کی آب و ہوا کیسی ہے؟'' بابا نے اس کی خفت مٹانے کی غرض سے موضوع بدلا تھا۔

''اچھی ہے بابا...... قدرے سرد...... لیکن خنک نہیں۔''

''کیا تمہارا شادی کے بعد لندن جانے کا ارادہ ہے؟''

''نہیں...... لیکن اگر چاند چاہے تو......''

چاند کا نام لبوں پر آتے ہی ایک بار پھر سے التمش کی مسکراہٹ شرماہٹ میں بدل گئی تھی۔ بابا مسکرانے لگے تھے۔ تب ہی حاجی بوا طشتری میں سرخ شربت سے بھرے کانچ کے گلاس رکھے کمرے

میں داخل ہوئی تھیں۔

''چاند کہاں ہے؟'' بابا نے فوراً سے پوچھا تھا۔

''وہ اپنے کمرے میں ہے۔''

''چاند سے کہیں کہ وہ خود التمش کو شربت پیش کرے۔''

''جی اچھا......'' حاجی بوا جیسے داخل ہوئی تھیں ویسے ہی الٹے قدموں باہر چلی گئیں۔

دین بابا کی بات پر التمش نے سکون کا سانس لیا تھا۔ کب سے اس کی نظریں چاند کو ہی کھوج رہی تھیں۔ جس کے دیدار کے لیے وہ یہاں آیا تھا، وہ ہی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کی بے چینی فطری تھی۔ بابا التمش کی بے چینی اور کھوجتی نظروں کو تاڑ چکے تھے۔ تب ہی انہوں نے حاجی بوا سے چاند کو لانے کی بات کی تھی۔

حاجی بوا شربت کے گلاسوں والی طشتری سمیت ہی چاند کے کمرے میں آئی تھیں۔

''کہاں ہو چاند...... تیار نہیں ہوئیں کیا ابھی تک......؟''

''آپ یہ شربت یہاں کیوں لے آئیں؟''

''تمہارے بابا نے کہا ہے کہ یہ تم خود التمش کو پیش کرو۔''

''اچھا...... میں بس نیچے آنے ہی والی تھی۔ آپ ایسا کریں کہ صندل کے کپڑے تبدیل کر کے اسے تیار کر دیں۔ التمش نے آج پہلی بار صندل کو دیکھنا ہے۔''

''وہ تو ایسے شرما رہا ہے جیسے اس نے تمہیں بھی آج پہلی بار ہی دیکھنا ہے۔'' حاجی بوا نے شوخی سے کہا تھا۔ جواباً چاند پھیکا سا مسکرا دی تھی۔ کچھ بناوٹی سے انداز میں...... دل سے تو اس سے مسکرایا جا ہی نہیں رہا تھا۔ رحبان سے ہوئی بات چیت نے اس کا موڈ خراب کر دیا تھا۔ صبح سے ایک بے چینی تھی جو جانے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ التمش کی آمد کی خوشی کو رحبان کی باتوں نے غارت کر دیا تھا۔

اسے پتا ہی نہیں چلا کہ رحبان کب اس سے محبت کرنے لگا۔ وہ بھی اتنی شدت سے...... پتا چل بھی جاتا تو وہ کیا کر سکتی تھی۔ یہ کوئی دریائی طوفان نہیں تھا جس پر وہ کوئی بند باندھ سکتی...... یہ تو محبت کا نوح تھا۔ اس نے سب برباد کر کے ہی رہنا تھا۔

وہ تیار ہوئی تھی۔ اس نے التمش کی پسند کے رنگ والا ہی لباس پہنا تھا جس کے وسیع دامن اور دوپٹے کے کناروں پر اس نے پورے دو دن لگا کر کرن لگائی تھی۔ چاندی کے جھمکے پہنے تھے۔ گلے میں چاندی کی زنجیر ڈالی تھی۔ بالوں کو بھی اس نے اسی طرح بنایا تھا جیسا اس نے سوچ رکھا تھا۔ گالوں پر غازہ لگایا تھا۔ آنکھوں میں کاجل، ہونٹوں پر ہلکا سا رنگ دیا ہوا مکھن...... لیکن یہ سب اس نے بے دلی سے کیا تھا۔ کسی بھی چیز میں اسے کوئی چاہت نہ رہ گئی تھی۔ وہ بت بنی آئینے میں نظر آتے اپنے عکس سے نظریں چراتے ہوئے پیچھے پلنگ پر بیٹھی بوا کو صندل کے کپڑے تبدیل کرواتے منظر کو دیکھ رہی تھی۔

"جلدی کرو چاند...... پہلے ہی کافی دیر ہو چکی ہے۔"

"کمرے میں کون کون ہے؟"

"سب ہی ہیں۔ تہمینہ، شکیلہ، زہرہ، ان کی بیٹیاں...... دین بابا...... اور بستام......"

"اور رحبان......؟" اس نے بات کو سرسری رنگ دیتے ہوئے پوچھا تھا۔

"سچ رحبان تو نہیں ہے وہاں پر......" چاند کے پوچھنے پر جیسے حاجی بوا کو بھی رحبان کا خیال آیا تھا۔

"کہاں ہے وہ......؟" چاند پریشان ہوئی تھی۔

"پتا نہیں...... کمرے میں بھی نہیں ہے۔ میں نے ابھی آتے وقت دیکھا۔ کمرا باہر سے بند تھا۔ شاید کہیں باہر گیا ہو۔"

چاند دوپٹا درست کرتی اٹھی تھی۔

"اچھا...... میں جا رہی ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ صندل کو بھی لے آیئے گا۔"

"اچھا......!"

ساری ہمتیں مجتمع کر کے وہ شربت کے گلاسوں والی طشتری پکڑے کمرے سے باہر نکلی تھی۔ التمش ایک عرصے بعد واپس آیا تھا۔ ایک سچی مسکراہٹ اس کا حق تھی۔ اور یہ سچی مسکراہٹ ہی چہرے پر سجانا چاند کے لیے مشکل ترین ثابت ہو رہا تھا۔

☆......☆......☆

سیب کے درخت زیادہ بڑے نہیں ہوتے......سروں سے ذرا ہی اونچے ہوتے ہیں۔ پھر باغوں کے مالی سیب کے درختوں کی ایسے تراش خراش کرتے ہیں کہ انہیں اونچا کرنے کے بجائے دائیں بائیں سے بڑھا دیتے ہیں تاکہ جب ان پر پھل آئے تو اتارنے میں آسانی رہے۔ اور پھر جب ان پر پھل آتا ہے تو وہ کسی بیل گاڑی کی طرح خوب لدے ہوئے دکھتے ہیں۔

حویلی کے پچھلے باغ میں بھی پھل آ چکے تھے۔ سبز پتوں والے درختوں پر سرخ سیب......درخت تو پتوں سے پہلے ہی بھرے ہوئے تھے۔ اب جو پھل آئے تو چھوٹی بڑی ساری شاخیں ہی چھپ گئی تھیں۔ شام ہونے سے بہت پہلے ہی وہاں شام اتری ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

دونوں درختوں کے درمیان بنی روش پر چل رہے تھے۔ بابا نے دونوں کو بہانے سے پچھلے باغ میں بھیج دیا تھا کیونکہ سلام کرنے کے علاوہ دونوں سب کے سامنے کوئی بات چیت نہیں کر رہے تھے۔ بس چور نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے شرماتے جا رہے تھے۔ زہرہ پھوپھو نے بابا کی توجہ اس جانب دلائی تو بابا نے چاند سے کہا تھا کہ وہ التمش کو حویلی کے پیچھے والا باغ دکھلائے۔ جو انہوں نے کچھ عرصہ قبل ہی خریدا تھا۔

بابا کی ہدایت پر چاند التمش کو لے کر باغ میں چلی آئی تھی لیکن دونوں یہاں بھی خاموش تھے۔ چاند سے زیادہ تو التمش شرما رہا تھا۔ وہ صرف چار سال بعد مل رہا تھا چاند سے......لیکن وہ ایسے مسکراتا جا

رہا تھا جیسے زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی سے مل رہا ہو۔ کافی دیر تو دونوں کو بات کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ یہ احساس ہی کافی تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔

''ان درختوں کی دیکھ بھال کون کرتا ہے؟'' بالآخر التمش نے بات شروع کی تھی۔

''مالی بابا کرتے ہیں۔ میں بھی کبھی مالی بابا کے ساتھ یہاں کام کرنے آجاتی ہوں۔''

''تم نے بتایا نہیں کہ تمہیں باغبانی کا شوق ہونے لگا ہے۔ میں وہاں سے تمہارے لیے بون سائی لاتا......''

''وہ کیا ہوتا ہے؟''

''ایک چھوٹا درخت...... بہت چھوٹا...... ہاتھ میں پکڑ لیے جانے والا درخت......''

''لیکن درخت تو بڑے ہی اچھے لگتے ہیں۔''

''بڑے درختوں سے تمہیں ڈر نہیں لگتا......؟''

''ڈر کس بات کا......؟''

''سنا ہے لڑکیاں ہر اس چیز سے ڈرتی ہیں جو قد میں ان سے بڑی ہوتی ہے۔''

التمش کی بات پر چاند بے اختیار ہو کر ہنسی تھی۔

''تمہیں جھوٹ لگ رہی ہے یہ بات......؟'' وہ رک کر اسے دیکھنے لگا تھا۔

''نہیں...... کچھ کچھ حقیقت لگ تو رہی ہے، لیکن میں درختوں سے نہیں ڈرتی......''

''پھر تو تمہیں پودوں سے بھی پیار ہو گا اور...... پھولوں سے بھی......'' وہ ایک قدم چاند کے قریب ہوا تھا۔

چاند خاموش ہو گئی تھی۔ اس نے پھولوں کا ذکر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کیا تھا۔

''پھول کس کو پسند نہیں ہوتے۔''

''ٹھیک کہا تم نے......تب ہی تو مجھے تم پسند ہو۔'' وہ جذب سے بولا تھا۔ چاند دائیں بائیں دیکھنے لگی تھی۔ شاید اوپر نیچے......اور التمش مسلسل اسے دیکھتا جا رہا تھا۔

''لندن کیسا تھا؟'' اس نے بات بدلتے ہوئے کہا تھا۔ التمش مسکرایا تھا۔ وہ چاند کی چالاکیاں سمجھ گیا تھا۔ اور پھر سے آگے کی طرف قدم لینے لگا تھا۔

''جب چھوڑا تھا تب تو ٹھیک تھا۔''

''چھوڑ دینے کے بعد ہی تو چیزیں تبدیل ہوتی ہیں۔'' چاند کی بات پر التمش پھر سے پلٹا تھا۔

''اتنی تلخ بات تم نے کیسے سوچی چاند......؟''

''ہجرت کے وقت کی مصیبتوں میں تم بھی یہاں ہوتے تو ایسی باتیں بات بے بات کہتے۔''

''تمہیں مجھ سے شکوہ ہے کہ تب میں یہاں نہیں تھا۔''

''نہیں......ایسا کچھ نہیں ہے۔ لیکن شاید......تب تم ہمارے ساتھ ہوتے تو مجھے خوشی ہوتی۔''

''اب ساری زندگی کے لیے تمہارے ساتھ ہوں چاند......'' اس نے اسے کندھے سے پکڑ کر یقین دہانی کروائی تھی اور صبح سے اب تک کے دن میں چاند پہلی بار دل سے مسکرا دی تھی۔

''اوہ......ایک بات تو بھول ہی گیا۔''

''کیا......؟'' چاند نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ التمش نے اپنی پینٹ کی جیب سے ایک انگوٹھی نکالی تھی۔

''یہ میں تمہارے لیے لایا ہوں۔''

''اگر یہ میرے لیے لی تھی تو پھر ان تحفوں کے ساتھ ہی رکھ دیتے جو اندر پڑے ہوئے ہیں۔''

''وہاں کیسے رکھ دیتا......اسے تو میں خود تمہیں پہنانا چاہتا ہوں۔'' التمش نے محبت سے چاند کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

چاند شرما کر خاموش ہوگئی تھی۔ التمش خود ہی اس کے قریب ہوتا چلا گیا تھا۔ آہستگی سے چاند کا ہاتھ تھام کر اس نے گرفت مضبوط کرلی تھی مبادا چاند کہیں شرما کے ہاتھ چھڑوا لے...... لیکن چاند کیسے اپنا ہاتھ چھڑواتی۔ وہ تو بت بنی التمش کو دیکھے جا رہی تھی۔ چار سالوں میں وہ کتنا بدل گیا تھا۔ اس کی بھنوئیں کس قدر سیاہ ہو چکی تھیں۔ اس کی آنکھیں کس قدر روشن تھیں۔ چاند کی نظریں اس کی ناک، ہونٹ سے اس کی گردن تک آتے ہوئے سینے پر آ کر رکی تھیں، جہاں سفید شرٹ میں سے اس کے سیاہ بال جھانک رہے تھے۔

سیبوں کی خوشبو اتنی بڑھ چکی تھی کہ لگتا تھا کہ فضا چیر کر چاند تک جا پہنچے گی۔ مضبوطی سے چاند کا ہاتھ تھامے ہوئے التمش اسے انگوٹھی پہنانے ہی والا تھا کہ دُور کہیں درختوں میں بھرپور سرسراہٹ ہوئی تھی۔ جیسے کوئی انہیں چھپ کر دیکھ رہا ہو، اور اب پکڑے جانے کے ڈر کی وجہ سے وہاں سے بھاگ گیا ہو۔

''کون ہے......؟'' التمش نے بلند آواز سے پوچھا تھا۔

''کون ہے وہاں......؟''

اب بھی کوئی جواب نہیں آیا تھا۔

''گلہری ہوگی یا شاید بلی......'' چاند نے کہا تھا۔

''ہاں شاید......'' التمش نے اتفاق کیا تھا۔

''اب واپس چلتے ہیں۔'' چاند نے کہتے ساتھ ہی واپسی کے لیے قدم اٹھائے تھے۔ مجبوراً التمش کو بھی واپس ہونا پڑا تھا۔ انگوٹھی پہنانے والا کام خود بخود ہی مؤخر ہو گیا تھا۔

چاند کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ ایک بار پھر سے رخصت ہو چکی تھی۔ اس نے ''گلہری یا بلی'' کا کہہ کر التمش کو تو مطمئن کر دیا تھا لیکن خود پریشان ہوگئی تھی۔ چاند نے رحبان کو دیکھ لیا تھا۔ جو درختوں کی آڑ میں چھپ کر بیٹھا دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

''کیا ہو گیا ہے تجھے رحبان......تو ایسا تو نہیں تھا۔ کیا ہو گیا ہے تجھے......''

مردہ چہرے کے ساتھ وہ حویلی واپس آئی تھی۔

☆......☆......☆

باغ سے سیدھا رحبان اپنے کمرے میں آیا تھا۔ غصے سے اس کا چہرہ تپا ہوا تھا۔ التمش کا چاند کو انگوٹھی پہنانے کا منظر جیسے اس کی آنکھوں میں گڑ گیا تھا۔ چاند کا شرمانا، التمش کا اس کے قریب ہونا، چاند کے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لینا، دونوں کا ایک دوسرے کو دیکھنا......منظر کمرے کے در و دیوار میں ہر طرف نظر آ رہا تھا۔ کھڑکی کے شیشے میں، دروازے کے پردے میں......رحبان نے سختی سے آنکھیں بند کر لیں لیکن اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کھلی اور بند آنکھوں میں جیسے یہ ہی منظر مرتسم ہو کر رہ گیا تھا۔

''غلطی میری ہے۔ زمین پر رہتے ہوئے مجھے چاند کی خواہش ہی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ چاند بھی وہ جو کسی اور دھرتی کا مرکز تھا۔'' ہار مانتے ہوئے رحبان نے اپنی غلطی تو شاید تسلیم کر لی تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ اس سے پیچھے نہیں ہٹا جا رہا تھا۔ وہ بے چینی سے کمرے کے چکر لگانے لگا تھا۔

''چاند میری نہیں ہو سکتی۔ اور اسے میں کسی اور کا ہوتا دیکھ نہیں سکتا......تو پھر میرے لیے بہتر ہے کہ......'' فیصلہ کر لینے کے بعد وہ کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

☆......☆......☆

بڑے کمرے میں تہمینہ، شکیلہ اور زہرہ پھوپھو بہت سے صندوق کھولے بیٹھی تھیں۔ ہر طرف کپڑے ہی کپڑے، زیورات اور پرانے ظروف بکھرے ہوئے تھے۔

''التمش چلا گیا ہے؟'' التمش کو الوداع کرنے کے بعد چاند کمرے میں داخل ہوئی تو بابا نے اس سے پوچھا تھا۔

''جی بابا......'' جواب دیتے ہوئے چاند نے کمرے میں بکھرے سامان کو اچنبھے سے دیکھا تھا۔

"یہ سب کیا ہے۔امی کی چیزیں کیوں نکالی گئی ہیں؟"

"کیونکہ اب ان کو استعمال کرنے کا وقت آ گیا ہے۔" زہرہ پھوپھو نے شوخ انداز میں کہا تھا۔

چاندان کی بات نہیں سمجھی تھی۔

"تمہاری شادی کی بات کی جا رہی ہے چاند......" شکیلہ پھوپھو نے اسے بتایا تھا۔ چاند کے چہرے پر بے اختیار ہی شرماہٹ وارد ہوئی تھی۔ بابا اسے دیکھ کر مسکرانے لگے تھے۔

"اب بیٹھو ادھر......اور بتاؤ کہ اس میں سے کون سے جوڑے تمہارے لیے رکھنے ہیں اور کون سے بستام کی دلہن کو دینے ہیں۔"

"آپ سب بستام کی دلہن کے لیے رکھ دیں پھوپھو!"

"کیوں بیٹی......تمہیں اس میں سے کچھ پسند نہیں کیا؟"

"سب پسند ہے بابا......لیکن مجھے ان چیزوں کی چاہت نہیں ہے۔"

"تمہاری ماں نے یہ سب تمہارے لیے بہت چاہت سے اکٹھا کیا ہے۔"

"جانتی ہوں بابا......"

"جانتی ہو تو پھر تم بھی چاہت سے اس سب کو استعمال کرو......اس کی روح خوش ہوگی۔"

بابا کی بات کی تائید کرتے ہوئے وہ نیچے بیٹھ گئی تھی اور کپڑے، زیورات اور ظروف دیکھنے لگی تھی۔ جو کہ امی مرنے سے پہلے لاتعداد حساب میں اس کے لیے جوڑ کر گئی تھیں۔ ان برتنوں میں سے بہت سے برتن تو امی کے اپنے جہیز کے ہی تھے جو انہوں نے استعمال نہیں کیے تھے۔ شادی کے ایک سال بعد چاند کی پیدائش کے بعد انہوں نے کافی کچھ تو چاند کے لیے ہی رکھ دیا تھا۔

"تم ان برتنوں میں سے چھانٹی کرنا بند کرو چاند...... یہ تو سب تمہارے ساتھ ہی جائے گا۔ ظاہر ہے یہ اب بستام کی بری میں تو لگانے سے رہے۔" تہمینہ پھوپھو نے کہا تو سب ہی ہنسنے لگے تھے۔

''تم زیورات اور کپڑوں کو دیکھو...... جو جو پسند ہے اسے الگ کرتی جاؤ۔''

سب سے رخ موڑ کر چاند خاموشی سے ایسا ہی کرنے لگی تھی۔ اس نے ''جی اچھا'' بھی نہیں کہا تھا کیونکہ مرحوم ماں سے منسوب چیزوں کو دیکھتے ہوئے وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی رندھی ہوئی آواز بابا یا کوئی اور سنتا...... چپ بیٹھی وہ کپڑوں اور زیورات کو دیکھتی جا رہی تھی اور ماں کی یاد کے آنسو آنکھوں میں اندر والے حصے میں اتارتی جا رہی تھی۔ باقی سب ہنسی خوشی شادی کی باتوں میں مصروف تھے۔

''ہم بہنوں کے لیے تو آپ بنارس سے کپڑا منگوایئے گا بھائی صاحب...... میں اس پر سنہری تلے کا کام کرواؤں گی۔'' تہمینہ پھوپھو نے کہا تھا۔

''ہاں...... ہاں...... کیوں نہیں......'' بابا خوش دلی سے بولے تھے۔

''سارے ملازم بھی ایک ایک جوڑے کی فرمائش تو ضرور ہی کریں گے۔ ان کا بھی خیال رکھنا ہوگا۔''

''بھئی، سب کی فرمائشیں پوری کریں گے۔''

''چاند! یہ زیورات دیکھ لو۔ اگر پرانے دکھ رہے ہیں تو انہیں بدلوا لیتے ہیں۔''

''نہیں بابا...... مجھے یہ ہی پسند ہیں۔ اماں نے انہیں خود پسند کر کے خریدا تھا۔''

''جو تمہاری مرضی میری بیٹی......'' بابا نے سب اس کی مرضی پر چھوڑ دیا تھا۔

رحبان کچھ سرد سے انداز میں کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر چاند نے خود کو مزید بری طرح سے کپڑے دیکھنے میں غرق کر لیا تھا اور تھوڑا سا مزید رخ موڑ لیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ رحبان سے اس کا سامنا ہو یا دونوں کی نظریں ملیں۔ رحبان نے چاند کی یہ حرکت دیکھ لی تھی۔ اسے غصہ تو بہت آیا تھا لیکن اب وہ ساری چیزوں کے حل نکال کر آ رہا تھا۔

''تم کس طرح کے کپڑے بنواؤ گے رحبان......؟'' بابا نے رحبان سے پوچھا تھا۔ جواباً اس نے سوالیہ انداز میں بابا کو دیکھا تھا۔

''چاند کی شادی پر کپڑے بنوانے کی بات کر رہا ہوں۔'' بابا نے بتایا تھا۔ رحبان کا سانس جیسے اکھڑنے لگا تھا۔

''کپڑے بنوانے کی ضرورت نہیں ہے بابا......''

''کیوں......ارے بیٹا خوشی کی بات......''

''میں واپس جا رہا ہوں۔'' اس نے بابا کو بات مکمل نہیں کرنے دی تھی۔

''کہاں......؟''

''ہندوستان......'' نرمی سے رحبان نے زوردار دھماکا کیا تھا۔ تینوں پھوپھیوں نے صندوق چھوڑ حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ اور بابا کے چہرے پر تو حیرت سے بھی بڑھ کر کچھ رقم ہو چکا تھا۔ چاند نے رحبان کو دیکھا نہیں تھا نہ ہی اس نے رخ بدلا تھا۔ اس کی پشت بدستور رحبان کی طرف تھی۔ لیکن اس کے چہرے کا رنگ فق ہو چکا تھا۔ کپڑے دیکھتے اس کے ہاتھ رک گئے تھے۔ دل دھک سے رہ گیا تھا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو تم میرے بچے......''

''جو آپ سن رہے ہیں بابا......''

''لیکن کیوں؟''

''میں نے یہاں آپ کے ساتھ آ کر غلطی کی بابا......''

چاند پر نظریں رکھتے ہوئے اس نے بابا سے کہا تھا۔ چاند اس کی بات کا مفہوم سمجھ چکی تھی۔ وہ جیسے کہنا چاہ رہا تھا کہ اس نے چاند سے محبت کر کے بہت بڑی غلطی کی۔ تینوں پھوپھیاں اور بابا حیرت زدہ سے اسے دیکھتے جا رہے تھے۔

''لیکن بیٹا......''

''آپ مجھے نہیں روکیں گے بابا...... بلکہ کوئی بھی نہیں روکے گا۔'' اس نے ''کوئی بھی نہیں'' کچھ

تیز اور جتانے والے انداز میں کہا تھا۔ وہ یہ بات چاند کو سنانا چاہ رہا تھا۔ اور چاند نے سن بھی لی تھی۔ تب ہی تو اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔ یعنی وہ اٹل فیصلہ کر چکا تھا۔ رحبان کی بات اور انداز پر بابا سمیت کوئی بھی کچھ نہیں بول سکا تھا۔

''میں نے سامان باندھ لیا ہے۔ میں جلد سے جلد واپس چلا جاؤں گا۔'' رحبان کہہ کر کمرے سے باہر چلا گیا تھا اور اپنے پیچھے خاموشی ہی خاموشی چھوڑ گیا تھا۔

''تم کچھ جانتی ہو چاند...... رحبان نے ایک دم سے یہ فیصلہ کیوں کیا ہے؟''

''ن...... نہیں...... بابا...... میں کچھ نہیں جانتی......'' جھوٹ بولنا چاند کے لیے مشکل ثابت ہوا تھا۔

''عجیب لڑکا ہے۔ عرصے کے بعد تو اس گھر میں کوئی خوشی آ رہی ہے اور اس نے مجھے پھر سے اداس کر دیا ہے۔'' دن بدن بوڑھے ہوتے بابا افسردگی سے کہتے ہوئے کمرے سے باہر چلے گئے تھے۔

''تم رحبان سے بات کرنا چاند...... تمہاری بات مان لیتا ہے وہ......''

''جی...... میں بات کروں گی پھوپھو......'' تھوک نگلتے ہوئے اس نے آمادگی دی تھی۔

لیکن رحبان چاند سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چاند جب جب اس کے کمرے میں جانے لگتی تھی وہ اندر سے کمرے کا دروازہ بند کر لیا کرتا تھا۔ چاند کسی نہ کسی طرح کمرے میں داخل ہو بھی جاتی تو وہ خود کمرے سے باہر چلا جاتا تھا۔ وہ چھت پر اسے اکیلے میں ملتی یا نیچے سب کے سامنے...... وہ ہر ممکن طریقے سے اسے نظر انداز کرتا تھا۔ وہ چاند سے ناراض تھا۔ چاند جانتی تھی لیکن وہ اسے کسی طرح منا بھی تو نہیں سکتی تھی۔ اس کی مانگ پوری کرنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ شروع شروع میں تو چاند کو کوفت ہوئی لیکن پھر اسے رحبان کو تنگ کرنے میں جیسے مزا آنے لگا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے رحبان پر طنز کرنے لگی۔

''واپس کیوں جا رہے ہو رحبان...... ہمارے گھر میں تمہیں روٹی نہیں ملتی کیا......؟''

وہ اسے چڑاتے ہوئے کہتی۔ رحبان اسے گھور کر رہ جاتا۔

''سمجھ گئی۔ یہاں کہیں سے پان نہیں ملتے ناں......اور تمہیں پان بہت پسند ہیں۔ اسی لیے واپس جا رہے ہو۔''

چاند کی ایسی باتوں پر بابا بھی نا چاہتے ہوئے ہنس پڑتے تھے۔

دستر خوان سورج مکھی والے بڑے صحن میں بچھتا تھا۔ بابا کی ہدایت پر سب کو رات میں وہاں لازمی موجود ہونا پڑتا تھا۔ کوئی اپنا رات کا کھانا اپنے کمرے میں نہیں لے کر جا سکتا تھا۔ دن بھر تو رحبان چاند سے کسی نہ کسی طرح بچا ہی رہتا تھا، لیکن رات میں دستر خوان پر دونوں کا سامنا لازمی ہوتا تھا۔ چاند جان بوجھ کر رحبان کے سامنے بیٹھ جاتی تھی۔

''تم کہیں اس لیے تو واپس نہیں جا رہے کہ یہاں ہم سب مل کر تم چھوٹے سے بچے پر ظلم کر رہے ہیں۔'' ایک رات پھر سے اس نے رحبان کو تنگ کرتے ہوئے کہا تھا۔ رحبان نے اس بار چاند کو بھرپور جواب دینے کا سوچ رکھا تھا۔

''میں اس لیے واپس جا رہا ہوں کہ وہاں میری ماں کی قبر ہے اور مجھے اس قبر سے لپٹ کر رونا ہے۔'' رحبان نے لفظ لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا تھا۔ بابا کا نوالہ ان کے منہ میں نہیں جا سکا تھا۔ باقی سب کو بھی جیسے چپ لگ گئی تھی۔ شرمندگی کے مارے چاند کا زمین میں دفن ہو جانے کا دل کرنے لگا تھا۔ رحبان کھانا چھوڑ کر اٹھا اور اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

''ہر وقت رحبان کو تنگ مت کیا کرو چاند......'' رحبان کے اٹھ کر جانے کے بعد بستام نے تنبیہی انداز میں چاند سے کہا تھا۔ اور اس طرح سے کہا تھا جیسے کوئی مالک اپنے زرخرید غلام کو حکم دیتا ہے۔ چاند تو اس کی شکل دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ بابا کو بھی تعجب ہوا تھا لیکن وہ جانتے تھے کہ ایسے موقع پر بستام کی مخالفت اس کا غصہ مزید بڑھا سکتی تھی۔ اس لیے انہوں نے اس کی بات کی تائید کی تھی۔

''بستام ٹھیک کہہ رہا ہے چاند......!''

''جی بابا......!'' اس نے سر جھکا کر کہا تھا۔

سب خاموشی سے کھانا کھانے لگے تھے۔ تھوڑی دیر بعد رحبان کے کمرے سے سنکھ کی آواز باہر کو لپکی تھی۔ رحبان ان دنوں رات میں خوب اداسی بھری سنکھ بجانے لگا تھا۔ بابا کو سنکھ کی آواز سے خوف آتا تھا لیکن وہ رحبان کو روکتے نہیں تھے۔ یہ سنکھ آج ساری رات بھی وقفے وقفے سے بجنے والی تھی۔ چاند جانتی تھی۔

☆......☆......☆

توری صورت کے بلیہاری نجام

توری صورت کے بلیہاری

سب سکھین میں چنر میری میلی

دیکھ ہنسیں نرناری نجام

سازندوں نے ساز اٹھائے تھے اور گویوں نے راگ......کومل اور ایمن سمے بیتے رقص شروع کر چکی تھیں۔ دونوں نے آج ہلکے گلابی رنگ کے پہناوے پہنے ہوئے تھے جوان کے رقص پر حرکت کرتے سارے کمرے میں چھائے ہوئے تھے۔ بستام نے جیب سے نوٹ نکالے تھے اور کومل پر نچھاور کرنے شروع کر دیے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ رقص اور گیت پر سر بھی دھنتا جا رہا تھا۔ لیکن رحبان وہاں ایسے بیٹھا تھا جیسے اسے کسی نے زبردستی بٹھا دیا ہو۔ اس کی جیب میں بھی نوٹ تھے جسے نکالنے کا اسے ہوش ہی نہیں تھا۔

اب کے بہار چنر میری رنگ دے

پیا رکھ لے لاج ہماری نجام

رقص کرتے ہوئے ایمن نے دیکھا کہ وہ جس قاتلِ جاں کے لیے اتنے جذبے سے رقص کر رہی ہے وہ تو اسے نظر بھر کر دیکھ بھی نہیں رہا ہے۔ اس نے مزید تن دہی سے رقص شروع کر دیا، لیکن تب

بھی بات نہ بنی تو وہ جیسے بجھ سی گئی اور پھر ہر ہر انگ میں اپنی بہن کی نقل کرنے لگی۔

نقل کا یہ تماشا آدھی رات گئے تھما تھا۔

''کیا ہوا ہے؟'' کوٹھے سے باہر نکل کر بستام نے اپنے دوست کے کندھے پر ہاتھ ڈالتے ہوئے پوچھا تھا۔

''کچھ نہیں......''

''اداس کیوں ہے؟''

''شاید اس جگہ کو چھوڑ کر جا رہا ہوں اس لیے......''

''تو اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا رہا......'' بستام نے دو ٹوک انداز میں کہا تھا۔

رحبان نے اسے دیکھا تھا۔

''میں تجھے کہیں جانے نہیں دوں گا۔'' بستام نے آج پہلی بار اس کے ہندوستان جانے پر بات کی تھی اور بات کیا کی تھی، بس حکم ہی سنا دیا تھا۔

''میں یہاں رہ کر کیا کروں گا بستام......؟''

''جو میں کر رہا ہوں......''

رحبان نے گہرا سانس بھرا تھا۔ اب وہ بستام کو کیا سمجھاتا کہ اسی کی بہن کی وجہ سے تو وہ ملک چھوڑ کر جا رہا ہے۔

''چاند کی محبت نے تجھے اتنا پاگل کر دیا ہے کہ تو مجھے چھوڑ کر جانے کے بارے میں سوچنے لگا ہے۔'' بستام نے کہا تو رحبان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

''میں سب جانتا ہوں۔'' بستام جانتا تھا کہ رحبان کے چہرے پر پھیلی حیرت کا کیا مطلب ہے۔

''جانتا ہے تو یہ بھی جانتا ہو گا کہ یہ ناممکن ہے۔''

''کچھ ایسا ناممکن بھی نہیں......'' بستام نے کسی ترنگ میں کہا تھا۔

رحبان مزید چونکا تھا۔ یہ بستام کیا کہہ رہا تھا۔

''کیسے......؟''

''بابا تجھے پسند کرتے ہیں۔''

''اور چاند......؟''

''چاند......وہ تجھے پسند کر سکتی تھی، لیکن درمیان میں التمش ہے۔ اگر التمش نہ ہوتا تو یہ کام بہت آسان تھا۔''

''شاید......!'' وہ مایوسی سے بولا تھا۔

''تجھے شیدا امرلی یاد ہے۔ جس کی دہلی میں سونے کی بہت بڑی دکان تھی۔ ہمارے گھر سے ذرا فاصلے پر......''

''ہاں......یاد ہے۔''

''اس کا وہ مشہور واقعہ یاد ہے۔ جس پر بہت دنوں تک چرچا ہوتا رہا تھا۔''

''کون سا؟''

''جب ایک خوش اخلاق گجراتی نے اس کی دکان کے بالکل سامنے اپنی دکان کھول لی تھی۔ گجراتی کے اخلاق کی وجہ سے جلدی ہی سارے لوگ اس کے پاس جانے لگے۔ شیدے کی دکان پر مندا بڑھنے لگا۔ شیدے نے بہت بڑی بڑی رقم کا لالچ دیا گجراتی کو کہ وہ یہاں سے اپنی دکان اٹھا لے، لیکن گجراتی نہیں مانا......پھر ایک دن اسی گجراتی کے لڑکے شیدے کو اپنی دکان بیچ گئے۔''

''لیکن وہ تو گجراتی کے مرنے کے بعد ہوا تھا۔''

''وہ......مرا تھوڑی تھا۔'' بستام نے آنکھوں میں چمک سی بھرتے ہوئے کہا تھا۔ ''وہ قتل ہوا تھا۔

شیدے نے اسے قتل کروا دیا تھا۔"

بستام نے اتنی بڑی راز کی بات اتنی آسانی سے کہہ دی تھی کہ رحبان کو اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا تھا۔وہ یک ٹک بستام کو دیکھنے لگا تھا۔

اس نے یہ واقعہ کس موقع پر سنایا تھا۔کس حوالے سے......؟

"سوچ اگر التمش نہ ہوتو تیرا کام کتنا آسان ہے۔چاند تیری ہو سکتی ہے۔" بستام نے بالآخر وہ کہہ دیا تھا جو وہ کافی دنوں سے سوچ رہا تھا۔اگر کسی طرح التمش راستے سے ہٹ جاتا ہے اور چاند کی شادی رحبان سے ہو جاتی ہے تو پھر کسی صورت حویلی کا بٹوارا نہیں ہوگا۔اور نہ ہی باغ کا......

بھلا رحبان نے کب ساری زندگی بٹوارے کی بات کرنی ہے اور چاند کو تو ان چیزوں کی طلب ہی نہیں تھی۔یہ اہم کام رحبان کے ذمے لگا کر بستام اب مطمئن ہو چکا تھا۔

"التمش کو راستے سے ہٹایا جا سکتا ہے۔چاند کو حاصل کرنے کے لیے انسان کیا کچھ نہیں کرتا......کیا وہ یہ ایک ادنیٰ سا کام نہیں کر سکتا۔"

بستام کی بات پر غور کرتے ہوئے رحبان کی آنکھوں میں روشنی سی بھر گئی تھی۔ایک سیاہ اندھیرے والی شیطانی روشنی......



ناول تاش گھر ابھی جاری ہے۔اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 1 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 4

چاند اور التمش کی شادی کی تاریخ رکھی جا چکی تھی اور پوری حویلی میں زور و شور سے شادی کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔

جہیز کا بہت سا سامان تو پہلے سے ہی جمع تھا لیکن بابا کو وہ نجانے کیوں کم لگ رہا تھا۔ پتا نہیں کہاں کہاں سے وہ کیا کیا خریدتے جا رہے تھے۔ ملتان سے نیلی کاشی کے برتن منگوائے تھے۔ پشاور سے فنجانوں کی نجانے کون کون سی قسمیں اکٹھی کی گئی تھیں۔ تام چینی کے برتن گجرات سے منگوائے تھے۔ فرنیچر بابا نے خود چنیوٹ سے جا کر خریدا تھا۔ نواڑی پلنگ لاہور کی مہنگی دکان سے خریدے گئے تھے۔ کشمیری ملازموں کو بھیج کر ان کے علاقوں کے بہترین قالین منگوائے گئے تھے۔ اور مینا کاری والا تخت شاہی جھولا بابا نے کاریگر بلوا کر حویلی میں اپنے سامنے تیار کروایا تھا۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا جو دائیں بائیں سے خریدا گیا تھا اور جو مہنگا ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد خوب صورت بھی تھا۔ جو جو کاریگر یا جاننے والا جس علاقے سے تعلق رکھتا تھا بابا وہاں کی خاص چیزیں ضرور منگوا رہے تھے۔ صرف درجن بھر چنگیریں ہی اتنی دور ہزارے سے منگوائی گئی تھیں۔ تانبے کی ٹھکائی والے برتن اور شمع دان اور صراحیاں لاہور کے کسیرے بازار سے لائی گئی تھیں۔ چاند بابا کے اتنے تردد پر شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔

''اتنا کچھ کیوں کر رہے ہیں بابا...... مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔''

''لیکن مجھے تو اچھا لگ رہا ہے ناں میری بچی!''

''آپ کو لگتا ہے کہ آپ نے جہیز کم دیا تو التمش یا اس کے گھر والے باتیں بنائیں گے۔ وہ ایسے نہیں ہیں۔''

''جانتا ہوں وہ ایسے نہیں ہیں۔ تب ہی تو سب اپنی مرضی سے کر رہا ہوں۔ ورنہ سب التمش کی پسند سے کرتا۔''

''لیکن بابا......''

''اکلوتی بیٹی کی خوشیوں کے لیے پہلی اور آخری بار کر رہا ہوں۔ تمہاری ماں زندہ ہوتی تو نجانے کیا کیا کرتی......اس لیے مجھے جو کرنا آتا ہے وہ کرنے دو......'' بابا نے اتنے پیار سے کہا تھا کہ وہ مزید کچھ بھی نہیں کہہ سکی تھی۔

پھوپھیوں کی تیاریاں بھی دیکھنے والی تھیں۔ بارات پر پہننے کے لیے انہوں نے بنارس سے کپڑا منگوایا تھا۔ جس پر گھر میں ہی تلے کا کام ہو رہا تھا۔ ولیمے کے لیے انہوں نے ڈھاکہ سے زری کے کام والی ساڑھیاں منگوائی تھیں۔ گھر کے ملازموں کو دینے کے لیے بھی مہنگے جوڑے خریدے گئے تھے۔ اور چاند کو دینے کے لیے کپڑے تو نجانے کہاں کہاں سے اور کس کس اقسام کے منگوائے گئے تھے۔

چاند کی برات کا لباس گھر پر ہی تیار ہو رہا تھا۔ دین بابا خود اپنی زیر نگرانی اس لباس کو تیار کروا رہے تھے۔ سرخ رنگ کے اس لباس کے لیے بابا نے نجانے کہاں سے سچے نگینے منگوائے تھے۔ اور بے حد احتیاط اور نفاست سے اس پر کام کروا رہے تھے۔ چاند بھی اس دن اسی کمرے میں چلی آئی تھی۔ تب بابا محبت سے اس کے مکمل ہو چکے لباس کو دیکھتے ہوئے آنکھوں میں آئے آنسو اندر جذب کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چاند ان کے کندھے پر سر گرا کر ان کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی تھی۔ عنقریب حویلی کو چھوڑ کر جانے کی وجہ سے وہ بھی اداس ہو رہی تھی۔

''اپنے آنسو چھپانے کی کوشش مت کریں بابا...... میں انہیں دیکھ چکی ہوں۔''

چاند کی بات پر بابا بے اختیار ہی ہنس دیے تھے اور تب ہی ان کے آنسو چھلک آئے تھے۔

"یہ خوشی کے آنسو ہیں میری جان......"

"آپ سے جھوٹ نہیں بولا جاتا بابا......اگر آپ روئے تو میں بھی رو دوں گی۔"

"اچھا......اب نہیں روتا......تم بتاؤ تمہاری ساری تیاری مکمل ہو چکی ہے۔"

"جی......پھوپھیوں نے سب کر دیا ہے۔"

"تمہیں الگ سے کچھ لینا ہو تو بتا دینا......"

"نہیں......کچھ نہیں لینا۔ سب ہے میرے پاس، بہت سے جوڑے، بہت سے گہنے......بس......" وہ کچھ کہتے کہتے رکی تھی۔

"کیا......؟ کچھ چاہیے تو بولو ناں میری جان......اپنے باپ سے شرما رہی ہو۔"

"نہیں......کچھ چاہیے تو نہیں......ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔"

"تو کہو......"

"آپ رحبان کو روک سکتے ہیں کیا......؟"

چاند کی بات پر بابا کے چہرے پر ایک دم سے اداسی پھیلتی چلی گئی تھی۔ انہوں نے ایک گہرا سانس بھرا تھا۔

"تم کیا سوچتی ہو کہ میں نے ایسا کرنے کے بارے میں نہیں سوچا ہو گا۔"

"آپ اس سے بات تو کریں۔ شاید وہ مان جائے۔ ہندوستان واپس جانے کا خیال دل سے نکال دے۔"

"تمہیں اس نے کیا کہا ہے؟"

"میری تو وہ کوئی بات سننے کو تیار ہی نہیں ہے۔"

''اور اگر اس نے میری ماننے سے بھی انکار کر دیا تو......''

''تو پھر اس کی منت کیجیے گا کہ وہ کم از کم میری شادی تک ہی رک جائے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں بات کرتا ہوں۔ تم پریشان مت ہو۔ خوشی سے شادی کی تیاریاں کرو......''

بابا کی بات پر چاند کو کسی طور تسلی ہوئی تھی۔ پھیکی سی مسکراہٹ سے مسکرا کر وہ وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

بابا اداسی سے تنے ہوئے لباس کو دیکھنے لگے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ رحبان شاید شادی تک رکنے والی ان کی بات تو مان لے۔ لیکن جب وہ فیصلہ کر ہی چکا تھا تو پھر شادی کے بعد تو وہ ضرور ہی ہندوستان واپس چلا جائے گا۔ اور تب بابا یقیناً بہت اداس ہو جائیں گے۔ اتنا دکھ انہیں ہندوستان سے پاکستان آتے وقت نہیں ہوا تھا۔ جتنا رحبان کے واپس جانے پر ہونے والا تھا۔

☆......☆......☆

کمرا سوچ کی کثافت سے بھرا ہوا تھا اور سگریٹ کے اس دھویں سے بھی جو رحبان کے لبوں سے لمبے کش کے بعد جاری ہوتا تھا۔ دھواں دودھ آسا تھا اور سوچ گہری سیاہ...... جس میں کسی اور رنگ کے مل کر بھسم ہو جانے کا خوف موجود تھا۔ دونوں چیزوں نے مل کر دن کی روشنی میں بھی کمرے کو اندھیرے میں گم کر دیا تھا۔ کرسی پر ساکت وجامد بیٹھے رحبان کو کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں......

''سوچ اگر التمش نہ ہو تو تیرا کام کتنا آسان ہے۔ چاند تیری ہو سکتی ہے۔'' بستام کا بولا جانے والا فقرہ کمرے میں اندھی چمگادڑ کی طرح چک پھیریاں لے رہا تھا۔ کھڑکی، روشن دان، دروازہ۔ کوئی بھی تو اس اندھی چمگادڑ کی رہنمائی کرتے ہوئے اسے کمرے سے باہر نہ نکال پا رہا تھا۔ پھر وہ اندھی چمگادڑ تھک کر رحبان کے کندھے پر آ کر بیٹھ گئی۔ اور اپنی غلیظ گوند نکالتے ہوئے وہ اس طرح سے مرتسم ہو گئی کہ اب اسے وجود سے الگ کرنا تقریباً ناممکن ہو گیا تھا۔

دین بابا گلا کھنکھارتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے تو ساکت بیٹھے رحبان کو جیسے ہوش آیا۔

جلدی سے اس نے سگریٹ کو مسل کر کسی طرف پھینک دیا تھا۔ دین بابا مسکرائے تھے۔ وہ رحبان کی حرکت دیکھ چکے تھے۔ بستام اور رحبان کا رات میں چھت پر جا کر سگریٹ پینا ان سے پوشیدہ نہیں تھا۔ اس عمر میں ان کے لیے یہ ہی بات کافی تھی کہ دونوں بچے ان کی اتنی عزت تو کرتے ہیں کہ ان کے سامنے سگریٹ پینے کی جرأت نہیں کرتے۔

''سلام بابا......!'' رحبان جلدی سے کھڑا ہوا تھا۔

''وعلیکم السلام...... بیٹھے رہو...... بیٹھے رہو......'' انہوں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا اور خود بھی اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔

''کوئی کام تھا تو مجھے طلب کر لیتے بابا......''

''جو کام تھا اس کے لیے تمہیں طلب کرنا مناسب نہیں تھا۔ بلکہ میرا تمہارے پاس آنا ہی ضروری تھا۔'' دین بابا اتنی بات کہہ کر خاموش ہو گئے تھے۔ رحبان ان کے مزید بولنے کا منتظر رہا تھا۔ بہت سے لمحے اسی خاموشی کی نظر ہوئے تھے۔

''جی کہیے، جو بھی آپ کو کہنا ہے۔''

''کیا تمہارا ارادہ اب بھی وہی ہے۔''

''کس متعلق؟'' وہ واقعی ہی نہیں سمجھا تھا یا شاید بن رہا تھا۔

''ہندوستان واپس جانے کے متعلق......''

بابا کی بات پر رحبان خاموش رہا تھا۔

''اگر تم اپنا ارادہ نہیں بدل سکتے تو کم از کم چاند کی شادی تک......''

''میں ارادہ بدل چکا ہوں۔'' اس نے جلدی سے کہا تھا۔

''کیا......؟'' یہ بات اس قدر غیر متوقع تھی کہ دین بابا رحبان کی شکل دیکھتے رہ گئے تھے۔

''جی...... میں اب یہاں ہی رہوں گا۔''

''سچ میں میرے بچے......!'' بابا کو تو جیسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ ان کے چہرے پر ایک دم سے اتنی خوشی آ گئی تھی کہ جلتی قندیل بھی ان کے نور کے آگے کم لگنے لگی۔

''جی...... بالکل سچ......'' اس نے ادب سے کہا تھا۔

''میں یہ بات جا کر ابھی چاند کو بتاتا ہوں۔ وہ بہت خوش ہوگی۔ اسی کے کہنے پر تو میں تم سے بات کرنے آیا ہوں۔'' خوشی سے بابا کے وجود میں ایک دم سے ہی بہت زیادہ توانائی آ گئی تھی۔ جلدی سے وہ اٹھے تھے اور پھر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔

رحبان اپنی جگہ بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ چند لمحوں کے بعد نیچے حویلی کے صحن سے آواز اوپر اس کے کمرے تک پہنچی تھی۔

''چاند......او چاند......! کہاں ہو میری بچی......؟''

''جی بابا......کیا بات ہے؟''

''رحبان نے ہندوستان جانے کا خیال دل سے نکال دیا ہے۔''

''کیا سچ میں......؟''

چاند کی خوشی سے چہکتی آواز رحبان کے کانوں میں اتری تھی۔ کرسی سے اٹھ کر وہ کمرے سے باہر دالان میں آ کر نیچے صحن میں جھانکنے لگا تھا۔

''ہاں......سچ میں......اس نے خود کہا۔'' بابا کہہ کر اب یہ خبر باقی سب کو بھی سنانے اندر کو چلے گئے تھے۔ چاند نے بے اختیار ہی اوپر رحبان کے کمرے کی طرف دیکھا تھا۔ رحبان پہلے سے ہی نیچے دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی نظریں ملی تھیں۔ چاند مدھم سا مسکرائی تھی۔ جیسے رحبان کو اس کی بات مان لینے پر شکریہ ادا کر رہی ہو۔

اور رحبان ...... وہ محبت سے چاند کو دیکھتا جا رہا تھا اور بس دیکھتا جا رہا تھا۔

محبت میں شکست تسلیم کر کے پیچھے ہٹنے کے بجائے اس نے سر دھڑ کی بازی لگانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☆......☆......☆

حویلی کے بڑے دروازے کے پار التمش کی جیپ کھڑی تھی۔ وہ خود بھی دروازے کے اسی طرف موجود تھا۔ باقی اندر کی طرف دین بابا، تینوں پھوپھیاں اور چاند کھڑی تھی۔ التمش کو نہ دیکھتے ہوئے لیکن پھر کہیں اور بھی نہ دیکھتے ہوئے......

"میں اب چلتا ہوں بابا...... اجازت دیں۔" التمش نے کہتے ہوئے واپس جانے کی تمہید باندھی تھی۔

"یہ کیا بات ہوئی بیٹا...... تم دروازے پر کھڑے ہو اور اندر نہیں آ رہے ہو۔ تھوڑی دیر اندر آ کر تو بیٹھو......"

"والدہ نے منع کیا تھا کہ اب شادی سے پہلے حویلی نہیں جانا......" اس نے بابا کے پاس کھڑی اپنے دوپٹے کے پلو میں انگلیاں مروڑتی چاند کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ "یہ زیورات کسی ملازم کے ہاتھ نہیں بھجوائے جا سکتے تھے، اس لیے مجھے خود آنا پڑا۔" اس نے مزید وضاحت دی تھی۔

"سارے زیورات بہت پیارے ہیں التمش...... میری طرف سے اپنی والدہ کو تعریف پہنچا دینا۔" تہمینہ پھوپھو نے کہا تھا۔

"جی بہتر......" وہ ادب سے بولا تھا۔

"اور چاند کی فکر نہ کرنا...... تمہارے نام کے زیور خواہ صدیوں پرانے ہی کیوں نہ ہوتے، وہ چاند کو دل و جان سے زیادہ عزیز ہونے تھے۔" شکیلہ پھوپھو نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ پہلے سے شرماتی چاند نے اپنا سر اتنا نیچے جھکا لیا تھا کہ اس کی ٹھوڑی اس کے سینے سے لگنے لگی تھی۔ التمش کے گال بھی سرخ ہو چکے تھے۔

حویلی کے اندر سے ایک ملازم خشک میووں سے بھری ٹوکری لیے وہاں آیا تھا۔

''اب تم تو اندر آ نہیں رہے، لیکن اسے ساتھ لے جانے سے معذرت مت کرنا......'' بابا نے پیار سے کہا تھا۔ جواباً التمش مسکرایا تھا۔

بابا نے ملازم کے ہاتھ سے ٹوکری پکڑ کر التمش کے حوالے کی تھی۔ جسے اس نے اپنی جیپ میں ڈرائیونگ نشست کے ساتھ والی نشست پر رکھ دیا تھا۔

''اب چلتا ہوں۔''

''خدا تمہارا نگہبان ہو۔'' بابا نے دعا دی تھی۔

''اب بارات کے ساتھ ہی آؤ گے یا بارات سے پہلے بھی کوئی بہانا بنا کر آ جاؤ گے۔ جیسے آج آ گئے ہو۔'' زہرہ پھوپھو نے تبصرہ کیا تھا۔ التمش مسکرایا تھا۔ اس کی چوری پکڑی گئی تھی۔

''نہ تنگ کرو بچے کو......'' بابا نے مسکراتے ہوئے ٹوکا تھا۔

جیپ کو اسٹارٹ کر کے چلانے سے پہلے التمش نے نظریں جھکائے کھڑی چاند کو دیکھا تھا اور تب ہی چاند نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ دونوں کی نظریں ملی تھیں اور دونوں ہی مسکراہٹ کو قابو میں نہیں رکھ سکے تھے۔ پھر التمش نے اپنی جیپ کو آگے بڑھا لیا تھا۔ بابا حویلی کے اندر والے حصے میں چلے گئے تھے اور چاند دور سڑک پر جاتی جیپ کو اوجھل ہو جانے تک دیکھتی رہی تھی۔ دروازہ بند کر کے وہ واپس پلٹی تو تہمینہ پھوپھو اس کی منتظر کھڑی تھیں۔

''یہ زیورات جا کر اپنے کمرے میں سنبھال کر رکھ لو...... دلہن کی چیزیں اسی کے کمرے میں موجود ہونی چاہییں۔'' پھوپھو نے سارے ڈبے اسے تھمائے تھے۔ چاند ڈبے پکڑ کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی تھی۔

''اور سنو......'' پھوپھو کے پکارنے پر وہ واپس پلٹی تھی۔

''آج رات تمہیں ابٹن اور ہلدی لگانی ہے۔ تیار رہنا......'' پھوپھو نے کہا تھا اور وہ شرماتے

ہوئے کمرے کی سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔

کمرے میں پہنچی تو دیکھا کہ صندل زار زار رو رہی تھی۔اور بس روتی ہی جارہی تھی۔

''کیا ہوا ہے صندل کو......'' اس نے فکر مندی سے صندل کو چپ کرواتی حاجی بوا سے پوچھا تھا۔

''پتا نہیں......آج تو چپ ہی نہیں ہو رہی ہے۔''

زیورات کے ڈبے جلدی سے الماری میں رکھنے کے بعد وہ صندل کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

حاجی بوا سے اس نے صندل کو اپنی بانہوں میں بھر لیا تھا۔

''کہیں پیٹ میں تو درد نہیں......''

''نہیں......میں دیکھ چکی ہوں۔پیٹ نرم ہے۔''

''پھر کیوں روئے جارہی ہے۔''

''شاید نظر لگ گئی ہے۔''

''آپ کہیں سے اسپند (ایک قسم کا بیج جو نظر بد کے لیے جلاتے ہیں) منگوائیں اور ابھی نظر اتاریں......مجھے فکر ہونے لگی ہے۔ایسے تو یہ کبھی نہیں روئی......''

''ٹھیک ہے۔میں ابھی منگواتی ہوں۔''

حاجی بوا کمرے سے باہر چلی گئی تھیں۔چاند،صندل کو گود میں بھرے تھپک تھپک کر چپ کروانے لگی تھی۔لیکن صندل تھی کہ بس روئے چلی جارہی تھی اور اس کے بلند بانگ انداز میں رونے سے نجانے کیوں چاند کا دل بیٹھنے لگا تھا۔رحبان بھی نجانے کہاں تھا صبح سے......ورنہ اس کی لوری سن کر صندل اکثر سوجایا کرتی تھی۔

☆......☆......☆

شام گہری ہونے لگی تھی۔حویلیاں شہر جیسے علاقوں میں تو شاموں کے گہرے ہونے کا پتا ہی نہیں

چلتا...... یہاں سورج پہاڑ کی اوٹ میں ہوتا ہے اور یہاں دن ہاتھوں سے پھسلتا چلا جاتا ہے۔

چاند کے خیالوں میں کھوئے التمش کی جیپ دھیرے دھیرے سے نشیبی زمین میں آگے کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ جب اچانک سے اسے احساس ہوا تھا کہ اسے جیپ چلاتے ہوئے کافی دیر ہو چکی ہے لیکن ابھی تک بڑی سڑک نہیں آئی۔ بستام نے اسے بتایا تھا کہ یہ مختصر راستہ ہے لیکن یہ تو کافی طویل ثابت ہو رہا تھا۔ پھر اب پکے سے ایک دم کچے سے جا ملا تھا۔ عین ممکن تھا کہ آگے یہ کسی پگڈنڈی کی صورت اختیار کر لیتا۔

نظروں ہی نظروں میں دور تک راستے کو کھوجتے ہوئے التمش نے ایک دم سے بریک پر پاؤں رکھا تھا۔ آگے جانے کے لیے راستہ بند تھا۔ ایک درخت ٹوٹ کر راستے میں گرا ہوا تھا۔ اچھل کر وہ جیپ سے باہر نکلا تھا۔

''اوہ مائی گاڈ!'' گرے ہوئے درخت کو دیکھتے ہوئے اس نے غیر ملکی زبان میں کوفت کا اظہار کیا تھا۔ درخت کافی موٹا اور وزنی تھا۔ اکیلے التمش سے ٹس سے مس نہیں ہو سکتا تھا۔ جیپ اس کے اوپر سے گزر نہیں سکتی تھی اور راستہ کچھ ایسا تھا کہ جیپ کو واپس موڑنا بھی محال نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بیزاری بڑھنے لگی تھی۔

شام جلد ہی رات میں بدلنے والی تھی۔ جیپ کو موڑ بھی لیا جاتا تو واپس جاتے ہوئے دوسرے راستے سے جانا سراسر رسک تھا۔ جیپ میں اتنا ایندھن موجود نہیں تھا۔ اور رات وہ دین بابا کی حویلی میں بسر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ والدہ نے تو اسے شادی سے پہلے گھر کے اندر جانے سے بھی منع کر دیا تھا۔ کہاں اب رات حویلی میں گزارنا...... آج بھی وہ زیورات کا بہانا بنا کر چاند کو دیکھنے حویلی تک آ گیا تھا۔ بہانے سے حویلی میں رات بسر کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

درخت پر ایک غلط نظر ڈال کر وہ واپس جیپ میں آ کر بیٹھ گیا تھا اور سوچنے لگا تھا کہ اب اسے کیا

کرنا چاہیے۔ جب ایک عجیب بات ہوئی تھی۔ نجانے کس طرف سے ایک تیز دھار آلہ انتہائی تیزی سے اور پوری طاقت سے اس کے سینے میں نصب کیا گیا تھا۔ ایک لمحے کا وقت لگا تھا۔ ہتھیار کی تین نوکوں نے اس کا سینہ اس طرح سے چیرا تھا کہ جوان مرد ہوتے ہوئے بھی اس کے حلق سے درد کی ایک بلند آہ فضا کو چیرتی ہوئی چلی گئی تھی۔

پھر اس تین نوکوں والے ہتھیار کو تھامے ہوئے ایک مرد التمش کے سامنے ظاہر ہوا تھا جیسے دیکھ کر التمش کی آنکھوں میں حیرت ہی حیرت در آئی تھی۔ کچھ سوچنے سمجھنے کو لمحہ بھی نہیں ملا تھا۔ مرد نے ہتھیار کو کھینچ کر اس کے سینے سے نکالا تھا اور پھر اپنی پوری قوت سے دوبارہ اس کے سینے میں گھونپ دینے کے لیے اوپر کو کیا تھا۔

اس کا وار کاری ثابت ہونے والا تھا۔ التمش جانتا تھا۔

☆......☆......☆

وہ ہو کا عالم تھا۔ کابوس کا صحرا...... جہاں سانس لینے کو ہوا موجود نہیں تھی۔ لیکن موت بھی نہیں آتی تھی کہ موت جسم سے نکل کر کس درز سے وہاں سے باہر نکل سکے۔ شاید وہ لامکاں تھا۔ دھرتی کے مکاں سے کوسوں دور...... جہاں کوئی ماضی، حال اور مستقبل نہیں ہوتا...... لیکن یہاں اتنا اندھیرا کیوں تھا۔ کیا یہ راتوں کی سرزمین تھی۔ لیکن راتیں بھی اتنی سیاہ کہاں ہوتی ہیں جس قدر وہ عالم خوف ناک تھا۔ یا شاید وہ اندھا عالم تھا۔ جس نے چاند کو بھی اندھا کر رکھا تھا۔

بہت سے لمحے تو اسے سمجھ ہی نہ آسکی کہ وہ کہاں کھڑی ہے۔ کیوں کھڑی ہے۔ کسی صحرا میں ہے یا کسی باغ میں...... ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اتنا اندھیرا کہ اسے اپنا ہاتھ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر اس اندھیرے میں ایک چیز چمکنے لگی۔ تین کونوں والی ایک عجیب وغریب سے وضع کی چیز...... چاند تجسس سے اس چیز کی طرف بڑھی تھی۔ سونے کی طرح چمکتا ہوا وہ تین نوک دار سلاخوں والا

کوئی ہتھیار تھا شاید...... جسے وہ کہیں نہ کہیں ضرور دیکھ چکی تھی لیکن کہاں...... وہ اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس کی روشنی میں ہی چاند نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا تھا، جن پر التمش کے نام کی مہندی لگی ہوئی تھی۔ اپنے مہندی لگے ہاتھ سے اس نے اس چیز کو چھونا چاہا تھا اور تب ہی کسی غیر مرئی قوت نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اتنی زور سے تین سلاخوں کی نوک پر رکھ دیا تھا کہ اس کے ہاتھ سے خون نکل آیا تھا۔ چاند نے اپنا ہاتھ پیچھے کرنا چاہا تھا لیکن وہ قوت اس کا ہاتھ مزید زور سے دباتی چلی گئی تھی۔ درد کی شدت سے لبریز ہو کر اس نے ایک زوردار چیخ ماری تھی۔

''کیا ہوا چاند......''

چاند کی چیخ پر حاجی بوا بدحواسی میں اس کے کمرے میں آئی تھیں۔ نیند سے جاگ کر چاند نا سمجھی سے حاجی بوا کو دیکھنے لگی تھی۔ پاس لیٹی صندل بھی اس کی چیخ سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی اور ایک بار پھر سے رونے لگی تھی۔ صندل کو لٹا کر اسے تھپک تھپک کر سلاتے وہ خود بھی اس کے ساتھ لیٹی التمش کو سوچتے ہوئے سو گئی تھی۔

''کیا کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا تھا۔'' حاجی بوا نے پوچھا تھا اور آگے بڑھ کر روتی ہوئی صندل کو اپنی گود میں بھر کر چپ کروانے لگی تھیں۔ چاند نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگی تھی۔ ان پر مہندی نہیں لگی ہوئی تھی اور نہ ہی خون......

''کچھ بولو بھی چاند......'' حاجی بوا پریشان تھیں۔

''فوراً سے کسی ملازم کو بھیجے التمش کے گھر...... وہ خبر لائے کہ التمش خیر خیریت سے گھر پہنچ گیا ہے یا نہیں......''

''اچھا بھیجتی ہوں۔'' حاجی بوا نے چاند کی بات کو کچھ زیادہ سنجیدگی سے نہ لیا تھا۔ وہ صندل کو چپ کروانے میں مصروف رہی تھیں۔

"میں نے کہا فوراً......"

حاجی بوا روتی ہوئی صندل کو وہاں ہی چھوڑ کر تیزی سے باہر کو نکلی تھیں۔

☆......☆......☆

التمش نے بروقت خود کو جھکا لیا تھا۔ ہتھیار پھر سے اس کے سینے میں پیوست ہونے کے بجائے نشست کی پشت کے اندر تک چلا گیا تھا۔ لڑکھڑا کر جھکنے سے ساتھ والا دروازہ کھل گیا تھا۔ خشک میوؤں سے بھری ٹوکری جیپ کا دروازہ کھلتے ہی نیچے سڑک پر جا گری تھی۔ سب کچھ بکھر کر زمین پر پھیل گیا تھا۔ اور اگلے ہی پل التمش اپنے خون آلود سینے پر ہاتھ رکھے ہوئے ان خشک میوؤں پر گرا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کا سارا لباس خون سے تر ہونے لگا تھا اور اس کے جسم سے طاقت کم ہوتی جا رہی تھی۔ ایک ہی وار نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ وہ باہر نکل کر گرا تھا اور اب خود کو زمین پر گھسیٹ رہا تھا۔ اس کا متوقع قاتل گھوم کر پھر سے اس کے سر پر آ کھڑا ہوا تھا۔ اور اب خود کو گھسیٹتے ہوئے التمش کو مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ اب اس سے بچ کر نہیں جا سکتا۔

وہ عالم ہو کے عالم میں بدل چکا تھا۔ حویلیاں شہر کا نیم جنگل نما علاقہ کا بوس کا صحرا بن چکا تھا۔ التمش کی سانسیں گھٹنے لگی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ اب جلد ہی اندھیرا چھا جانے والا ہے۔ ابدی اندھیرا...... جس کے بعد نجانے کتنا اندھیرا تھا اور نا معلوم کتنی روشنی......

رات گہری ہو کر سنسان بھی ہو چکی تھی اور اندھی بھی...... وہاں کوئی تیسرا فرد موجود نہیں تھا جو اس تک پہنچتا۔ درد سے التمش کی جان نکلی جا رہی تھی۔ خون تھا کہ رکنے میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے اپنے اوپر کھڑے ہتھیار تھامے مرد کو دیکھا تھا۔

"کس لیے مارنا چاہتے ہو مجھے......" سینے پر ہاتھ رکھے ہوئے اس نے درد سے کراہتے ہوئے پوچھا تھا۔

مرد نے استہزائیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا تھا اور کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ ہتھیار کو زور سے اونچا کر کے اس نے پوری طاقت سے ہتھیار کو التمش کے سینے میں گھونپ دیا تھا۔ التمش کے پورے وجود نے ایک جھٹکا کھایا تھا اور ہچکی کی صورت اس نے آخری سانس لی تھی۔

حویلیاں کی گھاس زدہ زمین خون آلود ہو چکی تھی۔ التمش کا گہرا سرخ خون رستا رستا کچی سڑک پر بکھرے ہوئے بادام، اخروٹ اور چلغوزے تک پہنچ کر انہیں اپنی آغوش میں لینے لگا تھا۔

☆......☆......☆

رات چوروں کی طرح وارد ہوئی تھی اور ڈاکازنوں کی طرح پوری دھرتی پر چھا گئی تھی۔ فضا خاموش تھی۔ جیسے کسی کی موت پر ماتم کر کے بیٹھی ہو۔ اسی خاموشی میں صحن کے سامنے والے بڑے کمرے کا دروازہ آہستگی سے کھولا گیا تھا۔ لیکن ساری احتیاط کے باوجود بھی پرانے قبضوں نے چوں چراں کرتے ہوئے شور مچایا تھا۔

دروازہ کھلتے ہی باہر صحن میں جلتی قندیلوں کی روشنی اندر کو لپکی تھی۔ جس نے کمرے کے فرش پر لمبائی کے رخ ایک سایہ گھڑ دیا تھا۔ ایک خاموش مرد کا گناہ کے بوجھ سے جھکا ہوا سایہ...... مزید روشنی کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔ کیونکہ یہ خود سے نظریں چرانے کے لمحے تھے۔

سایہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ بالکل سامنے اونچے استھان پر درگا ماں کی مورتی موجود تھی۔ اپنی پوری آن بان شان کے ساتھ شیر کے اوپر براجمان...... گوٹے کناری سے مزین سرخ جوڑا پہنے ہوئے...... اپنے دس ہاتھوں میں دس مختلف ہتھیار پکڑے ہوئے۔ کنول، تلوار، تیر کمان، عصا، وجرا، کلہاڑا، سانپ، سنکھ، سدرا شن اور......

نہیں...... آج درگا مورتی کے دس ہتھیار مکمل نہ تھے۔ ایک ہاتھ خالی تھا۔ جس میں ترشول ہوا کرتا تھا۔ تین نوک دار سلاخوں والا ترشول...... اس چوری پر درگا مورتی اپنے سامنے کھڑے چور کو دیکھ

رہی تھی۔اس کی سیاہ آنکھیں آج کچھ زیادہ ہی سیاہ تھیں۔ان میں پاتال کی گہرائی تھی جس میں رحبان بس ڈوبنے کو تھا۔

التمش کو قتل کر دینے کے بعد رحبان نے ترشول پر سے اچھے سے خون صاف کر دیا تھا۔باقی کے سارے ثبوت بھی اس نے مٹا دیے تھے۔اب ساری کارروائی کر چکنے کے بعد اس کے ماتھے پر پسینہ تھا اور پورے جسم سے بدبو اٹھ رہی تھی۔ بہت ہمت کر کے اس نے درگا مورتی کی سیاہ آنکھوں میں دیکھا تھا۔اور اسے لگا تھا کہ وہ ان آنکھوں سے بھسم ہو جائے گا۔

ڈرتے ڈرتے رحبان نے پھر سے درگا مورتی کے خالی ہاتھ میں ترشول پکڑا دی تھی۔

درگا مورتی کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں رحبان کو گھورتی جا رہی تھیں اور بس گھورتی جا رہی تھیں۔

☆......☆......☆

وہ تین درخت تین عمر رسیدہ ہیبت ناک جنوں کی طرح کچی سڑک کے کنارے موجود تھے۔ اخروٹ، بادام اور چلغوزے کے درخت...... یہ درخت اس قدر چھتناور تھے جیسے ان کے اندر بیسیوں درخت ضم ہو چکے ہوں۔سال بہ سال کے سفر نے ان کے تنے اردگرد کے باقی درخت کے تنوں سے اتنے موٹے کر دیے تھے جیسے یہ تین درخت جنگل کے جنگل کھا چکے ہوں۔ یہ درخت زیادہ پرانے نہیں تھے۔ان کی عمریں پچاس سال سے کچھ ہی زیادہ تھیں۔ اس کے باوجود ان کی ہیبت صدیاں دیکھ چکی آنکھوں جیسی تھی۔ تین بوڑھے درخت اپنے اردگرد کے درختوں کا رکھوالا بنے ان میں سب سے اگلی صف پر کھڑے تھے۔

لوگ ان درختوں کے پاس آنے سے ڈرتے تھے۔ان پر لگنے والے پھولوں کا رنگ سرخ ہوتا تھا۔ان کے اندر کی گریاں بھی ہلکے سرخی مائل (کسم) رنگ کی ہوتی تھیں۔اخروٹ، بادام اور چلغوزے کے درختوں کو لے کر شہر میں بہت سے قصے مشہور تھے۔کوئی کہتا تھا کہ ان درختوں پر جنوں بھوتوں کا سایا

ہے۔کوئی کہتا تھا کہ ان درختوں پر اکثر چاندنی رات میں پریاں آتی ہیں۔کوئی کہتا تھا کہ انار کے رس سے ان درختوں کی آبیاری کی گئی ہے۔تب ہی ان پر لگنے والے پھول اور پھل سرخ ہوتے ہیں۔لیکن حقیقت صرف بوڑھی چاند بی بی جانتی تھی۔

ہر سال وہ التمش کی برسی والے دن یہاں آ کرتی تھی۔اور ان سرخ پھولوں والے درختوں کے موٹے سیاہ تنے سے لگ کر خوب رویا کرتی تھی۔ان درختوں کی جڑوں میں اس کے محبوب کا خون شامل تھا۔وہ جانتی تھی۔

درخت کے تنے سے لگ کر کھڑی بوڑھی چاند بی بی آج بھی رو رو کر بے حال ہونے کو تھی۔

☆......☆......☆

رات کا آسمان سرخ ہو چکا تھا۔جیسے بہت سی آندھیاں وہاں پڑاؤ کر کے ٹلنے کا ارادہ نہ رکھتی ہوں۔گھن گرج کے ساتھ زوردار بجلی بھی کڑک رہی تھی لیکن بارش ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔

چاند جائے نماز بچھائے خدا کے حضور دعا کر رہی تھی۔نجانے کیا بات تھی کہ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ملازم کو گئے ہوئے بھی کتنی دیر ہو چکی تھی۔وہ ابھی تک کوئی خبر نہیں لایا تھا۔

گھنٹہ بھر دعا مانگنے کے بعد وہ نیچے آئی تھی۔جب اس نے رحبان کو درگا مورتی والے کمرے سے نکلتے دیکھا تھا۔

''یہاں کیا کر رہے ہو رحبان......''

دروازہ بند کرتا ہوا رحبان بری طرح سے گھبرایا تھا۔

''میں......وہ......کچھ بھی نہیں......بانسری بجانے کا شوق ہو رہا تھا۔سوچا شاید یہاں ہو۔لیکن یہاں تو نہیں ہے۔''

''تم کیا کیا بجانا سیکھو گے رحبان......ایک سنکھ ہی کافی نہیں ہے کیا اس حویلی کو سوگوار کرنے کے

لیے......"

"تمہیں کیا ہوا ہے...... پریشان دکھ رہی ہو۔"

"تمہیں التمش کی کچھ خبر ہے۔"

"نہیں...... مجھے کیوں اس کی خبر ہوگی۔"

"ہاں...... تمہیں بھلا کیسے اس کی خبر ہوگی۔" اس نے تاسف سے کہا تھا۔

تہمینہ پھوپھو دونوں کے پاس آئی تھیں۔

"چاند! تمہیں ابٹن اور ہلدی لگانی ہے۔ جاؤ کچھ کھلے ڈلے کپڑے پہن آؤ......"

"جی اچھا......" چاند انہیں منع نہیں کرسکتی تھی۔ وہ اپنی پریشانی گھر کے کسی فرد پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے اس نے چپ چاپ ان کی بات مان لی تھی۔ کپڑے تبدیل کر کے واپس نیچے آئی تو ملازم لڑکا تب تک بھی واپس نہیں آیا تھا۔ تینوں پھوپھیاں اور حاجی بوا اسے لے کر ایک کمرے میں بند ہوگئی تھیں۔ اور ہنسی مذاق کرتے ہوئے اسے ابٹن لگانے لگی تھیں۔ تہمینہ پھوپھو نے اس کی آستین اس کے کندھے تک اوپر کردی تھی اور شلوار گھٹنے تک اوپر چڑھا دی تھی۔ اسے شرم محسوس نہیں ہوئی تھی۔ التمش کے حوالے سے فکر اس پر اس بری طرح سے حاوی تھی کہ اسے اور کچھ محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا۔ سب اس سے ہنسی مذاق کر رہی تھیں اور وہ جواباً پھیکا سا مسکرا رہی تھی۔ اس کے بے قرار دل کی دھڑکنوں کو کسی طور قرار نہیں مل رہا تھا۔

ملازم لڑکا آچکا تھا جو التمش کی خبر لینے گیا تھا۔

"التمش کا کچھ پتا چلا...... کہاں ہے وہ؟" کمرے کے بند دروازے کے پاس سے اسے بابا کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ ملازم لڑکے سے پوچھ رہے تھے۔

"التمش صاحب ابھی تک گھر نہیں پہنچے ہیں۔" ملازم لڑکے کا جواب بھی چاند کو سنائی دیا تھا۔

"راستے میں بھی کہیں نظر نہیں آئے۔ میں اسی راستے سے گیا تھا جس راستے سے وہ گھر جاتے ہیں۔

راستے میں کہیں جیپ کے پہیوں کے نشان بھی نہیں ملے۔"

"پھر وہ کس راستے سے جا رہا تھا۔"

"ایک آدمی نے بتایا کہ دوسری طرف والے راستے پر ایک جیپ کھڑی ہے۔"

"تم نے وہاں دیکھا......؟" بابا نے کہا تھا اور اندر ابٹن ملواتی چاند کو ملازم لڑکے کے جواب کی بابا سے بھی زیادہ جلدی تھی۔

"میں ابھی وہیں سے ہو کر آ رہا ہوں۔"

"پھر......؟"

"وہاں جیپ کھڑی ہے۔ لیکن التمش صاحب وہاں بھی نہیں ہیں۔ اور......"

"اور کیا......؟"

"اور سارے خشک میوے سڑک پر بکھرے ہوئے ہیں۔"

ملازم لڑکے کی آواز گونجتی ہوئی کمرے میں اتری تھی اور ابٹن ملواتی چاند جھٹکے سے کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے پاؤں کے قریب چوکی پر پڑا ابٹن ہلدی سے بھرا دھاتی پیالہ لڑھک کر شور کرتا ہوا دور تک چلا گیا تھا۔

"ہائے اللہ چاند......! یہ کیا کیا تم نے......ابٹن گرا دیا ہے۔ بدشگونی کر دی ہے۔" شکیلہ پھوپھو تیز آواز میں بولی تھیں۔ چاند ہونق بنی ان کی صورت دیکھنے لگی تھی۔ اس کا سارا رنگ روپ لمحے بھر میں نچڑ گیا تھا۔ کہیں اندر ہی اندر وہ جان گئی تھی کہ ابٹن گرنے سے کہیں بڑی بدشگونی ہو چکی ہے۔

کسم کا موسم آ جانے والی بدشگونی......

☆......☆......☆

دین بابا، بستام، رحبان اور گھر کے باقی مرد ملازم......سب التمش کی تلاش میں باہر نکلے تھے۔ اب ان سب کو گئے بھی دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ لیکن ان میں سے نہ تو کوئی واپس آیا تھا اور نہ ہی کوئی التمش کی خبر لایا تھا۔ گھر کی ساری خواتین پریشان حال ایک کمرے میں جمع تھیں۔

چاند کی آنکھیں نجانے کیوں آنسوؤں سے بھر آئی تھیں۔ بہت سے وسوسے اسے گھیرنے لگے تھے۔ وہم ستانے لگے تھے۔ پتا نہیں کس بات کا دھڑکا لگ گیا تھا اسے...... پھوپھو اسے تسلی دلا سا دے رہی تھیں۔ لیکن چاند پر کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اتنی فکرمند ہو چکی تھی کہ اس کے لبوں سے دعا بھی نہیں نکل پا رہی تھی۔

دوسری طرف التمش کے گھر والے بھی پریشان ہو چکے تھے۔ التمش کی جیپ تو کچے راستے پر ایک جگہ سے مل گئی تھی۔ لیکن التمش کا کہیں اتا پتا نہیں تھا۔ یہ بات سب ہی کے لیے باعث حیرت تھی کہ التمش کی جیپ وہاں درختوں کے جھنڈ میں کر کیا رہی تھی۔ وہ کس راستے سے گھر واپس جا رہا تھا؟ جب کہ اس کے گھر کا راستہ تو قدرے آسان تھا۔ پھر اس نے مشکل والا راستہ کیوں منتخب کیا......؟ کیا اسے ڈاکو پڑ گئے تھے۔ جو اسے گھیر کر جنگل میں لے گئے تھے۔ اگر ایسا تھا بھی تو اب التمش کہاں تھا؟

رات گئے دین بابا، بستام، رحبان اور باقی مرد ملازم گھر لوٹے تھے۔ التمش کا کہیں پتا نہیں چل سکا تھا۔ چاند تو اتنی سی دیر میں ہی چھوئی موئی ہو چکی تھی۔ بابا خالی ہاتھ گھر واپس آئے تو وہ بے ہوش ہو گئی۔ سب نے مل اسے مشکل سے سنبھالا تھا۔ اور وہ ہوش میں آنے کے بعد بھی جیسے بے ہوش ہی تھی۔

''ایسے نہیں کرتے چاند...... ہمت سے کام لو اور اللہ سے دعا کرو...... سب ٹھیک ہو گا۔'' بابا نے اسے پیار سے گلے لگاتے ہوئے کہا تھا۔

وہ رات ساری حویلی والوں نے جاگ کر اور دعائیں مانگتے ہوئے گزاری تھی۔ لیکن یہ دعائیں قبول نہیں ہونے والی تھیں۔ سب اندر ہی اندر جانتے تھے۔ بابا نے چاند کو نہیں بتایا تھا کہ جس جگہ سے جیپ ملی ہے وہاں انہیں بکھرے ہوئے خشک میوؤں کے ساتھ بہت سا خون بھی ملا ہے۔ جو اس بات کی نشاندہی کے لیے کافی تھا کہ التمش کے ساتھ کچھ برا ہو چکا ہے۔ لیکن یہ بات وہ خود سے کہتے ڈر رہے تھے۔ کہاں چاند سے کہتے......



التمش کی لاش تین دن کے بعد ملی تھی۔ درختوں کے جھنڈ تلے...... جہاں سے بنسواڑی علاقہ شروع ہوتا ہے۔

بستام نے یہ خبر بابا کو دی تھی اور اندیشوں میں گھرے بابا دھک سے دل تھام کر رہ گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ لڑکھڑا کر گرتے، بستام نے انہیں سہارا دیا تھا۔

''ہمت سے کام لیں بابا...... آپ نے کمزوری دکھائی تو چاند کو کون سنبھالے گا۔'' اور بستام کی بات پر بابا نے جیسے واقعی ہی میں ہمت پکڑ لی تھی۔ بستام ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اگر وہ اپنی طبیعت بگاڑ لیتے تو پھر ان کی لاڈلی کو کون سنبھالتا۔

بنا چاند کو کچھ بتائے بابا چاند کو التمش کے گھر لے گئے تھے۔ سارے راستے وہ بابا سے پوچھتی رہی تھی کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور بابا یہ ہی کہتے رہے تھے کہ وہ التمش سے ملنے جا رہے ہیں۔

''کیا التمش خیریت سے ہے۔''

''ہاں بیٹی!''

بابا کی رندھی آواز میں کچھ تھا یا شاید فضا میں کافور کی بو پھیل چکی تھی۔ چاند کی تسلی نہ ہوئی تھی۔ پھر جب وہ التمش کے گھر پہنچی تو سامنے صحن میں چارپائی پر اس کی میت پڑی ہوئی تھی۔ دعاؤں کے قبول نہ ہونے کا سارا غم چاند کی آنکھوں میں اتر آیا تھا۔ خدا کو دیے گئے سارے واسطے بے کار گئے تھے۔ وہ جو دل میں ایک آس تھی کہ سب ٹھیک ہے وہ آس ختم ہو چکی تھی۔ التمش زندہ نہیں تھا۔ وہ مر چکا تھا۔ اس کی میت اس کی آنکھوں کے سامنے پڑی تھی۔

پہلے چند لمحے تو وہ بٹر بٹر اس کی میت کو دیکھتی رہی تھی، پھر جب سارے شک دور ہو گئے تو دیوانگی کے سے عالم میں وہ اس کے وجود سے لپٹی تھی۔ کسی نے اسے نہیں روکا تھا۔ وہ جو کر رہی تھی لوگ اسے کرنے دے رہے تھے۔ وہ ایسے رو رہی تھی کہ التمش کی ماں اور بہنیں اپنا رونا بھول چکی تھیں۔ ایک

دوسرے کو سنبھالتے سنبھالتے وہ اب چاند کو سنبھالنے لگی تھیں۔

چاند نے اپنی چوڑیاں توڑ دی تھیں اور اپنے کانوں اور گلے میں پہنے سارے زیور اتار پھینکے تھے۔ روتے روتے وہ بس التمش کو دیکھتی جا رہی تھی اور اس سے پوچھ رہی تھی کہ وہ کیوں چلا گیا اسے تنہا چھوڑ کر...... اس کا قصور ہی کیا تھا۔ لیکن التمش کوئی جواب نہیں دے سکتا تھا۔ صرف اللہ دے سکتا تھا۔

وہ تو قتل ہوا تھا اور چاند مر رہی تھی۔

جنازہ اٹھ جانے کے بعد بابا چاند کو اپنے ساتھ گھر لے آئے تھے۔ وہ بھلا وہاں کیسے رہ سکتی تھی۔ اب اس کا وہاں تھا ہی کیا۔ جس سے سب کچھ تھا وہ تو اس دنیا سے چلا گیا تھا۔

آنے والے دنوں میں چاند کی حالت مزید سے مزید خراب ہوتی چلی گئی تھی۔ اسے نہ تو خود کی کوئی ہوش تھی اور نہ ہی صندل کی...... وہ ایسے چلتی تھی جیسے کسی جادو کے زیر اثر ہو۔ گھر کے کسی بھی فرد سے اس کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ خاص کر بابا سے...... وہ سب سے چھپ چھپ کر روتے رہتے تھے۔ رحبان بھی چاند کو دیکھتا تھا تو اس کے دل میں ایک چور سر اٹھاتا تھا۔ چاند کی خوشیوں کا قاتل وہ تھا۔ چاند کو حاصل کرنے کی خاطر اس نے اس پر گرہن لگا دیا تھا۔ لیکن رحبان کی یہ شرمندگی بہت وقتی ہوتی تھی۔ جلد ہی وہ اپنے ذہن کو کوئی دلیل دے لیا کرتا تھا۔

"فکر مت کر چاند...... میں تجھے بہت خوش رکھوں گا۔ اتنا کہ تو سوچ بھی نہیں سکتی۔ دیویوں کی طرح تیری پرستش کروں گا۔ التمش کی تو یاد بھی نہیں آنے دوں گا تجھے......" چاند کو گم صم بیٹھا دیکھتے ہوئے وہ سوچا کرتا تھا۔

☆......☆......☆

حویلی پر سوگواریت کی چادر تن گئی تھی جس کے سائے میں سب گھبرائے گھبرائے پھرتے رہتے تھے۔ سب ایک دوسرے سے ایسے نظریں چرائے ہوئے تھے جیسے سب نے ہی ایک دوسرے کا دین دینا

ہو۔ شرمندہ ایسے تھے جیسے سب ایک دوسرے کے ساتھ کچھ برا کر چکے ہوں۔ کھانا سب خاموشی سے کھاتے تھے۔ جیسے کچھ بول دیا تو کسی کی شان میں گستاخی ہو جائے گی۔ چاند اپنے کمرے میں بند تھی۔ اسے باہر بلانے کی ہمت کوئی نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ باہر آ بھی جاتی تھی تو اس کا کمرے میں بند رہنا ہی بہتر لگتا تھا۔ اس کی چال اور انداز کچھ بہکے ہوئے لگتے تھے۔ جیسے یا تو وہ پاگل ہو چکی ہو یا ہونے والی ہو۔ حاجی بوا ہی اسے بڑے جتنوں سے کھانا کھلا دیا کرتی تھیں۔

چاند کو دیکھتے ہوئے بابا کی طبیعت بگڑنے لگتی تھی۔ مزید کسی نقصان سے بچنے کے لیے گھر والوں نے چاند کو کمرے میں بند رکھنا ہی بہتر خیال کیا تھا۔ ورنہ عین ممکن تھا کہ انہیں بابا کی جدائی کا غم سہنا پڑ جاتا......

ایک دن رحبان دروازے پر ہلکے سے دستک دے کر چاند کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ چاند اپنے تخت پر بیٹھی ہوئی تھی اور خالی آنکھوں سے سامنے کی دیوار کو دیکھ رہی تھی۔ جیسے سامنے دیوار پر کچھ منظر چل رہا ہو اور وہ اسے دیکھ رہی ہو۔

''کیسی ہو چاند......؟'' رحبان نے پیار سے پوچھا تھا۔ چاند نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ لیکن کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ چاند کے دیکھنے سے رحبان کے جسم نے ایک جھرجھری لی تھی۔ اسے پتا نہیں کیسا عجیب احساس ہوا تھا کہ چاند جانتی ہے کہ التمش کو رحبان نے قتل کیا ہے اور اب وہ اس کی بابت پوچھنے والی تھی۔ اس کو گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑنے والی تھی۔ لیکن رحبان جانتا تھا کہ یہ صرف اس کا وہم ہے۔ التمش کے قتل کا صرف ایک ہی گواہ تھا۔ اور وہ بستام تھا۔

''التمش کی یادوں کا سوگ کب تک مناؤ گی چاند......'' کہتے ہوئے رحبان تخت پر چاند کے بے حد قریب بیٹھ گیا تھا۔

''جب تک سانسیں ہیں۔'' وہ دکھ سے چور لہجے میں بولی تھی۔ رحبان کو خوشی ہوئی۔ اس نے کم از کم اس سے بات تو کی تھی۔

''سب گھر والے تمہاری وجہ سے پریشان ہیں چاند......اور کچھ نہیں تو بابا کا ہی سوچو......وہ دن بدن نحیف ہو رہے ہیں۔ ان کی کمر جھکتی جا رہی ہے۔''

''میں تو اپنا بھی نہیں سوچ رہی رحبان......صرف التمش کو سوچ رہی ہوں۔''

''اس کو سوچنے سے، یاد کرنے سے تمہیں کون منع کر رہا ہے چاند......لیکن اس کی یاد میں تمہارے دیوانہ ہو جانے سے سب ڈرے ہوئے ہیں۔''

''وہ مجھ سے اتنی محبت کرتا تھا۔ کیا میں اس کی یاد میں دیوانہ بھی نہیں ہو سکتی۔'' وہ ایک بار پھر سے رو دینے کے قریب تھی۔

''نہیں......کیونکہ تمہاری دیوانگی بابا کو جیتے جی مار دے گی۔ وہ پہلے ہی بہت سے غموں سے ٹوٹ چکے ہیں۔ اپنا نہیں تو کم از کم ان کا ہی خیال کرو۔ ایک بوڑھا شخص جس کی شریک حیات بھی اب اس دنیا میں نہیں رہی۔ سوچو وہ اپنے غموں کو کس کے کندھے پر سر رکھ کر ہلکا کرے۔'' رحبان کی بات اس قدر دلکش تھی کہ چاند نے نا چاہتے ہوئے بھی جیسے کچھ حوصلے کا دامن پکڑا تھا۔ اور آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو صاف کیا تھا۔

''غم میں تم ہو اور ٹوٹ وہ رہے ہیں۔''

''میرا کیا قصور ہے رحبان......میرے ساتھ یہ سب کیوں ہوا۔ التمش نے تو آج تک کسی کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ پھر اسے کیوں قتل کر دیا گیا۔''

رحبان بھلا اس بات کا کیا جواب دیتا۔

''وہ کیوں چلا گیا۔ اسے نہیں جانا چاہیے تھا۔ اس نے میرے ساتھ اتنے وعدے کیے تھے۔ ساری زندگی ساتھ نبھانے کا عہد دیا تھا۔ صندل کی ایک ساتھ پرورش کرنے کو کہا تھا۔ پھر وہ کیوں چلا گیا۔ اب میں یہ سب اکیلی کیسے کروں گی۔'' چاند سب کہتے ہوئے رونے لگی تھی اور پھر غیر ارادی طور پر

ہی رحبان کے کندھے پر اس نے اپنا سر گرا دیا تھا۔

''اس نے سارے وعدے توڑ دیے رحبان...... اس نے سارے وعدے توڑ دیے۔ وہ جھوٹا نکلا۔ مجھے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔'' چاند بولتی جا رہی تھی اور اس صورت حال میں بھی چاند کے وجود کا لمس محسوس کرتے ہوئے رحبان کا تنفس تیز ہونے لگا تھا۔

''تم اکیلی نہیں ہو چاند...... میں تمہارے ساتھ ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔'' رحبان نے دل میں سوچا تھا۔



غموں نے بابا کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ چند دن بعد اس گھر میں خوشیاں آنے والی تھیں۔ ان کی لاڈلی بیٹی اپنے گھر کی ہو جانے والی تھی اور وہی بیٹی بن بیاہے ہی بیوہ ہو چکی تھی۔ وہ بوڑھے کیسے نہ ہوتے...... کام میں ان کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ چاند کی حالت ٹھیک نہیں تھی جو سب کی نگرانی کرتی...... کاری گر کام چوری کر رہے تھے۔ انہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ جلد ہی اب یہ کام بھی ٹھپ ہو جائے گا۔ پچھلا کام بٹوارے کے باعث بند ہو گیا تھا۔ یہ کام اجاڑے کے باعث بند ہونے والا تھا۔

لیکن پھر ایک دن رحبان نے بروقت انہیں سہارا دیا تھا۔ اور رحبان سے انہیں بھلا اس نیکی کی توقع ہی کب تھی۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا بابا...... ہمت سے کام لیں۔ یہ برا وقت جلد ہی گزر جائے گا۔''

''ساری ہمتیں التمش اپنے ساتھ لے گیا ہے رحبان...... مجھے تو اب اپنی موت قریب نظر آنے لگی ہے۔'' بابا نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا تھا۔

''ایسے تو مت کہیں بابا......'' رحبان واقعی ہی میں رنجیدہ ہو گیا تھا۔

''ٹھیک کہہ رہا ہوں رحبان...... میری بیٹی گھر بیٹھے بیٹھے ہی بیوہ ہو چکی ہے۔ ان آنکھوں نے یہ دن

بھی دیکھنا تھا۔"

"آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ زندگی موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔"

"ہاں......لیکن چاند نہیں سمجھ رہی ناں......تم نے دیکھا نہیں اسے......کیسی سوکھ چکی ہے وہ......جیسے شہتوت کی ٹہنی ہو......رنگ روپ تو سواہ ہو ہی چکا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ ذہنی طور پر بھی اب ٹھیک نہیں ہے۔"

"سب وقتی اثر ہے۔ خدا نے چاہا تو سب جلد ٹھیک ہو جائے گا۔"

"بہت محبت کرتی تھی التمش سے......اتنی جلدی نہیں بھول سکے گی وہ اس کو......"

"اگر......چاند کی کہیں اور شادی ہو جائے تو......" رحبان نے ڈرتے ڈرتے کہا تھا۔

"کہاں سے ڈھونڈوں میں اس کے لیے رشتہ......ایسی روگی لڑکی سے کون شادی کرے گا۔ کون اسے سہارا دینے کو تیار ہو گا۔ کون سی ماں اپنے بیٹے کے لیے ایسی بیمار لڑکی کو پسند کرے گی۔"

"آپ فکر مت کریں بابا......میں ہوں ناں!" رحبان نے بے اختیار ہی کہہ دیا تھا۔ دین بابا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"کیا......کیا کہا تم نے؟" بابا نے خوش گوار حیرت سے پوچھا تھا۔ رحبان نے نظریں جھکا لی تھیں۔

"کیا سچ میں میرے بچے......؟" اب کے وہ خوشی سے پوچھ رہے تھے۔

"جی بابا......" رحبان نے سر جھکا لیا تھا۔

"اوہ میرے خدایا......خدا نے میری سن لی۔" بابا خوشی سے چہک رہے تھے۔ "گھر کی بات گھر میں رہ جائے گی۔ اس سے بڑی بات اور کیا ہو گی۔ میں اپنے مرنے تک چاند کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا رہوں گا۔"

بابا کے اتنے خوش ہو جانے پر رحبان کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آئی تھی۔

''تم نے...... تم نے مجھے خوش کر دیا رحبان...... تم نے میرا بیٹا ہونے کا حق ادا کر دیا ہے۔''

''آپ کی عاجزی ہے بابا...... ورنہ میں تو کسی قابل نہیں...... ملازم ہوں اس گھر کا......''

''یہ بات دوبارہ مت کہنا...... پہلے تم اس گھر کے بیٹے تھے۔ اب تم اس گھر کے داماد ہو۔''

''لیکن چاند......''

''اسے میری بات پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ وہ میری بات نہیں ٹالتی۔ مجھے امید ہے کہ وہ میری بات مان جائے گی۔''

''ٹھیک ہے۔ پھر میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ چاند کو ہر طرح سے خوش رکھوں گا، اور صندل کو بھی اپنا نام دوں گا۔''

''جیتے رہو میرے بچے...... خدا تمہیں سدا خوش رکھے۔'' بابا نے کہا تھا اور پھر اگلے ہی پل رحبان کو اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔

بابا کے سینے سے لگے رحبان کی آنکھوں میں خوشی ہی خوشی نظر آ رہی تھی۔

☆......☆......☆

دونوں نے اپنی اپنی سگریٹوں کو ہونٹوں میں دبا کر آپس میں ملایا تھا اور پھر دونوں کو ایک ساتھ لائٹر کی لو دکھائی تھی۔ پہلے ننھے ننھے شعلے جلے تھے اور پھر سگریٹ دھواں دینے لگی تھی۔ دونوں نے ایک ایک لمبا کش کھینچ کر دھواں فضا میں چھوڑا تھا۔

''میں نے التمش کو راستے سے ہٹانے کا کہا تھا۔ اور تو نے راستے میں ہی ہٹا دیا۔'' بستام کہتے ہوئے ہنسا تھا۔ جواباً رحبان نے ایک جاندار قہقہہ لگایا تھا۔

''التمش کو راستے سے ہٹانے کا یہ ہی حل تھا کہ اسے راستے میں ہٹا دیا جائے۔'' کہتے ہوئے رحبان نے اپنی گردن پر ہاتھ سے فرضی چھری چلائی تھی۔

''ترشول پر کہیں التمش کا خون تو نہیں لگا ہوا ناں؟''

''نہیں......میں نے اسے اچھے سے صاف کر لیا تھا۔''

''اب آگے کیا کرنا ہے؟''

''میں نے بابا نے بات کی ہے۔ وہ بہت خوش ہوئے ہیں۔ لیکن چاند کی رضامندی کے بنا کچھ نہیں ہو سکتا۔''

''فکر مت کر......چاند مان جائے گی۔''

''اور اگر ایسا نہ ہوا تو......؟'' رحبان بے چین تھا۔

''پھر میں بات کروں گا چاند سے......''

''سچ میں......؟''

''ہاں......تو جگر ہے اپنا......اپنے دوست کے لیے اتنا تو کر ہی سکتا ہوں ناں! میں نے آج تک چاند سے کوئی فرمائش نہیں کی......امید ہے میری پہلی فرمائش پر وہ مجھے مایوس نہیں کرے گی۔''

بستام نے ٹھوس لہجے میں پر امید انداز میں کہا تھا۔ اور رحبان کی ساری فکریں دور ہو گئی تھیں۔ اور معلوم تھا کہ بابا سے یہ کام نہ ہو سکا تو بستام یہ کام کر لے گا۔

چھجے کی دیوار پر دونوں ہاتھ رکھے بستام اپنی حویلی اور حویلی کے پیچھے والے سیب کے باغ کو دیکھنے لگا تھا۔ اب یہ سب اس کا تھا۔ کوئی حصے دار نہیں تھا۔

بستام کے برعکس رحبان کے خیالات پر چاند چھائی ہوئی تھی۔

دونوں ہی نہیں جانتے تھے کہ ان دونوں کی گفتگو کوئی تیسرا بھی سن چکا ہے۔ التمش کے قتل اور قاتل کو جان کر اس بوڑھی جان سے اب اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

☆......☆......☆

''یہ خیال آپ کے دل میں کیسے آیا بابا......'' چاند نے بابا سے پوچھا تھا۔اس کا لہجہ نرم تھا۔ساری زندگی التمش کے نام کی بیوہ رہنے کا ارادہ اس کا تھا۔بابا کا نہیں......انہیں اس کی شادی کی فکر ہونا فطری امر تھا۔چاند کو اس بات پر بھی حیرت نہیں ہوئی تھی کہ بابا نے اس کے لیے رحبان کا نام لیا تھا۔وہ بس جاننا چاہتی تھی کہ یہ خیال کس کے ذہن کا تھا۔

بابا جو یہ بات کرنے سے پہلے ہی چاند کے ردعمل سے ڈرے ہوئے تھے، چاند کے سوال پر مزید گھبرا گئے۔

''سچ بتاؤں تو یہ خیال میرا نہیں ہے۔رحبان نے مجھ سے ایسا کہا تھا۔''

''رحبان......'' وہ زیرلب اس کا نام بول کر رہ گئی تھی۔وہ تو کب سے چاند کا طلب گار تھا۔پھر اب کیا بعید تھی اس سے کہ وہ میدان خالی دیکھ کر زمین کی رجسٹری اپنے نام کرنے کی بات نہ کرتا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم دکھی ہو چاند......التمش کی بے وقت موت نے تمہیں دکھ سے توڑ کر رکھ دیا ہے۔لیکن اب تم ساری زندگی اس کی موت کے غم میں نہیں گزار سکتیں۔تمہیں کوئی فیصلہ لینا ہوگا۔''

بابا کی تمہید پر وہ خاموش رہی تھی۔

''میں نے رحبان سے ''ہاں'' کہہ دی ہے۔لیکن میں تمہاری مرضی جاننا چاہتا ہوں۔تم چاہو تو انکار کر سکتی ہو۔تمہیں اختیار ہے۔میں تمہارے لیے کوئی اور لڑکا دیکھ لوں گا۔لیکن......رحبان گھر کا بچہ ہے۔تم میری آنکھوں کے آگے رہو گی اس سے بڑی خوش نصیبی میری کیا ہوگی بھلا......'' بابا دکھی انداز میں بولتے جا رہے تھے۔

''مجھے رحبان میں کوئی برائی نظر نہیں آتی......سچ بتاؤں تو رحبان مجھے بستام سے زیادہ پسند ہے۔اور حقیقت میں بھی وہ بستام سے کسی حد تک بہتر ہے۔التمش جیسا داماد تو نہیں مل سکتا لیکن رحبان بھی بہت سوں سے بہتر ہے۔'' چاند کو آمادہ کرنے کی خاطر بابا رحبان کی اچھائیاں بیان کرنے لگے تھے۔

''دیکھو کتنا ادب کرتا ہے میرا...... جیسے میں اس کا سگا باپ ہوں۔ مانا کہ میرے اس پر بہت سے احسان ہیں لیکن آج کل کسی کے احسان کو مانتا ہی کون ہے۔ اور اب تو رحبان جوان ہو چکا ہے۔ اپنا کما رہا ہے۔ لیکن جو جیب خرچ دیتا ہوں اسی میں گزارا کرتا ہے۔ کبھی اپنے کام کا حساب کتاب مجھ سے نہیں مانگا۔''

ایسا نہیں تھا کہ بابا یہ سب چاند کو راضی کرنے کے لیے کہہ رہے تھے۔ وہ واقعی ہی میں رحبان کو پسند کرتے تھے اور رحبان کی چاند سے شادی کرنے والی بات نے انہیں اتنا خوش کر دیا تھا کہ وہ یہ بھی بھول چکے تھے کہ رحبان اور بستام دونوں نے مل کر درگا مورتی کے زیور چرائے تھے۔ دونوں عجیب محفلوں میں جانے لگے تھے اور سگریٹ پینے لگے تھے۔ ان ساری باتوں کو انہوں نے دونوں کے بچپنے اور جوانی کی غلطیوں کا نام دے دیا تھا۔

چاند جانتی تھی کہ بابا کی ان تمہیدوں کا کیا مقصد ہے۔ اس نے نظریں اٹھا کر اس بوڑھے شخص کو دیکھا تھا جس پر دن بدن بڑھاپا طاری ہوتا چلا جا رہا تھا۔ جس نے اس عمر میں آ کر اتنے بڑے غم دیکھے تھے کہ اگر وہ کسی پتھر پر اترتے تو پتھر ٹوٹ کر بکھر جاتا۔ جس نے اپنی بیوی کو اپنے سامنے مرتا دیکھا تھا۔ اپنے بہن بھائیوں کو قتل ہوتے دیکھا تھا اور جس نے اب اپنی بیٹی کو بنا شادی کے بیوہ ہوتے بھی دیکھ لیا تھا۔ کیا وہ اس بوڑھے کو اس عمر میں کوئی ایک خوشی نہیں دے سکتی تھی۔

''تم اچھے سے سوچ لو...... مجھے کوئی جلدی نہیں ہے جواب کی...... تسلی سے سوچ لو...... پھر مجھے بتانا۔''

بابا کہہ کر کمرے سے باہر جانے لگے تھے جب اس نے پیچھے سے انہیں پکارا تھا۔

''مجھے یہ رشتہ منظور ہے بابا......''

دین بابا پلٹے تھے۔ خوشی سے ان کے جسم میں توانائی بھر گئی تھی۔

''سچ میں میری جان......''

''جی...... جو آپ چاہیں۔''

''جیتی رہو میری بچی!'' بابا نے چاند کو اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ بابا کے سینے سے لگے اس نے اپنے آنسوان کی قمیص میں جذب کیے تھے۔ رحبان اسے چاہتا تھا۔ وہ التمش کو چاہتی تھی۔ اسے التمش نہیں مل سکا تھا۔ بہتر تھا کہ اب کوئی ایک تو خوش رہتا۔ رحبان کے حصے میں تو چاندنی آ جاتی...... یہ ہی سوچ کر اس نے اتنا بڑا فیصلہ لے لیا تھا۔



ناول **تاش گھر** ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **1** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 5

رمضان کا مہینہ قریب تھا۔ اس کے بعد عید اور پھر موسم کے بدل جانے کا وقت...... اس لیے شعبان کے مہینے میں چاند اور رحبان کی شادی کی تاریخ رکھ دی گئی تھی۔ ساری تیاری تو پہلے سے ہی مکمل تھی۔ چاند کا سارا جہیز بھی تیار تھا۔ حتیٰ کہ بارات پر پہننے کے لیے اس کا لباس بھی تیار تھا۔ پھر دیر کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ رہی بات رحبان کی طرف کی تیاری کی تو وہ تو ویسے بھی لڑکا تھا اور شادی پر لڑکوں کی تیاری تو بس واجبی سی ہوتی ہے۔ پھر بھی وہ تھوڑی بہت تیاری اور خریداری تھی وہ بسام اور رحبان دونوں دوست مل کر کر رہے تھے۔

بابا نچلی منزل پر در گار موتی کے ساتھ والا بڑا کمرا دونوں کے لیے تیار کروا رہے تھے۔ وہاں پر نئے زمانے کا ماربل کا فرش بچھ رہا تھا۔ اور درو دیوار پر بھی کچھ جدید کام کروایا جا رہا تھا۔ بابا نے چاند سے وہاں کی سجاوٹ کے بارے میں پوچھا تھا اور اس نے بے دلی سے کہہ دیا تھا کہ انہیں جو بہتر لگتا ہے وہ کریں۔

"یہ رحبان کے ساتھ زیادتی ہے میری بیٹی۔ تم دل سے اس رشتے پر رضا مند نہیں ہو۔"

"میں دل سے اس رشتے پر رضا مند ہوں بابا...... بس مجھ سے خوش نہیں ہوا جا رہا۔"

"رحبان تمہیں خوش رکھنے کے لیے ہی تو تم سے شادی کر رہا ہے تا کہ تم پھر سے ویسے ہی ہنس سکو جیسے پہلے ہنسا کرتی تھیں۔ پھر سے ویسے ہی چہک سکو جیسے پہلے پوری حویلی میں اپنی چہکار سنایا کرتی تھیں۔"

نادم سی نظر آتی وہ خاموش رہی تھی۔

''رحبان تمہاری خوشی کی خاطر ہی تو تم سے شادی کر رہا ہے۔ اس نے اتنی بڑی قربانی دی ہے۔''

اس نے چونک کر بابا کو دیکھا تھا۔

''ٹھیک کہہ رہا ہوں میں...... ایک مرد جب یہ جانتا ہو کہ اس کی ہونے والی بیوی دل و جان سے کسی اور کو چاہتی رہی ہے تو اس کا اس لڑکی سے شادی کرنا قربانی دینے کے مترادف ہی ہوتا ہے۔''

چاند کا بابا کی غلط فہمی دور کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ رحبان کوئی قربانی نہیں دے رہا ہے بلکہ وہ تو پہلے سے ہی اس کا طلب گار تھا۔

''میں کوشش کروں گی بابا کہ شادی کے بعد رحبان کو مجھ سے کوئی شکایت نہ ہو۔''

''اور اپنے دل کی سختی کو کچھ کم کرو گی تو پھر یہ کوشش رنگ لائے گی۔ ورنہ وہ بے چارہ ساری زندگی ایک پتھر سے سر ٹکراتا رہے گا۔ اور تم مورت بنی کمرے میں پڑی رہو گی۔''

بابا اپنی کہہ کر کمرے سے باہر چلے گئے تھے اور وہ ساری رات بابا کی باتیں سوچتی رہی تھی۔ التمش کی موت میں رحبان کا کیا قصور تھا آخر......؟ پھر وہ کیوں کسی کے جرم کی سزا کسی اور کو دے رہی تھی۔

''رحبان اگر دل و دل سے مجھے چاہتا ہے تو میرا بھی حق بنتا ہے کہ میں اسے بدل کے طور پر اتنی ہی محبت دوں۔ میرے لیے یہ مشکل ہے، لیکن تمہاری خوشی کی خاطر میں یہ کروں گی رحبان......'' گہری ہوتی رات میں اس نے زندگی کے بڑے بڑے فیصلے کیے تھے۔

رحبان ان دنوں بے حد خوش تھا۔ ہر وقت مسکراتا رہتا ہے۔ روز رات میں اس کے کمرے سے سنکھ کی آواز باہر نکل کر پوری حویلی اور حویلیاں شہر کی فضا میں گونجا کرتی تھی۔ اور اب کے یہ آواز ایسی ہوتی تھی جس سے بابا کو خوف نہیں محسوس ہوا کرتا تھا کیونکہ رحبان اسے مسکراتے ہوئے جو بجایا کرتا تھا۔ پھوپھیاں اس آواز کو سنتے ہوئے کن انکھیوں سے چاند کو دیکھا کرتی تھیں۔ اور چاند بے اختیار ہی مسکرا دیا کرتی تھی۔ رحبان کی خوشی میں خوش نظر آنے کے لیے اس نے خود پر مسکراہٹ کی طمع کاری کر لی تھی۔

رحبان تو لڑکیوں سے بھی زیادہ شرمارہا تھا۔ حویلی میں داخل ہوتا تو سر جھکا لیتا۔ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا مسکراتا چہرہ کوئی دیکھے اور اسے تنگ کرے۔ بابا کے سامنے تو وہ کچھ زیادہ ہی شرما جاتا تھا۔ ایسے میں بابا کو التمش یاد آجایا کرتا تھا۔ اس کے گال بھی رحبان کی طرح سرخ ہو جایا کرتے تھے۔ اس دن تو رحبان کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا جس دن بابا نے اسے ایک ہزار روپیہ دیا تھا۔

''یہ کس لیے ہے بابا......؟''

''نکاح والے دن چاند کو حق مہر دے دینا۔''

''حق مہر دینے کے لیے میرے پاس پیسے ہیں بابا......''

''ان سے تم کچھ اور لے لینا۔ میرے نکاح پر بھی میرے باپ نے مجھے حق مہر کے پیسے دیے تھے۔ اسی لیے اب میں تمہیں دے رہا ہوں۔''

رحبان کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

''بدلے میں، میں بس تم سے ایک چیز مانگتا ہوں رحبان۔'' بابا کی آواز رندھ گئی تھی۔

''بولیے بابا۔''

''کبھی میری چاند کی آنکھوں میں آنسو مت آنے دینا۔'' کہتے ہوئے بابا کی خود کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

''ایسا ہی ہو گا بابا...... میں چاند کو اداس تک نہیں ہونے دوں گا۔''

بابا نے آگے بڑھ کر رحبان کو اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔

شادی کے دن قریب آتے جا رہے تھے۔ حویلی میں ایک بار پھر سے شادی کی تیاریاں ہونے لگی تھیں۔ پھوپھیاں پھر سے چاند کو ابٹن ہلدی ملنے لگی تھیں۔ چاند چپ چاپ یہ سب کام کروا رہی تھی۔ وہ نہ تو اداس تھی اور نہ ہی خوش...... بس خاموشی سے اور ساکت چہرے کے ساتھ وہ یہ سب کام کروا رہی

تھی۔ وہ اب رحبان کے نکاح میں جانے والی تھی۔ بہت بہتر تھا کہ وہ التمش کو بھولنے کی کوشش کرتی۔ ورنہ یہ بے چارے رحبان کے ساتھ زیادتی تھی۔

چاند ان دنوں بابا کے کمرے میں رہ رہی تھی۔ بابا کا حکم تھا کہ شادی تک اب رحبان اور چاند دونوں ایک دوسرے کو نہ دیکھیں۔ جب کہ رحبان اس کے باوجود اپنے کمرے سے چاند کو دیکھنے کے لیے تانک جھانک کرتا رہتا تھا، لیکن چاند اتنی لمبی شال میں لپٹی ہوئی کمرے سے باہر آتی تھی کہ اسے کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ پھر چاند کے ساتھ لازمی کوئی نہ کوئی ہوتا تھا۔ حاجی بوا یا پھوپھو میں سے کوئی...... جو رحبان کو اوپر کھڑے دیکھ لیتیں تو وہاں سے ہی بڑک لگایا کرتی تھیں۔

''رحبان! تم باز نہیں آؤ گے۔ لگتا ہے کہ دین بھائی کو بتانا پڑے گا۔''

اور رحبان ہنستے ہوئے پیچھے ہو جایا کرتا تھا۔

''کتنے دن...... اب جلد ہی یہ چاند میرا ہونے والا ہے۔ اس چاند کی چاندنی صرف میری ہوگی۔''

یہ سوچ کر وہ خود کو تسلی دے لیا کرتا تھا۔ ان دنوں وہ یہ بات بھولا ہوا تھا کہ وہ چاند کی محبت کا قاتل ہے۔ التمش کا قتل کر کے اس نے کتنا عظیم گناہ کر لیا ہے۔ اس کے ذہن پر بس شادی سوار تھی۔ چاند کی قربت......

بارات والے دن تک بابا نے جہاں چاند کے سارے ارمان پورے لیے تھے وہاں رحبان کی بھی ساری رسمیں نبا ہی تھیں۔ اس کی شیروانی بابا نے خود اپنی پسند سے سلوائی تھی۔ جسے پہن کر وہ خوب پیارا لگ رہا تھا۔ بابا تو اس کی نظریں اتارتے نہ تھک رہے تھے۔

''سوچا تھا کہ تمہاری اور بستام کی شادی ایک ساتھ کروں گا۔ لیکن جو خدا کو منظور......'' اور کہتے ہوئے بابا نے بہت سے نوٹ رحبان کے سر سے وار کر ملازم کو دے دیے تھے کہ غریبوں میں بانٹ دو۔

نیچے بابا کے کمرے میں چاند تیار ہو چکی تھی۔ اس کے ہاتھوں پر مہندی کا رنگ خوب سرخ رنگ لایا تھا۔ جو اس کے سرخ لباس سے بھی مل رہا تھا۔ یہ لباس اس نے التمش کی دلہن بننے کے لیے زیب تن

کرنا تھا اور اب اسے پہنے وہ چند لمحوں کے بعد رحبان کے نام کی قبولیت بھرنے والی تھی۔ آئینے میں اپنے عکس کو اداسی سے دیکھتے ہوئے وہ لایعنی سوچوں میں غرق تھی۔

بابا کمرے میں آئے تھے۔ انہوں نے چاند کو دیکھا تھا اور اسے دیکھتے ہوئے بابا کو لگا تھا کہ جیسے ان کی بیٹی میں جنت کی کوئی حور سرائیت کر گئی ہو۔

''رحبان خوش قسمت ہے کہ اسے تم مل رہی ہو۔'' بابا نے اسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا تھا۔ ''لیکن رحبان کا بھی ایک احسان ساری زندگی رہے گا مجھ پر...... کہ اس کے فیصلے کی بدولت تم میری آنکھوں کے سامنے رہو گی۔ میرے مرنے تک......''

چاند پھیکا سا مسکرائی تھی۔

''نکاح کے لیے مولوی صاحب آچکے ہیں بابا۔'' بستام نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا تھا۔

''انہیں باہر بٹھاؤ...... میں آتا ہوں۔''

''جی اچھا......'' بستام کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔ بابا نے چاند کو خود سے الگ کرتے ہوئے جی بھر کر دیکھا تھا۔

''اس سفید دوپٹے کو اب اتار دو چاند...... سرخ دوپٹہ اوڑھ لو میری جان۔'' بابا نے کہتے ہوئے آہستگی سے اس کے سر پر رکھا سفید دوپٹہ ڈھلکا دیا تھا۔ ''التمش کی بیوگی کو آج ختم کر دو...... اور ہو سکے تو اسے بھول ہی جاؤ...... سرے سے بھول ہی جاؤ اسے تم......'' آنسو بھری آواز کے ساتھ کہتے ہوئے بابا جلدی سے کمرے سے باہر چلے گئے تھے۔

چاند رخ بدل کر خود کو آئینے میں دیکھنے لگی تھی۔ قسمت کے کھیل...... اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ دلہن بن کر مسکرانا بھول چکی ہو گی۔ اداسی کو دور کرنے کے لیے اسے کوشش کرنی ہو گی۔ غم بھلانے کے لیے جتن کرنے کو ہوں گے۔ ڈھلکے ہوئے سفید دوپٹے کو اس نے اپنے جسم پر اسے

الگ کیا تھا۔ تخت پر اس کے لباس والا سرخ کام دار دوپٹہ پھیلا ہوا تھا۔ مردہ ہمتوں کو اکٹھا کرتے ہوئے اس نے سرخ دوپٹے کو تھاما تھا۔ جو اسے منوں وزنی لگا تھا۔

اپنی قسمت پر ایک آخری بار تاسف کر کے چاند نے خود کو آئینے میں دیکھتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی تھی اور وہ سرخ دوپٹے کو سر پر رکھنے ہی لگی تھی۔ جب آئینے کے عکس میں اس کے عکس کے ساتھ ساتھ ایک اور عکس بھی ظاہر ہوا تھا۔ چاند نے فوراً سے پیچھے پلٹ کر دیکھا تھا۔

وہ بڑھیا گم صم صورت لیے چاند کو دیکھتی جا رہی تھی اور بس دیکھتی جا رہی تھی۔

☆......☆......☆

قبر کی مٹی بھری بھری ہو چکی تھی۔ ایسے جیسے وہ ڈھیری مٹی کی نہیں بلکہ ریت کی ہو۔ ایک ہی ٹھوکر سے دائیں بائیں بکھر جانے والی...... سطح کے ساتھ ہموار ہو کر اپنا وجود ختم کر دینے والی۔

بوڑھی چاند بی بی نے پانی اور بھوس ملی مٹی کے آمیزے میں ہاتھ ڈال کر ایک بڑی مقدار کو قبر پر رکھا تھا۔ اور کپکپاتے ہاتھوں سے وہ اس کی ساری بھر بھری جگہ کی لپائی کرنے لگی تھی۔ پتا نہیں کیسی مٹی تھی یہ...... قبر کی لپائی مہینہ بھر ہی ٹھہر پاتی تھی۔ شاید دین بابا اس سے ابھی تک ناراض تھے۔ انہوں نے چاند کو معاف ہی نہیں کی تھی۔ جو وہ اس کے ہاتھوں کا کوئی احسان لینا گوارا نہیں کر رہے تھے۔ یا شاید قبر کے جھیتر وہ روتے تھے جس باعث قبر کی مٹی بھر بھرا جاتی تھی۔

قبر کی لپائی کرتے ہوئے بوڑھی کے کانوں میں بستام کی آواز گونجی تھی۔ یہ آواز سالوں پرانی تھی۔

''یہ کیا کیا تم نے چاند...... تم نے بابا کو مار دیا۔'' بستام چلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ چاند حیران و پریشان کھڑی بستام کی بات سن رہی تھی اور تخت پر پڑی دین بابا کی میت کو یک ٹک دیکھتی جا رہی تھی۔

''میں نے...... میں نے کیا کیا ہے؟'' ہونق بنی وہ ناسمجھی سے پوچھنے لگی تھی۔

''پوچھتی ہو کیا کیا ہے۔ تم قاتلہ ہو بابا کی...... تمہاری وجہ سے بابا کی موت ہوئی ہے۔ تم نے مارا

ہے بابا کو......تم نے......" روتے ہوئے بستام چلاتا جا رہا تھا۔ اور چاند کے تو سارے آنسو ہی جیسے خشک ہو چکے تھے۔

بڑے تخت پر دین بابا کا مردہ وجود پڑا ہوا تھا۔ رحبان تخت پر گرا ہوا زار زار رو رہا تھا۔ اتنا وہ اپنے سگے ماں باپ کے مرنے پر نہیں رو رہا تھا جس قدر آج رو رہا تھا۔ تینوں پھوپھیاں بھی واویلا کر رہی تھیں اور نفرت سے چاند کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کے خیالات بھی بستام سے ملتے جلتے تھے کہ چاند کی وجہ سے بابا کی موت ہوئی ہے۔ چاند بابا کی قاتلہ ہے۔

گھر کے سب ملازم بھی بابا کے کمرے میں موجود تھے اور سب ہی بابا کی موت پر رو رہے تھے۔ سوائے چاند کے......اسے رونا کیوں نہیں آ رہا تھا۔ بسام کی بات پر اسے اتنی حیرت ہوئی تھی کہ وہ بس گم صم انداز میں بابا کی میت کو دیکھتی جا رہی تھی۔

"کیا آپ کو میں نے مارا ہے بابا......" وہ بابا کی میت سے پوچھنے لگی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میت جواب نہیں دیا کرتی۔

"کیا آپ کو میں نے مارا ہے بابا......" چاند بی بی قبر کی لپائی کرتے ہوئے ایک بار پھر سے قبر سے پوچھنے لگی تھی۔ لیکن پچاس سال پہلے کی طرح اس بار بھی اسے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ بابا خاموش تھے۔

چاند بی بی نے اپنے آنسو صاف کیے تھے اور مزید محبت سے قبر کی لپائی کرنے لگی تھی۔

☆......☆......☆

دوسری فصل......صندل زاد

۱۹۷۲ء

حویلیاں شہر میں ایک حویلی

حویلی کا صدر دروازہ اس قدر چوڑا اور اتنا اونچا تھا کہ دیکھ کر گمان ہوتا تھا جیسے وہ ہاتھیوں اور اونٹوں کی آمد و رفت کے لیے بنایا گیا ہو۔ آبنوس کی سیاہ موٹی لکڑی سے بنا وہ دروازہ کسی اکھری اینٹ سے بنی دیوار پر جتنا موٹا اور کسی پرانے سالم درخت جتنا وزنی تھا۔ اس پر لگے پیتل کے وزنی کنڈے سے لکڑی پر پڑے والی ضرب "ٹھن" کی سی گونج دیتی تھی۔ جیسے حویلی کے اندر باہر کی ساری بن ٹھن اپنے جوبن پر ہو۔ گہرا سیاہی مائل دروازہ خود میں ہی پوری ہیبت تھا۔

اس بڑے دیو ہیکل دروازے تک دو قدم بھاگتے بھاگتے پہنچے تھے۔ خوب صورت جوان لڑکی کے قدموں نے ست رنگی دھاگوں سے سجی ہوئی جوتیاں پہنی ہوئی تھیں۔ جس کے کناروں کو اس کی چاندی کے پازیب کے گھنگرو چھو رہے تھے۔ بہت ہفتوں سے حویلیاں شہر میں بادل نہیں برسے تھے۔ اس لیے حویلی تک آنے والی واحد سڑک پر دھول بہت زیادہ تھی۔ لڑکی کی پاؤں، جوتیوں اور چاندی کی پازیبوں پر بے تحاشا دھول چڑھ چکی تھی۔ پھر ویسے بھی جو کام وہ کر کے لوٹی تھی اس میں دھول کا دماغ پر چڑھنا یا پاؤں سے لپٹ جانا تو طے تھا۔ ارا سے اس دھول کی پروا ہی بھلا کب تھی۔ وہ اتھری ہرنی تھی۔ قلانچیں بھرتی تو شیر شکار بھول کر اسے دیکھا کرتے تھے۔ پھر عمر بھی ایسی تھی۔ جب ساون بن موسم کے ہی چلا آتا ہے۔ اور جاڑے میں بھی پتے نہیں گرتے ......عزم تو ایسا جوان تھا کہ دور نزآتے قراقرم کے پہاڑ محض نظر بھر کر دیکھ لینے سے ہی سر ہو جاتے۔ دیواریں پھلانگنے، کھڑکیاں کودنے، گھروں کے دروازوں پر دستک دے کر بھاگ جانے کو وہ بھلا سمجھتی ہی کیا تھی۔

سب نے منع کرنے کے بجائے ویسے بھی اسے مزید ہلا شیری دی تھی۔

''ارے، اپنی صندل تو شیر کے منہ سے نوالہ چھین لائے۔ مہندی کے پتے کیا چیز ہیں۔''
روشنائے نے بڑھا اکسانے میں پہل کی تھی۔

''تم شیر کی بات کرتی ہو۔ میں تو کہتی ہوں کہ ڈائینوسارز ہوتے تو وہ بھی صندل سے ڈر جاتے۔''

''ارے، وہ تو خود صندل کے ہاتھوں پر مہندی لگایا کرتے...... جس دن، چڑیل وڑیل سے ہماری صندل نہیں ڈرنے والی...... پھر بہاری کی بیگم کیا چیز ہے۔''

اور اس طرح ان سب کزنوں نے مل کر اسے بہاری کے گھر جا کر مہندی کے پتے چوری کر لانے پر آمادہ کر لیا تھا۔ وہ بھی مان گئی تھی۔ اسے ایسے کام کرنے میں مزا آتا تھا۔ خاردار باڑ کی سرحد والے باغوں سے پھل چرانے، اندھے فقیر کے کشکول میں کنکر ڈال کر دعائیں لینے، راہ چلتے کسی لڑکی کے چٹکی کاٹ کر نام کسی اور کا لگا دینے میں اسے مزا آتا تھا۔ تاہم بہاری کے گھر کی دیوار جس پر رنگ برنگے ٹوٹے کانچ بھی لگے ہوئے تھے اسے پار کر کے پچھواڑے میں لگے مہندی کے پودے سے پتے چرا کر لانے والا کارنامہ کچھ بڑا تھا لیکن کزنوں کی ہلا شیری کی وجہ سے صندل کو وہ قبول کرنا پڑا۔ اب ترقی بھی تو ضروری ہوتی ہے ناں...... چاہے شرارتوں میں ہو یا نیک نامی میں ہو۔ اور صندل کو نیک نامی کی ترقی نہیں چاہیے تھی۔ نیک لوگوں سے ساری حویلی بھری پڑی تھی۔ پھر وہ کیوں نیک بی بی بنتی...... اسے تو چھلاوا بننا تھا۔ سماعتوں میں ''واؤ'' کہہ کر چھو ہو جانے والا۔

عید کے چاند کا اعلان ہو چکا تھا اور صندل کو گئے بھی بہت دیر ہو چکی تھی۔ سب کزنز، تینوں پھوپھیاں اور حاجی بوا سورج مکھی کے پھول والے صحن میں بیٹھی صندل کا انتظار کر رہی تھی۔ باقی سب نے سارے کام مکمل کر لیے تھے۔ ہلکے پھلکے کام وہاں ہی بیٹھ کر پورے کیے جا رہے تھے۔ شکیلہ پھوپھو اپنی بیٹیوں سارہ اور زارا کی فراک کے دامن کی ترپائی کر رہی تھیں۔ تہمینہ پھوپھو تعبیر کی گود میں سر رکھے

اس سے اپنی بھنویں منڈوا رہی تھیں۔ اور زہرہ پھوپھو صندل کے انتظار میں اتاولی ہوئی جا رہی تھیں۔ کہیں تو آج انہوں نے بھی سالوں بعد مہندی لگانے کا قصد کیا تھا تو مہندی کہہ رہی تھی کہ جا میں نے آج تیرے ہاتھوں پر نہیں لگنا۔

''کہیں بہاری کی بیگم نے صندل کو دھر تو نہیں لیا۔'' کرن نے خدشہ ظاہر کیا تھا۔ اسے ہمیشہ صندل کے بارے میں الٹے سیدھے خیالات آتے رہتے تھے۔

''نہیں وہ بازار گی ہیں۔ اپنی پنڈلیوں اور بازوؤں کے بال صاف کروانے......اور خیر سے جتنا گھنا جنگل اس کے بازوؤں پر ہے پارلر والی تو کل عید کی نماز تک فارغ ہونے والی نہیں......''

''تو پھر صندل کہاں رہ گئی ہے۔'' حاجی بوا کو فکر ہونے لگی تھی۔ ''میں نے کہا بھی تھا کہ بازار سے مہندی منگوا لیتے ہیں۔ لیکن اس گھر میں تو میری کوئی سنتا ہی نہیں ہے۔'' حاجی بوا نے سالوں پرانا کا اپنا شکوہ پھر سے رویا تھا۔

''بازار کی مہندی میں وہ بات نہیں ہے حاجی بوا۔ جو بہاری کی بیگم کے گھر میں اگے پودے میں ہے۔''

''ہاں......ٹھیک کہتی ہو۔ پان کی پچکاریاں جو تھوکتی ہے وہ پودے میں ہی۔''

''اللہ بوا......دل تو نہ خراب کرو۔'' تہمینہ پھوپھو نے تعبیر کی گود میں سے سر اٹھا کر کہا تھا۔

''ہلیں مت خالہ......'' تعبیر انہیں ایسے ہدایت دے رہی تھی جیسے بھنوئیں مونڈنے میں وہ پی ایچ ڈی کر چکی ہو۔

''میں جا کر دیکھتی ہوں۔'' افشیں سستی کو خدا حافظ کہہ کر اٹھتے ہوئے بولی تھی۔ تب ہی حویلی کا بڑا دروازہ ایسے کھلا تھا جیسے باہر ہاتھیوں کی فوج آ گئی ہو۔

''میں آ گئی ہوں۔'' صندل نے اندر داخل ہو کر جوش سے کہا تھا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ چہرے پر کارنامے کے کامیاب ہو جانے کی خوشی موجود تھی۔ سب اسے سوالیہ انداز میں دیکھنے لگیں۔ تب

اس نے اپنے پیچھے چھپائی مہندی کی ٹہنیاں نکال کر سب کو دکھائی تھیں۔

''اللہ......'' سب کزن نے مشترکہ طور پر چیخ ماردی تھی۔ ''تم نے کرلیا صندل......''

''اور نہیں تو کیا...... یہ کون سا اتنا مشکل تھا۔''

''دیوار پھلانگتے تمہیں چوٹ تو نہیں آئی۔'' کرن اسے دائیں بائیں سے دیکھ رہی تھی۔ صندل سب ہی کچھ کرلیتی تھی۔ کہیں تو اس کی بھی سبکی ہو۔ لیکن کرن کو کوئی چوٹ نہ مل سکی۔ الٹا اس کی سبکی ہوگئی۔

''تمہیں کسی نے دیکھا تو نہیں صندل۔'' حاجی بوا کی فکریں الگ نوعیت کی تھیں۔

''دیکھ بھی لیتا تو کیا کرتا...... میں رکنے والی نہیں تھی۔''

''اے پاگل لڑکی! اس طرح غلط مشہوری ہوجاتی ہے۔ بعد میں شادی ہونے کا مسئلہ ہوتا ہے۔''

''آپ کی ہوگئی ناں شادی بوا...... میری فکر مت کریں۔ میری بھی ہوجائے گی۔ یہ لیں۔ جلدی سے مہندی کو پیس دیں۔ رات تو ویسے شروع ہوچکی ہے۔ دیر ہوگئی تو صبح ہاتھوں پر اچھا رنگ نہیں آئے گا اور ساری محنت اکارت جائے گی۔ اب عید پر بھی ہاتھوں پر بازار والی مہندی کا رنگ آیا تو فائدہ جان جوکھم میں ڈالنے کا......''

صندل نے مہندی کی ٹہنیاں حاجی بوا کو دے دی تھیں۔ جو فوراً سے سِل بٹے پر انہیں پیسنے لگتی تھیں۔ وہ کافی دیر سے سل بٹہ لیے ہاں ہی بیٹھے ہوئے اس کے آجانے کا انتظار کررہی تھیں۔

''کیا ساری ٹہنیاں توڑ لائی ہو؟''

''اور نہیں تو کیا...... پوری بارات تو بیٹھی ہے یہاں مہندی لگوانے کو......''

''اب بہاری کی بیگم کیا کرے گی؟'' افشیں نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ ''اسے پتہ چل گیا کہ اس کا قیمتی مہندی کا پودا صندل نے چوری کرلیا ہے تو کل ہی پورے بہار کو تیر کمان سمیت ہماری حویلی کے سامنے لا کھڑا کرے گی۔''

''ورنہ اپنے پان کی پچکاریوں سے ہی ہاتھوں پر نقش نگار بنالے گی۔'' سارہ کی بے ساختہ بات پر سب ہنسی تھیں۔ تہمینہ پھوپھو نے کچھ زیادہ ہل جل کی تھی۔

''ہلیں مت خالہ......'' تعبیر کو بھنوؤں کی خراب ہو چکی طرز کے مزید خراب ہو جانے کا خدشہ لاحق تھا۔ وہ کسی بہانے سے بھنوؤں کی خرابی تہمیہ پھوپھو کے کھاتے میں ہی ڈال دینا چاہتی تھی۔

''دھیان سے...... کہیں میری امی کو گنجا ہی نہ کر دینا۔'' روشنائے نے بناوٹی فکرمندی سے کہا تھا۔

''میرے ہاتھ میں دھاگا ہے، استرا نہیں۔'' تعبیر نے تڑخ کر کہا تھا۔ ایک تو وہ حساب اٹھا کر رکھنے کی عادی نہ تھی۔ دوسرا بہت جلدی غصہ کر جایا کرتی تھی۔

''چاند امی کہاں ہیں؟'' بڑی دیر کے بعد صندل کو اپنی امی کا خیال آیا تھا۔

''وہ تو سوگئی ہیں۔ کہہ رہی تھیں کہ صبح جلدی بھی اٹھنا ہے۔''

''کیا انہوں نے دوپٹے پر کرن لگا دی تھی؟''

''کر تو رہی تھی کام...... لیکن تم فکر مت کرو صندل...... دوپٹہ نہ مکمل ہوا تو میں صبح اٹھ کر مکمل کر دوں گی۔'' حاجی بوا نے جلدی جلدی ہاتھ چلاتے ہوئے کہا تھا۔ اتنے میں زارا اندر سے گلگلے پکا کر لے آئی تھی۔

''لو کھاؤ، اناج کے دشمنو۔'' اس نے طشتری لا کر سب کے درمیان رکھ دی تھی۔

''اناج کی دشمن تو تم خود ہو۔ ہمارا خیال تمہیں اسی لیے آیا ہے کہ تمہارا اپنا من چاہ رہا تھا۔ شکیلہ خالہ...... اپنی بیٹی پر ابھی سے کنٹرول کریں۔ بہت وزن بڑھا لیا ہے اس نے اپنا۔ لڑکا دیکھنے نکلیں گی تو ہاتھی کا رشتہ ہی ہاتھ آئے گا۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہے روشنائے...... ذرا تم ناں ذرا کم کھانا کھایا کرو۔''

''اللہ، بھینس کی بھینس ہو رہی ہے لڑکی۔''

''امی! ایسے ہی مت بولا کریں مجھ پر...... اور خالہ آپ بھی ساتھ میں مل گئی ہیں۔ کہاں کھاتی ہوں میں......''

''ارے، کہاں کہاں نہیں کھاتی ہو تم۔ باورچی خانے میں، بیڈروم میں، چھت پر، دالان میں، کھڑکی پر، جھرونکے میں، ایک کبوتروں کا پنجرا بچا ہے، اس میں بھی بیٹھ کر کھا لیا کرو......'' صندل کی بزلہ سخن پر سب پھر سے ہنسی تھیں۔ تہمینہ دل کھول کر ہنسی تھیں۔

''ہنسیں مت خالہ......'' تعبیر نے کانپتے ہاتھوں سے ان کی بھنوئیں مونڈتے ہوئے کہا تھا۔

''بنا دے تعبیر...... اور کتنی دیر لگے گی۔ میری گردن اکڑ گئی ہے۔''

''بس دو منٹ اور......''

''تیری گنتی ٹھیک نہیں ہے کیا...... دو گھنٹے سے دو منٹ کا کہہ رہی ہے۔''

''بس پھر ایک منٹ اور......''

''کوئی مجھے بھی کھلا دے۔ سیل بٹے پر لگا یا ہوا بوڑھی کو......'' حاجی بوا نے دہائی دی تھی۔

''تو میں تمہارے منہ میں ڈال دیتی ہوں بوا......'' صندل نے کہا تھا اور مہربانی کرنے کے بجائے شرارت کرتے ہوئے ایک گرما گرم گلگلا حاجی بوا کے منہ میں پورے کا پورا ڈال دیا تھا۔

''اللہ...... تیرا ستیاناس جائے صندل...... میرا منہ جلا دیا۔'' بوا نے گلگلا اگلا تھا، جو گنجے کی طرح لڑھکتا ہوا دور تک چلا گیا تھا۔

''کیا شارٹ مارا ہے بوا......'' سب لڑکیاں ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہونے لگی تھیں۔

''اتنے سے گلگلے سے کیا ہو گیا بوا...... سنا ہے آپ تو جوانی میں سالم مرغ ہڑپ کر جایا کرتی تھی۔''

''اور نہیں تو کیا۔ چاند امی بتا رہی تھیں کہ بورا تو ایک ساتھ پورا مالٹا کھایا کرتی تھیں۔ بنا پھانکیں الگ کیے۔''

"تم نے غلط سنا ہے۔ چاند امی نے مالٹے کا نہیں تربوز کا کہا تھا۔ وہ بھی بن چھیلے۔"

"ارے بس کرو۔ پتا نہیں کیا کیا باتیں بنا رہی ہو میرے بارے میں۔"

"سنا تو ایسا ہی ہے۔ اب چاند امی جھوٹ تو بولتی نہیں ہیں۔ بتا رہی تھیں کہ آپ اپنے شوہر نامدار کو بھی سالم چٹ کر گئی تھیں۔" صندل نے ناوٹی معصومیت سے کہا تھا۔ بوا نے بھی اسی وقت بدلہ لینے کی سوچی تھی۔

"تم نے کیا سنا ہوگا جو آج میں تم سب کو سنانے لگی ہوں۔" بوا نے شروعات کی تھی۔ صندل کو پتا چل گیا تھا کہ اب بوا بدلہ لینے پر اتر آئی ہیں اور بدلہ لے کر رہیں گی۔

"ہاں...... بتائے ناں بوا......" سب لڑکیاں اشتیاق سے پوچھنے لگیں۔ انہوں نے صندل کی طرح بس اتنا سن رکھا تھا صندل چاند امی کی لے پالک بیٹی ہے۔

"کوئی اسے حویلی کی دہلیز پر چھوڑ گیا تھا۔ چاند نے سنی تھی سب سے پہلے اس کے رونے کی آواز...... وہ ہی لائی تھی اسے حویلی کے اندر...... اور پھر اسی نے کہا تھا کہ میں اسے پالوں گی۔"

"کیا اس چوڑی کو حویلی میں رکھنے پر کسی نے اعتراض نہیں کیا تھا؟" کرن ہنستے ہنستے خود ہی لوٹ پوٹ ہو گئی تھی۔ نامحسوس طریقے سے صندل کو نیچا دکھانے میں اسے بہت مزا آتا تھا۔ تہمینہ، شکیلہ اور زہرا بھی مسکرا رہی تھیں۔ بوا خوب قصہ چھیڑ بیٹھی تھیں۔ سب کو سالوں پہلے کی وہ رات یاد آ گئی تھی۔

"نہیں...... تب یہ پیاری ہوا کرتی تھی۔"

"کیا مطلب بوا...... کیا اب میں پیاری نہیں ہوں؟" صندل معصومیت سے چلائی تھی۔

"اے بہن، ہمیں قصہ سننے دے۔ تیری خوب صورتی کی تریف کل عید والے دن کریں گے۔ ہاں بوا...... پھر کیا ہوا؟"

"خیر، چاند نے صندل کو گود لینے کا فیصلہ کر لیا۔ دین بابا نے تو صاف انکار کر دیا تھا اسے گھر میں

رکھنے سے۔ بستامی تو کہتا تھا کہ اسے یتیم خانے میں دے آتے ہیں، لیکن چاند نے التمش کو خط لکھ کر اس سے اجازت لے لی۔ تب التمش لندن میں ہوا کرتا تھا۔'' بوا کی آنکھ میں نجانے کیسے آنسو چلا آیا تھا۔ جسے انہوں نے جلدی صاف کرلیا تھا۔ تہمینہ، شکیلہ اور زہرہ کے علاوہ کسی نے بوا کی اس حرکت کو نہیں دیکھا تھا۔

''پھر یہ پتا نہ چلے کہ یہ موئی کس مذہب کی ہے۔ ہمیں تو شک تھا کہ یا تو یہ ہندو ہے یا سکھ......''

''اللہ، یہ تو سوچا ہی نہیں ہم نے۔ صندل بوا ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ تو مسلمان لگتی بھی نہیں...... سکھنی لگتی ہے۔''

''نہیں سکھنی نہیں...... مجھے تو صندل ہندنی لگتی ہے۔ رادھا میرا جیسی۔''

''آج سے ہم تجھے سیتا دیدی کہا کریں گے۔'' لڑکیاں ہنس ہنس کر بے حال ہو رہی تھیں۔ صندل بھی کھسیانی سے ہو کر ہلکا ہلکا مسکرا رہی تھی۔

''پھر رحبان کے مشورے پر اسے پاک کرلیا گیا۔'' حاجی بوا نے اپنا قصہ جاری رکھا۔

''کیا......؟ پاک......؟'' لڑکیوں نے مشترکہ طور پر چیخ ماردی تھی۔

''ہاں...... اس زمانے میں یہ ہی چلن تھا۔ ہجرت نے لوگوں کو دائیں بائیں کردیا تھا۔ ہندوؤں، سکھوں کے گھروں میں مسلمان تھے اور مسلمانوں کے گھروں میں ہندو اور سکھ...... اب دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کی کھانے پینے کی چیزیں استعمال کرتے ہوئے الجھن محسوس ہوتی تھی۔ تو سکھوں نے یہ حل نکالا کہ وہ برتن کو سات جوتے مار کر پاک کرلیتے تھے۔ ہندو گنگا جل سے دھولیتے تھے اور مسلمان کلمہ پڑھتے ہوئے برتن دھو کر اسے پاک کرلیا کرتے تھے۔ مولویوں نے فتوے دیے ہوئے تھے۔ لاوارث بچوں کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا جارہا تھا۔''

''تو صندل کے ساتھ کیا کیا؟''

''رحبان کے کہنے پر صندل کے سر کے سارے بال اتار کر اسے نہلاتے ہوئے پاک کیا تھا چاند

نے...... وہ ساتھ ساتھ منہ میں اللہ کے نام بھی پکارتی جاتی تھی۔''

''یہ والا طریقہ کیوں اپنایا آپ لوگوں نے بوا...... سات جوتے مار کر پاک کرتے ناں آپ اسے......'' لڑکیاں تو شاید آج ہنستے ہنستے نڈھال ہونے کو تھیں۔ تہمینہ، شکیلہ اور زہرہ پھوپھو کی ہنسی بھی رکنے نہیں آ رہی تھی۔

''اس طرح پھر پاک ہو جانے کے بعد چاند نے اسے اپنی بیٹی بنا لیا۔''

''لیکن یہ تو ابھی تک پاک ہی نہیں ہوئی ہے۔ دیکھیں کتنی بدبو آتی ہے اس میں سے......'' کرنل کو صندل کے حوالے سے اپنے سارے حسد باہر نکالنے کا موقع مل گیا تھا۔

''لگتا ہے رحمانی بابا شروع سے ہی مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔'' وہ قصے پر ہنسنے سے زیادہ پرانے وقت کو محسوس کرتے ہوئے مسحور ہو رہی تھی۔

''ہاں...... وہ تمہیں گجراتی لوریاں سنایا کرتا تھا۔ جسے سن کر تم روتے ہوئے چپ ہو جایا کرتی تھیں۔''

''بوا، مجھے لگتا ہے کہ سارا قصہ آپ نے سچ سنایا ہے۔ بس ایک بات غلط بتائی ہے۔ صندل کو کوئی حویلی کے دروازے پر نہیں چھوڑ گیا تھا بلکہ یہ چاند امی کو کوڑے کے ڈھیر پر سے ملی تھی۔ گندی مندی سی...... نہلانے کے بہانے چاند امی اسے حویلی لے آئیں اور یہ یہاں کی ہی ہو کر رہ گئی۔'' سب پھر سے ہنسی تھیں اور وہ بناوٹی غصے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''میں نہیں بیٹھ رہی تم سب میں...... میں جا رہی ہوں اپنے کمرے میں۔'' کہتے ہوئے اس نے پسی ہوئی مہندی سے بھرا کٹورا بھی پکڑ لیا تھا۔

''اتنی ساری خود لگاؤ گی کیا؟''

''نہیں...... چاند امی کو بھی لگاؤں گی۔''

''ایسا غضب مت کرنا صندل...... تمہارے باپ کے مرنے کے بعد چاند نے آج تک مہندی

نہیں لگائی۔''بوا نے پیچھے سے تیز آواز میں اسے پکارتے ہوئے کہا تھا۔ان کے لہجے میں خوف تھا۔کہیں صندل چاند کے ہاتھوں پر مہندی لگا ہی نہ دے۔

''امی میری کسی بات پر ناراض نہیں ہوتی ہیں۔آپ فکر مت کریں۔وہ آپ کو کچھ نہیں کہیں گی۔'' کہتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔

''چلو لڑکیو! مہندی لگالی ہے تو اب اٹھو۔صبح جلدی بھی اٹھنا ہے۔عید کی نماز کا وقت سات بجے کا ہے۔'' کزنوں کی نیک پروین افشیں نے کہا تھا۔اسے ویسے بھی بڑی بوڑھی بننے کا شوق رہتا تھا۔''اور جتنا تم سب نے تیار ہونا ہے ناں......میں تو کہتی ہوں ابھی سے تیار ہونا شروع کر دو۔''

صندل کے جاتے ہی سارا ہجوم بھی اپنے اپنے کمروں میں چلا گیا تھا۔سب سے آخر میں تہمینہ پھوپھو اور تعبیر اٹھی تھیں۔بھنوؤں کا کام بالآخر مکمل ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

صندل اوپر کمرے میں پہنچی تو چاند امی بیڈ پر لیٹے بہت میٹھی نیند سو رہی تھیں۔ان کا ایک ہاتھ تو ان کے چہرے کے ہی نیچے تھا اور ایک بیڈ پر دھرا ہوا تھا۔صندل نے آگے بڑھ کر بڑی احتیاط سے کٹورے میں سے مہندی نکال کر چاند امی کی ہتھیلی پر ایک چھوٹی سی گول ٹکیا بنا دی تھی۔اور پھر تھوڑی تھوڑی انگلی کے پوروں پر بھی لگا دی تھی۔چاند امی سو رہی تھی اور وہ محبت سے انہیں دیکھتی جا رہی تھی۔بہاری کی بیگم کے نایاب مہندی کے پودے کا رنگ چاند امی کے ہاتھوں پر بہت بھلا دکھنے والا تھا۔وہ جانتی تھی۔

اس نے اپنی سگی ماں کو تو نہیں دیکھا نہ ہی اسے دیکھنے کی طلب تھی۔اس کے باوجود وہ جانتی تھی کہ اس کی سگی ماں کسی بھی صورت چاند امی سے بڑھ کر خوب صورت نہیں ہو سکتی تھی۔چاند امی تو پوری حوری تھیں حور......

کھڑکی کے سامنے بیٹھ کر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں پر بھی مہندی لگائی تھی اور پھر کمرے کی

ساری روشنی بجھا کر وہ سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔ ابھی اسے نیند نہیں آئی تھی جب کسی کے چلانے کی آواز پر وہ چونکی تھی اور ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔ پھر لمحے بھر بعد آواز پہچانتے ہوئے وہ بے اختیار ہی ہنس دی تھی۔

رات کی خاموشی میں حویلی سے بہت دور بہاری کی بیگم اپنے نایاب مہندی کے پودے کو گنجا دیکھ کر ایسے چلا رہی تھی جیسے کوئی کند چھری سے اس کا گلا کاٹ رہا ہو۔

☆......☆......☆

صبح عید کا دن تھا۔ سب لڑکیاں عید کی نماز سے پہلے ہی ایسے تیار تھیں جیسے کسی شادی کی تقریب پر جا رہی ہوں۔ سوائے افشیں کے...... وہ وضو کر کے کس کے دوپٹہ لپیٹ کر ایسے لگ رہی تھی جیسے عید کی نماز پڑھنے نہیں بلکہ حج کرنے جا رہی ہو یا کر کے آئی ہو۔ ایسے کسے کسائے حلیے میں وہ باقی سب کو حیرت سے دیکھنے لگی تھی۔

''تم سب کیوں اتنا تیار ہو؟''

''پاگل...... یہ ہی تو موقع ہوتا ہے جب لڑکے کی ماں اپنے خوبرو جوان بیٹے کے لیے لڑکی دیکھتی ہے۔'' سارہ نے آنکھ دباتے ہوئے شرارت سے کہا تھا۔

''توبہ...... اللہ معاف کرے۔ تم عید کی نماز پڑھنے جا رہی ہو یا اپنے لیے ساسیں ڈھونڈنے......''

''ہم کسی کو نہیں ڈھونڈنے جا رہیں۔ ہماری ہونے والی ساس ہمیں خود ہی ڈھونڈ لے گی۔'' کرن نے ادا سے کہتے ہوئے سب کی ترجمانی کر دی تھی۔

''یہ مراثی پن بعد میں کر لینا...... ابھی دیر ہو رہی ہے چلو۔''

''صندل کو تو بلا لو۔''

''میں آ گئی ہوں۔'' کلائی میں چوڑیاں چڑھاتی ہوئی وہ ان تک پہنچی تھی۔ اور لمحے بھر کے لیے

سب دم بخود ہی رہ گئی تھیں۔ صندل نے گلابی شفون پر ہلکا سا تلے کا کام کروایا تھا۔ اور اوپر گلابی شفون کا ہی دوپٹہ لیا تھا۔ پاؤں میں اس نے چمڑے کا گہرے رنگ والا کھسہ پہنا تھا اور چوڑی دار پاجامے کے نیچے حسب معمول چاندی کی پازیبیں۔ بالوں کی ڈھیلی ڈھالی چوٹی کیے وہ ان سب میں سب سے زیادہ پیاری لگ رہی تھی۔

''ماشاءاللہ...... کتنی پیاری لگ رہی ہے میری دلاری۔'' روشنائے نے دل کھول کر تعریف کی تھی۔

''آج پہلی بار تھوڑی نا لگ رہی ہوں۔'' وہ بھی دل کھول کر اترائی تھی۔

سب نے عید کے لیے بڑے بھاری جوڑے بنوائے تھے۔ ایسے میں صندل کا ہلکا پھلکا سوٹ ان سب کو ہی بہت بھا رہا تھا۔

''میں نے کہا بھی تھا کہ مجھے اتنا بھاری جوڑا نہیں چاہیے۔ مگر اس گھر میں میری سنتا ہی کون ہے۔'' کرن کو ایک دم سے ہی اپنا جوڑا بہت زیادہ خراب لگنے لگا تھا۔

''یہ رونے بعد میں رو لینا۔ وہاں امام صاحب ہمارا انتظار نہیں کریں گے۔ انہوں نے جماعت کھڑی کر دینی ہے۔''

سب باہر نکلنے کو تھیں جب پیچھے سے حاجی بوا نے انہیں آواز دی تھی۔

افشیں نے سب کی جائے نمازیں پکڑ لی تھیں۔ بڑا گیٹ کھول کر ساری لڑکیاں باہر کو نکلی تھیں۔

عید کی جماعت کا انتظام بڑے باغ میں کیا گیا تھا۔ جب وہ سب پہنچیں تو تکبیر بلند ہونے لگی تھی۔ بمشکل ہی ان کی رکعت چھوٹتے چھوٹتے رہ گئی تھی۔ نماز کے بعد لمبی دعا اور پھر دعا کے بعد سب اٹھ کر ایک دوسرے سے عید ملنے لگے۔ آپس میں عید ملنے کا تو جیسے کسی کو خیال ہی نہیں آیا۔ سب لمحوں میں تتر بتر ہو گئی تھیں۔ سارہ، زاا اور کرن تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی عورتوں سے عید مل رہی تھیں جو ان کے حساب سے نہ صرف کافی مال دار تھیں بلکہ جوان اور خوب صورت لڑکوں کی ماں بھی تھیں۔

''عید مبارک خالہ جان۔''

''عید مبارک چچی جان۔'' خود سے ہی خالہ اور چچی کا رشتہ بھی دے دیا تھا کہ خالی خالی عید مبارک کہنا تو ویسے ہی برا لگتا ہے۔

''خیر مبارک...... کہاں سے ہو بیٹی؟''

''دین حویلی سے۔''

''وہ جو ٹیلے کے اوپر ہے؟''

''جی وہی۔ آپ آیئے گا وہاں کسی دن...... مجھے انتظار رہے گا۔'' کرن خوشامد کی ساری حدیں پار کرتے ہوئے بولی تھی۔ جب تعبیر اس کے کان کے پاس منہ کر کے منمنائی تھی۔

''اے پاگل...... یہ بیوہ عورت ہے۔ اس کا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ ایسے ہی گھر بلا رہی ہو۔''

''ہائے اللہ...... ستیاناس جائے میرا۔ میں ایسے ہی اس موٹی کے ساتھ کیکلیاں ڈال رہی ہوں۔'' کرن کو صدمہ پہنچا۔

''اچھا خدا حافظ آنٹی۔ ہماری حویلی کا راستہ کافی نشیبی ہو چکا ہے۔ میرا نہیں خیال اس عمر میں وہاں تک آنا آپ کے لیے اچھا ثابت ہوگا۔'' اور کہہ کر وہ جلدی سے کسی دوسری عورت کی تلاش میں وہاں سے کھسک گئی تھی۔

افشیں دور کھڑی سب کا تماشا دیکھ رہی تھی۔ اور خدا کے حضور ان سب کے حصے کی معافی مانگ رہی تھی۔

''یا اللہ، میری کزنیں نادان ہیں۔ انہیں معاف کر دینا میرے مالک...... یہ بھول بیٹھی ہیں کہ یہ یہاں عید کی نماز پڑھنے آئی ہیں۔ انہیں دوزخ کی بھٹی میں نہ سلگانا میرے مالک۔'' وہ عجز سے جھکتی چلی جا رہی تھی۔

تعبیر باری باری سارہ، زارا اور کرن کے پاس جا کر نجانے ان کے کان میں ایسا کیا کہتی کہ لڑکیاں بات کرتی عورت سے فوراً ہی کنی کترا جاتی تھیں۔

''کس لالچی بڑھیا سے بات کر رہی ہے۔ اس نے اپنی پہلی بہو کو جلتے تیل میں اس لیے ڈال دیا تھا کیونکہ وہ جہیز کم لائی تھی۔''

''اس کا بیٹا پہلے دو بیویاں چھوڑ چکا ہے۔ سنا ہے دونوں اب پاگل ہو چکی ہیں۔''

وہ تو بہت بعد میں پتا چلا کہ وہ سب بکواس کر رہی تھی۔ چونکہ وہ سب سے چھوٹی تھی اور ابھی اس کی شادی کی باری نہیں تھی تو وہ ان سب کا کام بھی نہیں بنتے دیکھنا چاہتی تھی۔

زارا چالاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایسی جگہ پر کھڑی ہوئی تھی جہاں عورتیں اپنے بیٹوں کے ساتھ واپس گھروں کو جا رہی تھیں۔

''چچی جان! یہ جائے نماز آپ کا تو نہیں...... وہاں پڑا ہوا تھا۔'' وہ ''چچی جان'' سے زیادہ ان کے جوان بیٹے کو دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

''نہیں بیٹا۔ میں جائے نماز لانا بھول گئی تھی۔ میں نے گھاس پر نماز پڑھی ہے۔''

''اللہ چچی جان۔ تو آپ مجھے کہہ دیتیں میں اپنی جائے نماز آپ کو دے دیتی۔''

''کتنی اچھی بچی ہے۔'' خاتون نے پاس کھڑے لڑکے سے کہا تھا۔ جو زارا کے پھیلے ہوئے وجود کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے قصائی موٹے تازے جانور کو دیکھتا ہے کہ اس میں کتنا گوشت نکل آئے گا۔

''اچھا چچی جان۔ پھر ملاقات ہوتی ہے۔ میں حویلی میں رہتی ہوں۔ مجھ سے یا میری امی سے ملنے کو دل کیا تو ضرور آیئے گا۔''

''ہاں...... ہاں...... کیوں نہیں بیٹا۔''

''چلیے امی۔ ایسے ہی دیر کر رہی ہیں۔'' خاتون کے بیٹے نے زارا کو دیکھتے ہوئے برا سا منہ بنا کر

اپنی ماں سے کہا تو زارا کو اندازہ ہو گیا کہ یہ کم بخت کبھی اپنی ماں کو حویلی تک نہیں لائے گا۔

کرنل کو ایک جگہ واضح کامیابی ہوئی تھی۔

"بیٹا! میں آؤں گی تمہاری حویلی کسی دن...... کیا نام بتایا تم نے اپنی کزن کا......صندل......"

"جی......صندل......" کرنل نے جل کر کہا تھا۔ ہر عورت مڑ مڑ کے صندل کا ہی پوچھ رہی تھی۔

افشیں ڈ دور کھڑی توبہ استغفار کی تسبیح پڑھتی جا رہی تھی۔

"بھئی دور فٹے منہ تم سب کا۔ یہاں یہ کام کرنے آئی ہو۔"

"پڑھنے تو نماز آئے تھے، لیکن ایک تیر سے دو شکار ہو جائیں تو تمہیں کیا مسئلہ ہے۔"

"تم سب ذرا گھر چلو۔ تمہیں آج میں شیر خورما کی جگہ...... تھپڑ خورما کھلاؤں گی۔"

"اچھا بڑی نانی۔" لڑکیاں افشیں کی نیچر کی وجہ سے اسے بڑی نانی کہہ کر چھیڑا کرتی تھیں۔

اوران سب کو دیکھتے ہوئے ایک بڑی بات بڑی نانی...... افشیں نے واضح طور پر نوٹ کی تھی کہ ہر عورت صندل کو دیکھ کر اس کا پوچھتی ضرور تھی۔ عورتوں کو اس خوب صورت لڑکی کے بارے میں تجسس ہوتا تھا۔ وہ صندل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک دوسرے سے بات چیت کرتی تھیں اور پھر نجانے کیا ہوتا تھا کہ نظروں ہی نظروں میں صندل کی خوب صورتی کو سراہنے والی عورت ناک بھوں چڑھانے لگتی تھی۔ وہ جیسے پھر سے صندل کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتی۔ افشیں کو یہ بات بری لگی تھی۔ اور برا لگنے سے زیادہ اسے تجسس ہوا تھا کہ ایسا کیوں ہے۔ عورتیں صندل کو دیکھ کر چہرے پر ناگواری کے تاثرات کیوں لا رہی تھیں۔

پھر جب اس نے اپنے قریب سے گزرتی دو عورتوں کا تبصرہ سنا تو اسے ساری بات سمجھ میں آ گئی تھی۔

"وہ گلابی کپڑوں والی لڑکی بہت پیاری ہے۔ پہلی ہی نظر میں میرے تو دل کو لگی ہے۔ میں اپنے بیٹے کے لیے لڑکی دیکھ رہی ہوں۔ بتاؤ کیسی ہے وہ لڑکی...... جانتی ہو اسے......" آہستہ آہستہ چلتی اس بھاری بھر کم خاتون نے اپنے ساتھ چلتی خاتون سے پوچھا تھا۔

''دین حویلی کی لڑکی ہے۔امیر کبیر لوگ ہیں۔طریقہ سلیقہ بھی بہت ہے۔لیکن لڑکی میں ایک خرابی ہے۔''

''کیا خرابی ہے؟''

''کسی کی ناجائز اولاد ہے۔'' جاتی ہوئی عورت نے افشیں پر جیسے بم گرایا تھا۔

''کوئی اپنی اولاد کو ایسے ہی دروازے کی دہلیز پر نہیں چھوڑ کر جاتا ہے۔ایسے بچے گناہ کی پیداوار ہوتے ہیں۔''

''یہ تو تم ٹھیک کہتی ہو۔اچھا کیا تم نے بروقت بتا دیا۔میں تو کل ہی جانے والی تھی۔''

افشیں نے دور پینگ جھولتی صندل کو دیکھا تھا۔کتنی پیاری تھی اس کی کزن...... باقی سب میں سب سے زیادہ حسین...... سارے شور شرابے سے الگ وہ اپنی مستی میں مست پینگ جھول رہی تھی۔اگر وہ ان دونوں عورتوں کی بات چیت اسے بتا دیتی تو یقیناً اس کا عید کا سارا دن برباد ہو جاتا۔افشیں نے فیصلہ کیا کہ وہ یہ بات صندل کو ہرگز نہیں بتائے گی۔لیکن اس بات سے اسے جتنا رنج پہنچا تھا وہ اسے کہاں ہلکا کرے۔اسے یہ بھی تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

یہ قافلہ تب گھر واپس ہوا تھا جب بہاری کی بیگم ان سب کی مہندی کا رنگ تاڑتے ہوئے بھاگتے ہوئے ان کے پاس آنے کو ہوئی تھی، تب وہ سب چپکے سے وہاں سے کھسک گئی تھیں۔

☆......☆......☆

''عید مبارک...... عید مبارک۔''

بڑا گیٹ کھول کر ساری اندر داخل ہوئی تھیں۔اور ایسے شور مچانے لگی تھیں جیسے سو سال سے چلتی آ رہی جنگ کو بالآخر انہوں نے جیت لیا ہو۔

''کہاں ہیں سب؟''

''سب ادھر ہی ہیں تم سب پہلے قطار میں کھڑی ہو جاؤ۔مجھے نظر اتارنی ہے تم سب کی......''

حاجی بوا نے سب کو قطار میں کھڑا کر دیا تھا۔ اور تھالی میں اسپند اور اجوائن جلا کر ان سب کے گرد سات چکر لگاتے ہوئے ان کی نظر اتار رہی تھی۔ یہ ہی تو رونق تھیں حویلی کی۔ انہی کے دم سے تو خوشیاں تھیں۔ حاجی بوا کو ہر وقت دھڑ کا لگا رہتا ہے کہ اب کچھ ایسا ویسا نہ ہو جائے جیسا سالوں پہلے ہوا تھا۔ کسی کی نظر نہ لگے اس گھر کی خوشیوں کو۔

"آپ ایسے ہی تردد کر رہی ہیں حاجی بوا...... زارا ہمارے ساتھ تھی۔ نظر لگنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" تعبیر نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ جس پر موٹی زارا نے فوراً سے منہ بنا لیا تھا۔ عید کا دن تھا تو اس نے بخش دیا۔ ورنہ وہ اسی وقت حساب چکتا کر دیتی۔

"چلو، اب جاؤ جہاں جانا ہے۔" بوا دھواں دیتے اسپند اور اجوائن لے کر حویلی سے باہر چلی گئی تھیں۔ اور ساری لڑکیاں اس حویلی کے اندر والے حصے میں پہنچی تھیں۔ پہلی باری تہمینہ پھوپھو کی تھی۔ کیونکہ پھوپھو میں سے وہ سب سے بڑی تھیں۔

"لائیں پھوپھو، عیدی دیں۔ اور بالکل کنجوسی نہیں کرنی آپ نے پچھلی بار کی طرح۔"

"جانے دو صندل کہاں کنجوسی کرتی ہوں میں...... پوری حویلی میں سے سب سے زیادہ عیدی میں دیتی ہوں۔"

"جھوٹ...... سب سے زیادہ عیدی میری امی دیتی ہیں...... کیوں لڑکیو......"

"ہاں...... یہ تو ہے۔ سب سے زیادہ عیدی چاندامی دیتی ہیں...... دوسرا نمبر آپ کا ہے خالہ۔ چاہیں تو اس سال پہلے نمبر پر آجائیں۔"

"نہیں۔ میں دوسرے نمبر پر ہی خوش ہوں۔" تہمینہ نے ہنستے ہوئے کہا تھا اور پھر عیدی ان سب کے ہاتھوں میں رکھ دی تھی۔ جسے سب لڑکیوں نے افشیں کے پاس جمع کروا دیا تھا۔

شکیلہ اور زہرہ نے بھی کم و بیش تہمینہ جتنی عیدی ہی دی تھی۔ اس کے بعد سب بستامی بابا کے در پر

ہوئی تھیں۔

بستامی اپنے کمرے میں موجود تھا۔اور حسب معمول اپنا من پسند کھیل کھیل رہا تھا۔ٹیبل پر تاش کے پتوں کو تکون شیپ دے کر ایک دوسرے کے اوپر رکھتے ہوئے وہ اس تکون کی اونچائی بڑھاتا جا رہا تھا۔''تاش گھر'' بنانے کا یہ کھیل انہوں نے روشن بیگم سے سیکھا تھا۔روشن بیگم تو اس کھیل میں بہت ماہر تھیں۔وہ تاش کے چار پانچ پیکٹوں کے ساتھ بھی ''تاش گھر'' بنا لیا کرتی تھیں۔دونوں میں کئی بار شرطیں بھی لگی تھیں جس پر ہمیشہ روشن بیگم ہی جیتی تھیں۔بستامی ایک یا دو پیکٹ کے ساتھ چھوٹی تکون والا تاش گھر تو آسانی سے بنا لیا کرتا تھا لیکن تیسرا پیکٹ استعمال کرتے ہوئے اس کا گھر اپنے ہی بوجھ سے گر جاتا تھا۔یہ کام شاید آج ہو جاتا...... اگر ساری لڑکیاں دھاوا بولنے والے انداز میں کمرے میں اچانک نہ چلی آتیں تو...... اور ان کے ایک دم سے وارد ہونے پر جو ہوا کا دباؤ بنا تو اسی سے بستامی کا سارا تاش گھر ٹیبل پر دھڑام سے گر گیا۔

''لائیں بابا...... عیدی دیں جلدی...... بالکل دیر نہ کریں۔ہم نے ابھی میلے پر بھی جانا ہے۔''

''اچھا دیتا ہوں۔'' بستامی نے پرس نکال کر کچھ نوٹ سب کے آگے کیے۔''یہ تم سب آپس میں بانٹ لو۔''

''یہ کیا...... یہ تو بہت کم ہیں۔''

صندل کے کہنے پر بستامی نے ایک نوٹ کا مزید اضافہ کر دیا تھا۔لیکن صندل کی اس پر بھی بس نہیں ہو رہی تھی۔بڑی مشکل سے اس نے دو مزید نوٹ نلکوائے تھے اور تب کمرے سے باہر نکلی تھیں۔کم عیدی ملنے پر لڑکیاں خوش نہیں تھیں۔ان کے جانے کے بعد بستامی اپنے پرس کو اور ٹیبل پر گرے ہوئے تاش کے پتوں کو دیکھنے لگا۔حویلی کے معاشی حالات دن بدن خراب ہو رہے تھے۔بچت ختم ہو رہی تھی اور اضافے کا کہیں سے کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔اڈے کا کام بھی مندا جا رہا تھا۔اور ساتھ والے

سیب کے باغ کے پھل بھی اس سال اچھے نہ آئے تھے لیکن وہ اب یہ ساری باتیں ان لڑکیوں کو کیسے سمجھاتا۔ سمجھا بھی دیتا تو جو کرنا تھا اسے خود ہی کرنا تھا۔ دین بابا کی موت کے بعد اب وہی اس گھر کا رکھوالا تھا۔

بستامی کے بعد لڑکیاں رحبانی کے کمرے میں آدھمکی تھیں۔

''بستامی باب سے زیادہ عیدی چاہیے ہمیں آپ سے...... میں پہلے ہی بتادوں۔ انہوں نے چار ہزار دی ہے۔ آپ کو زیادہ دینی ہوگی۔'' صندل نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا تھا۔

''لیکن میرے پاس تو اتنے پیسے نہیں ہیں اس بار۔''

''کیوں نہیں ہیں۔ نہ آپ کی کوئی بیوی، نہ بچے...... پھر کہاں کرتے ہیں اتنے پیسے......'' کرن نے کچھ اس انداز میں کہا کہ سب سمیت رحبانی بھی ہنسنے لگا تھا۔ اور اس نے ایک ہزار بڑھا کر ان سب کو عیدی دے دی تھی۔

''ساری عیدی ملا کر کل کتنی ہوگئی ہے افشیں......؟''

''ہر لڑکی کے حصے دو دو ہزار آجائے گا۔'' افشیں نے انگلی پر حساب کرتے ہوئے بتایا تھا۔

''اتنی کم......؟ بڑی نانی آپ پیسے اپنی گتھی میں تو نہیں ڈال رہیں......'' کرن نے لقمہ دیا تھا۔

''مجھ پر اعتبار نہیں تو پکڑ لو اپنے پیسے سب......'' اور افشیں کی عادت تھی جلدی بھڑک جاتی تھی۔

''اب چاندامی کے پاس چلتے ہیں۔ سب سے زیادہ عیدی تو وہی دیتی ہیں۔''

''ہاں...... لیکن چاندامی کو میں نیچے لاتی ہوں۔ پھر ان سے عیدی لیں گے۔''

ساری لڑکیاں نیچے اتر گئی تھیں اور صندل اپنے کمرے میں آئی تھی۔

چاندامی کرسی پر بیٹھے ہوئے دوپٹے پر کرن ٹانک رہی تھیں۔ صندل کی طرف ان کی پشت تھی۔ صندل نے پیچھے سے جا کر ان کو گلے سے لگا لیا تھا۔

''عید مبارک امی......'' اس نے چہک کر خوشی سے کہا تھا۔

''خیر مبارک میری جان......'' چاند امی نے اس کے ہاتھوں پر پیار سے اپنے ہاتھ رکھ دیئے تھے۔

''میں کب سے نیچے سے تمہاری آواز سن رہی ہوں۔ انتظار میں تھی کہ تم میرے پاس کب آتی ہو۔ لو...... تمہارا دوپٹہ تیار کر دیا میں نے۔ اور تم اسے لیے بنا ہی نماز کے لیے چلی گئیں۔'' انہوں نے تیار دوپٹہ اس کے آگے کیا تھا۔

''یہ دوپٹہ میرا نہیں ہے۔ یہ تو میں آپ کے لیے ہی تیار کروا رہی تھی۔''

''میرے لیے''

''جی......''

چاند امی ایک دم سے ہی اداس ہو گئی تھیں۔

''تم جانتی تو ہو صندل کہ تمہارے باپ کے مرنے کے بعد سے میں نے آج تک سر پر سفید رنگ کے علاوہ کوئی اور دوپٹہ نہیں رکھا ہے۔ پھر یہ سب کیوں کیا تم نے۔''

''بس آج عید کے دن کے لیے امی......''

''ضد مت کرو میری جان۔ اور یہ تم نے رات میں کیا کر دیا۔'' انہوں نے اپنا مہندی سے رنگا ہاتھ اس کے سامنے کیا تھا۔

''ارے دکھائیں۔ کتنا اچھا رنگ آیا ہے۔ ہم سب سے زیادہ اچھا......'' وہ آگے بڑھ کر چاند امی کا ہاتھ دیکھنے لگی تھی۔

''مت کیا کرو ایسا صندل...... بیوہ ہونے کے بعد میں نے یہ سب نہیں کیا ہے۔''

''کیا ایک بار بھی نہیں؟''

''بس...... ایک بار......'' اور یاد کرتے ہوئے چاند امی کی آنکھوں میں ماضی کی وہ پرچھائیں آئی

تھیں جس نے ان کی آنکھوں میں ایک کٹھور سا عکس اتارا تھا۔

''لیکن آج آپ کو کرنا پڑے گا۔ اور میں کروں گی آپ کو تیار......اور آپ انکار نہیں کریں گی۔''

''ارے صندل......''

''بس کچھ مت بولیں امی......اپنی بیٹی کی خاطر خاموش رہیں۔'' اور چاند امی خاموش ہوگئی تھیں۔

التمش کے بعد انہوں نے سب سے زیادہ محبت صندل سے کی تھی۔ اب وہ اس کی بات نہ مانتیں تو کس کی مانتیں۔ صندل نے انہیں سنگار میز کے سامنے بٹھا دیا تھا اور اپنا میک اپ وہ ان پر استعمال کرنے لگی تھی۔

''نیچے سب لڑکیاں انتظار کر رہی ہیں عیدی کا......میں نے کہا ہے کہ میں تھوڑی دیر میں آپ کو لاتی ہوں۔ دیکھیے گا آج ان کو حیران کر دوں گی۔'' وہ اپنے میک اپ میں سے چیدہ چیدہ چیزیں کم مقدار میں لیتے ہوئے چاند کے چہرے پر لگا رہی تھی۔ اور چاند خاموش بیٹھے ہوئے سب کرواتی جا رہی تھی۔ اب زندگی کا مقصد ہی کیا رہ گیا تھا۔ یہ ہی کہ بیٹی کی خوشی میں خوش ہوا جائے۔ صندل کو خوش کرنے کی خاطر انہوں نے برسوں کے بعد یہ سب کیا تھا اور انہیں یہ اچھا بھی لگ رہا تھا۔ میک اپ کرنے کے بعد صندل نے بڑے پیار سے ان کے بال بھی بنا دیئے تھے۔ کپڑے بھی تبدیل کرنے کو کہا تھا۔ چند ایک زیورات بھی پہنائے تھے اور پھر جب وہ ان کا سفید دوپٹا اتارنے لگی تو چاند امی نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے تھے۔

''یہ مت کرو میری جان......تمہارے بابا کی جان کا قرض ہے مجھ پر......جب وہ قرض اتر جائے گا تو میرے دوپٹے کا رنگ بھی بدل جائے گا۔''

صندل نے بھی مزید ضد کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ سجی سنوری چاند امی کو لے کر وہ نیچے صحن میں چلی آئی تھی۔

''باہر آؤ بھئی سب......چاند امی کو دیکھو آج......'' خوشی سے چہکتے ہوئے اس نے کمروں کی

طرف منہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ آہستہ آہستہ سب وہاں جمع ہونے لگے تھے۔

"اللہ..... چاندامی آج تو آپ پہچانی نہیں جا رہیں۔" لڑکیاں چاند کو دیکھ کر حیران تھیں۔

"چاند! ایسے لگ رہا ہے جیسے وقت نے تم پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ تم تو ویسی ہی جوان ہو۔" تہمینہ پھوپھو نے کہا تھا۔

"سچ کہہ رہی ہو تہمینہ..... ایسے لگ رہا جیسے چاند کو ابٹن لگانا کل ہی کی تو بات ہو۔"

"خیال رکھا کرو اپنا چاند..... دیکھو صندل نے لمحوں میں تمہیں جوان کر دیا۔ تم ایسے ہی بڑی بوڑھی بنی رہتی ہو۔ ہم سے زیادہ عمر لگتی ہے بعض اوقات تمہاری....." زہرہ پھوپھو نے پیار سے کہتے ہوئے چاند کا ماتھا چوم لیا تھا۔

حاجی بوا نے جلدی سے ہزار کا نوٹ چاند پر سے وارا تھا۔

"نظر نہ لگے میری بچی کو....." اور نجانے کیوں ان کی آنکھوں میں بہت سے آنسو چلے آئے تھے۔

"آج آپ ہمارے ساتھ عید کی نماز پڑھنے جاتیں تو سب نے آپ کو بھی ہماری کزن ہی سمجھنا تھا۔"

"صحیح کہا..... آپ تو بالکل پری لگ رہی ہیں چاندامی۔"

تعبیر کے تبصرے پر چاند بھی پھیکا سا مسکرائی تھیں۔ صندل کو خوش کرنے کے چکر میں وہ اپنے چہرے پر اداسی نہیں لا رہی تھیں۔

اور تب ہی اوپر بالکونی میں رحبانی کا چہرہ نظر آیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھے کافی دیر سے آوازیں سن رہا تھا۔ پھر تجسس سے تنگ آ کر اپنے کمرے سے باہر نکل کر اس نے نیچے جھانکا تھا۔ اور چاند کو دیکھ کر لمحے بھر کے لیے تو وہ حیران ہی رہ گیا تھا۔ تعبیر ٹھیک کہہ رہی تھی۔ چاند تو بالکل پری لگ رہی تھی۔ کوہ قاف کی شہزادی.....

اور چاند کو دیکھتے ہوئے رحبانی کے دل کی کھال سکڑی تھی۔

''کہاں کوتاہی ہوئی مجھ سے...... کہاں غلطی ہوئی جو یہ عورت میری نہ ہو سکی۔ کتنا ٹوٹ کر چاہا تھا میں نے اس عورت کو...... پھر میں اسے حاصل کیوں نہ کر سکا۔ کیا کمی تھی میری محبت......''

اور عین اسی لمحے رحبانی خود سے سوال اور خدا سے شکوہ کر رہا تھا۔ چاند نے بے اختیار ہی سر اٹھا کر اوپر دیکھا تھا۔ دونوں کی نظریں ملی تھیں اور پھر ملی ہی رہی تھیں۔ دونوں نے ایک دوسرے پر سے نظریں ہٹانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ رحبانی جو سوچ رہا تھا وہ چاند پر کشف کی صورت ظاہر ہوا تھا۔

''تیری محبت میں وہ کھوٹ تھا رحبانی جو سونے میں پھٹور کا ہوتا ہے۔ ہیرے میں مودہ کنی کا اور برتن میں سیاہ قلعی کا...... اسی لیے میں تیری نہ ہو سکی اور نہ ہی کبھی ہوں گی۔ تیری اوقات ہی کیا ہے جو تو نے چاند کی طلب کی...... میرے باپ کی نوازشیں نہ ہوتیں تو تُو آج بھی اس گھر کا ملازم ہوتا۔ مالکن کو حاصل کرنے کے خواب کیسے دیکھ لیے تُو نے......''

رحبانی کو یک ٹک دیکھتے ہوئے چاند سوچے جا رہی تھی۔

دونوں میں پچھلے بیس سالوں سے شدید ترین نفرت کا تعلق چل رہا تھا۔



ناول **تاش گھر** ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 1 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 6

حویلی کے معاشی حالات دن بدن بگاڑ کا شکار ہو رہے تھے۔ محفوظ سرمایہ ختم ہوتا جا رہا تھا اور کسی طرف سے کوئی نفع حاصل نہیں ہو رہا تھا۔ خاندانی تجوریاں خالی ہوتی جا رہی تھیں۔ اس سب کی ابتدا دین بابا کی موت کے بعد سے ہی شروع ہو گئی تھی۔ بستام نے سارا کاروبار سنبھالنے کی کوشش کی تھی اور کچھ عرصے تک سب سنبھلا بھی رہا تھا۔ لیکن پھر سب دیکھتے ہی دیکھتے ہاتھوں سے ریت کی طرح پھسلتا چلا گیا تھا۔

دراصل جو سنبھلا ہوا تھا وہ بھی صرف اس وجہ سے کہ دین بابا نے اس کاروبار کی بنیاد بہت مضبوط کر دی تھی۔ ایسی مضبوط بنیاد والے کام کو گرنے میں بھی سالوں کا عرصہ درکار تھا۔ بستام جو شروع میں سمجھ رہا تھا کہ اس نے سب اچھے سے سنبھال لیا ہے تو وہ اصل میں دین بابا کی دن رات کی محنت اور چیزوں کو عرق ریزی سے ترتیب دینے کی حکمت عملی تھی جس نے بستام کی بے توجہی کے باوجود بھی کاروبار کو کچھ عرصے تک چلتا رہنے دیا تھا۔

لیکن آخر کب تک......؟

بے توجہی کے کنکروں نے اس مضبوط دیوار کو ایک نہ ایک دن تو گرانا ہی تھا۔

غلطی دونوں کی تھی۔ بستام کی بھی اور رحبان کی بھی......لیکن دونوں اپنی غلطی ماننے کو تیار نہیں تھے۔ دونوں نے کام پر توجہ دینے کے جائے ایمن اور کومل پر توجہ دی تھی۔ آنکھیں بند کر کے پیسہ لٹایا تھا۔

منڈی کا حساب کتاب ملازموں کے سر پر ڈال دیا تھا۔ اور ملازم تو جیسے اس بات کے لیے تیار بیٹھے تھے کہ ان پر سے حکمرانی ختم ہو۔ وہ خرد برد کرنے لگے تھے۔ کوئی توجہ دینے والا موجود نہیں تھا کہ مال زیادہ جانے کے باوجود بھی گھر میں پیسہ کم کیوں آ رہا ہے۔

دین بابا کے فوت ہونے کے بعد ملازموں سے کام کروانے کا کام چاند کے ذمے آیا تھا۔ کیونکہ بستام اور رحبان کو تو اس چیز کی بالکل بھی سمجھ بوجھ نہیں تھی کہ منڈی میں کس رنگ اور کس طرح کے کام کی طلب ہے۔ یہ سب باتیں دین بابا کو معلوم ہوتی تھیں یا چاند کو...... چاند نے اس ذمہ داری کو بخوشی نبھانے کی کوشش کی تھی لیکن التمش کی موت کے بعد وہ اس کام کو دلجمعی سے نہیں کر پا رہی تھی۔ کچھ ادھورا رہ گیا تھا جو مکمل ہونے میں نہ آ رہا تھا۔ بہت سے آنسو بہا دینے کے باوجود آنکھ میں کوئی ایک آدھ آنسو جم کر رہ گیا تھا جو نہ باہر نکلتا تھا اور نہ سوکھتا تھا۔ دل پتھر ہو چکا تھا یا شاید دھڑکنا بھول چکا تھا۔

پھر بھی وہ ڈھیٹ بن کر سارے کام کرتی جا رہی تھی۔ وہ نمونہ بنا دیا کرتی تھی اور پہلا تیار نمونہ دیکھ بھی لیا کرتی تھی۔ کوئی کمی بیشی اسے نظر آتی تھی تو وہ بتا کر باقی سب ملازموں کے حوالے کر دیا کرتی تھی۔ مال کب آتا ہے اور کب جاتا ہے اسے اس کی بالکل خبر نہ ہوتی تھی۔ وہ اپنے پرانے حساب کتاب رکھا کرتی تھی اور پھر مزید کسی اور بات میں دلچسپی نہیں لیا کرتی تھی۔

نتیجہ یہ تھا کہ ملازم اپنی من مانیاں کرنے لگے تھے۔ کام چوری کرتے تھے اور کام نہ کرنے کے سو سو بہانے گھڑ لیتے تھے۔ اوپر سے تنخواہ میں اضافے کا مطالبہ بھی ان کا آئے روز کا تھا۔ بستام کو اس سب کا تب اندازہ ہوا تھا جب ساری بچت ختم ہو چکی تھی۔ حویلی کی تجوریاں دیکھتے ہی دیکھتے خالی ہونے لگی تھیں۔ سونا تو نکل ہی چکا تھا وہاں تو اب چاندی بھی نظر نہیں آتی تھی۔ نجانے کیا بات تھی۔ حویلی کی سرخ دیواروں کا رنگ کیوں سیاہی میں بدلنے لگے تھے۔ اڈے کا کام تو گرا ہی گرا تھا۔ سیب کے باغ سے بھی کوئی منافع حاصل نہیں ہو سکا تھا۔ ہر سال کوئی نہ کوئی مصیبت آ جاتی تھی۔ کبھی پھل صحیح نہ لگتا تھا۔ کبھی

خراب کھاد ذائقہ خراب کردیتی تھی۔اور ایک دو بار تو سیبوں کا رنگ ہی ایسا عجیب وغریب آیا کہ دیکھ کر لگتا نہ تھا کہ یہ سیب ہیں۔کبھی ان کا حجم چھوٹا رہ جاتا تھا، جیسے سیب نہ ہوں لوکاٹ ہو۔

اب خالی تجوریوں کو پھر سے بھرنے کے لیے بستام اور رحبان دونوں کام پر توجہ دینے لگے تھے۔ بہت سے ملازموں کو انہوں نے فارغ کردیا تھا۔جو ان کے خیال سے نہ صرف کام چور تھے بلکہ خرد برد کرنے میں بھی ماہر تھے۔کچھ نے تو اندر کھاتے ہی یونین بنا رکھی تھی۔جو ایک کہتا تھا باقی سب بھی اس کی تقلید کرتے تھے۔بستام نے سب سے پہلے ان کی یونین کو توڑا تھا۔کچھ کو دائیں سے بائیں کمروں میں منتقل کیا تھا اور کچھ کو بائیں سے دائیں میں...... کچھ ملازم صبح سے رات کی شفٹ پر آنے لگے تھے اور کچھ رات سے صبح کی شفٹ پر...... چھٹی کے اوقات کار بھی سب کے بدل دیے گئے تھے۔تیس تیس منٹ کے وقفے سے ملازموں کے گروپوں کو چھٹی دی جاتی تھی۔اس سے مقصد یہ ہی تھا کہ آپس میں ان کی بات چیت کم سے کم ہو۔ان ساری ترکیبوں سے معمولی ہی سہی لیکن فائدہ ہوا تھا۔

منڈی وہ دونوں خود جانے لگے تھے۔سارا حساب کتاب بھی خود رکھنے لگے تھے۔چاند کو اس نے ہدایت دے دی تھی کہ وہ ملازموں پر کام کے حوالے سے سختی کرے۔انہیں بالکل بھی کام چوری نہ کرنے دے۔ہلکے کام والا جوڑا پانچ دن اور بھاری کام والا جوڑا دس دن کے اندر اندر ہر صورت مکمل ہونا چاہیے۔پھر چاہے ملازم رات گئے تک ہی کیوں نہ کام کرتے رہیں۔بہت لوٹ لیا گیا تھا ان کو......اب وہ مزید نہیں لٹنا چاہتا تھا۔

چاند بستام کو کہہ نہ سکی کہ انہیں ملازموں نے نہیں لوٹا ہے۔بلکہ سب کومل اور ایمن پر لٹا دیا گیا ہے۔حویلی کی تجوریاں ملازموں کی سستی یا ان کی غفلت کی وجہ سے خالی نہیں ہوئی ہیں۔کومل اور ایمن کی وجہ سے خالی ہوئی ہیں۔لیکن اس نے یہ بات اپنے دل میں ہی رہنے دی تھی۔ایک وجہ تو یہ تھی کہ بستام کو یہ سب کہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔نہ تو وہ اپنی غلطی ماننے والا تھا اور نہ ہی باز آنے والا تھا۔اور دوسری وجہ

یہ تھی کہ وہ بہت کم بستام کو مخاطب کرتی تھی۔ وہ صرف ضرورت کے وقت بستام سے بات کرتی تھی اور رحبان سے تو وہ اس سے بھی کم بات چیت کرتی تھی۔کوئی ضروری بات رحبان سے کرنا مقصود بھی ہوتی تو وہ حاجی بوا یا صندل کے ذریعے رحبان کو پیغام بھجوا دیا کرتی تھی۔

رحبان بھی چاند کو کم ہی منہ لگایا کرتا تھا۔ بہت نخرے دیکھ لیے تھے اس نے اس مہارانی کے......بہت چاہ لیا تھا اس نے اسے......بہت دعائیں کرلی تھیں چاند کو حاصل کرنے کی اور بہت حربے آزما لیے تھے۔ جب سے چاند نے رحبان سے شادی کرنے سے انکار کیا تھا، چاند اسی دن سے اس کے دل پر سے اتر گئی تھی۔ عین بارات والے دن چاند کا رحبان سے شادی کرنے سے انکار کرنا رحبان کو اپنی بے عزتی محسوس ہوا تھا۔ پہلے پہل تو کسی کو یقین ہی نہ آیا کہ چاند کیا کہہ رہی ہے۔ وہ جو دلہن بن کر تیار بھی ہو چکی تھی اس نے ایک دم سے کہہ دیا تھا کہ اسے رحبان سے شادی نہیں کرنی......سب کا حیران ہونا لازم تھا۔ تہمینہ پھوپھو، شکیلہ پھوپھو، زہرہ پھوپھو، تینوں نے چاند کو باری باری سمجھایا تھا۔ بستام نے بھی چاند سے بات کی تھی لیکن چاند کا انکار اٹل رہا تھا۔

شیروانی پہنے رحبان بھی چاند کے پاس آیا تھا۔ اس نے اسے اپنی محبت کا واسطہ دیا تھا۔ اس کی منت کی تھی۔ لیکن چاند کسی کی نہ سننے کی جیسے قسم کھا چکی تھی۔ یہ تماشا اس وقت ختم ہوا تھا جب دین بابا بے ہوش ہو کر گر گئے تھے۔ اور پھر اگلے ہی پل ان کی موت ہو گئی تھی۔

سب نے مشترکہ طور پر دین بابا کی موت کی ذمہ داری چاند پر ڈال دی تھی۔ سب کا موقف تھا کہ چاند کے انکار کی وجہ سے بابا کی موت ہوئی تھی۔ اس حوالے سے سب کی چاند سے نفرت تو وقتی تھی لیکن رحبان......اس کا دل پھر چاند کے حوالے سے کبھی صاف نہیں ہو سکا تھا۔ انکار کے اس لمحے میں، منت سماجت کے اس وقت میں، اور دین بابا کی موت کی وجہ سے لمحے بھر میں چاند کے حوالے سے اس کی محبت نفرت میں بدل چکی تھی۔ لیکن اس سب کے باوجود وہ ایک عرصے تک عجیب مخمصے میں مبتلا رہا

تھا۔اسے آج تک سمجھ میں نہ آسکا تھا کہ چاند نے اس سے شادی سے کیوں انکار کیا۔اچانک ایسا کیا ہو گیا۔وہ تو شادی کو لے کر بہت خوش تھی، اچھے سے تیار بھی ہوگئی تھی۔پھر ایسا کیا ہوا کہ دین بابا کی منت سماجت بھی اسے آمادہ نہ کر سکی۔اپنی الجھن کو دور کرنے کے لیے اس نے ایک دو بار چاند سے اس حوالے سے بات کی بھی تھی لیکن چاند نے اسے کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دیا تھا۔

''کسی کو انکار کیوں کیا جاتا ہے رحبان؟'' وہ ہمیشہ کی طرح کے نرم لہجے میں بولی تھی۔

''ظاہر ہے، جب وہ پسند نہ ہو۔''

''پھر تو کیوں میرے انکار کی وجہ پوچھ رہا ہے۔جبکہ تو خود سب جانتا ہے۔''

''لیکن جب میں تجھے پسند نہیں تھا تو تو نے دین بابا کے سامنے رشتہ قبول کیوں کیا۔شادی کی حامی کیوں بھری؟''

''غلطی ہوگئی۔''

''عین نکاح والے دن تجھے کیا ہوا چاند؟''

''مجھے اس بات کا ادراک ہو گیا کہ میں کبھی بھی تجھ سے التمش جتنی محبت نہیں کر سکتی۔بلکہ سرے سے محبت ہی نہیں کر سکتی۔میرے دل سے التمش نہیں نکل سکتا۔عین اس لمحے جب بستام نے بتایا کہ باہر نکاح کے لیے مولوی آچکا ہے تو مجھے لگا کہ میں یہ نکاح نہیں کر سکوں گی۔یہ تیرے ساتھ ساتھ خود میرے ساتھ بھی زیادتی ہوگی اور التمش کے ساتھ بھی......''

''التمش......التمش......التمش......'' رحبان نفرت سے اس کا نام زیر لب ادا کر کے رہ گیا تھا۔یہ شخص مر کر بھی آخر زندہ کیسے تھا۔

''اس لیے میں نے تجھ سے شادی سے انکار کر دیا۔بس اتنی سی بات ہے۔'' چاند نے نرم لہجے میں وضاحت دی تھی۔

''عین بارات والے دن میرا تماشا لگانے کی کیا ضرورت تھی چاند...... میری جگ ہنسائی کی کیوں ضرورت پیش آئی تجھے؟''

''عین بارات والے دن میرا باپ بھی تو مر گیا رحبان!''

''ہاں...... لیکن تیری وجہ سے...... میری وجہ سے نہیں......''

''میں تجھ سے معافی چاہتی ہوں رحبان...... میں نے واقعی ہی تیرے ساتھ غلط کیا۔ لیکن یہ ہی تیرے اور میرے لیے بہتر تھا۔''

چاند نے دوٹوک انداز میں کہہ کر بات ختم کر دی تھی اور ان جوابات سے رحبان کی کبھی بھی تسلی نہیں ہوسکی تھی۔ چاند کو تو اپنی غلطی کا احساس تک نہیں تھا۔ رحبان کو ہمیشہ یہ ہی شک رہا کہ ضرور کچھ اور بات تھی جس کی وجہ سے چاند نے اس سے عین شادی والے دن شادی سے انکار کر دیا تھا۔ اور یہ وجہ اسے آج تک معلوم نہیں ہوسکی تھی۔

اس دن کے بعد سے رحبان میں واضح تبدیلیاں آئی تھیں۔ بولتا تو وہ پہلے بھی کم ہی تھا۔ اب کچھ زیادہ ہی خاموش رہنے لگا تھا۔ اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ حویلی میں سب سے ہی کم بات چیت کرتا...... صبح جلدی اٹھ کر حویلی سے باہر چلا جاتا اور رات کو دیر سے واپس لوٹتا۔ بہت سے دن تو حویلی کے مکین یہ ہی سمجھتے رہے کہ رحبان کی یہ خاموشی دین بابا کی موت کی وجہ سے ہے لیکن پھر جلد ہی انہیں احساس ہو گیا کہ انہیں اس نئے رحبان کو قبول کرنا پڑے گا۔

اس کی ضروریات کا خیال تہمینہ پھوپھو رکھتی تھیں۔ چاند نے اس کی فکر کرنا چھوڑ دی تھی۔ اس کے ٹھنڈے گرم سوٹ، کھانے پینے اور باقی کے سارے کام بھی تہمینہ پھوپھو نے سنبھال لیے تھے۔ کچھ حاجی بوا کر دیا کرتی تھیں۔ یہ سب پہلے چاند کے ذمے تھا جو اب حویلی کی دو خواتین کے ذمے آ گیا تھا۔ اور یہ ہی بات رحبان کو مارے دیتی تھی۔ شادی سے انکار تو ہوا ہی ہوا، چاند نے تو اس کی طرف دیکھنا بھی چھوڑ

دیا تھا۔ وہ جو دل میں خیال کیے ہوئے تھا کہ وہ جلد ہی چاند کو شادی کے لیے راضی کر لے گا، اب اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ اس منزل میں سوائے مایوسی کے اس کے ہاتھ کچھ نہیں آنے والا...... وہ دن رات کرب میں جینے لگا تھا۔ اور اسی کرب میں جیتے جیتے کڑھتے کڑھتے وہ پتھر کا ہونے لگا تھا۔ خاکستری رنگ اس کے وجود پر چھانے لگا تھا۔ منزل کی مایوسی کا یقین ہو جانے کے بعد اسے خود پتا نہ چلا کہ کب چاند کے حوالے سے اس کی محبت نفرت میں بدل گئی ہے۔

''ہونہہ...... سمجھتی کیا ہے خود کو...... جیسے کوئی حور پری ہے۔ اس سے لاکھ درجے بہتر تو ایمن ہے۔ جو میرے ایک اشارے کی منتظر رہتی ہے۔ میں نے بھی فضول میں ہی اس لڑکی پر اپنی محبت نچھاور کی...... اس کی خاطر التمش کا قتل کیا۔''

یہ سب سوچتے ہوئے وہ چاند کا خیال اپنے دل سے نکالنے کی مکمل کوششوں میں مصروف رہتا تھا۔ وہ خود کو بار بار باور کرواتا کہ اسے اب چاند کی طلب نہیں رہی ہے۔ وہ تو اب چاند کو دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔ لیکن پھر اس نے کسی اور سے بھی شادی نہیں کی تھی۔ جبکہ تہمینہ پھوپھو نے اس کی اس حوالے سے کافی منت بھی کی تھی۔ اسے پیار سے سمجھایا تھا۔ غصے سے منایا تھا۔ لیکن وہ ہر بار مختلف باتوں سے انہیں انکار کر دیا کرتا تھا۔ تھک ہار کر تہمینہ پھوپھو نے بھی اس حوالے سے بات کرنا بند کر دی تھی۔

اب ان باتوں کو ایک عرصہ گزر چکا تھا۔ صندل سمیت حویلی کے باقی سب چھوٹے بچے بھی بڑے ہو چکے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کے سمجھدار ہونے سے پہلے حویلی پر کیا بیت چکا ہے۔ وہ اپنی مستی میں گم رہنے والے بچے تھے۔ خاص طور پر صندل...... جو بس اتنا ہی جانتی تھی کہ وہ چاند امی کی لے پالک بیٹی ہے اور اس کا باپ التمش اسے اپنا نام دے کر مر چکا ہے۔

چاند امی کی التمش بابا سے شادی نہیں ہو پائی تھی لیکن التمش بابا کے قتل ہو جانے کے بعد چاند امی خود کو ان کی بیوہ ہی کہتی تھی اور بیوہ ہو جانے کے بعد اس نے کبھی شادی نہیں کی تھی۔ درحقیقت اس نے

زندگی بھر شادی کی ہی نہیں تھی۔ اس کا عقد اپنی محبت سے ہوا تھا۔ اور وہ ابھی تک اس عقد کو نباہ رہی تھی۔ تہمینہ، شکیلہ اور زہرہ پھوپھو نے اسے بھی شادی کا کہا تھا لیکن پتا نہیں حویلی کو کس کی نظر لگ چکی تھی کہ یہاں کسی کی شادی ہی نہیں ہو سکی تھی۔ ہر کوئی اپنے اپنے عہد نباہ رہا تھا۔

بستامی کن لڑکیوں کے چکر میں تھا، وہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی۔ وہ بازاروں، باغوں میں کھلے عام کومل کے ساتھ گھوما کرتا تھا۔ عید وغیرہ پر کومل ایک دو بار گھر بھی آ چکی تھی۔ اور کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ بستامی کو منع کرے۔ دیکھنے والوں نے کومل کو وہی نام دے رکھا تھا جو ایسی لڑکیوں کو دے دیا جاتا ہے۔ سب اسے بستامی کی راکھیل کہتے تھے۔

رحبانی کے دل میں کیا تھا، وہ ابھی تک مستقل بھید تھا۔ سنا تو تھا کہ اس کی بھی دوستی کومل کی بہن ایمن سے ہے۔ لیکن کسی نے آج تک اسے ایمن کے ساتھ نہیں دیکھا تھا۔ نہ ہی رحبانی نے کسی سے ایمن کا ذکر کیا تھا۔ تہمینہ پھوپھو تو تھک ہار کر دونوں کو کہہ چکی تھیں کہ اگر کومل ایمن پر ہی دل آ چکا ہے تو وہ انہی سے شادی کر لیں اور انہیں ہی حویلی لے آئیں۔ لیکن دونوں نے یہ بات ماننے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ بالآخر سب ایک دوسرے کو سمجھاتے سمجھاتے چپ ہو گئے تھے۔

حویلی والوں کی زندگی جس طرح گزر رہی تھی، سب اسی طرح گزارنے پر کاربند تھے۔ فی الحال کسی تبدیلی کی کوئی امید نہیں تھی۔



عید کی رات کا کھانا کسی جشن سے کم نہیں تھا۔ پاس پڑوس کے کچھ لوگ بھی مدعو تھے۔ اور کام والے ملازموں کو بھی بلایا گیا تھا۔ عید کی رات کا کھانا سالوں کی روایت تھی جسے سب نے ہی مل کر برقرار رکھا ہوا تھا۔ سارا دن خواتین اس کھانے کی تیاری کرتی رہی تھیں۔ صبح کا ناشتا اور دوپہر کا کھانا تو بے وقت کی چیزوں میں گزر گیا تھا۔ اس لیے اب رات کے کھانے کا وقت ہونے تک سب ہی کی بھوک بڑھتی جا رہی تھی۔

بڑا دستر خوان سورج مکھی والے صحن میں بچھایا گیا تھا۔ ساری لڑکیوں نے پہلے بڑے صحن میں چاند بچھا دی تھی۔ پھر اس پر کاسنی رنگ کا دستر خوان بچھایا تھا۔ جس کے کناروں اور درمیان میں گلابی، سرخ اور پیلے پھول کاڑھے ہوئے تھے اور ان پھولوں کے آس پاس ہی سبز اور گہری سبزی پتیوں کا جال بچھایا گیا تھا۔ کھانا تیار ہو گیا تو سب لڑکیاں اس دستر خوان پر کھانے کی طشتریاں سجانے لگی تھیں۔

کرن نے تیر مارتے ہوئے سلاد تیار کی تھی۔ وہ اسے لیے لیے گھوم رہی تھی اور سب سے پوچھ رہی تھی کہ اس نے کیسی سلاد تیار کی ہے۔ اس کی سلاد میں انوکھا پن صرف ٹماٹر کے چھلکے کا ایک پھول تھا جو اس نے نجانے کہاں سے بنانا سیکھ لیا تھا۔ جہاں سے بھی بنانا سیکھا تھا ڈھنگ سے نہ سیکھا تھا۔ ٹماٹر کا پھول جاتی بہار پر روتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن سب مجبوری میں یہ ہی کہتے جا رہے تھے کہ سلاد بہت اچھی تیار ہوئی تھی۔ ورنہ اگر کرن کا منہ پھول جاتا تو وہ پھر اگلے دو تین دن تک چلنے والا تھا۔

رات گہری ہونے لگی تو دائیں بائیں سے سب لوگ اکٹھے ہونے لگے۔ پاس پڑوس کی سب عورتیں بھی چاند امی کو دیکھ کر گھر کی خواتین کی طرح ہی حیران رہ گئی تھیں۔

"تم تو بہت پیاری لگ رہی ہو چاند...... اپنی بیٹی کی بڑی بہن لگ رہی ہو۔" اور چاند جواباً پھیکا سا مسکرا رہی تھی۔

کھانے کا جشن رات گئے تک جاری رہا تھا۔ لڑکیوں نے خوب ہنسی مذاق کیا تھا اور پھر کھانا ختم ہونے کے بعد دستر خوان اٹھا کر صحن میں ککلی بھی ڈالی تھی۔

"زارا! تم ککلی مت ڈالنا...... کہیں فرش کی اینٹیں نہ اکھڑ جائیں۔" زارا کی والدہ شکیلہ پھوپھو نے کہا تو سب ہی ہنسنے لگے۔ وہ تو شکر کہ یہ بات خود زارا کی ماں نے ہی کہی تھی۔ کوئی اور کہہ دیتا تو زارا اسی وقت لڑنے مرنے پر اتر آتی۔

اور یوں رات گئے عید کا پہلا دن تمام ہوا تھا۔

''دیکھا...... میری وجہ سے آپ کی آج کتنی تعریف ہوئی ہے۔'' چاند جیولری اتار کر صندل کو دے رہی تھی۔ جب صندل نے اس سے کہا تھا۔ چاند مسکرائی تھی۔

''آج آپ کا خود کو دیکھنا کیسا لگا؟''

''ہاں...... مجھے اچھا لگا۔'' بیٹی کا دل رکھنے کے لیے اس نے مسکراتے ہوئے جھوٹ بول دیا تھا۔

''میں اب روز ہی آپ کو تیار کر دیا کروں گی۔ اور آپ کے لباس بھی تبدیل کر دوں گی۔ بہت پرانی وضع کے لباس پہنتی ہیں آپ!''

''اس کی ضرورت نہیں صندل...... میں اس حلیے میں خوش ہوں۔'' چاند اپنی الماری کی طرف بڑھی تھی اور اس نے اندر سے ایک سفید رنگ کا سوٹ نکال لیا تھا۔ اس کے بیشتر لباس سفید رنگ کے ہی تھی۔ یا اسی رنگ سے ملتے جلتے رنگوں کے، پھیکے رنگوں کے......

''یہ کس لیے نکال رہی ہیں آپ؟''

''کل پہننے کے لیے......''

''کل عید کا دوسرا دن ہے چاند امی...... کچھ تو شوخ پہنیں......''

''پہن لیتی...... لیکن کل تمہارے بابا کی برسی ہے۔'' چاند نے اداس ہوتے ہوئے کہا تھا۔ صندل خاموش ہو گئی تھی۔

''مجھے کل ان کی قبر پر جانا ہے۔''

''کیا میں بھی آپ کے ساتھ چلوں؟''

''نہیں...... ضرورت نہیں...... عید کے دن ہیں۔ تم ان سے لطف اندوز ہو۔ جوان لڑکیوں کا قبرستان میں کیا کام...... تم گھر پر بیٹھ کر اپنے بابا کے لیے دعا کر دینا۔''

''جی...... جیسے آپ بہتر سمجھیں۔''

''تم ایسا کرنا کہ کل مجھے کہیں سے گلاب کے پھول لا دینا...... صبح ہی چاہیے ہوں گے مجھے......''

''میں کسی ملازم کو بھیج کر بازار سے منگوالوں گی۔''

''نہیں...... بازار سے نہیں ملیں گے۔ عید کے دن ہیں۔ پھول ملنا شاید مشکل ہو۔ پھر ویسے بھی مجھے تازہ پھول چاہییں۔ بازار سے مل بھی گئے تو وہ دو دن پرانے ہوں گے۔ کیونکہ عید پر منڈیوں میں کام نہیں ہوتا۔''

''لیکن تازہ پھول کہاں سے ملیں گے؟''

''ہماری حویلی سے آگے جہاں سڑک ختم ہوتی ہے وہاں کونے پر ایک سفید رنگ کی کوٹھی ہے۔ ان کے باہر باغ میں طرح طرح کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ تم مالی سے پوچھ کر کچھ پھول توڑ کر لے آنا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں لا دوں گی آپ کو......''

''جلدی لانا...... مجھے صبح جلدی نکلنا ہے گھر سے......''

''جی...... میں جلدی ہی لا دوں گی۔''

''اب تم سو جاؤ...... تھک چکی ہو گی۔''

چاند نے کہتے ہوئے کمرے کی بتی بجھا دی تھی۔ صندل واقعی ہی میں تھکی ہوئی تھی۔ بیڈ پر لیٹتے ساتھ ہی اسے فوراً سے نیند آ گئی تھی۔ کمرے سے باہر چاند اپنا لباس استری کرنے لگی تھی۔ اسے شروع سے ہی اپنے کام خود کرنے کی عادت تھی۔ وہ صندل کو بھی اپنے کام نہیں کرنے دیا کرتی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس کمرے میں آئی تو اس نے دیکھا کہ صندل سو چکی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر کھڑی پیار بھری نظروں سے صندل کو سوتے ہوئے دیکھتی رہی تھی۔

''ہماری بیٹی کی شکل تو ہو بہو تمہارے جیسی ہے چاند......'' چاند کو التمش کے الفاظ یاد آئے تھے۔ التمش نے جب پہلی بار صندل کو دیکھا تھا تو یہ ہی کہا تھا۔ وہ صندل کو دیکھ کر کسی حد تک حیران ہوا تھا۔

صندل کی شکل چاند سے حد درجہ ملتی تھی۔

''جن سے ٹوٹ کر محبت ہو ان سے شکلیں ملنے لگتی ہیں۔ ہماری بیٹی اپنی شکل پر ہے۔ میری شکل اس سے ملنے لگی ہے۔''

''جو ایسی بات ہے تو پھر تمہاری شکل مجھ سے ملنی چاہیے تھی، یا مجھ سے محبت نہیں تمہیں......'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔ چاند شرما کر رہ گئی تھی۔

یاد کرتے ہوئے چاند نے آہ بھری تھی۔ اس کی آنکھوں میں بہت سے آنسو چلے آئے تھے۔

التمش......اس کا محبوب......ایک خوب صورت جوان مرد......جسے بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔ کیوں......؟ کس لیے؟ اس کا حساب ابھی باقی تھا۔

چاند بیڈ پر لیٹ چکی تھی، لیکن نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ جانتی تھی آج کی رات التمش کی یادیں اسے سونے نہیں دیں گی۔

حویلی کے دوسرے حصے میں رحبانی اپنے کمرے میں بیٹھا حسب معمول سنکھ بجا رہا تھا۔ اور چاند کو بے حد شدت سے اس کے سنکھ بجانے سے نفرت محسوس ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

صبح کی دھوپ اپنی ہر انگڑائی پر نکھر رہی تھی اور منظر کو روشن کرتی چلی جا رہی تھی۔ درخت پر سے رات کی سیاہی اتر چکی تھی اور اب اپنے کاہی رنگوں کی کیچلیاں اتار کر پھینکنے لگے تھے۔ سڑکیں ویران تھیں۔ کل عید کی وجہ سے شاید لوگ رات دیر تک جاگتے رہے تھے جو اب اٹھنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ اور کچھ وہ بھی زیادہ ہی صبح چلی آئی تھی۔ چاند امی نے ہی کہا تھا کہ اسے صبح جلدی ہی پھول چاہییں۔ وہ چاشت کی نماز وہاں ہی ادا کرنا چاہتی تھی۔ التمش بابا کی قبر کے پاس......

سفید کوٹھی کے پاس پہنچ کر وہ رکی تھی۔ بڑی کوٹھی کے اندر اور باہر وسیع اراضی کو باغ کے لیے مختص

کیا گیا تھا۔ باغ کی تراش خراش جدید تھی۔ باڑوں کی جدت سے کاٹ چھانٹ کی گئی تھی۔ پھر قدرے اونچے درختوں پر پرندوں کے لیے کین سے بنی گولکیں بھی لٹکائی گئی تھیں۔ گیٹ بند تھا اور گیٹ کے اندر یا باہر کوئی چوکیدار نہیں تھا۔ صندل نے گیٹ کی درز سے اندر جھانکا۔ اندر والا باغ باہر والے باغ سے کہیں زیادہ وسیع تھا۔ جہاں طرح طرح کے اور باہر سے زیادہ خوش نما پھول لگے ہوئے تھے۔ وہ دیوار پھلانگ جاتی، لیکن اسے ڈر تھا کہ اندر کتے نہ ہوں، جو اسے دیکھتے ہی بھونکنا شروع کر دیں۔ یا اسے کاٹ ہی دیں۔ اسے کتوں سے کسی حد تک ڈر لگتا تھا۔ اس لیے اس نے باہر والے پھولوں پر ہی اکتفا کرتے ہوئے کچھ پھول توڑ کر اپنے دوپٹے کی جھولی سی بناتے ہوئے اس میں ڈالنے شروع کیے تھے۔ چوری چوری دائیں بائیں دیکھتے ہوئے چند پھول توڑنے کے بعد اس کی ہمت نے ساتھ دیا تھا اور لمحوں بعد وہ ڈرے بنا مزید تن دہی سے اپنا کام جاری رکھے ہوئے تھی جب اس کے کانوں میں ایک آواز گونجی تھی۔

''چور...... چور......''

اچانک آواز پر صندل سہم کر رہ گئی تھی۔ اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تھا اور اس کی سہم میں مزید اضافہ ہوا تھا۔

''پھول چوری کر رہی ہو لڑکی......''

''نہیں...... میں تو بس پھول توڑ رہی ہوں۔''

''واہ...... کیا جواز ہے۔'' وہ بے اختیار ہی ہنسا تھا۔ زندگی میں پہلی بار سہمی ہوئی صندل اس کی بات پر شرمندہ ہو گئی تھی۔

''دکھاؤ...... کتنے پھول چوری کر لیے ہیں اب تک تم نے......'' وہ قریب آ کر اس کے دوپٹے کی جھولی کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے بھی چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جھولی کھول کر دکھا دی تھی۔

''تو چوری کا مال آگے کسی کو پیش کیا جائے گا۔'' وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔

''نہیں...... میں کافی دیر سے مالی کو دیکھ رہی تھی۔ لیکن مجھے کوئی نظر ہی نہیں آیا۔ گیٹ پر چوکیدار بھی نہیں تھا، ورنہ میں پوچھ کر پھول توڑتی۔''

''تو ڈور بیل دے کر اندر سے اجازت لی جا سکتی تھی۔''

''مجھے لگا کہ اندر والے ابھی سو نہ رہے ہوں۔''

''اور تم نے سوچا کہ چلو پھر ان کے سونے کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کے باغ کا صفایا کرتے ہیں۔''

''مجھے دیر ہو رہی تھی اس لیے...... چاند امی نے کہا تھا کہ انہیں صبح ہی صبح گلاب کے پھول چاہییں۔'' اس نے بے تکی سی بات کی تھی۔ کچھ شرمندگی کے مارے اور کچھ سامنے والے کی رعب دار شخصیت کے باعث اس سے مزید کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔

''تمہیں گلاب چاہیے یا گلاب کا پھول......؟''

اسے بھلا ان دونوں میں فرق کا ہی کہاں معلوم تھا۔

''تم نے کہا ہے کہ تمہاری امی نے تمہیں گلاب کے پھول لانے کو کہا تھا۔ جب کہ تم نے تو سارے گلاب توڑ لیے ہیں۔''

وہ پھر بھی چپ رہی اور ناسمجھی سے اسے دیکھنے لگی۔

''چاند امی کو بابا کی قبر پر ڈالنے کے لیے پھول چاہییں۔'' اسے اور کچھ نہ سمجھ میں آیا تو اس نے یہ کہہ دیا۔

''اندر آ جاؤ۔'' لڑکے نے گیٹ کھول دیا تھا اور خود الگ ہو کر کھڑا ہو گیا تھا۔ صندل چپ چاپ گھر کے اندر والے حصے میں آ گئی تھی۔ اندر والا باغ کمال سے بھی اوپر کی کوئی چیز تھا۔ کونے پر ایک مصنوعی آبشار بھی بنائی گئی تھی جو فی الحال بند تھی۔

''وہ کونے میں گلاب کے پھول لگے ہوئے ہیں۔ جتنے چاہییں اتنے توڑ لو......''

وہ خاموشی سے کونے میں گئی تھی اور پھول توڑنے لگی تھی۔ اپنے حساب سے جب اس نے کافی پھول توڑ لیے تو تب وہ پیچھے کو پلٹی تھی۔ وہ وہاں ہی کھڑا تھا اور اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے وجود کے سامنے سورج پوری طرح سے طلوع ہو چکا تھا اور اس کے چہرے کو منور کر رہا تھا۔ اس کی سیاہ بھنویں کچھ زیادہ ہی سیاہ ہو گئی تھیں۔ سورج کی تمازت سے اس کے گال اور چہرے کا سفید رنگ گلابی میں بدلنے لگا تھا۔ صندل کو اپنا سانس اکھڑتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

''شکریہ......''

''ویلکم......'' اس نے خوش دلی سے کہا تھا۔ ''آپ کا نام جان سکتا ہوں۔''

''صندل......''

''میرزاد......''

''میرزاد نہیں......صندل......''

''میں اپنا نام بتا رہا ہوں مس......میرا نام میرزاد ہے۔''

اس نے کہا تو صندل کو شرمندگی ہوئی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ سامنے والے نے اس کا نام سننے میں غلطی کی ہے۔ پتا نہیں کیوں وہ تو آج بوکھلا ہی گئی تھی۔

''گلاب اور گلاب کے پھول میں کیا فرق ہوتا ہے؟'' گیٹ سے باہر نکلنے سے پہلے اس نے سرسری انداز میں پوچھا تھا۔

''کل پھر پھول توڑنے آنا......پھر بتاؤں گا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

صندل نے دیکھا کہ اس کے لبوں کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھیں، اس کے گال اور اس کی بھنویں اور اس کے چہرے کا ایک ایک عضو مسکرا رہا تھا۔ کیا کسی کی مسکراہٹ ایسی کامل بھی ہو سکتی ہے؟

صندل جس نے زندگی میں بڑے کارنامے کیے تھے۔ بڑے گھان کھولے تھے اور ہر بازی جیتی

تھی۔ آج پہلی بار بنا بازی خود کو ہارتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

☆......☆......☆

''کون تھا باہر میر......؟''

وہ اندر داخل ہوا تو زویا نے اس سے پوچھا تھا۔ زویا تھوڑی دیر پہلے ہی اٹھی تھی اور اس کے باوجود بھی اس کے چہرے کو دیکھ کر ایسے لگ رہا تھا جیسے اسے سخت نیند آ رہی ہو۔ ایک مستقل بیزاری ہمہ وقت اس کے چہرے پر سے جھلکتی رہتی تھی۔

''پتا نہیں......کوئی لڑکی تھی۔ پھول توڑنے آئی تھی۔''

''اور تم نے اسے اندر بلا لیا؟'' زویا نے پاس پڑا میگزین اٹھا لیا تھا اور حسب عادت اب وہ بے مقصد اسے دیکھنے لگی تھی۔

''ہاں......اسے گلاب کے پھول چاہیے تھے۔ اور وہ باہر نہیں تھے۔ اس لیے میں نے اس سے کہا کہ اندر سے آ کر لے لو۔''

''ویسے عجیب ہیں اس شہر کے لوگ بھی......کل عید پر کسی کے گھر سے شیر خورما تو آیا نہیں......اور لوگ پھول توڑنے چلے آئے ہیں۔''

''ہم نے بھی تو کسی کو شیر خورما نہیں بھجوایا۔''

''ہم نے بنایا ہی کب تھا۔ اور ویسے بھی ہم تو یہاں پر پہلی بار آئے ہیں۔ کسی سے جان پہچان نہیں ہے ہماری......لیکن یہاں کے لوگوں کو تو ہمارا خیال رکھنا چاہیے۔''

''اچھا، اگر وہ لڑکی کل آئی تو میں اس سے کہہ دوں گا کہ اپنے گھر سے کچھ بنا کر لیتی آئے۔''

''کیا وہ کل پھر سے آئے گی؟'' زویا نے میگزین ایک طرف رکھا تھا۔

''پتا نہیں......میں نے تو ویسے ہی کہا ہے، شاید آ جائے۔'' کہتے ہوئے وہ اٹھ کر وہاں سے

جانے لگا تھا۔

''یہاں کسی سے دل مت لگا لینا میر......''

''کیوں......؟'' اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ رکا تھا اور اس نے خود سے دو سال بڑی بہن سے پوچھا تھا۔

''بہت کٹھور لگے ہیں مجھے یہاں کے لوگ......اس لیے کہہ رہی ہوں۔'' زویا نے دل کی بات کہہ دی تھی اور میر زاد بہن کی بات پر دل کھول کر ہنسا تھا۔

''ایک شیر خورمے کی پلیٹ نہ ملنے پر آپ نے یہاں کے لوگوں کو کٹھور کہہ دیا۔''

''نہیں......اس لیے کہہ رہی ہوں کہ سنا ہے کہ پہاڑوں پر بسنے والے کٹھور ہوتے ہیں۔''

''آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے آپی کہ یہ پہاڑ نہیں ہے۔''

''پہاڑوں کی شروعات تو ہے۔''

''اور زوہیب بھائی کے بارے میں کیا کہیں گی۔ وہ تو ہیں ہی پہاڑوں کے رہنے والے۔ کیا وہ بھی کٹھور ہیں؟'' میر زاد نے بروقت بات کی تو زویا کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا جسے میر زاد نے دیکھ لیا تھا۔

''آپ کے اور زوہیب بھائی کے درمیان میں سب ٹھیک تو ہے ناں آپی......؟'' اس نے فکرمندی سے پوچھا تھا۔ ''جہاں تک میں جانتا ہوں، زوہیب بھائی آپ سے دیوانوں کی طرح محبت کرتے ہیں۔''

میر زاد کی بات ٹھیک تھی۔ زوہیب زویا کو دیوانوں کی طرح ہی چاہتا تھا لیکن زویا کے دل و دماغ میں وہ دن سمائے ہوئے تھے جب زوہیب نے اسے شادی کے پانچ سال ہو جانے کے باوجود اولاد نہ ہونے کی وجہ سے محرومی اور ناامیدی کی چند ایک باتیں کی تھیں اور جسے زویا نے اپنی انا پرست طبیعت کی

وجہ سے ابھی تک یاد رکھا ہوا تھا۔

''میں نے تو بس ویسے ہی بات کی ہے۔ تم تو بال کی کھال ہی ادھیڑنے لگ گئے ہو۔'' زویا نے اب کے اپنی ٹوکری پکڑ لی تھی۔ جس میں اوون کا گولا، سلائیاں اور ادھ بنا ہوا سویٹر پڑا ہوا تھا۔

''تمہارا تو پتا نہیں، لیکن میں جلد سے جلد یہاں سے واپس جانا چاہتی ہوں۔ ایک ایک دن کو انگلیوں پر گن رہی ہوں میں تو......'' وہ اپنے بنے ہوئے سویٹر کے گھر گنتے ہوئے بولی تھی۔ اندازے سے ہی اس نے ہونے والے بچے کی جسامت کا اندازہ کرتے ہوئے سویٹر کا سائز بنا لیا تھا۔

''اچھا...... آپ کی نصیحت پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔'' ہنستے ہوئے اس نے کہا تھا۔ پھر کچھ خیال آنے پر پلٹا تھا۔

''کیا آج میں بازار سے کھانے کو کچھ لاؤں۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو......''

''ہاں لے آؤ...... میرا کچھ بھی پکانے کو دل نہیں کر رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں فریش ہو کر باہر جاتا ہوں۔'' کہہ کر وہ اندر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ سویٹر بنتے ہوئے زویا کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی تھی جہاں موسم پل بھر میں بدلنے کے لیے تیار تھا۔

''ابھی سورج جوبن پر تھا اور اب سیاہ بادل آ رہے ہیں۔ اللہ...... کتنی قباحتیں ہیں اس شہر میں......''

موسم کو دیکھتے ہوئے اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے سوچا تھا۔

☆......☆......☆

دوپہر ہونے کے قریب تھی جب چاند التمش کی قبر سے واپس لوٹی تھی۔ اس کا چہرہ کافی تر و تازہ لگ رہا تھا جیسے اپنے سارے آنسوؤں کو اور دکھوں کو حویلی کی دہلیز سے باہر ہی چھوڑ آئی ہو۔ اور یہ بات صندل ہر بار نوٹ کرتی تھی کہ جب جب چاند امی التمش بابا کی قبر پر جاتی تھیں تو واپسی پر ان کے چہرے

پر ایسی تازگی موجود ہوتی تھی جیسے وہ زندہ التمش سے مل کر آ رہی ہوں۔

کمرے میں داخل ہو کر چاند نے چادر کو اتار کر سائیڈ پر رکھا تھا اور کچھ تھکے تھکے سے انداز میں وہ کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

''پانی لاؤں آپ کے لیے؟''

''نہیں...... میں نے نیچے پی لیا تھا۔ مجھے پیدل واپس نہیں آنا چاہیے تھا۔ میں تھوڑی تھک چکی ہوں۔''

''آپ کو پیدل آنے کو کہا ہی کس نے تھا؟''

''حویلی کے ملازم نے پالکی لے کر اپنی بیوی بچوں کو لے کر کہیں گھمانے جانا تھا۔ میں نے قبرستان سے اسے جانے کا کہہ دیا۔ میں نے سوچا تھا کہ واپس میں تانگے پر آ جاؤں گی لیکن راستے میں کوئی تانگا ہی نظر نہیں آیا۔ شاید سب میلے کی طرف گئے ہوئے ہیں۔''

''جی ایسا ہی ہے۔ عید کے میلے پر انتہا کا رش ہے۔ آپ چلیں گی ہمارے ساتھ؟''

''نہیں...... میرا دل نہیں چاہ رہا۔'' چاند نے حسب توقع انکار کر دیا تھا اور صندل کو اندازہ تھا کہ چاند امی انکار ہی کریں گی۔ کیونکہ التمش بابا کی برسی والے دن وہ کسی طرح کی کوئی خوشی نہیں مناتی تھیں۔

''اچھا چاند امی! بتائیں...... گلاب کے پھول اور گلاب میں کیا فرق ہوتا ہے؟'' کچھ خیال آنے پر اس نے چاند کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا تھا۔ چاند نے اچنبھے سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''تمہیں یہ فرق جاننے کا کیوں اشتیاق ہوا؟''

''کسی نے مجھ پر اپنا علم جھاڑا ہے۔''

''کس نے؟''

''بس ہے کوئی...... آپ بتائیں کہ دونوں میں کیا فرق ہوتا ہے؟''

''تم نے اسی سے کیوں نہیں پوچھ لیا؟''

''پوچھا تھا۔اس نے بتایا ہی نہیں......''اس نے معصومیت سے کہا تھا۔چاند ہنسنے لگی۔

''گلاب بدیسی وضع کا ہوتا ہے۔اس کی پتیاں مکمل طور پر نہیں کھلتیں......آپس میں جڑی رہتی ہیں۔اور گلاب کا پھول وہ جو آج تم توڑ کر لائی ہو،اس کی پتیاں مکمل طور پر کھل جاتی ہیں۔اسی لیے اسے گلاب کا پھول کہتے ہیں اور پہلے والے کو گلاب......''

''لو جی......اتنی سی بات تھی۔''

''اب بتاؤ......تم پر کس نے اپنا علم جھاڑا؟''

''وہ......''اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی،افشیں کمرے میں آدھمکی تھی۔

''صندل!تم تیار ہو؟ میلے پر نہیں جانا کیا؟''

''ہاں میں تیار ہوں۔''اور وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''تو چلو پھر......کیوں دیر کر رہی ہو۔دوپہر تو یہاں ہی گزر چکی ہے۔میلے میں تو ویسے بھی وقت گزرنے کا پتا نہیں چلتا۔''

''ہاں......ٹھیک کہہ رہی ہو۔اچھا چاندامی......میں چلتی ہوں۔''

''شام میں جلدی آجانا تم......''چاند نے پیچھے سے کہا تھا۔

''جی اچھا......''سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ بولی تھی۔پھر نیچے اتر گئی تھی۔جہاں صحن میں سب کزنز اسی کا انتظار کر رہی تھیں۔

☆......☆......☆

عید کا میلہ کھلے میدان میں لگایا گیا تھا۔جہاں ہر طرف افراتفری کا سماں تھا۔جیسے سارا حویلیاں شہر اس کھلے میدان میں آسمایا ہو۔چند ایک جھولے بہت سی تعداد میں نصب تھے اور ان چند ایک جھولوں

پر بے تحاشا رش تھا۔ خریداری کی دکانیں بھی موجود تھیں۔ کھانے پینے کی بھی اور چھوٹی موٹی آرائشی چیزوں کی بھی...... حویلی کی لڑکیوں کے پاس عید کے بہت سے پیسے اکٹھے ہو چکے تھے اور وہ سارے ہی آج میلے پر لگنے والے تھے۔ چونکہ خزانچی افشین تھی تو وہ سب کے ساتھ ساتھ تھی اور ہر خریداری پر اس کزن کو بتا دیتی تھی کہ اب تمہارے اٹھارہ سو باقی بچے اور اب تمہارے پندرہ سو باقی رہ گئے ہیں۔ ان معاملات میں وہ حساب کی پکی نہیں تھی لیکن اس پر حرام حلال کا بھوت اس طرح سے سوار رہتا تھا کہ بے چاری کے اپنے پیسے بھی ان سب کا حساب کتاب پورا کرنے کی نظر ہو جایا کرتے تھے۔

''صندل! تم کچھ نہیں لو گی؟ تم نے تو ابھی تک کچھ بھی نہیں خریدا ہے۔''

''عید پر اتنی تو خریداری کی ہے۔ پھر یہاں سے مزید چیزیں خریدنے کی کیا تک بنتی ہے۔ لوگ تو پاگل ہوئے جا رہے ہیں بس۔''

''تو پھر جھولے لے لو...... میلے کو انجوائے کرو۔''

''ابھی کسی چیز پر دل نہیں چاہ رہا میرا...... تم لوگ جاؤ...... میلہ انجوائے کرو...... میں یہاں ہی بیٹھ کر تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔''

خود وہ ایک جگہ پر بیٹھ گئی تھی اور باقی سب وہاں سے چلی گئی تھیں۔ وہ میلے پر آ تو گئی تھی لیکن اس کا میلے پر دل نہیں لگ رہا تھا۔ جبکہ وہ یہاں دل لگانے ہی تو آئی تھی۔ کل سے وہ میلے کو لے کر بہت پر جوش ہو رہی تھی لیکن نجانے کیا بات ہوئی تھی کہ صبح سے اس کا دل کچھ بے چین سا تھا۔ جیسے اس کا کچھ کھو گیا ہو۔ وہ تیار ہوئی تھی لیکن پھر بھی بہت کچھ ادھورا رہ گیا تھا۔ کچھ وہ خود میں اس قدر زیادہ کھوئی ہوئی تھی کہ اس اجنبی کو سوچنے کے لیے مکمل یکسوئی چاہتی تھی۔ کیسے بول رہا تھا وہ...... جیسے گلاب اسی سے کھلنا سیکھتے ہوں۔ ہے کہاں کا...... پہلے کبھی نہیں دیکھا اسے...... ضرور یہاں پر نئے نئے شفٹ ہوئے ہیں۔ ورنہ اس سے اب تک مڈبھیڑ ضرور ہو چکی ہوتی۔

اس نے میلے پر خوش ہونے کی کوشش کی...... جھولے لیے، کھٹی میٹھی چیزیں کھائیں، کھو کھلے قہقہے لگائے، لیکن وہ بات نہ بنی جو وہ سوچ کر آئی تھی۔

''کیا ہوا ہے صندل......؟ بہت چپ چپ ہو؟''

''نہیں...... کچھ بھی تو نہیں......''

''لگ تو ایسے رہا ہے جیسے تمہیں کسی کا انتظار ہو؟'' روشنائے نے ذو معنی انداز میں کہا تھا۔ اس نے مسکرا کر بات ٹال دی تھی، لیکن اسے لگا کہ روشنائے نے سو فی صد درست کہا ہے۔ اسے کسی کا انتظار ہی تو تھا۔ جو بات وہ خود سے کہنے کے لیے مناسب الفاظ ڈھونڈ رہی تھی وہ روشنائے نے لمحے میں کہہ دی تھی۔ اس کی آنکھیں کس کو دیکھنا چاہ رہی تھیں۔ اس کے مسکراتے لبوں سے پھسل پھسل کر نکلتے اس کے الفاظ سننا چاہتی تھیں۔ اور نجانے یہ کون سا لمحہ تھا کہ اس نے تو باقاعدہ دعا بھی نہیں کی تھی اور خدا نے محض اس کی آس کو ہی پورا کر دیا تھا۔

بہت سے لمحے تو اسے یقین ہی نہ آیا کہ وہ وہاں موجود ہے۔ اسے لگا یہ اس کی نظر کا دھوکا ہے۔ دکان والے سے بات کرتا ہوا وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔ جیسے یا تو لطیفے سن رہا ہو یا سنا رہا ہو۔ اس کے وجود کا یقین دلانے والی واحد چیز اس کی مسکراہٹ ہی تو تھی۔ صندل نے دائیں بائیں دیکھا۔ سب کزنز دور دور تک نظر نہیں آ رہی تھیں۔ وہ مطمئن ہو کر اس کی طرف بڑھی تھی۔

''میلے پر اکیلے آنا تو خلافِ تہذیب ہوتا ہے۔'' اس نے اس کے پاس جا کر کہا تو میر زاد نے رخ موڑ کر اسے دیکھا تھا۔ سیکنڈ کے آدھے حصے میں ہی اس نے اسے پہچان لیا تھا اور اس کی مسکراہٹ مزید بڑھ گئی تھی۔

''انسان جب پورے شہر میں ہی اکیلا ہو تو پھر اسے اکیلا ہی گھومنا پڑتا ہے۔''

''کیا آپ یہاں بالکل تنہا ہیں؟''

''نہیں...... میری بہن بھی یہاں میرے ساتھ موجود ہے۔ لیکن وہ کچھ بیمار ہے۔ اس لیے مجھے اکیلے ہی یہاں آنا پڑا۔ کچھ کھانا لینا تھا کیونکہ آج بہن کا کھانا پکانے کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ ویسے کافی دنوں سے اس کا یہ ہی موڈ چل رہا ہے۔'' وہ مسکراہٹ سے آگے ہنسا اور صندل بھی بے اختیار ہو کر ہنس دی۔

''ویسے یہاں کے لوگ پڑوسیوں کا کچھ زیادہ خیال نہیں رکھتے......'' وہ کچھ ذومعنی سے انداز میں بولا۔

''مطلب......؟''

''مطلب یہ کہ ہمیں یہاں آئے ہوئے ایک ماہ ہونے کو آیا ہے۔ لیکن نہ تو رمضان میں کسی کے گھر سے افطاری آئی اور نہ ہی عید پر کچھ آیا۔''

''آپ نے کس کس کو کیا کیا بھجوایا؟'' وہ اس کا طنز سمجھتے ہوئے اب اس پر طنز کر رہی تھی۔

''بھئی ہم تو مہمان ہیں اس شہر میں...... چند دن رہ کر چلے جائیں گے۔ لیکن یہ شہر ہمارا میزبان بننے کو تیار ہی نہیں ہے۔''

صندل پورا جملہ نہیں سن سکی تھی۔ چند دن رہ کر چلے جائیں گے والی بات اس کے کانوں میں شائیں شائیں کرنے لگی تھی۔ ابھی تو وہ ملا تھا اور ابھی سے جانے کی بات کر رہا تھا۔

''ویسے سنا بہت تھا حویلیاں شہر کے بارے میں...... لیکن ویسا پایا نہیں۔''

صندل کیا جواب دیتی کہ وہ تو گم صم سی کھڑی تھی۔ دکان والے نے اس کا سامان پیک کر کے اس کی طرف بڑھایا تھا۔

''اوکے...... چلتا ہوں۔ خدا نے چاہا تو پھر ملاقات ہوتی ہے۔'' الوداعی مسکراہٹ اس کی طرف اچھال کر وہ وہاں سے چلا گیا تھا۔

''خدا کو چاہنا پڑے گا۔'' اس نے اسے جاتا ہوا دیکھتے ہوئے زیر لب کہا تھا۔

☆......☆......☆

''کیا سب کچھ تیار ہو چکا ہے زرینہ بی بی......'' اس نے نعمت خانے میں جھانکتے ہوئے زرینہ بی بی سے پوچھا تھا۔

''جی...... بالکل تیار ہے۔'' زرینہ بی بی جلدی والے انداز میں پوریاں تلتے ہوئے بولی تھیں۔

''حلوہ پر بس بادام ڈالنے والے رہ گئے ہیں۔ چنے تیار ہو چکے ہیں اور کچوریاں بھی تلی جا چکی ہیں۔''

''بادام میں ڈال دیتی ہوں، آپ مجھے وہ بڑے والا ٹفن نکال دیں جو پیتل کا ہے اور جس میں آٹھ خانے ہیں۔''

''جی...... میں نے پہلے سے ہی نکال کر رکھا ہوا ہے۔''

''ارے واہ! زرینہ بی بی! آپ تو بہت سگھڑ ہیں۔ چلیں اب پھر جلدی سے سب پیک کر دیں۔''

''جی اچھا......'' اور زرینہ بی بی پیتل کے آٹھ خانوں والے ٹفن میں سب سامان پیک کرنے لگی تھیں۔

''اس سب کے بارے میں کسی کو بتایئے گا مت...... میری راز دار بنے رہیے گا آپ...... اپنی شادی پر سونے کا چھلا دوں گی۔ پکا وعدہ......'' صندل کی بات پر زرینہ بی بی مسکرا دی تھیں۔

''اور بتایئے کیسی لگ رہی ہوں میں......'' اس نے اپنی دو گھنٹے کی تیاری کو دکھاتے ہوئے پوچھا تھا۔

''لگ تو پیاری رہی ہیں آپ...... لیکن یہ بتائیں کہ جا کہاں رہی ہیں۔'' زرینہ بی بی نے مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے ذو معنی انداز میں پوچھا تھا۔

''بہت سوال پوچھتی ہیں آپ بی بی...... لائیں دیں ٹفن......'' اس نے بند ٹفن کو ان کے ہاتھ سے لے کر کین کی نفیس بنت والی ٹوکری میں رکھ لیا۔ ''میرے بارے میں کوئی پوچھے تو کہہ دیجیے گا کہ سیب کے باغ میں پینگ جھولنے گئی ہے۔''

''اور آپ کو کوئی وہاں تلاش کرنے چلا گیا تو......؟''

''باغ بہت بڑا ہے۔ جب تک کوئی سارا باغ دیکھے گا، تب تک میں واپس آ چکی ہوں گی۔''

ٹوکری پکڑے نعمت خانے میں سے باہر نکلتے ہوئے وہ بولی تھی۔

سفید کوٹھی تک مسافت ویسے بھی زیادہ دور نہیں تھی اور آج یہ اسے مزید قریب لگی تھی۔ ڈور بیل دینے سے پہلے اس نے گیٹ پر نصب اسٹیل کی بڑی سی پلیٹ پر اپنے سراپے کو دیکھا تھا۔ پتا نہیں کیا بات تھی آج اس کی تسلی ہو ہی نہیں پا رہی تھی۔ کبھی وہ بالوں کو آگے کرتی تھی اور کبھی پیچھے...... اسی دوران اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب ساتھ لگا چھوٹا دروازہ آہستگی سے کھلا اور وہ وہاں نمودار ہوا۔

''پیاری لگ رہی ہو۔'' اس نے کہا تھا۔ صندل بری طرح سے گھبرائی تھی۔

''میں پودوں کی کاٹ چھانٹ کر رہا تھا۔ تمہاری پازیبوں کی چھن چھن سنی تو باہر نکل آیا۔'' اب کے وہ ہاتھ باندھ کر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ یہ انداز ایسا تھا کہ صندل اپنا مدعا بیان کرے۔

''کیا آج بھی پھول لینے آئی ہو؟''

''نہیں...... یہ لائی ہوں۔'' اسے کچھ اور سمجھ میں نہیں آیا تو اس نے جلدی سے ٹوکری اس کی طرف بڑھا دی۔

''یہ کیا ہے؟''

''ہم اچھے میزبان ہیں۔'' اس نے اتراتے ہوئے کہا تھا۔ وہ ٹوکری پکڑے اسے سوالیہ انداز میں دیکھ رہا تھا۔

''کھانا ہے اس میں......''

''اوہ...... تب ہی تو کہوں میں یہ اتنی اچھی خوشبو کہاں سے آ رہی ہے۔ آ جاؤ...... اندر آ جاؤ بھئی...... اسے اپنا ہی گھر سمجھو...... ٹھیک کہہ رہی ہو تم...... یہاں کے لوگ بھی اچھے ہیں۔ شاید مجھ سے ہی سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔'' وہ بولتا جا رہا تھا اور آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اس کی تقلید میں گھر کے اندر والے حصے میں آئی تھی۔

''میری بہن بیمار ہے۔ وہ تمہارے استقبال کے لیے گھر کے باہر نہیں آسکتی......ہمیں ہی اندر جانا ہوگا۔''

گم صم انداز میں وہ ڈرائنگ روم تک آئی تھی۔ جو ڈرائنگ روم کم اور پرانے نوادرات اور نایاب مصوری کا عجائب خانہ زیادہ لگ رہا تھا۔

''باہر کون تھا میر زاد؟'' زویا کی آواز ڈرائنگ روم میں اتری تھی۔

''کل والی لڑکی آپی......''

''وہ پھول چور......''

ہاتھ میں گلاب سے بھرا گلدان پکڑے زویا کہتے ہوئے ڈرائنگ روم تک آئی تھی۔ اسے نہیں اندازہ تھا کہ اس کا بھائی اس پھول چور لڑکی کو اندر ڈرائنگ روم تک لے آیا ہے۔ وہ سمجھی کہ لڑکی باہر ہی کھڑی ہے۔ لیکن اب اسے اندر کھڑا دیکھ کر اسے شرمندگی ہوئی تھی۔ اپنی جگہ شرمندہ تو صندل بھی تھی۔

''وہ مجھے پھول اپنے بابا کی قبر پر ڈالنے کے لیے چاہیے تھے۔ عید کی وجہ سے کہیں اور سے مل نہیں رہے تھے۔'' اس نے وضاحت دی تھی۔

''ارے کوئی بات نہیں...... میں معذرت چاہتی ہوں۔ روانی میں میرے منہ سے نکل گیا۔''

''آپی! صندل ہمارے لیے کھانا لائی ہے۔''

''کیا تم نے اس سے فرمائش کی تھی؟'' وہ کن اکھیوں سے میر زاد کو دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

''نہیں آپی...... مجھے کیا ضرورت پڑی ہے۔ صندل اپنی مرضی سے لائی ہے۔ روایتیں ہیں یہ ان کے گھرانے کی۔''

''تمہارا بہت بہت شکریہ صندل......اور تم کھڑی کیوں ہو۔ بیٹھو ناں۔''

صندل ایک نرم سے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ پھولوں سے بھرے گل دان کو ایک سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر زویا بھی اس کے سامنے بیٹھ گئی تھی۔ اور تب ہی صندل کو اندازہ ہوا تھا کہ زویا بیمار نہیں تھی، بلکہ وہ امید

سے تھی۔ شرم اور لحاظ کی وجہ سے میر زاد نے اس سے کہا تھا کہ اس کی بہن بیمار ہے۔

''کہاں سے ہو صندل؟''

''دین حویلی سے...... وہ آگے جا کر اونچے ٹیلے پر ہے ہماری حویلی......''

''وہ سرخ رنگ کی حویلی...... جہاں سے اکثر سنکھ کے گونجنے کی آواز آتی رہتی ہے۔''

''جی...... وہ سنکھ رحبانی بابا بجاتے ہیں۔''

''انہیں منع کیا کرو۔ دن کی بات تو اور ہے، کم از کم رات میں تو سو جایا کریں۔''

''جی اچھا...... کہہ دوں گی۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''تمہارے خود کے بابا؟''

''ان کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔ میں چاند امی کے ساتھ حویلی میں ہی رہتی ہوں۔''

''تم خوش قسمت ہو تمہارے سر پر ماں کا سایہ تو ہے۔ ہم دونوں بہن بھائیوں کے پاس تو نہ ماں ہے اور نہ باپ......'' زویا کے بتانے پر صندل نے بے اختیار ہی میر زاد کی طرف دیکھا تھا۔ وہ حسبِ عادت مسکرایا تھا لیکن اب کی بار اس کی مسکراہٹ رلا دینے والی تھی۔

''میرے گھر شادی کے پانچ سال بعد اولاد ہونے والی ہے۔ ڈاکٹر نے کسی صحت افزا مقام پر جانے کا مشورہ دیا تو شوہر صاحب نے اپنے دوست کا بند پڑا گھر ارینج کروا دیا۔ اب شوہر صاحب تو رہے مصروف بندے...... اس لیے میر زاد کو میرے ساتھ آنا پڑا۔'' زویا نے مختصر بات میں ساری بات بتا دی تھی۔

''تو آپ کا یہاں پر قیام عارضی ہے؟''

''ہاں...... میں تو واپس جانے کے لیے ایک ایک دن گن رہی ہوں۔''

''ایسا کیوں؟''

''برا مت منانا...... مجھے یہ شہر اچھا نہیں لگا۔ موسم بھی عجیب ہے یہاں کا اور لوگ بھی......''

''آپ کا واسطہ غلط لوگوں سے پڑا ہوگا۔ آپ ہمارے گھر آئیے گا۔ آپ کو سب سے مل کر یقیناً

بہت خوشی ہوگی۔ خاص طور پر میری چاندامی سے......"

"تم اپنی والدہ کو ان کے نام کے ساتھ پکارتی ہو۔" زویا نے قدرے حیرت سے پوچھا تھا۔ اس کی نظر میں یہاں کے عجیب لوگ مزید عجیب ہو گئے تھے۔ یہ کیا بات تھی بھلا...... والدہ کو ان کے نام سے پکارنا......

"جی وہ کہتی ہیں کہ بابا کے مرنے کے بعد انہیں یہ نام بس میرے منہ سے ہی سننا اچھا لگتا ہے۔ اس لیے میں انہیں چاندامی کہتی ہوں۔ اور میری باقی کی سب کزنز بھی انہیں چاندامی ہی کہتی ہیں۔"

"عجیب بات ہے۔ میرا مطلب ہے کہ اچھی بات ہے۔" زویا نے فوراً سے بات بنائی تھی۔ اس کا مزاج تھا کہ جس چیز سے اس کا دل چڑ جاتا تھا پھر مشکل سے ہی راضی ہوتا تھا۔

"لو باتوں باتوں میں تمہارے لائے کھانے کو تو بھول ہی گئے۔ میں ابھی اسے برتن میں نکال کر لاتی ہوں۔ تم ہمارے ساتھ ہی ناشتا کرنا......" زویا نے کچھ اس انداز سے کہا تھا کہ صندل انکار نہیں کر پائی تھی۔

زویا نے کھانے والی ٹوکری پکڑی تھی اور وہاں سے اندر کی طرف چلی گئی تھی۔ وہ دونوں وہاں اکیلے رہ گئے تھے۔ وہ جو کافی دیر سے کھڑا تھا، اب اس کے سائیڈ پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔

"تو پھر پتا چلا کہ گلاب اور گلاب کے پھول میں کیا فرق ہوتا ہے؟"

"جی...... معلوم ہے۔ گلاب بدیسی وضع کا ہوتا ہے۔ اس کی پتیاں مکمل طور پر نہیں کھلتیں...... آپس میں جڑی رہتی ہیں۔ اور گلاب کے پھول کی پتیاں مکمل طور پر کھل جاتی ہیں۔ اسی لیے اسے گلاب کا پھول کہتے ہیں اور پہلے والے کو گلاب......"

اس نے کل کی بتائی چاندامی کی بات کو نقل کرتے ہوئے بیان کیا تھا۔ جسے سن کر میرزاد اونچی اونچی ہنسنے لگا تھا اور وہ کافی دیر تک ہنستا ہی رہا تھا۔ صندل اس کے ہنسنے سے کچھ شرمندہ سی ہوئی تھی۔ کیا اس نے کچھ غلط کہا تھا؟ وہ تو اس کے سامنے اپنے نمبر بڑھانا چاہتی تھی۔

"یہ...... یہ سب تم سے کس نے کہا؟" اپنی ہنسی کے دوران وہ بمشکل بولا تھا۔

''میں جانتی ہوں۔ ایسا ہی ہے۔'' اپنے علم پر کھوکھلا غرور کرنے کے سوا اس کے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

''گلاب کے پھول کے بہت سے مقاصد ہوتے ہیں۔ یہ سیج پر سجتا ہے۔ قبر پر چڑھتا ہے۔ یہ اظہارِ تعزیت بھی ہے، اظہارِ عیادت بھی اور اظہارِ تہنیت بھی...... جبکہ گلاب صرف زندہ لوگوں کو دیا جاتا ہے۔ اس کا صرف ایک ہی مقصد ہے۔''

''کیا......؟''

''اظہارِ محبت......'' اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے میر زاد نے کہا تھا۔ اور صندل دھک سے رہ گئی تھی۔



قسط نمبر 7

چاند آج بہت دنوں کے بعد کام والے کمرے میں آئی تھی۔ کچھ گزشتہ رمضان کی مصروفیت، پھر عید کی تیاری، اور پھر عید کے دنوں میں ہونے والی تھکن کو زائل کرنے میں نکلتے دن......

اوپر سے کاری گر بھی لمبی لمبی چھٹی پر تھے۔ کچھ بیوی بچوں کے ساتھ پہاڑوں کی سیر کو نکل گئے تھے اور کچھ میدانوں کی طرف...... عید کے تقریباً دو ہفتے کے بعد کام پھر سے معمول پر آیا تھا۔ سارے چوکھٹوں پر بہت تیزی سے ''آر'' چل رہی تھی۔ کاری گر عورتیں اور مرد دلجمعی سے کام کرنے میں مصروف تھے۔

چاند سارے کام کا جائزہ لیتے ہوئے سب کا کام پرکھ رہی تھی۔ بستامی نے کہا تھا مارکیٹ میں ہمارے کام کی ساکھ بہت گر چکی ہے۔ اس لیے ساکھ بحال کرنے کے لیے کام میں نفاست لانے کی ضرورت ہے۔ اس لیے اب چاند کام کی بہت باریک بینی سے پرکھ کر کے ہی اسے پاس کیا کرتی تھی۔

وہ سارے کام کا جائزہ لے رہی تھی جب اس کی نظریں کسی چیز پر جا رکی تھیں۔

''یہ...... یہ چمک کس چیز کی ہے؟'' اس نے چوکھٹے پر کسے ہوئے کپڑوں پر پڑے نگینوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس کے اشارے پر چوکھٹے کے دائیں بائیں بیٹھے سب ہی کاری گروں نے کسے ہوئے کپڑے پر پڑے چمڑے کے اس چھوٹے سے ٹکڑے کو دیکھا، جس پر نگینے اور موتی پڑے ہوئے تھے اور کاری گر وہاں سے ہی موتی نگینے اٹھا اٹھا کر لباس میں جڑتے جاتے تھے۔

''اس بار مال بہت خراب آیا ہے۔ نگینے چھوٹے بڑے تھے۔ بہت سے نگینوں کے اندر تو سوراخ

ہی نہیں تھے۔وہ سب بے کار گئے ہیں۔'' کاری گر نے بتایا تھا۔

چاند نے تو جیسے کاری گر کی بات سنی ہی نہیں تھی۔اس کی توجہ تو ان نگینوں کے درمیان پڑے ایک نگینے کی چمک نے اپنی جانب مبذول کروائی تھی جس کی چمک اسے نیم اندھیرے کمرے میں کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔ ہاتھ میں پکڑ کر پرکھنے سے اسے پتا چلا تھا کہ اس نگینے کے اندر بھی سوراخ نہیں ہے،لیکن وہ بے کار نہیں تھا۔نجانے کیوں چاند کو اس کی چمک کچھ اجنبی سی لگی۔ کچھ اچھوتی سی......ایسی چمک باقی نگینوں کی نہیں ہوا کرتی تھی۔اسے تو سالوں گزر چکے تھے یہ کام کرتے ہوئے۔ ہر طرح کے اور ہر رنگ کے نگینے،موتی اس نے دیکھے تھے۔ کسی کی بھی چمک ایسی نہیں تھی جو اس نگینے کی تھی۔

''نیا مال کہاں ہے؟''

''وہ کونے میں بوری میں پڑا ہے۔''

''بوری کھول کر یہاں پر الٹ دیں۔''

''جی بہتر......'' کاری گر نے کہا اور پھر کونے میں پڑی بوری کو لا کر چاند امی کے سامنے قالین پر الٹ دیا۔سارے نگینے قالین پر بکھر گئے تھے۔

کاری گر ٹھیک کہہ رہے تھے۔ مال اس بار بہت خراب آیا تھا۔ دکان دار نے سچے نگینوں کے ساتھ خراب نگینے بھی تول دیے تھے۔لیکن چاند فی الحال اس رخ پر نہیں سوچ رہی تھی۔ یہ باتیں معمول کی تھیں اور کام کا حصہ تھیں۔ایسا کوئی پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ چاند کو تو اپنے ہاتھ میں پکڑے نگینے جیسے مزید نگینے نکل آنے کی امید تھی۔اسی امید پر وہ سارے نگینوں کی پرکھ کر رہی تھی۔ محنت رنگ لائی تھی۔ ویسے ہی تین مزید نگینے اسے مل گئے تھے۔ سفید نگینے......جو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے چاند کی مٹی سے بنے ہوں، یا جیسے بنانے والے نے انہیں چاند کی چودھویں کی روشنی سے ادھار لے کر بنایا ہو۔

''یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟'' خاتون کاری گر نے پوچھا تھا۔

"مجھے یہ نگینے پسند آ رہے ہیں۔ میں انہیں انگوٹھیوں میں جڑواؤں گی۔"

"لیکن یہ تو بہت کم قیمت ہیں۔ اور مصنوعی بھی۔"

"ہاں...... لیکن ان کی چمک بہت قیمتی ہے۔" چاند نے کہا تھا۔

ملازمہ مسکرا کر پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھی۔ چاروں سفید نگینے لے کر چاند کمرے سے باہر نکل رہی تھی جب بستامی سے اس کا سامنا ہوا تھا۔

"یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے چاند......؟" ہتھیلی پر پھیلے نگینوں کو دیکھتے ہوئے وہ خوش ہو رہی تھی جب بستامی کی وہاں نظر پڑی تھی۔ اس بارے میں بستامی کا پوچھنا بے اختیاری تھا۔

"یہ کچھ نگینے ہیں۔ مال میں سے ملے ہیں۔ مجھے اچھے لگے تو میں نے رکھ لیے......"

"تم ان بے کار نگینوں کا کیا کرو گی بھلا؟"

"میں انہیں انگوٹھیوں میں جڑوانے کا سوچ رہی ہوں۔"

چاند کی بات پر بستامی نے کچھ غور طلب نظروں سے نگینوں کو دیکھا۔ ایسا کیا تھا ان میں کہ چاند انہیں سنبھالے پھر رہی تھی۔

چاند نے اپنی ہتھیلی بستامی کی نظروں کے سامنے کی۔ بستامی نے چار چمچماتے نگینوں کو دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ ان کی چمک تو لاجواب تھی۔

"دکھاؤ ذرا مجھے۔" بستامی نے چاروں نگینوں کو چاند کے ہاتھ سے لے کر اپنی ہتھیلی پر پھیلا کر دیکھا تھا۔ کچھ تو خاص تھا ان میں...... ان کی چمک چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ وہ عام نہیں ہیں۔

"کیا تمہیں یہ چاندی کی انگوٹھیوں میں چاہییں؟"

"ہاں...... چاندی میں ہی اچھے لگیں گے۔ کیونکہ سفید ہیں۔ سونے میں تو اچھے نہیں لگیں گے۔"

"ٹھیک ہے، میں لائل پور جا رہا ہوں۔ میں تمہارا یہ کام بھی کرتا آؤں گا۔" بستامی نے خوش دلی سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔''

بستامی نے چاروں نگینے اپنی جیب میں ڈال لیے تھے اور پھر وہاں سے چلا گیا۔ چاند حیرت سے اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی تھی۔ بستامی کے نرم رویے پر اسے حیرت ہوئی تھی کہ یہ کیوں آج اتنے مشفقانہ انداز میں پیش آیا ہے۔ بستامی کے چہرے پر مسکراہٹ آئے کتنا عرصہ گزر چکا تھا، یہ خود اب چاند کو بھی یاد نہیں رہا تھا۔

☆......☆......☆

''مجھے یہ نگینے نقلی نہیں لگتے بستامی......'' روشن بیگم نے ان روشن نگینوں کو بغور پرکھتے ہوئے کہا۔ اس کی جہاندیدہ آنکھوں نے بھانپ لیا تھا کہ بستامی اس کے پاس کس قدر قیمتی مال لایا ہے۔

''تو پھر...... یہ کیا ہے؟''

''ہیرے...... اصلی ہیرے......'' روشن بیگم نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو مزید بڑا کرتے ہوئے بتایا۔ ان آنکھوں نے اصلی ہیرے بہت بار دیکھے ہوئے تھے۔ وہ تو اندھیرے میں بھی ہیروں کو پہچان سکتی تھیں۔ یہ چاروں نگینے بھی اسے ہیرے ہی لگ رہے تھے جسے بستامی محض شک کی بنا پر اس کے پاس لے آیا تھا۔

''کیا سچ میں......؟'' بستامی بھلا اس کی بات پر کیسے یقین کرتا۔

''ہاں مجھے شک ہے کہ یہ ہیرے ہیں۔ کہاں سے ملے تمہیں؟'' روشن بیگم کے کھنکھناتے لہجے کے ساتھ ساتھ اس کے زیور بھی کھنکے تھے۔

''بس مل گئے کہیں سے...... سمجھو راہ چلتے ملے ہیں۔''

''راہ چلتے ایسی چیز مل جائے تو وہ اشارہ ہے کہ اب زندگی بدلنے والی ہے۔'' وہ مسکرائی۔ ''اور اگر یہ ہیرے نکلے تو میں اپنا حصہ ضرور لوں گی۔'' اور روشن بیگم کی ایک یہ بھی خوبی تھی کہ بات تو ہر وقت پیسوں کی کرتی تھی لیکن کبھی لالچی نہ لگی تھی۔

''ٹھیک ہے۔لیکن پہلے پتا تو چلے کہ یہ اصلی ہیرے ہیں یا نہیں......

''فکر مت کرو...... یہ ہیرے ہی ہیں۔میری تیکھی آنکھوں نے ان کے اندر کی کنی کو دیکھ لیا ہے۔''

روشن بیگم ہنستے ہوئے بولی۔

اتنے سالوں کے بعد بھی اس کی مسکراہٹ اور ہنسی میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔یہ مسکراہٹ اور ہنسی ہی تو تھی جس نے سالوں گزر جانے اور عمر میں بہت آگے نکل جانے کے باوجود اس کا روپ سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔بڑھاپے میں بھی روشن بیگم میں نوجوان لڑکیوں جیسی ادائیں تھیں۔اسے دیکھ کر لگتا نہیں تھا کہ یہ عورت اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ کھا چکی ہے۔

''لیکن میں تمہاری تسلی کے لیے سنار کو بلا لاتی ہوں۔وہ بتا دے گا ان کے بارے میں۔اور ان کی اصل قیمت بھی......''

''ہاں......بلاؤ......اگر یہ اصلی ہیں بھی تو ان کی قیمت کا تو پتا چلے۔''

''رحمو......او رحمو......کہاں ہو تم؟'' روشن بیگم نے رحمو کو آواز دی تھی۔اگلے ہی لمحے رحمو وہاں پر حاضر ہوا تھا۔

''جی مالکن!''

''یہ نکڑ والی دکان سے بابا کریم کو بلا لاؤ۔انہیں کہو کہ روشن بیگم نے بلایا ہے۔سارے کام دھندے چھوڑ کر فوراً سے آئے۔''

''جی بہتر!''

''اور سنو!اس سے کہنا اپنا عدسہ بھی ساتھ لیتا آئے۔ہیروں کی پرکھ کرنی ہے۔''

''جی کہتا ہوں۔''

حکم سن کر رحمو وہاں سے چلا گیا تھا۔تھوڑی دیر کے بعد اس کی واپسی بابا کریم کے ساتھ ہوئی تھی۔

بستامی نے یہ اتنا سا وقت بہت مشکل سے گزارا تھا۔عمر رسیدہ بابا کریم بڑھاپے کے باعث کپکپاتے ہاتھوں اور کانپتے جسم کے ساتھ وہاں موجود تھے۔روشن بیگم نے نگینے ان کے سامنے کیے تھے جسے بابا کریم اپنے موٹے عدسے سے بہت دیر تک دیکھتے رہے۔وہ چاروں طرف سے ان کی جانچ کررہے تھے۔سپاٹ چہرے کے ساتھ......اور بستامی دل تھامے بیٹھا رہا تھا کہ نجانے بابا کریم کیا کہہ دیں۔کہیں وہ یہ نہ کہہ دیں کہ یہ ہیرے نہیں بلکہ نگینے ہی ہیں۔روشن بیگم نے اسے جو امید دلا دی تھی تو وہ چاہتا تھا کہ اب یہ امید پوری ہو جائے۔چار ہیروں کے بدلے میں اسے ایک بڑی رقم ہاتھوں میں آتی ہوئی نظر آرہی تھی۔

''واہ......بہت خوب......'' بابا کریم نے بالآخر نعرہ لگاتے ہوئے بڑی دیر کے بعد کہا۔بستامی نے ان کی طرف دیکھا۔

''کمال ہی ہوگیا۔''

''کیا ہوا ہے؟''

''زندہ کنی والا ہیرا ہے محترم......'' بابا کریم نے کہا اور بستامی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔روشن بیگم بھی مسکرائیں۔

''یہاں تو مردہ کنی والا ہیرا بھی بہت قیمتی ہوتا ہے۔آپ تو زندہ کنی والا لے آئے ہیں۔''

''کیا چاروں......؟'' بستامی کی تسلی نہیں ہو رہی تھی۔بیٹھے بٹھائے اس کی تو جیسے لاٹری نکل آئی تھی۔

''ٹھہریئے! دیکھتا ہوں۔'' وہ پھر سے عدسے کے ساتھ ہیروں کی پرکھ کرنے میں مصروف ہو گئے تھے۔

''جی چاروں......اصلی ہیرے ہیں۔یہ تو نہیں کہوں گا کہ بہت نایاب ہیں، لیکن منڈی میں اچھی قیمت مل جائے گی ان کی......''

''اندازاً کتنی؟''

''دو سے تین لاکھ تک تو مل ہی جائے گی۔''

''کیا......دو تین لاکھ؟'' بستامی کو جیسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ چاند سے کیا چیز حاصل کر لی تھی اس نے......

''اس سے زیادہ بھی مل سکتی ہے۔''

''آپ کتنی دے سکتے ہیں؟'' روشن بیگم اصل بات پر آئی تھی۔

''تین لاکھ......'' بابا کریم نے کہا تھا۔

بستامی اور روشن بیگم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔

''منظور ہے۔'' بستامی نے آمادگی دے دی۔

''ٹھیک ہے۔ اپنا ملازم ساتھ بھیج دیجیے۔ میں دکان سے پیسے دے دیتا ہوں اس کو......'' بابا کریم نے چاروں ہیرے اپنی قمیص کے نیچے شلوار کی جیب میں ڈال لیے تھے۔

''رحمو......اور رحمو......تم بابا کریم کے ساتھ جاؤ۔ یہ تمہیں تین لاکھ کی رقم دیں گے، وہ احتیاط کے ساتھ لے آؤ۔''

''جی اچھا مالکن!''

رحمو اور بابا کریم کوٹھے سے نیچے اتر گئے تھے۔ اور تب ہی بستامی اور روشن بیگم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اگلے ہی لمحے دونوں کا قہقہہ فضا میں بلند ہوا تھا۔ اور دونوں نجانے کتنی ہی دیر تک ہنستے رہے تھے۔

☆......☆......☆

کھڑکی کھلی تھی اور سیب کے باغ سے اس کے کچے اور پکے پھلوں کی خوشبو کمرے میں اتر آئی تھی۔ وہ تو بچپن سے ہی اس خوشبو کو محسوس کرتی چلی آ رہی تھی۔ پھر بھی آج اسے یہ خوشبو کہیں زیادہ لگی

تھی۔ یا شاید اس خوشبو میں آج اس کا لہجہ گھلا ہوا تھا۔

اس پہاڑی شہزادے کا...... میر زاد کا......

''گلاب کے پھول کے بہت سے مقاصد ہوتے ہیں۔ یہ سیج پر سجتا ہے۔ قبر پر چڑھتا ہے۔ یہ اظہار تعزیت بھی ہے، اظہار عیادت بھی اور اظہار تہنیت بھی...... جبکہ گلاب صرف زندہ لوگوں کو دیا جاتا ہے۔ اس کا صرف ایک ہی مقصد ہے...... اظہار محبت......''

صندل کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ کیوں کہا تھا۔ اسے گلاب کی ایسی تعریف نہیں کرنی چاہیے تھی۔ کم از کم ایک لڑکی کے سامنے تو ہرگز نہیں...... جو گلاب کی پنکھڑی سے بھی زیادہ نازک جذبات رکھتی ہے۔

''اظہار محبت...... اظہار محبت...... اظہار محبت......''

صندل کے دل و دماغ میں یہ ہی فقرہ گونج رہا تھا۔ کاش وہ اس لفظ ''اظہار محبت'' کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار بھی کر دیتا...... لیکن ایک دم سے کیسے اچانک...... ابھی تو ان کی محض دو تین ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ وہ بھی واجبی سی...... اتنی کم مدتی ملاقاتوں کے بعد کوئی کسی لڑکی کے لیے محبت تھوڑی نہ محسوس کر سکتا ہے۔ لیکن صندل نے تو پہلی ملاقات میں اس کے لیے محسوس کر لی تھی۔ پھر اس نے کیوں نہیں کی۔

''رات کے اندھیرے میں کھڑکی سے باہر کیا دیکھ رہی ہو صندل......؟''

افشیں نے اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ میر زاد کو سوچتے ہوئے اپنے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ کو اس نے جلدی سے ختم کیا۔ لیکن افشیں جب ہلکے سے مسکرائی تو صندل کو احساس ہوا کہ وہ اس کے چہرے سے اپنے مطلب کا کچھ تاڑ چکی ہے۔

''سارا دن نظر نہیں آئیں آج تم...... کہاں گم رہی ہو؟''

''یہاں ہی تھی میں...... اپنے کمرے میں۔''

''کمرے میں ایسا کیا خزانہ نکل آیا ہے جو تم آج کمرے میں ہی بند رہی ہو۔'' افشیں نے ذو معنی انداز میں کہا۔

''بتاؤ...... کام کیا ہے؟'' اس نے بات بدلی تھی۔

''نیچے بڑے کمرے میں آ جاؤ...... سب وہاں ہی ہیں۔ سردیاں آنے والی ہیں۔ لہٰذا اس کی تیاری کرنی ہے۔ مرونڈا بنانا ہے۔ گچک بنانی ہے۔ پنیاں بنانی ہیں۔ اور بھی ہزار کام ہیں جو ایک دو روز میں مکمل ہوں گے۔''

''تم چلو...... میں آتی ہوں۔''

''میرے ساتھ چلنے میں کیا مسئلہ ہے تمہیں۔'' افشیں نے کہا تو صندل کو احساس ہو گیا کہ وہ ایسے جان نہیں چھوڑنے والی۔ دوپٹا پکڑ کر وہ فوراً سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''چلو...... مرو......''

دونوں نیچے بڑے کمرے میں پہنچیں تو وہاں سب پہلے سے ہی موجود تھے۔ حاجی بوا کمرے کے وسط میں بڑا چولہا رکھے اس میں پنیوں کے لیے چاشنی بنا رہی تھیں۔ کرن اور تعبیر باداموں کو توڑ کر ان کی گریاں الگ کر رہی تھیں۔ زارا کشمش صاف کر رہی تھی اور صاف کرنے سے زیادہ کھا رہی تھی۔ روشنائے اور سارا مونگ پھلیوں کو ہتھیلیوں پر مسل مسل کر ان کے چھلکے اتار رہی تھیں۔ تہمینہ پھوپھو تھالیوں پر گھی لگا رہی تھیں۔ اور زہرہ اور شکیلہ پھوپھو چاولوں کو پیس رہی تھیں۔

سردیوں کی تیاری کی یہ روایت بہت پرانی تھی۔ حویلی کی سب خواتین یہ کام بہت دل سے کیا کرتی تھیں اور اپنے ہاتھوں سے کیا کرتی تھیں۔ یہ کام ملازموں سے نہیں کروائے جاتے تھے۔ صندل اور افشیں بھی وہاں ہی بیٹھ گئی تھیں۔

''چاند کو نہیں بلایا تم نے افشیں......؟''

''بلایا تھا۔ انہوں نے کہا، انہیں نہیں آنا۔''

افشیں نے چاند کا پیغام آگے پہنچا دیا تھا۔ جسے سن کر تہمینہ پھوپھو کو دکھ ہوا تھا۔ چاند حویلی کی کسی خوشی میں شریک نہیں ہوتی تھی۔ نجانے کیوں اس نے خود کو اتنا خاموش کر لیا تھا۔ کسی نے چاند کے وہاں نہ آنے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا کیونکہ وہ چاند کا مزاج اچھے سے جانتے تھے۔

جلد ہی حاجی بوا نے چاشنی میں پسے ہوئے چاول ڈال دیے تھے۔ جس نے پورے کمرے میں ایک مدھر سی خوشبو کو پھیلا دیا تھا۔

اسی مدھر خوشبو میں صندل کو پھر سے میر زاد کا لہجہ یاد آیا تھا۔ کتنی خوب صورتی سے بولتا تھا وہ......کوئی اتنا خوب صورت کیسے لگ سکتا ہے۔ یا یہ صندل کی نظر تھی کہ اسے اس میں خوب صورتی ہی خوب صورتی نظر آتی تھی۔

گڑ کی چاشنی میں چاول اچھے سے بھن گئے تو حاجی بوا نے اسے ایک بڑے سے تھال میں الٹ دیا تھا اور تہمینہ پھوپھو نے اس میں ڈھیروں خشک میوے ڈال دیے تھے۔

''چلو بھئی لڑکیو! شروع ہو جاؤ......''

''اور زارا تم...... پنیاں بنانی ہیں، کھانی نہیں ہیں۔ یاد رہے۔''

صندل نے کہا تو زارا نے منہ بنا کر اسے دیکھا تھا۔ دل تو اس کا کر رہا تھا کہ پنی چھوڑ آج صندل کو ہی کچا چبا جائے۔ جیسے اس کے دانت تھے اور جس قدر اس کا پیٹ تھا، وہ ایسا کر بھی سکتی تھی۔

''اور سب نے ایک سائز کی بنانی ہیں۔ اپنے اپنے ہاتھوں کے حساب سے مت بنا دینا...... یہ دیکھو...... اتنی بنانی ہیں۔'' تہمینہ پھوپھو نے ایک پنی بنا کر سب کو دکھائی تھی۔

''سیدھی طرح سے کہہ دیں ناں خالہ...... کہ زارا کی ناک کے سائز کی بنانی ہیں۔'' افشیں نے اتنی معصومیت سے کہا تھا کہ سب ہی ہنسی تھیں۔

زارا کو بھی بے اختیار ہنسی آ گئی تھی۔ لیکن چونکہ اپنی بے عزتی پر ہنسنا زیادہ بڑی بے عزتی تھی اس لیے وہ گردن نیچے کر کے منہ چھپا کر ہنسی تھی۔

سب پنیاں بنانے میں مصروف ہو گئی تھیں اور حاجی بوا نے بڑے کڑاہے میں اب کے چنے اور گندم ڈال لیا تھا۔ اور اسے بھوننے لگی تھیں۔ یہ مرونڈا بنانے کی تیاری ہو رہی تھی۔

''آج بھی کوئی قصہ سناؤ بوا! جیسے آپ نے پہلے سنایا تھا۔ صندل کو گود لینے والا......'' کرن نے صندل کو دیکھتے ہوئے بوا سے کہا تھا۔

وہ چاہتی تھی کہ پھر سے صندل کے حوالے سے ہی کچھ سنایا جائے۔

''آج تو میں تمہیں اس سے بھی بڑھ کر کچھ سناؤں گی۔ حویلی میں ہونے والا سب سے اہم واقعہ......'' حاجی بوا مسکراتے ہوئے، خیالوں ہی خیالوں میں ماضی میں جاتے ہوئے بولی تھیں۔

''ایسا کیا بوا......''

''چاند اور رحبان کی شادی کا قصہ......'' کڑاہے میں کرچھا چلاتے ہوئے حاجی بوا نے بم پھوڑا تھا۔

''کیا......؟'' کام سے ہاتھ روک کر سب لڑکیاں مشترکہ چیخی تھیں۔ حاجی بوا کی بات پر انہیں شدید حیرت ہوئی تھی۔ جہاں لڑکیاں حیران تھیں، وہیں تہمینہ، زہرہ اور شکیلہ نے اچنبھے سے حاجی بوا کو دیکھا تھا۔

''کیا باتیں لے کر بیٹھ گئی ہیں حاجی بوا......'' تہمینہ پھوپھو نے آنکھ سے اشارہ کرتے ہوئے حاجی بوا کو کچھ بھی مزید بولنے سے منع کیا تھا۔ لیکن حاجی بوا منع ہونے والی کہاں تھیں۔

''ارے کچھ نہیں ہوتا...... پھر کیا ہوا۔ کسی غیر سے تھوڑی نہ کر رہی ہوں بات......''

''یہ کب کا واقعہ ہے بوا؟'' صندل سب سے زیادہ حیرت زدہ تھی۔ چاند امی نے آج تک اس سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔

''کوئی بیس سال ادھر کی بات ہے۔''

''کیا سچ میں رحبانی بابا اور چاندامی کی شادی ہوئی تھی؟''

''نہیں...... ہوئی نہیں تھی۔ بس...... بات چلی تھی۔''

''حاجی بوا چھوڑو ان باتوں کو......'' زہرہ پھوپھو نے ٹوکا تھا۔ ''چاند کو پتا چلا کہ تم صندل سمیت سب کو یہ بات بتا رہی ہو تو وہ ناراض ہوگی۔''

''ارے نہیں ہوتی وہ ناراض...... میں تم سے زیادہ جانتی ہوں اسے۔'' حاجی بوا کسی کی ماننے والی ہی کہاں تھیں۔ اور اب تو لڑکیاں بھی سننے کے لیے اتاؤلی ہوگئی تھیں۔

''ہمیں ساری بات جاننا ہے اب۔'' لڑکیوں نے بے چینی سے کہا تھا۔ خاص کر کے صندل نے......

''تو بتاؤ حاجی بوا...... کیا ہوا تھا؟''

اور تہمینہ، زہرہ اور شکیلہ کی تنبیہی نظروں کے باوجود حاجی بوا نے بات سنانے کے لیے اپنا رخ لڑکیوں کی طرف کر لیا تھا۔

''التمش کے مرنے کے بعد چاند تو جیسے خود بھی مر کر رہ گئی تھی۔ بس جسم سے جان نہ نکلی تھی۔ ہر وقت روتی رہتی...... التمش کو یاد کرتی رہتی۔ نہ کھانے پینے کا ہوش، اور نہ لباس کی پروا...... دین بابا سے تو چاند کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ وہ چاند کو دیکھ کر روتے رہتے تھے۔ گھر کے سارے افراد چاند کے حوالے سے فکر مند تھے۔ لیکن جو نقصان ہو چکا تھا اسے کسی طرح پورا نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میں ہی چاند کی منت سماجت کر کے اسے تھوڑا بہت کھانا کھلا دیا کرتی تھی یا کچھ کچھ وہ رحبان کی بات مان لیا کرتی تھی۔ سچ یاد آیا۔ تب چاند اور رحبان کی بہت دوستی ہوا کرتی تھی۔ چاند ہر کام رحبان کے ساتھ ہی کیا کرتی تھی اور رحبان بھی چاند کے بنا کچھ نہیں کرتا تھا۔ جو چاند نے کہہ دیا وہ ہی اس کے لیے پتھر پر لکیر ہوگیا۔''

''لیکن اب تو دیکھ کر ایسا نہیں لگتا کہ چاند امی کی کبھی رحبانی بابا سے دوستی رہی ہے۔ وہ تو ان سے بے حد کم بات چیت کرتی ہیں۔ بہت ہی کم...... صرف ضرورت کی بات چیت......''

صندل کے لیے ماضی کی ہر بات کسی اچنبھے سے کم نہیں تھی۔ چاند امی نے اسے ماضی کے بارے میں کبھی اتنا تفصیل سے نہیں بتایا تھا۔ وہ سوائے التمش بابا کے اور کچھ نہیں جانتی تھی۔ نہیں جانتی تھی کہ اس کی ماں نے کتنے بڑے بڑے غم دیکھے ہیں۔

''بس وقت وقت کی بات ہے ناں بیٹا...... کبھی دوستی کبھی دشمنی...... کبھی تشنگی کبھی تیرگی......''

''شعر و شاعری بند کرو بوا...... بتاؤ کہ پھر کیا ہوا؟''

''پھر دین بابا نے سوچا کہ رحبان اور چاند کی شادی کر دیتے ہیں۔ گھر کی بات گھر میں رہ جائے گی۔ حویلی میں سب کو معلوم تھا کہ چاند شادی کے لیے نہیں مانے گی کیونکہ وہ التمش کے نام کی بیوہ رہنے کی قسم کھا چکی ہے۔ لیکن وہ رحبان سے شادی کرنے کے لیے مان گئی۔ دین بابا نے اسے راضی کر لیا۔''

''ہائے اللہ! شادی کے لیے راضی ہو گئیں پھر بھی شادی نہیں ہو سکی۔''

زارا اپنے منہ میں بڑی سی پنی ڈالتے ہوئے بولی جو ڈکار کی صورت میں اس کے حلق کے نیچے اتری تھی۔ لڑکیاں کہانی سننے میں اتنی مگن تھیں کہ زارا کی طرف توجہ ہی نہیں دے رہی تھیں۔

''پھر دونوں کی شادی کی تاریخ رکھ دی گئی۔ ایک بار پھر سے حویلی میں چاند کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ چاند بھی بہت خوش اور رحبان کی خوشی کے تو کیا ہی کہنے۔ لڑکیوں سے زیادہ شرماتا تھا تب...... بات بات پر منہ لال ہو جاتا تھا اس کا...... کیوں تہمینہ...... یاد ہے تمہیں وہ دن......؟''

''جی......'' تہمینہ نے ہلکے سے کہا تھا۔

انہیں حاجی بوا کا لڑکیوں کو یہ سب بتانا پسند نہیں آ رہا تھا۔

''پھر بارات کا دن آ پہنچا۔ نکاح کا وقت ہو گیا۔ سب مہمان بھی آ گئے۔ چاند دلہن بن گئی اور

رحبان دلہا بن گیا۔لیکن......"

"لیکن کیا؟"

"لیکن اسی وقت دین بابا کی موت ہوگئی اور یہ شادی نہ ہوسکی۔"

"دین بابا کی موت کیسے ہوگئی؟" صندل نے بے اختیار ہو کر پوچھا تھا۔

حاجی بوا لمحے بھر کو گڑبڑا گئی تھیں۔

"کیسے ہوئی تھی کیا مطلب...... جیسے موت ہوتی ہے۔سانس بند اور زندگی ختم...... موت وقت تھوڑی ناں دیکھتی ہے۔" حاجی بوا نے جھوٹ کی آمیزش کرتے ہوئے بات بنائی تھی۔

"لیکن پھر موت کے سوگ کے بعد بھی یہ شادی کیوں نہ ہوسکی؟"

"پھر چاند نے شادی سے انکار کر دیا۔"

"کیوں......؟" ساری لڑکیوں نے پھر سے حیرت سے پوچھا تھا۔

ساری بات سننے کے باوجود بھی انہیں جیسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔حاجی بوا کیا بتا رہی تھیں انہیں اور کیا چھپا رہی تھیں۔

"پتا نہیں کیوں...... بہت پوچھا چاند سے...... بہت سمجھایا بھی...... لیکن چاند یہ ہی کہے جائے کہ اب بس وہ التمش کے نام پر ہی زندگی گزار دے گی۔" حاجی بوا نے کچھ اپنے پاس سے اور کچھ چاند کی بات کو ملاتے ہوئے بات بنائی تھی۔صندل کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر چکی تھیں۔اس کی ماں نے کتنے دکھ دیکھ لیے تھے کم عمری میں......

"چلو لڑکیو! پنیاں بن گئی ہیں تو اب گچک کی تیاری کرو......" تہمینہ نے بات بدلنے کی غرض سے زوردار آواز میں کہا تھا۔لڑکیاں ماضی کی اداسی سے واپس آتے ہوئے کچھ ایسی چپ چپ تھیں کہ جی ہاں بھی نہیں کہہ سکی تھیں۔

ماضی...... جو ہمیشہ سے ہی دردناک رہا ہے۔ اداس اور دکھ بھرا......

''میں ضرور پتا کر کے چھوڑوں گی کہ چاندامی نے رحبانی بابا سے شادی کیوں نہیں کی تھی۔'' تھال کے اوپر سفید کپڑا ڈال کر انہیں ڈھکتے ہوئے صندل نے دل ہی دل میں تہیہ کیا تھا۔

☆......☆......☆

سرخ حویلی میں صبح بہت جوبن سے نمودار ہوتی تھی۔ حویلی سب سے اونچے ٹیلے پر تعمیر تھی۔ اس لیے بنا کسی سائے کے سورج اپنی مکمل روشنی سے حویلی کو منور کیا کرتا تھا۔ پھر حویلی کے وسط کا صحن اس قدر بڑا تھا کہ دھوپ وہاں سے دالانوں اور ہر ہر کمرے میں بڑی فیاضی سے گزرتی تھی۔ چاند کو صبح کا یہ منظر بہت پسند تھا۔ وہ دالان میں بیٹھ جایا کرتی تھی اور دھوپ کے کم سے زیادہ ہوتے ہوئے سفر کو دیکھا کرتی تھی۔ اسے ویسے بھی صبح جلدی اٹھ جانے کی عادت تھی۔ وہ صبح ہی صبح اٹھ کر اپنے کام کا آغاز کر دیا کرتی تھی۔

آج بھی وہ دالان میں بیٹھی اوپر آسمان کو دیکھ رہی تھی جب حویلی کا چھوٹا دروازہ کھلا تھا اور بستامی اور رحبانی اندر داخل ہوئے تھے۔ دونوں کل لائل پور گئے تھے۔ ان کی واپسی آج صبح ہوئی تھی۔

رحبانی تو چاند پر ایک غلط نظر ڈال کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا جب کہ بستامی چلتا ہوا چاند کے پاس آیا تھا۔

''چاند......!''

''جی بھائی......!''

''یہ لو تمہاری چار انگوٹھیاں......'' بستامی نے کہتے ہوئے اپنی جیب سے چار انگوٹھیوں کی مخملی ڈبیہ نکال کر چاند کے سامنے کی تھیں۔

''میں نے انہیں سفید سونے میں جڑوا دیا ہے۔ چاندی کو تو اب کوئی پسند نہیں کرتا۔''

''شکریہ بھائی......!'' چاندامی نے کہتے ہوئے جلدی سے انگوٹھیاں پکڑ کر انہیں دیکھا تھا۔

بستامی مسکراتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ چاند نے انگوٹھیاں دیکھی تھیں اور نجانے کیوں اس کا دل بجھ سا گیا تھا۔ وہ نگینے جو بہت زیادہ چمک دے رہے تھے، انگوٹھیوں میں جڑ کر کچھ پھیکے پھیکے سے لگنے لگے تھے۔ چاند نے انہیں دوپٹے کے پلو سے رگڑا تھا لیکن بات نہیں بنی تھی۔ انگوٹھیوں میں جڑتے ہی نگینوں کی چمک جیسے ماند پڑ گئی تھی۔

''یہ کیسے عجیب بے رنگ سے دکھنے لگے ہیں۔'' اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہ ہی نگینے ہیں جو اس نے کام والے کمرے میں دیکھے تھے اور انہیں دیکھ کر وہ دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ یہ تو بہت مصنوعی لگ رہے تھے۔

بے چاری چاندامی نہیں جانتی تھی کہ جنہیں وہ نگینے سمجھ رہی تھی وہ کچی کنی کے ہیرے تھے جنہیں بستامی نے بیچ کر رقم اپنی جیب میں ڈال لی تھی اور اسے جھوٹے نگینوں کی چار انگوٹھیاں لا دی تھیں۔

کشمکش کی سی حالت میں وہ کمرے میں آئی تھی۔ اس نے چاروں انگوٹھیاں چاروں بڑی لڑکیوں کے لیے بنوائی تھیں لیکن انگوٹھیاں بن کر اتنی کم قیمت لگ رہی تھیں کہ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ان میں سے کسی کو بھی نہیں دے گی۔ اس کا دل بجھ گیا تھا اس لیے وہ اس نے بنا صندل کو دکھائے اپنی الماری میں رکھ لی تھیں۔

''چاندامی......!'' صندل نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس کو پکارا تھا۔

''ہاں بولو میری جان......'' الماری بند کر کے وہ پلٹی تھی۔

''میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔ آپ کے ہاتھوں کا مساج کروانا ہے۔''

''کیوں نہیں میری جان ......ابھی کر دیتی ہوں اپنی بیٹی کو......بیٹھو......'' چاند کرسی پر بیٹھ گئی تھی اور اسے نیچے بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔ صندل نیچے بیٹھ گئی تھی۔ سر پر خوشبو والا تیل ڈالتے ہوئے چاند ہلکے ہاتھوں سے اس کے سر کی مالش کرنے لگی تھی۔ صندل نے چند لمحے سوچ بچار کی تھی۔ پھر اصل بات پر آئی

تھی جو کرنے کے لیے وہ کل سے پر تول رہی تھی۔

''چاند امی...... کیا میں گھر میں کسی کو بلا سکتی ہوں؟''

''کس کو بلانا ہے تمہیں؟''

''اپنی دوست کو......''

''کون سی دوست......؟''

''زویا...... وہ آگے جا کر سفید رنگ کی کوٹھی ہے اس کی...... جہاں سے میں آپ کے لیے پھول توڑ کر لاتی رہی ہوں۔''

''کیا وہ اکیلی آئے گی؟''

''نہیں...... وہ اپنے بھائی کے ساتھ آئے گی۔''

صندل کی بات پر اس کے سر پر مالش کرتے چاند کے ہاتھ رک گئے تھے۔

''اس کے والدین فوت ہو چکے ہیں۔ وہ یہاں بس اپنے بھائی کے ساتھ ہی رہ رہی ہے۔''

''تو دراصل تمہیں سر میں درد نہیں تھا، تم نے یہ بات کرنے کے لیے ماحول کو خوش گوار بنایا ہے۔''

چاند کی بات پر صندل بے اختیار ہو کر ہنس پڑی تھی۔

''آپ نے میری چوری پکڑ لی ہے۔''

''ظاہر ہے، اولاد ہو تم میری...... مجھ سے کچھ چھپا نہیں سکتی ہو تم...... تمہیں کوکھ سے پیدا نہیں کیا میں نے...... لیکن وجود میں اتارا ضرور ہے۔''

''تو پھر میں انہیں کس دن بلاؤں؟''

''جس دن تمہارا دل کرے۔''

''کل؟'' وہ اپنی بے چینی چھپا نہیں سکی تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' چاند نے مسکراتے ہوئے رضامندی دے دی تھی اور وہ پھر سے رخ بدل کر اپنے سر کی مالش کروانے لگی تھی۔ اور سوچنے لگی تھی کہ کل وہ میرزاد اور زویا کے استقبال کے لیے کیا کیا کرے۔ کیا کیا کھانے پکائے۔

دوسری طرف چاند صندل کی بات پر بے چین ہو چکی تھی۔ جسے اس نے فی الحال صندل پر ظاہر نہیں کیا تھا۔ وہ کل نئے مہمانوں سے مل کر ہی کچھ فیصلہ کر سکتی تھی۔

''کل حاجی بوا نے بتایا کہ آپ کی شادی ایک بار رحبانی بابا سے بھی ہونے جا رہی تھی۔'' صندل کی بات پر چاند کے ہاتھ ایک بار پھر سے رکے تھے۔

''حاجی بوا کو تو میں پوچھتی ہوں۔ نجانے کیا کیا بتاتی رہتی ہیں تم لڑکیوں کو......''

''اب تو وہ بتا چکی ہیں ہمیں......''

''اچھی بات ہے۔''

چاند کا مزید اس موضوع پر بولنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور کپڑے سے اپنے ہاتھ صاف کرنے لگی تھی۔

''یہ شادی کیوں نہیں ہو سکی تھی چاند امی......''

''حاجی بوا نے تمہیں کیا بتایا ہے؟''

''انہوں نے تو کچھ بتایا ہی نہیں۔''

''پھر مجھ سے بھی مت پوچھو۔''

''لیکن!''

''بس صندل!'' چاند نے اپنا ہاتھ آگے کرتے ہوئے اسے مزید بولنے سے منع کیا تھا۔

''دوبارہ پھر کبھی اس موضوع پر بات مت کرنا۔''

اور صندل نے چاند کا اتنا سخت انداز زندگی میں پہلے بار دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر حیرت کا پھیلنا لازمی تھا۔ چاند کو بھی احساس ہوا تھا کہ وہ کچھ زیادہ ہی سختی سے پیش آئی ہے۔ شرمندگی چھپانے کے لیے وہ جلدی سے کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔ اور صندل کو احساس ہوا تھا کہ اس بات میں یقیناً کوئی راز ہے۔

کوئی بہت بڑا راز......

جس نے اس کی ماں کی زندگی برباد کر دی ہے اور جس کا پتا اب اس نے لگا کر ہی چھوڑنا تھا۔



ناول **تاش گھر** ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **1** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 8

دین حویلی میں کسی کی آمد کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ چاندامی نے باقی گھر والوں کو بتایا تھا کہ اس کے کچھ جاننے والے آ رہے ہیں۔ لیکن لڑکیاں بات لے اڑی تھیں۔ انہیں پتا چل چکا تھا کہ جو بھی آج آ رہا ہے صندل کی وجہ سے آ رہا ہے۔

کون آ رہا ہے؟ اس کا انہیں نہیں معلوم تھا۔ اور اسی کے لیے شام کا شدت سے انتظار کیا جا رہا تھا۔

تینوں پھوپھیوں کو یہ تو نہیں معلوم تھا کہ آنے والے مہمان کو صندل نے مدعو کیا ہے لیکن وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ آنے والے چاند کے جاننے والے نہیں...... کیونکہ مدتیں گزر چکی تھیں، اس گھر میں چاند کی کوئی سہیلی نہیں آئی تھی۔ اوپر سے پر تپاک تیاریاں دیکھ کر سب کا ہی اشتیاق بڑھا ہوا تھا۔

''ہمارے پڑوس میں ایک فیملی آئی ہے۔ صندل کی ان سے علیک سلیک ہو چکی ہے۔ اس لیے میں ان کو گھر کھانے پر بلا رہی ہوں۔''

چاندامی نے وضاحت دی تھی لیکن اس وضاحت سے کسی کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ پڑوس کی اس نئی فیملی کو ہر کوئی ہی دیکھنا چاہتا تھا۔

''صندل! کم از کم مجھے تو بتا دو کہ کون آ رہا ہے ہماری حویلی...... میں تو تمہاری دوست ہوں۔'' افشیں نے پوچھا تھا۔

''جب آئے تو خود ہی دیکھ لینا۔''

''ویسے بڑی گھنی ہو تم...... چپکے ہی چپکے کام کر جاتی ہو۔''

''ایسی کوئی بات نہیں، جیسا تم سوچ رہی ہو۔'' افشیں کی بات پر وہ اپنی مسکراہٹ چھپا نہ سکی تھی۔

''جیسی بات ہے وہ تمہاری مسکراہٹ بتا رہی ہے۔''

صندل بے اختیار ہو کر ہنس پڑی تھی۔

افشیں کے سارے شکوک کو تصدیق مل گئی تھی۔

''دیکھنا اگر وہاں سے تمہارے لیے رشتہ آیا تو میں تمہارا کیا حال کرتی...... میسنی لڑکی......''

اور صندل ہنستی ہی چلی گئی تھی۔

شام کی دعوت کے لیے صندل نے خاص تیاریاں کروائی تھیں۔ گھر کے سارے ملازم ہی مصروف ہو چکے تھے۔ کچھ صفائیاں کر رہے تھے۔ کچھ حویلی کو سجا بنا رہے تھے۔ کچھ کھانا بنا رہے تھے۔ صندل نے بہت سے روایتی کھانے بنوائے تھے۔ پہاڑی علاقوں کے مخصوص کھانے...... جوان کی حویلی کے ملازم پکانے میں طاق تھے۔

صندل نے برتنوں کا انتخاب بھی بہت سلیقے سے کیا تھا۔ چاند نے اس کی مدد کی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ شیرینیوں کے لیے کون سے تھال استعمال کیے جاتے ہیں۔ گوشتابہ کس رکابی میں ڈالا جاتا ہے۔ پلاؤ کس تھالی میں سجایا جاتا ہے۔ برتن پیتل کے ہوں تو ساتھ کانچ کے گولڈن پٹی والے گلاس رکھے جاتے ہیں۔ رات کے کھانے پر دستر خوان کس رنگ کا بھلا لگتا ہے۔ صندل ان کی ہدایات پر عمل کرتی رہی تھی۔

کمرے کو بھی اس نے نئے قالینوں اور سفید چاندنیوں سے سجا لیا تھا۔ عطر کا چھڑکاؤ کیا تھا۔ اور گلدان میں تازہ خوش رنگ پھول سجائے تھے۔ چاند اس کی ساری تیاریاں دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنا وقت یاد آ گیا تھا جب التمش نے اس گھر میں پہلی بار آنا تھا تو چاند نے بھی خوب تیاری کی تھی۔ کھانے بنوائے تھے۔ کمرا سجایا تھا اور التمش کے لیے صحن کے فرش پر خاص رنگولی بنوائی تھی۔

رنگولی...... جسے رحبان نے خراب کر دیا تھا۔

یاد کرتے ہوئے چاند کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

"تو نے اسی دن میری زندگی کے رنگ خراب کر دیے تھے رحبان......! مجھے ہی یہ بات دیر سے سمجھ آئی۔" چاند نے سوچتے ہوئے نفرت سے منہ بنایا تھا۔ اور آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو صاف کیا تھا۔

"خدا نہ کرے کہ میری بیٹی کی زندگی کے رنگوں کو کوئی خراب کرے۔ کسی نے ایسا سوچا بھی تو میں اس کا منہ نوچ لوں گی۔" چاند نے جیسے خود سے وعدہ کیا تھا۔

میرزاد اور زویا کو صندل نے ایک دن پہلے ہی دعوت کا کہہ دیا تھا۔

"ہماری دعوت......؟ کس خوشی میں؟" بات اتنی حیرت کی تھی نہیں جس قدر زویا حیرت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ جیسے خودکار طریقے سے اس کا ناک چڑھ گیا ہو۔

"ویسے ہی...... آپ لوگ یہاں نئے جو شفٹ ہوئے ہیں۔"

"ہمیں یہاں رہتے ہوئے مہینہ ہو گیا ہے صندل......"

زویا نے ایسے جتاتے ہوئے کہا تھا جیسے ان کے شفٹ ہو جانے سے اگلے ہی دن صندل کا انہیں دعوت نہ دینا کوئی بہت بڑا گناہ ہو۔ یا جیسے صندل کا انہیں دعوت دینا اسے بہت ہی برا لگا ہو۔

میرزاد جو کہ بہن کے مزاج سے اچھی طرح سے واقف تھا دور کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"بہت بہت شکریہ یہ تمہارا صندل...... ہم ضرور آئیں گے۔" میرزاد کے آمادگی دے دینے پر زویا نے اسے چونک کر دیکھا تھا۔

میرزاد نے اس سے پوچھے بنا دعوت قبول کیسے کر لی تھی۔

"کس دن آنا ہے ہمیں؟"

"جب آپ لوگوں کو مناسب لگے۔ چاہے کل، چاہے پرسوں......"

''ہم تو روز ہی فارغ ہوتے ہیں۔ کہو تو آج ہی آجاتے ہیں۔'' میر زاد نے لہک کر کہا تو صندل ہنستی چلی گئی تھی اور زویا تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے دونوں کے درمیانی تعلق کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''نہیں...... آج نہیں...... آج تو ہم نے تیاری بھی نہیں کی ہوئی۔''

''تیاری کی کیا ضرورت ہے...... بس سادہ پانی بھی پلا دو گی تو ہمیں اچھا لگے گا۔''

''چاندامی مہمانوں کو کھانا کھلائے بنا نہیں جانے دیتیں۔''

''اوہ...... تو لگتا ہے کہ ہماری دعوت بہت خاص ہونے والی ہے۔''

''ہم تو پوری کوشش کریں گے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''یہ بات بات پر ''ہم'' کا صیغہ بولنے کی عادت تو نوابوں کو ہوا کرتی ہے۔ تم لوگ تو کہیں سے بھی نواب نہیں ہو۔'' زویا نے تنک کر کہا تھا۔

''جی...... بس ایسے ہی کبھی کبھی بول دیتی ہوں۔''

''نوابی بننے کی کوشش کرتی ہو۔'' زویا کے لہجے میں طنز تھا۔

صندل سے کوئی جواب نہیں بن پڑا تھا۔

میر زاد ہنسنے لگا تھا۔

''آپی کی ہر وقت مذاق کرنے کی عادت نہیں گئی۔''

وہ فضول میں ہی ہنسا تو صندل بھی ہنسنے لگی۔ اس نے میر زاد کی بات پر یقین کر لیا تھا۔ زویا وہاں سے اٹھ کر اندر چلی گئی تھی۔

''ہم کل شام کو آجائیں گے صندل......''

''ہمیں انتظار رہے گا۔ اوہ! میرا مطلب ہے ''مجھے''......'' وہ کہہ کر خود ہی ہنسنے لگی۔

میر زاد بھی ہنسا تھا۔ صندل کا اس پر سے نظریں ہٹانا مشکل ہو گیا تھا۔

پھر جب دونوں میں خاموشی آئی تو صندل کو احساس ہوا کہ وہ وہاں میر زاد کے ساتھ اکیلی موجود ہے۔اسے اکیلے میں میر زاد کے ساتھ وہاں ٹھہرنا عجیب لگا تو وہ اجازت لے کر گھر سے باہر چلی گئی تھی۔

میر زاد بہن کے کمرے میں آ گیا تھا۔جو منہ پھلائے ہونے والے بچے کے لیے سویٹر بن رہی تھی۔

"کیا ہوا ہے آپی؟"

"کیا ہوا ہے؟" وہ کندھے اچکا کر بولی تھی۔

"آپ وہاں سے اٹھ کر چلی آئیں۔موڈ آف کر لیا۔"

"شکر...... تمہیں صندل کے علاوہ کچھ اور بھی نظر آیا۔" حسب عادت وہ طنزیہ گویا ہوئی تھی۔

"کس بات پر ناراض ہیں آپ......؟" زویا کے پاس بیٹھتے ہوئے میر زاد نے اس کا ادھورا سویٹر اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

"تم نے دعوت کیوں قبول کر لی؟"

"تو......اس میں برائی کیا ہے؟"

"برائی یہ ہے کہ میں دیکھ رہی ہوں کہ اس لڑکی کی طرف دن بدن تمہارا جھکاؤ ہونے لگا ہے۔"

زویا نے اپنی طرف سے بہت اندر کی بات کی تھی۔اسے توقع تھی کہ اس نے میر زاد کی چوری پکڑ لی ہے جس پر میر زاد شرم سار ہو گا۔

لیکن زویا کی بات پر میر زاد اونچا اونچا ہنسنے لگا تھا۔

"ہنس کیوں رہے ہو؟"

"آپ نے بات ہی ایسی کی ہے۔ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

میر زاد کی بات سے زویا کو کچھ تسلی ہوئی تھی۔اس کے ہاتھ سے سویٹر پکڑ کر وہ پھر سے مکمل کرنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

''نہ ہی ہو تو بہتر ہے۔''

''اور اگر ہو جائے تو......؟ کیا برائی ہے اس میں؟'' اس نے بہن کو تنگ کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

''مجھے یہاں کے لوگ نہیں پسند آئے۔ شہر تو عجیب ہے ہی، لوگ بھی عجیب ہیں۔''

''مثلاً......کیا خرابی ہے؟''

''چھوٹا شہر ہے، چھوٹی ذہنیت کے لوگ رہتے ہیں یہاں......دیکھا نہیں تم نے......یہاں کا دریا بھی نہر سے زیادہ بڑا نہیں ہے۔ میں اس شہر کے لوگوں سے بالکل بھی میل جول نہیں رکھنا چاہتی ہوں۔ اور ویسے بھی تمہارے لیے میرے ذہن میں پہلے سے ایک لڑکی ہے۔''

''کون......؟''

''زوہیب کی بہن ہے، تانیہ......'' زویا نے اپنی طرف سے بہت بڑا دھماکا کیا تھا جو پھٹنے سے پہلے ہی پھس ہو گیا تھا۔

''کیا......تانیہ......؟''

''ہاں......کیسی لگتی ہے وہ تمہیں؟''

''مجھے تو جھلی لگتی ہے۔'' وہ بہن کو تنگ کر رہا تھا۔

''جھلی نہیں ہے۔ بہت اچھی ہے وہ......تمہیں پسند بھی کرتی ہے۔'' زویا نے اپنی طرف سے ہی جھوٹ بول دیا تھا۔

''سچ کہہ رہی ہیں؟''

''سو فی صد سچ......میں یہ بات تمہیں نہیں بتانا چاہتی تھی، لیکن اب بتا رہی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ جیسا آپ چاہیں۔'' میرزاد نے اگلے ہی پل رضامندی دے دی تھی۔ زویا نے خوش گوار حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

''کیا سچ میں میر......؟''

''جی...... بالکل سچ......!''

''اللہ......! میں ابھی زوہیب کو فون کر کے یہ خوشی کی خبر سناتی ہوں۔'' سویٹر سلائیاں چھوڑ وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ ''وہ ویسے بھی تانیہ کے رشتے کو لے کر بہت پریشان ہیں۔ تمہارا سنیں گے تو بہت خوش ہوں گے۔''

زویا خوشی خوشی زوہیب کو فون کرنے دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔

میر زادا سے جاتا ہوا دیکھنے لگا تھا۔ اس کی رضامندی نے اس کی بہن کو بے پناہ خوشی دی تھی۔ وہ یہ ہی دیکھنا چاہتا تھا۔ زویا کے اداس چہرے پر خوشی...... اسی لیے اس نے فوراً سے رضامندی دے دی تھی۔

دونوں کا دنیا میں ایک دوسرے کے علاوہ تھا بھی کون......؟

☆......☆......☆

''کھانا تیار ہو گیا ہے کیا؟'' اس نے باورچی خانے میں جھانکتے ہوئے پوچھا تھا۔

''جی...... سب تیار ہے۔ بس پلاؤ کو دم لگانا باقی ہے۔''

''وہ پھر ان کی آمد پر کیجیے گا۔''

''تم باہر کے انتظام دیکھو...... میں یہ سب سنبھال لوں گی۔'' چاند بھی وہاں ہی آ گئی تھی۔

اس کی طرف مسکراہٹ کا تبادلہ کرنے کے بعد صندل باہر صحن میں آئی تھی۔ کھانے کا انتظام باہر صحن میں کیا جانا تھا۔ زمین پر...... جیسے کہ وہ روز کیا کرتے تھے۔ لیکن صندل نے کونے میں ایک گول میز بھی رکھوا دیا تھا۔ جسے دیکھ کر چاند کو تعجب ہوا تھا۔

''کیا کھانا ٹیبل پر لگانا ہے صندل......؟''

''نہیں چاند امی......! کھانا تو نیچے زمین پر دستر خوان پر ہی لگے گا۔''

''پھر یہ ٹیبل کس لیے رکھوایا ہے تم نے؟''

''بس......کچھ ہے جو میں ابھی نہیں بتاؤں گی۔'' وہ کچھ شوخی سے مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

''ماں سے چھپاؤ گی؟''

''سرپرائز ہے چاندامی......دیکھیں گی تو حیران رہ جائیں گی۔''

''پھر تو مجھے رات کا شدت سے انتظار رہے گا۔''

''آپ بس اچھے سے تیار ہو جائیں۔زویا بہت نک چڑھی ہے۔اسے جلدی کوئی چیز پسند نہیں آتی۔''

''تم تو پسند آ گئی ہوناں اسے......؟'' چاندامی نے ذو معنی انداز میں کہا تھا۔

نجانے کیوں صندل شرما گئی تھی۔

''آپ بہت شرارتی ہیں چاندامی......''

''تم پر گئی ہوں شاید......''

''میں اوپر تیار ہونے جا رہی ہوں۔'' وہ بات بدلتے ہوئے بولی تھی۔ ''وہ لوگ بس آنے ہی والے ہوں گے۔''

''تم چلو......میں بھی آتی ہوں۔''

''جی اچھا......!'' صندل کہہ کر اوپر اپنے کمرے کی سیڑھیاں چڑھ گئی تھی اور چاندا سے جاتا ہوا دیکھنے لگی تھی۔

''اللہ! میری بیٹی کی خوشیوں کو سلامت رکھنا۔اس کی قسمت میرے جیسی نہ کرنا......اس کی زندگی کی رنگولی کے رنگ کوئی خراب نہ کرے۔'' چاندامی نے پورے دل سے خدا کے حضور دعا کی تھی۔اور جس وقت چاند آسمان کو دیکھتے ہوئے خدا کے حضور دعا کر رہی تھی۔عین اسی وقت رحبانی اپنے کمرے سے باہر نکل کر نیچے جھانک رہا تھا۔وہ چاند کو اور ساری تیاری کو دیکھ رہا تھا۔دونوں کو وہ دن یاد آ گیا تھا جب

سالوں پہلے اسی طرح کی تیاری التمش کی آمد کے لیے کی گئی تھی۔ اور رحبان نے چاند کی بنائی رنگولی کو پاؤں سے ٹھوکریں مار مار کر خراب کر دیا تھا۔

''تیرے لیے میں نے کیا نہیں کیا چاند...... ایک شخص کا قتل کیا۔ اس کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے...... لیکن تو پھر بھی میری نہیں ہوسکی۔ میں نے زندگی بھر تیری محرومی کو سہا ہے۔ اب میں تجھے بھی ہر خوشی سے محروم کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کروں گا۔ میں تیری خوشیوں کو غارت کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دوں گا۔ تو کیا سمجھتی ہے تو مجھے دکھ دے کر اس سب سے غافل ہو جائے گی۔ میں تجھے وہ وہ دکھ دوں گا کہ تو ساری زندگی نہیں بھول پائے گی۔''

چاند نے اوپر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے رحبان کو دیکھا تھا۔ دونوں کی نظریں ملی تھیں۔ دونوں کی نظروں میں ایک دوسرے کے لیے بے انت نفرت موجود تھی۔

☆......☆......☆

حویلی کا بڑا دروازہ کھولا گیا تھا۔ زویا اور میرزا اندر داخل ہوئے تھے۔

''السلام علیکم!'' زویا نے ادب سے سلام کیا تھا اور پھر باری باری وہ بہت پرتپاک انداز میں سب سے ملی تھی۔ صندل کو اس کے رویے پر کچھ حیرت ہوئی تھی۔ وہ ہر بار اتنے سرد انداز میں صندل سے ملی تھی کہ صندل سے اب زویا کا اتنا اچھا رویہ ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ تو شکر کہ اس کی ہنسی نہیں چھوٹ گئی تھی۔ خیر جو بھی تھا، زویا میں رکھ رکھاؤ تھا۔ اسے یہ بات معلوم تھی کہ کسی کے گھر جا کر اپنی بدمزاجی کو گھر پر ہی چھوڑ کر جانا چاہیے۔

سب بہت پرتپاک انداز میں زویا سے ملے تھے۔ اور زویا کا انتظار ہی کس کو تھا۔ سب تو زویا کے بھائی کو دیکھنے کے لیے بے قرار ہو رہی تھیں۔ خود سے ہی طے کر لیا گیا تھا کہ زویا کا بھائی ہی صندل کا منظور نظر ہے۔

جبکہ صندل نے لاکھ قسمیں دینے کے باوجود بھی اس بارے میں زبان نہیں کھولی تھی۔

میرزاد نے بھی ادب سے سب کو سلام کیا تھا۔ چاندامی نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر پیار دیا تھا۔ لڑکیاں کھی کھی ہنسی تھیں۔ سب نے دل ہی دل میں صندل کی پسند کی تعریف کی تھی۔

کچھ خاص بات تو تھی میرزاد میں...... اس پر کسی بھی لڑکی کا دل آجانا کچھ اچنبھے کی بات نہیں تھی۔

میرزاد اور زویا خاندانی روایتوں والے لوگ تھے۔ خالی ہاتھ آنا انہیں معیوب لگ رہا تھا اس لیے وہ مٹھائی اور میوے سے بھری ٹوکری کے ساتھ آئے تھے۔

''اس سب کی کیا ضرورت تھی بیٹا......''

''ہمارے بڑے شہر میں یہ سب ضروری ہی سمجھا جاتا ہے آنٹی......'' میرزاد کے بجائے زویا نے جواب دیا تھا۔

اس کے سر سے بڑے شہر سے ہونے کا خبط زندگی بھر جانے والا نہیں تھا۔

''آنٹی لفظ تو بہت پرایا لگتا ہے میری جان......''

''تو پھر میں آپ کو کیا کہوں؟''

''تم بھی مجھے باقی سب کی طرح چاندامی کہہ سکتی ہو۔'' چاند نے یہ بات اس قدر پیار سے کہی تھی کہ زویا بے اختیار ہی مسکرادی تھی۔ عام حالات ہوتے تو اس کی حاکمانہ طبیعت کو یہ بات ہرگز پسند نہ آتی......لیکن چاند کے شیریں لہجے کے آگے اس نے مسکراتے ہوئے آمادگی دے دی تھی۔

دونوں مہمانوں کو پہلے بڑے کمرے میں بٹھا دیا گیا تھا۔ جس کو صندل کل شام سے سجانے میں مصروف تھی۔ سرخ شربت سے ان کی تواضع کی گئی تھی۔ چاند بہت خوش گوار انداز میں دونوں سے بات چیت کر رہی تھی۔ اس نے لمحے بھر میں تاڑ لیا تھا کہ زویا ماں بننے والی ہے۔ ملازمہ سے کہہ کر فوراً سے کچھ روایتی چیزیں بنوائی تھیں۔

''یہ سب کیا ہے؟'' زویا گول گول پنیوں کو دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

''صندل نے بتایا کہ تمہاری ماں نہیں ہے۔ وہ ہوتی تو اس وقت میں یہ سب ضرور کرتی...... یہ کچھ حکیمی نسخے ہیں، ایسے وقت میں انہیں خوراک میں شامل کرنا اچھا ہوتا ہے۔'' چاند نے بتایا تھا۔

زویا کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ اتنے پیار کی اس نے توقع ہی کہاں کی تھی۔ اس کی ساری تنک مزاجی ختم ہوگئی تھی۔ اسے چاند بے حد اچھی لگنے لگی تھی۔

پھر جوں ہی رات گہری ہوئی تو باہر صحن میں سب کے لیے کھانا لگا دیا گیا تھا۔ کھانے کے لیے برتن اور انتظام دیکھ کر زویا کتنی ہی دیر تک کھلی رہی تھی۔ کیا نفاست تھی، کیا امتزاج تھا۔ کیا شاہانہ انداز تھا۔ ایسا تو اس نے اپنے بڑے شہروں میں بھی کبھی نہیں دیکھا تھا۔

''آپ لوگ کیا روز یہاں ہی کھانا کھاتے ہیں؟''

''جی...... بس بارش اور شدید سردی کے دنوں میں اندر کمرے میں دسترخوان لگتا ہے۔'' صندل کے بولنے سے پہلے ہی کرن نے بتایا تھا۔

اس کی نظریں میرزاد سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔ سب جانتے ہوئے بھی وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح زویا اپنے بھائی کے لیے اسے پسند کرلے۔ اسے صندل کا پتا کاٹنے میں کوئی عار نہ تھی۔

کھانا بہت دیر تک چلتا رہا تھا۔ جس دوران ہلکی پھلکی بات چیت بھی چلتی رہی تھی۔ دونوں بہن بھائیوں نے جس مقدار میں کھانا کھایا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ کھانا دونوں کو ہی بہت پسند آیا ہے۔

ساری کزنز کھی کھی کرتے ہوئے ہنستی رہی تھیں۔ جس کی میرزاد نے تو کوئی پروا نہیں کی تھی۔ بہت دنوں سے وہ زویا کے ہاتھ کا بدذائقہ کھانا کھا رہا تھا۔ اب بہتر تھا کہ شرم کو ایک طرف رکھ کر اچھا کھانا کھا لیا جاتا۔

''صندل! تم نے بتایا نہیں کہ یہ گول میز تم نے کیوں رکھوایا ہے۔'' خیال آنے پر چاند نے پوچھا۔

''میں بس کھانے کے ختم ہو جانے کا انتظار کر رہی تھی۔ ابھی بتاتی ہوں۔''

یہ کہہ کر صندل غائب ہو گئی تھی۔ پھر دستر خوان اٹھا کر وہاں باہر ہی کرسیاں لگا دی گئی تھیں۔ اس دوران زویا سب محویت سے دیکھ رہی تھی۔ حویلی کے دالان، چھجے اور ان سے لٹکتی قندیلیں، دیواروں کا سرخ رنگ...... کیا عجیب ماحول تھا اس حویلی کا...... وہ سالوں یہاں رہ سکتی تھی اور تھکنے والی نہیں تھی۔

پھر کونے میں رکھی گول میز پر ملازم نے ایک بڑے سے ستار کو لا کر رکھ دیا تھا۔ مضراب پکڑے صندل وہاں آ کر بیٹھ گئی تھی۔ سب نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

وہ کیا کرنے جا رہی تھی۔

''صندل! کیا تم ستار بجانا جانتی ہو؟'' زویا نے حیرت سے پوچھا تھا۔

''بس...... شوق ہے۔ آج پہلا شو آپ کے لیے پیش کرنے جا رہی ہوں۔ اجازت ہے زویا آپی......؟''

صندل نے کچھ اتنے خلوص سے اسے آپی کہا تھا کہ زویا کا تو لمحے بھر کے لیے صندل پر دل ہی آ گیا تھا۔

''کیوں نہیں...... اجازت ہے میری جان......!'' وہ ہنستے ہوئے بولی تھی۔

''میری جان'' کا لفظ شوہر کے علاوہ اس نے پہلی بار صندل کے لیے بولا تھا۔

چاند اشتیاق سے صندل کو دیکھنے لگی تھی۔

گول میز پر صندل ستار بجانے کے مخصوص انداز میں بیٹھ گئی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ میں ستار کو پکڑا تھا اور دوسرے میں مضراب کو......

پہلی ضرب ہی کاری تھی۔

فضا بھی خاموش ہو کر صندل کا ستار سننے لگی تھی۔

بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی......

صندل نے بول اٹھائے تھے۔ سب حیرت سے صندل کو دیکھنے لگے تھے۔

ستار اور آوز......

یہ کرشمہ کب ہوا تھا۔

سب سے زیادہ حیرت چاند کو ہوئی تھی۔ صندل نے دونوں چیزیں سیکھ لی تھیں اور اسے خبر بھی نہیں ہو پائی تھی۔

کیسے میں بھر لاؤں مدھوا سے مٹکی......

زویا نے ستائش سے صندل کو دیکھا تھا۔

تو اس شہر کے لوگ بھی امیر خسرو سے واقفیت رکھتے تھے۔

برہا اگن کو کیسے بجھاؤں

راتوں رو رو نیر بہاؤں

کس کو محرم راز بناؤں

کس کو اپنا درد سناؤں

صندل نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور میر زاد اس کی بند آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی بند آنکھوں میں کھلی آنکھوں سے زیادہ کشش تھی۔ اس کی تراشی ہوئی بھنویں، اس کی لمبی پلکیں، اس کے گلابی ہوتے رخسار، سرخ ہونٹ......کانوں پر آئی لٹیں......اس سب کی طرف میر زاد کا دھیان پہلے کیوں نہیں گیا تھا۔ اس کی ہنسلی کی ہڈی......اور اس کا درمیانی خم......میر زاد یک ٹک اسے دیکھتا جا رہا تھا۔ یہ دیکھے بنا کہ اسے کون کون دیکھ رہا ہے۔

بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی......

کیسے میں بھر لاؤں مدھوا سے مٹکی......

صندل پنگھٹ کی بات کر رہی تھی۔ جبکہ وہ تو خود پوری ندی تھی۔ ایسی ندی جس میں آج پہلی بار میر زاد ڈوب رہا تھا۔ صندل کی بند آنکھوں کو دیکھتے ہوئے پہلی بار اس پر محبت کا انکشاف ہوا تھا۔ اس نے محبت کا ذائقہ چکھا تھا۔ جو شہد سے زیادہ میٹھا تھا۔

یہ زہر سے زیادہ تیکھا تھا۔ میر زاد کو بہت جلد یہ بھی معلوم پڑنے والا تھا۔

☆......☆......☆

''چاندامی بہت اچھی خاتون ہیں۔'' زویا نے اپنی جیولری اتارتے ہوئے میر زاد سے کہا تھا۔ پیچھے بیٹھا میر زاد اپنے خیالوں میں گم تھا۔ اس نے شاید زویا کی بات سنی ہی نہیں تھی۔

بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی......

کیسے میں بھر لاؤں مدھوا سے مٹکی......

''مجھے ایک عرصے کے بعد کسی ایسی خاتون سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ جس سے مل کر مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے۔''

میر زاد اب بھی خاموش رہا تھا۔ زویا نے پیچھے پلٹ کر اسے دیکھا تھا۔

''میر......!''

''جی......؟'' وہ چونکا تھا۔

امیر خسرو کی شاعری فضا میں ہی ٹھٹھر کر رہ گئی تھی۔

''کہاں گم ہو؟''

''یہاں ہی ہوں۔''

''میں کب سے بولے چلے جا رہی ہوں۔ تم کوئی تبصرہ ہی نہیں کر رہے۔''

''سوری......کیا کہہ رہی تھیں آپ......؟''

''میں صندل کی والدہ کی بات کر رہی تھی۔''

''بہت اچھی خاتون لگیں مجھے تو......''

''تو میں کون سا انہیں غلط کہہ رہی ہوں۔ میں بھی تو یہ ہی کہہ رہی ہوں کہ چاندامی کافی سوبر خاتون ہیں۔'' زویا کہتے ہوئے ایک دم سے ہنسی تھی۔ ''دیکھو ذرا......میں بھی انہیں چاندامی کہنے لگی ہوں۔''

''وہاں سب انہیں اسی نام سے جو مخاطب کر رہے تھے، شاید اسی باعث......''

''ہاں......شاید......ایک اور بات بھی ہے۔ انہیں دیکھ کر ایسا ہی احساس ہوتا ہے جیسے وہ ہماری بھی والدہ ہوں۔''

''میرے احساس کو الفاظ دیے ہیں آپ نے...... یہ ہی بات مجھ سے بیان نہیں کی جا رہی تھی جو آپ نے کر دی ہے۔''

''بہت اچھی خاتون ہیں۔ نفیس، سوبر...... مجھے تو ان کی شخصیت نے بہت متاثر کیا۔''

''وہ پہلی ہی ملاقات میں اپنا سحر طاری کر دیتی ہیں۔''

''ایسا کریں گے اب انہیں کسی دن دعوت پر اپنے گھر بلائیں گے۔'' زویا نے کہا تو میر زاد نے حیرت سے بہن کو دیکھا تھا۔

''لگتا ہے کہ آپ کو وہ کچھ زیادہ ہی پسند آ گئی ہیں۔''

میر حیران تھا۔ اس کی بہن کو لوگ بہت دیر سے پسند آتے تھے اور بہت کم پسند آتے تھے۔ اس کا تو اپنے اس شوہر سے بھی جھگڑا چلتا رہتا تھا جس کے ساتھ اس کی پسند کی شادی ہوئی تھی۔

''وہ ہیں ہی ایسی کہ انہیں فوراً سے پسند کر لیا جاتا ہے۔''

''آپ دعوت کا اتنا بہت سا کھانا بنا لیں گی؟''

''تم مدد کرنا ناں میری اس دن......''

''مجھ سے تو انڈا ابھی ٹھیک سے نہیں بنتا......آپ جانتی تو ہیں۔''

''پھر بازار سے کھانا منگوالیں گے۔''

''جیسے آپ کی مرضی......'' کہتے ہوئے وہ اٹھا تھا۔''میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں، مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔'' جبکہ وہ ستار کو، اس کی دھنوں کو اور بجانے والے کو سوچنا چاہتا تھا۔

''ایک منٹ بات سنو......'' زویا نے پکارا تو وہ رکا تھا۔ زویا اُٹھ کر اس کے پاس ہوئی تھی۔

''میں نے زوہیب سے بات کر لی ہے۔''

''کیسی بات......؟'' وہ غائب دماغی سے پوچھنے لگا۔

''تمہاری اور تانیہ کی شادی کی بات......''

میرزاد کے چہرے کے رنگ بدلے تھے۔

''وہ یہ بات سن کر بہت خوش ہوئے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ بچے کی پیدائش کے بعد دونوں کی شادی کر دیتے ہیں۔''

میرزاد چپ رہا تھا۔

کیسا کھیل کھیلا تھا قدرت نے اس کے ساتھ......جس دن اس نے تانیہ کے لیے آمادگی دی تھی اسی دن اس کا دل صندل پر آ گیا تھا۔ محبت کی مٹکی پنگھٹ پر پہنچنے سے پہلے ہی گر کر ٹوٹ گئی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کی مرضی......'' میرزاد کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

زویا اسے جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ میرزاد کا بجھا بجھا انداز اس نے نوٹس ہی نہیں کیا تھا۔ اس پر تو اپنی نند کو اپنی بھابھی بنا لینے کی خوشی سوار تھی۔

☆......☆......☆

''چاندامی......'' زویا نے نفرت سے چاندامی کا نام پکارا تھا۔''وہ ایک انتہائی چالاک اور مکار خاتون تھی۔ پہلی نظر میں میں اسے پہچان ہی نہیں سکی۔ مجھے لگا وہ ایک نفیس خاتون ہیں۔ میں دھوکا کھا گئی۔ زندگی میں پہلی بار مجھے دھوکا ہوا۔'' زویا نفرت سے بولتی جارہی تھی اور سامنے والا خاموشی سے اس کی ساری بات چیت سن رہا تھا۔

''اور میں دھوکا کیسے نہ کھاتی......تم اس عورت کو بولتا ہوا دیکھتے تو تمہیں بھی یہ ہی دھوکا ہوتا۔ وہ ایسے نرم انداز میں بولتی تھی کہ اس پر فرشتہ ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے جب میں پہلی بار ان کی حویلی میں گئی تھی۔ صندل نے ہماری دعوت کی تھی۔ وہاں اس نے ہمیں اپنی امی سے ملوایا تھا۔ چاندامی سے......ہونہہ......چاندامی......'' زویا نے شدید ترین نفرت سے ''چاندامی'' کا لفظ ادا کیا تھا۔ لفظوں کی شکل رنگوں میں بدلی جاسکتی تو زویا کے لہجے کا رنگ سیاہ ہوتا...... گہرا سیاہ......''

''کیا شیرینی تھی اس کے لہجے میں، کیا نفاست تھی، کیا لفظوں کی ادائیگی تھی۔ اس کا اردو لہجہ بے حد شائستہ تھا۔ بس یہاں سے ہی میں دھوکا کھا گئی۔ میں سمجھ ہی نہ سکی کہ فرشتے کے لبادے میں وہ ایک شیطان عورت ہے۔ وہ چاند نہیں کوئلہ ہے۔ جس کا دل تو کالا ہے ہی، سوچ بھی گھٹیا ہے۔''

''بھول جائیں آپ اب یہ سب......سالوں گزر چکے ہیں۔ کیا فائدہ ہے یاد رکھنے کا۔'' سامنے والا جو یہ سب کتنی بار سن چکا تھا۔ زویا کو کول ڈاؤن کرنے کی غرض سے بولا تھا۔

''میں نہیں بھول سکتی......میں ہرگز نہیں بھول سکتی......میں کیسے بھول جاؤں۔ اس عورت نے میرے بھائی کی زندگی برباد کر دی۔ اسے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ تباہ و برباد کر دیا۔'' بے انت غم سے چور ہو کر زویا رونے لگی تھی۔

''اتنا خوب صورت ہوا کرتا تھا میرا بھائی......جہاں سے گزرتا تھا لڑکیاں رک رک کر اسے دیکھا کرتی تھیں، دل تھام لیا کرتی تھیں۔ تم سوچ نہیں سکتے کہ اس عورت نے کیا حال کر دیا میرے میرزاد

کا...... مجھے اندازہ ہوتا تو میں اس گھٹیا شہر میں اپنے بھائی کو لے کر نہ جاتی...... اور اس حویلی میں تو ہرگز نہ جاتی...... مر کر بھی نہیں۔"

"مت سوچیں اب ان باتوں کو...... آپ سوچ سوچ کر خود کو اذیت دیتی ہیں۔ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ پچیس سال گزر چکے ہیں اس سب کو...... آپ کو ابھی تک سب یاد ہے۔"

"کیونکہ میں بھولنا نہیں چاہتی۔"

"یاد رکھ کر کیا کریں گی آپ...... بھول جائیں سب کچھ...... خود کو اذیت دینا بند کر دیں۔"

"میں سب ایسے نہیں بھول سکتی ہوں۔ جب تک میں اپنے بھائی کی حالت کا بدلہ نہیں لے لیتی۔"

"کیا کریں گی آپ......؟ کیسے قرار آئے گا آپ کے دل کو......؟ بتائیں مجھے۔" سامنے والے نے پوچھا تو زویا کی آنکھوں میں نفرت کا الاؤ روشن ہوا تھا۔

"جب تک میں اپنے ہاتھوں سے اس بڑھیا کا گلا نہیں گھونٹ دیتی...... مجھے چین نہیں آئے گا۔" زہریلے لہجے میں پھنکارتے ہوئے لفظ اس کے ہونٹوں سے نکلے تھے۔ سامنے والے نے ترس بھری نظروں سے زویا کو دیکھا تھا۔

☆......☆......☆

"تمہیں ستار بجانے کا شوق کہاں سے پیدا ہوا صندل......؟" کانوں سے چاندی کی بالیاں اتارتے ہوئے چاند نے پیچھے بیڈ پر بیٹھی صندل سے پوچھا تھا۔

"درگا مورتی والے کمرے میں پڑا ہوا تھا۔ میں نے چھیڑ چھاڑ کی تو بجانے کا دل کیا۔"

"تم نے کافی اچھا بجایا ہے۔"

"رحبانی بابا نے سکھایا ہے۔" صندل نے بتایا تھا اور رحبانی کا نام سن کر چاند کا منہ اتر گیا تھا۔ یہ بات صندل نے واضح نوٹ کی تھی۔

''رحبانی بابا کو ایسے کام خوب آتے ہیں۔ سنکھ بجانا...... بانسری...... اور اب ستار......'' اس نے خود سے ہی بات جاری رکھی تھی۔

چاندا اپنے سفید دوپٹے کو اتار کر بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی تھی۔

''رحبانی میں ایک خوبی ہے کہ وہ سازوں کی ساخت کو بہت جلدی سمجھ جاتا ہے۔ وہ ایسا ساز بھی بجا سکتا ہے جو آج سے پہلے کسی نے نہ بجایا ہو۔''

''لیکن وہ ہر ساز کو اداسی سے بجاتے ہیں۔ بانسری...... سنکھ...... سب میں سے دکھ جھلکتا ہے۔'' صندل نے کہتے ہوئے چاند کی گود میں سر رکھ لیا تھا۔ چاند اس کے بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیرنے لگی تھی۔

''رحبانی بچپن سے دکھی ہے۔ جب سے اس کے ماں باپ قتل ہوئے ہیں۔ یہ دکھ اس کی آنکھوں سے کبھی گیا ہی نہیں...... پھر دین بابا کی موت کا بھی اس نے بہت غم لیا۔ اور پھر جوانی میں ایک بڑا دکھ میں نے اسے دے دیا۔''

''وہ کیا......؟'' صندل نے گود سے سر اٹھا کر پوچھا تھا۔

''اس سے شادی نہ کر کے......'' چاند نے کہا تھا

صندل خاموش ہو گئی تھی۔ چاہتی تو موقع دیکھ کر مزید بات کر سکتی تھی لیکن ابھی اس نے اس موضوع پر بات کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ چاند امی پھر سے غصے میں آ سکتی تھیں۔ وہ چاہتی تھی کہ چاند امی خود ہی سے اسے سب بتائیں۔

''تم چاہو تو ستار کی کلاسز لے سکتی ہو۔ اگر تمہیں شوق ہے تو......''

''نہیں...... میں کچھ خاص شوق نہیں رکھتی ہوں۔''

''انسان کے پاس کسی نہ کسی چیز کا فن ہونا چاہیے۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ...... پھر کسی استاد کو بلوا لیتے ہیں گھر......''

''ہاں...... استاد بہتر رہے گا، کیونکہ اگر تم نے رحبان سے سیکھا تو وہ تمہیں اداس دھنیں سکھاتے سکھاتے خود بھی اداس کر دے گا۔'' چاند کہہ کر خود ہی ہنسنے لگی تھی۔

''آپ کو میرے مہمان کیسے لگے؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔

''بہت اچھے...... خاص طور پر میر زاد......'' وہ شوخ نظروں سے اسے دیکھتی ہوئی بولی تھی۔

صندل شرما گئی تھی۔

''تم نے ستار اس کے لیے بجایا تھا؟''

''نہیں تو......''

''تو پھر یہ کیوں کہہ رہی تھیں کہ کس کو محرم راز بناؤں؟''

''وہ تو شاعری تھی چاندامی......'' وہ ہنستے ہوئے بولی تھی۔

''شاعری بھی تو دل کی آواز ہوتی ہے۔''

''میں نے ستار کیسا بجایا......؟'' وہ بات بدلتے ہوئے بولی تھی۔ ''مجھے لگتا ہے کہ میں نے اچھا نہیں بجایا۔''

''تم نے دل سے بجایا تھا، برا نہیں ہو سکتا تھا۔'' چاند نے گہری بات کی تھی۔ وہ اس کے بدن میں اپنا منہ چھپا چکی تھی۔ چاند پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی تھی۔ اور اس کی زندگی کی خوشیوں کی دعائیں مانگنے لگی تھی۔ صندل کی آنکھوں میں میر زاد کا چہرہ رقم تھا۔ جسے وہ بند آنکھوں سے بھی خود کو دیکھتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

سرخ حویلی سے دور سفید کوٹھی کے ایک کوزی کمرے میں اپنے بیڈ پر لیٹا میر زاد اب بھی ستار کی اس آواز کو محسوس کر رہا تھا، جسے بند ہوئے گھنٹوں ہو چکے تھے۔ ستار کی آواز جیسے اس کے کانوں میں قید ہو

چکی تھی۔ اور ستار بجانے والا اس کے دل کے قید خانے میں بند ہو چکا تھا۔ صندل...... اس کے نام کی خوشبو اس کے پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ حویلیاں جیسے چھوٹے شہر میں جا کر صندل کے جنگلوں میں وہ گم ہو جائے گا۔ ورنہ وہ شاید یہاں ہرگز نہ آتا...... یا شاید یہاں لازمی آتا...... کیونکہ محبت ایسی ہی تو ہوتی ہے۔ انسان جانتے بوجھتے اس خطرے میں ہاتھ ڈالتا ہے۔ لہولہان ہونے کے لیے...... یا شاید مضبوط ہونے کے لیے......

☆......☆......☆

سیاہ کھال پر پیلی چتیوں والا وہ موٹا سانپ دالان کے کونے سے رینگتا ہوا آگے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی پھنکار میں خوف تھا۔ اس کی چال میں دہشت تھی۔ اپنے وجود کو بل پر بل دیتے ہوئے وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ دور سفید کپڑوں میں ملبوس بیٹھی بوڑھی اس کی منزل تھی۔

بوڑھی اور کمزور چاند بی بی نے ستون کی پشت سے اپنا بے ریش سر ٹکا لیا تھا۔ گہرا لیکن مختصر سانس بھرا تھا اور آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو صاف کیا تھا۔ یہ آنسو بھی عجیب تھے۔ خشک ہونے میں نہیں آ رہے تھے۔ سالوں سے بہتے چلے جا رہے تھے۔ نجانے کون کون سے دکھ تھے ان آنکھوں میں...... دین بابا کی موت کا دکھ...... التمش کی جدائی کا دکھ...... صندل کا...... میر زاد کا تھا۔ ان آنکھوں نے بہت کچھ سہا تھا۔ اس کے بوڑھے دل نے بہت کچھ جھیلا تھا۔

سیاہ سانپ بوڑھی کی پشت پر آ گیا تھا۔ اس نے اپنا پھن کھڑا کر لیا تھا۔ یہ اشارہ تھا کہ اب وہ بس بوڑھی کو ڈسنے ہی والا ہے۔

سانپ کے وجود سے غافل بیٹھی بوڑھی کو یاد آیا۔ جب اس نے پہلی بار میر زاد کو دیکھا تھا تو خوشی سے وہ کیسے ایک دم سے جوان ہو گئی تھی۔ میر زاد اس کی بیٹی کی پسند تھا۔ اور وہ کیسا خوب صورت نوجوان تھا۔ کھنکھناتے لہجے والا...... وہ میدانی علاقے سے تھا لیکن اس کا حسن پہاڑی لگتا تھا۔ چاند نے دعا کی تھی

کہ دونوں زندگی بھر خوش رہیں۔ لیکن نجانے کیا ہوا۔ اس کی دعا قبول کیوں نہیں ہوئی۔ اس کے ساتھ اکثر ایسا ہی ہوتا تھا۔ جب جب وہ خوشی کی دعا مانگتی تھی وہ دعا قبول نہیں ہوتی تھی۔

''لیکن وہ دعا تو قبول ہو چکی تھی۔ یاد کرو......'' اپنے بنا بالوں والے سر پر دوپٹا رکھتے ہوئے چاند بی بی نے اپنے اندر سے کسی کو پکارتے ہوئے سنا تھا۔ چاند کو احساس ہوا کہ اسے ٹھیک کہا جا رہا ہے۔ دعا تو قبول ہو چکی تھی۔ بس کسی نے دودھ میں گوبر کی چھینٹ ڈال دی تھی۔ اس میں دعا کی قبولیت پر تو حرف نہیں آنا چاہیے تھا۔ اور یہ حرکت کس نے کی تھی۔ اسی حویلی کے فرد نے......تو اب اس کا بدلہ کون لے گا۔ بوڑھی کے بے قرار دل کو کون قرار دلائے گا۔

بوڑھی چاند بی بی یہ سب سوچ رہی تھی جب سانپ بوڑھی کے بے جان پاؤں پر سے ہوتا ہوا نیچے سورج مکھی والے فرش کی درزوں میں گم ہونے لگا تھا۔ سانپ کافی موٹا تھا۔ اس کی طوالت بھی طویل تھی۔ چال میں بھی سستی نہ تھی۔ اس کے باوجود سوچوں میں گم بیٹھی چاند بی بی کو احساس تک نہیں ہو پایا تھا کہ اس کے پاؤں پر سے ایک زہریلا سانپ گزر چکا ہے۔ اتنا زہریلا سانپ کہ اگر وہ بوڑھی کو کاٹ لیتا تو مغرب کی اذان مکمل ہونے سے پہلے بوڑھی اگلے جہان رخصت ہو جاتی۔

لیکن وہ سانپ بوڑھی کو کاٹنے تھوڑی آیا تھا۔ وہ تو بوڑھی چاند بی بی کا دوست بننے آیا تھا۔ اس کا رکھوالا......اس کی جان کی حفاظت کا پاسبان......وہ بھلا بوڑھی کو کیسے کاٹ سکتا تھا۔



ناول تاش گھر ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 1 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 9

لاتعداد تاش کے پتوں سے بنتا وہ تکونا ''تاش گھر'' تھا کہ مکمل ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ ساگوان کے تختے پر اس کی بنیاد بنائے بستامی اسے اونچائی میں پروان چڑھاتا ہوا بڑھا رہا تھا۔ نجانے کہاں غلطی رہ جاتی تھی اس سے...... اوپر تک پہنچنا نصیب ہی نہیں ہو رہا تھا۔ روشن بیگم کیسی تاق تھی ناں اس میں...... وہ تو دیکھتے ہی دیکھتے ساری تاش سے قطب بنا دیا کرتی تھی۔ بس بستامی سے ہی یہ معمولی کام سیکھا نہ جا رہا تھا۔ اس نے دو تین بار کوشش کی تھی۔ لیکن گھر دوسری تیسری منزل پر دھڑام سے نیچے گر جاتا تھا۔ چوتھی بار میں غصے سے بستامی نے تاش کے پتوں پر ایسے ہاتھ مارا تھا کہ وہ اڑتے ہوئے فرش پر بچھے قالین پر جا پڑے تھے۔

''سلطان!'' اور اگلے ہی پل اس نے آواز لگائی تھی۔

''جی مالک......!'' سلطان فوراً سے حاضر ہوا تھا۔

''میرا حقہ گرم کر کے لاؤ...... اور کوئلوں پر چھالیہ ڈال دینا...... میرا سر درد کر رہا ہے۔''

''جی مالک......!'' سلطان حکم سنتے ہی چلا گیا تھا۔

بستامی بیٹھ کر سوچ بچار کرنے لگا تھا۔ سوچیں گہری تھیں۔ حقے کے دھویں سے بھی زیادہ گہری...... جنہوں نے بستامی کا دماغ چلم کی طرح گرم کیا ہوا تھا۔ نجانے کیا ہو گیا تھا حویلی کے معاشی حالات کو...... جو کہ ٹھیک ہونے میں ہی نہیں آ رہے تھے۔ بلکہ بگڑتے ہی چلے جا رہے تھے۔ ہر طرح کی

کوشش کر لی گئی تھی۔ لیکن کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ صرف کوششیں ہی رائیگاں نہیں ہوئی تھیں۔ بلکہ محنت، وقت، قوت اور سرمایہ بھی رائیگاں ہو گیا تھا۔ کام پر بھرپور توجہ دی گئی تھی۔ رنگوں کو بدلا گیا تھا۔ کام کی نوعیت کو بدلا گیا تھا۔ ہر چیز میں جدت لانے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن منڈی میں ان کے کام کی ساکھ جو گر چکی تھی، وہ بحال ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ اس بات نے بستامی اور رحبانی دونوں کو ہی تھکا دیا تھا۔

تین لاکھ کی رقم جو سچے ہیروں کو بیچنے کے بدلے میں ملی تھی۔ بستامی کو لگا تھا کہ اس سے بہت سے کام ہو جائیں گے۔ جو سرمائے کی وجہ سے ادھورے تھے۔ لیکن وہ اس کی خام خیالی ثابت ہوئی تھی۔ اتنا بہت سا قرض چڑھ چکا تھا کہ چار ہیروں کو بیچنے سے جو تین لاکھ ملا تھا، وہ قرض کو ادا کرنے کی صورت ہی نکل گیا تھا۔ اور بستامی ایک بار پھر سے خالی ہاتھ رہ گیا تھا۔ کومل نے ان تین لاکھ روپوں کو لے کر الگ شکوہ کیا تھا۔

"مجھے لگا تھا تم میرے لیے سونے کی پازیبیں لاؤ گے۔" بناوٹی روٹھتے ہوئے پلنگ پر بیٹھی وہ اپنی جھوٹی پازیبوں کو پاؤں سے اتارتے ہوئے بولی تھی۔ بات کرتے ہوئے اس نے آنکھوں کو کچھ اس ادا سے حرکت دی تھی کہ بستامی کا تو جیسے اس پر دل ہی آ گیا تھا۔ پہلی ملاقات سے لے کر اب تک بستامی کا اس پر بہت بار دل آیا تھا۔ اس کا پہلا، دوسرا، تیسرا پیار کومل ہی ٹھہری تھی۔

"سب سے پہلے تو یہ بتاؤ کہ تمہیں کس نے بتایا کہ میرے پاس تین لاکھ کی رقم ہے؟" وہ چلم چھوڑ قالین پر سے اٹھ کر پلنگ پر کومل کے پاس جا بیٹھا تھا۔

"دو لوگوں نے...... ایک تو روشن بائی نے...... دوسرا ایمن نے......"

"ایمن نے کیسے؟"

"اب تو پورا حویلیاں شہر جانتا ہے کہ تم دونوں دوست اپنی ہر چیز آپس میں تقسیم کر لیتے ہو۔ تو تم نے تین لاکھ میں سے جو ڈیڑھ لاکھ روپے رحبانی کو دیے اس نے ایمن کو ان سے سونے کی بالیاں بنا

دیں۔" کومل نے پلنگ کی پشت سے اپنی کمر ٹکاتے ہوئے کہا تھا۔

کومل کی بات پر بستامی کو شرمندگی ہوئی تھی۔ ایمن کو سونے کی بالیاں مل جانے کے بعد کومل کا شکوہ کرنا بنتا تھا۔ لیکن رحبانی نے یہ کیا حرکت کی...... اس نے تو کہا تھا کہ اسے پیسوں کی اشد ضرورت ہے۔ اور جہاں تک بستامی جانتا تھا، رحبانی کو واقعی ہی میں ضرورت تھی بھی...... اس پر بھی بہت سا قرض تھا۔ لیکن پھر نجانے کیوں اس نے ایمن کو سونے کی بالیاں بنا دی تھیں۔ وہ شروع سے ہی ایسا تھا۔ جب سے اسے چاند نے ٹھکرایا تھا۔ وہ عجیب خبطی ہو چکا تھا۔ محبت پانے کے لیے وہ کچھ بھی کر لیا کرتا تھا۔ یقیناً ایمن نے ہنس کر فرمائش کی ہو گی اور رحبانی اپنا سارا قرض بھول گیا ہو گا۔

"میں تمہیں بھی جلد ہی سونے کی پازیبیں بنوا دوں گا۔"

"کب......؟ اب دوبارہ تو ہیرے ملنے سے رہے۔ یہ اتفاق زندگی میں ایک بار ہی ہو جائے تو معجزے سے کم نہیں ہوتا۔"

"جانتا ہوں۔" بستامی نے مایوسی سے کہا تھا۔ کومل کی بات نے اسے مزید مایوس کر دیا تھا۔

"کیا ہوا......؟ تم کچھ پریشان دکھ رہے ہو۔"

"ہاں...... ہوں تو سہی۔"

"کیا بات ہے...... مجھے بتاؤ......"

اس نے بستامی کو اپنے پہلو میں بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔ بستامی اٹھ کر اس کے پہلو میں جا بیٹھا تھا۔ کومل نے اپنا سر اس کے کندھے پر گرا دیا تھا۔ بستامی کو اس کے وجود کی گرمی پہنچی تھی۔ بستامی کو سالوں پہلے کی ایک رات یاد آ گئی تھی جب کومل پہلی بار اس کی آغوش میں آئی تھی۔ اس بات کو مدتیں گزر چکی تھیں۔ کومل کے وجود کی گرمی میں تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔

"حویلی کے معاشی حالات بہت خراب ہیں۔"

اس نے وہ بات بتا دی تھی جو شاید ایک کوٹھے والی کو کبھی نہیں بتانی چاہیے۔ لیکن بستامی یہ ہی دیکھنا چاہتا تھا کہ اب خراب حالات میں اس کے ساتھ کون کون ہے۔

''کیوں......؟ کام کا مندا جا رہا ہے کیا؟''

''ایسا ہی سمجھ لو......''

''یہ سب زندگی کا حصہ ہوتا ہے پیارے بستامی...... کبھی زیادہ منافع، کبھی بہت سا نقصان......''

اس نے سر اٹھا کر گنگنانے کے سے انداز میں کہا تھا۔

''لیکن کافی عرصے سے نقصان ہی نقصان ہو رہا ہے۔''

''پھر تم کاروبار بدل لو......''

''بدل کر کون سا شروع کروں؟'' بستامی جوش سے بولا تھا۔ اسے کومل کی بات اچھی لگی تھی۔

''میں کچھ زیادہ تو نہیں کہہ سکتی...... شاید روشن بائی کچھ مفید مشورہ دے سکیں۔''

''کہاں ہیں وہ......؟''

''اپنی بہن سے ملنے گئی ہیں۔ شام تک آ جائیں گی۔''

''پھر شام تک میں یہاں بیٹھ کر کیا کروں گا۔'' بستامی نے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔ کومل نے جلدی سے اس کا بازو تھام لیا تھا۔ بستامی نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ کومل مسکرائی تھی۔ اس کے رنگے ہوئے سرخ ہونٹ گلاب کو مات دینے لگے تھے۔

☆......☆......☆

''تم اور رحبانی کس کس کام میں تاق ہو؟'' روشن بیگم نے چھالیہ کترتے ہوئے پوچھا تھا۔ سروتے کی ہر ٹھک پر اس کی چوڑیوں کی چھن چھن ہوتی تھی۔ چھالیے کی وجہ سے اس کے لاکھا جمے ہونٹ بات کرتے ہوئے کچھ زیادہ ہی بھرے بھرے لگ رہے تھے۔

''کسی بھی کام میں نہیں...... ہم دونوں نے ساری زندگی پتنگیں اڑائی ہیں۔'' بستامی نے صاف گوئی سے کہہ دیا تھا۔

''تو کارخانے کا سارا کام کیا چاند نے سنبھالے رکھا ہے؟''

''ہاں...... اسی نے شروع سے کام کو سنبھالا ہوا تھا۔''

''یہ تم نے غلطی کی بستامی...... تمہیں اس سب میں خود تاق ہونا چاہیے تھا۔ تمہاری چالاک بہن نے جان بوجھ کر تم دونوں کو پیچھے رکھا۔''

بستامی چپ رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا تھا کہ ایسا ہوا ہے یا نہیں...... چاند کا چہرہ تصور میں لاتے ہوئے وہ اس کے چہرے پر چالاکی کو کھوجنے لگا تھا۔ چاند ایسی تو نہیں لگتی تھی۔ یقیناً سب اتفاق ہی تھا۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ وہ ہی مال میں خرد برد کرتی رہی ہے۔ اسی باعث تمہیں اتنا نقصان ہوا ہے۔''

''نہیں...... وہ ایسی نہیں ہے۔''

''تم بہت بھولے ہو بستامی...... ابھی بھی نہیں سمجھ پا رہے۔ تمہارے اپنوں نے تمہیں لوٹ کھایا ہے۔'' سر دھنتا چلاتے ہوئے روشن بیگم نقصان کے اصل ذمہ داروں کی نشان دہی کر رہی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ بستامی کو چاند کے خلاف بھڑکا رہی تھی۔ حویلی کا جو نقشہ بستامی اور رحبانی کی باتوں سے اس کے ذہن میں اترا تھا، وہ تو بس اسی باعث بات کر رہی تھی۔

''اب کیا کرنا چاہیے؟''

''کام تم دونوں کوئی کر نہیں سکتے۔ سرمایہ تمہارے پاس ہے نہیں...... ایسے میں کیا کیا جا سکتا ہے؟''

روشن بیگم سوچ میں پڑ گئی تھی۔ اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہوا تھا۔ اس کے پاس خیالات کا ڈھیر تھا۔

''تمہاری حویلی کی حالت کیسی ہے بستام؟''

''بہتر حالت میں ہے......''

"اگر بہتر حالت میں ہے تو تمہاری حویلی کو سرائے میں بدلا جا سکتا ہے۔" روشن بیگم نے آنکھوں کو روشن کرتے ہوئے کہا تھا۔ بستامی حیرت سے اسے دیکھنے لگا تھا۔ روشن بیگم نے تو کمال کا خیال پیش کیا تھا۔ واقعی ایسا ہو سکتا تھا۔ حویلی کو سرائے میں بدلا جا سکتا تھا۔ ایک مہنگے سرائے میں......

"بات تو ٹھیک ہے۔ لیکن مجھے اس چیز کا بالکل بھی تجربہ نہیں ہے۔"

"میرے ہوتے تمہیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے بستامی...... میں ہوں ناں...... میں تمہاری مدد کروں گی۔" روشن بیگم فراخ دلی سے مسکراتے ہوئے بولی تھی۔ "بس مجھے تو میرے کمیشن سے مطلب ہوتی ہے۔ تم تو جانتے ہو میرے مزاج کو۔" وہ ہنسی تھی۔ سارا کمرا اس کی ہنسی سے چہکا تھا۔

"اور آپ بھی جانتی ہیں میرے مزاج کو...... میں آپ کا کمیشن نہیں روکتا۔"

"ہاں...... جانتی ہوں، تب ہی تو تمہیں لاکھوں کا خیال پیش کیا ہے۔ تم ایسا کرو مجھے اپنی حویلی دکھاؤ...... شاید میں کچھ مزید مشورہ دے سکوں۔"

"کیوں نہیں...... جب دل کرے......" بستامی نے فوراً سے آمادگی دے دی تھی۔ یہ سوچ بنا کہ روشن بیگم کا حویلی میں آنا وہاں کے مکینوں کو کسی قدر برا بھی لگ سکتا ہے۔

☆......☆......☆

سردیوں کی آمد آمد تھی۔ دن نکل کر بھی جیسے کسی کی آغوش میں چھپا رہتا تھا۔ دھوپ بڑی مدھرتا سے زمین پر گرتی تھی۔ جیسے زمین کانچ ہو اور دھوپ کو کانچ کے ٹوٹ جانے کا ڈر ہو۔ صندل کو سب بہت سہانا لگ رہا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ دن کچھ عجیب سا ہے۔ اس دن سب عجیب و غریب واقعات ہونے والے تھے۔

"یہاں کا بازار تو کافی بڑا ہے۔" اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے میرزاد نے کہا تھا۔

"تم نے پہلے نہیں دیکھا تھا کیا؟"

"نہیں، میں صرف بڑی سڑک تک ہی رہا تھا۔ ویسے بھی مجھے صرف کھانا ہی خریدنا ہوتا تھا۔"

"تو پھر یہاں زویا آپی کو ضرور لے کر آنا۔ انہیں ہمارے شہر کی ہر چیز مختصر لگتی ہے۔"

"ہاں...... مجھے کہہ رہی تھیں کہ یہاں کا تو دریا بھی نہر سے زیادہ بڑا نہیں ہے۔"

"کیا سچ میں......؟" صندل ہنسی تھی۔ اسے اس بات نے بہت محظوظ کیا تھا۔

"ہاں...... وہ اس شہر کے بہت خلاف ہیں۔ لیکن تمہارے گھر سے آنے کے بعد کچھ نارمل ہوگئی ہیں۔ تم لوگوں کی دعوت نے ان پر مثبت اثر ڈالا ہے۔ بہت تعریف کر رہی تھیں تم سب کی...... خاص کر چاندامی کی۔"

"میری امی تو ہیں ہی ایسی کہ ان کی تعریف کیے بنا رہا ہی نہیں جاتا۔"

"اور چاندامی کی بیٹی بھی۔" میرزاد نے بے اختیار ہی کہہ دیا تھا۔ صندل کی سانسیں بے ترتیب ہونے لگی تھیں۔

"آؤ، اس دکان میں چلتے ہیں۔" اس نے بلاوجہ ہی ایک دکان کی طرف اشارہ کیا تھا۔ یہ خفت مٹانے کا فوری ردعمل تھا۔

"اس دکان میں کیا ہے؟" وہ صندل کے اشارے کی سمت دیکھنے لگا تھا۔ وہ دکان جو باہر سے عجیب وغریب تصاویر سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اور جہاں لکھا تھا کہ "ارشادی بابا سے مستقبل کا حال جانیے۔"

"جادوگر...... یہ مستقبل کا حال بتاتے ہیں۔"

"تمہیں مستقبل کا حال جاننا ہے؟"

"نہیں...... صرف جادوگر کو تنگ کرنا ہے۔" صندل نے آنکھ مارتے ہوئے کہا تھا۔ "آجاؤ اندر۔"

میرزاد ہنستے ہوئے صندل کے پیچھے گیا تھا۔

اندر دکان کا حال ایسا تھا جیسے وہ دکان پہلے بھوت بنگلا رہ چکی ہو۔ بچوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کو

ڈرانے کے لیے بھی وہاں سارے اسباب موجود تھے۔ گند تو نہیں تھا۔ لیکن بے ترتیبی بہت تھی۔ دیواروں پر جالے نہیں لگے ہوئے تھے لیکن ان کی حالت ایسی تھی کہ جالے ان سے بہتر لگتے ہیں۔ تصاویر کا تو ڈھیر لگا ہوا تھا۔ دیواروں پر تو لگی ہی ہوئی تھیں، چھت پر سے بھی زنجیروں کی مدد سے لٹک رہی تھیں۔ پتا نہیں جادوگر تصویروں کا رسیا تھا یا نہیں لیکن اس نے ہیبت ناک ماحول خوب بنا رکھا تھا۔

''کوئی ہے یہاں؟'' صندل نے خالی دکان کو چاروں طرف سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''لگتا ہے کہ جادوگر اپنا ''قیمتی'' سامان چھوڑ کر یہاں سے چلا گیا ہے۔'' میرزاد ہنسا تھا۔

''جادوگر یہاں ہی ہے۔'' آواز گونجی تھی۔ دونوں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا تھا۔ دکان تو خالی تھی۔ آواز کہاں سے آ رہی تھی۔

''انکل جی! کہاں ہیں آپ......؟''

''بس دو منٹ......'' آواز نے کہا تھا۔ اور پھر ایک لمبی جمائی لی گئی تھی۔

میرزاد ہنسنے لگا تھا۔ اسٹول جو گندے کھیس سے ڈھکا ہوا تھا اس کے نیچے سے جادوگر کا کمزور سا وجود برآمد ہوا تھا۔ باہر نکل کر اس نے کھل کر انگڑائی لی تھی۔ تب ہی دونوں کی نظر اس کے حلیے پر گئی تھی۔ اس نے پانچ سال کے بچے کے سائز کی پینٹ پر بے حد کھلی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ بال ایسے بکھرے تھے جیسے ماں نے دیر سے گھر آنے پر خوب کس کس کے بال نوچے ہوں۔ کمر ایسے جھکی ہوئی تھی جیسے نجانے کتنے دن مرغا بنا رہا ہو۔ میرزاد سے اپنی ہنسی چھپانا مشکل ہو گیا تھا۔

''سردی بہت ہے ناں......تو بس اسی لیے آنکھ لگ گئی۔'' ارشادی بابا نے آنکھوں کو مسلتے ہوئے کہا تھا۔

''صندل! اس سے کیا مستقبل کا حال پوچھنا ہے۔ اس کا تو اپنا حال خراب ہے۔'' میرزاد نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

جادوگر شدومد سے کچھ ڈھونڈنے لگا تھا۔

''کیا تلاش کر رہے ہیں آپ......؟''

''میری ٹوپی......مل نہیں رہی۔''

''یہ والی......؟'' صندل نے ایک جگہ سے ٹوپی اتار کر اس کے سامنے کی تھی۔

''لو دیکھو ذرا......سامنے کی چیز نظر نہیں آئی......'' سولا ہیٹ پکڑ کر وہ سر پر رکھتے ہوئے بولا تھا۔

''تو پھر آپ میرا ہاتھ کیسے دیکھیں گے؟''

''میں ہاتھ نہیں دیکھتا لڑکی......''

''تو پھر......؟''

''میں ماتھے پڑھتا ہوں۔'' اس نے صندل کو دیکھتے ہوئے بارعب لہجے میں کہا تھا۔ اور یہ پہلی بار ہوا تھا کہ اسے جادوگر بہت سنجیدہ لگا تھا۔

''بیٹھو یہاں......'' جادوگر نے اسے اپنے سامنے ایک اسٹول پر بیٹھنے کو کہا تھا۔ صندل کا دل تو نہیں کیا تھا بیٹھنے کو......لیکن وہ بیٹھ گئی تھی۔ جوکر دکھنے والے جادوگر سے اسے خوف محسوس ہوا تھا۔ جادوگر اپنے سامنے بٹھائے اسے گھورتا جا رہا تھا۔ پھر اس نے صندل کے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اور اپنی آنکھیں بند کر دی تھیں۔ میر زاد کھڑا رہا تھا۔ اس کے لیے یہ سب دلچسپ ضرور تھا لیکن اسے کوئی تجسس نہیں تھا کہ جادوگر کیا کہتا ہے۔

''تمہیں بچپن میں ایک بار بے ریلش کیا گیا تھا۔ جانتی ہو ناں یہ بات......؟''

صندل نے پہلے حیرت سے اسے دیکھا تھا پھر ''ہاں'' میں سر ہلا دیا تھا۔ جادوگر کے لبوں پر مسکراہٹ آنے کے بجائے مزید سنجیدگی آئی تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا وہ اپنا اندازہ درست ہو جانے پر مسکراتا۔ لیکن اس کے چہرے پر افسوس پھیلا ہوا نظر آنے لگا تھا۔

''ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔''

''کیوں......؟'' وہ ایسے بولی تھی جیسے کسی گہرے کنویں سے بول رہی ہو۔

''جو کام معمول سے ہٹ کر ہوں، ان کا ردعمل بھی غیر معمولی ہوتا ہے۔ ہمیشہ چمکنے والے سورج پر جب گرہن لگتا ہے تو خوف پھیلتا ہے۔ ہموار زمین پر زلزلہ آتا ہے تو لوگ گھبرا جاتے ہیں۔''

''یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں...... بچہ بچہ جانتا ہے یہ بات۔'' میرزاد نے مداخلت کی تھی۔ جادوگر نے اس کی بات جیسے سنی ہی نہیں تھی۔ وہ صندل کے ماتھے کو دیکھتا جا رہا تھا۔

''اور بعض غیر معمولی واقعات کا اعادہ ہوتا ہے۔''

''اعادہ مطلب......!''

''چیزوں کا دوبارہ پھر سے ہونا...... یا پلٹ کر واپس آنا...... آسمانی بجلی کا ایک ہی مقام پر بار بار گرنا...... آتش فشاں کا ایک ہی بستی سے بار بار پھوٹنا......''

''قدرتی باتیں ہیں سب......'' میرزاد نے کہا تھا۔

جادوگر جس کا نام ارشادی بابا تھا نے میرزاد کی طرف دیکھا تھا۔

''خاندان میں بڑے لڑکے کا جوان ہونے سے پہلے مر جانا...... بڑی بیٹی کا ماں سے پہلے بیوہ ہونا...... چھوٹی لڑکی کا کسی حادثے میں مر جانا...... کیا یہ سب بھی قدرتی ہے تمہاری نظر میں......''

میرزاد لاجواب ہو کر چپ ہو گیا تھا۔

''اسے خاندانی واقعات کا پلٹ پلٹ کر آنا کہتے ہیں۔'' جادوگر کہتا جا رہا تھا اور صندل سنتی جا رہی تھی۔ وہ چپ ہو چکی تھی۔ بالکل چپ...... جادوگر کے پاس آنے کا غیر ضروری کام اس نے آخر کیا ہی کیوں تھا۔

''میرے ساتھ کون سا واقعہ دوبارہ ہوگا؟''

صندل کے سوال پر ارشادی بابا سرد چہرے کے ساتھ اسے دیکھنے لگا تھا۔

"کتنے پیسے ہوئے؟" میرزاد نے جلدی سے پوچھا تھا۔

"پیسے اگلی بار آنے پر لوں گا۔"

"مجھے اگلی بار یہاں نہیں آنا...... میں ویسے بھی یہاں کا نہیں ہوں۔"

"تمہاری بات نہیں کر رہا...... میں تو اس کی بات کر رہا ہوں۔" اس نے صندل کی طرف نظروں ہی نظروں میں اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ صندل جلدی سے وہاں سے اٹھی تھی اور باہر کو بھاگی تھی۔ میرزاد اس کے پیچھے آیا تھا۔

"کیا ہوا؟"

"پتا نہیں...... اس نے مجھے ڈرا دیا ہے۔"

"کیا بات کر رہی ہو یار......" میرزاد کھوکھلی سی ہنسی ہنس کر بولا تھا۔ "اس نے بات ہی کیا کی ہے۔ کچھ بھی نہیں...... صرف اپنے لفظوں میں تمہیں الجھایا ہے۔ سورج گرہن...... چاند گرہن...... سب کو پتا ہے ان باتوں کا...... بے ریش ہونے والی بات بھی کچھ انوکھی نہیں...... سب بچے بچپن میں بے ریش ہوتے ہیں۔"

"ہاں...... لیکن تم نہیں جانتے میر......" صندل نے حاجی بوا کی سنائی باتیں یاد کرتے ہوئے کہا تھا۔

"کیا......؟"

"کچھ نہیں...... پھر کبھی بتاؤں گی۔" اس نے اپنا موڈ ٹھیک کرنے کی غرض سے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ اندھیری دکان میں سے باہر روشن دن میں نکل آنا ویسے بھی مددگار ثابت ہوا تھا۔ وہ کچھ پرسکون ہوئی تھی۔

"کیا تمہیں بازار سے کچھ لینا ہے۔" چلتے چلتے میرزاد نے پوچھا تھا۔

''کیوں......؟''

''تم بس چلتی جا رہی ہو۔ میرے خیال سے تو ہمیں اب واپس چلنا چاہیے۔''

''مجھے پازیبیں لینی ہیں اپنے لیے......''

''تو لے لو......''

''کوئی دکان نظر آتی ہے تو لیتی ہوں۔'' اب وہ اسے کیا بتاتی کہ وہ تو اصل میں کچھ لینے آئی ہی نہیں تھی۔ بازار جانے کا تو اس نے میرزاد کے سامنے بہانہ بنایا تھا۔ ایک تو یہ لڑکا خود سے کچھ سمجھتا ہی نہیں...... کہاں گئی آج کل کے لڑکوں کی سمجھ...... یہ سمجھ کیوں نہیں جاتے کہ لڑکی کے دل میں کیا چل رہا ہے۔

چلتے چلتے وہ دونوں رکے تھے۔ بازار کے دوسرے سرے سے انہیں کچھ شور سنائی دیا تھا۔ کچھ عجیب وغریب سا شور، اونچی اونچی آوازیں اور ساتھ ہنسی کی آواز بھی...... جیسے یا تو کوئی ہنستے ہنستے جھگڑ رہا ہو یا جھگڑتے جھگڑتے ہنس پڑا ہو۔

پھر دونوں نے اس ساری آواز کے محرک کو دیکھا تھا۔ وہ کوئی بوڑھی سی خاتون تھی۔ جو حلیے سے فقیرنی لگ رہی تھی اور وہ اصل میں پاگل تھی۔ بچے اسے تنگ کر رہے تھے اور وہ ان سب پر بولتی ہوئی انہیں گالیاں نکالتی ہوئی چلاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ کچھ بچے اسے چھوٹے چھوٹے کنکر مار رہے تھے اور بدلے میں وہ انہیں زمین سے اٹھا اٹھا کر بڑے پتھر مار رہی تھی۔ پتھر مارتے ہوئے وہ یہ احتیاط نہیں کر رہی تھی کہ پتھر کسی بچے کو کتنی شدت سے لگتا ہے۔ اور اس کو کس قدر لہولہان کر سکتا ہے۔ وہ اپنی پوری قوت سے وار کر رہی تھی۔ دائیں بائیں کی دکانوں والے باہر سر نکالے ہنس رہے تھے۔

تیز تیز چلتی وہ تقریباً بھاگتی ہوئی صندل کے پاس آئی تھی۔ صندل اور میرزاد خاموش کھڑے تھے۔ نجانے کیا دیکھا تھا اس نے صندل میں کہ وہ اس کے پاس پہنچ کر رک گئی تھی۔ اور پھر اگلے ہی پل اس نے اپنے دونوں ہاتھ صندل کے کندھوں پر رکھ دیے تھے۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت مضبوط تھی۔

صندل کو ایسے لگا تھا جیسے اس کے کندھے کسی لوہے کے شکنجے میں جکڑے گئے ہوں۔

''کوئل کا بچہ سفید ہے۔'' آنکھیں پھاڑے وہ بڑبڑائی تھی۔ صندل نے اچنبھے سے اسے دیکھا تھا۔

''کیا......؟''

''کالی کوئل کے گھر سفید بچہ پیدا ہوا ہے۔'' وہ ایسے بتا رہی تھی جیسے دنیا کا کوئی بہت ہی بڑا راز آشکار کر رہی ہو۔

''تنگ مت کریں......'' میرزاد نے بڑھیا کے ہاتھ صندل کے کندھوں پر سے ہٹائے تھے۔ وہ بوڑھی عورت صندل کو دیکھتی جا رہی تھی۔

''بھاگ جاؤ...... دجال اترنے والا ہے۔ وہ سب کو مار دے گا۔ سب کو...... بھاگ جاؤ'' اور کہتے ہوئے وہ خود بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔ صندل دور تک اسے جاتا ہوا دیکھنے لگی تھی۔

''بہت مزاحیہ ہیں بھئی، تمہارے شہر کے لوگ......'' میرزاد نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ ''لو جی...... پیشن گوئی ہو گئی ہے خیر سے...... دجال آنے والا ہے۔'' وہ ہنستا ہی جا رہا تھا۔ لیکن صندل چپ تھی۔

''میرے خیال سے ہمیں گھر چلنا چاہیے۔''

''لیکن تمہیں تو پازیبیں لینی تھیں۔''

''وہ میں پھر کسی دن لے لوں گی۔'' اس نے واپسی کے لیے چلتے ہوئے کہا تھا۔

☆......☆......☆

کھپریل کی چھت پر لگے جالوں کو وہ کافی دیر سے گھورتی جا رہی تھی۔ پھر جب وہ اس کام سے اکتا گئی تو اس نے چھت کے درمیان میں ڈالے گئے لکڑی کے تختوں کو گننا شروع کر دیا۔ لیکن اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔ تکلیف کی شدت لحہ بہ لحہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ دھیان بٹانے کے لیے اس نے اس چلمن کو کھوجنا شروع کر دیا جو دروازے پر ڈالی گئی تھی۔ کمرے میں نیم اندھیرا تھا۔ چلمن میں سے

بہت معمولی سی روشنی باہر سے اندر کی طرف آ رہی تھی۔ایک ایک درز کی روشنی کو دیکھتے ہوئے اس کا دماغ عجیب وغریب سی کہانیاں بنا رہا تھا۔خوف ناک کہانیاں......

''ہمت سے کام لے میری بچی......'' اس کی ساس نے پیار سے کہا تھا۔''بچہ پیدا کرنا آسان نہیں ہوتا......''

وہ خاموش رہی تھی۔اس میں بولنے کی ہمت ہی نہیں تھی۔اس کے نچلے وجود نے اس کے جسم کی ساری طاقت کو نچوڑ لیا تھا۔

''بس تھوڑی دیر اور......'' دائی نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا تھا۔وہ تب بھی خاموش رہی تھی۔ پھر اسے ایسے لگنے لگا تھا جیسے اس کے جسم سے روح بس نکلنے والی ہو۔اور جس وقت اسے لگا کہ وہ بس مرنے کے قریب ہی ہے تب ہی کمرے میں بچے کے رونے کی آواز گونجی تھی۔ایک گہرا سانس اس کے حلق سے برآمد ہوا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد بچہ بھی روتے روتے خاموش ہو گیا تھا۔یا وہ بہت ہلکی آواز میں رو رہا تھا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔گہری خاموشی......اس کی ساس جو لمحہ بھر پہلے تک چہک رہی تھی اب ایک دم سے چپ ہو گئی تھی۔دائی کو بھی جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔جبکہ وہ تو انتظار کر رہی تھی کہ دونوں میں سے کوئی اسے بتائے کہ لڑکا ہوا ہے یا لڑکی......

''کیا ہوا ہے؟'' گہرے سانسوں کے درمیان اس نے خود ہی پوچھ لیا تھا۔

''کالی کوئل کے گھر سفید بچہ پیدا ہوا ہے۔'' دائی نے اسے بتایا تھا۔اور پھر روتے ہوئے بچے کا وجود اس کے سامنے کیا تھا۔بچے کو دیکھ کر اس کی نیند سے بوجھل آنکھیں حیرت سے پھٹنے پر آ گئی تھیں۔ اس کا خود کا رنگ تو گہرا سیاہ تھا۔اور اس کے شوہر کا بھی......پھر بچہ اتنا سفید کیسے پیدا ہو گیا تھا۔

''قیامت کی نشانی......مانو دجال آنے والا ہے۔'' دائی طنزیہ بڑبڑائی تھی۔اور اس کی ساس نے

آگے بڑھ کر ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا تھا۔

”حرام زادی...... کہاں جا کر منہ کالا کیا ہے، جو تیرے سیاہ بطن سے ایسا سفید بچہ پیدا ہوا۔“

ساس غصے سے دھاڑی تھی۔

اور تب لڑکی نے شدت سے خواہش کی تھی کہ زمین اور آسمان میں سے کوئی ایک چیز پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔

☆......☆......☆

ملازموں کو حویلی کی اچھے سے صفائی کرنے کو کہا گیا تھا اور یہ صفائی کوئی عام صفائی نہیں تھی۔ بلکہ ایسے لگ رہا تھا جیسے حویلی نئے سرے سے تعمیر ہونے جا رہی ہو۔ باورچی کو بہترین کھانے کی تیاری کرنے کا ابھی سے کہہ دیا گیا تھا۔ تینوں پھوپھیوں اور ان کی چھ بیٹیوں کو بھی اس دن تیار رہنے کو کہا گیا تھا جس دن روشن بیگم نے ان کے گھر تشریف لانی تھی۔

اپنے دن کے لمبے وظائف کے بعد چاند کمرے سے باہر نکلی تھی۔ اس نے ساری تیاری دیکھی اور کچھ حیران ہوئی تھی۔

”یہ کس چیز کی تیاری ہو رہی ہے؟“ اس نے حاجی بوا سے پوچھا تھا۔

”پتا نہیں...... بستامی نے گھر کے ملازموں سے کہا ہے کہ جمعے تک اسے یہ حویلی شیشے کی طرح چمکتی ہوئی چاہیے۔“

”کیا گھر میں کوئی آ رہا ہے؟“

”شاید...... لیکن میں کچھ زیادہ نہیں جانتی۔“

چاند بڑے کمرے میں گئی تھی۔ جہاں افشیں موجود تھی اور وہ کاغذ قلم لیے کچھ لکھنے میں مصروف تھی۔ چاند امی کو وہاں دیکھ کر افشیں نے فوراً سے کاغذ اپنے پیچھے چھپا لیا تھا۔ چاند نے اسے ایسا کرتے

ہوئے دیکھ تو لیا تھا لیکن یہ ان کے نزدیک کوئی اہم بات نہ تھی۔

''کیا گھر میں کوئی آ رہا ہے افشیں......؟''

''جی......آپ کو نہیں معلوم کیا؟''

''نہیں......کون آ رہا ہے؟''

''بستامی بابا کے کچھ خاص مہمان آ رہے ہیں۔'' افشیں نے نا چاہتے ہوئے بھی ''خاص'' کو خاص لہجے میں ادا کیا تھا۔ ''انہوں نے سب کو تیار رہنے کو کہا ہے۔ کہہ رہے تھے کہ مہمان کا اچھے سے استقبال کرنا ہے سب نے......اور خوب خاطر مدارت بھی کرنی ہے۔''

''کتنے لوگ ہیں؟''

''شاید......ایک ہی ہے۔ لیکن کچھ خاص ہے تب ہی تو اتنی تیاری کروائی جا رہی ہے۔''

''اچھا......خیر یہ صندل کہاں ہے۔ صبح سے نظر نہیں آ رہی......''

''میں یہاں ہوں......دروازہ کھولتے ہوئے وہ اندر داخل ہوئی تھی۔

''کہاں تھیں تم......؟ صبح سے غائب ہو۔''

''ہاں صندل......کہاں تھیں تم؟'' افشیں نے چہرے پر مسکراہٹ سجائے اس سے پوچھا تھا۔

''بازار میں تھی۔ پازیبیں لینے گئی تھی۔''

''اتنی دیر ہو گئی خریدتے خریدتے......'' افشیں بس ہنس دینے کو ہی تو تھی۔ صندل نے اسے گھورا تھا۔

''نہیں چاندامی......! میں کچھ دیر اکیلے باغ میں بیٹھ گئی تھی۔''

''ٹھیک ہے۔ تم جا کر تیار ہو جاؤ......استاد جی آنے والے ہوں گے۔''

''کون سے استاد......؟''

''تمہیں ستار بجانا سکھائیں گے۔''

''لیکن میں نے آپ سے کہا تو تھا کہ مجھے ستار نہیں سیکھنا۔''

''میں تم پر زور نہیں ڈال رہی ہوں صندل...... صرف مشورہ دے رہی ہوں۔ انسان کو زندگی میں کسی نہ کسی چیز میں ماہر ضرور ہونا چاہیے۔ تمہیں ستار کا شوق ہے تو بہتر ہے کہ تم یہ ہی سیکھ لو۔''

افشیں نے دیکھا تھا کہ دونوں ماں بیٹی میں سنجیدہ گفتگو ہونے لگی ہے تو اس نے وہاں سے چلے جانا ہی بہتر سمجھا تھا۔

''آپ کہتی ہیں تو سیکھ لیتی ہوں۔''

''اچھا ہوتا ہے کچھ نہ کچھ سیکھتے رہنا، میری جان...... میں تو چاہتی تھی کہ گھر کی باقی بچیاں بھی کچھ نہ کچھ سیکھ لیں، لیکن کسی پھوپھو نے میری بات پر توجہ نہیں دی۔''

''جیسے تم توجہ نہیں دیتیں ہماری باتوں پر......'' تہمینہ پھوپھو نے کمرے میں داخل ہوتے ہی لقمہ دیا تھا۔

''آپ کی کیا بات نہیں مانی میں نے تہمینہ پھوپھو......'' چاند ادب سے بولی تھی۔

''ویسے تو بہت سی باتیں ہیں۔ لیکن ایک بات تو بالکل نہیں مانتی ہو...... کتنی بار کہا ہے کہ کچھ تیار شیار رہا کرو...... ڈھنگ کے کپڑے پہنا کرو...... لیکن تم میری سنتی ہی نہیں ہو۔ جو زیورات التمش کے گھر سے آئے تھے کم از کم وہی پہن لیا کرو۔ انہیں بھی تم نے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔''

''وہ میں نے صندل کے لیے رکھ لیے ہیں۔'' چاند نے محبت سے صندل کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''صندل کی قسمت کے اسے مل جائیں گے۔ تم تو انہیں استعمال کرو...... اور ویسے بھی صندل کی شادی کون سا ابھی ہو رہی ہے۔''

''ظاہر ہے...... پہلے افشیں کی شادی ہو گی۔'' صندل نے ہنس کر کہا تھا اور پھر وہاں سے چلی گئی تھی۔

''آپ نے افشیں کے لیے کوئی رشتہ دیکھا ہے کیا؟''

''ہاں...... دیکھ رہی ہوں۔ کچھ رشتے مجھے پسند بھی آئے ہیں۔ بس یہ بستامی کے مہمان ہو کر چلے جائیں، پھر ان کو گھر بلاتی ہوں۔''

''بستامی کے مہمان کون ہیں؟''

''تم نہیں جانتیں کیا؟''

''نہیں......'' چاند نے ناں میں گردن ہلائی تھی۔

''بستامی نے تو کچھ نہیں بتایا لیکن میں نے رحبانی سے پوچھ لیا ہے۔ ایمن اور کومل کی والدہ......روشن بیگم آ رہی ہیں گھر میں۔''

''کیا سچ میں......؟'' اسے شدید حیرت ہوئی تھی۔

''ہاں......''

''وہ یہاں کیا کرنے آ رہی ہیں؟'' نا چاہتے ہوئے بھی چاند کے لہجے میں ناگواری آئی تھی۔

''جہاں تک میرا خیال ہے بستامی اور رحبانی دونوں نے اب شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کومل اور ایمن سے ہی......'' تہمینہ پھوپھو نے بتایا تھا اور چاند نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا تھا۔

''اتنا تعجب مت کرو چاند...... ویسے بھی تو وہ دونوں زندگی بھر انہی کے ساتھ رہے ہیں۔ اب اگر بیاہ کر حویلی میں لے آئیں گے تو اچھا نہیں ہو جائے گا۔ نسل بڑھے گی، دونوں کے بچے ہوں گے۔''

''لیکن......''

''تم سارے اعتراضات کو چھوڑو...... بس اچھے سے تیاری کرو۔ تم بہن ہو بستامی کی...... تمہیں زیادہ خاطر مدارت کرنا ہو گی۔ بہت اچھے سے مہمان نوازی کرنا ہو گی۔ ہم تو بستامی کی پھوپھیاں ہیں۔ ہماری بات میں وہ دم خم نہیں ہو گا۔ کوئی بھی منہ اٹھا کر کہہ سکتا ہے کہ حویلی میں ہمارا کیسا حصہ...... ہم تو تیسرا فرد ہیں۔ اس لیے تمہیں کہہ رہی ہوں۔ تم بات کرنا...... سمجھ گئیں۔''

''جی......''

''اب جا کر تیاری کرو۔''

چاند غائب دماغی سے اپنے کمرے میں آئی تھی۔

☆......☆......☆

''دیکھنے میں لگتا ہے کہ ستار انگلیوں سے بجایا جا رہا ہے۔ حقیقت میں یہ مضراب سے بجایا جاتا ہے۔ لیکن......صرف بجانے والا جانتا ہے کہ یہ دونوں سے نہیں، بلکہ من سے بجتا ہے۔ من شانت ہوگا تو انگلیاں شانت ہوں گی۔ انگلیاں شانت ہوں گی تو مضراب شانت ہوگا۔ اور تب ہی ستار کی دھنیں شانت ہوں گی۔ یاد رکھنا ستار شانت کا ساز ہے۔ اس میں شور وغل نہیں۔'' استاد صاحب اپنے دھیمے لہجے میں بولے تھے۔ ''ستار بجانے سے پہلے بہتر ہے کہ تم جان لو کہ وہ کون کون سی چیزیں ہیں جو ستار کو ستار بناتی ہیں۔ ویسے تو دنیا میں کچھ بہت بکھرا ہوا ہے لیکن باہمی خاصیت کی چیزیں جب آپس میں ملتی ہیں تو ستار جیسا خوب صورت امتزاج پیدا ہوتا ہے۔''

''اور اگر خاصیتوں میں تصادم ہو تو......؟''

''تصادم والا وجود کبھی قائم نہیں رہتا...... یاد رکھنا جن دو چیزوں میں باہم تصادم ہوگا اس میں سے کسی ایک کا وجود قائم رہے گا۔ آگ اور پانی مل نہیں سکتے...... ملانے کی کوشش کرو گے تو کوئی ایک چیز باقی بچے گی۔ یا آگ پانی کو سکھا دے گی یا پانی آگ کو بجھا دے گا۔''

''جی...... میں سمجھ گئی۔''

''اب جان لو کہ وہ کون سی چیزیں ہیں جن سے ستار کی خاصیت ترتیب پاتی ہے۔ سب سے پہلے آتا ہے کدو...... میٹھا اور ٹھنڈا پھل...... جو جس قدم نرم ہوتا ہے، سوکھ کر اتنا ہی سخت ہو جاتا ہے۔ پھر آتی ہے برگد کی لکڑی...... جو اتنی کوری ہوتی ہے کہ ہر روپ میں ڈھل جانے کو تیار رہتی ہے۔ اور اس کے بعد

آتی ہے کاریگر کی محنت...... جو دن رات ریتی کا غذ چلا چلا کر ستار کو ہموار کرتا ہے۔ سمجھ لگی؟''

''جی......'' وہ مسکرائی تھی۔

''آج کے سبق سے تم نے کچھ سیکھا تو نہیں...... لیکن تمہارے دل میں ستار کی محبت پیدا ہو گئی ہے۔ اور کسی بھی ساز کو بجانے کے لیے دل میں اس کی محبت کا ہونا ضروری ہے۔'' استاد جی نے توقف کیا تھا۔'' اور دل میں کسی انسان کی محبت ہو تو پھر تو کیا ہی کہنے......'' استاد جی نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

صندل بھی بے اختیار ہو کر مسکرا دی تھی۔

☆......☆......☆

حویلی میں پچھلے چند دنوں سے کچھ عجیب صورت حال دیکھنے کو مل رہی تھی۔ جسے سب سے پہلے صندل نے نوٹس کیا تھا۔ رات کے کسی گہرے پہر بانسری بجنے کی آواز آتی تھی۔ اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد حویلی کے کسی کمرے کے دروازے کے کھولنے کی آہٹ پیدا ہوتی تھی۔ اور زنجیر کے گرنے کی آواز......

پہلے پہل تو صندل نے اسے محض اتفاق سمجھا تھا۔ اسے لگا تھا کہ بانسری رات کے اس پہر رحبانی بابا بجاتے ہیں۔ جب کہ آواز کی پہنچ کے متعلق اس کا شک تھا بھی کہ وہ حویلی کے باہر سے آتی ہے۔ اور دروازہ کی آہٹ کو اس نے اہمیت نہیں دی تھی۔ لیکن آج جب اس نے رحبانی بابا سے پوچھا کہ بانسری رات کو وہ بجاتے ہیں تو انہوں نے انکار میں سر ہلایا تھا۔

''میں رات میں صرف سنکھ بجاتا ہوں۔ باقی ساز دن کے وقت کے لیے ہیں۔''

صندل کو پریشانی لاحق ہوئی تھی۔ یہ کیا ہو رہا تھا حویلی میں...... اسے خبر رکھنی چاہیے تھی۔ آج وہ اسی لیے جاگ رہی تھی۔ خبر رکھنے کے لیے...... وہ بانسری بجانے والے اور دروازہ کھولنے والے...... دونوں کو جاننا چاہتی تھی۔

پھر رات کے مخصوص پہر بانسری کی آواز حویلی میں اتری تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد حسب توقع

حویلی کے کسی کمرے کے دروازے کے کھلنے کی آہٹ پیدا ہوئی تھی۔

صندل اپنے پلنگ پر سے اتری تھی۔ وہ آج اس اتفاق کا پتا کر کے رہنا چاہتی تھی۔ کمرے سے نکل کر وہ دالان میں آ کر خاموشی سے کھڑی ہو گئی تھی۔ صحن میں اسے ایک ہیولا نظر آیا تھا۔ چادر میں لپٹا ہوا۔ جو دائیں بائیں دیکھتا ہوا چوری کرنے کے سے انداز میں حویلی سے باہر جا رہا تھا۔ صندل کو حیرت ہوئی تھی۔ جانے والی عورت تھی۔ لیکن کون......؟ اور اس سے بھی بڑی بات کہ کیوں؟

حویلی میں ایک جگہ ایک کھڑکی ایسی بھی تھی جہاں سے باہر کا منظر نظر آتا تھا۔ صندل وہاں جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ چادر میں لپٹا سایہ بے حد خاموشی سے حویلی سے باہر نکل گیا تھا۔ حویلی سے ذرا دور درخت کے نیچے ایک لڑکا تنے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ سایہ اس تک پہنچا تھا۔ اور دونوں ایسے باتیں کرنے لگے تھے جیسے برسوں سے بچھڑے ہوئے ہوں۔

رات گہری ہو رہی تھی۔ چاند روشن تھا لیکن بادلوں کی اوڑھ میں تھا۔ اپنی شکل دکھا رہا تھا لیکن لمحاتی طور پر......

بہت دیر کے بعد حویلی کا دروازہ پھر سے کھولا گیا تھا۔ بے حد خاموشی سے وہ اندر کمرے میں جانے لگی تھی جب صندل اس کے سامنے جا کر کھڑی ہوئی تھی۔ ہاتھ میں پکڑی لالٹین اس نے اس کے چہرے کے سامنے کی تھی اور پھر اگلے ہی پل بلند آواز میں بولی تھی۔

''افشیں تم......؟'' صندل کے لہجے میں حیرت تھی۔ افشیں نے شرمندگی کے مارے منہ دوسری طرف پھیر لیا تھا۔

''کون تھا وہ......؟ کس سے ملنے گئی تھیں تم باہر......؟''

''شش......آہستہ بولو......کوئی سن لے گا۔'' اس نے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے گہری شش کی تھی۔

''پاگل لڑکی......اور جو تمہیں کوئی باہر جاتا دیکھ لیتا تو......''

''سب سو رہے ہیں۔''

''کوئی میری طرح جاگ جائے تو......''

''کوئی تمہاری طرح چمگادڑ نہیں ہے اس حویلی میں...... جو رات رات بھر جاگے۔'' افشیں کہہ کر اندر جانے لگی تھی۔ اپنے راز کے آشکار ہو جانے کے بعد وہ کچھ بوکھلا گئی تھی۔ ابھی صندل سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن صندل سب جانے بغیر اسے کہاں جانے دینے والی تھی۔

''جا کہاں رہی ہو۔ ادھر رکو......'' اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکا تھا۔ ''میرے سوالوں کے جواب دو...... ایسے نہیں جانے دوں گی میں تمہیں......''

''پہلی بات تو یہ کہ مجھ سے ذرا تمیز سے بات کرو تم...... میں تم سے بڑی ہوں۔ بلکہ گھر میں سب کزنوں سے بڑی ہوں۔'' افشیں نے سنجیدگی اپنانے کی کوشش کی تھی۔ صندل نے بمشکل ہنسی کو روکا تھا۔

''جی تو بڑی آپی...... بلکہ بہت بڑی آپی...... باہر آپ کس سے مل کر آ رہی ہیں۔ کون صاحب تھے وہ......'' اس نے بناوٹی ادب سے کہا تھا۔

''تمہارے ہونے والے بہنوئی......'' افشیں کہتے ہوئے خود بھی ہنس پڑی تھی۔ صندل کو تو ہنسی کا دورہ ہی پڑ گیا تھا۔ افشیں کی بات پر اور اس کے انداز پر......

''عادل نام ہے اس کا......'' اس کا نام لیتے ہی افشیں کے چہرے پر مسکراہٹ آئی تھی۔

''کب سے دھول جھونک رہی ہو گھر والوں کی نظر میں......؟''

''ایک سال ہو گیا۔''

''بے غیرتی کی حد نہیں ہو گئی ویسے...... ایک سال ہو گیا۔ مجھے کچھ بتایا ہی نہیں۔''

''جیسے تم نے میر زاد کے بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا۔''

''میر زاد کی بات اور ہے۔ اس نے ابھی تک ایسی بات نہیں کی۔''

''لیکن عادل کر چکا ہے کہ وہ میرے بنا نہیں جی سکتا۔'' افشیں شرمائی تھی۔

''تم تہمینہ پھوپھو کو سب بتا دو افشیں......'' صندل سنجیدگی سے بولی تھی۔ ''وہ چاند امی سے تمہارے لیے رشتہ دیکھنے کی بات کر رہی تھیں۔''

''عادل کی والدہ بیمار ہیں۔ جیسے ہی وہ ٹھیک ہوں گی ہمارے گھر آ جائیں گی۔ اب بہت رات ہو گئی ہے۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔ میں سونے جا رہی ہوں۔ باقی باتیں کل ہوں گی۔'' افشیں کہہ کر جلدی سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔

صندل اپنے کمرے میں جانے سے پہلے کتنی ہی دیر وہاں کھڑی رہی تھی۔ افشیں کا باہر جانا...... عادل سے ملنا...... یہ سارا منظر دیکھ کر اسے نجانے کیوں یہ خواہش ہوئی کہ کاش افشیں کی جگہ وہ ہوتی اور عادل کی جگہ میر زاد......

☆......☆......☆

''رات تم کہاں گئی تھی صندل......؟''

صبح اٹھتے ہی چاند نے سب سے پہلا سوال اس سے یہ پوچھا تھا۔ لمحے بھر کے لیے صندل گڑبڑا گئی تھی۔

''وہ...... کہیں بھی نہیں...... غسل خانے گئی تھی۔''

''تم وہاں نہیں تھی...... میں نے دیکھ لیا تھا۔''

''نیچے گئی تھی۔ کچھ شور سنائی دیا تھا، مجھے لگا کہ چور نہ ہو۔''

''اچھی بات ہے کہ تمہیں حویلی کی فکر ہے۔'' چاند رکی تھی۔ اس نے صندل کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ ''اس حویلی کی عزت کی فکر کرنا بھی تمہاری ذمہ داری ہے۔'' اس نے پیار سے کہا تھا۔

صندل شرمندہ ہو گئی تھی۔ وہ چاند کی بات کا مطلب بخوبی سمجھی تھی۔ افشیں کے چکر میں اس پر شک کر لیا گیا تھا۔

''تمہاری ستار کی کلاس کیسی رہی؟''

''بہت اچھی......استاد جی سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔''

''اچھے سے سیکھنا......تم کسی چیز میں مہارت حاصل کر لو گی تو مجھے بہت اچھا لگے گا۔ستار تو ویسے بھی بہت نفیس مزاج ساز ہے۔اسے بجانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔''

''کل استاد جی بھی یہ ہی کہہ رہے تھے۔''

''لیکن بس مجھے ایک بات کا ڈر ہے صندل......!'' چاند کے چہرے پر پریشانی کے سائے لہرائے تھے۔

''کیا......؟''

''ساز اپنا خراج ضرور لیتے ہیں۔''

''وہ کیسے......؟''

''وہ بجانے والے کو اس نقطے تک پہنچا ہی دیتے ہیں جہاں سے ان کے سروں کی سچی سرگم نکلتی ہے۔'' چاند نے کہا تھا۔وہ نا سمجھی سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

''بانسری......اپنے بجانے والے کو محبت کی اتھاہ گہرائیوں میں لے ہی جاتی ہے۔تاکہ وہ اس کے ہونٹوں سے اپنے سچے سر باہر نکال سکے۔طبلہ......بجانے والے کو دیوانگی تک لے جاتا ہے۔مرلی......کسی کی تلاش کو سینے پر مرتسم کر دیتی ہے۔اور ستار......''

''ستار کیا......؟''

''ستار کا خراج اداسی ہے۔'' چاند نے کہا تھا۔''یہ کسی غم کو، جدائی کو، کسی روگ کو بالآخر جنم دے ہی دیتا ہے۔لیکن میں دعا کروں گی کہ ستار یہ خراج تم سے کبھی نہ لے......''انہوں نے مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔''تم جب بھی ستار بجاؤ مسکراتے ہوئے بجاؤ۔''

''ایسا ہی ہوگا۔''صندل نے بھی مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''اب جلدی سے تیار ہو جاؤ...... بستامی کی مہمان آنے والی ہوں گی۔ ہمیں ان کا اچھے سے خیر مقدم کرنا ہے۔ اچھے سے تیار ہو جاؤ تم......''

''جی اچھا......''

☆......☆......☆

روشن بیگم نے سردی کے باوجود شفون کی باریک ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ جس کا رنگ تو نفیس تھا لیکن اس پر کام کی چمک نے اسے کافی شوخ بنا دیا تھا۔ سردی سے بچنے کے لیے اس نے اپنے کندھوں پر کشمیری شال ڈال رکھی تھی۔ اس سے بیک وقت دو کام ہو رہے تھے۔ ایک تو سردی سے بچا جا رہا تھا۔ دوسرا ساڑھی کے مختصر بلاؤز سے جھانکتے اس کے جسم کی ستر پوشی ہو رہی تھی۔

دونوں ہاتھوں پر مہندی لگائے، کلائیوں میں بھر بھر کر سونے کی چوڑیاں ڈالے ہوئے اور بالوں میں موتیے کے گجرے ٹکائے روشن بیگم پورے کمرے کو روشن کیے بیٹھی تھی۔ بال بہت سلیقے سے اٹھا کر سر پر کچھ گنبد سا بنایا گیا تھا۔ میک اپ اتنی نفاست سے کیا گیا تھا کہ عمر کو ظاہر کرتی جھریاں تو چھپ ہی گئی تھیں۔ کچھ روشن بیگم اس قدر دل سے مسکرانے کی عادی تھی کہ اس پر ڈھلتی عمر کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ لڑکیوں کا دل چاہ رہا تھا کہ روشن بیگم سے میک اپ کی ٹپس لے لیں۔ کیا بارعب خاتون تھی۔ ساڑھی پہننا تو جیسے پورے ہندوستان میں اسے ہی آتا تھا۔

وہ سارے کمرے کو خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔ کمرے کی سجاوٹ، اس کی بناوٹ کو......

میزبان بنے سارے حویلی کے مکینوں میں سے کسی کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے کیا بات کریں۔ خاص کر چاندامی کو...... وہ نہیں سمجھ پا رہی تھی کہ وہ روشن بیگم سے کس طرح کی بات کرے۔ نہ تو وہ شوہر والی تھی اور نہ ہی بچوں والی...... اس سے پھر کس طرح کی بات کی جا سکتی تھی۔ اسے تو بستامی کا روشن بیگم کو گھر پر بلانا ہی سخت برا لگا تھا لیکن پھر بستامی کا گھر بس جانے کے خیال سے وہ چپ ہو گئی تھی۔ اور اس نے یہ کڑوا گھونٹ بھر لیا تھا۔

صندل روشن بیگم کے لیے سرخ شربت لے کر آئی تھی۔اس نے گلاس روشن بیگم کے سامنے کیا تھا۔روشن بیگم نے اسے دیکھا تھا۔

''چاند کی بیٹی ہوناں......''

''جی......میں چاندامی کی بیٹی ہوں۔''

''تمہاری شکل اپنی ماں پر گئی ہے۔میں دیکھتے ہی پہچان گئی تھی۔'' روشن بیگم نے سرخ شربت کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا تھا۔ایسا کرتے ہوئے اس کے ہاتھوں کے سارے زیور جھنجھنائے تھے۔

صندل آگے سے مسکرادی تھی۔روشن بیگم یک ٹک اسے دیکھتی جارہی تھی۔اس نے سادہ کھدر کا سیاہ رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا۔جس کے بازو اور گلے پر چاند نے سفید کروشیے کی بیل بنادی تھی۔

''گھر کی ساری لڑکیاں ہی ماشاءاللہ سے بہت پیاری ہیں۔مجھے بہت اشتیاق تھا تم سب سے ملنے کا۔''

''ہمیں بھی اشتیاق تھا۔آپ کے ساتھ ساتھ ایمن اور کومل ''مامی'' سے ملنے کا۔'' لڑکیاں کہہ کر ہنسی تھیں۔تہمینہ نے سب کو گھورا تھا۔

روشن بیگم بات سمجھتے ہوئے مسکرائی تھی۔وہ تو چلتے مرد کی جیب میں پڑے نوٹ گن لینے کی عادی تھی۔لڑکیوں کی باریک آوازیں بھلا کیسے نہ سنتی۔

''ٹھیک ہے۔اگلی بار آئی تو انہیں ساتھ لیتی آؤں گی۔''

''ہم انہیں لینے جائیں گے۔بینڈ باجے کے ساتھ۔'' لڑکیاں پھر سے ہنسی تھیں۔تہمینہ پھوپھو نے پھر سے انہیں گھورا تھا۔

''مجھے آپ کی حویلی دیکھنی ہے۔''

''جی جی......کیوں نہیں......صندل! تم بستامی کو بلا کر لاؤ۔وہ اپنی مہمان کی رہنمائی کرتے ہوئے حویلی دکھائے۔''

"نہیں...... بستامی کو بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔" روشن بیگم نے صندل کو روکا تھا۔ "مجھے آپ سب کے ساتھ حویلی کو دیکھنا ہے۔ خاص کر گھر کی لڑکیوں کے ساتھ......"

روشن بیگم جیسی بھی تھی۔ وہ جہاں سے بھی آئی تھی لڑکیوں نے ایک بات نوٹ کی کہ اس کی شخصیت کا سحر بہت تھا۔ اس کے لہجے میں ایسا پیار ٹپکتا تھا کہ کوئی بھی اسے، اس کی بات پر انکار کر ہی نہیں سکتا تھا۔

"چلیں...... ہم آپ کو حویلی دکھاتے ہیں۔" صندل سمیت ساتوں لڑکیاں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں اور روشن بیگم کو لے کر کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔

"ایک تو ہماری لڑکیوں کی زبان بہت چلتی ہے۔" سب کے جانے کے بعد زہرہ پھوپھو نے تبصرہ کیا تھا۔

"بات اصل میں یہ ہے کہ ہم چھوٹے کو بہت ہی چھوٹا سمجھ لیتے ہیں۔ لڑکیاں اتنی ناسمجھ نہیں جتنا ہم نے انہیں سمجھ لیا ہے۔ وہ بھی سب جانتی ہیں بستام، رحبان، کومل اور ایمن کا قصہ......" چاند نے کہا تھا۔

"بہتر ہے کہ اب یہ شادیاں ہو جائیں۔ بدنامی کے تعلق سے تو شادی بہر حال بہت بہتر ہے۔"

"تم موقع دیکھ کر روشن بیگم سے بات کر لینا چاند......" تہمینہ پھوپھو نے التجا آمیز لہجے میں کہا تھا۔ "ان دونوں کا گھر بس جائے تو بہت اچھا ہو جائے۔"

"اب بات کرنے کو کیا رہ گیا ہے پھوپھو...... سب ہو تو رہا ہے۔ روشن بیگم اسی لیے تو حویلی دیکھنے آئی ہیں کہ ان کی لڑکیاں یہاں خوش رہیں گی یا نہیں...... اپنی تسلی کرنے آئی ہیں وہ...... اب خود ہی بات کر لیں گی وہ مجھ سے یا بستام سے......" چاند نے بے دلی سے کہا تھا۔

ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ روشن بیگم حویلی میں کس نیت سے آئی ہے۔

☆......☆......☆

"کیسی لگی میری حویلی؟" بستامی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا تھا۔ روشن بیگم ٹہلتے ٹہلتے رکی تھی۔

''شان دار......!''

''تو پھر بتایئے...... کیا اسے سرائے میں بدلا جا سکتا ہے؟''

''میں کچھ اور سوچ رہی ہوں بستامی......'' ساڑھی کا پلو ہاتھ میں پکڑ کر اسے لہراتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔

''کیا......؟''

''مجھے یقین نہیں ہو رہا کہ تمہارے ساتھ یہ معجزہ دوسری بار ہو رہا ہے۔ کسی کو زندگی میں ہیرے بس ایک بار ہی ملتے ہیں۔ تمہیں دوسری بار بھی مل چکے ہیں۔''

''دوسری بار کب......؟''

''جنہیں تم میرے گھر لائے تھے۔ بیچنے کے لیے......''

''تو پھر پہلی بار کب......؟''

روشن بیگم مسکرائی تھی۔ یہ ہی وہ بات تھی جسے بتانے کے لیے وہ بے چین تھی۔

''آنکھیں کھولو بستامی......! تمہارے گھر میں چھ ہیرے پہلے سے موجود ہیں اور ایک کوہ نور...... وہ تمہیں مالا مال کر سکتے ہیں۔ رات ورات امیر کر سکتے ہیں۔ تمہاری ساری پریشانیاں ختم کر سکتے ہیں۔''

''میں...... میں سمجھا نہیں...... کن ہیروں کی بات کر رہی ہیں آپ...... کون سا کوہ نور......؟''

''تمہاری تینوں پھوپھیوں کی چھ لڑکیاں...... چھ ہیرے...... اور کوہ نور...... تمہاری بہن چاند کی بیٹی...... صندل......''

روشن بیگم نے آنکھیں گھماتے ہوئے کائنات کا بڑا راز آشکار کیا تھا۔



ناول **تاش گھر** ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **1** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 10

''روشن بیگم کی تو کھانسی میں بھی کھنک تھی۔'' ان کے جانے کے بعد زارا نے تبصرہ کیا تھا۔

''اور نہیں تو کیا...... میں تو ان کی چھینک کے انتظار میں رہی...... توقع تھی کہ چھینک بھی جلترنگ ثابت ہوگی۔'' روشانے نے ادبی انداز میں گفتگو کرنا چاہی تھی۔

روشن بیگم کے رکھ رکھاؤ کو دیکھتے ہوئے وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے انہی کی طرح بولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ روشن بیگم کا تازہ تازہ اثر تھا جو روشانے اور زارا پر چڑھا ہوا تھا۔

ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر تو زارا بھی بیٹھنا چاہتی تھی، لیکن موٹی ہونے کے باعث اس کی ٹانگ بار بار نیچے کو پھسل جاتی تھی۔

''ویسے اس عمر میں اتنا رعب دار ہونا مشکل ہے۔''

''ایک ہماری حویلی کی خواتین ہیں۔ خمیرہ آٹا لگتی ہیں۔'' کرن نے آگے آئے بال جھٹکے سے پیچھے کرتے ہوئے کہا تھا۔

''شرم کرو لڑکیو......! حویلی کی خواتین کو کس سے ملا رہی ہو۔ روشن بیگم تو بائی ہیں۔ ان کا تو کام ہی بنے ٹھنے رہنا ہے۔'' حاجی بوا نے سب کو ڈانٹا تھا۔

''اور نہیں تو کیا...... ٹھیک کہہ رہی ہیں حاجی بوا...... تم بھی کس عورت کا اثر لے رہی ہو۔'' تعبیر نے بڑی اماں بنتے ہوئے کہا تھا جبکہ روشن بیگم کی موجودگی میں اس کی بہت کوشش رہی تھی کہ وہ ان سے

میک اپ کے بارے میں پوچھ لے کہ وہ میک اپ کس کس طریقے سے کرتی ہیں اور چہرے پر کیا کیا لگاتی ہیں۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ روشن بیگم صندل سے خاص متاثر ہو گئی ہیں۔ وہ تو بار بار اسے ہی دیکھتی جا رہی تھیں۔'' کرن نے حسب عادت صندل سے حسد کرتے ہوئے کہا تھا۔

''کہیں انہوں نے صندل سے رقص نہ کروانا ہو۔'' کہتے ہوئے افشیں کی ہنسی چھوٹی تھی۔

''دور فٹے منہ تمہارا افشیں......'' اور حاجی بوا کی بروقت پھٹکار پر سب ہی ہنسنے لگی تھیں۔

''ذرا تصور کرو یار......تم گھنگھرو باندھ کر ناچ رہی ہو اور لوگ تم پر پیسوں کی بارش کر رہے ہیں۔'' افشیں کو آج نجانے کیا ہو گیا تھا۔ اس کی ہنسی ہی بند نہیں ہو رہی تھی۔

''خیر سے تمہارا منہ زیادہ اچھا نہیں ہے تو کم از کم بات ہی اچھی کر لیا کرو۔''

''کیا باتیں ہو رہی ہیں؟'' بستامی بڑے کمرے کے دروازے پر ظاہر ہوا تھا۔

بستامی کو وہاں دیکھ کر سب لڑکیاں ادب کی وجہ سے خاموش ہو گئی تھیں۔

''کچھ نہیں بستامی بابا......بس روشن بیگم کے بارے میں باتیں ہو رہی تھیں۔'' تعبیر نے صاف گوئی سے کہا تھا۔

''کیا باتیں ہو رہی تھیں ان کے بارے میں؟''

''یہ ہی کہ کافی اچھی خاتون تھیں وہ......'' افشیں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا تھا۔ ویسے وہ جھوٹ بولنے کو کفر کا درجہ دیا کرتی تھی۔ بے چاری کو آج یہ کفر اس لیے کرنا پڑا کہ کہیں بستامی بابا یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ روشن بیگم کو برے الفاظ میں یاد کر رہی تھیں۔

''واقعی بہت اچھی خاتون ہیں وہ......'' بستامی نے ساری لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

اس کی نظر میں آج ایک عنصر نیا تھا۔

کمینگی کا عنصر......

وہ ساری لڑکیوں کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے غار میں بیٹھا بوڑھا شیر دنوں کا بھوکا ہو اور کسی نے اس کے غار کے سامنے سات ہرنوں کو لا کر رکھ دیا ہو۔ اور اب بوڑھا شیر سوچ رہا ہو کہ اسے کس ہرنی کو پہلے لقمہ بنانا ہے۔

لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے اسے روشن بیگم کی بات یاد آ رہی تھی۔

''تمہاری تینوں پھوپھیوں کی چھ لڑکیاں...... چھ ہیرے ہیں اور کوہ نور...... تمہاری بہن چاند کی بیٹی...... صندل......''

بستامی کی آنکھوں میں الاؤ سا روشن ہونے لگا تھا۔

چھ ہیروں کی چمک جیسے اس کی آنکھوں میں گھسی چلی جا رہی تھی۔

اور کوہ نور تو اس کی آنکھیں چندھیا رہا تھا۔

''صندل......!''

''جی بستامی بابا......''

''میرے لیے حقہ بنا دو گی تم...... سلمان کی طبیعت کچھ ناساز ہے آج۔''

''جی...... کیوں نہیں...... میں بنا کر لاتی ہوں۔'' صندل کہتے ہوئے فوراً سے اٹھی تھی۔

''میرے کمرے میں لے آنا......'' بستامی نے ایک نظر سب لڑکیوں کو دیکھا تھا اور پھر باہر نکل گیا تھا۔

''حیرت ہے...... آج بستامی بابا نے اپنا کوئی کام صندل سے کہا ہے۔'' روشانے نے دونوں کے جانے کے بعد تبصرہ کیا تھا۔

''واقعی...... ورنہ وہ تو صندل کو زیادہ منہ لگانا پسند نہیں کرتے۔''

''صندل کے حوالے سے بستامی بابا کی اتنی سرد مہری کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟'' افشیں نے پرسوچ انداز میں کہا تھا۔

''صندل کا ناجائز ہونا......'' کرن نے بے اختیار ہی کہہ دیا تھا۔

سب کزنوں نے اسے گھورا تھا۔

حاجی بوا بھی قمیص پر کڑھائی کرنا چھوڑ کر گھورتے ہوئے کرن کو دیکھنے لگی تھیں۔

کرن کو احساس ہوا تھا کہ وہ کچھ تلخ لفظ بول گئی ہے۔

''معافی چاہتی ہوں، لیکن میری نظر میں بات یہ ہی ہے۔'' کرن نے فوراً سے معافی مانگ لی تھی۔ سب کزنوں کا اس کی طرف سے دل صاف ہوگیا تھا۔

''لیکن یہ لفظ کبھی صندل کے سامنے مت بول دینا تم......'' حاجی بوا نے تنبیہی انداز میں کہا تھا۔

''صندل کو تو دکھ ہوگا ہی......ساتھ ہی ساتھ چاند کو بھی رنج ہوگا۔''

''نہیں کہوں گی......'' شرمندگی کے مارے کرن کی مدھم سی آواز برآمد ہوئی تھی۔

''چلو، اب سو جاؤ سب......رات بہت ہوگئی ہے۔''

حاجی بوا کے کہنے پر سب ہی اٹھی تھیں اور دائیں بائیں بکھرنے لگی تھیں۔

افشیں نے سب کے سامنے کمرے میں جانے کا ڈرامہ کیا تھا، اور ایک ستون کی اوٹ میں ہوکر خاموشی سے کھڑی ہوگئی تھی۔

اسے ابھی جاگنا تھا کیونکہ حویلی سے باہر عادل کے آنے کا وقت قریب آرہا تھا۔

☆......☆......☆

اور عقاب میں یہ خاصیت ہوتی ہے کہ یہ پرندہ سکھانے سے بہت جلد سیکھ جاتا ہے۔ اپنے شکار کو بہت دور سے دیکھ لیتا ہے۔ اور اسے خبر ہونے سے پہلے ہی اسے آدبوچتا ہے۔

چونے سے بنے اس ٹھوس عقاب کو دیکھتے ہوئے بستامی سوچوں میں گم تھا۔

دو عقاب مدمقابل تھے۔ایک عقاب بے جان تھا۔وہ شکار نہیں کر سکتا تھا۔اور دوسرا شکار کرنے کے لیے داؤ پیچ سیکھ رہا تھا۔وہ بھی شکار کو خبر ہونے سے پہلے ہی دبوچ لینا چاہتا تھا۔

''یہ لیں بستامی بابا......! آپ کا حقہ تیار کر کے لے آئی ہوں۔'' صندل حقہ لیے وہاں آئی تھی اور پھر حقے کو اس نے ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔

بے جان عقاب سے نظریں ہٹا کر بستامی پلٹا تھا اور گہری نظروں سے صندل کو دیکھنے لگا تھا۔

صندل کا لباس آج اس کے وجود پر کچھ تنگ سا تھا۔چاندامی کو لڑکیوں کے تنگ لباس سخت ناپسند تھے لیکن شاید دھوبی نے گرم کپڑوں کو سردی کی وجہ سے گرم پانی سے دھو دیا تھا جو وہ اسے تنگ ہو گئے تھے۔

اس کے گال جو ہمہ وقت سرخ سیب ہوئے رہتے تھے آج کچھ زیادہ ہی دہک رہے تھے۔وہ جیسے کوئلوں کی دہک کو اپنے چہرے پر سجا لائی تھی۔اس کے سیاہ بال کانوں سے گھنگھرالے ہو کر اس کے چہرے پر دو حفاظتی پہرے داروں کی طرح کھڑے تھے جیسے ڈر ہو کہ کوئی اس کے چہرے پر گستاخی نہ کر لے۔

''کس کی بیٹی ہے یہ......؟ کہاں سے آئی ہے؟ اس جیسی عورت اس شہر میں تو کبھی نہیں دیکھی...... پھر کس کی بچی ہے یہ......کون اسے ہمارے گھر کی دہلیز پر چھوڑ گیا، کوئی ہیرے کو بھی کسی اور کی دہلیز پر چھوڑ کر جاتا ہے کیا......نہیں ہیرا نہیں......کوہ نور......'' صندل کو دیکھتے ہوئے بستامی سوچنے لگا تھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہیں بستامی بابا......؟'' صندل بستامی کے خود کو ایسے دیکھنے سے کچھ جھجک سی گئی تھی۔

''یہ دیکھ رہا ہوں کہ چاند نے تمہاری کتنی اچھی تربیت کی ہے۔'' گھاک بستامی نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔''حویلی کی تمام لڑکیوں سے تم سب سے زیادہ مختلف ہو۔''

بستامی کی بات کے جواب میں صندل کے چہرے پر مسکراہٹ آئی تھی۔

یہ پہلا اتفاق تھا جب بستامی کے منہ سے اتنی اچھی باتیں سننے کا موقع ملا تھا۔

''چاند نے ہی تمہیں حویلی میں رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔تب میں نے اس کے فیصلے کی مخالفت کی تھی۔آج سوچتا ہوں کہ غلط مخالفت کی......''

بستامی کے ذومعنی انداز پر صندل نے کچھ سوالیہ انداز میں اسے دیکھا تھا۔

''تم ہی تو اس حویلی کی رونق ہو۔'' عیار سوداگر کی طرح بستامی باتیں بنانے لگا تھا۔اور صندل مسلسل مسکرائے جارہی تھی۔

''ٹھیک ہے...... جا کر سو جاؤ تم......''

''شب بخیر......!'' صندل کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

''تم شب کی بات کرتی ہو صندل...... مجھے تو لگتا ہے کہ اب سب ہی طرف ''خیر'' ہونے والی ہے۔'' بستامی کرسی پر بیٹھ گیا تھا اور حقہ گڑگڑانے لگا تھا۔

''زندہ کنی والے ہیروں کی قیمت تو تین لاکھ تھی۔ان دھڑکتے دل والوں کی کیا قیمت مل سکتی ہے؟'' بستامی سوچ بچار کرتے ہوئے جوڑ توڑ کرنے لگا تھا۔

''میرے خیال سے یہ ہیرے سمندر کے ہیروں سے کہیں زیادہ قیمتی ہیں۔روشن بیگم کی بات ماننے میں کوئی حرج نظر نہیں آرہا......'' بستامی نے خود سے فیصلہ کن انداز میں کہا تھا۔

رحبانی کے کمرے سے سنکھ کی آواز پوری قوت سے ساری حویلی میں گونجی تھی۔

رات کا وہ پہر بڑا ہی ظالم تھا۔

حقے کے دھوئیں میں شیطان جنم لینے لگے تھے۔

☆......☆......☆

ساری رات اسے یا تو نیند نہیں آسکی تھی یا اس قدر اچھی نیند آئی تھی کہ ابھی تک اس کی آنکھیں

نیند کو ہی آغوش میں لیے ہوئے تھیں۔ دن چڑھ آیا تھا اور وہ جاگتا ہوا سو رہا تھا۔ ایسا اس وقت زیادہ ہوتا ہے جب انسان کا دماغ الجھنوں میں گرفتار رہے۔ وہ بھی الجھن میں گرفتار ہو چکا تھا۔ ایک طرف صندل تھی اور ایک طرف اس کی بہن زویا کی نند تانیہ...... جس سے شادی کے لیے وہ رضامندی دے چکا تھا۔ اب اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ صندل سے محبت کرنا چھوڑ دے یا اپنی بہن زویا کو انکار کر دے۔

سالوں کے بعد زویا ماں بننے والی تھی۔ ایسے میں میرزاد کی کوئی بھی بات اسے ٹینشن دے کر کسی ٹینشن کا باعث بن سکتی تھی۔ زویا کے معاملے میں وہ کوئی بے احتیاطی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''میر......! اٹھ جاؤ میر......! دن چڑھ آیا ہے باہر......'' زویا اس کا نام پکارتے ہوئے کمرے میں آئی تھی۔

اس نے دیکھا کہ میر ابھی تک بیڈ پر اوندھا لیٹا ہے تو اس نے آگے بڑھ کر کھڑکی کے پردے پیچھے کر دیے تھے۔ پردے پیچھے ہوتے ہی حویلیاں شہر کی سردی کے ساتھ ہم آغوش ہوتی دھوپ کمرے میں اتری تھی۔ یہ دھوپ اونٹ کی کھال سے بنے لیمپ کی طرح کی تھی۔ جس کے جلنے اور بند ہونے میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔

''اٹھ جاؤ...... کیا ہو گیا ہے تمہیں ...... تم اتنا تو کبھی نہیں سوتے۔'' زویا نے اسے پشت سے جھنجھوڑا تھا۔

''جی...... اٹھ چکا ہوں۔'' کسلمندی سے اٹھتے ہوئے اس نے تکیے کے ساتھ پڑی شرٹ کو اپنے وجود پر چڑھایا تھا اور پھر بیڈ کی پشت سے کمر ٹکا کر بیٹھ گیا۔

''ابھی میری زوہیب سے بات ہوئی ہے۔'' زویا نے کچھ چہکتے ہوئے بتایا تھا۔ زویا کے خوش گوار انداز پر میرزاد نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''وہ کہہ رہے ہیں کہ بچے کی پیدائش کے بعد تمہاری اور تانیہ کی دھوم دھام سے منگنی کریں گے۔

پھر جب تم دونوں چاہو شادی کر دیں گے۔'' زویا نے سوئے دماغ والے میرزاد پر زوردار دھما کا کیا تھا۔

وہ جواب میں کچھ بول ہی نہیں پایا تھا۔

''ٹھیک ہے ناں......؟''

''جی ٹھیک ہے۔''اس کی آواز بجھی ہوئی تھی۔اس میں نیند کا اثر نہیں تھا۔

''دیکھنا، میں تمہاری شادی کس قدر دھوم دھام سے کرتی ہوں، ایک ہی تو بھائی ہو تم میرے......میں کسی چیز میں کوئی کمی نہیں آنے دوں گی۔''

میرزاد نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔

اس کے پاس جیسے الفاظ ختم ہو گئے تھے اور اپنی شادی کی بات پر، مسکراہٹ بھی......

''تم صندل کو بھی بلانا اپنی شادی پر۔''

میرزاد نے چونک کر زویا کی طرف دیکھا تھا۔

نجانے کیوں اسے ایسا لگا تھا کہ جیسے زویا نے اس پر چوٹ کی ہے۔

''بلکہ صندل کی ساری فیملی کو بلائیں گے ہم......''

''آپ ابھی صندل سے اس بارے میں کوئی بات مت کیجیے گا۔'' وہ بیڈ پر سے اٹھتے ہوئے بولا تھا۔

''کیوں......؟''

''اسے میں اپنی شادی کا سرپرائز دینا چاہتا ہوں۔''

میرزاد نے بھونڈا جواز گھڑا تھا اور پھر واش روم میں چلا گیا تھا۔

اس کے جاتے ہی زویا کے چہرے کے تاثرات بدلے تھے۔اب وہاں ایک منفی مسکراہٹ نظر آ رہی تھی۔

''تمہیں میں بہت اچھے سے جانتی ہوں میر......! مجھ سے کچھ نہیں چھپا سکتے ہو تم......'' اس نے

خود سے کہا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے اور کس وقت کرنا ہے۔

☆......☆......☆

روشن بیگم کے پاس دیس بدیس سے آئے نت نئے تحفوں کا ڈھیر لگا رہتا تھا۔ جو اس کے چاہنے والے اسے گاہے بگاہے دیتے رہتے تھے۔ دھاتی ظروف، پتھر سے تراشے ہوئے جانور، لکڑی کے آرائشی ٹکڑے، قیمتی پتھروں سے سجے فنجان...... کتنے کو تو استعمال کرنے کی باری ہی نہیں آتی تھی۔

لیکن ایسا نہیں تھا کہ وہ تحفے اس کی نظر میں بے توقیر ہوتے تھے۔ وہ سب کو دل و جان سے سنبھال کر رکھا کرتی تھی۔ خواہ مدتوں کوئی چیز نظروں سے اوجھل ہی کیوں نہ رہی ہو، اسے یاد رہتا تھا کہ وہ کب اس کے کوٹھے پر آئی تھی اور اسے کون لایا تھا۔

وہ چیزوں کو خاص اہتمام سے استعمال کرنے کی عادی تھی۔

جیسے خالص مروارید کی تسبیح پر اس نے تب خدا کا نام پکارا تھا جب اس کے کوٹھے کے حالات بہت خراب جا رہے تھے۔

سعودیہ سے آئی جائے نماز پر اس نے تب شکرانے کے نفل ادا کیے تھے جب اس نے اپنی پہلی بچی کو جنم دیا تھا۔

اور آج شیشے کی شطرنج کو اس نے تب نکالا تھا جب وہ بستامی کے ساتھ ایک نئی چال چلنا چاہتی تھی۔

''پھر کیا سوچا ہے تم نے بستامی؟'' روشن بیگم نے شیشے کی شطرنج پر پیادے کو ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے اپنے سامنے سر جھکائے خاموش بیٹھے بستامی سے پوچھا۔

''آپ کی بات مان لینے میں کوئی حرج نظر نہیں آ رہا۔''

''تو پھر مان کیوں نہیں لیتے ہو۔ تمہیں معاشی پریشانیوں سے نکالنے کے لیے میں نے بہت

مناسب حل بتایا ہے۔" روشن بیگم شاید اپنے لحاظ سے ٹھیک ہی بات کر رہی تھی۔ وہ بری نہیں تھی۔ اس کی پرورش ہی اس طرح سے ہوئی تھی کہ اسے اپنی سوچ سے دوسروں کی زندگی چلانے میں کوئی برائی نظر نہیں آتی تھی۔

"گھر کے افراد پر رعب جمانا مشکل نظر آ رہا ہے۔"

"یہ کیا بات کر رہے ہو بستامی...... مجھے تم سے اس بات کی توقع نہیں تھی۔" روشن بیگم نے کہا تو بستامی کو خود بخود ہی اپنے آپ پر شرمندگی محسوس ہوئی تھی۔

"آج وہ لوگ جس گھر میں رہ رہے ہیں وہ تمہارا ہے۔ جو کھا رہے ہیں وہ بھی تمہارا ہے۔ پھر تمہارا رعب کیسے نہیں چلے گا ان پر۔" روشن بیگم نے کہا تو بستامی کو اپنی حیثیت کا جیسے اندازہ ہوا تھا۔

"کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں۔" اس کا سینہ خود بخود تن گیا تھا۔

"پھر میری بات مان لو...... جیسا میں کہتی ہوں ویسا ہی کرو...... دیکھنا...... دنوں میں تمہارے حالات بدل جائیں گے۔ مالا مال ہو جاؤ گے تم...... دولت سنبھالے نہیں سنبھلے گی۔"

"کیا کرنا ہوگا مجھے......؟"

"وہ تم مجھ پر چھوڑ دو...... میں تمہاری ایک ایک انچ پر رہنمائی کروں گی۔ تمہیں اس مشکل گھڑی میں بالکل تنہا نہیں چھوڑوں گی۔"

اور سالوں کے تعلق کے بعد بستامی کو روشن بیگم پر اتنا اعتماد تو تھا ہی......

"ٹھیک ہے، جیسا آپ کہیں......" چند لمحے سوچ لینے کے بعد بستامی نے رضامندی دے دی تھی۔

روشن بیگم کے چہرے پر مسکراہٹ آئی تھی۔

"یہ ہوئی ناں بات......" اس نے ایسے کہا تھا جیسے شطرنج کی بازی بیچ راستے میں ہی جیت گئی ہو۔ چار ہیروں کا کمیشن اس نے بستامی سے ٹھیک ٹھاک لیا تھا۔ اب تو سات ہیروں کی سودا بازی کی

باری تھی۔ ان کا کمیشن تو روشن بیگم کے کوٹھے کو بھی سب میں ممتاز کر سکتا تھا۔

”پلان کیا ہے؟“

”میرے خیال سے پہلا نمبر تمہاری بڑی پھوپھی کی بڑی بیٹی کا ٹھیک رہے گا۔ کیا نام ہے اس کا......؟“

”افشیں......“

”ہاں......افشیں......اس کے لیے لاہور کے ایک نواب ہیں میری نظر میں......جاگیروں کے مالک ہیں، سرگودھا میں اپنے باغات ہیں۔ دولت سے تجوریاں بھر دیں گے تمہاری۔“

”کیسے ہوگا سب......؟“

”میرے ہوتے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے بستامی......میں تمہیں سمجھاؤں گی کہ کیسے ہوگا سب......تم بالکل فکر ہی مت کرو۔“

”آپ ساتھ ہیں تو پھر مجھے فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“ بستامی نے ایک طرح سے ہر طرح کی رضامندی دے دی تھی۔

☆......☆......☆

افشیں کے دل کو کہیں قرار نہیں آ رہا تھا۔ پورا ایک ہفتہ ہو گیا تھا اسے عادل سے ملے ہوئے۔ عادل شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ اپنی ماں کے علاج کے لیے......جاتے وقت اس نے کہا تھا کہ وہ دو تین دن میں ہی واپس آ جائے گا لیکن نجانے کیا بات ہوئی تھی کہ اسے ایک ہفتہ ہونے کو آیا تھا لیکن اس کے آنے کی کوئی خبر نہیں تھی۔

افشیں کا دل گھبرانے لگا تھا۔ اس کی آنکھیں عادل کو دیکھنے کے لیے بے چین ہو چکی تھیں۔ رات کے خاموش پہر میں عادل کی آمد کا اشارہ دینے والی اس بانسری کی آواز کو سننے کو اس کے کان ترس چکے

تھے۔ان دنوں میں اس نے عادل کے لیے بہت سے خط لکھ لیے تھے۔وہ غسل خانے میں چھپ کر اور رات کے اندھیرے میں عادل کے لیے خط لکھا کرتی تھی۔ ان خطوط کا لب لباب زیادہ کچھ نہیں تھا ماسوائے اس کے کہ وہ اس کو کتنا یاد کر رہی ہے اور اس کے بنا یہ دن کیسی اذیت میں گزار رہی ہے۔

وہ پہروں چھت پر ٹہلتی رہتی تھی یا جھرونکے میں بیٹھی رہتی تھی۔ان دنوں اس کا کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔تہمینہ پھوپھو کو اس کے بدلے مزاج پر شک ہوا تھا لیکن پھر انہوں نے خود ہی اسے افشیں کی ذہنی عمر میں سنجیدگی کے ساتھ جوڑ لیا تھا۔باقی کزنز ان دنوں بازاروں میں گئی تھیں اور وہ ہنس بول بھی رہی تھیں۔سردیوں کے کھیل کھیل رہی تھیں۔لیکن وہ نہ تو ان کے ساتھ گھر سے باہر نکلی تھی اور نہ ہی ان کے ہنسی مذاق یا کسی کھیل میں شریک ہوئی تھی۔

رفتہ رفتہ صندل کے توسط سے سب کو پتا چل گیا تھا کہ محترمہ عشق کی آگ میں جل رہی ہیں۔سب نے افشیں کے گرد گھیرا تنگ کیا تھا۔اس پر سوالوں کی بارش کر دی تھی لیکن عادل کی غیر موجودگی کو افشیں نے کچھ اس طرح دل پر لگایا ہوا تھا کہ وہ ان کے کسی سوال کا ٹھیک سے جواب نہیں دے پائی تھی۔

نجانے کیوں ایک وسوسہ اسے تنگ کر رہا تھا کہ اب وہ کبھی عادل کو نہیں دیکھ پائے گی۔اسی وسوسے کے تحت اس کی راتوں کی نینداور دن کا چین غارت ہو چکا تھا۔

''افشیں......!یہاں کیا کر رہی ہو؟''

بسطامی نجانے کب وہاں چلا آیا تھا۔اس نے جھرونکے میں خاموش بیٹھی افشیں کو سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''ویسے ہی......کرنے کو کوئی کام نہیں تھا تو یہاں آ کر بیٹھ گئی۔''

''کرنے کو کوئی کام کیوں نہیں تھا؟'' افشیں کے قریب ہوتے ہوئے اس نے سرسری انداز میں پوچھا تھا۔

افشیں آگے سے مسکرادی تھی۔

''ویسے اب تمہاری شادی کی عمر ہو چکی ہے۔ میرے خیال سے تمہاری شادی کر دینی چاہیے۔'' مسکراتے ہوئے بستامی نے کہا تھا۔

افشیں کے چہرے کے رنگ بدلے تھے۔ اس سے کچھ بھی بولا نہیں گیا تھا۔

بستامی چند لمحے اسے گھورتا رہا تھا۔ وہ اسے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے سنیار سونے کی پرکھ کرتے ہوئے اس کی قیمت کا تعین کرتا ہے۔

بستامی بھی تعین کر رہا تھا کہ یہ ''مال'' کتنی مالیت کا ہے۔ اسے کتنا امیر کر سکتا ہے۔ روشن بیگم نے کہا تو تھا کہ افشیں کی بہت اچھی قیمت مل سکتی ہے۔ اب دیکھنا تھا کہ روشن بیگم کی بات سچ ثابت ہوتی ہے یا نہیں......

''پھوپھو کو میرے پاس بھیجو ذرا۔''

''جی بہتر......!'' افشیں کہہ کر فوراً ہی سے اپنی ماں کو بلانے ان کے کمرے کی طرف گئی تھی۔

بستامی نے مونچھوں کو تاؤ دیا تھا اور پھر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا تھا۔

☆......☆......☆

''ہاں بستامی......! تم نے بلایا؟''

''جی پھوپھو...... بیٹھیے میرے سامنے، کچھ ضروری بات کرنی ہے۔'' بستامی نے اتنے ادب سے کہا تھا کہ تہمینہ پھوپھو تو لمحے بھر کے لیے حیران ہی رہ گئی تھیں۔ حیرت چھپاتے ہوئے وہ اس کے سامنے بیٹھی تھیں۔

''افشیں اب بڑی ہو چکی ہے۔ اس کے بیاہ کو لے کر کیا سوچا ہے آپ نے......؟''

''میں تو خود بہت فکر مند ہوں بستامی...... ایک دو رشتے کروانے والیوں سے کہا ہوا ہے۔

دیکھو...... کیا بنتا ہے۔"

"میرے پاس افشیں کے لیے ایک رشتہ ہے۔ لاہور سے ہے۔ نواب خاندان ہے۔ ہجرت کر کے یہاں آئے ہیں۔ بہت بڑی کوٹھی ہے لاہور میں ان کی...... ہماری حویلی تو ان کی کوٹھی کے آگے کچھ بھی نہیں ہے۔ مال دار اتنے ہیں کہ کیا بتاؤں۔" بستامی نے جو بتایا تھا سب سچ بتایا تھا۔

بس یہ سچ چھپا لیا تھا کہ نواب افشیں سے چالیس سال بڑا ہے اور اپنے چھ بچوں کی شادی کر دینے کے بعد نواسے نواسیوں اور پوتے پوتیوں والا ہے۔

"اگر وہ اتنے ہی مال دار ہیں جتنا تم بتا رہے ہو تو تمہیں لگتا ہے کہ وہ ہم لوگوں سے رشتے داری جوڑ لیں گے؟"

"وہ سب آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ منڈی کے توسط سے جانتے ہیں وہ ہمارے گھرانے کو...... میں نواب سے مل بھی چکا ہوں۔ ٹھہری ہوئی طبیعت کا مالک ہے۔ ہماری افشیں خوش رہے گی وہاں......"

"ٹھیک ہے بستامی...... اگر تمہاری تسلی ہے تو بلا لو انہیں گھر...... افشیں کی شادی ایسے گھر میں ہو جائے، میں اس کے علاوہ اور کیا چاہوں گی۔" تہمینہ پھوپھو نے خوش ہوتے ہوئے کہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ میں آج ہی پیغام بھجوا دیتا ہوں۔" بستامی نے کہتے ہوئے فوراً سے سلمان کو کمرے میں بلایا تھا۔

تہمینہ پھوپھو اٹھ کر کمرے سے باہر آ گئی تھیں۔ انہیں خوشی کے ساتھ ساتھ حیرت بھی ہو رہی تھی۔ بھلا بستامی نے کب گھر کے کاموں میں دلچسپی لینا شروع کر دی اور وہ بھی خالصتاً عورتوں کے کاموں میں......

اندر کمرے میں بستامی سلمان کو کچھ ہدایات دیتا ہوا مسکرا رہا تھا۔

☆......☆......☆

اونٹ کے کھال کے لیمپ والی صبح اس دن کچھ زیادہ ہی بے رس تھی۔ سردیاں جوں جوں قریب آ رہی تھیں، دھوپ جیسے حویلیاں شہر سے روٹھتے ہوئے دور جا رہی تھی۔

دہرے لحاف میں لپٹی ہوئی صندل کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ ساری رات اسے ٹھیک سے نیند نہیں آ سکی تھی۔ جس قدر مشق اس نے کل شام میں استاد صاحب کے ساتھ مل کر ستار کی کی تھی اسے لگا تھا کہ رات میں ستار کی یہ ہی دھنیں اس کے دماغ میں گونجتی رہیں گی اور اسے سونے نہیں دیں گی۔ لیکن اس کے برعکس اس کے دماغ پر کوئی اور ہی چیز ہتھوڑے مارتی رہی تھی۔

''دجال آنے والا ہے۔ کالی کوئل کے گھر سفید بچہ پیدا ہوا ہے۔'' آواز کے ساتھ ساتھ اس کے خواب میں وہ بوڑھی پاگل عورت بھی آئی تھی جس سے اس دن اس کی بازار میں مڈبھیڑ ہوئی تھی۔

''میں نے کہیں منہ کالا نہیں کیا...... کالا نہ کیا، منہ کالا کرنا ہے۔'' بوڑھی دہائی دیتے ہوئے جیسے اس کے سرہانے بیٹھی چلا رہی تھی۔ کبھی وہ رونے لگتی تھی، کبھی پاگلوں والی ہنسی ہنسنے لگتی تھی۔

یہ اسی سب کا اثر تھا کہ صبح میں اٹھتے اٹھتے اسے کافی دیر ہو چکی تھی۔ باہر دن نکل آیا تھا۔ اگرچہ بے رس ہی سہی......

''آج تم نے اٹھنے میں بہت دیر کر دی صندل......!'' چانداس کے سامنے کرسی پر بیٹھی اون اور سلائیوں سے کچھ بنا رہی تھی۔ اون کی سلائیاں تیز تیز چل رہی تھیں۔ وہ کافی دنوں سے یہ کام کر رہی تھی۔

صندل جانتی تھی کہ یقیناً چانداسی کے لیے کچھ بنا رہی ہو گی۔ سردیاں آتے ہی اس کے ایسے کام شروع ہو جاتے تھے۔

''ساری رات کچھ آوازیں مجھے تنگ کرتی رہی ہیں۔''

''کیسی آوازیں......؟'' وہ سلائیاں چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

''شاید کوئی پاگل خاتون ہیں۔ عجیب و غریب باتیں کرتی ہیں۔''

''کچھ تو بتاؤ......''

''دجال آنے والا ہے۔ کالی کوئل کے گھر سفید بچہ پیدا ہوا ہے۔ یہ بچہ میرا ہے۔ وغیرہ وغیرہ......''

''میرے خیال سے تم آمنہ کی بات کر رہی ہو۔''

''آپ جانتی ہیں انہیں......؟'' چونکتے ہوئے وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

''ہاں...... جانتی ہوں لیکن زیادہ نہیں۔ وہ اسی شہر کی عورت ہے۔ جوانی میں کچھ ہوا تھا اس کے ساتھ، تب ہی سے اس کے ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ زیادہ تر پیدل ہی ہوتی ہے وہ، اور اسی طرح شہر شہر گھوما کرتی ہے۔ میرے خیال سے میں نے چھ سال کے بعد کل رات اس کی آواز سنی ہے۔ لگتا ہے کہ وہ چھ سال کے بعد اپنے شہر واپس آئی ہے۔''

''کیا ہوا ہوگا اس کے ساتھ چاند امی......؟'' صندل نے ہمدردی سے پوچھا تھا۔

''کچھ کہہ نہیں سکتی۔ میں نے ایک دو بار پوچھنے کی کوشش کی تھی لیکن آمنہ بہت بے ربط باتیں کرنے لگی۔ مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آئی اس کی بات...... اس لیے کچھ نہیں جانتی کہ کیا ہوا ہوگا بے چاری کے ساتھ...... ہاں اتنا ضرور پتا ہے کہ اس کا جوانی میں ارشادی کے ساتھ بہت گھومنا پھرنا تھا۔''

''ارشادی بابا...... جن کی بازار میں دکان ہے؟ جو ماتھے پڑھ کر تقدیر بتاتے ہیں۔''

صندل اچھل کر بیڈ سے اتری تھی۔ اس نے جس انداز میں کہا تھا۔ چاند نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

''تم کیسے جانتی ہو کہ وہ ماتھے پڑھتا ہے؟''

''وہ...... ان کی دکان کے باہر لکھا ہوا ہے۔''

''دکان کے باہر ہاتھ پڑھوانے کا لکھا ہے۔ ماتھے والی بات وہی جانتے ہیں جو دکان کے اندر جاتے ہیں۔''

صندل چپ ہو گئی تھی۔ چاند اسے گھورنے لگی تھی۔

''تم گئی تھیں وہاں......؟''

''نہیں......دوست سے سنا تھا۔'' چاند کے غصے کے ڈر کی وجہ سے اس نے صاف جھوٹ بول دیا تھا۔

''جانا بھی مت...... مجھے ایسے کام سخت ناپسند ہیں۔ تقدیر کے حوالے سے بس خدا کی ذات پر یقین رکھنا چاہیے۔''

''جی......!'' وہ واقعی ہی میں شرمندہ ہوئی تھی۔

ارشادی بابا کے پاس جانے پر تو وہ تب سے خود کو ملامت کر رہی تھی کہ وہ وہاں گئی ہی کیوں......

''بعض لوگوں کے ساتھ زندگی کس قدر برا کرتی ہے ناں چاند امی......''

''ہاں......بعض لوگوں کے ساتھ زندگی واقعی ہی بہت برا کرتی ہے۔'' چاند نے گہرا سانس بھرتے ہوئے کہا تھا۔

یہ انداز ایسا تھا جیسے انہیں اپنی زندگی کے دکھ یاد آ گئے ہوں۔ دونوں میں چند لمحوں کی خاموشی آئی تھی۔ پھر چاند نے ہاتھ میں پکڑی چیز اٹھاتے ہوئے اسے دکھائی تھی۔

''لو...... یہ تو بن گیا۔''

صندل نے دیکھا کہ وہ کسی نومولود بچے کا اونی لباس تھا۔ جبکہ وہ تو سمجھ رہی تھی کہ چاند اس کے لیے کچھ بنا رہی ہے۔

''یہ کس کے لیے ہے؟''

''زویا کے ہونے والے بچے کے لیے......''

''کیا سچ میں؟'' چہکتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

اسے ایسا ہی لگا تھا جیسے چاند واقعی ہی میں اس کے لیے کچھ بناتی رہی ہے۔

''ہاں......زویا کی والدہ نہیں ہیں ناں......تم اسے یہ سب دے آنا، اسے اچھا لگے گا۔ بلکہ میں کچھ دیسی چیزیں بھی بنادوں گی۔ تم وہ بھی دے آنا اسے، وہ خوش ہو جائے گی۔''

''جی......کیوں نہیں......''

''اب اٹھ کر منہ ہاتھ دھولو، میں تمہارے لیے ناشتا بنواتی ہوں۔'' چاند کہتے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔

صندل اٹھی تھی۔ کمرے سے باہر گئی تھی۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا تھا اور پھر کپڑے تبدیل کیے تھے۔ اس سب کے دوران وہ جس قدر بوڑھی آمنہ کی آوازوں کو ذہن سے جھٹلاتی رہی وہ اتنا ہی اس کے ساتھ ساتھ رہی تھیں۔

☆......☆......☆

حویلی کے دالانوں میں گرد ڈیرے ڈال چکی تھی۔ مدتیں گزریں وہاں کسی کے قدم نہیں پڑے تھے۔ بوڑھی چاند بی بی کے جسم میں اتنی سکت نہیں ہوتی تھی کہ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کے حصوں کی دیکھ بھال کرے۔ وہاں جھاڑو پونچھا لگائے۔ اس لیے حویلی کے بہت سے حصے اب مخدوش حالت میں تھے۔ زنگ والی جگہوں پر مزید زنگ چڑھ چکا تھا۔ دیمک اور زیادہ راجدھانی قائم کر چکی تھی۔ کھڑکیاں، دروازے اپنی اپنی جگہ چھوڑنے کو تیار تھے۔ ایک چیز میں بدلاؤ نہیں آیا تھا اور وہ تھی درگا مورتی کی سیاہ آنکھیں......جو کہ سالوں گزر جانے کے بعد کچھ مزید سیاہ دکھنے لگی تھیں۔

''دجال آنے والا ہے۔ وہ سب کو مار دے گا۔'' بوڑھی آمنہ حویلی کے ستون سے سر ٹکائے بڑبڑا رہی تھی۔ سالوں گزرے اس نے چلانا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ کسی حد تک پاگل نہیں رہی تھی بلکہ باشعور ہو چکی تھی۔ لیکن کسی کسی وقت اسے ماضی یاد آجاتا تھا۔ تب وہ ایسے ہی بڑبڑایا کرتی تھی۔

آمنہ کا ماضی بہت تلخ تھا۔ اور اس تلخی کی شروعات ارشادی سے ہوتی تھی۔ اس کے خوب صورت

اور خوش شکل محبوب سے...... جسے وہ پہروں دیکھا کرتی تھی۔ تب بڑے شہر سے پڑھ کر آئے ارشادی کے سر پر ہر وقت جادو کا بھوت سوار رہتا تھا۔ اسے لوگوں کے ہاتھ پڑھنے کا علم جاننا تھا۔ اسے لوگوں کے ماتھے پڑھنے تھے۔ غائب کے بارے میں جستجو رہتی تھی اسے۔ کاش وہ ایک بار آمنہ کا ہاتھ بھی پڑھ لیتا۔ تو جان جاتا کہ آمنہ کی زندگی اسی کے کارن کیسی دردناک گزرنے والی ہے۔

بوڑھی چاندنی بی نے چنگیر میں روٹی اور سالن کی پلیٹ بوڑھی آمنہ کے سامنے رکھی تھی۔

''کھانا کھالیں۔''

ایک بوڑھی دوسری بوڑھی کو گھورنے لگی تھی۔

''میں نے کہیں منہ کالا نہیں کیا تھا۔''

''جانتی ہوں، آپ کھانا کھالیں۔'' بوڑھی چاندنی بی نے پیار سے کہا تھا۔

یہ اسی کے پیار کا اثر تھا کہ بوڑھی آمنہ نے سالوں سے حویلی میں قیام کیا ہوا تھا۔ وہ اب چاندنی بی کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ شہر شہر کی خاک چھاننا اس نے چھوڑ دیا تھا۔

''کالا شخص مزید کیا منہ کالا کرے گا۔'' بوڑھی کی آنکھیں پانی سے بھر گئی تھیں۔ ''مجھ پر الزام لگایا گیا تھا۔ وہ بچہ ناجائز نہیں تھا۔''

''جو ہونا تھا ہو چکا ہے۔ آپ کھانا کھالیں۔'' چاندنی بی نے پیار سے کہا تھا۔

بوڑھی آمنہ مسکین صورت لیے کھانا کھانے لگی تھی۔

اجڑ چکی حویلی میں بس دو افراد رہائش پذیر تھے۔ ایک چاندنی بی اور دوسری آمنہ بی بی......

تیسرا تھا سانپ...... جو کسی گھس بیٹھیے کی طرح حویلی میں آ گھسا تھا اور اب جانے کا نام نہ لے رہا تھا۔

سیاہ کھال پر پیلی چتیوں والا وہ موٹا سانپ زیادہ تر وقت درگا مورتی کے پاؤں سے لپٹا رہتا تھا۔

☆......☆......☆

چاندامی کے بنائے چھوٹے چھوٹے سوئٹر، موزے اور ٹوپیاں دیکھ کر زویا بہت خوش ہوئی تھی۔

''کیا یہ سب چاندامی نے بنایا ہے؟'' وہ خوش ہوئی تھی، بہت زیادہ خوش......

''جی......! یہ سب انہوں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔''

''مجھے یقین نہیں آرہا۔''

''وہ اس سب میں بہت ماہر ہیں۔ اکثر وہ میرے لیے بھی سوئٹر وغیرہ بنادیتی ہیں۔''

''سب بہت پیارا ہے۔ انہیں میری طرف سے شکریہ بولنا۔'' زویا کو سب واقعی ہی میں بہت پسند آیا تھا۔ واحد چاند تھیں جن کو لے کر اس کے دل میں کچھ منفی سوچ نہیں تھی۔

''شکریہ کی کوئی ضرورت نہیں ...... وہ تو کہہ رہی تھیں کہ جب ولادت کے دن قریب آجائیں گے تو وہ آپ کو کچھ دیسی کھانے بھی بنادیں گی۔ جو ماں اور بچے کی صحت کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔''

''ارے......ان سے کہنا کہ اتنا تکلف مت کریں۔''

''تکلف کیسا......انہیں یہ سب کر کے خوشی ہوگی۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ آپ کی والدہ نہیں ہیں تو اس لیے آپ کو اس شہر میں اپنی والدہ کی کمی محسوس نہیں ہونے دوں گی۔''

صندل کی بات پر خوشی یا شکر کی وجہ سے زویا کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

''تمہاری والدہ واقعی ہی میں بہت اچھی ہیں صندل...... یقین کرو میرا بھی ان کو چاندامی کہنے کو ہی دل کرتا ہے۔''

''آپ کہہ لیا کریں، انہیں خوشی ہوگی۔''

''کیا باتیں ہو رہی ہیں؟'' میر زادو ہاں آیا تھا۔ صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

اس نے بلیو جینز پر وائٹ ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ سردی ہونے کے باوجود اس نے کوئی جیکٹ یا سوئٹر نہیں پہنا ہوا تھا۔ اس کے کسرتی بازو اس کی آستینوں سے نمایاں تھے۔ جو اس کے بھرپور جوان

ہونے کی چغلی کھا رہے تھے۔اسے دیکھتے ہوئے صندل کی آنکھوں کو جیسے قرار آ گیا تھا۔وہ کب سے وہاں میر زاد کو ہی تو ڈھونڈ رہی تھی۔

''کچھ نہیں......بس ادھر ادھر کی باتیں......'' زویا نے جلدی جلدی صندل کی لائی چیزوں کو سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔چھوٹے بچے کے سوئٹر، موزے اور ٹوپیاں دیکھتے ہوئے ایک دم سے ہی اسے شرم کا احساس ہوا تھا۔جبکہ وہ خود میر زاد کے سامنے ہونے والے بچے کے لیے چیزیں بنتی رہتی تھی۔

''یہ لو صندل......! یہ میں تمہارے لیے لایا ہوں۔'' میر زاد نے اپنی پینٹ کی پاکٹ سے ایک چھوٹا سا خاکی لفافہ نکالتے ہوئے اس کے سامنے کیا تھا۔

''کیا ہے اس میں؟'' صندل کے بجائے زویا نے تجسس سے پوچھا تھا۔

''کھول کر دیکھو صندل......''

صندل نے لفافہ کھولا تھا۔اندر سے پازیبیں نکلی تھیں۔جنہیں دیکھ کر صندل کے چہرے پر مسکراہٹ آئی تھی۔

''تم اس دن انہیں تلاش کر رہی تھی ناں......مجھے نظر آئیں تو میں نے انہیں تمہارے لیے خرید لیا۔''

''بہت شکریہ یہ تمہارا......''

''تمہیں پسند آئیں......؟''

''بہت زیادہ......''

جواباً میر زاد کے چہرے پر مسکراہٹ آئی تھی اور میر زاد کو دیکھتے ہوئے صندل بھی مسکرا رہی تھی۔ زویا دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

''تمہاری پسند اچھی ہے میر......!''

''میر اسے صرف میں کہتی ہوں صندل......!'' زویا نے تنک کر کہا تھا۔

اس کے انداز پر صندل نے کچھ حیرت سے زویا کو دیکھا تھا۔اس کے چہرے پر لمحہ بھر پہلے والی خوشی غارت ہو چکی تھی۔اسے میر زاد اور صندل کا سارا سین بری طرح سے ناپسند آیا تھا۔

صندل تو چپ ہو کر رہ گئی تھی۔

''اور تم بتاؤ میر......تم کیا صندل کے ساتھ بازاروں میں گھومتے رہے ہو؟''اب کے زویا نے میر زاد سے پوچھا تھا۔

میر زاد لمحے بھر کو گڑ بڑایا تھا۔

''وہ......اس دن اتفاقیہ طور پر ملے تھے ہم۔''

''میرے خیال سے تمہیں اپنی تعلیم پر توجہ دینی چاہیے۔''

''جی......!''

''اور صندل تم......اپنی والدہ کو میری طرف سے شکریہ کہنا......اور انہیں کہنا کہ مزید کوئی تکلف نہ کریں۔''

''جی......!''صندل کہتے ہوئے اٹھی تھی کیونکہ زویا کے سپاٹ سے انداز نے جیسے اسے اب وہاں سے چلے جانے کا ہی اشارہ دیا تھا۔

صندل کے وہاں سے جاتے ہی زویا بھی اٹھی تھی۔

''میں سونے جا رہی ہوں،کوئی مجھے ڈسٹرب نہ کرے۔''

زویا بھی وہاں سے چلی گئی تھی۔میر زاد ایسے چپ بیٹھا تھا جیسے زندگی بھر اس نے کوئی لفظ نہ بولا ہو۔

☆......☆......☆

جب سے افشیں کو پتا چلا تھا کہ اسے دیکھنے لاہور کی کوئی نواب فیملی آنے والی ہے،اسے تیز بخار چڑھ گیا تھا۔جبکہ کزنیں اس کی قسمت پر رشک کر رہی تھیں۔

''پاگل...... اتنی بڑی کوٹھی ہے ان کی لاہور میں...... اپنے باغات ہیں۔لڑکیاں تو خواب دیکھتی ہیں اس سب کے لیے...... تم نے خود کو بخار چڑھا لیا ہے۔گولی مارو عادل کو...... اور اس رشتے کو قبول کرلو۔''

سوائے صندل کے سب نے ہی اسے سمجھایا تھا۔

''میں مرجاؤں گی صندل...... میں عادل کے بنا نہیں رہ سکتی۔'' افشیں نے اس کے آگے دہائی دی تھی۔وہ تو جیسے بس مرجانے کے قریب تھی۔

''میں سمجھ سکتی ہوں افشیں...... لیکن میں کیا کروں؟'' وہ بے بس تھی۔

''تم ہی کچھ کرسکتی ہو صندل...... میں زہر کھالوں گی اگر میری شادی عادل سے نہ ہوئی تو......''

''عادل ہے کہاں، وہ گھر کیوں نہیں آرہا؟''

''وہ اپنی بیمار ماں کو لے کر شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔اس سے کوئی رابطہ نہیں ہے میرا۔''

''تم کہو تو تہمینہ پھوپھو سے بات کروں؟''

''کرسکتی ہو تو کرلو۔''

''تمہاری خاطر کچھ بھی کرسکتی ہوں میری جان...... تم فکر مت کرو۔''

تہمینہ پھوپھو آج آنے والے مہمانوں کی تیاری کررہی تھیں۔وہ کھانے کا انتظام دیکھ رہی تھیں جب صندل ان کے پاس پہنچی تھی۔

''آپ سے دو منٹ بات ہوسکتی ہے تہمینہ پھوپھو؟''

''ہاں...... بولو صندل......!''

''یہاں نہیں، کمرے میں۔''

صندل کے انداز پر تہمینہ پھوپھو چونکی تھیں۔لیکن انہوں نے مزید کوئی سوال نہیں پوچھا تھا۔ صندل کے پیچھے پیچھے وہ کمرے میں آئی تھیں۔

''ہاں......کیا بات ہے؟''

صندل چند لمحے لفظوں کے ساتھ جوڑ توڑ کرتی رہی تھی پھر اس نے مناسب الفاظ میں بتایا تھا کہ افشیں کسی لڑکے کو پسند کرتی ہے۔

''کون ہے وہ......؟'' تہمینہ پھوپھو نے ناگوار انداز میں پوچھا تھا۔

''میں نے دیکھا ہوا ہے اسے...... پیارا لڑکا ہے۔ گھر ہماری حویلی جتنا بڑا تو نہیں ہے لیکن کافی بڑا ہے۔''

تہمینہ پھوپھو کے چہرے پر پھیلی ناگواری جانے کا نام نہ لیتی تھی۔

''اس میں اپنی بیٹی کی خوشی سمجھ لیں تہمینہ پھوپھو......'' صندل نے اتنے پیار سے کہا تھا کہ تہمینہ کو نرم ہونا پڑا تھا۔

''یہ بات افشیں کو پہلے بتا دینا چاہیے تھی۔''

''اس میں یہ سب بتانے کی ہمت نہیں تھی۔''

''میں بستامی کو کیا کہوں گی؟''

''مناسب لفظوں میں انکار کر دیجیے گا۔''

''اچھا...... دیکھتی ہوں کہ کیا کر سکتی ہوں۔ سب اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم کہہ رہی ہو۔'' تہمینہ پھوپھو پریشان نظر آنے لگی تھیں۔

افشیں کو دیکھنے کے لیے آنے والے مہمان شام میں آئے تھے اور تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے گئے تھے۔ ساری حویلی کی لڑکیاں نوابوں کی وہاں آمد کو لے کر پر جوش تھیں۔ لیکن ان کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی تھی۔ وہ بھی شدید سردیوں والی اوس......نواب صاحب کے گھر سے نہ تو ان کی والدہ آئی تھیں اور نہ ہی کوئی بہن......جو آیا تھا وہ ان کا خاص ملازم تھا۔

ڈھیروں پھلوں کی ٹوکریوں، زیورات اور کپڑوں کے ساتھ...... اور اس کے ساتھ ساتھ وہ تہمینہ پھوپھو کو نواب صاحب کی ایک ہاتھ سے بنی ہوئی تصویر بھی دے گیا تھا۔ جسے دیکھ کر تہمینہ پھوپھو کو مایوسی ہوئی تھی۔

تصویر میں نواب افشیں سے کچھ پندرہ بیس سال بڑا لگ رہا تھا۔ جبکہ حقیقت تہمینہ پھوپھو جانتی ہی نہ تھیں کہ یہ تصویر بھی کوئی بیس سال پرانی تھی۔

''میں نے تہمینہ پھوپھو کو سب بتا دیا ہے افشیں...... تم پریشان مت ہو۔ سب اچھا ہوگا۔ تم بس عادل کو خبر کر دو۔ اسے کہو کہ جلدی اپنی ماں کو لے کر حویلی میں پہنچے۔''

''وہ شہر گیا ہوا ہے۔ بتایا تو ہے۔''

''تو کسی طرح رابطہ کرو اس سے۔''

''میں ایبٹ آباد میں ایک جگہ کو جانتی ہوں صندل...... کیا تم وہاں جا سکتی ہو۔ وہاں اس کے دوست کی دکان ہے۔ وہاں سے تمہیں عادل کا پتا مل جائے گا کہ وہ اپنی ماں کو لے کر کس ہسپتال گیا ہے۔ اور کہاں رہ رہا ہے۔''

''میں...... شہر سے باہر کیسے جا سکتی ہوں افشیں......''

''کسی بھی طرح کر کے چلی جاؤ صندل......'' افشیں کی تو جیسے جان پر بنی ہوئی تھی۔

''تم ہی کوئی حل بتا دو۔''

''میر زاد کے ساتھ چلی جاؤ صندل......!''

افشیں نے حل نکال لیا تھا اور صندل حیرت سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

''اس کے پاس گاڑی ہے، تم صبح جانا اور شام تک واپس آ جانا...... میں چاندامی سے کوئی بہانہ بنا لوں گی۔''

صندل ابھی بھی آمادہ نظر نہیں آ رہی تھی۔

''میں تمہاری منت کرتی ہوں صندل......! خدا کے لیے چلی جاؤ......عادل سے ملو......اسے میرا حال بتاؤ۔'' افشیں نے کہا تو صندل کو نجانے کیوں اس پر ترس آ گیا۔

یہ محبت بھی کتنی عجیب چیز ہے ناں......کتنا ذلیل کرواتی ہے یہ......

''ٹھیک ہے، میں کل ہی چلی جاؤں گی۔ لیکن ایک شرط ہے۔ اپنے بخار کو فوراً سے ٹھیک کر لو۔'' صندل نے کہا تو افشیں نے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔

☆......☆......☆

دن شام میں ڈھلنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اپنے کمرے میں موجود بسطامی حسب عادت ٹیبل پر تاش کے پتوں سے تاش گھر بنا رہا تھا۔

یہ اس کی مہارت تھی یا شاید قسمت......

اب کی بار گھر ایک دفعہ بھی نہیں گرا تھا۔

وہ یہ گھر بنانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

اس کے بلانے پر تہمینہ پھوپھو کمرے میں آئی تھیں۔

''پھر کیا سوچا ہے آپ نے پھوپھو......؟''

''مجھے تو اس رشتے سے بہت مایوسی ہوئی ہے بسطامی......!'' تہمینہ پھوپھو نے صاف گوئی سے کہا تھا۔

''کیوں......؟ کیا ہوا ہے؟'' تاش گھر سے نظریں ہٹا کر بسطامی نے انہیں گھورا تھا۔

''عجیب بات ہے۔ ان کے گھر سے کوئی آیا ہی نہیں......نہ ماں نہ بہن......''

''نواب کی ماں اور باپ فوت ہو چکے ہیں۔ اور بہن بھائی کوئی ہے نہیں۔''

''کوئی رشتے دار تو ہوگا۔''

''نہیں......اپنے گھر کے بڑے وہ ہی ہیں۔''

''پھر بھی......ہمارے گھر انہیں کسی رشتے دار کو بھیجنا چاہیے تھا۔ یہ کیا بات ہوئی کہ ملازم کو بھیج دیا۔''

''یہ بھی تو دیکھیے کہ کتنے اہتمام سے بھیجا ہے۔ کتنا کچھ لایا تھا وہ......کتنے کپڑے، کتنے پھل اور زیور......جبکہ ابھی رشتہ بھی طے نہیں ہوا ہے۔''

''مانتی ہوں......رکھ رکھاؤ نوابوں والا ہی ہے۔ لیکن طریقہ بھی ضروری ہے۔''

''اس کے علاوہ اور کوئی اعتراض......؟'' بستامی نے ضبط سے کام لیتے ہوئے پوچھا تھا۔

''عمر میں وہ افشیں سے کافی بڑا ہے۔''

''لڑکے کی عمر شکل نہیں، دولت دیکھی جاتی ہے۔''

''دولت کا کیا کرنا ہے، جب زندگی میں خوشی ہی نصیب نہ ہو۔''

تہمینہ پھوپھو کی باتیں بستامی کو غصہ دلا رہی تھیں۔

وہ اٹھ کر تہمینہ پھوپھو کے قریب آیا تھا۔

''آپ کہتی کیا ہیں؟''

''میری طرف سے انکار ہے۔'' تہمینہ پھوپھو نے کہہ دیا تھا۔

بستامی کی کن پٹیاں سرخ ہوگئی تھیں۔ وہ نواب سے دس لاکھ کے عوض افشیں کی بات پکی کر چکا تھا۔ اور اسے دس لاکھ اب ہر صورت چاہیے تھا۔

''میں اس رشتے کو ہاں بول چکا ہوں۔'' بستامی نے کہا تو تہمینہ پھوپھو نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

''تم کیوں انہیں ہاں بول چکے ہو؟''

''کیونکہ افشیں کے لیے مجھے یہ رشتہ ٹھیک لگا ہے۔''

''لیکن مجھے ٹھیک نہیں لگا۔ میں اپنی بیٹی کی شادی یہاں نہیں کروں گی۔'' تہمینہ پھوپھو نے اٹل انداز میں کہا تھا۔

بستامی نے غصے سے انہیں گھورا تھا۔

''افشیں کی شادی یہاں ہی ہوگی۔''

اب کے حیران ہونے کی باری تہمینہ کی تھی۔ بستامی کا انداز انہیں لحہ بہ لحہ حیران کرتا جارہا تھا۔

یہ بستامی آج کس انداز میں بات کررہا تھا۔

''تم شاید بھول رہے ہو کہ افشیں میری بیٹی ہے، تمہاری نہیں...... اس کی زندگی کا کوئی بھی فیصلہ لینے کا حق صرف مجھے ہے۔''

تہمینہ پھوپھو نے کہا تھا اور بستامی کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

اگلے ہی پل اس نے تہمینہ پھوپھو کو گدی سے دبوچ لیا تھا۔

''حق کی بات کرتی ہیں۔ سالوں سے میرے باپ کے گھر میں رہ رہی ہیں۔ میرے باپ کا دیا ہوا کھا رہی ہیں، پہن رہی ہیں۔ اور اب آکر حق کی بات یاد آگئی ہے۔''

بستامی چند لمحے تہمینہ کی پھٹی ہوئی آنکھوں میں جھانکتا رہا تھا۔ پھر جھٹکے سے اس نے تہمینہ پھوپھو کو پرے دھکیلا تھا۔ اپنی گردن سہلاتے ہوئے تہمینہ ہکا بکا بستامی کو گھورتی جارہی تھیں۔ بستامی کے ہاتھوں کی گرفت اتنی مضبوط رہی تھی کہ ان کی گردن دکھنے لگی تھی۔

''ٹھیک ہے، مت کریں افشیں کی شادی نواب کے ساتھ...... لیکن رات ہونے سے پہلے پہلے اپنی دونوں بیٹیوں کو لے کر یہاں سے دفع ہوجائیں۔ اس حویلی پر آپ کا کوئی حق نہیں ہے۔''

بستامی نے دوٹوک انداز میں بات ختم کی تھی۔ وہ سب وہی بول رہا تھا جو روشن بیگم نے اسے بولنے کو کہا تھا۔ روشن بیگم نے واقعی ہی میں اس کی انچ انچ پر رہنمائی کی تھی۔

''اور جانے سے پہلے پچھلے بیس سالوں کا حساب دے کر جائیے گا۔ جو آپ نے اور آپ کی بیٹیوں نے کھایا، پیا، پہنا......اس سب کا حساب......میں ایک ایک دانے کا حساب لوں گا۔''

تہمینہ پھوپھو کو گھورتے ہوئے بستامی کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔

اور تہمینہ پھوپھو اس نئے بستامی کو جاتے ہوئے دیکھے جا رہی تھیں۔

حویلی کی چھت پر رحبان اتنے زور سے سنکھ بجا رہا تھا جیسے جنگ کی آمد کا طبل بجا رہا ہو۔



ناول **تاش گھر** ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **1** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 11

نشیبی راستوں پر اگے ہوئے درخت ایک کے پیچھے ایک بھاگ رہے تھے۔ حویلیاں سے ایبٹ آباد تک کے سفر میں لاتعداد چھوٹے چھوٹے پہاڑ تھے۔ جن پر چھوٹے بڑے گھر بنے ہوئے تھے۔ ان گھروں میں زندگی رواں دواں ہو چکی تھی۔ بلکہ ایسے ہی جیسے صندل کی حویلی میں صبح ہوتے ہی زندگی شروع ہو جاتی تھی۔

وہ دیکھتی جا رہی تھی۔ پہاڑوں کو، گھروں کو، درختوں کو...... اور میر زاد کو...... جو اس کے ساتھ بیٹھا ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس کے مضبوط ہاتھ اسٹیرنگ پر کسے ہوئے تھے۔ کیونکہ راستہ اونچا نیچا تھا اور ڈرائیونگ بہت احتیاط مانگ رہی تھی۔

وہ افشیں کے کام سے نکلی تھی اور اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ خود کہیں جا رہی ہو۔ حویلیاں شہر سے باہر نکلنا حسین تر لگ رہا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے شہر سے نکل کر ایبٹ آباد تک کا سفر کرنا دنیا کا حسین ترین سفر ہو۔ وہ دعا کر رہی تھی کہ یہ سفر کبھی نہ ختم ہو۔

''ہم وہاں کیوں جا رہے ہیں صندل......؟'' میر زاد نے وہ سوال کافی دیر کے بعد پوچھا تھا جو اسے پہلے پوچھ لینا چاہیے تھا۔

''ہم ایک کام سے جا رہے ہیں۔''

''ظاہر ہے کہ کام سے ہی جا رہے ہیں۔ اتنی ایمرجنسی میں کام سے ہی جایا جاتا ہے۔ جتنی صبح تم

میرے گھر آ گئی تھیں، مجھے تو لگا کہ اللہ خیر کرے، کوئی بیمار ہی نہ ہو گیا ہو اور اسے لے کر بڑے ہسپتال نہ جانا پڑے۔"

"اللہ نہ کرے۔"

"میں تو تمہاری عجلت پر کہہ رہا ہوں۔"

"جس کے لیے جا رہے ہیں اس کی زندگی موت کا ہی مسئلہ ہے۔" صندل نے کہا تو میر زاد نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ صندل کے سنجیدہ انداز نے اسے فکر مند کیا تھا۔

"ایسی کیا بات ہے؟"

"ہم وہاں افشیں کے لیے جا رہے ہیں۔"

"افشیں کے لیے کیوں......؟"

"کیونکہ وہ دنیا کا سب سے خطرناک کام کر چکی ہے میر......"

"وہ کیا ہوتا ہے؟" میر زاد نے سوالیہ انداز میں صندل کو دیکھا تھا۔

"محبت......وہ محبت کر چکی ہے۔"

"محبت خطرناک کھیل ہے؟" وہ بناوٹی معصومیت سے پوچھنے لگا تھا۔

"خطرناک سے بھی کچھ زیادہ......میرے پاس اس سے بڑھ کر الفاظ نہیں تھے۔ اس لیے میں نے یہ لفظ بولا ہے۔"

"کیا تم یہ خطرناک کھیل کھیلو گی؟" میر زاد نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال پوچھا تھا۔ صندل نہ چاہتے ہوئے بھی ایسے ظاہر کر گئی تھی جیسے وہ میر کے سوال پر گھبرا گئی ہو۔ میر اس کے گھبرانے پر مسکرایا تھا۔ وہ اسے کیا جواب دیتی کہ وہ یہ کھیل کھیل رہی ہے۔ خطرناک ترین کھیل......اس نے مکھیوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔ اب یا تو اس کے وجود میں سسکاریاں بھر جانے والی تھیں یا

اس کے حصے میں شہد آنے والا تھا۔

''تم نے جواب نہیں دیا۔''

''شاید...... کیونکہ محبت ایک ایسا کھیل ہے کہ انسان جانتے ہوئے بھی کہ اس کھیل کے سارے ہی حصے خطرے سے خالی نہیں اس کھیل کو کھیلنے سے باز نہیں رہتا۔''

''یہ کس ناول کی لائن ہے؟'' وہ مسکرایا تھا۔

''پتا نہیں...... لیکن یہ زندگی کی حقیقت ہے۔''

''ہاں...... شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' میر زاد نے اس سے اتفاق کیا تھا۔ ''میری سوچ کے مطابق فرق اتنا ہے کہ یہ خطرناک کھیل سے زیادہ شطرنج کی بازی ہے۔ ساری چالیں آپ کو آتی ہیں۔ سارے داؤ پیچ سیکھے ہوئے ہیں اس کے باوجود وقت اور حالات کی چالوں میں ہیر پھیر ہو جاتا ہے۔ خود فتح یا شکست انسان کے لیے نئی ہوتی ہے۔ جیتنے والا سوچ رہا ہوتا ہے کہ وہ ہار بھی سکتا تھا۔ اور ہارنے والا آخری لمحے تک خود کی جیت کے لیے پر امید ہوتا ہے۔''

میر زاد نے اتنے اچھے انداز میں بات کی تھی کہ صندل اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ اس کا فلسفہ اس کی بات سے کہیں زیادہ گہرا تھا۔ ایک اور بات صندل نے نوٹ کی تھی۔ یہ بات کرتے ہوئے یا کرنے کے بعد میر ایک دم سے ہی بجھ گیا تھا۔ جیسے یا تو وہ کچھ ہار رہا ہو، یا ہارنے کے قریب ہو۔

باقی کا سفر خاموشی میں کٹا تھا۔ صندل اس سے باتیں کر رہی تھی اور وہ بس ہوں ہاں میں جواب دے رہا تھا۔ اسے اپنی غلط چال کا دکھ کھائے جا رہا تھا۔ اس نے صحیح چال غلط وقت پر چل لی تھی یا غلط چال صحیح وقت سے پہلے چل لی تھی۔ ایک طرف صندل تھی جو اس کے اعصاب پر سوار ہوتی چلی جا رہی تھی اور دوسری طرف تانیہ تھی۔ اس کے بہنوئی کی بہن...... جسے زویا بھابھی بنانے کی پوری تیاری کر چکی تھی۔

میر زاد کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ صندل اور تانیہ میں سے کس کا دل دکھائے۔

لیکن پھر ایک رات اچھے سے اپنا احتساب کر لینے کے بعد اسے اندازہ ہوا تھا کہ یہ صندل اور تانیہ کے دکھ کا کھیل نہیں ہے بلکہ یہ تو خود اس کے اور اس کی بہن زویا کے دکھ کا کھیل ہے۔ اسے اپنے دل کی اور زویا کے دل میں سے کسی ایک کی پروا کرنی تھی۔ اپنی خوشی کے لیے وہ خودغرض ہو سکتا تھا لیکن زویا جو کہ ایک عرصے بعد ماں بننے والی تھی وہ اس بات کو دل پر لے کر کسی بھی طرح کی پیچیدگی کا شکار ہو سکتی تھی۔ بس یہ ہی بات اسے خوف میں مبتلا کیے ہوئے تھی۔

"کیا ہم ایبٹ آباد کی حدود میں داخل ہو چکے ہیں؟"

"ہاں......!"

"کیا ایبٹ آباد کا موسم ہمیشہ سے ہی اتنا حسین ہوتا ہے؟"

"نہیں...... جب میں پچھلی بار آیا تھا تب ایسا نہیں تھا۔ لگتا ہے کہ کوئی حسن تمہاری آنکھوں میں اتر آیا ہے۔ تمہیں ہر چیز حسین دکھنے لگی ہے۔" اور اسے کیا ضرورت تھی اتنی دلفریب بات کرنے کی...... صندل نے اسے دیکھا تو اس کا دل کیا تھا کہ سفر کبھی ختم نہ ہو...... بس بڑھتا ہی رہے۔ ایبٹ آباد اور بہت دور چلا جائے۔

☆......☆......☆

دین حویلی کی سرخ چھت پر ٹہلتی افشیں کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ اس نے خود کو اوپر چھت پر چھپا لیا تھا کیونکہ اسے چاند امی کے آگے نت نئے جھوٹ بولنا پڑ رہے تھے۔ صبح اس نے کہا تھا کہ صندل اس کے لیے بازار سے کچھ چیزیں لینے گئی ہے۔ چاند امی نے اس کے جواب پر حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ اتنی صبح صبح افشیں کو ایسی کس چیز کی ضرورت پڑ گئی تھی کہ اسے صندل کو بازار بھیجنا پڑا تھا۔ پھر اتنی صبح صبح تو ابھی بازار کھلتے ہی نہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے افشیں کی بات کا یقین کر لیا تھا۔

دوپہر تک اس نے اسی جھوٹ کو چلایا تھا۔ افشیں کی قسمت اچھی تھی۔ دوپہر میں چاند سو گئی تھی

جبکہ چاند دوپہر کو سونے کی عادی نہ تھی۔ وہ کام والے ملازموں کو بھیج کر پھر ہی اپنے کمرے میں آرام کرنے جایا کرتی تھی۔ باقی کی کزن بھی دائیں بائیں کے کاموں میں مشغول رہی تھیں۔ کسی کو صندل کی بہت دیر سے غیر حاضری پر تعجب نہیں ہوا تھا۔ سہ پہر میں جب چاند سو کر اٹھی تو افشیں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ صندل تو ساری دوپہر حویلی میں ہی رہی ہے۔ اور ستار کی مشق کرتی رہی ہے۔ اور بس ابھی ابھی باہر گئی ہے۔ زویا سے ملنے...... چاند کو افشیں کی باتوں پر شک ہوا تھا لیکن اسے یقین کرنا پڑا تھا کیونکہ افشیں کا ماضی بے داغ رہا تھا۔ گھر والوں نے اس کے ہاتھوں فریب نہ کھایا تھا۔ ورنہ اس کی جھول دار باتوں پر تو کوئی پاگل بھی یقین نہ کرتا۔

اب جوں جوں شام گہری ہو رہی تھی افشیں کو فکر ہو رہی تھی۔ صندل کا کہیں اتا پتا نہیں تھا۔ وہ صندل کی غیر حاضری کے متعلق مزید جھوٹ نہیں گھڑ سکی تھی۔ دوسرا اسے صندل کا اس لیے بھی انتظار تھا کہ وہ اس تک عادل کی خبر لائے کہ وہ کہاں ہے اور کب تک واپس آئے گا۔

اور تیسری سب سے اہم بات...... کیا عادل نے اتنے دنوں میں اسے یاد کیا؟ یاد کیا تو کتنا یاد کیا؟ عادل نے اسے کبھی خط نہیں لکھے تھے لیکن پھر بھی اسے بے چینی سے عادل کے خطوط کا انتظار تھا۔ وہ یہ بات بھولی ہوئی تھی کہ عادل بے چارہ اپنی بیمار ماں کے ساتھ ہسپتال میں رہ رہا ہے اور ہسپتال میں محبتوں کو کون یاد رکھتا ہے۔

بے قرار تو صبح سے زویا بھی تھی۔ میر صبح سے غائب تھا۔ دن چڑھے وہ اس کے کمرے میں اسے اٹھانے گئی تھی تو اسے تب پتا چلا تھا کہ میر کمرے میں موجود نہیں ہے۔ ملازم کو جاتے وقت اس نے اتنا بتایا تھا کہ وہ ایبٹ آباد کسی ضروری کام سے جا رہا ہے۔ کس ضروری کام سے جا رہا ہے اس نے یہ نہیں بتایا تھا۔ جبکہ وہ تو بازار کھانا وغیرہ بھی لینے جاتا تھا تو زویا کو ضرور بتا کر جایا کرتا تھا۔ چاہے اسے سوئی ہوئی زویا کو نیند سے جگا کر ہی کیوں نہ بتانا پڑے۔

ماضی میں اس کا کبھی شاید ہی ایبٹ آباد جانا ہوا ہو۔ ملازم نے بتایا تھا کہ وہ اکیلا گیا ہے۔ لیکن دل کے اندر کا شک تھا کہ جانے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا تھا۔ اس نے ملازم کے ہاتھ دین حویلی میں پیغام بھجوایا تھا کہ وہ صندل کو یاد کر رہی ہے۔ کیا صندل اسے آ کر مل سکتی ہے۔ ملازم جو جواب لایا تھا اس نے زویا کو چکرا دیا تھا۔

''وہ کہہ رہے ہیں کہ صندل گھر پر موجود نہیں ہے۔ آئے گی تو اسے پیغام دے دیا جائے گا۔'' یہ دوپہر کی بات تھی۔ اس نے شام کو پھر سے ملازم کو وہاں بھیجا تھا۔ پھر سے وہی جواب دے دیا گیا تھا۔

میر زاد غائب تھا اور صندل بھی...... یہ اتفاق تھا یا منصوبہ...... سوچتے ہوئے زویا کے ماتھے کی شکنیں گہری ہونے لگی تھیں۔ اسے محسوس ہوا تھا کہ اس کا اپنا بھائی اس کے ساتھ کوئی کھیل کھیل رہا ہے۔ اسے کھیل سے زیادہ اس بات پر غصہ تھا کہ وہ اتنی آسانی سے بے وقوف کیسے بن گئی ہے۔ میر نے اسے سمجھ کیا رکھا ہے۔

''ٹھیک ہے میر...... اب میں تمہیں بتاؤں گی کہ اس کھیل کو میں نے کس وقت آشکار کرنا ہے۔ میں تانیہ کے ساتھ زیادتی نہیں ہونے دوں گی۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔''

اور زویا اپنا احتساب کرتی تو جان جاتی کہ اسے تانیہ کی رتی برابر پروا نہیں تھی۔ اسے تو بس صندل سے خار تھی۔

☆......☆......☆

وہ لوگ گیارہ بجے کے قریب ایبٹ آباد پہنچے تھے اور پھر عادل کے دوست کو ڈھونڈنے میں انہیں دوپہر ہو گئی تھی۔

عادل کے دوست نے ان دونوں کی بہت اچھے سے تواضع کی تھی۔ انہیں کھانا کھلایا تھا۔ اور جب صندل کو یہ پتا چلا تھا کہ وہ ان دونوں کو میاں بیوی سمجھتا رہا تھا تو صندل کی کتنی دیر ہنسی ہی بند نہیں ہوئی

تھی۔ یہ ہنسی خفت مٹانے سے زیادہ ایسی تھی جیسے کسی نے اس کے دل کی بات کہہ دی ہو۔ جبکہ میر زاد خاموش رہا تھا۔

کھانے کے بعد عادل کے دوست نے انہیں عادل کے پاس بھیج دیا تھا۔

عادل بے چارہ اپنی بیمار ماں کے سرہانے بیٹھا بے حد پریشان نظر آ رہا تھا۔ ڈاکٹرز نے اس کی ماں کو چند دن کا مہمان قرار دے دیا تھا۔ ایسے میں بے چارے عادل کی آنکھوں میں وقت سے پہلے ہی اپنی ماں کی موت کا دکھ نظر آنے لگا تھا۔

صندل نے اسے افشیں کے لکھے سارے خطوط تھما دیے تھے۔ اور اس کے سارے زبانی پیغامات بھی دے دیے تھے۔

''وہ بہت پریشان ہے۔ تمہیں جلد اس سے ملنا ہوگا۔''

''میں سمجھ سکتا ہوں لیکن میں اس سے زیادہ پریشان ہوں۔ یہاں مجبوری میں رکا ہوا ہوں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ کسی بھی وقت امی کے دن پورے ہو سکتے ہیں۔'' عادل کی بات پر صندل کو دکھ ہوا تھا۔ وہ افشیں سے زیادہ مجبور تھا۔

''میں تمہاری مجبوری سمجھ سکتی ہوں عادل...... لیکن تم یہ ہی سمجھ لو کہ وہاں افشیں کے دن بھی بس پورے ہونے والے ہیں۔ اگر تم نہ پہنچے تو وہ تو مر ہی جائے گی۔''

''اسے کہو کہ چند دن صبر کر لے۔''

''چند دن کیوں...... تم کل ہی آ جاؤ۔''

''امی بیمار ہیں، میں کیسے آ سکتا ہوں۔ اگر امی کی طبیعت نہ سنبھلی تو میں کسی دن اپنے دوست کو امی کے پاس بٹھا کر اس سے ملنے چلا آؤں گا۔''

''لگتا ہے کہ تم بات سمجھ نہیں رہے ہو۔ بات افشیں سے ملنے کی نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ اس کی

شادی کے لیے گھر پر رشتے آنا شروع ہو گئے ہیں۔ تمہیں جلد اس کے گھر اپنی ماں کو لے کر بھیجنا ہو گا۔"

عادل کو ساری بات اب سمجھ میں آئی تھی۔

"افشیں کی مجبوری سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ لڑکی ذات ہے۔ اوپر سے تم سے محبت کر بیٹھی ہے۔ محبت زدہ لڑکی سے زیادہ مجبور دنیا میں کوئی نہیں ہو سکتا۔" صندل کی بات نے عادل کو چپ کروا دیا تھا۔

"تمہاری مجبوری ایک طرف...... اور افشیں کی بے بسی ایک طرف...... میں بہت مشکل سے تم تک پہنچی ہوں۔ مجھے کوئی ایک بات تو ایسی کرو کہ جس سے افشیں کو تسلی ہو۔"

"میں جلد آنے کی کوشش کروں گا۔"

"مجھے دن بتاؤ عادل......"

"امی کے مرنے کے بعد......" عادل نے سپاٹ چہرے کے ساتھ کہہ دیا تھا۔

صندل خاموش ہو گئی تھی۔ اور باہر چلی گئی تھی۔ وہ پہلے سے پریشان کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"چلو......" جیپ میں بیٹھتے ہوئے میر کے پاس پہنچ کر اس نے کہا تھا۔

"کتنے خط لکھے تھے افشیں نے؟" گاڑی جب سڑک پر آ گئی تھی تو اس نے پوچھا تھا۔

"مجھے نہیں اندازہ...... بہت سے ہوں گے۔"

"کیا تم نے پڑھے......؟"

"ہرگز نہیں...... میں کیوں کسی کے خط پڑھوں گی۔"

"اس طرح شاید تمہیں بھی خط لکھنا آ جائے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

صندل خاموش ہو گئی تھی۔ اب وہ اسے کیا بتاتی کہ وہ اسے کہے تو سہی کہ وہ اسے چاہتا ہے۔ خط تو کیا وہ تو اس کی خاطر دیوان بھی لکھ سکتی ہے۔ اور عین جس لمحے صندل یہ بات سوچ رہی تھی۔ میر تک

اس کی بات کشف کی صورت ظاہر ہوئی تھی۔

''میں تم سے محبت کا اظہار کیسے کر سکتا ہوں صندل...... میں وہ مسافر ہوں جو دو کشتیوں میں پاؤں رکھ چکا ہے۔ اب کشتیوں کا تو پتا نہیں...... لیکن وہ مسافر ڈگمگا رہا ہے۔''

''میر......! یہ ہم کس راستے سے جا رہے ہیں۔ ہم آئے تو کسی اور راستے سے تھے۔'' اس نے میر سے پوچھا تھا۔ میر نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا تھا۔ اور صبح سے لے کر اب تک کے سفر میں پہلی بار صندل کو احساس ہوا تھا کہ وہ ایک مرد کے ساتھ اکیلی باہر ہے۔

''میر! ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''جنت میں......''

''وہ ایبٹ آباد میں موجود ہے؟''

''جنت تو نظروں میں ہوتی ہے۔ احساس میں ہوتی ہے۔ سماعت میں ہوتی ہے۔''

وہ پہاڑوں پر ڈرائیونگ کرنے لگا تھا۔ آتے وقت وہ پہاڑ دیکھتی آئی تھی لیکن کسی ایسی سڑک پر ان کی جیپ نہیں چلی تھی جو پہاڑ کو کاٹ کر بنائی گئی ہو۔ اب ان کی جیپ پہاڑ کی سڑک پر چڑھ رہی تھی۔ سنسان علاقے میں...... جہاں دائیں بائیں اتنے درخت تھے کہ وہاں آسانی سے گم ہوا جا سکتا تھا۔

''میر......! ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' وہ سچ مچ گھبرا گئی تھی۔ ''کیا میر اس کا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔''

''دو منٹ خاموش ہوگی تم......؟'' اس نے رعب سے کہا تھا۔

صندل کے پاس دبک کر بیٹھنے کے بجائے بھلا اور حل ہی کیا تھا۔ دو منٹ تو نہیں...... پورے تین منٹ کے بعد میر زاد کی جیپ رکی تھی۔

''نیچے اترو......''

وہ نیچے اتر آئی تھی۔ اور اپنے دائیں بائیں دیکھنے لگی تھی۔ درختوں سے گھرا ہوا وہ ایک چھوٹا سا

قطعہ زمین تھا جس کے تین طرف اونچے پہاڑ تھے اور ایک طرف چمکتا ہوا سورج...... اس قطعہ زمین پر ایک گھر بھی تھا جو کہ ابھی نامکمل تھا۔

''اس جگہ کو ٹھنڈیانی کہتے ہیں اور یہ میرا گھر ہے۔'' میر نے اسے بتایا تھا۔ صندل نے خوش گوار حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

''کیا سچ میں......؟''

''ہاں...... لیکن ابھی اس کے بارے میں کسی کو نہیں بتایا...... زویا آپی کو بھی نہیں...... صرف تمہیں بتا رہا ہوں۔ میں شادی کے بعد اس گھر میں رہنا چاہتا ہوں۔ دنیا سے الگ تھلگ...... ایک پرسکون گوشے میں...... اسی لیے اس گھر کو بہت دل سے تیار کروا رہا ہوں اور سب سے پہلے تمہیں دکھانے لایا ہوں۔''

''تم یہ گھر مجھے دکھانے کیوں لائے ہو میر......؟''

''کیونکہ میں اس گھر میں تمہارے ساتھ زندگی بتانا چاہتا ہوں۔''

میر نے کہا تھا اور صندل کی سماعت پر یہ جملہ بار بار ٹکرایا تھا۔ وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے میر کو دیکھنے لگی تھی۔ جو بات وہ میر کے منہ سے سننے کے لیے بے تاب تھی، وہ جب میر نے کہہ دی تھی تو اسے یقین کیوں نہیں آ رہا تھا۔

''اس گھر میں رہو گی میرے ساتھ......؟'' اس کے بے حد قریب ہوا وہ پوچھ رہا تھا۔ صندل نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

اور جنت تو نظر میں ہے۔ محسوس کرنے میں ہے۔ سماعت میں ہے۔

صندل کو لگا کہ وہ اس وقت جنت کے کسی خوب صورت ترین گوشے میں موجود ہے۔ اور کوئی فرشتہ اس سے میٹھی میٹھی باتیں کر رہا ہے۔

☆......☆......☆

تہمینہ پھوپھو کو چپ لگ چکی تھی۔ وہ کل سے چپ چپ تھیں۔ چاند نے پوچھا تھا کہ انہیں آنے والا رشتہ کیسا لگا۔ وہ تب بھی چپ رہی تھیں۔ کوئی جواب نہیں دے سکی تھیں۔ ایسے جیسے انہیں سکتہ ہو گیا ہو۔ یا ایسے جیسے ان کا کوئی بہت ہی پیارا فوت ہو گیا ہو۔ پچیس سالوں کے بعد انہیں آج ایسا لگا تھا جیسے وہ آج بیوہ ہوئی ہیں۔ جب ان سے عمر میں کافی کم بستامی نے انہیں گردن سے دبوچ لیا تھا۔ اور صرف دبوچا نہیں تھا بلکہ ان سے حساب کتاب مانگ لیا تھا۔ ان کا دل کیا تھا کہ وہ بستامی کا منہ توڑ دیں لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ بستامی کے گھر میں رہ رہی تھیں۔ پہلے اس کے باپ کا اور اب اس کا دیا ہوا کھا رہی تھیں۔ پہن رہی تھیں۔ وہ اس کا منہ کیسے توڑ سکتی تھیں۔

آج انہیں لگا تھا کہ وہ تنہا ہو چکی ہیں...... بہت زیادہ تنہا...... شدید تنہا......

انہیں اپنے شوہر کے قتل ہونے کا دکھ اس وقت اتنا نہیں ہوا تھا جتنا اب ہو رہا تھا۔ وہ اب روتے ہوئے خدا سے شکوہ کر رہی تھیں کہ وہ کیوں بیوہ ہوئیں۔ خدا نے کیوں ان کے شوہر کو ان سے چھین لیا۔ پھر ان کے ذہن میں مختلف خیالات آنے لگے تھے۔ یہ کہ بیوہ ہونے سے بہتر تھا کہ انہیں طلاق ہو جاتی...... ان کی بچیوں کے باپ کا سایہ تو ان کے سر پر ہوتا...... بے شک وہ ان کی زندگی میں نہ ہوتا...... لیکن ان کی بچیوں کا کوئی مالک تو ہوتا...... انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ہجرت کے وقت میں جی رہی ہوں اور بلوائیوں نے ان کی بیٹیوں کی عزتوں پر حملہ کر دیا ہو۔

''کیا نواب کا رشتہ آپ کو پسند نہیں آیا پھوپھو......؟'' چاند نے پوچھا تھا۔

''ایسی بات نہیں......''

''تو پھر آپ خوش کیوں نہیں ہیں؟''

''میں خوش ہوں۔ بہت خوش ہوں۔'' تہمینہ پھوپھو نے کہا تھا۔ اور پھر ہنسنے لگی تھیں۔ ''بہت خوش ہوں میں......'' تہمینہ پھوپھو ایسے ہنسی تھیں کہ چاند تعجب سے انہیں دیکھنے لگی تھی۔

یہ آج تہمینہ پھوپھو کو کیا ہو گیا تھا۔

''تو پھر آگے کیا ارادہ ہے۔ ہم سب نے کب جانا ہے لاہور ان کا گھر بار دیکھنے......؟''

''اس کی ضرورت نہیں...... بستامی سب دیکھ چکا ہے۔ سب دیکھ چکا ہے۔ بس اب جلدی افشیں کو رخصت کر دینا ہے۔'' تہمینہ پھوپھو جیسے کہیں نہ دیکھتے ہوئے گویا تھیں۔ ''تا کہ کچھ تو حساب کتاب بے باق ہو۔ کچھ تو قرض اترے۔''

''کون سا قرض......؟ کون سا حساب......؟''

''کچھ نہیں...... تم نہیں سمجھو گی چاند......'' تہمینہ پھوپھو کہہ کر اٹھی تھیں۔ اور اپنا ٹرنک کھولنے لگی تھیں جس میں ان کا کچھ پرانا سامان مدتوں سے محفوظ پڑا تھا۔ چاند انہیں ایسا کرتے ہوئے دیکھتی جا رہی تھی۔

''شادی کب تک کرنے کا ارادہ ہے؟''

''بستامی نے کہا ہے کہ اگلے ہفتے نکاح ہے۔''

''اتنی جلدی...... اتنی جلدی میں اتنی بہت سی تیاری کیسے ہو گی؟''

''کیسی تیاری چاند......؟''

''سارا جہیز بنانا ہے۔ کتنی بہت سی چیزیں لینی ہیں۔''

''جہیز نہیں چاہیے ان لوگوں کو...... بہت امیر ہیں وہ...... بس چند جوڑے دوں گی میں افشیں کو......'' وہ ٹرنک کا سامان دائیں بائیں کر رہی تھیں۔

''چند جوڑے کیوں...... لڑکے والے تو ایسے ہی کہتے ہیں پھوپھو...... پھر بارات کا انتظام کرنے کے لیے بھی تو وقت چاہیے۔''

''کیسی بارات...... وہاں سے بس تین چار افراد آئیں گے۔ ان کا کیا انتظام کرنا......'' تہمینہ

پھوپھو نے بتایا تھا۔ چاند نے کچھ اچنبھے سے انہیں دیکھا تھا۔

''یہ دیکھو...... کیسا ہے یہ جوڑا...... نکاح والے دن کے لیے افشیں کے لیے سلوا لیتی ہوں۔'' وہ ٹرنک میں سے ایک پرانا جوڑا نکال کر چاند کو دکھا رہی تھیں۔

''اتنے پرانے جوڑے دینے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم افشیں کے لیے سب نیا خریدیں گے۔'' چاند نے ٹرنک کے جوڑوں کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''نئے جوڑوں کے پیسے کہاں سے آئیں گے چاند......؟'' تہمینہ نے گہرا سانس لیا تھا۔ اور حیرت کے مارے چاند کا تو جیسے سانس ہی گم ہو گیا تھا۔

''کیسی باتیں کر رہی ہیں تہمینہ پھوپھو...... کیا آگے آج تک آپ سے کسی نے پیسوں کا مطالبہ کیا ہے؟''

''اب کیا ہے۔'' تہمینہ پھوپھو کی آنکھوں میں دکھ ہی دکھ اتر آیا تھا۔

''کس نے......؟''

''اور ایسے کیا ہے کہ میں لمحے بھر میں کنگال ہو گئی ہوں۔ مجھے احساس ہو گیا ہے کہ میرے پاس کچھ نہیں...... نہ اپنے لیے اور نہ ہی اپنی بیٹیوں کے لیے...... میں خاک ہوں۔''

''آپ کیا بولتی جا رہی ہیں تہمینہ پھوپھو......''

''چھوڑو...... کیا بے کار باتیں کرنے لگی ہوں میں...... یہ بتاؤ یہ جوڑا کیسا لگے گا افشیں پر......'' وہ ایک پرانا سا سوٹ چاند کو دکھانے لگی تھیں۔ اور پرانے سوٹ کو دیکھتے ہوئے چاند کو سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ تہمینہ پھوپھو سے کیا کہے۔ وہ تو بس یہ ہی بات سوچ رہی تھی کہ یہ آج تہمینہ پھوپھو کو ہو کیا گیا ہے۔

آنے والے دنوں میں کسی کو کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ حویلی میں یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ عجیب سے دن تھے وہ...... رات کے عالم کو اپنے اندر سموئے ہوئے۔

افشیں کو تیز بخار چڑھ گیا تھا جو اترنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ تہمینہ پھوپھو چپ ہو گئی تھیں۔ ایسے جیسے زندگی بھر انہوں نے ایک لفظ نہ بولا ہو۔ اور بستامی افشیں کی شادی کی تیاریاں ایسے کرنے لگا تھا جیسے اپنی سگی بیٹی کو بیاہنے جا رہا ہو۔

یہ شادی ایسی ہو رہی تھی جیسے کسی کے مرنے کے بعد کفن دفن کا انتظام کیا جاتا ہے۔ کوئی گہما گہمی نہیں تھی۔ کوئی تیاری نہیں ہو رہی تھی۔ باقی سب سمیت چاند کو بھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ماجرا ہے۔ تہمینہ کیوں چپ ہے۔ افشیں کیوں بیمار ہے۔ انہیں ایسے لگ رہا تھا جیسے کوئی بہت ہی انہونی بات ان سے چھپائی جا رہی ہو۔ افشیں کی شادی میں مرضی نہیں تھی تو اس کی شادی یہاں کیوں کی جا رہی تھی۔ تہمینہ کی مرضی نہیں تھی تو ایسی کون سی مجبوری تھی کہ وہ یہاں شادی کر رہی تھیں۔

''میں مر جاؤں گی صندل...... میں بتا رہی ہوں۔ میں مر جاؤں گی۔''

''ایسا کچھ نہیں ہو گا افشیں...... کیوں فکر کرتی ہو۔ عادل بس آنے والا ہو گا۔''

''اس کے آنے سے کیا ہو گا...... یہاں میری اماں نے میری شادی کی تاریخ رکھ دی ہے۔''

''مجھے تو تہمینہ پھوپھو پر حیرت ہے۔ وہ جانتی بھی ہیں کہ تمہاری مرضی کہیں اور ہے۔ پھر انہوں نے لاہور والے رشتے کو رضا مندی کیوں دے دی۔''

''مجھے نہیں پتا صندل...... کچھ کرو...... میں مر جاؤں گی۔'' افشیں بری طرح سے رونے لگی تھی۔ صندل کا ضبط جواب دے گیا تو وہ غصے سے تہمینہ پھوپھو کے پاس پہنچی تھی۔

''میں جانتی ہوں کہ تم کیا بات کرنے آئی ہو صندل......''

''آپ ایک بار عادل سے مل تو لیں۔ آپ نے اسے دیکھے بنا ہی مسترد کر دیا ہے۔''

''میں نے اسے مسترد نہیں کیا ہے صندل...... مجھ سے یہ حق چھین لیا گیا ہے کہ میں اسے قبول کروں۔''

''کیا مطلب......؟''

''تم نہیں سمجھو گی صندل......ابھی تم بہت چھوٹی ہو۔اور میری باتیں بہت بڑی نہ سہی تو گہری ضرور ہیں۔تم میرا ایک کام کرسکتی ہو۔''

''جی کہیے......؟''

''افشیں سے کہو کہ وہ چپ چاپ اس جگہ پر شادی کروالے۔''

''لیکن پھوپھو......!''

''صندل......!میں نے کہا ناں بہت سی باتوں کو تم نہیں سمجھ سکتی۔عام حالات ہوتے تو میں اپنی بیٹی کی پسند کو ضرور اہمیت دیتی......وہ جہاں کہتی اس کی شادی وہاں کردیتی......لیکن......''

''لیکن اب ایسا کیا ہوچکا ہے پھوپھو......بیٹی کی خوشی سے بڑھ کر کیا ہوسکتا ہے۔''

''اسے سمجھاؤ کہ اس کا باپ مرچکا ہے۔وہ ایک یتیم لڑکی ہے۔اور یتیم لڑکیاں اپنے پالنے والوں کے پاس گروی ہوتی ہیں۔''

صندل ناسمجھی سے انہیں دیکھنے لگی تھی۔

''بس اس سے اتنا کہہ دو کہ اگر وہ اپنی ماں کو زندہ دیکھنا چاہتی ہے تو لاہور والے رشتے کو قبول کرلے۔'' تہمینہ پھوپھو نے کچھ ایسی التجا آمیزی سے کہا تھا کہ صندل کو افشیں سے زیادہ ان پر ترس آگیا تھا۔اسے لگا یہ عورت دنیا کی مجبور ترین عورت ہے۔اور اسے انہیں سمجھانے کے بجائے افشیں کو سمجھانا چاہیے۔

نکاح کا دن نزدیک آگیا تھا اور حویلی والے اسی آس میں تھے کہ کوئی ان سے کہہ دے کہ یہ نکاح نہیں ہورہا۔لیکن نکاح ہونے جارہا تھا۔نواب کی پانچ افراد پر مشتمل بارات حویلی تک پہنچی تھی۔اور نواب کو دیکھ کر لڑکیاں بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گئی تھیں۔وہ تو افشیں کا باپ نہیں، دادا لگ رہا تھا۔وہ افشیں سے عمر میں اتنا بڑا تھا کہ اگر طبعی عمر کو مدنظر رکھ کر دیکھا جاتا تو قیاس تھا کہ افشیں اگلے پانچ سالوں

میں بیوہ ہونے والی تھی۔

چاند نے شدید ترین حیرت سے تہمینہ پھوپھو کو دیکھا تھا کہ یہ انہوں نے اپنی بیٹی کے لیے کیا منتخب کیا ہے۔ تہمینہ پھوپھو نظریں چرا گئی تھیں۔ ان کے پاس کسی کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

افشیں خودکشی نہیں کر سکی تھی۔ زہر جب اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ اسے منہ میں ڈالنے ہی لگی تھی تو اسے تب اندازہ ہوا تھا کہ یہ کام آسان نہیں ہے۔ اس کے لیے عورت کو بھی "مردانگی" کی ضرورت پڑتی ہے۔

مرنا آسان نہیں...... موت کو خود سے گلے لگانا بہت ہمت مانگتا ہے اور وہ بہت بے ہمت تھی۔ اس لیے وہ رو رو کر پاگل ہوتی رہی تھی۔

نکاح والے دن تک اس کی حالت ایسی تھی جیسے جسم سے روح نکل گئی ہو۔ رونا دھونا سب ختم ہو چکا تھا کیونکہ آنسو ختم ہو چکے تھے۔ وہ بنا کسی دھات کے ٹھوس مجسمہ بن چکی تھی۔

شام کے وقت افشیں کی رخصتی کر دی گئی تھی اور افشیں حویلی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی تھی۔

عین انہی لمحوں میں عادل اپنی مری ہوئی ماں کا سوگ منا کر واپس لوٹا تھا۔ بت بنی افشیں کار میں بیٹھ کر رخصت ہو رہی تھی۔ عادل ہکا بکا افشیں کو کار میں بیٹھ کر رخصت ہوتے دیکھتا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں صرف پھٹی نہیں تھیں بلکہ ان میں خون بھی اتر آیا تھا۔

اس رات حویلی میں کسی کو نیند نہیں آئی تھی۔ سب تعجب سے ایک دوسرے کو دیکھنے کے بعد اب خود سے سوال جواب کر رہے تھے۔ ان کی حویلی میں پہلی شادی ہوئی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی مر گیا ہو۔ خوشی کے بجائے نجانے کیوں سب کا ماتم کرنے کو دل کر رہا تھا۔ ساری رات اسی سوچ بچار میں گزر گئی تھی کہ یہ ہوا کیا ہے۔

صبح حویلی کے باہر لگے مجمعے اور شور کی وجہ سے سب کی آنکھ جلدی کھل گئی تھی۔ عجیب سی چیخ و پکار

تھی جو ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔ سب بوکھلا کر باہر نکلے تھے۔ اور پھر سب کی آنکھیں آگے کا منظر دیکھ کر پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

خاص طور پر تہمینہ پھوپھو کی......

حویلی سے کچھ فاصلے پر پیپل کے درخت تلے جہاں عادل اور افشیں رات میں چھپ چھپ کر ملا کرتے تھے، وہاں اسی درخت کی شاخ سے عادل کی لاش لٹک رہی تھی۔

☆......☆......☆

مارٹینی کے تین بلوری جام آپس میں ہلکے سے ٹکرائے تھے۔ یہ جام روشن بیگم کو ان کے ایک مداح نے انگلستان سے بھیجے تھے۔ بلوری جام اس قدر شفاف تھے کہ اس وقت چھت پر لگے فانوس کی تمام تر روشنی کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھے۔ تینوں میں سے ایک جام روشن بیگم کے ہاتھ میں تھا، ایک بستامی اور ایک رحبانی کے ہاتھ میں......جس میں شفاف گندمی سیال تھا۔ جواب ان کے منہ کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ ہلکا سا گھونٹ بھرنے کے بعد روشن بیگم نے ایک جاندار قہقہہ لگایا تھا۔ یہ قہقہہ زندگی سے اس قدر بھرپور تھا کہ پورے ہال نما کمرے میں کسی اندھی چمگادڑ کی طرح چک پھیریاں لگانے لگا تھا۔ بستامی اور رحبانی کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

''میں نے کہا تھا ناں بستامی، کہ یہ سودے بازی تمہیں مالامال کر دے گی۔'' روشن بیگم نے چہک کر کہا تھا۔ آج وہ چہک سکتی تھیں۔ انہوں نے جو کہا تھا ویسا ہی ہوا تھا۔ افشیں کا دس لاکھ بستامی کو مل چکا تھا۔ ان کی ساری بات حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی تھی۔

''آپ نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔''

''تم ایسے ہی پریشان ہو رہے تھے۔ دیکھنا اب تمہیں کبھی بھی معاشی تنگی نہیں ہوگی۔ بس میرے کہے پر چلتے رہو۔''

''اب تو آپ کا ساتھ میں چھوڑ ہی نہیں سکتا۔'' بستامی خوش تھا۔ بہت خوش تھا۔

''ابھی تو بس افشیں کا سودا ہوا ہے۔ ابھی تو چھ ہیرے مزید موجود ہیں۔'' رحبانی نے بھی ان کی باتوں میں ان کا ساتھ دیا تھا۔

''ہر ہیرے کی قیمت پچھلے سے زیادہ ملے گی۔ یہ میرا وعدہ ہے تم دونوں سے......''

تینوں نے اپنے اپنے جام ختم کیے تھے۔ رحبانی نے بوتل پکڑ کر انہیں پھر سے بھر دیا تھا۔ دوسرے کے بعد تیسرے جام کے بعد سب ہی ڈولنے لگے تھے۔ تینوں کے وجود اور لہجے غیر متوازن ہو چکے تھے۔

''پیسوں کا حصہ کب ہوگا......؟'' روشن بیگم کن انکھیوں سے بستامی کو دیکھتے ہوئے بولی تھیں۔ ان کی آواز میں نشے کی بندش سرائیت کر چکی تھی۔ خوشبودار عورت کے وجود سے بدبودار آواز برآمد ہوئی تھی۔

''ابھی کر لیں......میں ملازم کو بھیج کر حویلی سے پیسے منگوا لیتا ہوں۔''

''نہیں......اتنی بھی جلدی نہیں ہے۔ مجھے تم پر اعتبار ہے بستامی......'' روشن بیگم نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔ کام ہی ایسا تھا کہ دونوں کو گناہ کے اس سودے میں ایک دوسرے پر اعتبار کرنا پڑ رہا تھا۔

''اب آگے کیا کرنا ہے؟'' رحبانی نے تینوں کے لیے چوتھا جام بناتے ہوئے پوچھا تھا۔

''میرے خیال سے اگلا نمبر تمہارے گھر کے سب سے نایاب ہیرے کا ٹھیک رہے گا۔''

''کس کی بات کر رہی ہیں آپ......؟''

''صندل کی......'' روشن بیگم نے آنکھوں کو روشن کرتے ہوئے کہا تھا۔ بستامی کی آنکھیں چمکی تھیں۔ اور رحبانی کا سارا نشہ چھو ہو گیا تھا۔

''صندل ساری لڑکیوں میں سے سب سے زیادہ خوب صورت ہے۔ شعلہ ہے۔ ذرا سی دھوپ سے آگ لگوا سکتی ہے۔ میرے خیال سے اس کے معاملے میں بالکل بھی دیر نہیں کرنی چاہیے۔''

''بالکل بالکل......'' بستامی کے بجائے رحبانی نے فوراً سے تائید کی تھی۔ وہ صندل کو ایک لڑکے کے ساتھ گھومتے پھرتے دیکھ چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب حویلی میں کیا آگ لگنے جارہی ہے۔ ایک طرف چاند تھی اور دوسری طرف بستامی......آگ اور مٹی کا تصادم ہونے جارہا تھا۔ غالب گمان تھا کہ مٹی پر آگ غالب آجائے گی۔ مزید بھڑکے گی اور یہ آگ چاند کے دل میں لگنے والی تھی۔ اس بات کی رحبانی کو سب سے زیادہ خوشی تھی۔

یہ ایسی آگ تھی جو چاند کو جلا کر خاکستر کرسکتی تھی۔ اس کے دل کو کوئلہ کرسکتی تھی۔ اس کام میں بستامی سے زیادہ رحبانی پرجوش تھا۔ چاند کو آگ میں جلانے سے اسے بے پناہ خوشی ملنے والی تھی۔

''تم گھر جا کر ساری تیاری کرو بستامی......صندل کی رونمائی بہت شاندار ہونی چاہیے۔''

''مطلب......؟''

''ہم صندل کی بولی لگائیں گے۔ جیسے نیلامی کی تقریب کی جاتی ہے۔ سمجھو ویسا ہی......جس نے صندل کی سب سے زیادہ بولی لگائی اسے صندل مل جائے گی۔''

روشن بیگم کی بات پر رحبانی کی آنکھیں روشن ہوئی تھیں......سب اس سے بڑھ کر ہونے والا تھا جیسا وہ سوچ رہا تھا۔

''مجھے تو ان سب کاموں کا بالکل علم نہیں......''

''پریشان کیوں ہوتے ہو بستامی......میں ہوں ناں......میں تمہیں سب سمجھا دوں گی۔''

''نہیں......یہ کام میں اپنے ذمے لیتا ہوں۔'' رحبانی درمیان میں بولا تھا۔ روشن بیگم اور بستامی دونوں نے ہی اسے دیکھا تھا۔

''ٹھیک ہے......جیسا تم چاہو......لیکن سب بہت شاندار ہونا چاہیے۔ صندل کی خوب صورتی کے عین مطابق......''

''اس چیز کی آپ فکر ہی مت کریں۔'' رحبانی خلاؤں میں دیکھتے ہوئے بولا تھا۔ اس کے لبوں پر بہت ہی زہر خندسی مسکراہٹ مچل رہی تھی۔ اور اس گندی سی مسکراہٹ میں وہ چالاک لومڑ لگ رہا تھا۔

☆......☆......☆

صندل کو ان دنوں تیز بخار چڑھا ہوا تھا۔ وہ بخار جو پہلے افشیں کو چڑھا کرتا تھا اب افشیں کی رخصتی کے بعد صندل کو چڑھنے لگا تھا۔ شدید سردی کے باوجود دن رات اس کا ماتھا جلتا تھا۔ چاندامی اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں کرتی تھیں لیکن اس کا بخار کم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ چاند کو فکر ہوئی تھی۔

''کیا ہوا ہے تمہیں صندل...... کیا بد پرہیزی کر لی ہے تم نے......؟''

''موسم کی وجہ سے ایسا ہوا ہے چاندامی......''

''یہ موسم زندگی میں کوئی پہلی بار نہیں آیا ہے۔''

''ٹھیک ہو جاؤں گی۔ آپ فکر مت کریں۔'' وہ بات کو ٹال دیا کرتی تھی۔

افشیں کی جدائی سے زیادہ اسے عادل کی خودکشی نے حساس کر دیا تھا۔ پیپل کے پیڑ سے لٹکتی عادل کی لاش کا منظر ایسا تھا جو اس کی آنکھوں سے جاتا ہی نہیں تھا۔ وہ خوف سے زیادہ دکھ کا شکار ہوئی تھی۔ محبت نے ایک لڑکی کو تباہ کر دیا تھا اور لڑکے کی جان لے لی تھی۔ کیا ایسا ہی ہوتا ہے محبت کا انجام......

حویلی میں کسی کو عادل کی خودکشی کی وجہ معلوم نہیں تھی۔ سب کو یہ ہی لگا تھا کہ کسی لڑکے نے محض اتفاق سے ان کی حویلی کے سامنے خودکشی کر لی ہے۔ سارا معاملہ جانتی تھی تو بس صندل اور تہمینہ...... اور دونوں ہی اس موضوع پر بات نہیں کر سکتی تھیں۔ عادل کی بات جب بھی چھیڑی جاتی تہمینہ پھوپھو نظریں چرا جاتی تھیں اور صندل بس انہیں گھور کر رہ جاتی تھی۔

وہ دن بہت بے کیف تھے۔ سردیاں مکمل طور پر آچکی تھیں اور پت جھڑ کی اداسی تھی کہ جانے کا نام نہ لیتی تھی۔ سارے موسم میں مردہ تتلیوں کی باس پھیلی ہوئی تھی۔ وہ تتلیاں جو اپنی بے رحم قید کی وجہ سے مر

گئی تھیں یا شاید انہوں نے خود کو ختم کر لیا تھا۔ کون جانے...... اصل حقائق کیا تھے۔ دن کی روشنی میں کتنا اندھیرا قید تھا۔

چاند نے ایک دن اسے زبردستی نہلا کر، اسے نئے کپڑے پہنا کر کمرے سے باہر بھیجا تھا۔ وہ کافی دنوں سے اپنے کمرے میں بند تھی۔ باہر جانے کو اس کا من نہیں تھا اس لیے وہ حویلی کی پچھلی طرف کا چھوٹا دروازہ پھلانگ کر سیب کے باغ میں چلی آئی تھی۔ دور ایک بڑے اور اونچے درخت پر ایک پینگ تھی۔ جو اس نے اور افشیں نے وہاں ڈالی تھی۔ افشیں کو یاد کرتے ہوئے وہ پینگ پر بیٹھ کر جھولنے لگی تھی۔ اس خاموش گوشے میں آنے کا مقصد گھر والوں سے چھپ جانا تھا۔ نجانے کیوں وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کا ان دنوں میرزاد سے ملنے کا بھی من نہیں تھا۔ وہ یہ ہی جوڑ توڑ کر رہی تھی کہ جب افشیں گھر میں آئے گی تو وہ اسے کیسے بتائے گی کہ عادل مر چکا ہے۔ اس نے خودکشی کر لی ہے۔

بے چاری صندل بھلا یہ کیسے جان سکتی تھی کہ اب وہ بھلا کہاں ساری زندگی افشیں کو دیکھ پائے گی۔

گہرے نیلے آسمان کو دیکھتے ہوئے وہ ایسی ہی سوچوں میں گم تھی جب رحبانی وہاں آیا تھا۔

''صندل......!''

''جی رحبانی بابا......!'' وہ چونک کر خود کو نارمل دکھانے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

''یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''کچھ نہیں...... پینگ جھول رہی ہوں۔'' اس نے بلاوجہ ہی پینگ کی رفتار بڑھا دی تھی۔

''تم تو ٹھیک سے پینگ بھی نہیں جھول رہی ہو۔ دیکھو ذرا اپنے چہرے کو...... کیسا اداس نظر آ رہا ہے۔'' رحبانی نے کہا تو صندل نے سب ٹھیک ہے کی اداکاری کرنا بند کر دی تھی۔ وہ مزید اداس نظر آنے لگی تھی۔

''کیا بات ہے، مجھے بتاؤ۔''

''مجھے افشیں کی یاد آ رہی ہے۔''

''کیا تم اس سے ملنا چاہتی ہو؟''

''جی ...... کیوں نہیں ......'' وہ چہک کر بولی تھی۔

''تو میں تمہیں اس کے پاس لے جاؤں گا۔''

''کیا سچ میں ......؟''

''بالکل سچ ...... لیکن اس سے پہلے تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔''

''کیا ......؟''

''گھر پر کچھ مہمان آرہے ہیں، تمہیں ان کے سامنے ستار بجانا ہوگا۔''

''بس ...... اتنی سی بات ......''

''اگر تم اتنا سا کام کردو گی تو پھر میں تمہیں لاہور لے جاؤں گا۔ افشیں سے ملوانے ......''

''میں کردوں گی لیکن بتائیں کہ گھر پر آ کون رہا ہے؟''

''بستامی کے کچھ دوست ہیں۔ ان کی خاص دعوت کرنی ہے۔ اچھا کھانا، اچھا انتظام ...... اور پھر انہیں تفریح بھی دینی ہے تو میں نے سوچا کہ اسی بہانے تم سے ستار سن لیا جائے۔ ہم بھی تو دیکھیں کہ تم ستار کو کتنے اچھے سے جاننے لگی ہو۔''

''کیوں نہیں ...... میں بجاؤں گی اور بہت دل سے بجاؤں گی۔'' صندل نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ افشیں سے ملنے کی خوشی تو ایک طرف ...... اسے اس بات کی بھی خوشی تھی کہ وہ ایک بڑے مجمعے کے سامنے ستار بجا کر انہیں محظوظ کرنے والی ہے۔

''تو پھر میں تمہیں بہت جلد افشیں سے ملوانے لے جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے ......'' اس نے رضامندی دے دی تھی۔ اور پھر وہاں سے اٹھ کر اس چھوٹے دروازے کی طرف بڑھی تھی جو حویلی کے اندر کی طرف کھلتا تھا۔

☆......☆......☆

اس نے گہرے سرخ رنگ کا جوڑا پہنا تھا۔ جس کا گھیر اتنا وسیع تھا کہ اسے ایسے لگ رہا تھا جیسے اس کی کمر پر کسی نے کپڑے کے بہت سے تھان باندھ دیے ہوں۔ اسی مناسبت سے اس کا بھاری دوپٹا بھی کافی وزنی تھا۔ جسے اس نے دونوں بازوؤں میں ڈالنے کا سوچ رکھا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دوپٹے کی سیٹنگ اس طرح سے کافی اچھی لگے گی۔

گلے اور کانوں میں اس نے بھاری جیولری پہنی تھی۔ اور ہاتھوں کو خالی ہی رہنے دیا تھا۔ یہ اس کے استاد محترم نے اسے بتایا تھا۔ ستار بجاتے ہوئے ہاتھوں کے کنگن کی کھنکھناہٹ ستار کی آواز میں مل کر اس کا حسن تباہ کر سکتی تھی۔ اس لیے اس نے ہاتھوں میں کچھ نہیں پہنا تھا۔ بالوں کو اس نے کچھ اس ڈھب سے باندھا تھا کہ وہ کھلے ہوئے بھی دکھتے تھے اور بندھے ہوئے بھی...... ساری تیاری کرتے ہوئے وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ ایک تو اس وجہ سے کہ وہ آج پہلی بار ایک ہجوم کے سامنے ستار بجانے جا رہی تھی اور دوسرا اس وجہ سے کہ آج میرزاد بھی آنے والا تھا۔ تقریب کا بہانہ بنا کر اس نے اسے بھی مدعو کر لیا تھا۔

چاندو وہاں آئی تھی۔ اس نے صندل کو دیکھا تھا اور اس کے چہرے پر ناگواری پھیلی تھی۔

''تم اس قدر تیار کیوں ہو رہی ہو صندل......؟'' اس کا لہجہ سخت تھا۔ جسے صندل نے نظر انداز کر دیا تھا۔

''میری زندگی کی پہلی پرفارمنس ہے چاندامی...... میں تیار کیسے نہ ہوں۔''

''ایک تو تم نے مجھ سے پوچھے بنا سب کے سامنے ستار بجانے کی ہامی بھر لی...... مجھے بتانا بھی مناسب نہیں سمجھا۔''

''رحمانی بابا نے اتنے پیار سے کہا تھا...... میں انکار کیسے کرتی۔''

''اس کی بات تم تب مانتیں جب وہ ستار کو خود سننے کی فرمائش کرتا...... سو لوگوں کے درمیان بٹھا دیا ہے اس نے تمہیں......''

''آپ کو برا لگ رہا ہے......؟'' وہ بناوٹی انداز میں ہمدردی کرتے ہوئے بولی تھی۔

''ہاں...... کیونکہ بستامی کی محفل مجھے کبھی بھی پسند نہیں آئی۔ نجانے کس کس کو بلایا ہے اس نے...... کیسے لوگ ہیں، کون ہیں، کیسے مزاج کے ہیں۔'' چاند نے کہا تو اسے ان سب باتوں کی نزاکت کا احساس ہوا تھا۔

''معافی چاہتی ہوں۔ دوبارہ ایسی غلطی نہیں کروں گی۔''

''مجھے نہیں پسند کہ میری بیٹی کسی غلط نیت والے آدمی کے سامنے جا کر بیٹھ جائے۔ وہ بھی سج دھج کر......'' چاند کو صندل پر کافی غصہ تھا۔ جو جانے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ غصہ تو اسے بستامی پر بھی تھا کہ وہ حویلی میں کیا کچھ کرنے لگا ہے۔ لیکن چونکہ وہ بستامی کے معاملات میں کم کم بولا کرتی تھی اس لیے اس نے بستامی سے کچھ بھی کہنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

''مجھ سے واقعی ہی میں غلطی ہوئی ہے۔''

''دوبارہ ایسی غلطی نہ ہو...... آج کرلو...... اور پھر کوئی کہے بھی تو صاف منع کر دینا۔''

''جی اچھا......''

چاند اپنی کہہ کر وہاں سے چلی گئی تھی۔ وہ چند لمحے تو خاموش رہی تھی، پھر دوبارہ سے تیار ہونے لگی تھی۔

''ٹھیک ہے جو ہونا تھا ہو گیا ہے۔ لیکن اب میں اپنا پہلا شو پوری تیاری سے کرنا چاہتی ہوں۔'' رخ سنگار میز کی طرف کرتے ہوئے وہ پھر سے تیار ہونے میں مشغول ہو گئی تھی۔ آج بھانت بھانت کے لوگ آنے والے تھے۔ اسے سب پر اپنا سحر بھی تو طاری کرنا تھا۔ اور سب سے بڑی بات...... آج میر بھی تو آنے والا تھا۔

☆......☆......☆

''کہاں جا رہے ہو میر......؟''

آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے وہ خود پر پرفیوم کا اسپرے کر رہا تھا جب زویا وہاں آئی تھی۔ اس

نے تیار شدہ میر کو دیکھا تھا اور پھر ظاہر ہے کہ اس کا یہ سوال پوچھنا تو بنتا ہی تھا۔

''صندل کے گھر......'' وہ صاف گوئی سے گویا ہوا تھا۔

''کیا کرنے......؟''

''آج ان کے گھر کوئی تقریب ہے۔ پارٹی سمجھ لیں......صندل نے مجھے بھی بلایا ہے۔''

''حیرت ہے، صندل نے مجھے نہیں بلایا۔''

''اس معاملے میں مجھ سے ہی غلطی ہوئی۔ میں صندل کو کہہ چکا تھا کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''ہاں......وقتی خراب تھی۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں دائمی بیمار ہوں۔''

''آپ نے چلنا ہے تو ساتھ چل سکتی ہیں۔''

''نہیں......بن بلائے مہمان بن کر جانا مجھے پسند نہیں ہے۔ تم جاؤ۔''

''جی......'' کہہ کر وہ پھر سے تیار ہونے لگا تھا۔ زویا اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظروں میں ناگواری تھی۔ چند لمحے دیکھتے رہنے کے بعد وہ وہاں سے چلی گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد میر نے گہری سانس بھری تھی۔ زویا کی نظروں کے عتاب سے بچنا اس کے لیے مشکل ثابت ہو رہا تھا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر زویا نے فوراً سے زوہیب کو کال کی تھی۔

''زوہیب......! تم فوراً حویلیاں آجاؤ......تانیہ کو اپنے ساتھ لے آنا......میں چاہتی ہوں کہ اسی جمعے کو تانیہ اور میر کی منگنی کر دی جائے۔''

فون بند ہو جانے کے بعد زویا تسلی سے مسکرائی تھی۔

☆......☆......☆

ساری حویلی کو بہت اچھے سے سجا دیا گیا تھا۔ پھولوں سے، روشنیوں سے......حویلی کے چاروں طرف کی دیواروں پر بڑے بڑے قمقموں والی لڑیاں لگا دی گئی تھیں اور جگہ جگہ پھولوں کے گلدان رکھ دیے گئے تھے۔ ساری حویلی ہی جگمگ کرنے لگی تھی۔ بیٹھنے کا سارا انتظام حویلی کے صحن میں کیا گیا تھا۔ سارے

فرش پر سرخ قالین بچھوائے گئے تھے جن پر گول ٹیبل لگوائے گئے تھے۔ ان گول ٹیبلوں کے اطراف میں کرسیاں لگوائی گئی تھیں۔ یہ اپنی طرز کا انوکھا انتظام تھا جو حویلی کی خواتین زندگی میں پہلی بار دیکھ رہی تھیں۔

کھانے کے لیے باہر سے باورچی بلوائے گئے تھے۔ گھر کے باورچیوں پر بھروسہ نہیں کیا گیا تھا۔ کھانے کے لیے برتن بھی باہر سے ہی آئے تھے اور وہ اتنے جدید تھے کہ ایسے برتن پہلے سب نے بس ٹی وی ڈراموں میں ہی دیکھے تھے۔

پہلے پہل تو حویلی کے سب ہی مکینوں نے اس پارٹی میں دل چسپی لی تھی۔ لیکن پھر مین پارٹی والے دن سب پیچھے ہو گئے تھے۔ تقریب کچھ عجیب رنگ اختیار کرتی جا رہی تھی۔ پہلے تو سب کو اسی بات پر بہت حیرت ہوئی تھی کہ مرد اور عورتوں کی کرسیوں میں کوئی پردہ نہیں ہے۔ سب نے ایک ساتھ بیٹھنا ہے۔ پھر گول ٹیبل...... جن پر جام سجائے جا رہے تھے۔ یہاں تک بھی بات حدود سے نکلی ہوئی نہ تھی۔ لیکن شام ہونے تک ساری لڑکیوں نے دیکھا کہ گول ٹیبلوں پر تاش بھی رکھی جا رہی تھی۔ شطرنج کی بازیاں سجائی جا رہی تھیں۔ یہ کیسی تقریب تھی؟ یہاں تک بھی شاید برداشت کا مظاہرہ کیا جا سکتا تھا۔ لیکن جب وہاں شراب کی بوتلوں کے کارٹن پہنچے تو سب لڑکیوں نے چیخ ماردی تھی۔

"تم میں سے کوئی چاندامی کو مت بتائے کہ یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ انہوں نے مجھے ہرگز ستار نہیں بجانے دینا۔"

"لیکن صندل...... !تم خود ایسی جگہ پر ستار بجانا ہی کیوں چاہتی ہو؟"

"میں یہ سب افشیں کے لیے کر رہی ہوں۔"

"افشیں کے لیے تم اب کیا کر سکتی ہو؟ اس بے چاری کے ساتھ جو ہونا تھا ہو گیا ہے۔"

"میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔ رحمانی بابا نے کہا ہے کہ وہ مجھے اس کے پاس لے جائیں گے۔ تم سب پلیز چاندامی کو کچھ مت بتانا۔"

"نہیں بتائیں گے، لیکن ہم سب میں سے کوئی تقریب میں شریک نہیں ہو گا۔"

''تو پھر میر کو کمپنی کون دے گا......؟ مجھے تو دور بیٹھ کر ستار بجانا ہے۔''

''اسے آج اکیلا ہی رہنے دو۔ ہماری ماؤں نے سختی سے منع کیا ہے کہ آج کوئی کمروں سے باہر نہیں نکلے گا۔''

سب کزن کہہ کر وہاں سے نکل گئی تھیں۔ صندل کو وقتی طور پر شرمندگی ہوئی تھی۔ کہیں رحبانی کے سامنے ستار بجانے کی ہامی بھر کر اس نے غلطی تو نہیں کر لی تھی۔ جو بھی تھا، اب پیچھے نہیں ہٹا جا سکتا تھا، تقریب کا وقت شروع ہونے میں چند ہی منٹ رہتے تھے۔

جوں جوں شام گہری ہونے لگی تھی، حویلی میں مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ سب سے پہلے تو روشن بیگم پہنچی تھیں اور اس کے بعد نجانے کون کون...... پتا نہیں وہ کون لوگ تھے اور کہاں کہاں سے آ رہے تھے۔ لیکن اتنی شان و شوکت سے آ رہے تھے کہ کھڑکیوں سے جھانکتی لڑکیوں کے دل دھک سے رہ گئے تھے۔

حویلی کے باہر شاندار بگھیوں کا ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا۔ جیپ، مرسڈیز......اور کون سی گاڑی تھی جو مہنگی نہیں تھی۔ ان سب سواریوں میں سے امیر کبیر لوگ نکل رہے تھے۔ دولت کی فراوانی جن کے چہروں پر لکھی ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ حویلی کا صحن بھرنے لگا تھا۔ ان سب کو مشروب پیش کیا جا رہا تھا۔ لوگ خوش گپیوں میں مشغول ہو گئے تھے۔ کچھ مردوں نے سگار لیے تھے۔ مرد تو مرد وہاں تو کچھ عورتیں بھی سگریٹ پینے لگی تھیں۔ کھڑکیوں سے جھانکتے ہوئے لڑکیاں دم بخود ہو چکی تھیں۔ عورتوں کے پہناوے بہت عجیب وضع کے تھے۔ لیکن جو بھی تھا، ان پر جچ رہا تھا۔

میر بھی آ چکا تھا اور وہ ایک کونے میں کچھ حیران و پریشان بیٹھا ہوا تھا۔ کیسا عجیب سا ماحول بنا ہوا تھا آج حویلی کے صحن میں...... اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی امریکن فلم دیکھ رہا ہو۔ تاش، شطرنج، شراب...... صندل لوگ تو کافی خاندانی تھے۔ پھر یہ سب کیا تھا۔ وہ صندل سے اس بارے میں پوچھتا لیکن وہ اسے نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں شکر ادا کر رہا تھا کہ وہ آج زویا کے ساتھ یہاں نہیں آ گیا۔

وہ جسے پہلے ہی لوگ پسند نہیں آتے تھے آج اگر وہ یہاں آجاتی تو اسے ان لوگوں سے نفرت ہو جاتی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد صندل وہاں آگئی تھی۔ اس کی پائلوں کی چھن چھن نے سب کو ہی اس کی طرف متوجہ کیا تھا۔ سب اپنی باتیں چھوڑ کر صندل کو دیکھنے لگے تھے۔ صندل کو یہ سب اچھا لگا تھا۔ پھر وہ وسط میں پڑے قدرے نیچے گول ٹیبل پر بیٹھ کر ستار بجانے لگی تھی۔ پتا نہیں کون سی دھن بجا رہی تھی وہ...... کیا گا رہی تھی۔ لیکن سب ایسے سر دھن رہے تھے جیسے سب بچپن سے ستار کو سنتے چلے آ رہے ہوں اور ستار کے رسیا ہوں۔ تاش اور شطرنج کی بازیاں تھوڑی دیر کے لیے موقوف ہو گئی تھیں۔ اٹھے ہوئے جام لبوں تک نہ لگ سکے تھے۔ روشن بیگم نے سب سے کہا تو تھا کہ وہ تقریب میں ایک کوہ نور کو بھی بلائے گی۔ لیکن یہ کوہ نور ایسا روشن ہوگا، کسی نے کہاں سوچا تھا۔

روشن بیگم، بستامی اور رحبانی...... تینوں مہمانوں کو ہر طرح سے تفریح مہیا کر رہے تھے۔ روشن بیگم تو تقریباً وہاں سب کو ہی جانتی تھیں کیونکہ آدھے سے زیادہ تو اس کے گاہک تھے۔ وہ سب سے چہک چہک کر باتیں کر رہی تھیں اور پوچھ رہی تھیں کہ انہیں صندل کیسی لگی۔ ستار بجاتی صندل کو احساس تک نہ تھا کہ وہ غلیظ نظروں والے مردوں کے درمیان ایک سجاوٹی گڑیا کی طرح بیٹھی ہے۔ مرد اس کے ستار کو سننے سے زیادہ اسے سر سے پیر تک دیکھ رہے ہیں۔ پرکھ رہے ہیں۔ جانچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ صرف ایک میر تھا جو اسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

''روشن بیگم...... بات سنیے......'' ایک بارعب آواز روشن بیگم کے کانوں میں اتری تھی۔ چہکتے ہوئے وہ پلٹی تھیں۔ انہیں پکارنے والا کمال تھا۔ کشمیری قالینوں کا تاجر......

''جی فرمایئے......''

''یہ لڑکی کون ہے؟''

''صندل نام ہے اس کا...... میری ہی بیٹی سمجھ لیں آپ......''

''مجھے پسند آئی ہے۔'' کمال نے مسکرا کر کہا تھا۔

''پسند تو بہت سوں کو آئی ہے۔ بات تو قدر کی ہے ناں کمال صاحب...... کہ ہیرے کو کون کتنے قیراط کے سونے میں جڑواتا ہے۔''

''کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں۔''

''ابھی ان صاحب سے بات ہو رہی تھی۔ کہہ رہے تھے کہ ابھی کے ابھی دس مربع زمین نام لگانے کو تیار ہوں لڑکی کے......''

''لیکن آپ سودا طے کرنے سے پہلے مجھے ضرور بتایئے گا۔''

''آپ بات تو کریں۔ آفر پسند آئی تو سمجھیں کہ مال آپ کا ہوا۔'' روشن بیگم نے کہا تھا اور پھر بستامی کو اشارے سے وہاں بلا لیا تھا۔ انہیں کمال کی بے تابی سے اندازہ ہوا تھا کہ یہاں سے صندل کی زیادہ رقم ہاتھ آسکتی ہے۔

''ایک کلو سونا......'' کمال نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا تھا۔ روشن بیگم اور بستامی دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

''ڈیڑھ کلو......'' کمال کو لگا تھا کہ اس نے کم دام لگایا ہے۔

''منظور ہے۔'' بستامی نے رضا مندی دے دی تھی۔

''صندل آپ کی ہوئی۔'' روشن بیگم نے مسکراتے ہوئے بات فائنل کی تھی۔ کمال ہوس بھری نظروں سے صندل کو دیکھنے لگا تھا۔ وسط میں بیٹھی صندل کو اندازہ تک نہیں تھا کہ اس کا سودا طے ہو چکا ہے۔



ناول **تاش گھر** ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **1** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 12

سنہ ۲۰۰۰ء

"آج کی شام آپ نے کس مغنیہ کو دعوت دی ہے؟" اس موٹی توند والے سرکاری آفیسر نے اونچے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اپنے میزبان آفیسر سے پوچھا تھا۔

"باریشہ نام ہے لڑکی کا..... نئی ہے ابھی..... لیکن کافی نام بنا چکی ہے اس فیلڈ میں....."

"نام میں تو کسی گھرانے کی جھلک نہیں....."

"لیکن آواز میں ہے۔ ایک تو حویلیاں شہر سے ہے۔ دوسرا دین حویلی کی لڑکی..... اور سب سے بڑی بات..... صندل کی بیٹی....."

"کون صندل.....؟"

"شاید آپ نہیں جانتے..... کیونکہ میرے خیال سے آپ نے حویلیاں شہر کی وہ پارٹی اٹینڈ نہیں کی جہاں اس لڑکی کی ماں سے ستار بجایا تھا۔ قسم سے آفت تھی۔"

"کون..... ستار..... یا..... لڑکی.....؟" آفیسر نے ہنستے ہوئے پوچھا تھا۔

"اجی چھوڑیے..... ستار لڑکی بجا رہی ہو تو ستار کو کون دیکھتا ہے۔"

اور اس بات پر دونوں ہی دل کھول کر ہنسے تھے۔

"سنا ہے کہ تب ایک کشمیری تاجر اس پر بری طرح سے عاشق ہو گیا تھا۔"

پھر.....؟" سننے والے نے تعجب کا اظہار کیا تھا۔

''صندل کو پانے کی خاطر اس نے سونے میں تول دینے کی پیش کش کی تھی۔''

''یقیناً بستامی مان گیا ہوگا۔''

''ظاہر ہے ان لوگوں کا اور کام ہی کیا ہوتا ہے۔ پیسے کے پیچھے پاگل ہوتے ہیں یہ لوگ......''

''ان لوگوں کا دین ایمان پیسہ ہوتا ہے۔''

''یہ مغنیہ اسی کی بیٹی ہے۔''

''بلائیے...... دیکھتے ہیں کیا آفت ہے اس آفت کی بیٹی......''

میزبان نے اپنے قریب سے گزرتے ایک بیرے کو اشارے سے اپنے پاس بلایا تھا۔

''کیا سب مہمان آچکے ہیں؟''

''جی سر......!''

''پھر آج کی محفل کی شان کو بھی بلا لاؤ۔''

''جی بہتر سر......!'' بیرا کہہ کر وہاں سے رخصت ہوا تھا۔

☆......☆......☆

''سکل بن پھول رہی سرسوں...... بن بن پھول رہی سرسوں

امبوا پھوٹے ٹیسو پھولے...... کوئل بولے ڈار ڈار

اور گوری کرت سنگار...... ملنیاں گڈھوا لے آئیں کرسوں''

وہ مکمل دھیان لگا کر آج کے گانے کی مشق کر رہی تھی۔ یہاں تک لانے کے لیے اسے سب ٹھیک سے سکھایا گیا تھا۔ سمجھایا گیا تھا۔ ایمن مامی نے تو اس گیت کی مشق نجانے اسے کتنی بار کروائی تھی۔ لیکن ایک بڑے مجمعے کے سامنے جانے کے خیال سے وہ کچھ گھبرائی ہوئی تھی اور بار بار آج کے گیت کی مشق کیے جا رہی تھی۔

بیوٹیشن اس کا میک اپ کر چکی تھی اور اب اس کے بالوں میں لہریں ڈال کر انہیں پھیلاؤ میں بڑا کر رہی تھی۔ کرسی پر بیٹھی اپنے بھاری لباس کو بے نیازی سے دائیں بائیں جھٹکے وہ "سرسوں" کو دہرائی جا رہی تھی۔ اور جب جب "سرسوں" کہتے ہوئے ہاتھ ہلاتی تھی تو اس کے ہاتھوں میں پڑے ہوئے بھاری کنگن بجنے لگتے تھے۔ جنہیں کچھ خیال آنے پر اس نے جلدی سے اتار دیا تھا۔ کنگنوں کی یہ آواز اس کے گیت میں خلل ڈال سکتی تھی۔

"نتاشہ...... سننا ذرا...... میں ٹھیک گا رہی ہوں۔" اس نے اپنے ساتھ آئی لڑکی کو گیت گا کر سنایا تھا۔ اس کا تلفظ ٹھیک تھا۔ ادائی بھی ٹھیک تھی لیکن گھبراہٹ تھی کہ جانے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

"سب ٹھیک ہے باریشہ بی بی...... آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔"

"پتا نہیں کیوں......؟"

"آپ بستامی بابا سے بات کر لیں...... وہ اس موقع پر یقیناً آپ کو بہتر نصیحت کریں گے۔"

باریشہ کے سر ہلا دینے کے بعد نتاشہ نے بستامی بابا کو کال کر کے فون باریشہ کو پکڑا دیا تھا۔ باریشہ نے چند منٹ بستامی بابا سے بات کی تھی۔ نتاشہ نے ٹھیک کہا تھا۔ بستامی بابا نے اسے اتنے پیار سے پرسکون کیا تھا کہ اس کی ساری گھبراہٹ دور ہو گئی تھی۔

"گیت گاتے ہوئے اپنی ماں کو سوچو باریشہ...... اس نے اس قدر خوب صورتی سے ستار بجایا تھا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ کیونکہ تب اس کے سامنے وہ شخص بیٹھا ہوا تھا جسے وہ اپنا محبوب سمجھتی تھی...... میرزاد...... تم بھی سمجھو کہ تم گیت کسی ایک خاص کے لیے گا رہی ہو۔" بستامی بابا کی الوداعی بات نے اس کے اندر نئی توانائی بھر دی تھی۔ فون کے بند ہو جانے تک وہ مطمئن ہو چکی تھی۔

"پریشان مت ہوں۔ اب آپ بہت اچھے سے گیت گا رہی ہیں۔" بیوٹیشن نے اس کے بال سیٹ کرتے ہوئے اس سے کہا تھا۔

"کیا سچ میں؟"

"جی...... جھوٹ کیوں بولوں گی۔ بہت ترنم ہے آپ کی آواز میں......"

"پہلی بار اتنے بڑے مجمعے کا سامنا کر رہی ہوں تو تھوڑا نروس ہو گئی تھی۔"

"جوس پی لیں۔"

"نہیں...... گانے سے پہلے کچھ بھی ٹھنڈا نہیں پیتے۔"

"تو پھر چائے پی لیں۔ آپ کو سکون دے گی۔"

"ہاں...... ایک کپ چائے منگوادیں۔"

بیوٹیشن نے کمرے میں پڑے فون پر ایک کپ چائے کا آرڈر دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی چائے آگئی تھی۔ ساتھ ہی پیغام بھی آگیا تھا کہ باریشہ بی بی کو نیچے بلایا جا رہا ہے۔

"بس تھوڑی دیر میں میم نیچے آتی ہیں۔" نتاشہ نے پیغام لانے والے کو کہا تھا۔

باریشہ نے جلدی جلدی چائے کو ختم کیا تھا۔ چائے پینے سے اسے واقعی ہی مزید سکون ملا تھا۔ پتا نہیں یہ چائے کا ذائقہ تھا یا اس کی حدت...... وہ مطمئن ہو چکی تھی۔ وہ باہر جانے کے لیے کھڑی ہوئی تو بیوٹیشن نے اس کا دوپٹا سیٹ کر دیا۔ اس کا کام دار گاؤن بھاری ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے پاؤں کو چھو رہا تھا۔ وزنی دوپٹے کو بیوٹیشن نے اس طرح سے سیٹ کیا تھا کہ لباس کا گھیراؤ مزید وسعت اختیار کر چکا تھا۔

"اب آپ تیار ہیں۔ نیچے جا سکتی ہیں۔" بیوٹیشن نے مسکراتے چہرے کے ساتھ کہا تو وہ بھی جواباً مسکرائی تھی اور پھر نتاشہ کی تقلید میں نیچے کی طرف چلی گئی تھی۔

☆......☆......☆

محفل کا انتظام گھر کے وسیع باغ میں کیا گیا تھا۔ مہمانوں کی تعداد چار سو کے لگ بھگ تھی۔ دائیں بائیں پھرتے بیروں کی ٹیم نے تعداد کو مزید بڑھا دیا ہوا تھا۔ سج سج کر پاؤں رکھتی باریشہ وہاں تک آئی تھی۔

اس کے گھنگھروؤں کی جھنکار سے سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔لوگوں کی نظروں میں اس کے لیے ستائش تھی۔وہ نظروں ہی نظروں میں اس کی خوب صورتی کو سراہ رہے تھے۔باریشہ کے چہرے پر مسکراہٹ آئی تھی۔وہ اپنی زندگی میں یہ ہی سب چاہتی تھی۔جو اسے بستامی بابا کی بدولت مل رہا تھا۔

سب مہمانوں کے سامنے پڑے تخت پر وہ بیٹھ گئی تھی۔نتاشہ نے اس کا لباس تخت پر کسی حد تک پھیلا دیا تھا۔میزبان کے اشارے پر سازندوں نے اپنے سازوں کو چھیڑا تھا۔

''سکل بن پھول رہی سرسوں......'' اس نے کہنا چاہا تھا۔

لیکن آواز کہیں اس کے حلق میں ہی بیٹھ گئی تھی۔

''سکل بن......'' اس نے پھر سے کہنا چاہا تھا اور اب کے آواز ایسے برآمد ہوئی تھی جیسے اس کے گلے میں کسی نے روئی دفن کردی ہو۔میزبان اور مہمانوں نے اسے دیکھا تھا۔نتاشہ کے چہرے پر تو سخت گھبراہٹ تھی اور باریشہ...... چند لمحے پہلے تک جو اس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پالیا تھا تو وہ ساری کی ساری اس کے چہرے پر پھر سے نمودار ہو گئی تھی۔اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا تھا۔لیکن گلا صاف نہیں ہوا تھا۔اس کی کھنکار بھی لحافوں میں دبی ہوئی برآمد ہوئی تھی۔جس نے اس کے چہرے پر مزید وحشت طاری کردی تھی۔

''سکل بن پھول......''

مہمانوں نے اب کے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔ان کی نظروں میں باریشہ کے لیے تضحیک تھی۔

کیا کرنے آئی تھی یہ لڑکی یہاں......اگر اسے کچھ گانا ہی نہیں آتا تھا تو......

سازندوں نے ساز بند کیا تھا۔اور اس کے کہنے پر ایک بار پھر سے ساز اٹھائے تھے۔اس نے ہمت سے کام لیتے ہوئے ایک بار پھر سے کوشش کی تھی۔

''سکل......''

بس......اس بار مزید شک کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔وہ جانتی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔اور

اگلے ہی پل وہ وہاں سے اٹھی تھی اور باہر بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔

بھاری لباس کے ساتھ بھاگتے سارے مجمعے نے اسے گھر سے باہر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ نتاشہ اس کے پیچھے لپکی تھی۔ لیکن گیٹ سے باہر نکلتے ہی وہ جیسے غائب ہوگئی تھی۔ شرمندگی کے مارے وہ مجمعے سے، ان لوگوں سے، بہت دور چلی جانا چاہتی تھی۔

بہت دور پہنچ کر اس نے ایک درخت کے سائے تلے رک کر اپنی سانس بحال کی تھی۔ بھاگتے بھاگتے وہ تھک چکی تھی اور شرمندگی کی وجہ سے نڈھال ہو چکی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بلند آواز میں رونا شروع کردے۔ اس کی زندگی کا اہم دن برباد ہو چکا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ سب کس کی وجہ سے ہوا ہے۔ چاند بی بی کی وجہ سے......

اسے چاند بی بی کی بددعا لگ چکی تھی۔ وہ بوڑھی مکارن اسی میں تو ماہر تھی۔ اس نے اس کی ماں کی زندگی بھی برباد کردی تھی۔ اب وہ اس کی زندگی کے درپے ہو چکی تھی۔

☆......☆......☆

"چاند......!"

وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے نیچے جانا چاہتی تھی جب بستامی نے اسے پکارا تھا۔ چاند نے رک کر بستامی کو دیکھا تھا۔

"ذرا کمرے میں آؤ۔" بستامی کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ چار و ناچار چاند بھی اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اس کا ابھی کچھ دن بستامی سے بات کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ کل رات کو جو پارٹی کے نام پر بے حیائی ہوئی تھی اس کی وجہ سے اسے بستامی پر کافی غصہ تھا۔ وہ اس سب کا ذکر کرنا چاہتی تھی لیکن کسی مناسب وقت پر......

"ہاں بولو...... کیا بات ہے؟"

''صندل اب بڑی ہوگئی ہے۔اس کی شادی کے بارے میں کچھ سوچا ہے تم نے؟''

چاند کو بستامی کی بات پر کچھ حیرت ہوئی تھی۔اسے بھلا کب سے صندل کی اتنی فکر ہونے لگی۔

''خیریت......آج تمہیں صندل کا خیال کیسے آ گیا؟''

''وہ بھی گھر کا حصہ ہے......بے شک میں اس سے تمام عمر غافل رہا ہوں۔لیکن اب میں خود کو گھر کے معاملات میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔تا کہ سب احسن طریقے سے ہو۔''

''تمہارے احسن طریقے کی مثال میں افشیں کی شادی کے طور پر دیکھ چکی ہوں......'' چاند نے اسے لاجواب کیا تھا۔''خیر جب صندل کا وقت آئے گا سوچ لوں گی۔'' چاند نے رکھائی سے کہا تھا۔

''وقت تو آ چکا ہے۔تم دیکھ نہیں رہی کہ وہ جوان ہو چکی ہے۔''

''ہاں......لیکن حویلی کی باقی لڑکیاں بھی جوان ہو چکی ہیں۔پہلے ان سب کی شادی ہو گی۔پھر صندل کی باری آئے گی۔صندل اپنی کزنوں میں سب سے چھوٹی ہے۔ایسے ہی سب کو چھوڑ کر اس کی شادی نہیں کی جا سکتی۔''

''باقی سب کی بھی ہو جائے گی۔جب ان کا وقت آئے گا۔''

''تمہیں صندل کی شادی کی اتنی جلدی کیوں ہے؟ کیا تم شادی کے بہانے اسے اس حویلی سے نکالنا چاہتے ہو؟''

''ہر وقت میرے بارے میں غلط مت سوچتی رہا کرو......'' بستامی اس کے قریب ہوا تھا۔پیار سے اس نے چاند کے کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ لیے تھے۔چاند، بستامی کے اتنے اپنائیت بھرے انداز پر حیران ہوئی تھی۔

''میری بات سنو چاند......کل پارٹی میں ایک کشمیری تاجر بھی آیا ہوا تھا۔اس نے صندل میں دلچسپی ظاہر کی ہے۔''

''کیا...... تم ٹھیک تو ہو بستامی......؟'' چاند نے غصے سے بستامی کے ہاتھ اپنے کندھوں سے پرے کیے تھے۔

''کل تمہاری پارٹی میں کیا کوئی ایک بھی کام کا شخص موجود تھا۔ سب مجھے اوباش اور عیاش خاندانوں کے لوگ لگ رہے تھے۔ نجانے کیا سوچ کر تم نے ان لوگوں کو گھر پر بلا لیا۔ جبکہ تم جانتے بھی ہو کہ گھر میں جوان لڑکیاں موجود ہیں۔'' چاند نے غصے سے کہا تھا۔

بستامی نے ضبط سے چاند کی باتوں کو برداشت کیا تھا۔ ابھی حکمت عملی کا تقاضا یہ ہی تھا کہ وہ سب ہنس کر برداشت کرے۔

''ہاں...... ٹھیک کہہ رہی ہو تم...... مجھ سے غلطی ہوئی۔ مجھے دوستوں کے دوستوں کو نہیں بلانا چاہیے تھا۔''

بستامی نے بناوٹی انداز میں شرمندگی ظاہر کی تو چاند کچھ نرم ہوئی تھی۔

''دوبارہ ایسی حرکت نہیں ہوگی۔ سچ کہہ رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔''

''لیکن تم صندل کے رشتے کے بارے میں تو دلچسپی ظاہر کرو۔ بہت ٹھیک ٹھاک لوگ ہیں وہ...... صندل بہت خوش......''

''میں صندل کا رشتہ طے کر چکی ہوں بستامی......'' چاند نے بات کاٹتے ہوئے کہا تھا۔ اور جیسے بستامی کے اعصاب پر دھماکا کیا تھا۔

''کیا......؟ کب اور کہاں......؟'' اس کی آواز جیسے بہت دور سے آتی سنائی دی تھی۔

''جب وقت آئے گا تو بتا دوں گی۔ تم فی الحال انہیں جواب دے دو۔ میں صندل کی شادی وہاں ہی کروں گی جہاں بات چیت طے کر چکی ہوں۔'' چاند نے دوٹوک انداز میں کہہ کر بات ختم کر دی تھی۔

بستامی کو چاند کی بات پر غصہ تو بہت آیا تھا لیکن وہ برداشت کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

"یہ لوگ بہت اچھے ہیں چاند......" وہ تو جیسے منت کرنے پر آ گیا تھا۔

"جس قدر مرضی اچھے ہوں۔ میں اپنی بیٹی کی شادی وہاں ہی کروں گی جہاں اس کی خوشی ہو گی۔"

"لیکن......"

"بس...... بات کو ختم کرو اب بستامی...... اگر وہ لوگ اتنے ہی اچھے ہیں تو حویلی کی باقی لڑکیوں میں سے کسی کا رشتہ طے کروا دو...... لیکن صندل کے بارے میں مت سوچنا......" چاند نے دوٹوک انداز میں کہا تھا۔

"لیکن وہ تو صندل......"

"بس پھر اس قصے کو ہی ختم کر دو۔" چاند کہہ کر کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔

بستامی آنکھوں میں غصہ بھرے چاند کو جاتا ہوا دیکھتا رہا تھا۔ چاند کے معاملے میں وہ بے بس تھا۔ وہ چاند پر تہمینہ، شکیلہ یا زہرہ پھوپھو کی طرح رعب نہیں جما سکتا تھا۔ وہ تینوں اس کی قرض دار تھیں لیکن چاند کسی بھی معاملے میں اس کی قرض دار نہیں تھی۔ وہ اپنے باپ کے گھر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اپنا کام کر کے کھا رہی تھی۔

دوسری طرف کشمیری تاجر کمال تھا۔ جو صندل پر مرمٹا تھا۔ وہ مزید رقم بھی دے سکتا تھا۔ بستامی نے سوچا تھا کہ صندل کے عوض وہ اپنی حویلی کی خالی تجوریوں کو پھر سے سونے سے بھر لے گا۔ لیکن چاند...... اسے منانا ناممکن نظر آ رہا تھا۔ پھر بھی ابھی بستامی نے ہار نہیں مانی تھی۔ بہت سے داؤ پیچ ابھی باقی تھے۔ کچھ اسے روشن بیگم بتا سکتی تھیں، اور کچھ رحبانی......

"یقیناً رحبانی کوئی بہتر مشورہ دے سکتا ہے۔" بستامی کے ذہن میں خیال آیا تھا۔ وہ رحبانی کے کمرے کی طرف بڑھا تھا۔



میر زاد کے گھر کا بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ صندل بنا جھجکے اندر داخل ہوئی تھی۔ وہ اس گھر میں اتنی بار آ چکی تھی کہ یہ گھر بھی اب اسے اپنا اپنا ہی لگنے لگا تھا۔

وہ سردیوں کے عروج کے دن تھے۔ خزاں کے بعد ہر پودے، ہر درخت پر مردنی طاری ہو چکی تھی۔ ہوا جو اپنے ساتھ مٹی لاتی تھی وہ سوکھے درختوں پر کہر کی وجہ سے ڈھیر ہو جاتی تھی۔ جس سے مڑے تڑے درخت مزید گدلے دکھتے تھے۔ میر زاد کے گھر کا باغ بھی مردہ ہو رہا تھا۔ سارے پودے درخت سوکھ چکے تھے۔ کہیں کسی پودے پر کوئی پھول نہیں تھا۔ خزاں کیا ایسی ہی بے رونقی اپنے ساتھ لاتی ہے۔ جب وہ پہلی بار یہاں آئی تھی تو یہ باغ طرح طرح کے پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ نجانے کتنی ہی دیر اسے دیکھتے ہوئے مسحور ہوتی رہی تھی۔

یہ یاد کرتے ہی اسے میر زاد کا اسے چور چور پکارنا بھی یاد آ گیا تھا۔ بے اختیار ہی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آئی تھی۔ اور اب وہ اسی چور لڑکی کے ساتھ پوری زندگی بتانا چاہتا تھا۔ اس نے کیسے دل موہ لینے والے انداز میں اسے شادی کے لیے کہا تھا۔ اپنا گھر دکھاتے ہوئے اور آرزو کرتے ہوئے کہ وہ اس کے ساتھ اس گھر میں زندگی بتانا چاہتا ہے۔ صندل کا تو دل چاہ رہا تھا کہ وہ اسی وقت اس گھر میں رہنا شروع کر دے۔ کبھی گھر واپس نہ آئے۔

ایک کوئل گنگناتی ہوئی وہاں سے گزری تو وہ اپنی سوچوں سے باہر آئی تھی۔ نظریں جو خزاں زدہ باغ کو دیکھتے ہوئے بہار کو محسوس کر رہی تھیں وہ بھی جیسے حقیقت کی دنیا میں دیکھنے لگی تھیں۔ وہ باغ جو بہار کے دنوں میں مہک رہا تھا اب خزاں کے دنوں میں باسی بساند دینے لگا تھا۔ بہار سے خزاں تک کا سفر جیسے پل بھر میں ہو گیا تھا۔ تو یعنی کہ اسے یہاں آتے کافی وقت گزر چکا تھا۔ صندل نے انگلیوں پر مہینوں کو گنا تھا۔ چار ماہ ہو چکے تھے۔ اس حساب سے یقیناً زویا کی ڈلیوری کا وقت بھی قریب آ چکا تھا۔

"یہاں کیا کر رہی ہو صندل......؟" اپنے پیچھے اسے زویا کی آواز سنائی دی تو وہ پلٹی تھی۔

''ویسے ہی...... باغ کو دیکھ رہی تھی۔ خزاں میں باغ اچھے نہیں لگتے۔''

''بالکل ٹھیک کہا تم نے...... لیکن تمہارے شہر میں تو باغ بہار میں بھی اچھے نہیں لگتے۔'' زویا کہہ کر خود ہی ہنسی تھی۔ صندل جھینپ سی گئی تھی۔

''آؤ بیٹھو...... کچھ باتیں کریں۔ آج تم سے بہت سی اہم باتیں کرنی ہیں مجھے......'' زویا کے بے حد خوش گوار موڈ پر اسے کچھ حیرت ہوئی تھی۔ آج اس کا انداز کچھ نیا پن لیے ہوئے تھا۔ زویا کی تقلید میں وہ باغ کے وسط میں موجود کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

''ہم لوگ واپس جا رہے ہیں۔'' زویا نے بیٹھتے ہی کہا تھا۔ صندل نے حیرت سے زویا کی طرف دیکھا تھا۔

''کہاں......؟'' وہ چاہ کر بھی اپنی آواز کی حیرت کو کم نہ کر پائی تھی۔

''واپس...... اپنے شہر...... کراچی...... تم تو جانتی ہی ہو کہ میں یہاں کس مقصد کے لیے آئی تھی۔''

''جی...... لیکن ابھی تو بچے کی پیدائش میں وقت ہے۔''

''ہاں...... جانتی ہوں۔ اور میں چاہتی ہوں کہ بچے کی پیدائش کراچی میں جا کر ہو۔ اپنا گھر اپنا ہی ہوتا ہے صندل...... یہاں اکیلی میں کیا کیا کروں گی۔ میرے سسرال کے لوگ وہاں میرا خیال رکھیں گے۔ ایسے وقت میں مجھے ان کی ضرورت ہے۔'' زویا کچھ بناوٹی پریشانی سے بولی تھی۔ صندل کو سب بتاتے ہوئے وہ صندل کے چہرے کے تاثرات کو نوٹس کر رہی تھی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ ان کے واپس جانے کی بات صندل کے لیے کیسی دھماکا خیز ثابت ہوتی ہے۔ اور اب صندل کے چہرے کے اڑے ہوئے رنگ دیکھتے ہوئے اس کے چہرے پر بڑی کمینی سی مسکراہٹ نظر آ رہی تھی۔

''لیکن یہاں میں آپ کا خیال رکھ سکتی ہوں...... چاند امی بھی......''

''بے شک...... تم خیال رکھ سکتی ہو صندل...... لیکن تم میری رشتے دار تھوڑی نہ ہو۔ میرے گھر میں

جوان بھائی موجود ہے۔ تمہارا یہاں رہنا کیسے مناسب ہو سکتا ہے۔"

"تو آپ ہماری حویلی میں رہ لیں......" اس نے نیا خیال پیش کیا تھا۔ "ہم سب مل کر آپ کا خیال رکھیں گے اور بچے کا بھی......"

زویا مسکرائی تھی۔ صندل کی بے قراری اس کی کمینی طبیعت کو تقویت دے رہی تھی۔

"نہیں...... مجھے اپنے سسرال جا کر ہی سکون آئے گا اب......"

زویا کے فیصلہ کن کہنے پر صندل کا منہ اتر گیا تھا۔ مزید کوئی خیال پیش کرنا بے کار تھا۔

"تمہارے گھر کل کوئی پارٹی تھی کیا......؟" وہ آہستہ آہستہ اصل بات کی طرف آ رہی تھی۔

"جی......"

"تم نے مجھے بلایا ہی نہیں......"

"وہ میں نے تو میر...... میرزاد سے کہہ دیا تھا۔ لیکن وہ شاید آپ کو کہنا بھول گیا۔"

"تم براہ راست مجھ سے بھی کہہ سکتی تھیں۔"

"آگے سے دھیان رکھوں گی۔"

"آگے سے دھیان رکھنے کی ضرورت نہیں...... کیونکہ ہم تو یہاں سے جا رہے ہیں اب......" زویا جیسے اسے چڑانے لگی تھی۔

"تم نے مجھے نہیں بلایا، لیکن میں تمہیں ضرور بلاؤں گی۔"

"کہاں......؟" وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی تھی۔

"ہمارے گھر میں بھی فنکشن ہونے والا ہے۔"

زویا نے کہا تو صندل نے سوالیہ سے انداز میں اسے دیکھا تھا۔

"بہت بڑا فنکشن...... کراچی واپس جانے سے پہلے ہو گا۔ ابھی چند دنوں میں گھر میں لوگ آنا

شروع ہو جائیں گے۔ زوہیب بھی آ رہا ہے۔ دیکھنا بہت مزا آئے گا۔ تم اپنی ساری کزنوں کو لانا...... ہم سب مل کر تیاری کریں گے۔ خوب ہلا گلا رہے گا۔ اور کھانا تو میں چاندامی سے تیار کرواؤں گی۔ اس شہر کے خاص روایتی کھانے......" زویا کہتی جا رہی تھی اور صندل اسے چپ چاپ سن رہی تھی۔ آخر زویا بتا کیوں نہیں رہی تھی کہ کیسا فنکشن ہونے جا رہا تھا اس گھر میں......

"جی...... وہ کردیں گی...... جو جو آپ کہیں گی۔"

"تم انہیں آج ہی جا کر بتا دینا کہ میر کے گھر میں فنکشن ہے۔ بہت کچھ تیار کرنا ہے۔"

اگر زویا نہیں بتا رہی تھی تو صندل کی پوچھنے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ نجانے کیوں اسے لگ رہا تھا کہ زویا ضرور کچھ ایسا کہنے والی ہے جو اسے بری طرح سے منتشر کر دے گا۔

"صندل تم سب کزن ایک جیسے کپڑے پہننا...... بہت اچھی لگو گی تم......"

"کیسا فنکشن ہے......؟" صندل نے اٹکتے ہوئے پوچھا تھا۔

زویا مزید مسکرائی تھی۔ صندل کی حیرت، اضطراب، بے چینی اسے خوش کر رہی تھی۔

"میر زاد کی منگنی کا فنکشن......" زویا نے ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے بڑے آرام سے دھماکا کیا تھا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یہ الفاظ جس قدر مرضی آرام سے ادا ہوئے ہوں، صندل کو بری طرح سے گھائل کرنے والے ہیں۔

"میر زاد کی منگنی......؟" وہ چاہ کر بھی بھلا کیسے اپنی حیرت پر قابو پا سکتی تھی۔

"ہاں...... میری نند تانیہ کے ساتھ۔"

اور اب بھلا شک کیسے کیا جا سکتا تھا کہ زویا اس کے ساتھ کوئی مذاق کر رہی ہے۔ زویا کا خیال درست ثابت ہوا تھا، صندل بری طرح سے گھائل ہوئی تھی۔ ایسے جیسے کسی نے اسے اس کی موت کی خبر دے دی ہو۔

"تم تو ایسے حیران ہو رہی ہو جیسے کچھ نہیں جانتیں...... کیا میر زاد نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟"

صندل میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ ”ناں“ میں سر ہلا دیتی۔

”کیا نہیں بتایا......؟“ میر زاد بھی وہاں آیا تھا۔ اس نے زویا کا آخری جملہ سن لیا تھا۔

”کہ تمہاری منگنی تانیہ سے ہونے جا رہی ہے۔“ زویا نے کہا تھا۔ میر زاد کا چہرہ برف جیسا ہو گیا تھا۔ جیسے وہ کبھی نہ مسکرایا ہو۔ بے اختیار ہی اس نے صندل کو دیکھا تھا اور صندل تو کب سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں حیرت، غصہ اور دکھ لیے......

”کیا تم نے صندل کو ابھی تک کچھ نہیں بتایا میر......؟“ زویا انجان بننے کی اداکاری کرتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”ن......نہیں......وہ میں بتانا بھول گیا تھا۔“

اور میر کے منہ سے یہ سنتے ہوئے صندل پر دکھ کا پورا سمندر اتر گیا تھا۔ اب بھلا شک کی گنجائش ہی کہاں رہ گئی تھی۔ اس نے یہ نہیں کہا تھا کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ بلکہ اس نے کہا تھا کہ وہ بتانا بھول گیا ہے۔ تو یعنی اس کی بہن جو کچھ کہہ رہی تھی سب حرف بہ حرف سچ تھا۔ باغ کی خزاں رسیدہ بساند کے اشارے کو وہ اب سمجھی تھی۔

”لو......آج میں نے بتا دیا ہے پھر......تم تیاری پکڑ لو صندل......بس اسی ہفتے ہو گا سب......اپنی سب کزنوں کو کہہ دینا یاد سے......“ زویا نے کہا تھا۔

اور صندل جیسے کچھ سن ہی نہیں رہی تھی۔ وہ تو دکھ سے میر کو دیکھتی جا رہی تھی۔ اتنا بڑا دھوکا، اتنا بڑا فریب......اگر اس نے کہیں اور شادی کرنی تھی تو پھر صندل سے کیوں اپنی محبت کا اظہار کیا تھا۔

میر اس سے نظریں چرائے کھڑا تھا۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت تھا کہ وہ جھوٹا ہے، دھوکے باز ہے۔

”تم کیسا سوٹ پہنو گی صندل......؟“

صندل اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا ضبط جواب دینے کے قریب تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ زویا کے سامنے اس کے بھائی کا گریبان پکڑ کر اسے جھنجھوڑے۔

"ارے..... کہاں جا رہی ہو؟"

"مجھے کچھ کام یاد آ گیا ہے۔" صندل کہہ کر مزید ایک لمحے کی بھی دیر کیے بنا وہاں سے اٹھ کر باہر کو بھاگ گئی تھی۔

"اسے کیا ہوا ہے؟" بناوٹی بھول پن سے زویا نے میر کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ "بھئی بہت عجیب ہیں اس شہر کے لوگ..... میں اس سے فنکشن کو لے کر بات چیت کر رہی ہوں اور وہ اٹھ کر چل دی۔"

خاموش کھڑا میر اپنی چالاک بہن کو دیکھ رہا تھا۔ جس نے بہت موقع پر اپنی چالاکی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اور بڑے آرام سے اس کی زندگی میں بھونچال پیدا کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

دن کہر کے غلاف میں کسی کتاب کی طرح لپٹا ہوا تھا۔ دن کو روشن کرنے کے لیے پردے کی بہت سی تہ ہٹانے کی ضرورت تھی۔ اور اس سب میں یقیناً بہت سے دن لگنے والے تھے۔ سیب کے درختوں پر سے سارے پھل اتار لیے گئے تھے۔ اب وہاں صرف پتے رہ گئے تھے۔ مٹی سے اٹے ہوئے۔ کہر کے ساتھ مل کر گرد پتوں پر ڈھیریاں بنا چکی تھی اور کہر اسی گرد سے پھسلتی ہوئی پتوں کے کونوں سے آنسوؤں کی مانند نیچے گھاس سے اٹی زمین پر گر رہی تھی۔

کہر کے آنسوؤں اور صندل کے آنسوؤں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ کہر کے آنسو موسم کے بدلنے کے بعد تھم جانے والے تھے۔ لیکن اس کے آنسو شاید زندگی بھر اس کے ساتھ چلنے والے تھے۔

میر زاد کی منگنی..... زویا کی نند کے ساتھ.....

اس سال خزاں کیوں اتنی ہولناک سی آئی تھی۔ کیا ارادے تھے اس کے..... اس بار کی خزاں نے اسے ڈس لیا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ درختوں کے ساتھ ساتھ اس پر بھی مردنی آ جائے گی۔ وہ تو آج صبح تک بہار جیسی خوشی محسوس کر رہی تھی۔ لیکن پھر شاید قدرت کو اس کی بے موسمی خوشی پسند نہیں آئی تھی۔

"اگر میر کے دل میں کوئی اور لڑکی تھی تو پھر اس نے اس کے ساتھ کیوں اظہار محبت کیا تھا۔ اتنی دور لے جا کر کیوں اسے اپنا گھر دکھایا تھا۔"

کھڑکیوں سے باہر سیب کے بے پھلوں کے درختوں کو دیکھتے ہوئے وہ اپنے دکھ کی وجہیں تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"کیا وہ وقتی جذبہ تھا؟ یا وہ اکیلے میں اس کا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا؟" اور آخری بات سوچتے ہوئے صندل کے چہرے پر وحشت نظر آئی تھی۔ اسے اپنی سوچ پر یقین ہو چلا تھا کہ ایسا ہی تھا۔ وہ یقیناً اس کا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ خدا نے اسے بچا لیا۔ ورنہ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتی۔

"صندل..... تمہارے استاد جی آ گئے ہیں۔ تمہیں بلا رہے ہیں۔" حاجی بوا نے اس کے کمرے میں آ کر اس سے کہا تھا۔

"جی..... میں آتی ہوں۔" آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ حاجی بوا اس کا رندھا ہوا لہجہ تاڑ گئی تھیں۔

"کیا ہوا ہے؟" وہ فکر مند تھیں۔

"کچھ نہیں..... بس افشیں یاد آ رہی تھی۔"

اور اگر صندل یہ سمجھی تھی کہ اس کے جھوٹ کو سچ مان لیا گیا ہے تو یہ اس کی خام خیالی تھی۔ حاجی بوا نے اپنے بال دھوپ میں سفید نہیں کیے تھے۔

منہ پر پانی کے بے تحاشا چھینٹے مار کر وہ نیچے گئی تھی۔

"آج میرا ستار بجانے کو دل نہیں چاہ رہا استاد جی....."

"میں تمہیں ستار سکھانے آیا بھی نہیں ہوں۔"

"تو.....؟"

"تو یہ بتاؤ کہ کل تم نے کس سے پوچھ کر سب کے سامنے ستار بجایا ہے؟" استاد جی کے سوال نے اسے لاجواب کیا تھا۔ "کیا اپنے استاد سے اتنی بڑی ہوگئی ہو کہ اپنی مرضی کرسکو۔"

"وہ...... گھر والوں نے کہا تھا۔"

"کیا تم نے مجھ سے اجازت لی تھی...... یا تم بھول گئی تھیں۔"

"مجھے معاف کردیں۔ میں نے دونوں ہی باتوں کو اہمیت نہیں دی۔" اس نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے معذرت کرلی تھی۔ اس کی ذہنی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ دھڑا دھڑ بہانے بناتی۔ استاد جی اسے دیکھنے لگے تھے۔

"ستار بدذوق لوگوں کے لیے نہیں ہے صندل...... کبھی بھی نہیں ہے۔ ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا، ستار بجاتے ہوئے لڑکی جس قدر سندر لگتی ہے دنیا کا کوئی ساز بجاتے ہوئے اتنی سندر نہیں لگتی...... اس لیے اسے اگر تم بدذوق لوگوں کے سامنے بجاؤ گی تو وہ ساز کو نہیں سنیں گے۔ بلکہ تمہیں دیکھیں گے۔ وہ سماعتوں کو جگانے کے بجائے دیدہ بازی کریں گے۔"

صندل خاموش ہوگئی تھی۔ استاد جی کی گہری باتیں اسے شرمندہ کررہی تھیں۔

"مجھے معاف کردیں استاد جی...... دوبارہ ایسا نہیں ہوگا۔" اس نے سیدھے سبھاؤ معافی مانگ لی تھی۔

"ٹھیک ہے، تمہاری پہلی غلطی ہے اس لیے معاف کررہا ہوں۔"

"میں آپ کے لیے گوند کا شربت لاتی ہوں۔ چاندامی بنا کر گئی تھیں۔ انہوں نے خاص کہا تھا کہ آپ کو دوں۔" کہہ کر وہ جلدی سے باہر نکل گئی تھی۔ عجلت سے کام لینے میں دو حکمتیں پوشیدہ تھیں۔ ایک تو موضوع گفتگو بدل گیا تھا۔ دوسرا شربت پینے کے بعد یقیناً استاد جی کا غصہ کافی ٹھنڈا ہوجانے والا تھا۔

"صندل! کہاں جارہی ہو؟" وہ باہر نکلی تو رحبانی سے اس کا سامنا ہوا تھا۔

"رسوئی میں جارہی ہوں۔ استاد جی کو شربت دینے......"

"کسی ملازم سے کہہ دو...... تم ذرا میری بات سنو......"

"جی اچھا......"

وہ تو پہلے ہی چاہتی تھی کہ استاد جی سے دوبارہ سامنا نہ ہو۔ ملازم کو شربت دینے کا کہہ کر وہ رحبانی کے ساتھ ہو گئی تھی۔

رحبانی اسے لے کر حویلی کے بڑے کمرے میں آ گیا تھا۔ درگا مورتی والے کمرے میں...... ایسا بے اختیاری میں ہوا تھا۔ کافی عرصے سے وہ اس کمرے میں نہیں آیا تھا۔ اب آیا تو سامنے دیوار کے ساتھ لگی بڑی سی درگا مورتی کو دیکھ کر لمحے بھر کے لیے ڈر گیا تھا۔ درگا مورتی اس کا ایک راز جانتی تھی۔ خاص طور پر درگا مورتی کا ہتھیار...... ترشول......

"کہیں اور چلتے ہیں۔" رحبانی گڑبڑا گیا تھا۔ وہ درگا مورتی سے نظریں چراتے ہوئے بولا تھا۔

"کیا بات ہے......؟" صندل کو تجسس ہوا تھا۔

"نہیں...... وہ تم سے کچھ ضروری بات کرنا تھی۔ اکیلے میں......"

"تو یہاں کر لیں۔ یہاں کوئی نہیں ہے۔"

"ہاں......" رحبانی نے نارمل ہونے کی کوشش کی تھی۔ "یہاں درگا مورتی نہ سن لے۔"

"کیا......؟" صندل نے تعجب سے رحبانی کو دیکھا تھا۔ رحبانی کو چار و ناچار اپنی گھبراہٹ پر قابو پانا پڑا تھا۔

"وہ...... بات دراصل یہ ہے صندل...... کہ جس دن تم ستار بجا رہی تھیں ناں...... تو تمہیں کسی نے پسند کر لیا تھا۔"

صندل نے کچھ حیرت سے رحبانی کو دیکھا تھا۔

"امیر کبیر لوگ ہیں...... کشمیر میں ہوتا ہے۔ قالینوں کا بڑا تاجر ہے۔ بستامی نے چاند سے بات کی

تھی لیکن چاند نے انکار کر دیا۔ وہ کہنے لگی کہ تم کسی کو چاہتی ہو۔ کیا تم کسی کو چاہتی ہو؟''

رحبانی نے سوال کیا تھا۔ صندل کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے تھے۔ یک طرفہ محبت کا دائمی عذاب.......

''نہیں......'' ضبط سے کام لیتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

''تو پھر اس رشتے کو قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ تم کیا کہتی ہو؟ میں تمہارا برا نہیں چاہ سکتا ہوں۔ کیا تم ایسا سوچتی ہو؟''

''نہیں رحبانی بابا......''

''تو پھر تم خود سوچ لو......''

''جی اچھا......اور کچھ......؟''

''ہاں...... کہنے کو بہت کچھ ہے لیکن ڈر ہے کہ تم ناراض نہ ہو جاؤ۔''

''آپ جو کہنا چاہتے ہیں کہہ سکتے ہیں۔''

''میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی کا فیصلہ تم خود لو...... چاند نے بے شک تمہاری پرورش کی ہے۔ لیکن وہ تمہاری سگی ماں نہیں ہے۔ وہ تمہاری زندگی کا فیصلہ یقیناً ویسا نہیں لے سکے گی۔ جیسا تمہاری سگی ماں لیتی......'' اس غیر متوقع بات پر صندل کے چہرے کے تاثرات بدلے تھے۔ رحبانی اسے دیکھ رہا تھا۔

''میں سمجھ سکتا ہوں کہ میرے کہنے کے باوجود تم میری باتوں کا برا مان رہی ہو۔ لیکن ایک لمحے کو غور کرو میری باتوں پر...... چاند نے خود شادی نہیں کی...... ساری زندگی اس نے اکیلے ہی بتا دی ہے۔ اس کے ذہن میں یقیناً یہ سوچ بھی ہو گی کہ تمہاری شادی ہو جائے گی تو وہ مزید تنہا ہو جائے گی۔ پھر اس کو پوچھنے والا کون ہو گا یہاں......؟ کون اس کی دیکھ بھال کرے گا۔ شاید یہ ہی وجہ ہے کہ اس نے بستامی کی بات مکمل سنی ہی نہیں...... وہ تمہیں کشمیر کیوں بھیجے گی۔ اس میں تو اس کا خسارہ ہے۔''

رحبانی نے روانی میں بہت کچھ کہہ دیا تھا۔اس کی باتیں تلخ تھیں۔لیکن صندل کو نجانے کیوں وہ سچی لگ رہی تھیں۔

''اب تم جا سکتی ہو۔مجھے بس یہ ہی کہنا تھا۔اچھے سے سوچ بچار کرو۔پھر مجھے بتانا۔''
کشمکش کے عالم میں وہ درگا مورتی والے کمرے سے باہر آئی تھی۔

☆......☆......☆

''یہ آپ نے کیا کیا زویا آپی؟''میر زویا پر بھڑ کا تھا۔
''کیا کیا ہے میں نے......؟''وہ انجان بنتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔
''آپ نے صندل کو کیوں بتایا کہ میری منگنی تانیہ سے ہونے والی ہے۔''
''کیا یہ بات چھپانی چاہیے تھی؟''وہ میر زاد کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔میر زاد لاجواب ہو گیا تھا۔
''اگر چھپانی چاہیے تھی تو کیوں......؟ایک ہفتہ رہ گیا ہے تمہاری منگنی میں......پھر یہ بات چھپانے کا مقصد......''
''آپ پہلے بتائیں کہ منگنی کی ڈیٹ آپ نے کس سے پوچھ کر رکھی تھی۔''
''یہ میرا نہیں،زوہیب کا آئیڈیا تھا۔وہ چاہتا تھا کہ شادی نہیں تو کم از کم منگنی کی تقریب ہی کر لی جائے۔''
''آپ مجھ سے تو پوچھ لیتیں۔''
''مجھے تم سے پوچھنا ضروری نہیں لگا۔ایک معمولی سی تقریب ہی تو ہے۔کون سا شادی ہونے جا رہی ہے۔''
میر منہ بنا کر صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس صورت حال میں کس کی غلطی نکالے۔زویا کی یا اپنی......

''کیا تم صندل کے ساتھ افیئر چلا رہے ہو میر......؟'' زویا نے براہ راست پوچھ لیا تھا۔ میر اتنے بے باک سوال پر حیرت سے اسے دیکھنے لگا تھا۔

''میں تمہیں کردار کا اتنا ہلکا نہیں سمجھتی تھی۔ کہ صندل کی خوب صورتی کا فائدہ اٹھانے کے لیے تم اس کے ساتھ جھوٹا عشق لڑاؤ گے۔''

''ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں صندل سے محبت کرتا ہوں۔'' میر نے بھڑک کر کہا تھا۔ زویا اسے دیکھنے لگی تھی۔

یہ بات اس کے لیے کچھ نئی نہیں تھی۔ میر کے کہے بنا بھی وہ سب جانتی تھی۔

''اور تانیہ......اس کا کیا......؟''

''آپ زوہیب بھائی سے معذرت کر لیجیے گا۔''

''میں ایسا ہرگز نہیں کروں گی۔ میں نے زوہیب سے بات تم سے پوچھ کر کی تھی میر...... مجھے آزمائش میں مت ڈالو اب تم......''

''ہاں......میں مانتا ہوں کہ میری غلطی ہے۔ اس لیے زوہیب بھائی سے میں خود بات کر لوں گا۔''

''کیا بات کرنی ہے مجھ سے......؟'' زوہیب نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا تھا۔ میر نے شدید حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ زوہیب مسکرا رہا تھا۔ میر سے ہاتھ ملا کر وہ اپنی بیوی کے قریب ہوا تھا اور اس نے اسے خود سے لگایا تھا۔

اگلا شخص جو کمرے میں داخل ہوا وہ زوہیب کی والدہ تھیں اور ان کے پیچھے تانیہ...... جو میر کو دیکھتے ہوئے نجانے کیوں شرمانے لگی تھی۔

سب زویا سے ملنے لگے تھے۔ اور میر بت بنا سب کو دیکھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بہن نے اس کے ساتھ کیا کھیل کھیلا ہے۔



آنے والے دن عجیب سے گزرے تھے۔ موسم خنک تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ایسے جیسے صندل کے ساتھ ساتھ موسم بھی رو رہا ہو۔ صبح بے رونق تھی۔ دن بے کیف تھے۔ شام کی اداسی بڑھ چکی تھی۔ اور رات پہلے سے زیادہ تاریکی لے کر اترتی تھی۔ ان دنوں وہ بہت اداس تھی۔ ایسے جیسے ابھی رو دے گی۔ اسے اپنے زندگی بھر کے دکھ ان دنوں میں یاد آنے لگے تھے۔ اسے احساس ہوا تھا کہ شروع سے ہی اس کی بے قدری کی گئی ہے۔ اس کی ماں اسے پیدا کرنے کے بعد حویلی کی دہلیز پر چھوڑ گئی۔ اس کا باپ کون تھا؟ کچھ پتا نہیں...... حویلی والوں نے اسے رکھنے سے انکار کر دیا۔ چاند امی نہ ہوتیں تو وہ یقیناً کسی یتیم خانے میں پل رہی ہوتی۔

اس نے بہت سے لوگوں کو اپنے لیے ناجائز کا لفظ بولتے ہوئے سنا تھا۔ وہ چاند امی کی گود میں سر رکھ کر روتی تھی۔ تب چاند امی اسے گھنٹوں سمجھاتی تھیں اور وہ بہت مشکل سے خود کو دلاسا دیا کرتی تھی۔ لیکن اب جو میر نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ اسے لگا تھا کہ وہ ساری زندگی بھی خود کو دلاسا دیتی رہے تو اس کا دکھ کم نہیں ہوگا۔

ان دنوں میں میر نے اس سے ملنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے اس کی کزنوں کے ہاتھ پیغام بھجوائے تھے۔ لیکن صندل نے اس سے ملنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ وہ گھر سے باہر بھی نہیں گئی تھی کہ میر سے سامنا نہ ہو جائے۔ وہ میر سے بات تک نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ یہ بات اسے کھائے جا رہی تھی کہ اتنے دنوں سے اسے بے وقوف بنایا جاتا رہا ہے۔ وہ بھی اس کا فائدہ حاصل کرنے کی خاطر...... چاند امی نے اس سے وجہ پوچھی تھی۔ لیکن وہ کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دے پائی تھی۔

”میرے سر میں درد ہے۔“

”سر میں نہیں...... تمہارے دل میں درد ہے صندل......“

صندل نے چونک کر چاند کو دیکھا تھا۔

”مجھے بتاؤ کہ کیا ہوا ہے۔ میر نے کچھ کہا ہے؟“

"جی...... اس نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ وہ میرا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔"

"کیا......؟" چاندنے شدید حیرت سے اسے دیکھا۔ "ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"ایسا ہی ہوا ہے چاندامی...... وہ دھوکا دے رہا تھا مجھے...... میرا فائدہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔"

"بعض اوقات چیزیں ویسی نہیں ہوتیں صندل جیسی دکھتی ہیں۔ ایک آئینہ بھی سارا سچ نہیں دکھاتا۔ وہ دائیں کو بائیں اور بائیں کو دائیں دکھاتا ہے۔"

صندل خاموشی سے چاندامی کی باتیں سننے لگی تھی۔ چاندامی کی باتیں ہمیشہ کی طرح یقیناً اس بار بھی درست تھیں۔

"اگر میرزاد تمہیں دھوکا دے رہا ہوتا تو تمہارے لیے بار بار یہاں کیوں آتا؟ کیوں تم سے بات کرنے کی کوشش کرتا...... ظاہر ہے کہ وہ تم سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اپنی صفائی دینا چاہتا ہے۔ تم ایک بار میر سے بات تو کرو...... اسے کچھ کہنے کا موقع تو دو......"

چاندامی کی باتوں نے اس کے دل پر اثر کیا تھا۔ میر کے معاملے میں وہ کچھ نرم پڑی تھی۔

"اگر تم اسے اپنی صفائی میں بولنے کا موقع نہیں دو گی تو ساری زندگی پچھتاتی رہو گی۔ اس لیے ضروری ہے کہ ایک بار اس کی بات سنو...... پھر کوئی فیصلہ کرو۔"

"ٹھیک ہے......"

"تم جاؤ...... اس سے بات کرو۔"

چاندامی نے اس کی اچھے سے ذہن سازی کی تھی۔ اور وہ میر سے بات کرنے کے لیے آمادہ ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

میران دنوں سخت پریشان تھا۔ صندل اس سے ناراض ہو چکی تھی۔ وہ اس سے ملنا چاہتا تھا۔ بات کرنا چاہتا تھا۔ اپنی صفائی دینا چاہتا تھا۔ لیکن بارہا پیغام بھجوانے کے باوجود بھی صندل نے اس سے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔ اوپر سے مزید ستم یہ کہ زوہیب اور اس کی فیملی وہاں آ چکی تھی۔ اور گھر میں اس کی منگنی کی

تیاریاں کی جارہی تھیں۔ مہمانوں کی وہاں آمد کا سلسلہ بڑھتا جارہا تھا۔ میر کو یہ منگنی رکوانا بے حد مشکل لگ رہا تھا۔ روز بروز اس کے ہاتھ پاؤں باندھے جانے لگے تھے۔ اور یہ سب اس کی بہن کر رہی تھی۔

زویا نے ہر ہر چیز کی بہت اچھے سے پلاننگ کی ہوئی تھی۔ وہ میرزاد اور تانیہ کو اکیلے نہیں ہونے دے رہی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ تانیہ کو اکیلا دیکھ کر میر اسے کہہ سکتا ہے کہ وہ کسی اور کو پسند کرتا ہے۔ وہ تانیہ کو اس رشتے سے پیچھے ہٹنے کے لیے کہہ سکتا ہے۔ اس لیے اس نے تانیہ کے آتے ہی اعلان کر دیا تھا کہ میر اور تانیہ آپس میں بات چیت نہیں کریں گے۔ منگنی کے بعد بے شک بات کریں۔

وہ زوہیب کو بھی میر کے پاس زیادہ دیر تک نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ میر زوہیب سے کچھ الٹا سیدھا نہ بول دے۔

جمعہ کی شب کو منگنی کی رسم ہونا طے تھی۔ اسی حوالے سے زویا، تانیہ اور باقی مہمانوں کے بازاروں کے چکر ختم نہیں ہو رہے تھے۔ میر نے خود کو کمرے میں قید کر لیا تھا۔ وہ شاید یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ منگنی والے دن بھی وہ کمرے میں قید ہی رہے گا۔ زوہیب کو اس کے رویے پر حیرت تھی۔ بلکہ اسے کچھ کچھ شک ہوا تھا کہ میر کی اس منگنی میں رضامندی شامل نہیں ہے۔ ایسی ہی تشویش کا مظاہرہ زوہیب کی والدہ اور تانیہ بھی کر چکی تھیں۔ زوہیب نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ اگر میر کی اس شادی میں رضامندی نہیں ہے تو اس سلسلے کو یہاں ہی ختم کیا جاسکتا ہے۔ لیکن زویا نے کہا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ رشتہ میر کی رضامندی کے بعد طے کیا گیا ہے اور رہی بات میر کے کمرے میں بند ہونے کی تو وہ ویسے ہی شرمیلی طبیعت کا ہے۔ اسے نہیں پسند کہ اس کی منگنی کی باتیں اسی کے بہنوئی کے سامنے ہوں۔ زویا نے ایسی ہی مزید بے سروپا باتیں کر کے اپنی ساس اور شوہر کی تسلی کروادی تھی۔

حکمت عملی کا مظاہرہ کرتے ہوئے زویا میرزاد کے کمرے میں آئی تھی۔ وہ بیڈ پر لیٹے ہوئے جاگ رہا تھا۔

''میر! تم سو رہے ہو؟'' اس نے پوچھا تھا۔ میر نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ زویا سے سخت خفا تھا۔ اور زویا یہ بات جانتی تھی۔ یہ الگ بات کہ اسے اس بات کی کچھ زیادہ پروا نہیں تھی۔

زویا نے کھڑکی کے پردے پیچھے کر دیے تھے۔اور پھر بیڈ پر میر کے ساتھ آ کر بیٹھ گئی تھی۔۔

''میر! میں جانتی ہوں کہ تم مجھ سے ناراض ہو۔ مجھے کوئی ایسا طریقہ بتاؤ جس سے تم راضی ہو جاؤ میرے بھائی۔'' وہ پیار سے بولی تھی۔ میر زاد نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

''میں جانتی ہوں کہ اس منگنی میں تمہاری رضامندی نہیں ہے۔ لیکن میری مجبوری سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں نے تم سے پوچھ کر یہ رشتہ طے کیا ہے۔ کوئی زور زبردستی نہیں کی تمہارے ساتھ...... پھر اب تم کیوں مجھے میرے سسرال والوں کی نظر میں گرانا چاہتے ہو؟''

''میں آپ کو نہیں گرانا چاہتا...... میں نے کہا تو ہے کہ زوہیب بھائی اور تانیہ سے میں خود معافی مانگ لوں گا۔''

''تو پھر یہ کام تم منگنی کے بعد کر لینا......'' زویا نے کہا تھا۔ میر زاد نے پہلے چند لمحے تو حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ پھر بیڈ پر اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

''کیا مطلب......؟''

''تم منگنی کروالو...... گھر پر کتنے بہت سے لوگ اکٹھے ہو چکے ہیں۔ ابھی ایسا ویسا کچھ کیا تو بہت برا لگے گا۔ بدنامی ہوگی۔ تمہاری بھی اور تانیہ کی بھی...... لوگوں کو طرح طرح کی باتیں بنانے کا موقع مل جائے گا۔ اس لیے کہہ رہی ہوں کہ ابھی خاموش رہو۔ بعد میں منگنی کو ختم کر لیں گے۔ منگنیاں بھی تو ٹوٹ جاتی ہیں ناں...... تو تمہاری خاطر یہ منگنی ختم کر لیں گے ہم......''

''آپ سچ کہہ رہی ہیں؟'' وہ بے یقینی سے پوچھ رہا تھا۔

''ہاں...... بالکل سچ...... تم منگنی کے بعد زوہیب کو سب بتا دینا کہ تم کسی اور کو چاہتے ہو۔ اس سے معافی مانگ لینا...... میں بھی تمہارا ساتھ دوں گی۔ زوہیب کو بات سمجھانے کی کوشش کروں گی۔ میری ساس بھی بہت سمجھدار خاتون ہیں۔ وہ بات کو سمجھ جائیں گی۔ رہی بات تانیہ کی تو وہ کون سا تم سے محبت کرتی چلی آ رہی ہے۔ وقتی پسندیدگی ہے، اسے بھی زیادہ دکھ نہیں ہوگا۔''

زویا کے اتنے پیار سے کہنے پر میر کو کچھ تسلی ہوئی تھی۔

''تم شام کے لیے تیاری کرو۔ اچھے سے خوش ہو کر منگنی کی رسم میں شریک ہو۔ لوگوں کو قیاس آرائیاں کرنے کا موقع نہ دو۔ پھر چند دن بعد ہی دونوں بہن بھائی مل کر زوہیب سے بات کر لیں گے۔''

''ٹھیک ہے؟'' میر کے خاموش رہنے پر اس نے پوچھا تھا۔

''جی...... ٹھیک ہے۔''

''فکر مت کرو...... صندل کو میں خود اپنے ہاتھوں سے اپنے بھائی کی دلہن بناؤں گی۔''

''کیونکہ یقیناً آپ کو اس شہر کا میک اپ بھی پسند نہیں ہوگا۔'' میر مسکرایا تھا۔

''ٹھیک سمجھے ہو تم......'' زویا ہنسی تو میر بھی ہنسنے لگا تھا۔

''چلو پھر جلدی سے تیار ہو جاؤ۔''

زویا کے کہنے پر میر اٹھ کر نہانے کے لیے واش روم میں چلا گیا تھا۔ زویا خلاؤں میں دیکھتے ہوئے مسکرانے لگی تھی۔

☆......☆......☆

صندل کو میر کے گھر کے ماحول میں آج کچھ انوکھا پن محسوس ہوا تھا۔ وہ ابھی اندر نہیں گئی تھی۔ باہر ہی کھڑی تھی۔ اور یہ انوکھا پن اس نے باہر سے ہی محسوس کر لیا تھا۔ پورے گھر کو باہر تک کافی اچھے سے سجایا گیا تھا۔ پھولوں سے اور برقی قمقموں سے...... کھلے گیٹ کے اندر اور باہر بہت سے لوگوں کی چہل پہل نظر آ رہی تھی۔

کیا آج میر زاد کے گھر کوئی تقریب تھی؟

اور یہ بات سوچتے ہی اس کے ذہن نے اسے زویا کی بات کی یاد دہانی کروا دی تھی۔ میر کی منگنی کی رسم والی بات...... تو کیا آج میر کی منگنی کی رسم تھی؟ ایسا نہیں ہو سکتا، میر نے تو اس سے محبت کی تھی۔ وہ تو اسے وضاحتیں دینے کے لیے آ رہا تھا۔ اپنی صفائی بیان کرنا چاہتا تھا۔ یقیناً زویا کو کوئی غلط فہمی ہو چکی تھی۔

گیٹ پار کر کے وہ اندر پہنچی تھی۔ اور آگے کا منظر دیکھ کر اسے جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔

بے تحاشا اور بنے ٹھنے مہمانوں کے درمیان کھڑا میرزاد، مسکراتے چہرے کے ساتھ ایک لڑکی کو انگوٹھی پہنا رہا تھا۔ اور لڑکی مسکرا رہی تھی۔ انگوٹھی کے پہناتے ساتھ ہی مہمانوں نے تالیاں بجائی تھیں۔ ایک شور اٹھا تھا۔ جو بہت دیر کے بعد تھما تھا۔ پھر لڑکی نے انگوٹھی میرزاد کو پہنائی تھی اور تب ہی میر کی نظر گیٹ کے پاس کھڑی صندل پر گئی تھی۔ صندل آنکھوں میں آنسو لیے میر کو دیکھ رہی تھی۔ اور میر جیسے اپنی جگہ مجسم ہو چکا تھا۔

لوگ ایک بار پھر سے تالیاں بجانے لگے تھے۔ تالیوں کے شور میں صندل کی سسکیاں دب گئی تھیں۔ اسے لگا تھا کہ لوگ اس پر تالیاں بجا رہے ہیں اور تالیوں کے ساتھ صندل کی طرف انگلیاں کرتے ہوئے "بے وقوف" "بے وقوف" کی صدا لگا رہے ہیں۔

میر کی آنکھوں میں شرمندگی اتری تھی۔ صندل نے شرمندگی کے اس تاثر کو میر کا احساس جرم جانا تھا، اور نفرت سے میر کو دیکھتے ہوئے وہاں سے باہر کو بھاگی تھی۔

محبت کے قافلے کے منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی رہزنوں نے اسے لوٹ لیا تھا۔

☆......☆......☆

"رحبانی بابا کہاں ہیں؟" حویلی میں داخل ہوتے ہی صندل نے حاجی بوا سے پوچھا تھا۔

"وہ...... اپنے کمرے میں ہے۔ کیوں......؟ خیریت؟"

صندل نے انہیں جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ وہ جلدی سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے رحبانی کے کمرے میں پہنچی تھی۔ جہاں رحبانی سنکھ کو بجانے کی تیاری کر رہا تھا۔

"رحبانی بابا......"

"ہاں...... بولو صندل......!"

"مجھے وہ رشتہ منظور ہے جو آپ بتا رہے تھے۔" تیز تیز سانسوں میں اس نے جلدی میں کہا تھا۔

رحبانی نے پہلے تو حیرت سے صندل کو دیکھا تھا پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ آئی تھی۔

"یہ بات تم سوچ سمجھ کر کہہ رہی ہو صندل......؟"

"جی...... اچھی طرح سے سوچ کر......" صندل نے فیصلہ کن انداز میں کہا تھا۔ "لیکن میری ایک شرط ہے۔"

"کیا؟"

"شادی جلد سے جلد ہو جانی چاہیے۔"

"بالکل...... جیسا تم چاہو......"

چہرے پر انتقام کا عزم لیے صندل وہاں سے باہر نکلی تھی۔

مغرب کا سورج غروب ہونے سے پہلے پورے ارض و سماء میں سنکھ کی آواز گونجی تھی۔



ناول تاش گھر ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 15 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 13

وہ دن دھند سے بھرا ہوا تھا۔ رات انتہا کی تھی۔ ایسے جیسے صبح سورج نکلے گا ہی نہیں ...... لیکن پھر صبح میں مدھم روشنی چاروں طرف پھیلی تھی۔ ایسے جیسے سفید کپڑے پر کسی نے سنہری پارہ پھینک دیا ہو۔ دھند کو پرے کرتے ہوئے دن کو دیکھنا پڑ رہا تھا۔

چاند جھروکے میں سے سب دیکھ رہی تھی۔ اونچے ٹیلے پر واقع اپنی حویلی میں سے دور تک پھیلے ہوئے درختوں اور چھوٹے بڑے گھروں کا منظر...... وہ بھی کچھ ایسے ہی دن تھے جب حویلی میں اس کی اور التمش کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ دین بابا جہیز بنوا رہے تھے۔ نئی سے نئی چیزیں خرید رہے تھے۔ وہ اپنی بیٹی کو پورے ارمانوں کے ساتھ بیاہنا چاہتے تھے۔ لیکن پھر کیا ہوا۔

رخصتی سے پہلے ہی التمش رخصت ہو گیا۔

ہمیشہ ہمیشہ کے لیے......

اور التمش کو یاد کرتے ہوئے چاند کو احساس ہوا کہ کافی دن بیت گئے وہ اس درخت کے پاس نہیں گئی جہاں التمش کا قتل ہوا تھا۔ اور جس کی بابت مشہور تھا کہ وہاں پریاں آتی ہیں۔

''چاند...... نیچے آؤ ذرا......'' نیچے سے بسطامی نے اسے آواز دیتے ہوئے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ وہ نیچے صحن میں کھڑا ہوا تھا اور کافی خوش نظر آ رہا تھا۔ آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے وہ نیچے اتری تھی۔

''لو چاند......! مٹھائی کھاؤ۔'' بستامی نے ہاتھ میں پکڑے مٹھائی کے ڈبے میں سے برفی کا ٹکڑا نکال کر چاند کو دیا تھا۔

''کس بات کی......؟'' چاند نے برفی پکڑ لی تھی۔

''صندل کا رشتہ طے ہو گیا ہے۔''

''کیا......؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' غصے سے اس نے مٹھائی واپس ڈبے میں پھینکی تھی۔

''کیوں......؟ میں نے ایسا کیا عجیب کہہ دیا ہے؟'' وہ انجان بنتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

''تم ہوتے کون ہو صندل کا رشتہ طے کرنے والے......؟ میں نے تمہیں انکار کر دیا تھا۔''

''ہاں......یاد ہے مجھے......تم نے انکار کر دیا تھا۔ لیکن پھر صندل نے کہا کہ اسے وہاں ہی شادی کرنی ہے۔''

''صندل نے کہا؟'' چاند کا حیران ہونا فطری تھا۔

''ہاں......اس نے کل ہی رحبانی سے کہا ہے۔''

چاند فوراً سے اپنے کمرے کی طرف گئی تھی۔ پھر یہ خیال آنے پر کہ صندل تو کمرے میں تھی ہی نہیں......واپس نیچے اتری تھی۔

''حاجی بوا......! صندل کہاں ہے؟'' اس نے نعمت خانے میں جھانکتے ہوئے پوچھا تھا۔

''شاید تعبیر کے کمرے میں ہو......کیوں؟ کیا ہوا......؟'' چاند کے پوچھنے کے انداز پر حاجی بوا گھبرا گئی تھیں۔

چاند نے انہیں کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس کے پاس جواب دینے کا وقت نہیں تھا۔ اسے اس بات کی تصدیق کے بنا ہی صندل پر بے تحاشا غصہ آ رہا تھا۔ اور اگر یہ بات سچ نکلنے والی تھی تو وہ صندل سے بہت سخت ناراض ہو جانے والی تھی۔

اس نے کیا سوچ کر رحبانی کو رضامندی دے دی تھی۔

اور میرزاد......اس کا کیا ہوا تھا؟

سب سوچتے ہوئے تعبیر کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے آج اس کا کمرا چاند کو بہت دور لگ رہا تھا۔

''تعبیر بیٹا......!صندل کہاں ہے؟''

''صبح تو میرے پاس ہی تھی، اب نہیں ہے۔''

''کہاں گئی ہے؟''

''باہر ہی گئی ہے شاید......''

''کیا زویا کے پاس......؟''

''نہیں زویا کے پاس جانے کا اس نے ذکر نہیں کیا۔''

''تو پھر کیا بات کی اس نے تم سے......؟''

''کس متعلق......؟'' تعبیر نے چاند کی بات نہیں سمجھی تھی۔

''نہیں......کچھ نہیں......!'' چاند کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔ تعبیر بے چین نظر آنے لگی تھی۔

چاند پھر سے اپنے کمرے میں پہنچ کر اپنے ہاتھ ملنے لگی تھی۔ یہ کیا ہو رہا تھا حویلی میں......اسے خدشے تنگ کرنے لگے تھے۔ وہم ستانے لگے تھے۔ بالکل ویسے ہی خدشے جب وہ لوگ ہندوستان سے ہجرت کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ لڑائی، مار کٹائی، پکڑ دھکڑ......اسے لگنے لگا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ بربادی......یا شاید ایسا ہی کچھ......

اور سالوں کے بعد آج چاند بے حد پریشان نظر آنے لگی تھی۔ جتنا وہ التمش کی گمشدگی پر ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

آنسو اس کی آنکھوں سے رواں تھے۔ لیکن وہ رو رہی نہیں تھی۔ رویا تو ماتم پر جاتا ہے۔ وہ تو غم منا رہی تھی۔ اس لیے بنا آواز نکالے رو رہی تھی۔ اس کی حالت ایسی تھی جیسے اب وہ کبھی نہ ہنس سکے گی۔ چہرے کی ساری شادابی زائل ہو چکی تھی۔ ارشادی بہت دیر سے اسے دیکھتا جا رہا تھا۔ یہ لڑکی کیا کرنے آئی تھی اس کے پاس......؟ کیا وہ اسے کوئی روحانی بابا سمجھ کر اپنے دل کا حال کہنے آئی تھی۔ یا ان سے کچھ ایسا سننے آئی تھی جو اس کے دکھی دل کو ڈھارس دے۔

"کچھ بولو صندل......؟ کس لیے آئی ہو میرے پاس؟" اس نے پیار سے پوچھا تھا۔ صندل نے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو صاف کیا تھا۔

"آپ بولیں ارشادی بابا......آپ نے کہا تھا کہ میں آپ کے پاس دوبارہ ضرور آؤں گی۔ لیجیے میں آ گئی ہوں۔"

"وہ وقت تو ابھی دور ہے۔"

"پھر میں وقت سے پہلے ہی آ گئی ہوں۔ وقت سے پہلے ہی مجھے آپ کی ضرورت پڑ گئی ہے۔"

"کیا ہوا ہے؟"

"میرا ماتھا پڑھ کر بتائیں کہ میرے ساتھ یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟"

"کیا ہوا ہے؟ کس بات پر دکھی ہو تم......؟"

"نہیں بتا سکتی......مجھ میں ہمت نہیں......آپ خود ہی پڑھ لیں۔"

"میں اپنے علم میں اتنا پہنچا ہوا نہیں ہوں صندل کہ تمہارے موجودہ حالات کو جان سکوں......" اس نے مایوسی سے کہا تھا۔ "پھر بھی کہوں گا کہ اتنی سی بات پر گھبرا گئی ہو۔ تمہاری ماں تو ایسی نہیں تھی۔"

ارشادی بابا کی بات پر صندل بری طرح سے چونکی تھی۔ حیرت سے اس نے ان کی طرف دیکھا تھا۔

"آپ کیسے جانتے ہیں میری ماں کو......؟"

''میں نہیں جانتا...... لیکن تمہارے ماتھے پر لکھا ہوا ہے کہ تمہاری ماں نے زندگی کا بہت ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے۔''

صندل خاموش رہی تھی۔ وہ کیا بتاتی کہ وہ تو اپنی ماں کے بارے میں کچھ جانتی ہی نہیں تھی۔

''کیا ایسا ہی ہے؟''

''میں...... میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔''

''مطلب......؟''

''میری پرورش چاند امی نے کی ہے۔ لیکن میں حقیقت میں کس کی بیٹی ہوں، یہ مجھے نہیں معلوم......''

''یقیناً کسی ایسی عورت کی بیٹی ہو، جس میں بہت صبر تھا۔''

''اور میرا باپ......؟ اس کے بارے میں کیا کہیں گے آپ......؟''

صندل کی بات پر ارشادی بغور اس کا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔ وہ جیسے جیسے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا، الجھتا جا رہا تھا۔ ایسا چہرہ دیکھنے کا اتفاق اسے پہلی بار ہوا تھا۔

''تمہارے باپ کے بارے میں کچھ بتانے سے قاصر ہوں صندل...... لیکن اتنا ضرور بتا سکتا ہوں کہ تمہاری ماں نے تمہارے باپ کو بہت چاہا ہے۔ اس لیے تمہارے چہرے میں باپ کے نقوش زیادہ ہیں۔''

''کیسا دکھتا ہوگا میرا باپ......؟'' اس نے اشتیاق سے پوچھا تھا۔ اب کے ارشادی نے مزید غور سے اس کے چہرے کو دیکھا تھا اور کچھ حیران ہوا تھا۔ صندل کے چہرے میں اسے بہت کچھ اپنے چہرے جیسا ملا تھا۔ ایسے جیسے اس کے چہرے کو کسی نے نسوانیت میں بدل دیا ہو۔

''مجھے تو تمہارے چہرے میں اپنا عکس دکھ رہا ہے صندل......''

''پھر کہیں آپ ہی تو میرے والد نہیں......''صندل نے کھوکھلی سی ہنسی ہنس کر کہا تھا۔

''ایسا ہو سکتا تھا اگر میں نے شادی کی ہوتی۔لیکن اب ایسا ہونا ناممکن ہے میری جان......کیونکہ میں نے آج تک کسی لڑکی کو چھوا تک نہیں......''ارشادی نے سنجیدگی سے کہا تھا۔صندل اٹھی تھی۔

''کہاں جا رہی ہو؟''

''گھر......امی انتظار کر رہی ہوں گی۔''

''ٹھیک ہے جاؤ......اور ہمت سے کام لو......سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''سچ میں......؟''

''خدا کی ذات پر یقین رکھو۔''

''کوشش کروں گی۔'' کہتے ہوئے وہ وہاں سے چلی گئی تھی۔

ارشادی اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگا تھا۔لڑکی کی چال میں بہت کچھ آمنہ جیسا تھا۔اسے جوانی کی آمنہ یاد آ گئی تھی جو درختوں کی اوٹ سے چھپ چھپ کر اسے دیکھا کرتی تھی۔ جب وہ کاغذ پر ہاتھوں کی لکیروں کے خاکے بنایا کرتا تھا۔ جو جب جب اس کے گھر نیاز دینے آیا کرتی تھی تو خوب بن ٹھن کر آیا کرتی تھی۔اس کی رنگت سانولی تھی۔اسے ڈر تھا کہ سرخ و سفید چہرے والا ارشادی اسے مسترد نہ کر دے۔اسی لیے جب جب اسے توقع ہوا کرتی تھی کہ اس کا سامنا ارشادی سے ہوگا تو وہ خوب سج دھج کر آتی تھی۔

وہی بن سنور کر رہنے والی آمنہ اب پاگل ہوئی شہر شہر گھوما کرتی تھی۔کیا کیا تھا ارشادی نے اس کے ساتھ......اسے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔

ارشادی نے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو صاف کیا تھا۔وہ ایک ظالم محبوب رہا تھا۔وہ جانتا تھا۔

☆......☆......☆

دھند کی لکیریں پھٹنا شروع ہو چکی تھیں۔ دوپہر کے پر ہلکے ہلکے کھلنے لگے تھے۔ وہ دکان میں سے باہر نکلی تھی جب پاگل آمنہ سے ٹکرا گئی تھی۔ ایک تو وہ اپنے دھیان میں نظریں جھکائے چلتی آرہی تھی۔ دوسرا پاگل آمنہ بٹر بٹر دکان پر نصب ارشادی کی تصویر کو دیکھتی جارہی تھی۔

''اوہ سوری......'' ٹکرانے کے بعد صندل نے فوراً سے کہا تھا۔ آمنہ اب کے بٹر بٹر اس کو دیکھنے لگی تھی۔

''کالی کوئل کے گھر سفید بچہ پیدا ہو سکتا ہے کیا؟'' وہ پوچھنے لگی تھی۔

''پتا نہیں......شاید......ہو سکتا ہے۔''

''پھر انہوں نے میرا یقین کیوں نہ کیا......؟''

''کس نے......؟''

بڑھیا نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ ایک آنسو ضرور اس کی آنکھ سے نکلا تھا۔

''تم......تم......ارشادی سے مل کر آرہی ہو؟''

''جی......!''

''اس نے تم سے بھی تو وعدہ نہیں کیا کہ وہ تم سے شادی کرے گا؟''

''جی......؟'' صندل نے حیرت سے آمنہ کو دیکھا تھا۔

''اس کی باتوں پر یقین مت کرنا......دیوانہ ہے ارشادی......'' ایک دیوانی دوسرے کو دیوانہ کہہ رہی تھی۔ اور پھر خود ہی ہنسنے لگی تھی۔

''پاگل ہے ارشادی......تمہیں بھی پاگل کر دے گا۔ جیسے مجھے کر دیا ہے۔ اس کی باتوں پر بالکل یقین مت کرنا۔''

آمنہ کہتے ہوئے ہنسی تھی اور پھر وہاں سے بہت دور جانے لگی تھی۔ اسے جاتا ہوا دیکھتے ہوئے صندل کو اپنے غم بہت کم دکھنے لگے تھے۔

☆......☆......☆

حویلیاں شہر سے کوسوں میل دور...... بنگال کی سرزمین پر...... کلکتے کے ایک پرانے محلے کی ایک تنگ گلی میں چھوٹے سے گھر میں تاریک کمرے میں لیٹا ہوا آدمی اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اس کی ماں اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رہی تھی۔ اس کے اردگرد لوگ اسے ترس بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ مرد کی سانسیں اٹک اٹک کر آ رہی تھیں۔ سب جانتے تھے کہ کسی دوا دارو کا کوئی اثر نہیں ہونے والا تھا۔ مرد کی حالت بتا رہی تھی کہ اب وہ بس چند لمحوں کا مہمان ہے۔

"آمنہ......!" نقاہت میں وہ بڑبڑایا تھا۔

"کیا......؟ پانی چاہیے؟" کسی ایک نے پوچھا تھا۔

"نہیں......آمنہ کو بلوا دو۔"

"کیسے بلوا دیں۔ وہ تو پاکستان میں ہے۔ یہاں سے بہت دور......"

"کوئی جائے حویلیاں......اسے بلوا دے۔"

"بھیجا تھا ایک آدمی کو......وہ اب وہاں نہیں رہتی...... کہتے ہیں وہ پاگل ہو چکی ہے۔"

آدمی کے چہرے پر دکھ پھیلا تھا۔ اسے لگا کہ جیسے آمنہ کو پاگل کر دینے میں اس کا ہاتھ رہا ہو۔

"اسے کہنا کہ میں نے اس کی اور ارشادی کی بیٹی کو جان سے نہیں مارا تھا۔"

"پھر......کیا کیا تھا اس کے ساتھ......؟"

"لکشمی حویلی (دین حویلی) کی دہلیز پر چھوڑ آیا تھا۔" مرد نے کراہتے ہوئے کہا تھا۔ ماں نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

"میرے مرنے کے بعد یہ پیغام اس تک پہنچا دینا۔" آخری سانس لیتے ہوئے مرد نے اٹکتے ہوئے کہا تھا۔

☆......☆......☆

"آپ زوہیب بھائی سے کب بات کریں گی آپی......؟" میرزاد نے زویا کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا تھا۔ وہ کل رات سے ہی بے چین تھا۔ ساری رات جیسے اس نے انگاروں میں گزاری تھی۔ وہ جانتا تھا کہ کل رات صندل نے بھی کچھ ایسی ہی گزاری ہو گی۔ منگنی کی انگوٹھی تانیہ کو پہناتے ہوئے صندل نے اسے دیکھ لیا تھا۔ اب وہ جلد سے جلد صندل کی غلط فہمیاں دور کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس سے پہلے زویا سے بات کر لینا ضروری تھا۔ وہ صندل سے معافی مانگ لینے کے بعد اسے پھر کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

زویا کل کی منگنی والے دن کی تصویریں دیکھ رہی تھی۔ میرزاد کی بات پر اس نے ناگواری سے میرزاد کو دیکھا تھا۔

"تم منگنی کی تصویریں دیکھو، کتنی پیاری آئی ہیں۔" اس نے اس کے پاس آ کر تصویریں اس کے سامنے کی تھیں۔ "تم دونوں کی جوڑی کتنی پیاری لگ رہی ہے میر...... کسی کی نظر نہ لگے بس......"

"مجھے میری بات کا جواب دیں آپی......" وہ زویا کا تصویروں والا ہاتھ پرے کرتے ہوئے بولا تھا۔ "زوہیب بھائی سے کب بات کریں گی آپ؟"

"کون سی بات......؟" وہ یکسر انجان بنتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"تانیہ سے منگنی ختم کرانے والی بات......"

زویا نے تصویروں کو غصے سے سائیڈ پر پٹخا تھا۔

"منگنی ختم نہیں ہو گی میر......" زویا نے صاف الفاظ میں کہا تھا۔ میر نے شدید حیرت سے زویا کو دیکھا تھا۔

"آپ شاید بھول رہی ہیں کہ آپ نے وعدہ کیا تھا۔"

"بالکل...... مجھے یاد ہے کہ میں نے وعدہ کیا تھا۔ میں بھول نہیں رہی ہوں۔ لیکن اپنے وعدے

سے مکر رہی ہوں۔"

"لیکن کیوں......؟" وہ تو جیسے زویا کی بات پر تڑپ ہی اٹھا تھا۔

"تمہاری شادی صندل سے نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ وہ خاندانی لڑکی نہیں ہے۔"

اس بار زویا نے جیسے اس پر بم دے مارا تھا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

"جو تم سن رہے ہو میر......نہ تو چاندامی اس کی سگی ماں ہے اور نہ ہی التمش اس کا سگا باپ تھا۔"

"آپ سے یہ سب کس نے کہا......؟"

"وہ تم چھوڑ دو......لیکن یہ بات سو فی صد درست ہے کہ صندل ایک ناجائز اولاد ہے۔"

میر زاد کیا بولتا......اسے ان باتوں نے سخت حیران کیا تھا۔

"کیا صندل نے تمہیں اس بارے میں بتایا تھا؟"

"نہیں......!"

"وہ چالاک لڑکی حویلی کی ایک ایک بات بتاتی رہی اور اتنی اہم بات چھپا گئی۔ اور خیر سے تم بھی بے وقوف......محبت کرنے سے پہلے کچھ جانچ پڑتال ہی کر لینی تھی۔"

"محبت کرنے سے پہلے یہ بھی کیا جاتا ہے کیا......؟" وہ دکھی انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"تمہارے لیے کرنا ضروری ہے کیونکہ تم مردم شناس نہیں ہو۔ تم آنکھیں بند کر کے محبت کرنے والے ہو میر......لیکن شکر ہے کہ میں تمہارے جیسی نہیں ہوں۔" میر زاد کو مسلسل لاجواب کرتے ہوئے وہ رکی تھی۔ "صندل کو بھول جاؤ تم......تانیہ سے تمہاری شادی ہو یا نہ ہو......لیکن صندل سے کبھی نہیں ہو گی۔" زویا نے دو ٹوک انداز میں کہا تھا۔ میر زاد بت بنا کھڑا رہا تھا۔ "تصویریں دیکھ کر دل بہلا لو اپنا......تمہاری اور تانیہ کی جوڑی بہت پیاری لگ رہی ہے۔" زویا کہتے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئی۔

میرزادا ایسا گم صم ہو چکا تھا جیسے اس کے سارے اثاثے لوٹ لیے گئے ہوں۔

☆......☆......☆

''جی چاند امی......آپ نے بلایا؟''

چاند بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہی تھی جب صندل وہاں آئی۔

''کیا بات ہے۔ نیچے ایک ایک فرد مجھے کہہ چکا ہے کہ آپ بہت غصے میں نظر آرہی ہیں آج......''

''کیا رحبانی نے تم سے کوئی بات کی تھی؟''

''کس بارے میں......؟'' وہ انجان بنتے ہوئے پوچھ رہی تھی جبکہ وہ جانتی تھی کہ چاند کیا پوچھنا چاہ رہی ہے۔

''کسی کشمیری تاجر کے رشتے کے بارے میں......؟''

''جی......کی تھی۔''

''پھر......؟ تم نے کیا کہا؟''

''میں نے رضامندی دے دی ہے۔'' اس نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا تھا۔

چاند نے شدید حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ جیسے سن کر بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ صندل نے یہ جملہ اس کے سامنے بول دیا ہے۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم......؟''

''جو مجھے بہتر لگا۔'' وہ لاپرائی سے بولی تھی۔

''تم اتنی بڑی ہو گئی ہو کہ اپنے فیصلے خود لے سکو۔'' چاند نے غصے سے کہا تھا۔

''جی......شاید ہو چکی ہوں۔ بڑی بھی اور سمجھ دار بھی......''

''ہرگز نہیں......ابھی تم بہت چھوٹی ہو۔''

''آپ شاید بھول رہی ہیں کہ آپ نے ہی بتایا تھا کہ آپ مجھ سے بھی بہت چھوٹی تھیں جب آپ نے مجھے گود میں لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں تو پھر کافی بڑی ہو چکی ہوں۔ کوئی بھی فیصلہ لے سکتی ہوں۔''اس نے ردعمل دینے سے زیادہ چاندکو لاجواب کیا تھا۔

''تمہارا دماغ خراب ہو چکا ہے صندل...... نجانے کیا سوچ کر تم نے رحبانی کو آمادگی دے دی۔ میں ابھی جا کر اسے منع کرتی ہوں۔'' چاند کہتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی تھی۔

''آپ ایسا نہیں کریں گی چاندامی......'' دروازے میں سے باہر نکلتے وہ اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

''اپنی زندگی کا کوئی بھی فیصلہ لینے کا حق صرف مجھے ہے۔''

''مجھے کیوں نہیں ہے؟'' چاند کی حیرت ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔

''کیونکہ آپ میری سگی ماں نہیں ہیں۔''اس نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہہ دیا تھا۔اور اگلے ہی پل شدید غصے سے چاند نے ایک زوردار تھپڑ صندل کے منہ پر دے مارا تھا۔

☆......☆......☆

کوٹھے کی اونچی چھت پر شیشے کا کام کیا گیا تھا۔ چھوٹے بڑے شیشوں سے چھت کو آراستہ کروایا گیا تھا۔ یہ کام پچھلے دنوں ہی ہوا تھا۔ جب بستامی نے انہیں افشیں کے سودے کے پیسوں میں سے ان کا حصہ دیا تھا۔ روشن بیگم نے ان پیسوں سے اپنے کوٹھے کو آراستہ کروالیا تھا۔ اور اب چھت پر نصب چھوٹے بڑے شیشوں میں خود کو دیکھتے ہوئے وہ مسکرا رہی تھیں۔ بھاری تخت پر بچھا ہوا ان کا وجود کسی مغل ملکہ کی طرح کا دکھ رہا تھا۔ خود وہ اپنے آپ کو پنکھا جھل رہی تھیں اور سوچ رہی تھیں کہ تین کلو سونے میں سے ان کا کیا حصہ نکلے گا۔

''روشن بیگم......!''ایمن بھاگی بھاگی ان کے پاس آئی تھی۔

''کیا بات ہے میری پری......؟'' وہ مسکرا کر بولی تھیں۔

''کمال صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ کشمیری قالینوں کے تاجر......''

''کیا......؟ کمال آ رہا ہے......؟'' وہ اٹھ بیٹھیں۔

''جی......ملازم خبر لایا ہے۔ان کی بگھی بازار کے وسط تک پہنچ چکی ہے۔''

''جلدی کرو پھر......جلدی سے صفائی کرواؤ کوٹھے کی......خوشبو نچھاور کرو......میں انہیں خوش آمدید کہنے نیچے جاتی ہوں۔''

ہدایات دے کر روشن بیگم نے ایک نظر خود کو آئینے میں دیکھا تھا۔ سنگھار میز پر پڑے اپنے زیورات میں سے کچھ کو مزید اپنے اوپر چڑھا لیا تھا۔ پھر ساڑھی کا پلو طریقے سے درست کیا تھا۔ اور نیچے چلی گئی تھیں۔

کمال کی بگھی کے پہنچنے سے پہلے اس کے ملازم ان کے گھر کی دہلیز تک پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے سر جھکاتے ہوئے روشن بیگم کو سلام پیش کیا تھا۔ پھر چار گھوڑوں والی بگھی ان کے دروازے کے باہر رکی تھی۔ روشن بیگم نے خود آگے بڑھ کر بگھی کا پردہ سرکایا تھا۔

''زہے نصیب......زہے نصیب......ان آنکھوں کو کب سے آپ کا انتظار تھا۔'' ہاتھ آگے کرتے ہوئے انہوں نے کمال کو نیچے بلانا چاہا تھا۔ کمال مسکرایا تھا۔ اس نے روشن بیگم کا ہاتھ تھام لیا تھا اور بگھی میں سے نیچے اترا تھا۔

''سلام خدمت......!'' روشن بیگم نے اب کے کمال کا ہاتھ پشت سے چوم لیا تھا۔ یہ ہی تو ان کی ادائیں تھیں جو ان کے گاہکوں کو کسی اور کے کوٹھے پر جانے نہ دیتی تھیں۔ روشن بیگم جانتی تھیں کہ گاہک چاہے کنگال ہی کیوں نہ ہو چکا ہو۔ اسے بے حد عزت دینا ضروری ہے۔ یہ چیز گاہک کے پھر سے امیر ہو جانے پر اسے روشن بیگم کا مرید بنا دیا کرتی تھی۔

کمال کے ساتھ آئے ملازم ساتھ لائے ہوئے تحفے تحائف باہر نکالتے ہوئے گھر کے اندر پہنچانے لگے تھے۔

''آئیں......اوپر چلتے ہیں۔''

''بالکل......بیٹھنے کے لیے ہی تو آئے ہیں۔''

کمال کا ہاتھ تھامے ہوئے روشن بیگم انہیں اوپر کمرے میں لائی تھیں جہاں ان کی پھرتیلی ملازماؤں نے برق رفتاری سے کوٹھے کو سجا بنا دیا تھا۔

''ادھر بیٹھیے......''

وہ ایک قدرے اونچی اور گداز نشست پر اس کو بٹھا کر خود بھی اس کے برابر بیٹھ گئی تھیں۔ ملازم کشمیری تحائف وہاں ہی رکھتے جا رہے تھے۔ پھلوں کی ٹوکریاں، لباس اور قالین......

''اس سب تکلف کی کیا ضرورت تھی کمال صاحب......''

''آپ کی طرف بنا تحائف کے کیسے آ سکتا ہوں۔ ان میں سے کچھ تحفے میری بیوی نے بھیجے ہیں۔ انہیں آپ کی رقاصاؤں کا رقص بہت پسند آیا تھا جو انہوں نے ہمارے گھر نوروز کے تہوار پر کیا تھا۔

''شکریہ ان کی ستائش کا......انہیں میری طرف سے بہت شکریہ بولیے گا۔'' روشن بیگم نے کہا تھا اور پھر ایمن کو آواز دی تھی۔

''کمال صاحب کے لیے گلوقند کا شربت لاؤ۔''

''نہیں روشن بیگم......آج گلوقند کا شربت نہیں پیوں گا۔ بلکہ آج تو ہمیں آپ صندل کا شربت پلائیں۔ وہ بھی صندل کے ہاتھوں سے......'' کمال نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

روشن بیگم کے چہرے پر سایہ آیا تھا۔ یہ کیا کہہ دیا تھا کمال نے......کیسی فرمائش ڈال دی تھی۔

''جب سے اسے دیکھا ہے میں تو چین سے سو نہیں سکا روشن بیگم......سچ پوچھیے تو آج اس کا

دیدار کرنے ہی آیا ہوں۔"

"ایسے تھوڑی نہ کروائیں گے دیدار......" روشن بیگم لہک کر بولی تھیں اور اس دوران کوئی بہانہ سوچنے لگی تھیں۔

"آپ کی فکر میں سمجھ سکتا ہوں روشن بیگم......آپ صندل کو میرے ساتھ رخصت کرنے والی بات کریں۔ طے شدہ سونا ابھی کے ابھی آپ تک پہنچ جائے گا۔"

"رخصت بھی کر دیں گے۔ کیا آپ نے بارات کی تیاری کر لی ہے؟"

"بارات......؟ کیا مطلب......؟" کمال نے اچنبھے سے روشن بیگم کو دیکھا تھا۔

"مطلب......نکاح کے لیے ساتھ کچھ لوگ تو لائیں گے ہی نا آپ......؟"

"نکاح......؟" کمال مزید حیران ہوا تھا۔ "یہ آپ کیا کہتی جا رہی ہیں روشن بیگم؟"

روشن بیگم سب سمجھ رہی تھیں، اسی لیے خاموش ہو گئی تھیں۔

"میں کیوں نکاح کروں گا صندل سے......میں ایک خاندانی مرد ہوں۔ ہمارے گھرانے کی عورتوں کے سائے بھی غیر مردوں نے نہیں دیکھے ہوئے اور میں ایک ستار بجانے والی لڑکی سے نکاح کر لوں۔" کمال غصے سے بولتا چلا گیا تھا۔ روشن بیگم بری طرح سے گھبرا گئی تھیں۔ انہیں معاملے کے بگڑ جانے کا ڈر ہوا تھا، اسی لیے گھبراہٹ میں بھی مسکرا رہی تھیں۔

"آپ کیوں اتنا ناراض ہو رہے ہیں کمال صاحب......"

"آپ نے بات ہی عجیب کی ہے۔ نکاح ہی کرنا ہو تو پھر میں اسے سونے میں کیوں تو لوں؟"

"آپ کی بات ٹھیک ہے۔ لیکن یہاں معاملہ تھوڑا الگ ہے، اس لیے نکاح کا کہہ رہی تھی میں......"

"نکاح ناممکن ہے۔ میرے باپ کو پتا چل گیا کہ میں ایک ستار بجانے والی سے شادی کر چکا ہوں تو وہ مجھے قتل کرنے میں ایک منٹ بھی ضائع نہیں کریں گے۔"

"تو پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"میں صندل کو اپنی رکھیل بنا کر رکھوں گا۔ایک الگ گھر لے کر دوں گا جہاں وہ شاہانہ زندگی گزارے گی۔لیکن اس کا میرے خاندان، یا میری خاندانی جائیداد سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔بچہ ویسے تو ہوگا نہیں...... لیکن اگر ہو بھی گیا تو اس کی پرورش میری بیوی کرے گی، صندل کو اس بچے کو دیکھنے کی بھی اجازت نہیں ہوگی۔"

کمال نے دوٹوک انداز میں بات کی تھی۔ وہ تاجر تھا۔تجارت کرتے وقت لگی لپٹی رکھنے کا عادی نہیں تھا۔روشن بیگم نے تھوک نگلا تھا۔یہاں معاملہ کچھ ٹیڑھا ہو رہا تھا۔کمال نے تو براہ راست صندل کو رکھیل بنانے کی بات کر ڈالی تھی۔

"ٹھیک ہے کمال صاحب! مجھے آپ کی ہر بات منظور ہے۔" روشن بیگم نے آمادگی دے دی تھی۔وہ جانتی تھیں کہ بستامی بھی ایسا ہی کرے گا جیسا وہ اسے کرنے کو کہیں گی۔

"لیکن آج کے لیے معذرت خواہ ہوں۔صندل اپنی خالہ کے ہاں گئی ہوئی ہے۔مجھے ذرا سا بھی اندازہ ہوتا کہ آپ نے آنا ہے تو میں اسے نہ جانے دیتی۔"

روشن بیگم کی بات پر کمال کا منہ اتر گیا تھا۔اور روشن بیگم سارے حربے جانتی تھیں۔

"آج آپ کو کیسر کے ہاتھ سے کیسر کا شربت پلاتی ہوں۔مزا نہ آئے تو پھر بولیے گا۔" روشن بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"آپ نے پہلی بار کسی چیز کی معذرت طلب کی ہے تو مجھے بھی اعلیٰ ظرفی دکھانی پڑے گی۔لیکن آئندہ صندل کے آنے اور جانے پر میری مرضی چلے گی۔کیونکہ سودا طے ہو چکا ہے۔اور اس حساب سے اب صندل میری ہے۔"

"ٹھیک ہے...... جیسا آپ کہیں......"

☆......☆......☆

اس نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا اور نہ ہی رات کا کھانے کا ارادہ تھا۔ نجانے کتنے گھنٹوں سے وہ اپنے کمرے میں بند تھی۔ چاند سے تھپڑ کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔ اور چاند کی بھی ہمت نہیں رہی تھی کہ وہ اس کے کمرے میں جاتی اور اسے منانے کی کوشش کرتی۔ صندل کو تھپڑ مار دینے کے بعد چاند کو افسوس ہوا تھا۔ لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ گزرا وقت واپس آ سکتا تو وہ التمش کو نہ اپنی زندگی میں واپس لے آتی۔

افسوس تو صندل کو بھی ہو رہا تھا۔ میرزاد کا غصہ اس نے چاند امی پر نکال دیا تھا۔ اسے چاند امی کے ساتھ بدتمیزی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اس نے کیا سوچ کر رحیانی بابا کو رشتے کے لیے رضامندی دے دی تھی۔ میرزاد پر غصہ ایک طرف، لیکن اسے کچھ ہوش مندی کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔ یہ سب کسی بھی ماں کے ساتھ ہوتا تو اس کا وہی ردعمل ہونا تھا جو چاند امی نے دیا تھا۔ جانے انجانے میں اس نے چاند امی کو اپنی سگی ماں نہ ہونے کا طعنہ بھی دے دیا تھا۔ یہ یقیناً ایک دل دکھا دینے والی بات تھی۔ اور یہ سب میرزاد کی وجہ سے ہو رہا تھا۔

"آخر یہ میرزاد میری زندگی میں آیا ہی کیوں......" بے آواز روتے ہوئے وہ خدا سے شکوے کرنے لگی تھی۔ "کاش! میں اس سے نہ ملی ہوتی......کبھی نہ ملی ہوتی......"

منگنی کی رسم کو یاد کرتے ہوئے وہ مزید رونے لگی تھی۔ کس قدر ڈھٹائی سے مسکرا رہا تھا وہ، تانیہ کو منگنی کی انگوٹھی پہناتے ہوئے......ایک لڑکی کو بے وقوف بنا دینے کے بعد......

غلطی صندل کی تھی۔ وہ کیوں اسے سب سے مختلف سمجھی تھی۔ وہ تو روایتی مرد تھا۔ جسم کا طالب......جبکہ صندل تو اسے اپنی روح سے چاہنے لگی تھی۔

چاند نیچے والے کمرے میں بند تھی۔ اس نے بھی دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا اور نہ ہی رات کا کھانے کا ارادہ تھا۔ کیونکہ آج اس نے نعمت خانے میں جا کر رات کے کھانے کو لے کر نہ تو کچھ ہدایت

دی تھی اور نہ ہی دلچسپی ظاہر کی تھی۔ حاجی بوا کو دونوں کی فکر ہونے لگی تھی۔ یہ ہو کیا رہا تھا حویلی میں...... آئے روز کچھ نہ کچھ نیا ہی سننے کو ملتا تھا۔

''چاند...... رحبانی آ گیا ہے۔'' حاجی بوا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا تھا۔ چاند فوراً سے اٹھی تھی۔

''کہاں ہے......؟''

''اپنے کمرے میں گیا ہے۔ تم نے کہا تھا کہ وہ آئے تو تمہیں بتاؤں۔''

چاند فوراً سے کمرے سے باہر نکلی۔

رحبانی کپڑے تبدیل کرنے کے بعد آتش دان کے قریب بیٹھا تھا۔ اور اس نے اپنا پسندیدہ ساز اٹھالیا تھا۔ سنکھ...... بہت دن ہو گئے اس نے اسے نہیں بجایا تھا۔ لیکن آج بجانا چاہتا تھا، کیونکہ کمال نے کہا تھا کہ وہ صندل سے نکاح نہیں کرے گا، بلکہ اسے اپنی رکھیل بنا کر رکھے گا۔ یہ بات کومل نے اسے آج شام میں ہی بتائی تھی۔ اور جس بات کی رحبانی کو خوشی ہو رہی تھی۔ آنے والا وقت اس کے لیے بہت مسرت والا ہونے والا تھا۔ جب چاند کو پتا چلے گا کہ اس کی بیٹی کے ساتھ کیا کچھ ہو چکا ہے تو وہ اسی طرح تڑپے گی جیسے کبھی رحبانی اس کی محبت میں تڑپا کرتا تھا۔

سنکھ کو منہ کے قریب لا کے وہ اسے بجانے ہی والا تھا جب چاند غصے سے اس کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ دروازے کے زور سے دیوار پر لگنے پر رحبانی نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

''کیا ہوا ہے چاند......؟ تم اس طرح اچانک...... اور یہ کیا انداز ہے کمرے میں داخل ہونے کا......؟''

چاند کو اتنا غصہ تھا کہ اس نے رحبانی کی باتوں کا جواب دینے کے بجائے سنکھ کو پکڑ کر زور سے زمین پر دے مارا تھا۔ لیکن قوت سے مارنے پر بھی وہ ٹوٹی نہیں تھی، بلکہ گر کر لڑھک کر دور چلی گئی تھی۔

رحبانی ہنسا تھا اور پھر ہنستا ہی چلا گیا تھا۔

''کیا ہوا ہے چاند...... کس بات کا غصہ ہے تمہیں...... تم جانتی تو ہو کہ یہ سنکھ بہت مضبوط ہے، نہیں ٹوٹتی......''

''تم خود کو کیا سمجھتے ہو رحبانی......'' اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ رحبانی کا گریبان پکڑ لے۔

''ہوا کیا ہے۔ کچھ بولو تو سہی......''

''تم کون ہوتے ہو میری بیٹی کا رشتہ طے کرنے والے......''

''میں نے کیا کیا ہے۔'' رحبانی نے معصوم بنتے ہوئے پوچھا تھا۔ جو آگ وہ لگانا چاہتا تھا، اس کی شروعات ہو چکی تھی۔ ''اس نے خود رضامندی دی ہے۔''

''تم نے اس سے رشتے کی بات کی ہی کیوں......؟''

''تو اور کس سے کرتا......؟ تم سے......؟'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھنے لگا۔ ''اور تمہیں اس رشتے سے کیا مسئلہ ہے چاند......؟''

''جو بھی ہو، تم کون ہوتے ہو اس کی زندگی کے بارے میں سوچنے والے؟''

''اب التمش تو ہے نہیں...... کسی کو تو سوچنا پڑے گا۔'' رحبانی ترنگ میں بولا تھا اور زمین پر گری سنکھ کو اٹھا کر اس کی گرد صاف کرنے لگا تھا۔

''دراصل تم ساری زندگی اکیلی رہی ہو چاند...... اب صندل کو خود سے دور ہونے نہیں دے رہی......''

''ایسا کچھ نہیں ہے۔''

''ایسا ہی ہے۔ تم صندل کو ساری زندگی اپنے ساتھ لگا کر رکھنا چاہتی ہو۔ اس کے لیے کوئی ایسا لڑکا ڈھونڈنا چاہتی ہو جو گھر داماد بن جائے یا کم از کم پاس کا ہی رہنے والا ہو۔ اتنی دور، کشمیر کیونکر بھیجو گی تم اسے......''

''میں نے اس رشتے سے اس لیے انکار کیا تھا کہ صندل کسی کو چاہتی ہے۔''

''وہ جس کو چاہتی ہے، کل اس کی منگنی ہو چکی ہے۔'' رحبانی نے بتایا تھا اور چاند نے حیرت سے

اسے دیکھا تھا۔

''ک......کون......؟ کس کی بات کر رہے ہو تم......؟''

''میر زاد کی...... جو ایک بار اپنی بہن کے ساتھ ہمارے گھر بھی آ چکا ہے۔ اسی کی بات کر رہا ہوں میں......کل منگنی تھی اس کی......'' رحبانی نے کچھ اس انداز میں کہا تھا کہ چاند کو اس کا یقین کرنا پڑا تھا۔ اور سارا قصہ اسے سمجھ میں آ گیا تھا۔ صندل کا رشتے کے لیے رضامندی دینا اور پھر اس کے ساتھ بدتمیزی کرنا۔ تو اس کے غصے اور انتشار کی وجہ میر زاد کی منگنی تھی۔

جلدی سے وہ کمرے سے باہر نکلی تھی اور صندل کے کمرے میں گئی تھی۔

آنکھوں پر بازو رکھے وہ شاید سو رہی تھی یا سونے کی اداکاری کر رہی تھی۔

''صندل......!'' چاند نے اسے پکارا تھا۔ صندل نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ چاند اس کے پاس بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

''صندل......! اپنی امی کو معاف کر دو۔''

چاند نے کچھ اتنے دکھی انداز میں کہا تھا کہ صندل نے آنکھوں پر سے بازو ہٹایا تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''میں شرمندہ ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔''

صندل چپ رہی تھی۔ اس نے کچھ نہیں بولا تھا۔ آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو صاف کیا تھا۔

''میر زاد کی منگنی ہو چکی ہے، تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟''

''آپ کو کس نے بتایا......؟''

''رحبانی نے...... مجھے بتاؤ کہ کیا یہ سچ ہے؟''

''جی......سچ ہے۔'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

''لیکن کیوں......؟ وہ تو تمہیں چاہتا تھا۔''

''میری غلط فہمی تھی۔ وہ مجھے نہیں چاہتا، تب ہی تو اس نے منگنی کروالی ہے۔''

''لیکن ہو سکتا ہے کہ تمہیں کچھ غلط فہمی ہو رہی ہو۔''

''میں نے اسے خود دیکھا ہے چاند امی...... مسکراتے ہوئے وہ انگوٹھی پہنا رہا تھا تانیہ کو......'' صندل نے روتے ہوئے کہا تھا۔ اور چاند امی بے یقینی سے اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

''لیکن ایسا کیوں ہوا؟''

''مجھے نہیں پتا...... کیوں کیا اس نے میرے ساتھ ایسا......'' اس کا غم ہلکا ہونے میں نہیں آرہا تھا۔

''اسی لیے تم نے رحبانی کو غصے میں ہاں بول دیا۔''

چاند کے پوچھنے پر اس نے ہاں میں سر ہلایا تھا۔

''تم نے غصے میں غلط کیا صندل......''

''شاید...... لیکن مجھے اب یہی بہتر لگتا ہے۔''

''تم مت رو...... اپنے آنسو صاف کرو۔'' وہ اس کے آنسو صاف کرنے لگی تھی۔

''کتنی بار صاف کریں گی یہ آنسو......؟''

''میں تمہیں کبھی رونے ہی نہیں دوں گی میری جان......''

''تو پھر جائیں...... میرزاد کے پاس...... پوچھیں اس سے اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا ہے۔ منت کرلیں اس کی کہ وہ مجھ سے شادی کرلے۔'' وہ بے تحاشا روتے ہوئے بولی تھی۔

''میں کروں گی ایسا......'' لمحہ بھر سوچنے کے بعد چاند نے کہا تھا۔ صندل نے بے یقینی سے اسے دیکھا تھا۔ ''تمہارے لیے میں یہ کرسکتی ہوں...... بنا شرم کے......''

''اور اگر وہ نہ مانا تو پھر میں اسی سے شادی کروں گی جس کو میں رضامندی دے چکی ہوں۔''

اس نے بھی دوٹوک انداز میں اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

"میں کشمیر چلی جاؤں گی۔ یہاں نہیں رہوں گی۔ میں بتا رہی ہوں آپ کو......"

"ایسا نہیں ہوگا۔ میں بات کرتی ہوں میرزاد سے...... ابھی جا کر کرتی ہوں۔ تم رومت میری بچی......" چانداس کے آنسو صاف کرنے کے بعد کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔

صندل تکیے میں منہ چھپا کر رونے لگی تھی۔ اسے افشیں رہ رہ کر یاد آرہی تھی۔ اسے اب سمجھ میں آیا تھا کہ افشیں کیوں مر مر جا رہی تھی۔ اور افشیں کو یاد کرتے ہی اسے عادل بھی یاد آ گیا تھا اور درخت سے لٹکتی ہوئی اس کی لاش بھی......

اسے لگنے لگا تھا کہ اب کے حویلی کے سامنے درخت پر اس کی لاش لٹکے گی۔ اور بہت جلد لٹکے گی۔

☆......☆......☆

میرزاد گھر کے لان میں ٹہل رہا تھا۔ زویا کی دن میں کہی ہوئی باتیں اس کے دماغ میں گھوم رہی تھیں۔

"صندل ناجائز ہے۔" زویا کے یہ الفاظ اسے ڈس رہے تھے۔ گھائل کر رہے تھے۔

سارے گھر والے گھر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ زوہیب، زویا، زوہیب کی والدہ اور تانیہ بھی...... سب باہر کھانا کھانے گئے ہوئے تھے۔ اس نے بہت مشکل سے ان کے ساتھ جانے سے انکار کیا تھا۔ زویا نے اس کا ساتھ دیا تھا۔

"زوہیب! اسے تانیہ سے ابھی شرم آتی ہے۔ اسے فورس مت کرو...... ہم چلتے ہیں بس......"

زویا نے بات سنبھال لی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے ٹوٹے ہوئے بھائی کو سنبھلنے میں ابھی وقت لگے گا۔

"صاحب! آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔" ملازم نے اس کے پاس آکر اس سے کہا تھا۔

"کون......؟"

"کوئی خاتون ہیں۔ کہہ رہی ہیں کہ دین حویلی سے آئی ہیں۔"

"انہیں اندر لائیں۔"

"جی بہتر......" ملازم واپس ہوا تھا۔ اس نے گھر کے مین گیٹ میں نصب چھوٹے گیٹ کو پھر سے کھولا تھا۔ جو اندر داخل ہوا تھا۔ اس کو دیکھ کر میر زاد حیران ہوا تھا۔ وہ وہاں چاند کی آمد کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام! کیسے ہو؟"

"جی......بہتر ہوں۔ بیٹھیے......"

"نہیں......میں بیٹھنے نہیں آئی ہوں میر......!" چاند نے کھڑے کھڑے ہی کہا تھا۔ "میں تو تم سے بات کرنے آئی ہوں۔"

"جی......کیجیے۔"

"کیا صندل سے تمہارا کوئی جھگڑا ہوا ہے؟" چاند نے پوچھا تھا۔

میر زاد خاموش رہا تھا۔

"بولو میر......تم بھی چپ رہے تو میں اپنے جواب کس سے مانگوں گی؟"

"ایسا کچھ نہیں ہے۔"

"تم نے اپنی منگنی کروالی ہے۔"

"جی......!" سر جھکائے وہ بولا تھا۔

"تو صندل......؟ وہ کہاں جگہ رکھتی تھی تمہاری زندگی میں......؟"

"وہ میری زندگی میں سب سے اہم تھی چاندامی......لیکن آج صبح تک......"

"میں سمجھی نہیں......کیا کہنا چاہتے ہو تم......آج صبح تک؟"

"کیا صندل آپ کی بیٹی ہے......؟"

''ہاں ...... صندل میری ہی تو بیٹی ہے۔''

''سگی بیٹی ......؟'' میرزاد نے پوچھا تھا۔

چاند خاموش اس کی صورت دیکھنے لگی تھی۔

''بولیے ...... کیا صندل آپ کی سگی بیٹی ہے؟''

''نہیں ......!''

''اس کی ماں اور باپ کا علم ہے آپ کو ......؟''

''نہیں ......!'' اس کے پاس جواب کے لیے یہ ہی لفظ تھا۔

''پھر اس کے ماں اور باپ کو ڈھونڈ لائیے۔ میں اس سے شادی کر لوں گا۔''

''تمہیں ابھی کیا برائی نظر آتی ہے صندل میں ......؟''

''برائی اس میں نہیں ...... خون میں ہے۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا تھا۔ ''میں یہ بات برداشت نہیں کر سکوں گا کہ کوئی مجھے کہے کہ میری بیوی ناجائز خون ہے۔''

چاند کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ تو یہ وجہ تھی جس باعث اس کی بیٹی ٹھکرا دی گئی تھی۔

''تم اس کی محبت کو نظر انداز کر کے زمانے کا سوچ رہے ہو بیٹا ......''

''کیونکہ مجھے اسی زمانے میں جینا ہے چاند امی ...... کسی نئے زمانے میں زندگی نہیں گزارنی ہے میں نے ......''

''لیکن میر ...... اس میں صندل کا کیا قصور ہے؟''

''قصور تو میرا بھی نہیں ہے۔ صندل کو یہ بات پہلے ہی بتا دینا چاہیے تھی۔ پھر شاید میں اس سے محبت نہ کرتا ......''

''اس پر ترس کھاؤ میر ...... وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ بہت زیادہ محبت ......''

''اس محبت کا انجام ہو چکا ہے۔ میری بہن کبھی بھی اس شادی کے لیے راضی نہیں ہو گی۔''

''تم کہو تو میں بات کروں اس سے......؟''

''کوئی فائدہ نہیں...... میری محبت بھی مرجھا چکی ہے چاندامی......'' اس نے مایوسی سے کہا تھا۔

''مجھے کوئی تو حل بتاؤ میر...... کوئی تو حل ہوگا میری بیٹی کے دکھوں کو کم کرنے کے لیے......''

''حل ہے...... صندل کے اصلی ماں باپ کو ڈھونڈ لائیں آپ......''

''یہ تو مشکل ہے۔ شاید ناممکن......!''

''پھر مزید بات چیت بھی بے کار ہے۔'' میرزاد نے کہا تھا اور اندر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا تھا۔

چاند کچھ دیر وہاں ہی کھڑی اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی تھی۔

شام کا وقت تھا اور پوری رات چاند کی آنکھوں میں اتر چکی تھی۔

☆......☆......☆

حویلی واپسی کا سفر اس نے ایسے طے کیا تھا۔ جیسے وہ کوئی پہاڑ چڑھ کر آ رہی ہو۔ اور پہاڑ بھی وہ جس کی ڈھلان بالکل سیدھی ہو۔ اور دل میں ہر لمحہ وہم آئے کہ ابھی گر جائیں گے۔ اس کے قدم وزنی ہو رہے تھے۔ یہ ہی وجہ تھی کہ اسے حویلی واپس پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی تھی۔

''کہاں سے آ رہی ہو چاند......؟ رات کو تو تم کبھی باہر نہیں جاتیں......'' صحن میں کھڑے بستامی نے پوچھا تھا۔ ''میں نے کام کرنے والے ملازموں کو چھٹی دے دی ہے۔ تم تو نجانے کہاں چلی گئی تھی۔''

''ٹھیک کیا تم نے......'' چاند نے کچھ تھکے تھکے سے انداز میں کہا تھا۔

''کیا ہوا ہے؟ تم کچھ پریشان لگ رہی ہو۔''

''ہاں...... ہوں۔''

''مجھے بتاؤ میری بہن...... کیا ہوا ہے؟'' بستامی اس کا ہاتھ پکڑ کر بڑے کمرے میں لے گیا تھا۔

اوپر صندل اپنے کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔اسے چاندامی کے گھر واپس آ جانے کا انتظار تھا۔شاید کچھ اچھا سننے کو مل جائے۔

عشاء کی نماز کے وقت چاند کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ایسے جیسے سب کچھ ہار چکی ہو۔صندل نے اسے دیکھا تو فوراً سے اس کی طرف بڑھی تھی۔

''اتنی دیر سے آئی ہیں آپ......'' اس نے چھوٹتے ہی کہا تھا۔چاند خاموش رہی تھی۔وہ اس سے نظریں چرائے کھڑی تھی۔

''ملی تھیں آپ میرزاد سے......؟''

''ہاں......ملی تھی۔''

''کیا کہا اس نے......؟''

چاند کیا بولتی......کیا بتاتی صندل کو کہ میر نے کیا کہا ہے۔وہ پہلے سے دکھی بیٹی کو مزید دکھ نہیں دینا چاہتی تھی۔میرزاد کی باتوں نے تو اس کا سینہ چیر دیا تھا۔صندل کہاں برداشت کر سکتی تھی۔

''بولیے چاندامی......''

''ابھی نیچے مجھے بستامی ملا تھا صندل......''

''پھر......؟'' اس بے محل بات پر صندل بٹر بٹر انہیں دیکھنے لگی تھی۔

''میں نے اسے رضامندی دے دی ہے۔تمہاری شادی کشمیری لڑکے سے ہو جائے گی۔'' چاند نے جیسے صندل پر کوئی پہاڑ گرا دیا تھا۔''تم بہت جلد کشمیر چلی جانا......یہ سب چھوڑ کر......''

چاند نے کہا تھا اور صندل دھپ سے بیڈ پر بیٹھی تھی......ایسے جیسے آخری بازی بھی ہار چکی ہو۔

☆......☆......☆

''آج پھر سے اپنی قسمت کا حال جاننے آئی ہو باریشہ......؟'' ایک پرانی کتاب پر جھکے ہوئے

ارشادی بابا نے چال سے ہی اندازہ لگایا تھا کہ باریشہ اس کی دکان میں داخل ہو چکی ہے۔

''ابھی مہینہ پہلے تو تم نے مجھ سے اپنی قسمت کا حال پوچھا تھا۔''

''نہیں......آج ایسا نہیں کرنے آئی ہوں میں ارشادی بابا......'' گہرا سانس بھرتے ہوئے وہ اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

''پھر یہ پوچھنے آئی ہوگی کہ تمہاری زندگی میں دولت کب آئے گی۔ دین حویلی سے تمہاری جان کب چھوٹے گی۔ چاند کب مرے گی وغیرہ وغیرہ، کیوں کہ تم گھما پھرا کر یہ ہی باتیں پوچھتی ہو۔''

''آج تو ویسے ہی چلی آئی ہوں۔ بازار سے گزر رہی تھی۔ نانو چاند نے کچھ جڑی بوٹیاں لانے کو کہا تھا تو سوچا کہ آپ سے بھی مل لوں۔''

''چاند تمہیں کوئی دوا نہیں بنا کر دیتی کہ تم اس سے محبت کرنے لگو اور اس کے مرنے کی دعائیں کرنا بند کر دو۔''

''ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ارشادی بابا......'' اس نے منہ بناتے ہوئے کہا تھا۔

''کیوں نہیں ہو سکتا؟''

''میری زندگی میں سکون تب ہی آئے گا جب وہ بڑھیا مرے گی۔''

''بری بات......ایسے نہیں کہتے۔''

''بروں کے لیے برے لفظ ہی نکلتے ہیں منہ سے......''

''وہ بری نہیں ہے۔ بس تمہاری بات نہیں مانتی ہے، تمہاری ضدیں پوری نہیں کرتی ہے۔''

''ایک ہی بات ہے۔ میرے ساتھ تو برائی ہو رہی ہے ناں......''

اس کی بات پر ارشادی بابا ہنسنے لگے تھے۔

''تم اپنی ماں کے بالکل الٹ ہو۔ وہ تو ایسی ہرگز نہیں تھی۔''

''آپ کتنی بار ملے ہیں میری ماں سے؟'' وہ اشتیاق سے پوچھنے لگی تھی۔

''کئی بار...... آجایا کرتی تھی وہ بھی میرے پاس اکثر...... جیسے تم آجایا کرتی ہو۔''

''سنا ہے کہ انہوں نے زندگی بہت دکھ میں گزاری...... اور دکھوں میں ہی ان کی موت ہوئی۔''

''دکھ کس کی زندگی میں نہیں ہوتے باریشہ......!''

''یہ تو ہے۔''

''تم بھی اپنی ماں کی طرح بنو...... سمجھدار اور شاکر......''

''میری ماں کو دکھ دینے میں کون کون شامل رہا ہے ارشادی بابا......؟'' اس نے عجیب ہی سوال کیا تھا۔ ارشادی کے چہرے کے رنگ بدلے تھے۔

''کوئی تو دکھ دیتا ہے ناں...... آپ کیا سمجھتے ہیں کہ نانو چاند نے انہیں دکھی زندگی سے نوازا ہوگا؟''

''نہیں ایسا کچھ نہیں تھا۔''

''پھر...... میرا باپ......؟''

''نہیں...... وہ بھی نہیں......''

''تو پھر کون......؟''

''میں......!'' ارشادی نے اعتراف کرلیا تھا۔ سالوں کے بعد اس نے آج جیسے یہ اعتراف خود سے کیا تھا۔

باریشہ شدید ترین حیرت سے اسے دیکھنے لگی تھی۔



ناول **تاش گھر** ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **15** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 14

''چاند نے کمال کے رشتے کے لیے رضامندی دے دی ہے۔'' بستامی نے پان کی گلوری منہ میں رکھنے کے بعد روشن بیگم کو بتایا تھا۔ پاندان بند کرتے روشن بیگم کے ہاتھ رکے تھے۔

''کیا......؟ سچ میں......؟''

''جی...... بالکل سچ......!''

''تم تو کہہ رہے تھے کہ اس نے تمہیں صاف انکار کر دیا تھا۔''

''پہلے انکار ہی کیا تھا۔ بلکہ کھری کھری سنائی بھی تھیں۔ لیکن کل رات اس نے خود سے ہی کہا کہ وہ صندل کی شادی کشمیری لڑکے سے کرنا چاہتی ہے۔''

''حیرت ہے......''

''یہ سارا کام رحبانی نے کیا ہے۔''

''رحبانی سے اس معرکے کی کامیابی کی اتنی امید نہیں تھی۔ مجھے تو لگا تھا کہ مسئلہ کافی سنگین ہو جائے گا۔''

''وہ جو کام اپنے ذمے لیتا ہے کر کے رہتا ہے۔''

روشن بیگم سے کہتے ہوئے بستامی کو سالوں پہلے کا وہ دن یاد آ گیا تھا جب اس نے اسے التمش کی موت کے لیے اکسایا تھا۔ رحبانی نے یہ کام اپنے ذمے لے لیا تھا اور کس خوبی سے کیا تھا اس نے یہ

کام...... کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو سکی تھی کہ التمش کو رحبان نے قتل کیا ہے۔ درگا مورتی کے ہتھیار ترشول کے ذریعے سے......

"اب آگے کیا کرنا ہے؟"

"کرنا کیا ہے...... کمال سونے کی مرغی ہے۔ اس سے پہلے کہ کہیں اور جا کر سونے کا انڈہ دان کر دے، جلد سے جلد شادی کر دیتے ہیں۔" بستامی نے کہا تھا۔

پہلی بار روشن بیگم کے چہرے کے رنگ کچھ بدلے تھے۔ پاندان کو ایک طرف کھسکاتے ہوئے وہ پھر سے اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجانے کی کوشش کرنے لگی تھیں۔ بستامی نے ان کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو تاڑ لیا تھا۔

"کیا ہوا ہے؟ کیا کوئی بات ہے جو آپ کو پریشان کر رہی ہے؟"

"ہاں...... بات تو ہے۔ کمال نے ایک عجیب مطالبہ کر دیا ہے، جو شاید تمہیں پسند نہ آئے۔"

"کیا کہا ہے اس نے؟"

"اس نے کہا ہے کہ وہ صندل سے نکاح نہیں کرے گا، بلکہ اسے اپنی رکھیل بنا کر رکھے گا۔" روشن بیگم نے ہمت کرتے ہوئے کہہ دیا تھا۔ بستامی چپ ہو گیا تھا۔ بات کڑوی نہیں لیکن نئی ضرور تھی اس کے لیے...... روشن بیگم جانتی تھیں کہ اب انہیں مزید کیا کہنا ہے۔ ایسے بہت سے داؤ پیچ ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھے۔

"مجھے اس میں کچھ برا نہیں لگا بستامی...... دیکھو وہ صندل کی ساری زندگی کی ذمہ داری لے رہا ہے۔ کاغذات پر سائن کرنے کو بھی تیار ہے کہ صندل کو شاہانہ زندگی دے گا۔ لیکن نکاح کرنے کو تیار نہیں ہے۔"

"نکاح میں کیا برائی ہے؟"

"خاندانی لوگ ہیں۔ کہتا ہے کہ نکاح کیا تو باپ جان سے مار دے گا۔"

بستامی کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ پہلی بار شاید اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ صندل کا سودا کس چیز کا کرنے جا رہا ہے۔

''اگر کھلے دل سے سوچو تو اس کی بات میں کوئی برائی نہیں ہے۔ نکاح کیا ہے۔ کاغذ کا ایک پرزہ ہی تو ہے۔ جب وہ سب کچھ نکاح کے بنا ہی دینے پر راضی ہے تو پھر نکاح کی بات کر کے اسے ناراض کرنے کی کیا تک بنتی ہے۔''

''جی...... کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں...... لیکن......''

''تو بس پھر...... صندل کو رخصت کرنے والی بات کرتے ہیں اور تین کلو سونے کو خوش آمدید کہتے ہیں۔'' روشن بیگم چہکتے ہوئے بولی تھیں۔ ان کے لیے یہ سب مجرا دیکھتے ہوئے تالی بجانے جیسا یا داد دینے جیسا تھا۔

''لیکن چاند...... اس کا کیا کرنا ہے۔ وہ تو اپنی تسلی کیے بنا صندل کو کسی صورت رخصت نہیں کرے گی۔''

''ہاں...... یہ تو ہے۔ اس رخ پر تو میں نے سوچا ہی نہیں۔'' روشن بیگم گداز نشست پر پیچھے کو دراز ہوتے ہوئے بولی تھیں۔

''اسے بھنک بھی پڑ گئی کہ ہم اس کی بیٹی کے ساتھ کیا کرنے والے ہیں تو وہ پوری حویلی کو آگ لگا دے گی۔''

''فکر مت کرو بستامی...... میرے ہوتے ہوئے فکر مت کیا کرو تم......'' روشن بیگم نے تھوک دان میں سارا پان تھوک دیا تھا اور پھر پاس پڑے حقے کی نال کو اپنے منہ سے لگا لیا تھا۔ ان کی آنکھیں کسی نقطے پر مرکوز تھیں۔ ایک مخصوص جگہ کو دیکھتے ہوئے اور کہیں نہ دیکھتے ہوئے...... یہ انداز کچھ سوچنے والا تھا۔ مسئلے کا حل نکالنے والا...... اس لیے جب تک وہ خود نہیں بولیں...... بستامی خاموش رہا تھا۔

"کیا چاند نے کمال کو دیکھا ہے؟"

"نہیں...... نہ تو چاند نے کمال کو دیکھا ہے اور نہ ہی صندل نے...... بلکہ حویلی میں سے کسی نے بھی نہیں دیکھا ہوا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ سمجھو مسئلہ حل ہو گیا۔" انہوں نے حقے کی نال کو واپس اس کے بازو پر رکھ دیا تھا۔

"کیسے حل ہو گیا؟"

"ہم کسی اور گھرانے کا بندوبست کر لیتے ہیں۔ کسی امیر کبیر گھرانے کا...... چاند کو ان سے ملوا دیں گے۔ چاند رضامندی تو دے ہی چکی ہے۔ مزید کوئی اعتراض ہونے ہی نہیں دیں گے۔ ایسا انتظام کریں گے کہ چاند خود کہے گی کہ اسے اپنی بیٹی کی شادی یہاں ہی کرنی ہے۔ آنکھوں میں دھول ہی تو جھونکنی ہے۔"

"اور نکاح...... اس کا کیا کریں گے؟"

"نکاح بھی ہو جائے گا۔ مردوں والے حصے میں تو تم اور رحبانی ہی ہو گے۔ مولوی بھی ہمارا اپنا ہو گا۔ صرف دکھاوا کریں گے کہ نکاح ہو رہا ہے۔ اور پھر صندل حویلی سے رخصت ہو کر کمال کے فارم ہاؤس میں پہنچ جائے گی۔ بولو کیسا......؟" اپنا خیال سنا کر وہ ستائش چاہتی تھیں۔

"یہاں تک تو سب ٹھیک ہے۔ بعد میں کیا کرنا ہے۔ چاند تو صندل سے ملنا چاہے گی۔"

"بعد میں تمہیں کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں بستامی...... کب تک ڈر ڈر کر زندگی گزارو گے تم...... کہہ دینا کہ معاشی حالات خراب تھے...... تمہیں مجبوری میں ایسا کرنا پڑا...... قرض سے نکلنے کے لیے کسی ایک کو قربانی دینا تھی۔ اور صندل کو کمال کے ساتھ کیا دکھ ہو گا جو چاند کو اعتراض ہو۔ کمال یقیناً صندل کو بہت خوش رکھے گا۔"

"وہ مجھے جان سے مار دے گی روشن بیگم......" بستامی نے کہا تھا اور روشن بیگم نے ایک قہقہہ لگایا تھا۔

"کیا...... جان سے مار دے گی۔ تم تو بہت ڈرپوک نکلے بستامی...... اپنی بہن سے ڈر رہے ہو۔ وہ کچھ بھی نہیں کر سکے گی۔ روئے گی...... بددعائیں دے گی۔ اس سے زیادہ وہ کیا کر سکتی ہے۔ صندل کو تو واپس لا نہیں سکتی...... تو تم بعد کی فکر مت کرو...... اگر اس سے ڈر گئے تو حویلی کی باقی کی لڑکیوں کے سودے کیسے ہوں گے؟"

"جی...... کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں۔"

"کچھ نہیں رکھا شرافت کی زندگی میں بستامی......" اس بار روشن بیگم نے کچھ بناوٹی انداز میں گہرا سانس بھرتے ہوئے کہا تھا۔ "کیا کر رہی ہیں گھریلو لڑکیاں...... بچے پیدا کرتی ہیں۔ گھر کے کام کرتی ہیں۔ شوہر کی مار کھاتی ہیں۔ ساس نندوں کے طعنے سنتی ہیں۔ نکاح کے بعد ملتا ہی کیا ہے ہمارے معاشرے کی لڑکیوں کو...... تمہاری حویلی کی لڑکیاں تو تمہاری شکر گزار ہوں گی۔ تمہاری وجہ سے انہیں شاہانہ زندگی ملے گی۔ ایسی زندگی جس کے باقی لڑکیاں بس خواب دیکھتی ہیں۔"

روشن بیگم نے بہت طریقے سے بستامی کی ذہن سازی کی تھی۔ بستامی نے تائید میں سر ہلایا تھا۔ وہ روشن بیگم کی بات سے مکمل اتفاق کر رہا تھا۔

"پھر میں کسی کشمیری گھرانے کا بندوبست کروں...... ؟ چاند سے ملوانے کے لیے......؟"

"جی کریں۔" بستامی نے آمادگی دے دی تھی۔

☆......☆......☆

بڑے کمرے میں سب موجود تھے۔ زویا، زوہیب، تانیہ اور زوہیب کی والدہ...... ناشتا کیا جا چکا تھا اور اب زویا کے علاوہ باقی سب کے ہاتھوں میں چائے کے کپ تھے۔ اور سب خوش گوار انداز میں بات چیت کر رہے تھے جب وہ آنکھوں میں رات بھر کا رت جگا لیے وہاں آیا تھا۔ پچھلی بہت سی راتوں کی طرح اسے کل کی رات بھی نیند نہیں آ سکی تھی۔ پہلے وہ صندل کے بارے میں سوچتا رہا تھا کہ اس کے

ساتھ جانے انجانے میں زیادتی ہوئی ہے۔ اور کل کی رات وہ اپنے بارے میں سوچتا رہا تھا کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ صندل کے ناجائز ہونے اور اس بات کے چھپائے جانے کو وہ اپنے ساتھ دھوکے سے جوڑ رہا تھا۔

''لو...... میر بھی اٹھ گیا ہے۔'' زویا نے سرسری انداز میں کہا تھا۔

''گڈ مارننگ......!'' اس نے جمائی روکتے ہوئے سب سے کہا تھا اور آگے کا منظر دیکھ کر میر کی آنکھوں میں حیرت اتری تھی۔ زویا بڑے سے سوٹ کیس میں اپنا سامان پیک کر رہی تھی۔

''آپ کہیں جا رہی ہیں آپی؟''

''صرف میں نہیں...... تم بھی......'' کپڑے سوٹ کیس میں رکھتے ہوئے زویا نے کہا تھا۔

''ک...... کہاں......؟''

''واپس...... اپنے شہر کراچی......'' اس کے نزدیک جیسے یہ کوئی بات ہی نہیں تھی۔ اور میر کو ایسے محسوس ہوا تھا جیسے کسی نے اس کی شہ رگ کاٹ دی ہو۔ اور اسے خود پر تعجب بھی ہوا تھا کہ اسے ایسا کیوں محسوس ہو رہا ہے۔ وہ کیوں اس شہر میں رہنا چاہتا تھا؟ کیا صندل کے لیے؟ جس سے وہ اب کوئی رشتہ نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

''لیکن...... اتنی جلدی......؟''

''جلدی کیا اور دیر کیا...... ایک نہ ایک دن تو واپس جانا ہی ہے بیٹا......'' زوہیب کی والدہ نے پیار سے کہا تھا۔

''جی...... لیکن آپی نے کہا تھا کہ نیکسٹ منتھ جائیں گے۔''

''ہاں...... زویا نے مجھ سے بھی یہ ہی کہا تھا۔ لیکن میں نے ہی اس سے کہا کہ اب گھر چلو...... ویسے بھی بچے کی پیدائش کے دن قریب آتے جا رہے ہیں۔''

''تمہیں کیا ہوا ہے میر...... تم کیوں اتنے حیران ہو گئے ہو؟'' زوہیب کو میر کے حیرت زدہ رویے پر کچھ حیرت ہوئی تھی۔ وہ مرد تھا۔ مرد کو تاڑ لینے میں اسے ایک سیکنڈ درکار تھا۔

''اسے کیا ہونا ہے۔ اس کا دل لگ گیا تھا یہاں پر...... کام تو کرنا نہیں پڑتا تھا اسے یہاں......'' زویا نے ہنستے ہوئے بات ٹالی تھی۔ اور پھر گھور کر میر کو دیکھا تھا۔ ''ہے ناں...... میر......؟'' اس کا چبھتا ہوا انداز اس بات کا اشارہ دے رہا تھا کہ تم بھی فوراً سے میری ہاں میں ہاں ملاؤ......

''جی......!'' اور میر بھلا کیا کہتا۔

''تم بھی کل تک اپنا سامان پیک کر لینا۔''

''جی...... میں آج ہی کر لوں گا۔'' وہ وہیں بیٹھ گیا تھا۔ اپنے چہرے کے تاثرات چھپانے کے لیے اس نے جلدی سے کوئی میگزین اٹھا کر اپنے چہرے کے آگے کر لیا تھا۔

''تانیہ...... میری ہونے والی بھابھی......! کیا تم میر کے لیے ناشتہ بنا دوگی؟'' زویا رسان سے بولی تھی۔

''جی...... کیوں نہیں بھابھی......!'' تانیہ اپنے بھائی اور ماں کے سامنے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے اٹھی تھی۔

''تم میر سے خود ہی پوچھ لو کہ وہ کیا ناشتا کرتا ہے۔ اب بھئی تمہیں بھی تو میر کی پسند ناپسند کا علم ہونا چاہیے نا......'' زویا کہہ کر خود ہی ہنسی تھی۔

''کیا ناشتہ کریں گے آپ؟'' میر کے سامنے ہوتے ہوئے اس نے انتہائی سرسری انداز میں پوچھنے کی کوشش کی تھی۔ ''کیا بناؤں آپ کے لیے......؟''

''دو سلائس اور ایک ہاف فرائی انڈا......'' میگزین چہرے سے نیچے کرتے ہوئے، تانیہ کو دیکھتے ہوئے اس نے تانیہ کو اپنی پسند کا ناشتا بتا دیا تھا کیونکہ اب زندگی بھر یہ کام تانیہ نے ہی اس کے لیے کرنا تھا۔

☆......☆......☆

وہ بیڈ پر اوندھی پڑی ہوئی تھی۔ ایسے جیسے اس کے جسم سے روح نکل گئی ہو۔ اور اسے مرے ہوئے زمانے بیت گئے ہوں۔ چاند اس کے لیے ناشتا لیے کمرے میں آئی تھی اور صندل کو اس طرح سے دیکھ کر اس کا دل ہول کر رہ گیا تھا۔ لمحے بھر کے لیے اسے صندل کے وجود میں اپنا عکس نظر آیا تھا۔ التمش کی موت کے بعد کمرے میں بند پڑا اس کا بے روح وجود...... یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ اس کی بیٹی کے ساتھ بھی ویسا ہی کیوں ہو رہا تھا جیسا اس کے ساتھ ہو چکا تھا۔ کیا حویلی کی تاریخ کو خود سے اتنی ہی محبت تھی کہ وہ بار بار خود کو دہرائے جا رہی تھی۔

''صندل......! اٹھ جاؤ بیٹا...... ناشتا کر لو......'' چاند نے پیار سے پکارا تھا۔ وہ سو ہی کہاں رہی تھی جو اٹھتی...... چاند کی پکار پر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی تھی۔

''صندل......!'' اس نے ناشتے والی تشتری ایک طرف رکھ کر اسے پھر پیار سے بلایا تھا۔

''مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''ایسے مت کرو صندل...... کیوں اپنی ماں کو اذیت دے رہی ہو۔''

''کیونکہ میں خود اذیت میں ہوں چاند امی......'' اس نے چاند کی طرف رخ کیا تھا۔ چاند کے دل کی کھال سکڑی تھی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ وہ بے آواز بے تحاشا رو چکی تھی۔

''آپ نے مجھے کیوں پالا......؟ کیوں میری پرورش کی...... مجھے کیوں حویلی کے اندر لے آئیں آپ...... مجھے دہلیز پر ہی پڑے رہنے دیتیں آپ...... کوئی جانور کھا جاتا مجھے...... میں اب تک زندہ تو نہ ہوتی...... آپ نے میری زندگی کا تماشا بنا دیا ہے چاند امی......''

''ایسے کیوں سوچتی ہو میری جان......''

''کیا فائدہ ہوا آپ کو ایک لاوارث بچی کو گود لینے کا۔ اس کی پرورش کرنے کا...... جب زمانہ اسے قبول کرنے کو ہی تیار نہیں تھا۔ لوگ اسے آج بھی ناجائز بچی کہہ کر پکارتے ہیں۔ گناہ کی پیداوار سمجھتے ہیں۔''

"لوگوں کی کیوں فکر کرتی ہو میری جان؟"

"نہیں کرتی تھی۔ عیدگاہ میں عورتیں مجھے ناجائز کہہ رہی تھیں میں نے تب بھی فکر نہیں کی......

میلے میں آدمی نے مجھے ناجائز کہہ کر چیزیں دینے سے منع کر دیا، میں نے تب بھی آپ سے کوئی شکایت نہیں کی، کچھ نہیں کہا۔ لیکن اب...... میر مجھے ایسا کہہ رہا ہے۔ جس سے میں نے اتنی زیادہ محبت کی تھی۔ وہ بھی سمجھتا ہے کہ مجھ سمیت میری محبت بھی ناجائز ہے۔"

وہ کہہ کر پھر سے رونے لگی تھی۔ چاند نے اسے سینے سے لگا لیا تھا۔ میر زاد کی بات بتا دینے کا خیال غلط ثابت ہوا تھا۔ صندل کا غم کم ہونے کے بجائے مزید بڑھ گیا تھا۔ چاند کو کچھ اور بہانہ بنا دینا چاہیے تھا۔ جو جواز میر زاد نے اسے دیا تھا وہ اسے صندل کو نہیں بتانا چاہیے تھا۔

"ہر انسان کا اپنا ایک ظرف ہوتا ہے صندل...... کسی کا چھوٹا، کسی کا بڑا...... کسی کا گہرا اور کسی کا چھید والا...... سب انسان ایک جیسے نہیں ہوتے۔"

"پھر اسے آپ جیسا ہونا چاہیے تھا۔"

"جب تم یہاں سے بہت دور چلی جاؤ گی تو اسے بھولنے میں آسانی ہوگی۔" چاند نے نوالہ بنا کر جیسے زبردستی صندل کے منہ میں ڈالا تھا۔

"میں نے اسی لیے اس رشتے کے لیے رضامندی دی ہے کہ تم یہاں سے بہت دور چلی جاؤ...... ایک دو دن میں وہ لوگ تمہیں دیکھنے آئیں گے۔ میں بہت جلد تمہاری شادی کر دوں گی۔ میر کے معاملے میں میں بے بس ہوں۔ وہ کوئی اور اعتراض کرتا تو میں ہر ممکن طریقے سے اس کا اعتراض دور کرنے کی کوشش کرتی...... لیکن اس نے تمہارے خون پر حرف اٹھایا ہے۔ اور مجھے یہ بات برداشت نہیں...... کوشش کر کے اسے بھول جاؤ...... اسے بھول جاؤ......"

وہ صندل کی ویسے ہی منت کرنے لگی تھی جیسے کبھی دین بابا نے چاند کی کی تھی۔ التمش کو بھول کر

رحبان سے شادی کرنے کی درخواست کی تھی۔ تب چاند نے ان کی بات مان لی تھی۔ اب اسے امید تھی کہ صندل بھی اس کی بات مان لے گی۔ وہ اسے یہاں سے دور بھیج دینا چاہتی تھی۔ بہت دور...... جہاں کسی کو پتا نہ ہو کہ صندل اس کی سگی بیٹی نہیں ہے۔"

☆......☆......☆

"تم تو پاگل ہو صندل...... محبت میں کوئی اتنی جلدی ہار مانتا ہے کیا......؟" سب کزنز کو جب پتا چلا تھا کہ پچھلے کافی دنوں سے حویلی اور صندل کی زندگی میں کیا معاملہ چل رہا ہے تو سب نے ہی اس کی عقل پر ماتم کیا تھا۔ خاص کر تعبیر نے......

"تعبیر ٹھیک کہہ رہی ہے۔ تم نے تو فوراً سے ہار مان لی ہے۔" روشانے نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

"تو میں کیا کروں؟" اسے واقعی کچھ سمجھ میں تو نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے...... کیسے میرزاد کو منائے۔

"پاس جاؤ اس کے...... بات کرو اس کے ساتھ......"

"کیا بات کروں میں......؟"

"پاگل لڑکی...... تم نے سنا نہیں کہ عورت کے آنسو تو مرد کو پگھلا کر رکھ دیتے ہیں۔ تو جاؤ اس کے پاس...... اس کی بے وفائی پر آنسو بہاؤ...... اسے جذباتی بلیک میل کرو......" زارا اس ٹینشن بھرے ماحول میں بھی پنجیری کھاتے ہوئے بولی تھی۔

"وہ تب بھی نہ مانا تو......؟"

"ارے...... مانے گا کیسے نہیں...... تم اسے منانے والی تو بنو...... بالکل ویسی صندل بن جاؤ جو کسی سے ہار نہیں مانتی...... جو ہر کام کر کے رہتی ہے۔" سارا نے اسے بڑھاوا دیا تھا۔

شاید ساری کزنز یہ بھولی ہوئی تھیں کہ یہ کوئی کھیل نہیں تھا جس میں ہمت سے کام لیتے ہوئے صندل

نے ہر صورت جیتنا تھا۔ یہ تو زندگی کا جوا تھا۔ اس میں قسمت ہی تیراتی ہے اور قسمت ہی ڈباتی ہے۔

''یاد کرو...... بہاری بیگم کے مہندی کے پتے تم کیسے چرا لائی تھیں۔ جان جوکھم میں ڈال کر......
یہ تو پھر تمہاری محبت کا سوال ہے۔ اتنی جلدی ہار مت مانو تم......'' تعبیر نے اسے یاد دلایا تھا۔ ''تم اس کے پاس جاؤ...... بات کرو اس سے...... کچھ رو کر دکھاؤ...... کچھ محبت کا واسطہ دو...... کچھ بے چارگی دکھاؤ اپنے آپ کو کہ جو کچھ میری پیدائش کے حوالے سے ہوا، اس میں میرا کیا قصور ہے۔ دیکھنا، وہ مان جائے گا۔''

''اور اگر وہ نہ مانا تو......؟''

''جنگ میں جانے سے پہلے تھوڑی نا ہار مان لیتے ہیں۔ تم جا کر اس سے بات تو کرو......'' کرن جو زیادہ تر صندل سے حسد کرتی رہتی تھی، اسے آج صندل سے ٹوٹ کر ہمدردی ہو رہی تھی۔

سارا اس کے کمرے سے جا کر اس کے کپڑے لے آئی تھی۔ تعبیر نے اسے اچھے سے تیار کر دیا تھا۔ روشانے نے اس کی پیاری سی فرنچ چوٹی کر دی تھی۔

''دیکھو خود کو میری جان...... کتنی پیاری لگ رہی ہو تم...... تمہیں تو کوئی لڑکا انکار کر ہی نہیں سکتا ہے۔'' زارا اس کے صدقے واری جا رہی تھی۔ صندل پھیکا سا مسکرا دی تھی۔

''جاؤ...... اور فتح کر کے آؤ میر کو......'' کزنز نے اسے حویلی سے باہر تک چھوڑا تھا۔ وہ خاموشی سے اور دبے قدموں سے میر کے گھر کا فاصلہ طے کرنے لگی تھی کہ زمین کو احساس تک نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کے اوپر کوئی چل رہا ہے۔ وہ لفظوں کی جوڑ توڑ کر رہی تھی کہ وہ میر سے ملے گی تو کیا کہے گی۔ کیا واسطہ دے گی اسے...... اور وہ تو اتنا بھی نہیں جانتی تھی کہ محبت میں واسطے دیے جاتے ہیں کیا......؟ یہ تو بھیک نہیں ہو گئی؟ جو بھی تھا...... بھیک ہی سہی...... اسے ایک بار یہ جوا کھیلنا تھا۔ تا کہ زندگی بھر اسے کوئی شکوہ نہ رہ جائے کہ منت سے ہی سہی...... وہ اپنی محبت کو حاصل کر لیتی۔

میر زاد کے گھر کے باہر کچھ چہل پہل سی تھی۔ گیٹ کے ساتھ دو گاڑیاں کھڑی تھیں اور ملازم گھر کے

اندر سے سامان لا کر اس میں رکھ رہا تھا۔ نجانے کیوں صندل کو اپنا سانس اکھڑتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ کیا گھر والے کہیں جا رہے تھے۔ سارے منظر کو سمجھنے کے لیے وہ ایک درخت کے پیچھے چھپ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

اندر گھر میں سے سب سے پہلے زوہیب اور اس کی والدہ باہر نکلے تھے اور گاڑی میں بیٹھ گئے تھے۔ پھر چند لمحوں کے بعد تانیہ اور زویا باتیں کرتے ہوئے نکلی تھیں اور گاڑی میں بیٹھ گئی تھیں۔ اور آخر میں میرزاد نکلا تھا۔ تب ہی صندل درخت کے پیچھے سے نکل کر سامنے ہوئی تھی۔ گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے میرزاد کی نظر صندل پر پڑی تھی۔ وہ رک گیا تھا۔ اور صندل...... وہ خود تو رکی ہی ہوئی تھی، اس کے ساتھ اس کا سانس اور اس کے دل کی دھڑکن بھی رکی ہوئی تھی۔

میر کی آنکھوں میں دکھ جھلکا تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں دکھ کیوں تھا؟ وہ تو دکھ دینے والا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تو فخر ہونا چاہیے تھا۔ مردانگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے ایک لڑکی کی زندگی برباد کر دی تھی۔ صندل کے رکے ہوئے آنسو مزید ضبط نہیں کر سکے تھے اور بہہ نکلے تھے۔ میر اسے دیکھتا جا رہا تھا۔

''چلو میر...... رک کیوں گئے ہو؟'' زویا نے اس سے کہا تھا اور پتھر ہوا میر میکانکی انداز میں کار میں بیٹھ گیا تھا۔

دونوں گاڑیاں اسٹارٹ ہوئی تھیں اور آگے کو بڑھنے لگی تھیں۔ سڑک کے کناروں کی دھول اٹھی تھی اور آسمان میں چڑھنے کے بجائے صندل کی آنکھوں میں اترتی چلی گئی تھیں۔ وہ دھول جانتی تھی کہ اس کی گرد کو صندل کے آنسو ہی بٹھا سکتے ہیں۔

☆......☆......☆

روشن بیگم، بستامی اور رحبانی کے توسط سے ایک ایسی فیملی کو تیار کر لیا گیا تھا جو کشمیر سے تھی۔ اور وہ بستامی اور روشن بیگم کے سارے ڈرامے میں شرکت کرنے اور منہ بند رکھنے کے لیے آمادہ ہو گئی تھی۔ ہر ہر چیز کو پلان کر لیا گیا تھا۔ اس سب میں سب سے زیادہ خوش رحبانی تھا۔ سالوں کے بعد وہ بالآخر چاند

کے ساتھ وہی سب کچھ کرنے جا رہا تھا جو کبھی چاند نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ اس کے دل کو دکھایا تھا۔ اسے کرب میں مبتلا کیا تھا۔ اب رحبانی اسے آگ میں جھونک کر تڑپتا دیکھ کر خوش ہونے والا تھا۔

کشمیری گھرانہ ڈھیر سامان کے ساتھ صندل کو دیکھنے آیا تھا اور طے شدہ پلان کے مطابق اسی وقت صندل کے ہاتھ پر سونے کا سکہ رکھ دیا گیا تھا۔ اگلے ہفتے چاندامی نے کشمیر جانا تھا ان کا گھر بار دیکھنے۔

کشمیر میں ایک بہت بڑے گھر کو کرائے پر لیا گیا تھا۔ وہاں چاندامی کو لے جایا گیا تھا۔ چاند لڑکے سے ملی تھی۔ جو کہ بہت شریف اور عاجز لڑکا تھا۔ گھر بار بہت بڑا تھا۔ زمین تھی، نوکر چاکر تھے۔ چاند کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ کوئی بھی ماں اپنی بیٹی کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا چاہے گی۔ پھر بستامی نے بتایا تھا کہ یہ لڑکا صندل کو چاہتا ہے۔ اس پر مرمٹا ہے۔ جس پر چاند کی تسلی تھی کہ وہ زندگی بھر صندل کا خیال رکھے گا۔ وہ بھی لڑکے کے ہاتھ پر چاندی کا سکہ رکھ آئی تھی۔

شادی کی تاریخ پندرہ دن بعد کی رکھ دی گئی تھی۔

☆......☆......☆

سردی جوبن پر جانے کے بعد اب نیچے کی طرف آ رہی تھی۔ موسم پہاڑ کی چڑھائی کے دوسری طرف سے اترنے لگا تھا۔ دن میں اجلی دھوپ نکل آئی تھی۔ راتیں اگرچہ ٹھنڈی تھیں اور ان کا ابھی مزید ٹھنڈا رہنے کا ارادہ تھا۔

حویلی میں صندل کی شادی کی تیاریاں ہونے لگی تھیں۔ بہت جلدی ہو گیا تھا سب...... کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ پندرہ دنوں کے بعد صندل کی شادی ہے اور وہ یہاں سے بہت دُور کشمیر جانے والی ہے۔ جہاں سے پھر اس کی واپسی چھ ماہ، سال کے بعد ہی ہوا کرے گی۔ پھپھو وغیرہ حیران تھیں کہ چاند نے صندل کی شادی اتنی دُور کرنے کا فیصلہ کیوں کر لیا ہے۔ لیکن چاند انہیں کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دے پائی تھی۔ وہ ویسے بھی ان دنوں صندل کا جہیز جوڑنے میں مصروف تھی۔

صندل کا جہیز ویسے ہی تیار کروایا تھا جیسے دین بابا نے چاند کے لیے تیار کروایا تھا۔ نجانے کہاں کہاں سے کیا کیا کچھ منگوایا جا رہا تھا اور بنایا جا رہا تھا۔ کتنا بہت سا سامان تو چاند کا بھی ویسے کا ویسا ہی پڑا ہوا تھا۔ بہت سے گہنے، زیورات مہنگے لباس...... وہ سب کچھ صندل کو دے دینا چاہتی تھی۔ اس کے علاوہ بھی کتنا کچھ خرید لیا گیا تھا۔ چند دنوں میں ہی درگا مورتی کے ساتھ والا بڑا کمرہ صندل کے جہیز سے پوری طرح بھر گیا تھا۔

بستامی نے انہیں ایسا کرنے سے منع کیا تھا۔

"اس سب کا تردد مت کرو چاند...... ! لڑکے والوں کو کچھ نہیں چاہیے۔ انہوں نے خود سے کہا تو ہے، تم مل تو چکی ہو ان سے، دیکھ تو چکی ہو کہ کتنے عاجز پسند لوگ ہیں وہ۔"

"سب لڑکے والے ایسا ہی کہتے ہیں، لیکن دینا پڑتا ہے۔"

چاند کے کہنے پر بستامی خاموش ہو گیا تھا۔ حیران وہ الگ تھا کہ چاند کے پاس اتنی دولت کہاں سے آ رہی ہے جس سے وہ صندل کا ایسا شاندار جہیز تیار کروا رہی ہے۔ اور اگر یہ سب چاند کی بچت تھی تو وہ کیوں اس سے اب تک غافل رہا۔ اس نے اپنی غفلت پر خود کو لعنت ملامت کی تھی۔

اور روشن بیگم نے اسے ایک الگ ہی راہ دکھائی تھی۔

"تم بھی عجیب ہو بستامی...... ! کرنے دو چاند کو جو کرنا چاہتی ہے وہ...... بلکہ اس پر زور ڈالو کہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ جہیز تیار کروائے۔ بعد میں ہم سب چیزوں کو بیچ دیں گے۔ چار پیسے ہی ہاتھ آئیں گے ناں......" روشن بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

ایک کمینی سی مسکراہٹ بستامی کے چہرے پر بھی نمایاں ہوئی تھی۔ وہ اس رخ پر کیوں نہیں سوچ پاتا جس پر روشن بیگم پہنچ جاتی ہیں۔ اس کے بعد اس نے چاند کو کچھ بھی کرنے سے منع نہیں کیا تھا بلکہ جو زیور چاند نے صندل کو بعد میں دینے کے لیے محفوظ کر لیے تھے وہ بھی سمجھا بجھا کر جہیز میں ہی شامل کروا لیے تھے۔

رحبانی ان دنوں بہت خوش تھا۔ سالوں سے ادھار اس کا بدلہ اب پورا ہونے جا رہا تھا۔ اسے امید نہیں تھی کہ قدرت اس کی اس شاندار طریقے سے مدد کرے گی کہ وہ قدرت کا شکر ہی ادا کرتا رہ جائے گا۔ جب چاند کو پتا چلے گا کہ اس کی بیٹی کے ساتھ کیا ہو چکا ہے، شادی کے نام پر وہ کسی کی رکھیل بن چکی ہے تو وہ دیواروں میں اپنا سر دے مارے گی۔ اپنے بال نوچ لے گی۔ گریبان پھاڑ، دیوانی ہو جائے گی۔ جیسے وہ پاگل آمنہ دیوانی ہوئی شہر شہر گھوما کرتی ہے، عین ممکن ہے کہ چاند بھی اسی کی تقلید کرے۔ پھر رحبانی روز رات میں سنکھ بجا کر سویا کرے گا۔ خوش نما آواز میں...... پوری دنیا کو بتائے گا کہ دیکھو...... جس عورت نے اس کی راتوں کی نیند حرام کر دی تھی اس نے اس پر زندگی ہی حرام کر دی ہے۔ چاند خدا سے موت کی دعا کیا کرے گی لیکن اسے موت نہیں آئے گی۔

حویلی کی باقی لڑکیاں بے دلی سے شادی کی تیاری کر رہی تھیں۔ صندل کا سسرال بہت امیر تھا، بہت ٹھیک ٹھاک لوگ تھے۔ اسے وہ گھرانہ مل رہا تھا جس کا لڑکیاں خواب دیکھتی ہیں۔ لیکن ان کی بے دلی کی یہ وجہ تھی کہ صندل کی شادی وہاں نہیں ہو سکی تھی جہاں وہ چاہتی تھی۔ بہتر ہوتا کہ صندل کے دولہے کے روپ میں میرزاد کو ہی دیکھتیں...... لیکن اب سنا تھا کہ یہ کشمیری لڑکا بھی بہت خوب صورت ہے۔

صندل ان دنوں اپنے کمرے میں بند تھی۔ اسے کچھ نہیں معلوم تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ کیوں ہو رہا ہے۔ اس نے خود کو قسمت کے سپرد کر دیا تھا۔ پہلے وہ سمجھی تھی کہ میرزاد نے اسے دھوکا دیا ہے۔ اب اسے ادراک ہو چکا تھا کہ میرزاد نے اسے ٹھکرا دیا تھا۔ اس کے ناجائز خون کو جواز بنا کر...... پھر بھی وہ اس کی منت کر سکتی تھی۔ لیکن...... وہ رکتا تو...... وہ تو چلا گیا تھا۔ یہ شہر چھوڑ کر...... نہیں شہر چھوڑ کر نہیں...... بلکہ صندل کو چھوڑ کر......

چاند کمرے میں آ کر شادی کے حوالے سے باتیں کیا کرتی تھی۔ حویلی میں ہوتی تیاریوں کے بارے میں اسے بتایا کرتی تھی۔ اور وہ غائب دماغی سے سب سن لیا کرتی تھی۔ اسے اس سے کوئی سروکار

نہیں تھا کہ اس کے جہیز کے لیے کیا کیا کچھ آ چکا ہے۔ کیا کیا مزید تیار ہو رہا ہے۔ کتنے گہنے۔ کتنے کپڑے تیار ہو چکے ہیں۔ وہ تو بس ایک بات سوچے جا رہی تھی کہ وہ ایک اجنبی مرد کے ساتھ ایک چھت تلے کیسے رہے گی۔ ایک کمرے میں بند...... راتیں کیسی عذاب والی ہوں گی اور وہ ان عذاب والی راتوں کا کتنی شدت سے انتظار کیا کرے گی۔ ان دنوں میں وہ یہ ہی سب سوچتے ہوئے نفسیاتی طور پر بیمار ہوتی جا رہی تھی۔ کچھ اور سمجھ میں نہ آیا تو وہ رحبانی کے کمرے میں گئی تھی۔

"رحبانی بابا......!"

صندل کی آواز پر رحبانی چونکا تھا۔ اپنے کمرے میں موجود وہ آنے والے وقت کو سوچتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

"ہاں...... بولو صندل......!"

"آپ نے کہا تھا کہ آپ مجھے انشیں سے ملوائیں گے۔"

"میں بھول گیا صندل...... مجھے معاف کر دو...... پھر تم بھی تو ذہنی طور پر ٹھیک نہیں تھیں۔ اس لڑکے میرزاد نے تمہیں توڑ کر رکھ دیا ہے۔"

رحبانی کی بات پر صندل چونکی تھی۔

"میں سب جانتا ہوں صندل......"

"آپ کو کس نے بتایا......؟"

"میں تمہیں اس کے ساتھ گھومتے ہوئے دیکھ چکا ہوں۔"

"پھر تو یہ بھی جانتے ہوں گے کہ اس نے مجھے ٹھکرا دیا ہے۔"

"کم ظرف کے دیئے غم پر زیادہ غم نہیں کیا کرتے۔ اب دیکھو۔ جہاں تمہاری شادی ہو رہی ہے وہ لڑکا سب جانتا ہے۔ بستامی نے اسے سب بتا دیا ہے اور اس نے بالکل بھی اعتراض نہیں کیا۔ اسے

کہتے ہیں خاندانی لوگ......"

صندل چپ رہی تھی۔ وہ کیا جواب دیتی......اس کا اپنے ہونے والے دولہے پر تبصرہ کرنے کا کوئی موڈ نہیں تھا۔

"تم اسے بھول جاؤ......اور شادی میں خوش ہونے کی کوشش کرو۔"

"کیا آپ افشیں کو میری شادی پر بلوا سکتے ہیں؟"

"ہاں......کیوں نہیں......" اس نے بہت جلدی سے جھوٹی رضامندی دے دی تھی۔

"کیا سچ میں......؟" اسے یقین نہیں ہوا تھا۔

"بالکل سچ......اس میں کیا ہے۔ تمہاری شادی ہے۔ میں خود جا کر اسے لے آؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ پھر میں بھی شادی میں خوش ہونے کی کوشش کروں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ تم جا کر آرام کرو......"

"شب بخیر......" صندل کہتے ہوئے وہاں سے چلی گئی تھی۔ رحمانی خلاؤں میں دیکھتے ہوئے مسکرانے لگا تھا۔ وہ مستقبل کو سوچتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

کل وعدے کے مطابق کمال کی طرف سے تین کلو سونا ملنے والا تھا۔ بستامی نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ دو دن کے بعد صندل اس کے فارم ہاؤس میں پہنچا دی جائے گی۔

پرسوں صندل کی بارات کا دن تھا اور اس بارات نے سیدھا کمال کے فارم ہاؤس پر ہی پہنچنا تھا۔ جہاں کمال اپنی ہوس کی آگ بجھانے کے لیے صندل کا انتظار کرنے دو دن پہلے سے ہی پہنچ چکا تھا۔

☆......☆......☆

بارات سے ایک دن پہلے تک اسے ابٹن لگایا جاتا رہا تھا۔ پھوپھیوں نے اسے ہنسانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ ایسے بت بنی رہی تھی کہ اگر ہنس دے گی تو ٹوٹ جائے گی۔ پھوپھیوں کو تشویش

ہوئی تھی۔لیکن چاند نے یہ کہہ کر سب کی تسلی کر دی تھی کہ یہ حویلیاں شہر کو چھوڑ کر اتنی دُور جانے کی وجہ سے افسردہ ہو چکی ہے۔جبکہ جہاندیدہ پھوپھیوں کو مطمئن کرنا خاصا مشکل کام تھا۔انہوں نے دنیا دیکھی ہوئی تھی۔کیا وہ نہیں جانتی تھیں کہ گھر کو چھوڑ کر جانے کا غم اور شادی کی خوشی میں کیا فرق ہوتا ہے۔

بارات کی صبح چاند نے اسے بہت سی نصیحتیں کی تھیں۔بالکل ویسی ہی جیسے دین بابا نے اسے کی تھیں۔

''اپنے شوہر کا خیال رکھنا...... تم اس کے نکاح میں ہو گی۔اس سے جسمانی اور ذہنی وفاداری تم پر فرض ہے، مجھے شکایت کا موقع مت دینا...... جتنی جلد ہو سکے میر کو بھول جانا۔'' چاند بولتی جا رہی تھی اور وہ سب ایسے سن رہی تھی جیسے بہری ہو چکی ہے اور دنیا کی کوئی آواز سننے کی تمنا نہ رکھتی ہو۔

دوپہر میں اسے نہلا کر تیار کرنے کے لیے کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔تعبیر اور روشانے نے مل کر اسے دلہن بنایا تھا۔سرخ جوڑا جو چاند نے گھر پر ہی تیار کروایا تھا اسے پہنا دیا گیا تھا۔جسے پہن کر وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔

''تھوڑا مسکراؤ میری جان...... سارے میک اپ اور لباس کا بیڑا غرق کر رہی ہیں تمہاری یہ اداس آنکھیں......''

تعبیر کے کہنے پر وہ مدھم سا مسکرائی تھی۔تب ہی نیچے سے بارات کے آجانے کا شور اٹھا تھا۔اور دونوں نیچے کی طرف بھاگی تھیں۔کمرا خالی ہو گیا تھا۔

صندل اٹھی تھی اور خود کو آئینے میں دیکھنے لگی تھی۔بہت سے میک اپ تلے اس کے آنسو بھی قید تھے۔

وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے ایک آنسو بھی بہایا تو وہ بہت زیادہ رونے لگے گی۔اس لیے اس نے اپنے آنسوؤں کو آنکھوں تلے جذب کر لیا تھا۔لیکن ذہن کو میر کا خیال آنے سے کیسے روکتی...... کاش وہ میر کی دلہن بنی ہوتی تو یوں مسکرانا تو نہ بھولتی۔یوں اداسی تو نہ اس کے چہرے پر سوار رہتی...... وہ خوش ہوتی...... اور چاہ کر بھی اپنی ہنسی بند نہ رکھ پاتی۔تب اسے آنسو ضبط کرنے کی حاجت نہ ہوتی۔

ابھی وہ یہ ہی سب سوچتے ہوئے آنکھوں کی نمی کو صاف کر رہی تھی جب کمرے کی کھڑکی جو سیب کے باغ میں کھلتی تھی کو باہر سے دھکا لگا کر اندر کی طرف کھولا گیا تھا۔ صندل نے چونک کر وہاں دیکھا تھا۔ دو ہاتھ سردل پر موجود تھے جن پر زور لگا کر وجود کو اوپر اٹھایا جا رہا تھا۔ پھر جب وہ سارا وجود اندر کی طرف لڑھک آیا تو صندل ہکا بکا رہ گئی۔

وہ میرزاد تھا۔

☆......☆......☆

تیسری فصل......باریشہ ضامن

سن: ۲۰۰۰ء

حویلیاں شہر میں ایک حویلی

حویلی کا صدر دروازہ اس قدر چوڑا اور اتنا اونچا تھا کہ دیکھ کر گمان ہوتا تھا جیسے وہ ہاتھیوں اور اونٹوں کی آمد و رفت کے لیے بنایا گیا ہو۔ آبنوس کی سیاہ موٹی لکڑی سے بنا وہ دروازہ کسی اکہری اینٹ سے بنی دیوار جتنا موٹا اور کسی پرانے سالم درخت جتنا وزنی تھا، جس پر اب دیمک اپنے نقش و نگار بنانے میں مصروف تھی۔ دروازے پر لگے پیتل کے وزنی کنڈے سے لکڑی پر پڑنے والی ضرب ''چھن'' کی سی گونج دیتی تھی۔ جیسے حویلی کے اندر بہت کچھ ٹوٹ گیا ہو۔ گہرا ایسا ہی مائل دروازہ جو کبھی خود میں ہی پوری ہیبت ہوا کرتا تھا اب برسات کی مینہ میں نم ہوئے کسی شہتیر کی طرح جھکا ہوا دکھتا تھا۔

دروازے کے کھلتے ہی سامنے وسیع صحن نظر آتا تھا جو کبھی سرخ رنجیت شاہی اینٹوں سے سجا رہا ہوگا لیکن اب اس کی اینٹیں ایسی دکھتی تھیں جیسے زلزلہ انہی بھیتر سے پیدا ہوتا ہوگا۔ سورج مکھی جیسا دکھتا صحن اب خود پر تھوڑا گائے ہوئے تھا۔ چلتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی کانٹا چبھ نہ جائے۔

حویلی کی باقی عمارت اگرچہ مضبوط تھی لیکن اپنی ویرانی پر نوحہ کناں تھی۔ دائیں بائیں اور سامنے،

تین اطراف عرصے سے خاموش اور گندے تھے۔ ان کے پیچھے موجود بہت سے کمرے بند تھے۔ ان کے دروازوں پر تالا نہیں لگا ہوا تھا۔ کمروں میں کچھ ایسا موجود نہیں تھا جس کے لیے وہاں تالا لگایا جاتا...... کتنا بہت سا سامان بک چکا تھا۔ بلکہ اب تو ضرورت کا سامان میں حویلی میں موجود نہیں تھا۔

دالان کی چھت کی محرابوں کی گہرائیوں سے زنجیر کے ساتھ جھولتیں، نیچے تک آتی قندیلیں مکڑی کے جالوں سے اٹی ہوئی تھیں۔ محرابوں سے ملے ہوئے ستون جو کبھی سفید ہوا کرتے تھے، اب میلے ہو کر سیاہ دکھنے لگے تھے۔

انہی ستونوں میں سے ایک کے ساتھ لگ کر بیٹھی بوڑھی چاند بی بی بڑے سے ہاون دستے میں کچھ کوٹنے میں مصروف تھی۔ خاموش حویلی میں لوہے کے ہاون میں دستے سے پڑنے والی ٹھک ٹھک کی آواز گونج رہی تھی۔ لیکن کچھ دبی ہوئی ٹھک ٹھک...... کیونکہ ہاون دستے میں برہم بوٹی تھی جسے بوڑھی پیس رہی تھی، اور برہم بوٹی جس کے ریشے بہت نکلتے ہیں۔ اسے ہاون دستے میں کوٹنا ہمیشہ ہی سے بوڑھی کو بہت مشکل لگا کرتا تھا۔ لیکن پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے یہ کام کرنا ضروری تھا۔ اسے دوائی بنانا تھی...... اور جلد بنانا تھی۔ برسات کا موسم آنے والا تھا۔ جب علاقے والوں کو اس دوائی کی ضرورت پڑنے والی تھی۔ اس لیے اسے پہلے سے ہی تیاری کر کے رکھنا تھی۔

اوپر کمرے میں بیڈ پر سوئی باریشہ نے اپنے کان پر تکیہ رکھ لیا تھا لیکن ٹھک ٹھک کی آواز جیسے مزید بڑھنے لگی تھی۔ ایسے جیسے نانو چاند اس کے سرہانے بیٹھے ہوئے ہاون دستے میں دوائی پیس رہی ہوں۔

''نانو...... سونے دیں مجھے......'' اس نے لیٹے لیٹے ہی چلا کر کہا تھا۔ جبکہ وہ جانتی تھی کہ کم سننے والی اس کی نانو تک اس کی آواز نہیں پہنچ پائی ہوگی۔ غصے سے وہ اٹھی تھی اور دالان میں آ کر اس نے نیچے صحن میں جھانکا تھا۔

''نانو...... کیا کر رہی ہیں آپ...... آپ کو پتا نہیں کہ میں سو رہی ہوں۔'' وہ چلائی تھی۔

''دوائی پیسنا بھی تو ضروری ہے بیٹا......''

''تو کسی اور وقت کرلیا کریں یہ کام......'' جبکہ وہ اس کام کے حوالے سے ہر وقت ہی اس پر بولتی رہتی تھی۔

''دھوپ تیز تھی تو سوچا کہ پیس لوں...... دھوپ میں اسے پیسنا کچھ آسان ہوتا ہے۔ ہاون دستہ گرم ہو جاتا ہے تو اچھے سے پستی ہے برہم بوٹی......''

''ہونہہ......!'' اس نے نخوت سے سر جھٹکا تھا اور پھر دھپ دھپ کرتی سیڑھیاں اترتی نیچے آ کر چاند کے سر پر کھڑی ہو گئی تھی۔

''یوں کیوں نہیں کہتیں کہ مجھے تنگ کرنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی ہیں آپ......''

''ایسا کیوں سوچتی ہو باریشہ...... میں تو تمہارا بہت خیال رکھتی ہوں میری جان......'' پیار سے بولتے ہوئے وہ کھڑی ہوئی تھی۔

''ہونہہ پیار...... پیار ہوتا تو اب تک میری بات مان چکی ہوتیں آپ...... ہزار بار کہہ چکی ہوں کہ یہ حویلی بیچ کر لاہور یا کراچی چلتے ہیں۔ لیکن آپ میری بات ہی نہیں مانتی ہیں۔''

''تمہیں میں بتا تو چکی ہوں کہ مجھے اس حویلی سے بہت پیار ہے۔ میں نہیں بیچ سکتی اسے......''

''اس کھنڈر سے پیار ہے آپ کو؟''

''یہ تمہارے لیے کھنڈر ہو گا، میرے لیے نہیں۔''

''اور میری زندگی کا کھنڈر......؟ وہ نظر آتا ہے آپ کو یا نہیں؟''

''تمہیں خوش کرنے کے لیے ہی تو اتنی محنت کر رہی ہوں۔ یہ دیکھو......'' اس نے اپنی ہتھیلیوں کے گڑھے اس کے سامنے کیے تھے جو مسلسل وزنی دستے کو ہاون میں مارنے سے پڑ چکے تھے۔

''تو مت کریں محنت...... کون کہہ رہا ہے اتنی محنت کرنے کو...... اس حویلی کے بہت اچھے دام مل

جائیں گے، لاہور جا کر ہم کوئی پیارا سا چھوٹا سا گھر دیکھ لیں گے۔ باقی پیسوں سے کچھ کام کر لیں گے۔ ہم تین جانوں کے لیے تو چھوٹا گھر بھی بہت ہے۔ اس حویلی کے لاتعداد کمرے تو ویسے بھی سالوں سے بند پڑے ہیں۔''

''تم جو بھی کہہ لو...... میں یہ حویلی نہیں بیچوں گی۔''

''پھر آپ بھی یاد رکھیے گا۔ جیسے ہی مجھے موقع ملا اس گھر سے بھاگ جاؤں گی۔'' اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا تھا۔ ''کیونکہ آپ میری سگی نانو نہیں ہیں جو مجھ پر اپنا حق جمائے۔'' دوٹوک کہتے ہوئے وہ واپس اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ بوڑھی چاند ایسے ستون کے ساتھ لگی تھی جیسے گرنے والی ہو۔ ستون اسے سہارا نہ دیتا تو شاید وہ واقعی ہی میں گر جاتی۔

☆......☆......☆

اس کے جنم کا ستارہ سرطان تھا۔ جس کی شبیہ ''کیکڑے'' سے دی جاتی تھی اور کیکڑے میں یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے گھر کے دو دروازے بناتا ہے۔ ایک پانی کی طرف اور ایک خشکی کی طرف...... اسے دونوں طرف جینے کی عادت ہوتی ہے۔ وہ خود کو ایک ماحول میں ڈھال کر ایک طرف کا پابند نہیں ہونا چاہتا۔ باریشہ میں بھی کیکڑے کی سی خصوصیات تھیں۔ وہ پابند نہیں ہونا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کے گھر کے بھی دو دروازے ہوں۔ ایک آسائشوں کی طرف کھلے اور ایک عاجزی کی طرف...... وہ یہ بات نہیں جانتی تھی کہ وہ دو مختلف چیزوں کو ملانا چاہتی ہے۔ جس کے پاس عاجزی ہو اسے آسائشوں کی طلب نہیں ہوتی...... اور جو آسائشوں میں گھرا ہوا ہو اسے عاجزی سے سروکار نہیں ہوتا......

لیکن اس کی عادت تھی وہ اپنی سوچ، اپنے خیالات کے ساتھ زیادہ بحث و تکرار نہیں کیا کرتی تھی۔ اپنی اندرونی آوازوں پر وہ بلا سوچے سمجھے لبیک کہہ دیا کرتی تھی۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ شروع سے ہی نانو چاند کے خلاف تھی۔ جیسے جیسے اس نے ہوش سنبھالا اس پر

زندگی کی تلخیوں کا ادراک ہوا تھا۔ اس کا فہم بڑھا تو اس نے جانا کہ وہ باقی لوگوں سے کم تر زندگی گزار رہی ہے۔ اسکول میں اس کی سہیلیاں اپنے اپنے گھروں کی باتیں کرتے ہوئے چہکتی تھیں۔ ان کے پاس بتانے کو بہت کچھ ہوتا تھا۔ بہنوں کی باتیں، بھائیوں کی شرارتیں، ابو کا غصہ، اماں کی ڈانٹ...... کزنوں کی شادیاں...... عید پر بڑوں سے عیدی ملنا...... تہواروں پر کپڑوں کا لین دین...... شادیوں پر کی جانے والی شرارتیں...... رقص، شور شرابا...... لیکن باریشہ کے پاس بتانے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کی زندگی میں بس ایک حویلی تھی اور ایک دوائیاں بنانے والی نانو...... آخر وہ ان کی کتنی باتیں کرتی...... نہ تو اس کی ماں تھی اور نہ ہی کوئی بہن بھائی...... وہ تو اپنے باپ کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتی تھی۔ عید، تہوار، شادی، بیاہ...... یہ سب کس بلا کا نام تھا، وہ نہیں جانتی تھی۔ اس کی سہیلیاں ایسی باتیں کرتیں تو اس کو لگتا کہ یہ کسی اور دنیا کی باتیں اسے بتائی جا رہی ہیں اور وہ خود کسی اور ہی دنیا میں رہتی ہے۔ جو سب سے الگ تھلگ ہے۔

پھر کالج میں جا کر اس کی زندگی میں جیسے بھونچال آ گیا۔ کالج کی زندگی اسکول کی زندگی سے بہت الگ تھی۔ وہاں سب سے پہلے جو چیز اس نے باقی لڑکیوں میں دیکھی وہ خود اعتمادی تھی۔ دولت کی خود اعتمادی، فیملی کی خود اعتمادی...... جو اس کے پاس نہیں تھی۔ وہ منتشر ہوتی چلی گئی تھی۔ لیکن ابھی اس کا سارا کرب اپنی ذات کے حوالے سے تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب وہ اپنی زندگی کی محرومیوں کا ذمہ دار نانو جان کو نہیں سمجھتی تھی۔ لیکن پھر ایک دن اسے بستامی بابا کے بارے میں پتا چلا......

اس کی ایک دوست نے بتایا تھا کہ اس کی نانو کا ایک بھائی بھی ہے جو اب اسلام آباد میں رہتے ہیں۔ کیا وہ ان کے بارے میں جانتی ہے۔ اور وہ ان کے گھر کیوں نہیں جاتی؟

"نہیں...... میں تو ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہوں۔"

"وہ تو بہت ٹھیک ٹھاک لوگ ہیں...... بہت امیر......!" باریشہ کو سن کر یقین نہیں آیا تھا۔ بھلا

کوئی امیر کبیر شخص نانو چاند کا رشتے دار کیسے ہو سکتا تھا۔ پھر بھی اس نے اپنی دوست سے کہہ دیا تھا کہ وہ ان کے بارے میں مزید معلومات لے کر اسے بتائے۔

دوست کا بھائی اسلام آباد کام کے سلسلے میں جاتا تھا۔ اس نے جو کچھ بتایا تھا وہ سن کر باریشہ کو یقین نہیں آیا تھا۔

''بھائی بتا رہے تھے کہ ان کا گھر تو کسی محل سے کم نہیں...... اتنے نوکر چاکر ہیں وہاں...... اتنی گاڑیاں ہیں۔ کتنا وسیع تو لان ہی ہے جو گھر کے باہر ہے۔ اندر کی حالت کا تم خود ہی اندازہ لگا لو۔ اور ہاں...... سوئمنگ پول بھی ہے۔''

''کیا سچ میں......؟'' وہ بھلا کیسے یقین کرتی۔ اس کے لیے یہ سب خواب کی باتیں تھیں۔ اس نے تو بستامی کا نام ہی اپنی دوست کے منہ سے سنا تھا۔

''ہاں بالکل سچ...... بھائی کیوں جھوٹ بولیں گے بھلا...... بتا رہے تھے کہ بہت امیر ہیں وہ لوگ...... سیاسی اثر ورسوخ بھی رکھتے ہیں اور بہت جلد اسلام آباد میں ان کی دس منزلہ بلڈنگ بھی بننے والی ہے، جس میں فلیٹ بنا کر سیل کیے جائیں گے۔''

دوست کی باتیں سنتے ہوئے باریشہ کی آنکھیں روشن ہوئی تھیں۔ وہ مستقبل کے خواب دیکھنے لگی تھی۔ نانو چاند کا بھائی ایک فلیٹ ان کو دینے میں کیا کمی محسوس کرے گا۔ پھر وہ لوگ وہاں رہیں گے اور ایک بہتر زندگی گزاریں گے۔

اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ بھاگ کر گھر واپس پہنچ جائے۔ پیریڈ ختم ہونے کے بعد اس نے دو پیریڈ چھوڑ دیئے تھے اور فوراً سے حویلی واپس پہنچی تھی۔

''آپ کا کوئی بھائی بھی ہے نانو......؟'' واپس آتے ہی وہ سیدھا ان کے پاس گئی تھی۔ چاند نوک دار چھری سے سخت صدف کی اوپری سخت پرت اتارنے میں مصروف تھی۔ باریشہ کے سوال پر

چھری کی نوک اس کے ہاتھ میں کھب گئی تھی جہاں سے فوراً سے قطرہ بھر خون نکل آیا تھا۔

''اف! یہ کیا ہو گیا۔'' چاند نے جلدی سے ہاتھ کو پانی کے نل کے نیچے کیا تھا۔ یہ پہلی بار تھا کہ باریشہ اس کی تکلیف کے حوالے سے فکرمند نہیں ہوئی تھی۔ ہاتھ دھو لینے کے بعد وہ پھر سے صدف اور چھری کے ساتھ مصروف ہو گئی تھیں۔ باریشہ کا سوال جیسے انہوں نے سنا ہی نہیں تھا۔ یا سن کر نظر انداز کر دیا تھا۔

باریشہ کو نانو کے اس رویے پر حیرت ہوئی تھی۔

''میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے نانو......''

''میرا کوئی بھائی نہیں ہے۔'' انہوں نے باریشہ کو دیکھتے ہوئے سخت انداز میں کہا تھا۔

''کیوں جھوٹ بول رہی ہیں آپ......میری تمام دوستیں جانتی ہیں آپ کے بھائی کے بارے میں......ان کے ماں باپ جانتے ہیں۔ بستامی نام ہے ان کا۔''

''تھا......اب نہیں ہے۔ میں نے اس سے سارے تعلق ختم کر لیے ہیں۔''

''اچھے لوگوں سے آپ نے تعلق کیوں ختم کر لیے ہیں؟''

''تم سے کس نے کہا کہ وہ اچھا ہے۔''

''اسلام آباد میں اتنا بڑا گھر ہے ان کا......اتنے نوکر چاکر ہیں۔ گاڑیاں ہیں۔ اور دس منزلہ بلڈنگ بھی بنوا رہے ہیں۔'' وہ بولتی چلی گئی تھی اور چاند حیرت سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

''تمہیں یہ سب کس نے بتایا؟''

''بس پتا چل گیا مجھے......'' وہ نظریں چراتے ہوئے بولی تھی۔

''جب کوئی تعلق ہی نہیں تو پھر مجھے ان باتوں سے کیا لینا دینا۔''

''تو تعلق پھر سے استوار کر لیں نا آپ......''

''کیوں......تم کیوں ایسا چاہتی ہو؟''

''اس طرح ہم اسلام آباد چلے جائیں گے۔ اس حویلی سے ہماری جان چھوٹ جائے گی۔'' یہ پہلی بار تھا کہ اس نے حویلی کے بارے میں اپنے برے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ چاند حیرت سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

''سب ترقی کر رہے ہیں نانو...... ہم کیوں پیچھے رہیں۔''

''ہم پیچھے نہیں ہیں۔ سب موجود ہے ہمارے گھر میں......''

''آخر آپ اپنے بھائی کے پاس کیوں نہیں جانا چاہتی ہیں۔ کیوں شاہانہ زندگی گزارنا نہیں چاہتی ہیں۔''

''میں اس زندگی سے خوش ہوں۔''

''لیکن میں نہیں ہوں۔'' اس نے غصے سے کہا تھا۔ اس کی آواز بلند تھی۔ ''آپ کی ان سے کوئی ناراضی ہے تو صلح کر لیں۔''

''یہ ناممکن ہے۔''

''ویسے تو آپ دین کی بہت باتیں کرتی ہیں۔ سب کو عاجزی سے رہنے کی تلقین کرتی پھرتی ہیں۔ یہاں آ کر سارا دین ختم ہو گیا آپ کا......'' باریشہ نے انہیں کھری کھری سنائی تھیں۔

چاند کے لیے باریشہ کا رویہ حیران کن نہیں تھا۔ وہ جوان ہو رہی تھی۔ ابھی طرح طرح کی سوچوں کا اس کے ذہن میں آنا لازمی تھا۔

''تمہیں ساری باتیں معلوم نہیں ہیں۔ اس لیے تم نہیں سمجھ سکو گی۔''

''میری خاطر آپ ویسے ہی کچھ نہیں کرنا چاہتی ہیں۔ مہان بنتے ہوئے اس پاگل آمنہ کو گھر پر رکھا ہوا ہے آپ نے...... جو خود کو میری سگی نانو کہتی ہے۔ جس نے نجانے کہاں منہ کالا کر کے میری ماں کو پیدا کیا تھا۔'' غصے سے لال پیلی ہوئی وہ خرافات بکنے پر آ گئی تھی۔

''باریشہ......!'' چاند چلائی تھی۔ ''تمیز سے بات کرو تم......''

''چلانے سے کچھ نہیں ہو گا۔ حقیقت چھپ نہیں جائے گی۔ سب جانتے ہیں کہ ان کا شوہر گہرے رنگ کا تھا۔ خود یہ بڑھیا بھی ایسی ہے۔ پھر میری سفید رنگت والی ماں کو کیسے پیدا کر لیا انہوں نے...... یقیناً کہیں جا کر منہ کالا کیا ہو گا۔ ایسے ہی شوہر نے نہیں چھوڑا...... ایسے ہی ساس نے گھر سے نہیں نکال دیا۔ سارا حویلیاں شہر کہتا ہے کہ اس عورت کا شادی سے پہلے کسی کے ساتھ چکر تھا۔ سب جھوٹ نہیں بولتے۔ ایسی باتوں میں کچھ نہ کچھ حقیقت ہوتی ہے۔'' باریشہ روانی میں بولتی جا رہی تھی اور چاند کی حالت ایسی تھی جیسے سانس آنا بند ہو گیا ہو۔

''آپ دونوں بوڑھی عورتیں جہنم میں رہنا چاہتی ہیں تو رہیں...... مجھے کیوں رکھا ہوا ہے۔'' ناگواری سے سر جھٹکتے ہوئے وہ وہاں سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔

چاند نے چولہے کی طرف دیکھا تھا۔ جہاں بڑے پتیلے میں پڑا پانی ابل ابل کر ہلکان ہو چکا تھا۔

☆......☆......☆

وہ دن اس کی زندگی کی بدتمیزی کا آغاز تھا۔ اس دن کے بعد وہ بدتمیزی سیکھتی چلی گئی تھی۔ چاند سے پیار سے بات کرنے کو اس نے گناہ سمجھ لیا تھا۔ وہ اس کے ہر ہر کام میں کیڑے نکالنے لگی تھی۔ وہ ان خواتین کے سامنے بھی اس کو کھری کھری سنا دیا کرتی تھی جو اس سے شام میں دوائی لینے آیا کرتی تھیں۔ اسے اس کے بنائے کھانے ناپسند آنے لگے تھے۔ اس کے لائے کپڑے اس کی ناک پر نہ چڑھتے تھی۔ وہ ہر ہر طریقے سے ان کو تنگ کرنے لگی تھی۔ اس نے پاگل آمنہ کو اپنے ہاتھ سے کھانا دینا بھی بند کر دیا تھا۔

''مجھے گناہ گاروں کی سیوا کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔'' اس نے دو ٹوک کہہ دیا تھا۔ چاند اس کی شکل دیکھتی رہ گئی تھی۔ آمنہ سے اس کا بیر چاند سے بھی بڑھ کر تھا۔ وہ انہیں بیٹھا دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتی رہتی تھی۔ پہلے آمنہ کے کپڑے وہ دھو دیا کرتی تھی، اور اب انہیں گندے کپڑوں سے الگ کر دیا کرتی تھی۔

''یہ کام آپ خود کریں یا اس بوڑھی کو کہیں کہ خود کر لے۔''

"مجھ سے کپڑے نہیں دھلیں گے اب باریشہ...... میں تھک جاتی ہوں۔ کچھ رحم کرو مجھ پر......"

"اور میں اتنے گندے کپڑے نہیں دھو سکتی ہوں۔ ہر وقت تو رال بہتی رہتی ہے ان کی......"

چاروناچار چاند کو آمنہ کے کام خود ہی کرنا پڑتے تھے۔

"میرے کالج میں مینا بازار ہے۔ مجھے خریداری کے لیے کچھ پیسے چاہئیں۔" ایک دن کالج سے واپس آکر اس نے کہا تھا۔ مزید لڑائی سے بچنے کے لیے چاند نے اپنی سونے کی بالیاں بیچ کر اس کو پیسے دے دیئے تھے۔ جس سے اس نے اپنی من پسند خریداری کی تھی۔

آج کل وہ دن رات یہ ہی سوچتی رہتی تھی کہ آگے کیسے بڑھا جائے۔ کیسے ترقی کی جائے۔ لائف اسٹائل کو کیسے بہتر کیا جائے۔ یا کم از کم اتنا شاہانہ کہ کالج کی باقی لڑکیاں اسے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا کریں۔ تب ہی اس کے ذہن میں ایک نیا خیال آیا تھا۔

"آپ اس حویلی کو نہیں بیچنا چاہتی ناں...... تو پھر ٹھیک ہے۔ ہم یہ حویلی کسی کو ٹھیکے پر دے دیتے ہیں۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

وہ اس حویلی کو ریسٹورنٹ یا ہوٹل میں بدل دیں گے۔ حویلیاں شہر میں سیاحت بڑھنے لگی ہے۔ ہمیں آسانی سے کوئی اچھا ٹھیکیدار مل جائے گا۔ ہم بھی یہاں ہی رہیں گے۔ ہمارے لیے تو دو کمرے بھی بہت ہیں۔"

"نہیں...... یہ مجھے مناسب نہیں لگ رہا۔"

"اب اس میں کیا خرابی ہے۔" وہ چڑ کر بولی تھی۔

"میں اس حویلی کو کسی اور کو کیسے سونپ سکتی ہوں۔"

"میں نام لگانے کو نہیں کہہ رہی ہوں۔ بس ٹھیکے پر دینے کو کہہ رہی ہوں۔"

"کچھ کمی بیشی ہوگئی تو کون ہے ہمارے ساتھ...... جو ہمارے لیے کھڑا ہوگا۔ بہت پیچیدہ ہوتے ہیں یہ مسئلے...... میں ایسا ہرگز نہیں کروں گی۔" چاند نے واضح الفاظ میں انکار کردیا تھا۔

اور یہ وہ دن تھا جب باریشہ کو باقاعدہ طور پر چاند سے نفرت ہو چکی تھی۔ اس کا دل کرنے لگا تھا کہ وہ کوئی زہریلی جڑی بوٹی چاند کو کھلا کر ہمیشہ کے لیے ان سے جان چھڑوا لے۔

آنے والے دنوں میں وہ رفتہ رفتہ اپنی زندگی سے مایوس ہونے لگی تھی۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ ساری زندگی اسی حویلی میں گزار دے گی۔ یہاں ہی مر جائے گی۔ کوئی تبدیلی نہیں ہو گی اس کی زندگی میں...... اور جب وہ مکمل طور پر مایوس ہو چکی تھی تب ہی سیاہ رات میں روشن ستارہ چمکا تھا۔ جس نے اس کی باقی زندگی کو روشن کر دیا تھا۔

بستامی بابا...... جو اس کی زندگی میں رہنما بن کر وارد ہوئے تھے۔



ناول **تاش گھر** ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **15** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 15

عرصے سے یہ حویلی صرف اور صرف ضروریات کے مطابق چل رہی تھی۔ یہاں خواہشوں کو دفن کیا جاتا تھا۔ چاہتوں کی یہاں کوئی قدر نہیں تھی۔ اونچی اڑان بھرنا گناہ تصور کیا جاتا تھا۔ ایسا باریشہ سوچتی تھی۔ کیونکہ جب سے اس نے آنکھ کھولی تھی اس نے یہاں پر زندگی کو رینگتے رینگتے، سسکتے سسکتے گزرتے ہوئے دیکھا تھا۔ بلکہ بعض اوقات تو ایسے حالات آجاتے تھے کہ زندگی مرتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ حویلی کے درو دیوار کی طرح یہاں پر موجود لوگوں کی سانسیں بھی جامد ہو چکی تھیں۔ سب چلتے پھرتے مردے تھے جن کا نہ تو حساب کتاب ہوتا تھا اور نہ ہی وہ دفن ہوتے تھے۔

تب حویلی میں صرف ایک عورت زندہ تھی جو باریشہ کو ماضی کی باتیں سنایا کرتی تھی۔ حاجی بوا......!

حاجی بوا باریشہ کو جو بتایا کرتی تھیں اسے اس پر یقین نہیں ہوتا تھا۔ ان کی باتیں پریوں کی کہانیوں کے جیسے تھیں۔ وہ بتاتی تھیں کہ حویلی میں کیسے ماضی میں پیسوں کی ریل پیل ہوا کرتی تھی۔ کتنے نوکر چاکر ہوا کرتے تھے حویلی میں...... سو تو مزدور کام کیا کرتے تھے حویلی میں زردوزی کا...... سارے کمروں میں لکڑی کے چوکھٹوں پر "آر" چلا کرتی تھی۔ اور اس "آر" کی آواز پوری حویلی میں گونجا کرتی تھی۔ ان ملازموں کا اتنا بہت سا کھانا بنا کرتا تھا۔ حویلی کے دو تین کچن تھے جو ہر وقت مختلف چیزوں سے بھرے رہتے تھے۔ خشک میوہ جات، پھل، خشک اناج...... یہ سب اس قدر ہوا کرتا تھا کہ اس کا کوئی حساب کتاب ہی نہیں رکھا جاتا تھا۔ حویلی کی لڑکیاں سردیوں کی چیزیں الگ سے بنایا کرتی تھیں اور

گرمیوں کی الگ سے...... جو کہ منوں کے حساب سے بنا کرتی تھیں۔ پنجیری، پنیاں، مرونڈا سردیوں کے لیے...... کیسر کا شربت، توت کا مربعہ، آم کا اچار گرمیوں کے لیے......

وضع داری تو ایسی تھی کہ جو مہمان حویلی میں آتا تھا، وہ اس حویلی کی مہمان نوازی کی تعریف کرتا نہیں تھکتا تھا۔ تمام مہمانوں کو پیتل کے برتنوں میں کھانا دیا جاتا تھا۔ بڑے چھوٹے میں فرق نہیں رکھا جاتا تھا۔ امیر غریب میں کوئی امتیاز نہیں تھا۔ حویلی کے دروازے تک آنے والے فقیر اور ڈاکیے کو بھی گوند اور کیسر کا شربت پیے بنا جانے نہیں دیا جاتا تھا۔

باریشہ یہ باتیں سنتی تھی اور حویلی کے اس دور کا تصور کیا کرتی تھی جب یہ سب ہوتا ہوگا۔ جو باتیں حاجی بوا اسے سنایا کرتی تھیں، وہ اس کے لیے بہت رنگین تھیں۔ حویلی کے سیاہ ہوتے در و دیوار میں صرف حاجی بوا کی باتیں ہی اسے دل کش لگا کرتی تھیں۔ لیکن پھر وہ جب بڑی ہوئی تو اسے محسوس ہوا کہ اس کے ساتھ جھوٹ بولا جاتا رہا ہے۔ اسے لگا کہ حاجی بوا ایک مکار خاتون ہیں۔ جنہوں نے اس کے بچپن کو رنگین بنانے کے لیے ایسے من گھڑت قصے گھڑ لیے ہیں جبکہ حویلی کی حالت دیکھ کر حاجی بوا کی کسی بات پر یقین کرنے کو دل نہیں کیا کرتا تھا۔

"کیا آپ یہ سب مجھے کہانیاں سنا رہی ہیں حاجی بوا......"

"نہیں...... کہانیاں تو نہیں...... تمہیں ایسا کیوں لگا باریشہ......؟ یہ سب ہوتا رہا ہے حویلی میں......"

"لیکن حویلی کی حالت دیکھ کر لگتا تو نہیں کہ ایسا کبھی رہا ہوگا۔"

"ایسا ہی تھا جیسا میں تمہیں بتا رہی ہوں۔"

"پھر...... کیا ہوا کہ سب ختم ہو گیا؟"

اور اس سوال پر حاجی بوا خاموش ہو جایا کرتی تھیں۔ جس سے باریشہ کی سوچ کو تقویت ملا کرتی تھی کہ یہ جھوٹی عورت بچپن سے اس کے ساتھ جھوٹ بولتی آ رہی ہیں اور کتنی چالاکی سے بولتی آ رہی ہیں۔

حاجی بوا بے بس تھیں۔ وہ بے چاری بتا نہ سکتی تھیں کہ کیا ہوا کہ سوکھا پھیل گیا۔ سرسبز زمین پر کلر چھا گیا۔ حویلی کی تجوریاں کیسے خالی ہوئیں۔ کیا بتاتیں کہ حویلی کے اپنے ہی بلوائی بن گئے جنہوں نے حویلی کی عزت کو پامال کر دیا۔ تار تار کر دیا۔ ملازم ایک ایک کر کے کیسے حویلی چھوڑ گئے۔ اور صرف ملازم ہی تو نہیں...... گھر کے افراد بھی...... تہمینہ، شکیلہ، زہرہ...... تینوں چلی گئیں۔ اور ان کی بیٹیاں......؟ ہائے، حاجی بوا کی تو جان ہوا کرتی تھی ان میں...... کیسی جوان تھیں سب، خوب صورت اتنی کہ دیکھ کر نظریں نہ بھریں۔ نجانے اب کہاں ہوں گی وہ سب...... شاید کہیں زندہ ہوں یا مر گئی ہوں۔ ان کے بارے میں تو خدا جانتا تھا یا بستامی...... جس نے باری باری سب کو بیچ دیا تھا۔

حاجی بوا بتاتے ہوئے اکثر رو پڑتی تھیں جس پر باریشہ کو ان کے ایک یا دو فیصد سچا ہونے کا گمان ہوتا تھا لیکن اس کی تشویش کبھی ختم نہیں ہو سکی تھی۔ اسے حویلی کی بہت سی چیزوں کو لے کر تشویش تھی۔ اس بدحالی کی...... اگر اتنی ہی خوش حالی کبھی تھی جتنی حاجی بوا بتا رہی تھیں تو پھر اتنی بدحالی کیسے آ گئی۔ اتنی خوش حالی کے بعد تو بدحالی کو آنے میں بھی وقت لگتا ہے۔ وہ سونے سے بھری ہوئی تجوریاں کون خالی کر کے لے گیا؟ وہ ملازم کیا ہوئے......؟ وہ ریل پیل...... وہ کچن میں انواع اقسام کی چیزوں کا موجود ہونا...... کیا بنا سب کے ساتھ؟ یہ ایسے سوال تھے جن کا جواب حاجی بوا کے پاس نہیں تھا۔ اس لیے وہ اسے ہر بار ٹال دیا کرتی تھیں۔ اور وہ بات تو بالکل ہی ٹال دیا کرتی تھیں جب وہ چاند نانو کے گنجے سر کے بارے میں پوچھا کرتی تھی۔

''کیا چاند نانو شروع سے ہی گنجی ہیں؟''

''نہیں...... چاند کے بال تو بہت گھنے ہوا کرتے تھے۔ گھنے، سیاہ اور لمبے...... بہت پیارے لگا کرتے تھے اس پر......''

''پھر...... کہاں گئے وہ گھنے بال......؟''

''چاند نے بال کٹوا دیے۔''

''کیوں......؟''

''بس......ویسے ہی......''

''کون سی عورت اپنے بال کٹواتی ہے وہ بھی سر کی جلد تک......اور پھر ہر ماہ کاٹتی ہے۔''

''مجھے نہیں معلوم......اور تم بھی چاند سے مت پوچھنا......'' حاجی بوا نے اسے تاکید کی تھی۔

اس نے کبھی چاند نانو سے اس بارے میں نہیں پوچھا تھا اور نہ ہی اپنی ماں کے بارے میں......

اسے بس اتنا ہی معلوم تھا کہ اس کی ماں بہت خوب صورت عورت تھی اور اس کو جنم دینے کے بعد فوت ہو چکی تھی۔ اور اس کا باپ......اس کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں پتا تھا۔ اور نہ ہی کوئی کچھ بتاتا تھا۔ کاش وہ اپنے باپ اور اس کے خاندان کے بارے میں کچھ جانتی ہوتی تو اسی کے پاس واپس چلی جاتی......

یہاں رہتے ہوئے اسے آہستہ آہستہ یقین ہو چکا تھا کہ گھر کے تمام افراد سٹھیا چکے ہیں۔ وہ تین بوڑھیوں میں پرورش پا رہی تھی۔ چاند نانو، آمنہ نانو اور حاجی بوا......اگر وہ اسکول کالج نہ جایا کرتی تو وہ بھی ان کی ہی طرح کی ایک بوڑھی بی بی ہوتی......جوان جسم والی بوڑھی روح والی لڑکی......لیکن کالج جا کر ہی تو اسے پتا چلا تھا کہ زندگی کیا ہوتی ہے۔ حویلی کی چار دیواری کے باہر زندگی کتنی حسین ہے اور وہ کیسے دقیانوسی سے ماحول میں رہ رہی ہے۔

گھر کی ساری معیشت چاند سے جڑی ہوئی تھی۔ وہ حکمت کا کام کرتی تھی، دوائیاں بناتی تھی۔ جس میں حاجی بوا بھی ان کا ساتھ دیا کرتی تھیں۔ حاجی بوا اونچے نیچے پہاڑوں پر نکل جایا کرتی تھیں۔ جڑی بوٹیاں اکٹھی کرتی تھیں۔ کبھی کبھی باریشہ بھی ان کے ساتھ جایا کرتی تھی۔ پھر ان جڑی بوٹیوں سے چاند دوائیاں بنایا کرتی تھیں۔ جڑی بوٹیوں کو صاف کیا جاتا تھا، کوٹا جاتا تھا، پیسا جاتا تھا، ابالا جاتا تھا، سکھایا جاتا تھا۔ بہت لمبے عمل اور محنت کے بعد یہ کام مکمل ہوتا تھا۔ نانو آمنہ کوئی کام نہیں کرتی تھیں۔ وہ

بس حویلی میں کسی ایک جگہ پر بیٹھی رہتی تھیں اور وہیں بیٹھے بیٹھے سارا دن گزار دیا کرتی تھیں۔

صحن میں ایک چٹائی ہر وقت بچھی رہتی تھی جس پر کچھ نہ کچھ سوکھتا رہتا تھا۔ کوئی جڑی بوٹی یا جڑی بوٹیوں سے بنی ہوئیں چھوٹی بڑی گولیاں...... ویسے تو دائیں بائیں کی عورتیں جب دل کرے حویلی میں آ جایا کرتی تھیں، لیکن شام کے وقت زیادہ رش لگا کرتا تھا۔ عورتیں اپنے مسئلے بیان کیا کرتی تھیں اور چاند نانو سے دوائی لیا کرتی تھیں۔ یہ کام سردیوں کی دھوپ جیسا تھا۔ اس میں تشنگی ہی تشنگی تھی۔ اس کام سے کبھی اتنی کمائی نہیں ہو سکی تھی کہ وہ اسیری کے دن دیکھ لیتی۔

پھر حاجی بوا کا انتقال ہو گیا اور حویلی میں بس وہ تینوں رہ گئیں۔

حاجی بوا کا کام باریشہ کے ذمے آ گیا۔ چونکہ وہ حاجی بوا کے ساتھ جایا کرتی تھی اس لیے اسے جڑی بوٹیوں کی پہچان تھی۔ اب وہ ہفتے دو ہفتے بعد جڑی بوٹیوں کو توڑ لایا کرتی تھی۔ اس کے لیے شاید زندگی اسی طرح گزرتی رہتی...... لیکن جوان ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے اندر کا انتشار بڑھنے لگا تھا۔ خواہشیں جنم لینے لگی تھیں اور چونکہ ہر خواہش پیسے سے جڑی تھی اور پیسہ اس حویلی میں کم تھا تو اسی لیے اس کے انتشار نے اس کے اندر بدمزاجی کو جنم دیا۔ اسے خود نہ پتا چلا تھا کہ وہ کب بدتمیزی سے اپنی روح اور ذہنیت کو بھی بدمزاج بنا چکی ہے۔

لیکن پھر بستامی بابا نے اس کی ساری زندگی کو بدل کر رکھ دیا تھا۔

☆......☆......☆

وہ اس دن دیر تک سوتی رہی تھی۔ کالج سے چھٹی تھی۔ اس لیے اس کا جلدی اٹھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لیکن پھر اسے اٹھنا پڑا...... اس نے اپنی حویلی کے باہر گاڑیوں کے رکنے کی آواز سنی تھی۔ پھر کسی نے ان کی حویلی کے دروازے پر دستک دی تھی۔ وہ جلدی سے کمرے سے نکل کر باہر دالان میں آئی تھی۔ اس نے نیچے جھانک کر دیکھا تھا۔ چاند نانو ایک آدمی کو اندر لا رہی تھیں۔ ڈھلتی عمر کا وہ آدمی اس

قدر رعب والا تھا کہ باریشہ اسے دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ اس آدمی نے سفید لباس پہنا ہوا تھا۔ گلے میں سونے کی موٹی چین تھی اور کلائی میں چمچماتی ہوئی گھڑی......

چاندنا نو اسے لے کر اندر کمرے میں چلی گئی تھیں اور کمرے کا دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔

باریشہ جلدی سے نیچے اتری تھی۔ اس کی چھٹی حس نے اسے الارم دیا تھا کہ ضرور حویلی میں کچھ اہم ہونے والا ہے جس کے بارے میں اسے ضرور معلوم ہونا چاہیے۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ یہ آدمی کون ہے۔ اتنے امیر کبیر آدمی کا ان سے کیا تعلق ہو سکتا ہے کہ چاندنا نو اسے لے کر کمرے میں چلی گئی ہیں۔ اس نے تو اپنی زندگی میں یہاں کسی مرد کو آتے نہ دیکھا تھا۔

کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اس نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی تھی لیکن اسے کچھ زیادہ سمجھ میں نہ آیا تھا۔ بہت نرم انداز میں گفتگو ہو رہی تھی۔ وہ حویلی سے باہر نکلی تھی۔ باہر دو گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ ایک تو اس آدمی کی تھی جو اندر موجود تھا اور ایک جیپ تھی جس کے اندر دو گارڈز بیٹھے ہوئے تھے۔

''اللہ...... یہ کون ہے جو اپنے ساتھ گارڈز لیے گھومتا ہے۔'' وہ دل ہی دل میں اندر بیٹھے شخص پر رشک کر رہی تھی۔

''یہ...... کون صاحب ہیں جو اندر گئے ہیں؟'' اس نے حویلی کے دروازے پر کھڑے گارڈ سے پوچھا تھا۔

''سر بستامی......'' گارڈ نے اسے بتایا تھا اور باریشہ کے چودہ طبق روشن ہوئے تھے۔

''بستامی آئے ہیں۔ نانو کے بھائی......؟''

''مجھے رشتے کا نہیں معلوم...... لیکن وہ کچھ ضروری بات کرنے آئے ہیں۔''

''کیا بات......؟''

''اس کا مجھے علم نہیں......''

"میں جانتی ہوں۔" اس نے جیسے خود سے کہا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ چاند نانو کے بھائی ان سے صلح کرنے کے لیے آ گئے ہیں۔ وہ بہت خوش ہو گئی تھی۔ اب وہ جلد ہی اسلام آباد شفٹ ہو جائیں گے۔ سوئمنگ پول والے گھر میں...... خوشی خوشی وہ اندر آئی تھی اور کچن میں کھڑے ہو کر بستامی بابا کے باہر جانے کا انتظار کرنے لگی تھی۔

بستامی بابا تھوڑی دیر میں وہاں سے چلے گئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد وہ چاند نانو کے سر ہوئی تھی۔

"تو نانو...... کیا صلح ہو گئی آپ کی، آپ کے بھائی سے......؟" اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا تھا۔

چاند نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

"تم سے کس نے کہا کہ وہ صلح کرنے آیا تھا؟"

"تو کس لیے آئے تھے؟"

"ہمیں باغ والا راستہ بند کرنا ہو گا۔"

"کیوں؟ اس حویلی میں ایک ہی تو تفریح ہے باغ میں چلے جانے کی...... اب وہ راستہ کیوں بند ہونے جا رہا ہے۔"

"باغ بستامی کا ہے۔ اور وہ اپنا باغ کسی کو بیچ رہا ہے۔ اس لیے اب ہمیں باغ کا راستہ بند کرنا ہو گا۔ دو تین دن میں یہ کام ہو جائے گا۔" چاند کہتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی اور باریشہ پر مایوسی کے بادل چھا گئے تھے۔

"اللہ! کتنی پاگل ہوں میں...... دو منٹ میں میں نے کیا کیا سوچ لیا تھا۔" وہ سخت مایوس ہوئی تھی۔ سوئمنگ پول والا گھر تو دور، وہ تو اب اپنی حویلی کے ساتھ والے باغ سے بھی محروم ہونے والی تھی۔ اس دن اس نے نماز پڑھی اور خدا سے دعا کی تھی کہ چاند نانو کی اپنے بھائی سے صلح ہو جائے۔

لیکن دعا کے ساتھ ہی اسے ادراک تھا کہ ایسا ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ چاند کسی سے ناراض نہیں ہوتی تھیں۔ اب اگر وہ اپنے بھائی سے ناراض تھیں تو یقیناً وہ اس ناراضی کو ساری زندگی چلانے والی تھیں۔

"کیا وہ دوبارہ آئیں گے؟" رات میں سونے سے پہلے اس نے چاند سے پوچھا تھا۔

"کون......؟"

"آپ کے بھائی......!"

"دو تین دن کے بعد آئے گا۔ دروازہ بند ہوگا۔ اور باقی کے معاملات بھی طے پائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ سو جائیں اب...... مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔"

اور باقی کی رات میں سونے کے بجائے وہ جاگتی رہی تھی۔ وہ سوچتی رہی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔

☆......☆......☆

تین دن کے بعد ایک بار پھر سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ منظر پہلے والا ہی تھا۔ دو گاڑیاں ان کی حویلی کے باہر آ کر رکی تھیں۔ بارعب سے بستامی بابا کو چاند نانو اندر کمرے میں لے گئی تھیں۔ اور مزدور باغ کی طرف کھلنے والا دروازہ اینٹوں سے بند کرنے لگے تھے۔

باریشہ نے وہی کیا تھا جو وہ پچھلے دو دنوں میں سوچ چکی تھی۔

کچن سے کین کی ٹوکری پکڑ کر وہ چپکے سے حویلی سے باہر نکلی تھی۔ حویلی کے دائیں بائیں دو راستے جاتے تھے۔ ایک راستہ بنسواڑی جنگل کو جاتا تھا اور دوسرا شہر کی طرف...... وہ جانتی تھی کہ بستامی بابا کا بنسواڑی علاقے میں کیا کام...... اس لیے وہ شہر والے راستے پر گئی تھی۔ کافی آگے جانے کے بعد وہ ایک ڈھلوان کی آڑ میں ہو کر کھڑی ہوگئی تھی۔ اپنی ٹوکری کو اس نے فالتو جڑی بوٹیوں سے جلدی سے بھر لیا تھا۔ اور چھپ کر کھڑی وہاں سے بستامی کی کار کے گزرنے کا انتظار کرنے لگی تھی۔

کوئی گھنٹہ بھر انتظار کے بعد اسے دور سے سڑک نما پگڈنڈی پر دھول اٹھتی محسوس ہوئی تھی۔

مطلب بستامی بابا کی گاڑی نزدیک آرہی تھی اور جب وہ کافی نزدیک آگئی تو باریشہ ٹوکری پکڑے اوپر سڑک پر آئی تھی اور سڑک کے عین درمیان پہنچ کر آہ بھرتے ہوئے گر جانے والے انداز میں بیٹھ گئی تھی۔ نیچے گر کر وہ جلدی سے اپنا پاؤں پکڑ کر ہائے ہائے کرنے لگی تھی۔

بستامی کی کار رکی تھی۔ اندر سے ڈرائیور نکل کر باہر آیا تھا۔

''کیا ہوا ہے لڑکی......؟''

''میں گر گئی ہوں۔ پاؤں میں موچ آگئی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ سائیڈ پر ہو جاؤ ذرا...... میرے مالک نے جلدی جانا ہے۔''

''بھیا! ایک کام کرو...... مجھے میرے گھر تک چھوڑ دو۔'' اس نے منت بھرے انداز میں کہا تھا۔

ڈرائیور نے اچنبھے سے اسے دیکھا تھا۔

''زیادہ دور نہیں ہے۔ یہ پیچھے ہی ہے۔ اپنے مالک سے پوچھ لو...... مجھ سے تو ایک قدم نہیں چلا جائے گا۔''

باریشہ کے منت بھرے انداز پر ڈرائیور اپنے مالک کے پاس گیا تھا۔ بستامی کے پاس......اور پھر وہاں سے ہدایت لے کر اس تک آیا تھا۔

''اٹھو...... تمہیں تمہارے گھر تک چھوڑ دیتے ہیں۔''

''کیا سچ میں......؟''

''ہاں......اٹھنے کی کوشش کرو۔''

''مجھے سہارا دو۔''

اور ڈرائیور کا سہارا لے کر وہ ایسے بناوٹی انداز میں چلنے لگی تھی جیسے واقعی ہی میں موچ آگئی ہو۔ کار تک پہنچ کر اس سے پہلے کہ ڈرائیور آگے والی خالی سیٹ کا دروازہ کھولتا، اس نے جلدی سے پیچھے والی

سیٹ کا دروازہ کھول لیا تھا۔ جہاں بستامی بیٹھا ہوا تھا۔ ڈرائیور نے بستامی بابا کو دیکھا تھا۔

"کوئی بات نہیں......!" بستامی بابا نے ڈرائیور سے کہا تھا۔ "بیٹھ جاؤ لڑکی...... یہاں ہی بیٹھ جاؤ۔"

"شکریہ......!" وہ بستامی بابا کے ساتھ اندر بیٹھ گئی تھی۔ اور بستامی کو قریب سے دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔ ان کی شخصیت تو قریب سے اور بھی زیادہ سحر انگیز تھی۔ لیکن ان کی شخصیت میں ایک منفی اثر بھی موجود تھا۔ باریشہ نے بہت بار ہندو مذہب میں راون کا سنا ہوا تھا۔ اور بستامی کو دیکھ کر اسے وہی راون کی یاد آئی تھی۔ بستامی بابا کی شخصیت میں سب جھلکتا تھا۔ رعب، دولت، عقل، شعور، نفاست...... اور اس کے ساتھ ساتھ غرور بھی، گھمنڈ بھی......

"کہاں جانا ہے تمہیں......؟"

"یہ...... تھوڑا سا پیچھے ہی گھر ہے میرا......"

"ڈرائیور! گاڑی پیچھے لو......"

"جی بہتر......!" گاڑی ریورس ہو کر واپس دین حویلی کی طرف جانے لگی تھی۔

"یہ ٹوکری میں کیا ہے؟" بستامی کی نظر اس کی ٹوکری پر گئی تھی۔

"جڑی بوٹیاں ہیں۔ اپنی نانو کے لیے توڑنے گئی تھی۔"

"تم...... دین حویلی سے ہو؟" بستامی نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"جی......! دین حویلی...... چاند میری نانو ہیں۔"

"تم صندل کی بیٹی ہو؟" اب کے بستامی مزید حیران ہوا تھا۔ اس نے اوپر سے نیچے تک باریشہ کو دیکھا تھا۔

"جی...... آپ جانتے ہیں میری ماں کو......؟"

"بہت اچھے سے......"

''لیکن میں انہیں نہیں جانتی ہوں۔ وہ میری پیدائش کے بعد فوت ہو چکی تھیں۔ میں تو اپنے کسی رشتے دار کو نہیں جانتی ہوں۔ سنا ہے کہ میری نانو کے ایک بھائی ہیں۔ میں تو کبھی ان سے بھی نہیں ملی ہوں۔'' وہ بناوٹی بھول پن سے بول رہی تھی۔ بستامی یک ٹک اسے دیکھتا جا رہا تھا۔

''سنا ہے کہ وہ بہت امیر لوگ ہیں۔ لیکن کیا فائدہ...... اگر وہ اپنی غریب بہن کی ہی کچھ مدد نہ کر سکتے تو......''

''تم ان کے بارے میں کیسے جانتی ہو؟''

''میری دوست کا بھائی اسلام آباد آتا جاتا ہے۔ اسی نے بتایا کہ ان کا بہت بڑا گھر ہے وہاں پر...... بہت امیر ہیں وہ لوگ...... نوکر چاکر بہت ہیں۔ بہت سی نئی نئی گاڑیاں ہیں۔ اور اسلام آباد میں ایک اونچی بلڈنگ بھی بنوا رہے ہیں۔''

''تمہاری نانو کا وہ بھائی میں ہوں۔'' بستامی نے انکشاف کیا تھا اور پہلے سے سب کچھ جانتی باریشہ کو اپنے چہرے پر حیرت لانے میں دقت ہوئی تھی۔

''کیا سچ میں......؟''

''ہاں...... میں ہی ہوں تمہاری نانو کا بھائی...... بستامی......''

''مجھے معاف کر دیں۔ میں آپ ہی کے سامنے آپ کی برائیاں کر رہی تھی۔''

''کوئی بات نہیں......''

''مجھے بہت اچھا لگا آپ سے مل کر...... اور تب اور بھی اچھا لگے گا اگر آپ اپنی بہن سے صلح کر لیں تو......''

''میں تو صلح کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن تمہاری نانو میری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی ہے۔''

''کیوں......؟''

''وہ سب میں تمہیں نہیں سمجھا سکتا ہوں۔''

''میں نانو چاند کو سمجھانے کی کوشش کروں گی۔''

''ڈرائیور! گاڑی روک دو......''بستامی نے ڈرائیور سے کہا تھا۔گاڑی رک گئی تھی۔

''حویلی کچھ فاصلے پر ہے۔تم یہاں ہی اتر جاؤ......تمہاری نانو کو پتا چل گیا کہ تم میرے ساتھ آئی ہو تو وہ تمہیں قتل کر دیں گی۔''

''اتنی نفرت کرتی ہیں وہ آپ سے......؟''

''بہت زیادہ......''

''ٹھیک ہے۔شکریہ آپ کا......''وہ کار سے اترنے لگی تھی۔پھر کچھ خیال آنے پر اس نے کہا تھا۔

''آپ کا کانٹیکٹ نمبر مل سکتا ہے کیا؟''

''کیوں نہیں......ڈرائیور! لڑکی کو کارڈ دو......''بستامی کے ڈرائیور نے اسے بستامی کا وزٹنگ کارڈ دیا تھا۔

''میرا نام باریشہ ہے۔''کارڈ پکڑتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

''تمہارا جب دل کرے تم مجھے فون کر سکتی ہو باریشہ......بلکہ ملنے بھی آ سکتی ہو۔''

''کیا سچ میں......؟''وہ بے حد خوش ہوئی تھی۔بستامی بابا کتنے اچھے تھے۔

''بالکل سچ......لیکن ایک بات یاد رکھنا......جب بھی مجھے ملنے آ ؤ گی پیچھے ساری کشتیاں جلا کر آنا......کیونکہ مجھ سے ملنے کے بعد تمہاری نانو ویسے بھی تمہیں جان سے مار دیں گی۔''

''ٹھیک ہے۔''کارڈ پکڑے وہ کار میں سے نیچے اتر آئی تھی۔

''چلو ڈرائیور......!''گاڑی واپس موڑی گئی تھی۔وہ دور تک جاتی بستامی بابا کی گاڑی کو دیکھتی رہی تھی۔

☆......☆......☆

کارڈ پکڑ کر وہ ایسے خوش ہوئی تھی جیسے اس کے ہاتھ کوئی خزانہ لگ گیا ہو۔ اسے ایسے لگنے لگا تھا کہ بس اب اس کی زندگی بدلنے والی ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہونے والا ہے۔ زندگی کو لے کر اس کے سارے شکوے ختم ہونے والے ہیں۔

''کہاں سے آ رہی ہو باریشہ......؟''

''میں جڑی بوٹیاں توڑنے گئی تھی۔''

''لیکن میں نے تو تم سے کچھ نہیں منگوایا تھا۔''

''میں عادتاً چلی گئی تھی۔'' اس نے توقف کیا تھا، پھر پوچھا تھا۔ ''آج آپ کے بھائی کیا کرنے آئے تھے؟''

''بتایا تو تھا کہ باغ والا راستہ بند کروانا تھا۔ وہ بند ہو چکا ہے، اب تم وہاں نہیں جا سکتی ہو۔''

''کوئی بات نہیں......اب وہاں جانے کی طلب بھی نہیں مجھے......'' ٹوکری چاندکو پکڑا کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اور چاند حیرت سے ٹوکری کو دیکھنے لگی تھی، جس میں گھاس پھونس اکٹھا تھا۔

کمرے میں آ کر کارڈ کو اس نے اپنی الماری میں چھپا دیا تھا۔ اور سوچنے لگی تھی کہ اب آگے اسے کیا کرنا ہے۔

آنے والے دن بہت پر جوش تھے۔ وہ ہر لمحہ مستقبل کے خواب دیکھ رہی تھی۔ بستامی بابا کا بڑا سا گھر، نوکر چاکر، گاڑیاں، پیسے کی ریل پیل...... یہ سب ہی تو اسے چاہیے تھا۔ جو اس کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ چاندنانو وہاں جانا نہیں چاہتی تھیں اور وہ حویلی میں رہنا نہیں چاہتی تھی۔ پھر بستامی بابا نے اسے کہا تھا کہ وہ جب بھی ان کے پاس آئے، ساری کشتیاں جلا کر آئے۔ بہت دن سوچتے رہنے کے بعد اس نے چاندنانو سے حتمی بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

''کیا اب بھی آپ اس حویلی کو بیچنے پر راضی نہیں ہیں؟''

''تمہارے ذہن میں بیٹھے بیٹھے کیا خیال آتے ہیں باریشہ......؟''

''نہیں......میں آپ سے آخری بار پوچھ رہی ہوں۔''

''نہیں......! ہرگز نہیں......میں اس حویلی کو کبھی نہیں بیچوں گی۔''

''ٹھیک ہے۔ اب جو مجھے کرنا ہوگا، میں کرلوں گی۔''

دھمکی دے کر وہ دھپ دھپ سیڑھیاں چڑھتی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ چاند نے اس کی دھمکی کی زیادہ پروانہیں کی تھی۔ وہ ہر لڑائی کے اختتام پر ایسی ہی بات کرتی تھی لیکن چاند نہیں جانتی تھی کہ اس بار باریشہ کے ہاتھ میں حکم کا اکا ہے۔ جو ساری کایا پلٹ کر رکھ دے گا۔

''نانو چاند......!

میں نے بہت کوشش کی کہ اس زندگی کے ساتھ سمجھوتا کرسکوں جو آپ میرے لیے ترتیب دیتی آ رہی ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوسکا۔ میں نے بہت بار آپ کو اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس میں بھی ناکام رہی......آپ چاہتی تھیں کہ میں آپ کی مرضی سے زندگی گزاروں، میری سانسوں پر بھی آپ کی حکمرانی ہو۔ میں ہر کام آپ کی اجازت سے کروں، لیکن ایسا ہونا ناممکن ہے۔ میرے اندر ایک جوان روح ہے۔ میں بوڑھی روح کے ساتھ سمجھوتا نہیں کرسکتی ہوں۔ اس لیے میں نے اپنی زندگی کا ایک فیصلہ لے لیا ہے۔ آپ کے ساتھ رہتے ہوئے میں کب سے اس موقع کی تلاش میں تھی اور خدا نے اب مجھے یہ موقع دے دیا ہے۔ اس لیے میں اس موقع کو ضائع نہیں ہونے دینا چاہتی ہوں۔ میں آپ کی حویلی چھوڑ کر جارہی ہوں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے......اور ساتھ آپ کو بھی چھوڑ رہی ہوں۔ آپ میری سگی نانو نہیں ہیں۔ لیکن میری پرورش پر جو آپ کا خرچا ہوا ہے وہ میں آپ کو جلد لوٹا دوں گی۔

میں کہاں جارہی ہوں، اس سے آپ کا کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ میں جہاں جارہی ہوں، وہاں بہت خوش رہوں گی۔ پلیز! مجھے ڈھونڈنے کی کوشش مت کیجیے گا۔

آپ کے مظالم سے تنگ......

باریشہ!''

چاند نے خط پڑھا تھا اور پھر اگلے ہی لمحے بے ہوش ہو کر بیڈ پر گر گئی تھی۔

☆......☆......☆

رات کی تاریکی میں وہ حویلیاں شہر سے نکلی تھی۔ اپنے چند کپڑوں اور کچھ نقد رقم کے ساتھ......
ارشادی بابا سے کہہ کر اس نے اپنے لیے ایک تانگے والے کا بندوبست کروالیا تھا۔ ارشادی بابا نے اس کی مدد کی تھی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اب یہ لڑکی رکنے والی نہیں...... پہلے تو انہوں نے اسے بہت سمجھایا تھا کہ وہ چاند اور آمنہ کو چھوڑ کر نہ جائے۔ لیکن جب باریشہ کا فیصلہ اٹل رہا تو انہوں نے خود اس کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ باغی لڑکی بغاوت کرتے وقت کسی مشکل کا شکار ہوتی اس سے بہتر تھا کہ وہ خیر خیریت سے اپنی منزل تک پہنچ جاتی......

تانگے والے نے اسے حویلیاں کے ریلوے اسٹیشن پر چھوڑ دیا تھا۔ وہاں سے وہ پنڈی تک ٹرین میں آئی تھی اور پھر اسلام آباد جانے کے لیے اس نے ایک ٹیکسی لے لی تھی۔ اس دوران بستامی بابا کا دیا ہوا کارڈ اس کے ہاتھ میں دبا رہا تھا۔ جو اس نے کسی قیمتی ہیرے کی طرح مٹھی میں دبایا ہوا تھا کہ وہ کہیں گم نہ ہو جائے۔ اس نے اس پر موجود پتا اور فون نمبر ازبر کر لیا تھا۔ حویلیاں شہر سے نکلنے اور اسلام آباد پہنچنے تک جو اس پر شرمندگی طاری تھی وہ رخصت ہو چکی تھی۔ ایک پچھتاوا تھا کہ وہ چاند کو اکیلا چھوڑ آئی ہے، وہ اسلام آباد کے ٹھنڈے میٹھے موسم میں گم ہو گیا تھا۔

''کیا آپ نے یہاں ہی اترنا ہے؟'' ٹیکسی ڈرائیور نے اس سے پوچھا تھا۔

''کارڈ پر لکھا ہوا پتا یہ ہی ہے؟''

''جی...... یہ ہے۔''

"ٹھیک ہے۔" وہ ٹیکسی سے نیچے اتری تھی۔ اس نے ٹیکسی والے کو پیسے ادا کیے تھے۔ اور پھر وہ اس گھر کو دیکھنے لگی تھی جس کے باہر وہ اتری تھی۔ گیٹ کے ساتھ والے ستون پر بستامی بابا کا نام لکھا ہوا تھا۔ گھر کی بیرونی دیوار کافی اونچی اور دور تک پھیلی ہوئی تھی جس سے گھر کی کل اراضی کا اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ بہت سی اقسام کے پودے لگے ہوئے تھے جن کی کانٹ چھانٹ ماہر ہاتھوں نے کی ہوئی تھی۔ باریشہ تو کتنی دیر باہر کی نفاست اور سجاوٹ کو ہی دیکھتی رہی تھی۔ پھر ہمت کرتے ہوئے اس نے گیٹ کے ساتھ نصب بیل کا بٹن دبا دیا تھا۔

"جی...... کس سے ملنا ہے آپ کو......؟" چھوٹا گیٹ کھول کر چوکیدار نے اس سے پوچھا تھا۔

"میں...... وہ مجھے بستامی بابا سے ملنا ہے۔"

"وہ تو اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔"

"گھر پر نہیں ہیں......؟" وہ پریشان ہوئی تھی۔ پھر جلد ہی اس نے ہمت سے کام لیا تھا۔ "میں...... بہت دور سے آئی ہوں۔ باریشہ نام ہے میرا...... میں دین حویلی سے آئی ہوں۔ چاندنا نو کی نواسی......"

"اچھا...... میں اندر جا کر بتا دیتا ہوں۔" چوکیدار کہہ کر اندر چلا گیا تھا۔ وہ باہر بے صبری سے اس کا انتظار کرنے لگی تھی۔ اگر بات نہ بنی تو وہ کہاں جائے گی۔ نجانے بستامی بابا کہاں چلے گئے ہیں۔ اسے اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا تھا کہ وہ بنا فون کیے کیوں چلی آئی تھی۔ اسے کم از کم ایک فون تو کر ہی دینا چاہیے تھا۔

لیکن اس کے خیالات کے برعکس تھوڑی دیر کے بعد ایک عورت باہر نکلی تھی۔

"باریشہ ہو تم......؟ صندل کی بیٹی......؟" عورت نے خوشگواریت سے پوچھا تھا۔ بات کرتے ہوئے اس کے جسم پر موجود سارے ہی زیور کھنکھنائے تھے۔

"جی......!"

"اندر آ جاؤ...... باہر کیوں کھڑی ہو۔"

عورت کی تقلید میں وہ اندر داخل ہوئی تھی۔ اور اندر آ کر تو وہ دنگ ہی رہ گئی تھی۔ ایک ایک قدم اسے اس گھر کے سحر میں مبتلا کرتا جا رہا تھا۔ وہ گھر تھا یا کسی بادشاہ کا محل...... وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ حویلی تو ان کی بھی بہت بڑی تھی لیکن اس گھر کی شان و شوکت، سجاوٹ کا تصور تو وہ خواب میں بھی نہیں کر سکتی تھی۔

"بیٹھو......!" خاتون اسے بڑے سے ڈرائنگ روم میں لے کر چلی آئی تھی۔ وہ کچھ جھجکتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔

"میرا نام کومل ہے۔ میں بستامی کی بیوی ہوں۔" کومل نے اپنا تعارف کروایا تھا۔ باریشہ مسکرائی تھی۔ وہ عورت جو بستامی بابا کی بیوی تھی اور یقیناً اسی کی ہم عمر ہوگی کسی صورت عمر رسیدہ نہیں لگ رہی تھی بلکہ وہ خود سے نہ بتاتی کہ وہ بستامی کی بیوی ہے تو باریشہ نے اسے بستامی بابا کی بیٹی سمجھ لینا تھا۔

"کیا لو گی باریشہ......؟ پلیز...... تکلف مت کرنا...... جو دل کر رہا ہے بتا دو۔"

"مجھے پانی کی طلب ہو رہی ہے۔"

"میں ابھی لاتی ہوں۔" کومل کہہ کر باہر چلی گئی تھی۔ پازیب پہنے، چھن چھن کرتے اس کے پاؤں کی چھنکار دور جاتی سنائی دی تھی۔ باریشہ ڈرائنگ روم کو دیکھنے لگی تھی جہاں کی ہر ہر چیز کم از کم پاکستان کی تو نہیں لگتی تھی۔ کسی نے بہت چاہت سے اس گھر کو سجایا تھا۔

کومل واپس لوٹی تو اس کے ہاتھ میں شربت تھا اور ساتھ ایک اور خاتون بھی تھی۔

"یہ ایمن ہے۔ رحبانی کی بیوی......!" اسے شربت پکڑاتے ہوئے کومل نے بتایا تھا۔

"کون رحبانی......؟" وہ کچھ نہیں سمجھی تھی۔

"تم رحبانی کو نہیں جانتیں......؟" ایمن نے پیار بھرے شکوے سے کہا تھا۔

"معذرت...... میں نہیں جانتی ہوں۔ مجھے تو بستامی بابا کا بھی اپنی دوست سے معلوم ہوا ہے۔"

"سمجھ سکتی ہوں...... ہائے تمہاری نانو کی ہم لوگوں سے نفرت...... جسے ہم تو کبھی سمجھ ہی نہ

سکے۔'' ایمن نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا تھا۔

''خیر اب تم آ گئی ہو تو آہستہ آہستہ سب سمجھ جاؤ گی۔''

دونوں خواتین اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئی تھیں۔ اور وہ چپ چاپ سہمی ہوئی شربت پیتی رہی تھی۔

''سفر کیسا گزرا تمہارا؟''

''بہت اچھا......!''

''کیا تم اپنی نانو کو بتا کر آئی ہو کہ تم یہاں آ رہی ہو؟''

''نہیں......!''

''اگر تم بتانا چاہو تو فون کر کے بتا سکتی ہو۔''

''نہیں...... میں نہیں چاہتی کہ انہیں علم ہو۔''

''ٹھیک ہے...... جیسے تمہاری مرضی...... آؤ تمہیں تمہارا کمرا دکھا دوں۔''

کومل نے اس سے کہا تھا۔ وہ اٹھی تھی اور پھر سے کومل کی تقلید میں گھر کے ایک حصے سے گزرتے ہوئے دوسرے میں جانے لگی تھی۔

''یہ ہے تمہارا کمرا......'' کومل نے ایک کمرے کا دروازہ کھول دیا تھا۔ اور باریشہ کی آنکھیں چندھیاتے چندھیاتے رہ گئی تھیں۔ وہ تو کسی شہزادی کا کمرا تھا۔ یا اس گھر کا سب سے عالیشان کمرا......

''بستامی اور رحبانی دونوں شہر سے باہر ہیں۔ دو تین روز میں آ جائیں گے، تب تک تم آرام سے ادھر رہو...... کچھ چاہیے ہو تو مجھے بتا دینا۔ جب کچھ کھانے کو دل کرے تو بلا جھجک ملازم سے کہہ دینا۔ ٹھیک ہے؟''

''جی...... ٹھیک ہے۔''

کومل نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ اور وہ کمرے کو دیکھتے ہوئے بیڈ پر بیٹھی تھی۔

''اللہ......! کتنے اچھے ہیں یہ لوگ...... چاندنا نو کیوں ان سب سے اتنی نفرت کرتی ہیں۔'' بیڈ

پر بیٹھی وہ ایسی ہی باتیں سوچتی جا رہی تھی جن کے سوال اسے آنے والے وقت میں ملنے والے تھے۔

☆......☆......☆

رات میں کھانے سے پہلے کومل نے اسے گھر کے کچھ مزید حصے دکھائے تھے جن سے وہ بے حد متاثر ہوئی تھی۔ اس پر کومل کا یہ جملہ کہ باقی حصے کل دیکھ لینا...... نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ یہ گھر آخر کتنا کو بڑا ہے۔

پھر وہ دونوں وسیع ڈرائنگ روم تک آئی تھیں۔ جہاں ایمن پہلے سے موجود دونوں کا انتظار کر رہی تھی۔ کھانا بس تین افراد نے کھایا تھا۔ کومل، ایمن اور وہ خود......

''آج کل سب ادھر ادھر ہیں۔ ورنہ یہاں بہت رش ہوتا ہے۔ یہ مت سمجھنا کہ بس تین لوگ ہوتے ہیں۔ یہاں تو اکثر کرسیاں کم پڑ جاتی ہیں۔'' ایمن نے ہنستے ہوئے بتایا تھا۔

''تم کھانے میں کیا پسند کرتی ہو باریشہ......؟''

''میں سب کچھ ہی کھا لیتی ہوں۔''

''پھر بھی بتا دینا...... کل تمہاری پسند کا کھانا بنوا لیں گے۔ تم سو رہی تھیں اس لیے تم سے آج پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔''

''جی شکریہ......!'' وہ دونوں کے پیار بھرے رویے پر فدا ہوئی جا رہی تھی۔

باقی کا کھانا خاموشی سے کھایا گیا تھا۔ کومل، ایمن آپس میں تو باتیں کرتی رہی تھیں لیکن باریشہ کی جھجک کی وجہ سے انہوں نے اسے مزید نہیں مخاطب کیا تھا۔

''تم کمرے میں جانا چاہتی ہو تو جا سکتی ہو۔'' کھانے کے بعد کومل نے اس سے کہا تھا۔

''میں کچھ دیر لان میں ٹہلنا چاہتی ہوں۔''

''جیسے تم چاہو میری جان......!''

کومل ایمن اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں اور وہ باہر لان میں نکل آئی تھی۔

اسلام آباد کی خنک راتوں میں لان کچھ زیادہ ہی خنک محسوس ہو رہا تھا کیونکہ وہ کافی وسیع تھا اور وہاں بہت سے پودے درخت تھے۔ ٹہلتے ہوئے وہ نا چاہتے ہوئے بھی چاند نانو کو سوچنے لگی تھی۔ گزرے ہوئے ایک ہی دن میں اسے اتنا سکون ملا تھا کہ وہ اپنی گزری ہوئی زندگی پر لعنت کرنے لگی تھی۔ کیا تھا وہاں حویلی میں...... سیاہ در و دیوار، ہر وقت ہاون دستے کی ٹھک ٹھک...... جو سر میں درد کر دیتی تھی۔ اور یہاں...... کتنا سکون تھا۔ معاشرے کے ساتھ چلتی ہوئی زندگی تھی۔ بلکہ اس سے بڑھ کر گزرتی ہوئی...... اب اسے یہاں ہی رہنا تھا۔ ہر صورت...... اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔

"کون......؟" اپنے پیچھے اسے ایک مردانہ آواز سنائی دی تھی تو وہ پیچھے پلٹی تھی۔ اور کچھ ڈر سی گئی تھی۔ پیچھے ایک نیلی آنکھوں والا معصوم سا لڑکا کھڑا تھا۔ وہ وہاں کسی مرد کی موجودگی کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

"کون ہو تم......؟"

"میں باریشہ ہوں......"

"کون باریشہ......؟"

"بستامی بابا کی رشتے دار ہوں۔"

"میں ان کے تمام رشتے داروں کو جانتا ہوں، تم کہاں سے ہو؟"

"میں دین حویلی سے ہوں۔"

"سمجھ گیا...... میں سانول ہوں۔ رحبانی کا بیٹا۔"

لڑکے نے اپنا تعارف کروایا تھا۔ باریشہ نے اسمائل پاس کی تھی۔ اس کے علاوہ وہ اور کیا کرتی۔ سانول اسے دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں بے حیائی نہیں تھی بلکہ بچوں جیسی معصومیت تھی۔ جیسے اس نے ساری زندگی ایک کمرے میں گزار دی ہو اور آج ہی باہر نکلا ہو۔

"تمہیں پہلے کبھی یہاں نہیں دیکھا۔"

"میں آج پہلی بار یہاں آئی ہوں۔"

"لیکن بستامی بابا اور میرے بابا تو دو تین دن شہر سے باہر ہی رہیں گے۔"

"میں اب یہاں ہی رہوں گی۔"

"گڈ......!" باریشہ کی بات پر سانول خوش ہوا تھا۔ پھر چند لمحے سوچ میں گم رہا تھا کہ مزید کیا بات کرے۔

"میرے ساتھ کیرم کھیلو گی باریشہ......؟" سانول نے اس سے پوچھا تھا۔ باریشہ نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ وہ بے تکلف نہیں ہو رہا تھا۔ یہ تو اس کے چہرے پر لکھا ہوا تھا۔ وہ تو بس جیسے کسی کے ساتھ اچھا وقت بتانا چاہتا تھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے آج پہلی بار اسے کوئی ہم عمر ٹکرایا ہو۔

"مجھے کیرم کھیلنا نہیں آتا......"

"میں سکھا دوں گا۔ آجاؤ......!" اسے لے کر وہ ایک بڑے سے کمرے میں آیا تھا۔

"یہ میرا پلے اسٹیشن ہے۔ یہاں میری ساری گیمز موجود ہیں۔" اس نے کہتے ہوئے کسی جگہ سے کیرم بورڈ نکال لیا تھا اور اسے زمین پر بچھا کر اس پر پاؤڈر ڈالنے لگا تھا۔ باریشہ کے لیے وہ سب نیا تھا۔

"یہ دیکھو...... گیم اسٹارٹ ہو گی ایسے......" اس نے ایک ہٹ ماری تھی اور ترتیب سے پڑی ہوئی ساری ہی گوٹیاں دائیں بائیں بکھر گئی تھیں۔

"اب تمہاری باری......"

باریشہ نے اس کی تقلید کرتے ہوئے ہٹ ماری تھی۔ سانول ہنسا تھا۔

"ناٹ بیڈ...... پہلی بار کے حساب سے ٹھیک ہے۔ بہت جلد سیکھ جاؤ گی۔" وہ پھر سے اپنی باری کھیلنے کے لیے بورڈ پر بکھری گوٹیوں کو دیکھنے لگا تھا۔

"سانول......! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" ایمن وہاں آئی تھی۔

"امی! میں اسے کیرم کھیلنا سکھا رہا ہوں۔"

''بہت رات ہو چکی ہے بیٹا...... سو جاؤ...... اسے بھی سونے دو۔ اس کے لیے ابھی اس گھر کا ماحول اجنبی ہے۔''

''امی! یہ میری کزن ہے۔ مجھ سے دوستی کرے گی تو اجنبیت دور ہو گی اس کی......'' اس جوان نے کچھ آٹھ دس سال کے بچے کی طرح کہا تھا۔ باریشہ کو اس پر بے حد پیار آیا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ تھوڑی دیر کھیل لو...... پھر باریشہ کو سونے دینا۔''

''جی...... جیسا آپ کہیں۔'' اس نے رضامندی دے دی تھی۔

رضامندی دینے کے باوجود وہ دونوں رات گئے تک کیرم کھیلتے رہے تھے۔ باریشہ کیرم کھیلنے سے زیادہ اسے دیکھتی رہی تھی۔ اتنا معصوم انسان دیکھنے کا اتفاق اسے زندگی میں پہلی بار ہوا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ معصوم انسان آنے والے وقت میں اس کی زندگی میں کیا تبدیلیاں لانے والا ہے۔

☆......☆......☆

چاند پر وہ رات بہت بھاری گزرنے والی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ آج کی رات اسے نیند نہیں آئے گی۔ بالآخر باریشہ بھی اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اب اس کے پاس کوئی نہیں تھا۔ سوائے بوڑھی آمنہ کے اور اس کے اپنے سائے کے......

دین بابا، حاجی بوا...... تہمینہ پھوپھو، شکیلہ پھوپھو، زہرہ پھوپھو...... ان کی بیٹیاں...... سب ہی تو اسے چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ اور صندل بھی...... کوئی بھی تو نہیں رہا تھا اس کے پاس...... اجڑ جانے کا اتنا احساس تو انہیں ہندوستان سے پاکستان آتے وقت نہیں ہوا تھا جتنا اب ہو رہا تھا۔ کس نے حویلی میں اس بربادی کا بیج بویا تھا۔ ایسا بیج جس کی فصل نے سب تہس نہس کر دیا تھا۔

دور...... بہت دور اسے دروازے پر دستک دینے کی آواز سنائی دی تھی۔ بستامی اتا ؤلا ہوا دروازہ پیٹ رہا تھا۔

☆......☆......☆

''صندل! دروازہ کھولو......'' کمرے کے باہر کھڑا بستامی کہہ رہا تھا۔اور کمرے کے اندر دلہن بنی صندل، چاند اور میر زاد سہمے ہوئے کھڑے تھے۔

''تم لوگ دروازہ کیوں نہیں کھول رہے ہو؟'' بستامی اتاؤلا ہو رہا تھا۔چاند نے کچھ ہمت مجتمع کی تھی۔

''صندل تیار ہو رہی ہے بستامی......!تم کچھ دیر انتظار کرو ذرا......''

''جلدی کرو......صندل سے کچھ ضروری بات کرنا ہے مجھے......''

''ٹھیک ہے۔'' دروازے سے الگ ہو کر چاند میر زاد کے قریب ہوئی تھی۔

''اب کیا کرنے آئے ہو میر......؟میری بیٹی کو انکار تو تم کر ہی چکے ہو۔تو پھر اب کیا کرنے آئے ہو یہاں......''

''مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے چاندامی......!''

''بہت دیر سے ہوا ہے۔''

''میں صندل کے بنا نہیں رہ سکتا۔پلیز کچھ کریں۔''

''اب کچھ نہیں ہو سکتا میر......!'' چاند کے بجائے صندل نے کہا تھا۔

''کتنی دیر ہے چاند......تم دروازہ کھولو......کچھ ضروری بات کرنا ہے۔''

''میر!تم پردے کے پیچھے چھپ جاؤ۔'' چاند نے میر سے کہا تھا۔میر زاد نے ایسا ہی کیا تھا۔وہ پردے کے پیچھے چھپ گیا تھا۔بوکھلائی ہوئی چاند نے گھبرائی ہوئی صندل کو بیڈ پر بٹھایا تھا۔اور خود آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا تھا۔

''لڑکیوں کو تیار ہونے میں کچھ وقت لگتا ہے بستامی......''

بستامی نے کچھ نہیں کہا تھا۔وہ ہاتھ میں ایک کاغذ پکڑے صندل کے قریب ہوا تھا۔

''صندل!اس پر سائن کر دو۔''

"یہ کیا ہے۔ نکاح نامہ......؟"

"نہیں......لیکن اس سے پہلے میں کسی چیز کی گارنٹی چاہتا ہوں۔"

"کس چیز کی......؟"

"کہ جس کے ساتھ صندل کو بیاہا جا رہا ہے۔ صندل اس کو ہر طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کرے گی۔ کبھی اسے ناراض نہیں ہونے دے گی۔ کبھی شکایت کا موقع نہیں دے گی۔ اور جو مرضی ہو جائے، اس جگہ سے واپس نہیں آئے گی۔"

"اس کے لیے سائن کروانے کی کیا ضرورت ہے بستامی......؟ میں یہ سب باتیں اسے سمجھا چکی ہوں۔"

"مجھے بہت لوگوں نے دھوکا دیا ہے چاند......اس لیے میں اب ہر کام لکھ پڑھ کر کرتا ہوں۔"

"صندل لوگ نہیں ہے، گھر کا فرد ہے۔"

"اس پر ایسا کچھ نہیں لکھا جس پر اعتراض کیا جائے۔ میں کوئی جائیداد نام لگانے کو نہیں کہہ رہا ہوں۔ سائن کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔"

"لیکن......"

"ٹھیک ہے۔ میں کر دیتی ہوں۔" صندل نے رضامندی دے دی تھی۔ اور پھر بستامی سے کاغذ پکڑ کر اس پر سائن کر دیے تھے۔

"تمہیں بھی وعدہ دینا ہو گا چاند......کہ اگر صندل نے اپنے حلف کی پاسداری نہیں کی تو پھر تم اس کی طرف داری نہیں کرو گی۔"

"نہیں کروں گی۔"

بستامی کے چہرے پر مسکراہٹ آئی تھی۔ اب وہ ہر طرح سے مطمئن ہو چکا تھا۔

''میں باہر جا کر نکاح کے انتظام دیکھتا ہوں۔'' بستامی باہر چلا گیا تھا۔

چاند نے دروازے کو پھر سے بند کر دیا تھا۔ میرزاد کو پردے کے پیچھے سے نکال لیا گیا تھا۔

''اب کیا ہو گا۔ بستامی بابا نے تو صندل سے سائن کروا لیے ہیں۔'' میرزاد پریشان تھا۔ پردے کے پیچھے کھڑا وہ سب سن چکا تھا۔

''تم جاؤ میر...... تمہارے لیے اب یہاں کچھ نہیں ہے۔'' صندل نے آنسو چھپاتے ہوئے کہا تھا۔''میں بستامی بابا کو حلف دے چکی ہوں۔''

''ایسے مت کہو صندل......''

''جو بھی کہہ رہی ہوں تم سے مایوس ہونے کے بعد کہہ رہی ہوں۔''

''مجھے معاف کر دو۔ میں خود اپنی شادی چھوڑ کر آ رہا ہوں۔''

''کیا......؟'' چاند کو حیرت ہوئی تھی۔

''ہاں...... آج میرا نکاح تھا تانیہ کے ساتھ...... اب میں واپس نہیں جا سکتا ہوں۔ میں ساری کشتیاں جلا کر آیا ہوں۔ صندل کے لیے......''

''پھر تم دونوں کے پاس ایک ہی حل ہے۔''

''وہ کیا......؟''

''یہاں سے بھاگ جاؤ......''

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں چاند امی......''

''اس کے علاوہ کچھ نہیں کیا جا سکتا صندل...... بستامی کو راضی نہیں کیا جا سکتا ہے۔''

''لیکن نیچے میری بارات آ چکی ہے۔''

''وہ سب میں سنبھال لوں گی۔ تم دونوں جاؤ۔'' چاند نے کہا تھا اور پھر جلدی جلدی سے الماری

میں سے سونا موتی نکال کر ایک پوٹلی میں ڈالنے لگی تھی۔

''حویلی کی بہت بے عزتی ہو جائے گی۔''

''کچھ نہیں ہوگا۔ میری بیٹی کی خوشی سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔''

''بستامی بابا آپ سے سخت ناراض ہو جائیں گے۔''

''وہ سب میں دیکھ لوں گی۔ تم میرزاد کے ساتھ جاؤ۔''

چاند کے کہنے کے باوجود صندل بت بنی کھڑی تھی۔

''میر......! اسے لے کر نکلو تم...... کھڑکی کے ہی راستے......''

''چلو صندل......!'' اور میرزاد کے ساتھ چلنے سے پہلے صندل نے چاند کو گلے سے لگا لیا تھا۔ وہ رونے لگی تھی۔

''آپ کا شکریہ چاندامی...... میں واقعی ہی میر کے علاوہ کسی کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی تھی۔''

''جانتی ہوں تم صرف میرزاد کے ساتھ ہی خوش رہ سکتی ہو۔ جاؤ اس کے ساتھ...... خدا نے چاہا تو جلد ملاقات ہو گی۔''

میرزاد نے پہلے اسے کھڑکی سے باہر نکالا تھا۔ پھر چاند کو شکریہ کی نظر سے دیکھتا ہوا خود بھی کھڑکی سے نیچے اتر گیا تھا۔ چاند نے دل ہی دل میں انہیں بہت سی دعائیں دی تھیں۔ پھر گہرا سانس بھرتے ہوئے اپنے اعصاب کو نارمل کیا تھا۔ اور پھر کمرے کا دروازہ کھول دیا تھا۔



ناول **تاش گھر** ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **15** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 16

''ارشادی بابا...... ارشادی بابا......!'' وہ دونوں گھبرائے ہوئے سے دکان میں داخل ہوئے تھے۔ دن کی روشنی کے باوجود دکان میں حسبِ دستور نیم اندھیرا تھا۔ دونوں کو چند لمحے تو وہاں کچھ نظر ہی نہیں آیا۔ پھر صندل کی نظر ارشادی بابا پر پڑی تھی جو لکڑی کے ایک بنچ پر لیٹا دہرا سا ہوا سو رہا تھا۔ صندل نے اس کے پاس جا کر اس کو جھنجھوڑا تھا۔

''اٹھیے ارشادی بابا......!''

اور کچی پکی نیند میں گم ارشادی بابا اٹھ گیا اور حیرت سے بٹر بٹر دونوں کو دیکھنے لگا تھا۔

''صندل......! تم یہاں......؟ کیا بات ہے صندل؟''

''ہماری مدد کریں ارشادی بابا......!'' صندل نے منت بھرے انداز میں کہا تھا۔ ارشادی نے اب کے آنکھیں پوری طرح سے کھول دی تھیں۔ اور پھر صندل کو غور سے دیکھا۔ جو دلہن بنی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ کھڑے میر زاد کو......

''یہ سب کیا ہے؟''

''آج میرے گھر پر میری شادی تھی۔''

''اور تم یہاں ہو؟'' وہ حیران ہوا۔ اور پھر اگلی بات کا قیاس اس نے خود سے ہی لگا لیا تھا۔ ''تم ......تم گھر سے بھاگ رہی ہو صندل......؟''

جواباً صندل نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جو وہ فخر سے بتا سکتی...... اس کے چہرے پر شرمندگی دیکھی جا سکتی تھی۔ ارشادی بابا فوراً سے اٹھا اور پھر جلدی سے اس نے دکان کا دروازہ اندر سے لاک کر دیا تھا۔

''تمہیں یہاں آتے کسی نے دیکھا تو نہیں......؟'' وہ تو جیسے صندل اور میر زاد سے بھی زیادہ گھبرا گیا تھا۔

''نہیں...... کسی نے نہیں دیکھا۔'' صندل کے بجائے میر زاد نے جواب دیا تھا۔

''اب بتاؤ کہ کیا ہوا ہے سب......'' ارشادی نے اسٹول پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ صندل اور میر زاد نے مختصر لفظوں میں اسے ساری بات بتا دی۔ جسے سنتے ہوئے وہ گہرا سانس بھرنے کے بعد بھی خاموش ہی رہا۔

''کچھ بولیے ارشادی بابا......''

''تم دونوں نے غلط حرکت کی ہے۔ چاند بے شک تمہارے ساتھ ہے لیکن حویلی کی بدنامی ہونے کو وہ بچا نہیں سکتی ہے۔''

''جانتی ہوں۔''

''تمہیں یہ کام کرنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ خاص کر اپنی شادی والے دن تو ہرگز نہیں...... بستامی اور رحبانی کی بہت بے عزتی ہو جائے گی۔ تم لڑکی ہو۔ تمہارے لیے یہ بات سمجھنا مشکل ہے۔ لیکن جس مرد کے گھر میں یہ کام ہو اس کا گھر سے باہر نکلنا محال ہو جاتا ہے۔''

''ہم جانتے ہیں کہ ہم نے غلطی کی ہے لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا ہے۔ ہماری مدد کریں۔'' میر زاد نے بھی منت بھرے انداز میں کہا تھا۔

''کیا مدد چاہیے تمہیں؟''

''ہمیں رات ہونے تک یہاں رکنا ہے۔ تا کہ دن کی روشنی میں ہمیں کوئی دیکھ نہ لے۔ رات

ہوتے ہی ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔"

"رات کے اندھیرے میں کہاں جاؤ گے تم...... راستہ خطرناک ہے۔ تمہیں اب رات بھر یہاں ہی رکنا ہوگا۔ صبح فجر کے بعد نکل جانا...... تاکہ دن کی روشنی میں تمہیں راستے واضح نظر آنے لگیں۔ ایسا کرو دونوں اندر چلے جاؤ...... اندر چھوٹا سا اسٹور ہے۔ گندا بھی ہے لیکن تمہیں اسی میں گزارا کرنا ہوگا۔ میں تمہارے لیے کچھ کھانے کو لاتا ہوں۔ دکان کو باہر سے لاک کردوں گا۔"

"یہ تردد مت کریں۔" صندل نے انہیں باہر جانے سے روکا تھا۔

"تمہاری شکلوں پر لکھا ہوا ہے کہ تمہیں بھوک لگی ہے۔" ارشادی نے کہا اور پھر دکان سے باہر چلا گیا۔ وہ دونوں نیم اندھیری دکان میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے...... گھبرائے ہوئے اور آنے والے وقت سے ڈرے ہوئے......

☆......☆......☆

"میر...... دروازہ کھولو......!" زویا میر زاد کے کمرے کے باہر کھڑی دروازے پر دستک دے رہی تھی اور یہ کوئی اس کی تیسری دستک تھی۔ دروازہ کھلنے میں آرہا تھا اور نہ ہی میر زاد کوئی جواب دے رہا تھا۔

"میر! دیر ہو رہی ہے۔ دروازہ کھولو...... کیا سو گئے ہو؟ اتنی دیر کیوں لگا رہے ہو؟" زویا زچ ہو رہی تھی۔

"کیا ہوا ہے زویا......؟" زوہیب وہاں آیا تھا۔

"میر دروازہ نہیں کھول رہا ہے۔"

"نہا رہا ہوگا۔"

"نہیں...... نہا تو وہ پہلے ہی چکا تھا۔ اب تک تو اسے تیار ہو جانا چاہیے تھا۔ سب مہمان آچکے ہیں۔ جلدی سے نکاح ہو جائے تو پھر کھانا بھی اوپن کرنا ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں بارش نہ ہو جائے۔

ہم کہاں مہمانوں کو اندر سنبھالتے پھریں گے۔ تیز ہوا چل رہی ہے باہر......"

"ایسا نہیں ہوگا...... ہو بھی گیا تو مہمانوں کو کرلیں اندر ایڈجسٹ...... تم میر زاد کو ریڈی ہونے کو کہو......"

"دروازہ تو کھولے......"

"کہیں لیٹے لیٹے سو نہ گیا ہو...... تم ایسا کرو کہ دوسری چابی سے دروازہ کھول لو......"

"جی...... ایسا ہی کرنا پڑے گا۔"

زوہیب مشورہ دے کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ زویا اپنے کمرے سے دروازے کی دوسری چابی لے آئی تھی۔ تب تک زویا کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ میر زاد کمرے میں نہیں ہوگا۔ وہ کھڑکی کے راستے جا چکا ہوگا۔ یہ بات تو اس کے گمان میں ہی نہیں تھی۔ بھلا میر زاد نے وہاں سے کہاں جانا تھا۔ لیکن کمرا کھولنے پر وہ دھک سے رہ گئی تھی۔

کمرا خالی تھا۔ وہاں میر کا کوئی سایہ تک موجود نہیں تھا۔ زویا خالی نظروں سے کمرے کو دیکھ رہی تھی۔ بند دروازہ، میر کی غیر موجودگی پر وہ اس قدر حیران ہوئی تھی کہ اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا تھا۔ وارڈروب کھلی ہوئی تھی۔ اندر سے میر کے کپڑے غائب تھے۔ جو زویا کو واضح اشارہ دے رہے تھے کہ میر زاد وہاں سے جا چکا ہے۔ پھر توقع کے عین مطابق بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر اسے خط پڑا ہوا نظر آیا تھا۔ جسے پڑھے بغیر ہی اسے اندازہ تھا کہ اندر کیا لکھا ہوگا۔

پیاری آپی!

غصہ مت کیجیے گا۔ بلکہ مجھے سمجھنے کی کوشش کیجیے گا۔ ایک لڑکے کے جذبات کو...... ایک نوعمر لڑکا...... جس کا ہر دن پچھلے دن سے مختلف ہوتا ہے۔ جس کے صبح کے فیصلے رات ہونے تک بدل جاتے ہیں۔ میں نے خود کو بہت سمجھایا، بہت روکا، لیکن میں خود کو صندل سے محبت کرنے سے باز نہیں رکھ سکا۔

شاید اس لیے کہ صندل میری پہلی محبت ہے۔ مجھے یہ منظور نہیں کہ میں ساری زندگی اپنی پہلی محبت کا غم مناؤں، صرف اس لیے کہ وہ ناجائز خون ہے۔ میں نے بہت سوچنے کے بعد فیصلہ کیا ہے اور میں صندل کو اپنانے جا رہا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ آگے کیا صورت حال ہوگی۔ صندل مجھے معاف کرتی ہے یا نہیں...... لیکن فی الحال مجھے جانا ہے۔ مجھ پر غصہ ہونے کے بجائے بات کو سمجھنے کی کوشش کیجیے گا۔

میں جانتا ہوں کہ میں تانیہ کے ساتھ زیادتی کر رہا ہوں۔ لیکن یہ تانیہ کے ساتھ اس سے بھی بڑی ناانصافی تھی کہ میرے دل میں کوئی اور ہو اور کمرے میں کوئی اور...... میں رہوں تو اس کے ساتھ لیکن سوچوں کسی اور کو...... اس لیے جو زیادتی اس کے ساتھ اب کر رہا ہوں، یہ معمولی ہے۔ میں واپس آکر آپ سے، تانیہ سے اور زوہیب بھائی سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لوں گا۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجیے گا۔

میر زاد

خط پڑھ کر زویا کے چہرے پر اتنی سختی آ گئی تھی جیسے اس کا چہرہ لوہے سے ڈھالا گیا ہو۔ خط کو اس نے توڑ مروڑ دیا تھا۔ اور تصور میں وہ ایسے سوچنے لگی تھی جیسے صندل کی گردن مروڑ رہی ہو۔

☆......☆......☆

''چاندامی! صندل کے پاس کون ہے؟'' تعبیر نے چاندامی سے پوچھا تھا جو ستون کے ساتھ لگ کر کھڑی اپنی گھبراہٹ کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''کوئی نہیں ہے اس کے پاس...... وہ اکیلی ہے اپنے کمرے میں......''

''اکیلا مت چھوڑیں اسے...... وہ بہت اداس ہو رہی تھی۔ رونے نہ لگ جائے، روئے گی تو میک اپ خراب ہو جائے گا۔''

''وہ...... مجھے نیچے بھی ہزاروں کام ہیں۔''

''میں جاتی ہوں پھر......'' تعبیر کہہ کر وہاں سے جانے لگی تھی جب بستامی نے اسے روکا تھا۔

''تعبیر......!''

''جی بستامی بابا......'' وہ رکی تھی۔

''صندل کو کہو کہ پردہ کرلے......نکاح کے لیے مولوی صاحب اور گواہ اوپر جائیں گے۔''

''جی بہتر......!'' تعبیر صندل کے کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔

چاند کے سانس جیسے کہیں گم ہوگئے تھے۔ بڑے کمرے میں جاتے ہوئے بستامی کی نظر چاند پر پڑی تھی۔

''کیا بات ہے چاند......تم بہت گھبرائی ہوئی لگ رہی ہو۔''

''نہیں......ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔''

''سمجھ سکتا ہوں......صندل کا یہاں سے رخصت ہوجانا تمہیں اداس کررہا ہے۔''

''ہاں......ایسی ہی بات ہے۔''

''فکر مت کرو......جہاں صندل جارہی ہے، وہاں وہ بہت خوش رہے گی۔''

بستامی کی بات پر چاند پھیکے سے مسکرائی تھی۔

''میں نکاح کے لیے مولوی صاحب کو کمرے میں لے کر جاتا ہوں، تم اتنی دیر کمرے میں مت جانا......'' بستامی کہہ کر وہاں سے جانے کو ہوا تھا......جب تعبیر تقریباً بھاگتی بھاگتی وہاں آئی تھی۔

''چاندامی......چاندامی......! صندل کمرے میں نہیں ہے۔'' گھبرائی ہوئی تعبیر نے پھولے ہوئے سانس اور آواز پر قابو رکھتے ہوئے کہا تھا، لیکن اس کی آواز اتنی تو ضرور رہی تھی کہ حویلی کے تمام مکین سن سکتے۔

''کیا کہا......؟ کہاں ہے صندل؟'' بستامی نے فکرمندی سے پوچھا تھا۔

''پتا نہیں......کمرے میں نہیں ہے۔''

''تو کہاں گئی؟ دائیں بائیں دیکھو اسے......''

''دیکھ لیا ہے...... وہ کہیں نہیں مل رہی ہے۔'' تعبیر کے چہرے کا رنگ فق تھا۔ بستامی خود سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر پہنچا تھا۔ صندل وہاں نہیں تھی۔

''کیا ہوا ہے؟ کہاں ہے صندل......؟'' رحبانی بھی وہاں آیا تھا۔ اور حویلی کے باقی مکین بھی...... جو لمحے بھر میں جان گئے تھے کہ صندل حویلی سے غائب ہو چکی ہے۔

''پتا نہیں...... وہ مل نہیں رہی ہے۔'' تعبیر نے کہا تھا۔

''کہاں جاسکتی ہے وہ......؟''

''اسے تلاش کرو...... دیکھو اسے کہاں ہے وہ......؟'' بستامی دھاڑا تھا۔

''لیکن تلاش کریں کہاں......؟ کچھ پتا تو ہو کہ وہ کہاں گئی ہے؟'' شکیلہ پھوپھو فکرمندی سے بولی تھیں۔

''میں باغ میں دیکھ کر آتا ہوں...... شاید وہاں نہ ہو...... اکثر باغ میں چلی جایا کرتی ہے۔''

رحبانی کہہ کر باغ کی طرف چلا گیا تھا۔ حویلی کے باقی افراد صندل کو پوری حویلی میں تلاش کرنے لگے تھے۔ صرف ایک چاند تھی جو خاموش سی ستون کے ساتھ لگ کر کھڑی تھی۔ چاہنے کے باوجود بھی اس کے چہرے پر فکرمندی نہیں آ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ صندل کہاں ہے۔ اس لیے وہ اپنے چہرے پر لاعلمی کی حیرت نہیں لا پا رہی تھی۔ جبکہ باقی کے افراد بہت پریشان تھے۔

''ہائے کہاں گئی میری بچی......!'' حاجی بوا کونے میں بیٹھ کر رونے لگی تھیں۔ چاند نے انہیں چپ نہیں کروایا تھا۔

حویلی میں کافی دیر تک ایک ہلچل موجود رہی تھی۔ سب جو صندل کو ڈھونڈ رہے تھے لمحوں میں واپس صحن میں اکٹھے ہوئے تھے۔

''صندل کہیں نہیں ہے۔'' سب نے ملتی جلتی بات کی تھی۔

''صندل گھر سے بھاگ گئی ہے۔'' رحبانی نے وہاں آ کر اونچی آواز میں بتایا تھا۔ سب نے

سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا تھا۔

''باغ میں اس کی پائل گری ہوئی ہے۔ قدموں کے نشان بھی ہیں۔ صندل کے بھی اور کسی مردانہ جوتوں کے بھی...... وہ کسی کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی ہے۔'' رحبانی نے چاند کو دیکھتے ہوئے کہا۔

بستامی نے غصیلی نظروں سے چاند کو دیکھا۔

''کیا یہ سچ ہے چاند......؟'' وہ غرایا۔

''مجھے کیا معلوم بستامی...... میں تو تمہارے سامنے ہی کتنی دیر سے بیٹھی ہوں۔''

''کیا وہ کسی کو پسند کرتی تھی؟ کیا کسی اور سے شادی کرنا چاہتی تھی؟''

''ایسا کچھ نہیں ہے...... ایسا ہوتا تو وہ مجھے ضرور بتاتی۔''

''تو پھر وہ کیوں بھاگ گئی؟'' بستامی چیخا تھا۔ اور ایسے چیخا تھا کہ سب سہم گئے تھے۔ چاند کچھ زیادہ ہی سہم گئی تھی۔

''رحبانی! جلدی کرو...... وہ زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔ تلاش کرو انہیں...... وہ بڑی سڑک تک بھی نہیں پہنچے ہوں گے۔ آدمی لے کر جاؤ اپنے ساتھ...... انہیں تلاش کرو۔''

بستامی کے کہنے پر رحبانی فوراً سے آدمی اکٹھے کر کے باہر نکلا۔ چاند کو گھورتا ہوا بستامی اندر ان لوگوں کے پاس چلا گیا تھا جو نکاح کے لیے جمع تھے۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے چاند......؟'' بستامی کے اوجھل ہو جانے کے بعد تینوں پھوپھیاں چاند کے گرد ہوئی تھیں۔

''پتا نہیں...... مجھے کچھ نہیں معلوم......''

''تم یہ جھوٹ بستامی سے تو بول سکتی ہو، لیکن ہم سے نہیں......'' زہرہ پھوپھو نے کہا اور چاند سمجھ گئی تھی کہ وہ واقعی ہی میں ان سے جھوٹ نہیں بول سکتی ہے۔''

''بولو کہاں ہے صندل......؟ وہ ایسی لڑکی نہیں کہ گھر سے بھاگ جائے۔ یقیناً کوئی اور بات ہے۔ جو تم ہم سے چھپا رہی ہو۔'' تہمینہ پھوپھو نے کہا۔

''اور صندل تمہارے ساتھ ایسا بھی نہیں کر سکتی ہے۔ وہ مر تو سکتی ہے لیکن تمہاری بے عزتی نہیں کروا سکتی ہے۔'' شکیلہ پھوپھو کہہ کر سوالیہ انداز میں چاند کو دیکھنے لگی تھیں۔

چاند چپ رہی تھی۔ وہ بے چین نظر آنے لگی تھی۔ خنک موسم کے باوجود بھی اس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا تھا۔

''کیا صندل کو تم نے گھر سے بھاگ جانے میں مدد کی ہے؟'' شکیلہ پھوپھو نے پوچھا۔

''ہاں......! میں نے مدد کی ہے۔ وہ میر زاد کے ساتھ چلی گئی ہے۔'' چاند نے اعتراف کر لیا تھا۔ تینوں پھوپھو نے اپنا سر پکڑ لیا۔

''یہ کیا کیا تم نے چاند......؟''

''میری بیٹی کی خوشی میر زاد کے ساتھ تھی۔ اس لیے میں نے اس کی مدد کی......''

''تمہیں یہ کام آج ہی کیوں کرنا تھا، جب اس کا نکاح تھا۔''

''میں کیا کرتی...... میر زاد آیا ہی آج تھا۔''

''اب دیکھنا...... بستامی کس قدر غصہ ہوتا...... اتنے امیر لوگ...... اوپر سے تاجر...... وہ تو بستامی کو چھوڑیں گے نہیں......اور بستامی ہمیں نہیں چھوڑے گا۔''

''اس کا غصہ کرنا بنتا بھی ہے۔ اس کی بہت بے عزتی ہونے والی ہے۔ اتنا چھا رشتہ تھا یہ......'' زہرہ پھوپھو نے شکیلہ کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''تو پھر کیا ہوا...... مانا کہ چاند نے برا کیا ہے لیکن بستامی نے افشیں کے ساتھ کون سی بھلائی کی ہے۔ ایک طرح سے بیچا ہے میری بیٹی کو اس بڈھے کے ہاتھ......'' تہمینہ نے غصے میں روانی سے کہہ دیا۔

سب نے حیرت سے تہمینہ کو دیکھا تھا اور کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کیا کہے۔

''ہم میں سے کوئی یہ بات بستامی کو نہیں بتائے گا کہ صندل میرزاد کے ساتھ گئی ہے۔'' حاجی بوا نے کہا۔

سب خاموش رہے تھے۔ مطلب حاجی بوا کی بات ماننے پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ لیکن چہروں سے حیرت اور پریشانی نہیں جا رہی تھی۔

شام ہونے تک سب مزید بوکھلا چکے تھے کیونکہ بستامی پاگل ہوا کمرا کمرا گھوم رہا تھا۔ لڑکے والوں کو اس نے کیا کہہ کر روکا ہوا تھا، کوئی نہیں جانتا تھا۔ اور وہ اب کس انتظار میں تھے یہ بھی کسی کے علم میں نہیں تھا۔ کیونکہ بات تو یقیناً ان کے کان تک بھی پہنچ چکی ہوگی کہ صندل گھر سے بھاگ چکی ہے۔

شام گہری ہونے سے پہلے رحبانی، آدمیوں کے ساتھ واپس حویلی آ گیا تھا۔

''صندل کا کہیں کچھ پتا نہیں چلا ہے۔'' اس نے مایوسی سے کہا۔ باقی کسی کو تو کچھ زیادہ حیرت نہیں ہوئی تھی لیکن پہلے سے غصے میں بیٹھا بستامی جیسے شیش ناگ بن گیا تھا۔ جیسے سب کو کھا جائے گا۔

''دیکھا چاند......! تمہاری بیٹی نے کیا حرکت کی ہے۔ وہ ناجائز خون تھا۔ اس نے ایسی ہی گھٹیا حرکت کرنی تھی۔ اس نے کتنے آرام سے کاغذ پر سائن کیے اور پھر یہاں سے چلی گئی۔ اس کے ذہن میں کیا تھا اس نے اس کی خبر ہی نہیں ہونے دی۔ اس نے اتنا زیور پہنا ہوا تھا، وہ سب ساتھ لے کر بھاگ گئی ہے۔''

کوئی کچھ نہیں بولا تھا...... کوئی کیا بول سکتا تھا۔

''میں صندل کو جان سے ماردوں گا چاند...... میں بتا رہا ہوں...... وہ جب مجھے ملی میں اسے جان سے ماردوں گا۔'' بستامی کا غصہ کرنا بنتا تھا۔ اس کی بے عزتی ہو رہی تھی۔

''مہمانوں کا کیا کرنا ہے؟'' رحبانی نے پوچھا تھا۔

"انہیں واپس بھیج دو...... کہنا کہ ہم نے ایک ناجائز خون کو پالنے کی غلطی کی تھی۔ اس کی سزا آج بھگت رہے ہیں۔"

بستامی کی بات سن کر رحبانی وہاں سے چلا گیا تھا۔ بڑے کمرے میں دبک کر بیٹھے سب موجود لوگوں کو مہمانوں کے ایک ایک کر کے جانے کا احساس ہوتا رہا تھا۔ کچھ سرگوشیاں، کچھ باتیں جو انہیں کمرے میں اترتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ لیکن کچھ اندازہ نہیں تھا کہ جانے والے کیا کچھ سنا رہے ہیں۔ کھانے پینے کی کسی کو کوئی ہوش نہیں تھی۔ بڑوں کو پریشانی تھی اور چھوٹوں کو خوشی کہ چلو صندل کو میرزا دل گیا ہے جو اسے چاہیے تھا۔

☆......☆......☆

"اس کی مرضی نہیں تھی اس رشتے میں تو تم نے کیوں تانیہ کے ساتھ اس کا رشتہ جوڑا......؟"

زوہیب زویا پر چلایا تھا۔

زوہیب کی والدہ زویا کو گھور رہی تھیں۔ اور تانیہ بجی سنوری بیٹھی بے آواز رو رہی تھی۔ اس کے آنسوؤں نے اس کا میک اپ خراب کر دیا تھا۔ اور وہ بدصورت نظر آنے کے بجائے بدحال نظر آ رہی تھی۔

"زوہیب! میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں۔ یہ رشتہ اس کی مرضی سے طے ہوا تھا۔" زوہیب کے غصے کے سامنے سہمی سی زویا اپنی طرف سے وضاحتیں دے رہی تھی۔

"جھوٹ نہیں بول رہیں تو پھر وہ کیوں چلا گیا ہے؟"

"مجھے کیا پتا کہ وہ کیوں چلا گیا ہے۔"

"تمہیں سب معلوم ہے۔ تم مجھ سے جھوٹ بول رہی ہو۔"

"مجھ سے جس طرح کی مرضی قسم لے لو زوہیب...... یہ رشتہ اس کی مرضی سے ہوا تھا۔"

"کیا وہ کوئی خط وغیرہ بھی نہیں چھوڑ کر گیا ہے؟"

''ن......نہیں......!'' مصلحت کے تحت زویا نے جھوٹ بولا تھا۔ زوہیب دونوں ہاتھوں میں سر پکڑ کر صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

''میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اگر یہ رشتہ اس کی مرضی سے ہوا تھا تو پھر وہ گھر سے کیوں چلا گیا ہے۔'' زوہیب کی والدہ نے بھی اپنے غصے کا اظہار کیا تھا۔ غصہ تو انہیں بہت تھا لیکن وہ زویا کے سامنے اظہار کو لاحاصل سمجھ رہی تھیں کیونکہ جو ہوا اس میں زویا کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اس نے نیک نیتی سے اپنی نند کا رشتہ اپنے بھائی کے ساتھ کروایا تھا۔

زویا رونے لگی تھی۔ وہ زوہیب لوگوں کے ساتھ کھڑی ہے، اس بات کا ثبوت دینے کے لیے اسے رونا پڑا تھا جبکہ اسے رونے سے زیادہ غصہ آ رہا تھا۔ میرزاد پر اور صندل پر......اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ صندل کو جان سے مار دے۔ کسی نے اسے چپ نہیں کروایا تھا۔ اور جب اسے احساس ہوا کہ رونے سے اس کی قوت فضول میں ضائع ہو رہی ہے تو وہ خود ہی چپ ہو گئی تھی۔

''کچھ تو پتا ہو گا تمہیں کہ کہاں گیا ہے میرزاد......تھوڑا بہت تو کچھ جانتی ہو گی تم......'' اس کے چپ ہو جانے کے بعد زوہیب نے اس سے پوچھا تھا۔

''کیا تم مجھے حویلیاں لے جاؤ گے زوہیب......؟''

''حویلیاں......؟'' زوہیب نے پوچھا تھا اور زویا کی ساس نے حیرت سے زویا کو دیکھا تھا۔

''ہاں......! مجھے شک ہے کہ میر وہاں ہی ہو گا۔''

''وہاں کیوں ہو گا؟ کیا میرزاد وہاں کسی کو پسند کرتا ہے؟''

زویا چپ رہی تھی۔ زویا کا چپ رہنا ہی اس کی شرم ساری کو واضح کر گیا تھا۔ تینوں کو اندازہ ہو چکا تھا کہ میرزاد کے گھر سے چلے جانے کی وجوہات حویلیاں شہر سے جا کر ملتی ہیں۔

''تو تمہیں پہلے سے کچھ معلوم تھا اور تم مجھ سے جھوٹ بولتی رہیں......''

"مجھے نہیں معلوم......بس شک ہے مجھے......" زویا جھوٹ پر جھوٹ بولتی جارہی تھی کیونکہ ابھی موجودہ وقت کا تقاضا جھوٹ بولنا ہی تھا۔ وہ سچ بتا کر اپنے سسرال والوں کو اپنے خلاف نہیں کر سکتی تھی۔ ابھی حکمت عملی یہ ہی تھی کہ وہ میرزاد کی حرکت پر غصے کا اظہار کرے۔

"ہم حویلیاں چلتے ہیں زوہیب......میر یقیناً وہاں سے مل جائے گا۔"

"میرزاد وہاں سے ملے یا نہ ملے......میں اب اس سے ہرگز شادی نہیں کروں گی۔" تانیہ نے کھڑے ہوتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا تھا۔ اس نے آنکھوں کے آنسوؤں کو خشک کر لیا تھا اور اپنے اندر جیسے ایک نئے عزم کو بھر لیا تھا۔

زویا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"میری زندگی میں اب میرزاد کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ امی آپ اور بھائی آپ......مجھے میرا فیصلہ بدلنے پر بالکل مجبور نہیں کریں گے۔" غصے کو روکنے کے بجائے، غصے کا اظہار کرتی ہوئی تانیہ کہہ کر وہاں سے چلی گئی تھی۔

زوہیب اور اس کی والدہ اسے جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں کے دل میں تانیہ کے لیے ہمدردی تھی۔ اور تانیہ بے چاری نہیں جانتی تھی کہ میرزاد اب بھلا کہاں واپس آنے والا تھا۔

"تانیہ کو میں راضی کر لوں گی زوہیب......تم پلیز مجھے حویلیاں لے جاؤ......" زویا نے منت بھرے انداز میں کہا تھا۔ زوہیب اور اس کی والدہ نے ایسے منہ پھیرا تھا جیسے زویا کی بات ماننے کا ان کا کوئی ارادہ نہ ہو۔

☆......☆......☆

اندھیرا رات کو الوداع کر رہا تھا۔ یہ الوداعی ملاقات کچھ طویل تھی۔ یا شاید اس اسٹور روم کی چھوٹی کھڑکی میں اتنی سکت نہیں تھی کہ صندل کو وہ روشنی دکھا سکتی جو باہر سورج کے طلوع ہونے کی نوید

سنانے لگی تھی۔ صندل نے میرزاد کو دیکھا تھا جو غیر آرام دہ جگہ پر بے آرامی کی حالت میں لیٹا سو رہا تھا۔ اب وہ صرف اس کا دوست یا محبوب نہیں تھا بلکہ شوہر بن چکا تھا۔ ارشادی نے کھانا لانے کا بہانہ کیا تھا۔ وہ مولوی کو لینے گیا تھا۔ اپنے سامنے اس نے دونوں کا نکاح کروایا تھا۔ اور اس بات نے صندل کے سارے دکھ جیسے پل بھر میں دور کر دیے تھے۔ خوشی کے مارے وہ ساری رات سو ہی کہاں سکی تھی۔ اس خوشی میں بس ایک کنکر تھا کہ یہ سب چاندامی کے سامنے ہونا چاہیے تھا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ ایسا چاہ کر بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

''جلدی سے دونوں باہر آ جاؤ...... دن نکلنے والا ہے۔'' ارشادی نے وہاں آ کر کہا۔ صندل نے جلدی سے میرزاد کو جگایا۔ رمق رمق کر آتے نل کے پانی سے دونوں نے اپنا منہ دھویا۔ ارشادی کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے پی اور جانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

''یہ لو......!'' ارشادی نے ایک چادر صندل کی طرف بڑھائی۔

''یہ کیا ہے؟''

''چادر ہے...... دیکھ تو رہی ہو تم۔'' صندل نے چادر ان کے ہاتھ سے پکڑ لی تھی۔

''اسے اچھی طرح خود پر اوڑھ لو...... تمہارا لباس کافی بھڑکیلا ہے۔ بہتر ہے کہ تم اسے خود پر لپیٹ کر خود کو چھپا لو......''

اس نے چادر کھول کر خود پر اچھے سے لے لی۔ اور تب ہی اسے اندازہ ہوا تھا کہ وہ چادر بہت مہنگی اور نفیس تھی۔ پشمینے پر دھاگے اور باریک شیشے کا کام کیا گیا تھا۔ بھلا اتنی نفیس چادر ارشادی بابا کے پاس کیا کر رہی تھی؟

''آپ کے پاس کہاں سے آئی یہ......؟''

''بس ہے کسی کی...... کافی دیر سے پڑی ہوئی تھی میرے پاس......''

صندل اور میرزاد خاموش رہے تھے۔ ارشادی نے کچھ تیار کھانا دونوں کے حوالے کیا۔

''یہ لے جاؤ...... تمہیں ضرورت پڑے گی۔ جہاں بھی جاؤ وہاں سے چند دن گھر سے باہر مت نکلنا۔ حویلی والے تمہیں تلاش کر رہے ہیں۔''

''جی بہتر......!'' میرزاد نے کہا۔

''اب تم دونوں جاؤ...... باہر اتنی روشنی ہو چکی ہے کہ تمہیں راستے واضح نظر آئیں گے۔''

''شکریہ آپ کی مدد کا...... خدا حافظ!'' میرزاد کہہ کر باہر جانے کو ہوا، صندل اس کے پیچھے ہی تھی، لیکن پھر نجانے کیا ہوا کہ دکان میں سے باہر نکلنے سے پہلے صندل پوری شدت سے پیچھے کو پلٹی تھی اور ارشادی کے سینے سے لگ گئی تھی۔

''آپ بہت اچھے ہیں ارشادی بابا......!'' اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ یہ آنسو کس جذبے کے تھے، وہ سمجھ نہیں سکی تھی۔

''تم مجھے صرف بابا بھی کہہ سکتی ہو۔'' ارشادی بابا نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ نجانے کیوں آنکھیں ان کی بھی نم ہو چکی تھیں۔

''بابا......!'' اور ان کے سینے سے لگ کر وہ ایسے رونے لگی تھی جیسے سچ میں اسے اس کے سگے بابا مل گئے ہوں۔ کچھ ایسا ہی ارشادی بھی محسوس کر رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے صندل اسی کی سگی بیٹی ہو۔

''چلو صندل! ہمیں دیر ہو رہی ہے۔ دن نکلنے سے پہلے ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔'' میرزاد نے اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔ اور اسے لے کر دکان سے باہر چلا گیا تھا۔

سورج کی روشنی اوٹ سے دھرتی کو دیکھ رہی تھی۔ ابھی اس کی راجدھانی میں کچھ وقت باقی تھا۔ رات کی اوس درختوں سے چمٹی ہوئی تھی۔ جس نے درختوں کے رنگوں کو چھپا دیا تھا۔

میرزاد خاموشی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا اور وہ گم صم بیٹھی درختوں کو دور جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

دونوں کے پاس کرنے کے لیے کوئی بات نہیں تھی۔ یا باتیں تو بہت سی تھیں لیکن اس میں ایک دوسرے کو شریک نہیں کرنا چاہتے تھے۔ دونوں جلدی میں تھے لیکن یہ جلدی کہاں کی تھی، وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ وہ گھر سے بھاگ چکی تھی، میرزاد کے ساتھ تھی اور اب میرزاد کی بیوی تھی۔ یہ ہی بات اس کے لیے اہم تھی۔ میرزاد کے ذہن میں کیا پلان تھا، وہ نہیں جانتی تھی۔ اور ابھی پوچھنے کی اس میں سکت بھی نہیں تھی۔ وہ اسے جہاں بھی لے جاتا اسے بھلا کہاں اعتراض ہونے والا تھا۔

دن آہستہ آہستہ کسی نومولود کی طرح پروان چڑھنے لگا تھا۔ سفید روشنی بڑھ کر پیلے رنگ سے ملنے لگی تھی۔ اور یہ پیلا دن کل والے پیلے دن سے جا ملا تھا۔ رات کی سیاہی جیسے دونوں کے درمیان سے نکل گئی تھی۔ میرزاد کو اپنا گھر سے بھاگ جانا یاد آ رہا تھا اور صندل کو اپنا...... میرزاد تانیہ کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ جو بھی تھا اس کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی اور صندل چاند امی اور بستامی بابا کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔ اس کی وجہ سے حویلی اور بستامی بابا کی بہت بے عزتی ہونے والی تھی۔ اس کے اس اقدام کا اثر اس کی کزن کی شادیوں پر بھی پڑنے والا تھا۔ یہ ساری باتیں ایسی تھیں جس نے اس پر خوف کا غلبہ کر دیا تھا۔ دھوپ تیز ہو جانے کے باوجود وہ کپکپا رہی تھی۔

"کیا تمہیں سردی لگ رہی ہے؟"

"نہیں تو......!"

"تم کانپ رہی ہو......"

میرزاد نے جیپ سائیڈ پر روک لی۔ پیچھے پڑے اپنے بیگ میں سے اس نے ایک جیکٹ نکال کر صندل کو دی۔

"اسے پہن لو......!"

اور صندل نے چپ چاپ جیکٹ کو پہن لیا تھا جس میں سے نکلتی میر کی خوشبو اس کے وجود پر

مسلط ہونے لگی۔ میر زاد ایک بار پھر سے ڈرائیونگ کرنے لگا تھا۔

''ہم کہاں جائیں گے میر......؟'' اہم بات کا خیال اسے اب آیا تھا۔

''خدا کی زمین بہت بڑی ہے۔ کہیں نہ کہیں تو چلے ہی جائیں گے۔''

''پھر بھی......کچھ تو بولو......وہ لوگ ہمیں تلاش کر رہے ہوں گے۔ کسی ایسی جگہ پر جانا ہوگا جہاں ہمیں کوئی تلاش نہ کر سکے۔''

''ایسی ہی جگہ پر جا رہے ہیں ہم......''

''کہاں......؟''

''وہاں تم پہلے بھی جا چکی ہو۔'' پریشانی میں میر زاد نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ صندل نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ پھر اس نے راستے پر غور کیا تھا۔ یہ راستہ اسے شناسا سا لگا تھا۔ وہ یہاں پہلے بھی آ چکی تھی۔

''کیا ہم ٹھنڈیانی جا رہے ہیں؟''

''ہاں......!'' میر نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ اور صندل نے سکون کا ایک سانس لیا تھا۔ وہ ایسی جگہ تھی کہ دونوں کے وہاں ہونے کی واقعی ہی میں کسی کو خبر نہیں ہونے والی تھی۔ صندل نے وہ نامکمل گھر دیکھا ہوا تھا۔ اس نے اس گھر میں زندگی بتا دینے کے خواب دیکھے تھے۔ اب خواب پورے ہونے جا رہے تھے۔

''کیا وہ گھر مکمل ہو چکا ہے؟''

''نہیں......! ہم اسے مل کر مکمل کریں گے۔'' میر زاد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پیار سے کہا۔

صندل دل سے مسکرائی۔ ساری پریشانیاں، دکھ ختم ہونے جا رہے تھے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس نے چاند امی کے لیے کتنی پریشانیاں بڑھا دی تھیں۔

☆......☆......☆

باہر سورج پوری آب و تاب سے نکل آیا تھا لیکن دکان میں اتنا اندھیرا تھا جیسے یہ رات کی دوست ہو۔ ارشادی نے کوئی بتی نہیں جلائی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر سے اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔

صندل جا چکی تھی اور اس کے آنسوؤں کی نمی ارشادی کے لباس پر اتر چکی تھی۔ صندل کے وجود سے اٹھتی مہک بھی ارشادی کے وجود پر قابض ہو چکی تھی۔ اس کی کوئی بیٹی نہیں تھی۔ اس نے کبھی شادی نہیں کی تھی۔ لیکن اگر اس کی کوئی بیٹی ہوتی تو یقیناً صندل جیسی ہی ہوتی...... لیکن کس کے وجود سے......؟

وہ تو ایک مجرد مرد تھا۔ سوامی جی نے اسے شادی نہ کرنے کا کہا تھا۔ اس نے بھی آج تک کسی عورت میں دلچسپی نہیں لی تھی۔ حتیٰ کہ آمنہ میں بھی نہیں...... جو اس پر جان چھڑکا کرتی تھی۔ جس کا سارا دن کا بس ایک ہی مشغلہ تھا۔ چھپ چھپ کر ارشادی کو دیکھنا...... وہ بنسواڑی علاقے میں چلا جایا کرتا تھا۔ اپنے کاغذ اور قلم لیے...... وہ وہاں زائچے بنایا کرتا تھا۔ جنتریاں بنایا کرتا تھا اور آمنہ چھپ کر اسے دیکھا کرتی تھی۔ آمنہ کے لیے وہ پل جنت جیسے ہوتے تھے۔ وہ ان سے نکلنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

نجانے وہ کون سا کمزور لمحہ تھا جس میں اس نے آمنہ سے شادی کا وعدہ کر لیا تھا۔ ایک ایسا وعدہ جسے وہ کبھی نہیں نباہ سکا تھا۔ اور وہ الوداعی ملاقات تو قیامت تھی۔ جب آمنہ کی پشمینے کی چادر ارشادی کے گھر میں ہی گر گئی تھی۔

ارشادی نے سالوں اس چادر کو سنبھال کر رکھا تھا۔ بالآخر آج اس نے آمنہ کی آخری نشانی بھی صندل کو دے دی تھی۔ نجانے اس نے ایسا مجبوری میں کیا تھا یا قدرت نے اس سے یہ کام کروایا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ چیز اس کے اصل حق دار تک پہنچ چکی تھی۔

☆......☆......☆

ستمبر کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ دھوپ میں دن بدن کمی ہونے لگی تھی۔ سردیوں کی آمد آمد تھی۔ پہاڑی علاقوں پر تو ویسے بھی سردیاں جلدی شروع ہو جاتی ہیں۔ اس نے سنا تھا کہ بہت جلد قراقرم

جانے والے رستے بند ہو جائیں گے۔ اس کے دوست نے بتایا تھا کہ پہلی برف باری ہونے کی دیر ہوتی ہے اور پھر وہاں تک جانے والے سارے رستے بند کر دیے جاتے ہیں۔ انگریز لوگ ان معاملات میں بہت سخت تھے۔ ان کی تو منت کر کے بھی اجازت نہیں لی جا سکتی تھی۔ اس لیے اب وہ بہت جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ پہلی برف باری ہونے سے پہلے پہلے......

وہ جانے کے لیے سامان پیک کر رہا تھا۔ چھوٹے سے بیگ میں اپنے بہت سے کپڑے ڈال رہا تھا۔ نجانے وہاں کتنے دن ٹھہرنا تھا اسے...... سال، دو سال...... یا شاید اس سے بھی زیادہ...... سب گھر والوں نے اس کے جانے کی مخالفت کی تھی۔ بھلا اپنا شہر چھوڑ کر کون اتنی دور جاتا ہے۔ جاتا بھی ہے تو کمانے کے لیے جاتا ہے یا کچھ سیکھنے کے لیے جاتا ہے۔ کسی مقصد کے لیے جاتا ہے۔ جادو سیکھنے کون جاتا ہے۔ اور ارشادی انہیں ہزار بار سمجھا چکا تھا کہ ہاتھ پڑھنے کا علم، ماتھے پڑھنے کا علم جادو نہیں کہلاتا ہے۔ لیکن اس کے کم پڑھے لکھے والدین اور بہن بھائی اسے جادو سے ہی جوڑ رہے تھے۔ جو ان کے نزدیک غلط ہونے کے ساتھ ساتھ حرام بھی تھا۔ بہت سمجھانے کے بعد بھی ارشادی نہیں سمجھا تو سب نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ اس کے فیصلے میں اس کے ساتھ تو نہیں تھے لیکن مخالفت بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے اس کی والدہ نے اس کے لیے کھانے کی ایسی بہت سی چیزیں تیار کر دی تھیں جو وہ وہاں جا کر کھا سکتا تھا۔ اس کے والد نے اسے ایک خطیر رقم دی تھی کہ وہاں جا کر خرچ کر لے......

اور اب سب کی رضامندی یا غیر رضامندی سے وہ جا رہا تھا۔ یہاں سے بہت دور...... پہاڑوں میں...... جہاں اسے ایک سوامی جی کا معلوم پڑا تھا۔ جو اسے اس کا مطلوبہ علم سکھانے میں اس کی مدد کر سکتے تھے۔ وہ وہاں جانے کے لیے بہت پر جوش تھا۔ اس نے کسی کا خیال نہیں کیا تھا۔ نہ گھر والوں کا اور نہ ہی آمنہ کا......

''خالہ......! کہاں ہو تم......؟'' اور خلاف توقع کمرے سے باہر آمنہ کی آواز گونجی تھی۔ کھلے دروازے سے وہ گھر کے اندر چلی آئی تھی۔ وقتی طور پر ارشادی گھبرا گیا تھا۔

''ادھر آ جاؤ آمنہ......!'' ارشادی نے آواز دی تھی۔ آمنہ آواز کی سمت اس کے کمرے تک آئی تھی۔ ہاتھ میں کوئی تھال پکڑے جو کروشیہ کے رومال کے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ جب جب ارشادی کے گھر آتی تھی خوب سج دھج کر آتی تھی۔ ارشادی کے گورے رنگ کے سامنے اسے اپنا سیاہ رنگ بہت دکھ پہنچایا کرتا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ ہر صورت ارشادی کو پسند آ جائے۔ اگرچہ اس نے شادی کا وعدہ کر لیا تھا لیکن مردوں کا کیا ہے۔ کب اپنے وعدے سے پھر جائیں، اس لیے وہ اپنی تیاری میں کوئی کمی نہیں آنے دیا کرتی تھی۔ آج بھی اس نے ہلکے پیلے رنگ کی فراک پہنی ہوئی تھی جس پر سیاہ دھاگے سے بیل بوٹے بنائے گئے تھے۔ سیاہ دوپٹا گلے میں تھا اور کندھوں پر اس نے پشمینے کی چادر لپیٹی ہوئی تھی جو اس کی ماں نے اس کے داج کے لیے سنبھال کر رکھی ہوئی تھی اور جسے وہ ماں سے نظریں بچا کر لے آئی تھی۔ اور جس پر انتہائی نفاست سے دھاگے اور شیشے کا کام کیا گیا تھا۔

''میں یہ کھیر لائی تھی۔ خالہ کہاں ہیں؟''

''وہ گھر سے باہر ہیں۔ تم رسوئی میں جا کر ہمارے کسی برتن میں کھیر ڈال دو۔''

''اچھا......!'' آمنہ رسوئی کی طرف جانے لگی تھی اور پھر جاتے جاتے رکی۔ ارشادی جو کام کر رہا تھا، اس پر اس کا دھیان دیر سے پڑا۔

''تم......تم کیا کر رہے ہو؟''

''دیکھ تو رہی ہو کہ اپنے کپڑے پیک کر رہا ہوں۔''

''کہیں جا رہے ہو کیا......؟''

''ہاں...... یہاں سے بہت دور...... پہاڑوں میں......''

''پہاڑ تو یہاں بھی ہیں، حویلیاں میں......''

''یہاں کے پہاڑ بہت چھوٹے ہیں۔ میں اونچے پہاڑوں پر جا رہا ہوں۔ جو برف سے ڈھکے

ہوئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ خیر سے جاؤ...... لیکن جلدی آجانا...... بقرہ عید ہمارے ساتھ ہی کرنا......"

آمنہ بے چاری ابھی بھی موقع کی نزاکت کو نہیں سمجھی تھی۔ ارشادی اسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔ اور ارشادی کے دیکھنے میں ہی کچھ ایسا تھا کہ آمنہ کچھ سہم سی گئی تھی۔ اس کی چھٹی حس نے اس کے اعصاب پر خطرے کی گھنٹی بجائی تھی۔

"تم...... تم کب تک واپس آجاؤ گے ارشادی......؟"

"پتا نہیں......!"

"کیا مطلب پتا نہیں...... انسان کو اپنے فیصلوں کا علم ہوتا ہے۔"

"شاید سال بعد...... یا شاید دو سال بعد...... کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

ارشادی نے کہا تھا اور اگلے ہی پل آمنہ کے ہاتھ میں موجود کھیر کا تھال اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر جا گرا تھا۔ ارشادی نے پہلے تھال اور پھر اس کی طرف دیکھا تھا۔ آمنہ کی حالت ایسی تھی جیسے اسے کسی نے موت کی خبر سنا دی ہو۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟"

"تم اتنے لمبے عرصے کے لیے جا رہے ہو۔ کس لیے؟"

"علم سیکھنے کے لیے......"

"ہاتھ کی لکیروں کا علم......؟" آمنہ نے کچھ طنزیہ کہا تھا۔ یہ پہلی بار تھا کہ اس نے ارشادی کی جستجو پر طنز کیا تھا۔ بات اس کی محبت پر جو آگئی تھی۔

"اچھا...... تو دیکھو میرا ہاتھ...... بتاؤ میری قسمت میں مزید تمہارا کتنا انتظار لکھا ہے۔" آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ اس نے اپنا ہاتھ اس کے آگے کیا تھا۔

ارشادی نے سر جھکالیا۔

''بولوارشادی......''

''میں نے تمہیں کبھی میرا انتظار کرنے کو نہیں کہا۔میری منزل ہمیشہ سے کچھ اور رہی ہے۔''

''لیکن میری محبت کی منزل تم رہے ہو۔''

''وہ تمہارا مسئلہ ہے آمنہ...... میرا نہیں......'' اس نے خود غرضی سے کہا تھا۔علم کی جستجو نے اسے خودغرض بنادیا تھا۔آمنہ کا خون خشک ہونے لگا تھا۔

''خدا کے لیے ارشادی میرے ساتھ ایسا مت کرو...... میں مر جاؤں گی۔تم جا رہے ہو۔میرے گھر والے تو جلد سے جلد میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔''

''تو تم کرلو کسی اور سے شادی...... میں نہیں رک سکتا۔'' ارشادی بھڑکا تھا۔آمنہ نے شدید حیرت سے اسے دیکھا۔

''تم نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا۔''

''ہاں...... کیا تھا۔مجبوری میں کرلیا تھا۔تم نے اتنا دباؤ ڈالا کہ مجھے تم سے شادی کا وعدہ کرنا پڑا۔ تم ہر وقت میرے اعصاب پر سوار رہتی تھیں۔میں درخت کے نیچے بیٹھا ہوتا تھا اور تم درخت کے پیچھے سے چھپ کر مجھے دیکھتی تھیں۔کوئی لمحہ ایسا نہیں گیا جب تم نے میرا سایہ بننے کی کوشش نہ کی ہو۔میں وعدہ کیسے نہ کرتا۔لیکن پھر بھی میں وعدہ خلافی نہیں کر رہا ہوں۔تم میرا انتظار کرسکتی ہو تو ٹھیک ہے۔ورنہ میں کچھ نہیں کرسکتا۔مجھے لازمی جانا ہے۔'' ارشادی نے دوٹوک انداز میں اپنا فیصلہ سنادیا تھا۔آمنہ کے آنسو مزید تواتر سے جاری ہوئے تھے۔اس نے بھلا اپنی زندگی کا تصور ارشادی کے بنا کیا ہی کب تھا۔

''ارشادی! میں مر جاؤں گی۔خدا کے واسطے ایسا مت کرو...... اچھا ایک کام کرو...... تم مجھے بھی ساتھ لے جاؤ...... میں وہاں رہ لوں گی پہاڑوں میں تمہارے ساتھ...... جیسے مرضی حالات ہوں وہاں...... میں رہ لوں گی۔''

''میں تمہیں وہاں لے کر نہیں جا سکتا...... وہاں صرف مرد رہتے ہیں۔''

''پھر ایسا کرو کہ مجھ سے شادی کر لو...... تم مجھے یہاں ہی چھوڑ جانا...... میں خالہ کے ساتھ رہ لوں گی۔ تم آرام و سکون سے اپنا شوق پورا کرنا...... چاہے دو سال لگیں یا تین سال...... میں تمہیں واپس آنے کا بالکل نہیں کہوں گی۔''

''میں شادی بھی نہیں کر سکتا ہوں۔'' ارشادی نے کہا تھا۔

آمنہ نے اس کی طرف دیکھا تھا کہ اب اس میں ایسا کیا مسئلہ ہے۔

''سوامی جی کسی شادی شدہ کو اپنے پاٹ شالہ میں رہنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ وہ صرف انہی مردوں کو اندر داخل ہونے کی اجازت دیتے ہیں جنہوں نے عورت کے جسم کو ہاتھ تک نہ لگایا ہو۔''

نظریں جھکائے اس نے کہہ دیا تھا۔ اور آمنہ کا چہرہ ایسے اترا تھا جیسے ساری بازیاں ہار گئی ہو۔

''مجھے معاف کر دینا آمنہ...... مجھے معاف کر دینا۔''

آمنہ نے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ بس وہاں سے بھاگی تھی۔ تیزی سے...... اپنا تھال اور رومال وہاں ہی بھول کر...... وہ جتنی تیزی سے بھاگ سکتی تھی بھاگ گئی تھی۔ ارشادی سست قدموں سے اس کے پیچھے ہوا تھا۔ وہ اسے نہیں روک سکتا تھا۔ روکنا چاہتا بھی نہیں تھا۔

گھر کے دروازے سے باہر نکلنے سے پہلے آمنہ کی چادر وہاں ہی گر گئی تھی۔ دروازے کی دہلیز پر...... ارشادی نے اسے اٹھا لیا تھا۔ آمنہ اس چادر کو واپس لینے آئے گی یا نہیں...... وہ نہیں جانتا تھا۔

☆......☆......☆

ارشادی تین سال بعد لوٹا تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس نے کافی کچھ سیکھ لیا تھا۔ سوامی جی نے اپنے علم کا بہت بڑا حصہ اس کے اندر اتارا تھا۔ وہ بھی ان کا ایک فرماں بردار شاگرد ثابت ہوا تھا۔ ان کی باتیں اس کے لیے حکم کا درجہ ہوا کرتی تھیں۔ ارشادی تو جیسے سانس بھی ان سے پوچھ کر لیا کرتا تھا۔ یہ ہی

وجہ تھی کہ واپس آتے وقت سوامی جی نے اپنی بہت سی نادر کتابیں بھی تحفے میں اسے دے دی تھیں۔

ان تین سالوں میں بہت کچھ بدل چکا تھا۔ پاکستان بن چکا تھا۔ ہندوستان آزاد ہو چکا تھا۔ دھرتی کا بٹوارہ ہو چکا تھا۔ دنیا کی سب سے بڑی ہجرت ہو چکی تھی۔ سوامی جی اپنا پاٹ شالہ قراقرم کی پہاڑیوں سے اٹھا کر ہمالیہ کی پہاڑیوں پر لے گئے تھے۔ مجبوراً ارشادی کو واپس حویلیاں آنا پڑا تھا۔ اپنے شہر، اپنے گھر...... جہاں درخت، چرند، پرند تو ویسے ہی تھے۔ انسان بھی شاید ویسے ہی تھے۔ لیکن ان کے مقام تبدیل ہو چکے تھے۔

ان تین سالوں میں ارشادی نے اپنے گھر والوں کو بہت سے خط لکھے تھے۔ اور تقریباً ہر خط میں آمنہ کے بارے میں پوچھا تھا۔ لیکن گھر والوں نے اسے آمنہ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ بلکہ ارشادی کی والدہ نے تو ایک خط میں صاف صاف لکھ دیا تھا کہ وہ پھر سے آمنہ کے بارے میں کچھ نہ پوچھے۔ اگر اسے آمنہ کی اتنی ہی فکر ہے تو یہاں آ کر اس کی خبر گیری کر لے۔ اور یہاں آ کر اسے جو کچھ پتا چلا تھا وہ اس کے دل کی کھال سکیڑ دینے کے لیے کافی تھا۔

ارشادی کے قراقرم کے پہاڑوں پر جانے کے چند ماہ کے بعد آمنہ کی شادی ہو گئی تھی۔ اپنے ہی جیسے ایک مرد کے ساتھ...... جس کے چہرے کا رنگ کافی پکا تھا۔ شادی کے سال بھر بعد اس کے گھر ایک خوب صورت بیٹی نے جنم لیا تھا۔ بیٹی کی خوب صورتی پر پہلے سے شک کرتی ساس کو آمنہ پر یقین ہو چکا تھا کہ یہ لڑکی اپنے شوہر کے ساتھ باوفا نہیں ہے اور بچی اس کے بیٹے کی نہیں ہے۔ آمنہ نے یقیناً کہیں جا کر منہ کالا کیا ہے۔ آمنہ اور ارشادی کا قصہ تو کچھ کچھ سب کو ہی معلوم تھا۔ آمنہ کے لاکھ وضاحتیں دینے اور منتیں کرنے کے باوجود بھی اس کی ساس نے اسے گھر سے نکال دیا تھا۔ شوہر نے طلاق تو دی ہی تھی ساتھ ہی ساتھ بچی کو بھی چھین لیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس نے بچی کو جان سے مار دیا تھا۔ پھر وہ سارا گھرانہ بنگال چلا گیا تھا۔

''اور آمنہ......؟'' ارشادی نے ماں سے پوچھا تھا۔

''آمنہ اپنے گھر واپس آئی تو اس کے اپنے گھر والوں نے بھی اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا بھی خیال تھا کہ آمنہ نے بدکاری کی ہے۔''

''اب آمنہ کہاں ہے؟''

''اب آمنہ کا کچھ پتا نہیں ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے۔ مہینوں بعد اس کا چہرہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ذہن سے کچھ ہلکی ہو چکی ہے۔ ہنستی ہے تو ہنستی چلی جاتی ہے۔ روتی ہے تو روتی چلی جاتی ہے۔ اپنے آپ سے باتیں کرتی ہے۔ اور بلاوجہ قہقہے لگاتی ہے۔'' ارشادی کی والدہ نے بہت ڈھکے چھپے لفظوں میں ارشادی کو بتایا تھا کہ اصل میں آمنہ پاگل ہو چکی ہے۔

اور ارشادی جانتا تھا کہ آمنہ کے پاگل ہو جانے میں اس کا ہاتھ ہے۔

☆......☆......☆

باہر سورج پوری آب و تاب سے نکل آیا تھا۔ لیکن دکان میں اتنا اندھیرا تھا جیسے یہ رات کی دوست ہو۔ ارشادی نے کوئی بتی نہیں جلائی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر سے اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔ اور ماضی کو کھوج رہا تھا۔

دکان کے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ ارشادی ماضی کے خیالوں سے باہر آیا تھا۔

''کون ہے...... آجاؤ اندر......''

آہستگی سے دروازہ کھلا اور ایک نوعمر لڑکا دکان میں داخل ہوا۔ کچھ ڈرا سہما ہوا لڑکا۔

''آپ ارشادی بابا ہیں؟''

''ہاں...... تھوڑی دیر کے بعد آنا...... اتنی صبح صبح میں کسی کو کچھ نہیں بتاتا ہوں۔''

''میں ہاتھ دکھانے نہیں آیا ہوں۔''

''تو پھر کس لیے آئے ہو؟''

''میں آمنہ کا پتا کرنے آیا ہوں۔'' اس نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔

''آمنہ......؟ اس کے بارے میں مجھے کیا معلوم ہوگا۔''

''انہوں نے کہا تھا کہ حویلیاں میں آمنہ نہ ملے تو ارشادی سے اس کے بارے میں پوچھ لینا۔''

''کن لوگوں نے کہا تھا؟'' ارشادی بابا کو اس عجیب وغریب لڑکے کی عجیب وغریب باتوں پر حیرت ہوئی۔

''آمنہ کے سابقہ شوہر اور اس کے سسرال والوں نے......''

ارشادی اچھل کر اسٹول سے اترا اور لڑکے کے پاس آیا۔

''کیا بات ہے؟''

''اس کے سابقہ شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ آمنہ تک خبر پہنچا دو کہ اس نے اس کی اور ارشادی کی بیٹی کو جان سے نہیں مارا تھا۔''

''وہ میری بیٹی نہیں تھی۔ میں تو ان دنوں میں قراقرم کے پہاڑوں پر تھا۔'' ارشادی زچ ہو کر چلایا تھا۔

''وہ سب میں نہیں جانتا...... بہرحال وہ لڑکی زندہ ہے۔ آمنہ کو یہ بات بتا دیجیے گا۔''

''کہاں ہے وہ لڑکی......؟''

''انہوں نے کہا ہے کہ انہوں نے لڑکی کو لکشمی حویلی کی دہلیز پر چھوڑ دیا تھا۔''

ارشادی چپ ہو گیا تھا۔ لڑکا کچھ دیر اس کے بولنے کا منتظر رہا۔

''مجھے بس یہی پیغام دینا تھا۔ میں اب چلتا ہوں۔ آمنہ کو بتا دیجیے گا۔ اس کی لڑکی لکشمی حویلی میں ہے۔'' لڑکا کہہ کر دکان سے باہر چلا گیا تھا۔ اور ارشادی ذہن پر زور ڈالنے لگا کہ لکشمی حویلی کا نام اب کیا ہے۔ اور پھر جیسے اس کے ذہن میں ایک جھماکا ہوا تھا۔ ''دین حویلی''...... اور پھر ساتھ ہی دوسرا دھماکا ہوا تھا۔ ''صندل......!''

''تو صندل آمنہ کی بیٹی تھی؟''

یہ ایسی بات تھی، جس نے بیک وقت ارشادی کو تین چار طرح کے جذبات سے مغلوب کر دیا تھا۔

خوشی، دکھ، حیرت، ملال......

آمنہ کی بیٹی مل چکی تھی۔ وہ صندل تھی۔ جو اس کے پاس کئی بار آ چکی تھی۔ جس کا نکاح کل رات اس نے اپنے سامنے کروایا تھا۔ اور اب دونوں ہی غائب تھیں۔ صندل میرزاد کے ساتھ گم نام جگہ پر جا چکی تھی۔ اس کی واپسی نجانے کب ہونے والی تھی۔ اور آمنہ...... اس کو بھی دیکھے ہوئے کئی دن بیت چکے تھے۔

صندل اس کے پاس آتی رہی اور وہ اسے پہچان ہی نہ سکا۔ کہاں گیا اس کا علم......؟ کہاں گئی وہ ریاضت، وہ شاگردی......

اور سالوں بعد ارشادی کو لگا کہ اس نے جو سیکھا تھا، سب بے کار رہا۔

☆......☆......☆

حویلی کے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ اور کسی نے اتنے زور سے دستک دی تھی کہ ایسے جیسے باہر والا جنگ کرنے کے لیے آیا ہو۔ رات کے جاگے ہوئے حویلی کے سارے ہی مکین باہر صحن میں اکٹھے ہو گئے تھے کہ صبح ہی صبح یہ ایسا کون آ گیا تھا۔ حاجی بوا نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ اور زویا دروازے کو دھکا مار کر اندر داخل ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر سختی نظر آ رہی تھی۔ اس کے پیچھے زوہیب بھی تھا۔

''صندل کہاں ہے؟'' اس نے آتے ہی پوچھا۔

کوئی کیا جواب دیتا...... صندل کے بارے میں تو کسی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔

''کہاں ہے صندل......؟'' وہ بھڑکی تھی۔ ''بلائیں اسے......''

''وہ گھر پر نہیں ہے۔''

''کہاں گئی ہے؟''

''کہیں باہر گئی ہے۔''

"باہر گئی ہے یا گھر سے بھاگ گئی ہے۔" وہ غصے میں غرائی۔ بستامی اپنے کمرے سے نکل کر باہر آیا۔

"کون ہو تم......؟"

"میر زاد کی بہن...... جس کو اس گھر کی لڑکی نے ورغلایا ہے۔"

"صندل نے......؟"

"جی...... اسی نے ورغلایا ہے میرے بھائی کو...... کل نکاح تھا میرے بھائی کا...... اور وہ گھر سے بھاگ گیا۔ یقیناً وہ اسی حویلی میں ہے۔"

"وہ اس حویلی میں نہیں ہوسکتا، کیونکہ صندل بھی اس حویلی میں نہیں ہے۔"

"سمجھ گئی...... تو دونوں ساتھ میں بھاگے ہیں۔"

"لیکن وہ ساتھ میں کیوں بھاگیں گے۔" بستامی کو ادھورا قصہ معلوم تھا۔ اس لیے وہ کچھ نہیں سمجھ رہا تھا۔

"میں نے صندل کو اپنانے سے انکار جو کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ ایک ناجائز خون جو ہے۔" زویا تیز لہجے میں بولی۔

بستامی تو جیسے خاموش ہو کر رہ گیا تھا۔

"بولیے چاندامی...... کہاں ہے وہ......؟" زویا نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

بستامی سمیت سب چاند کو دیکھنے لگے۔

"م...... مجھے کیا معلوم......؟"

"تو پھر کسے معلوم ہوگا؟"

"کل اس کا بھی نکاح تھا۔ لیکن وہ بھی گھر سے جا چکی ہے۔"

"اسے گھر سے بھاگ جانا کہتے ہیں۔ ماں باپ کے منہ پر کالک مل کر بھاگ جانا...... لیکن سچ

اس کے تو ماں باپ کا پتا ہی نہیں ہے۔ باپ نجانے کون ہے اور ماں...... اس کا بھی علم نہیں۔'' زویا طنزیہ بولتی جا رہی تھی۔

''کیا آپ نے جانے دیا ہے دونوں کو...... آپ کی پلاننگ تھی یہ......؟''

''میں کیوں ایسا کروں گی زویا......؟''

''صندل کی خوشی کے لیے آپ کچھ بھی کر سکتی ہیں۔''

''چاند......! کیا سچ میں ایسا ہے؟ صندل کو بھگانے میں تم نے مدد کی ہے؟'' بستامی دھاڑا۔

''ن...... نہیں بستامی......! سچ میں مجھے نہیں معلوم کہ صندل کہاں ہے۔''

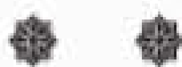
''تو پھر میں پتا چلوالوں گی۔ فکر مت کریں آپ...... اور بہت جلد پتا چلوا لوں گی۔'' زویا بستامی کی طرف ہوئی تھی۔ ''اور جیسے ہی پتا چلے گا آپ کو بھی بتا دوں گی۔ پھر آپ نے اس کا جو کرنا ہوا، کر لیجیے گا۔''

زویا وہاں سے واپس جانے کے لیے مڑی اور پھر کچھ خیال آنے پر پلٹی۔

''لیکن ایک بات یاد رکھیے گا۔ اگر صندل آپ سے رابطے میں ہے تو اسے کہہ دیجیے گا۔ میں اسے ہرگز قبول نہیں کروں گی۔ اس نے اگر میرے شادی بھی کر لی ہوئی تو پھر بھی میرے باپ کے گھر میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ اسے میرے آخر میں طلاق ہی لینا ہوگی۔''

زویا نے کچھ اس انداز میں کہا تھا کہ چاند ڈر گئی۔ پھر زویا اور زوہیب جیسے آئے تھے ویسے ہی واپس چلے گئے تھے۔

زویا کی باتوں پر چاند کا دل ہولنے لگا تھا۔



ناول تاش گھر ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 15 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 17

ٹھنڈیانی کا موسم حویلیاں کی نسبت زیادہ ٹھنڈا تھا۔ یہ علاقہ پہاڑوں کی شروعات کہلاتا تھا، اور یہاں درختوں کی بھرمار تھی۔ یہ ویسے درخت نہیں تھے جیسے حویلیاں میں ہوتے تھے بلکہ یہاں کے درخت کچھ زیادہ سبز اور کچھ زیادہ محصور کر دینے والے تھے۔ یہاں کے پرندوں کی رنگت بھی گہری تھی۔ کوے سیاہ کالے تھے اور کوئل مزید خوش نما...... ایسے جیسے یہاں کی ہر چیز خالص شکل میں ہو اور وہ جو چیزیں دیکھتی آ رہی ہو وہ ملاوٹ زدہ ہوں۔

ٹھنڈیانی کے سحر زدہ ماحول میں وہ اس طرح کھو گئی تھی کہ جیپ کے رک جانے کے باوجود اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بادلوں میں اڑ رہی ہو۔ میرزاد نیچے اتر گیا تھا اور اب اس کے نیچے اترنے کا منتظر تھا۔

''صندل......!'' میرزاد نے اس کی آنکھوں کے آگے چٹکی بجائی تھی۔ صندل چونکی تھی۔

''اترو......! ہم اپنی منزل تک پہنچ چکے ہیں۔ گھر آ چکا ہے۔''

''اوہ اچھا......! مجھے خیال ہی نہیں رہا۔''

میرزاد کے ہاتھ کا سہارا لے کر وہ جیپ سے نیچے اتر آئی تھی۔ اور کچھ فاصلے پر موجود اس گھر کو پھر سے دیکھنے لگی تھی جسے وہ پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔ گھر بدستور نامکمل تھا۔ جیسا اس نے پچھلی بار دیکھا تھا، بالکل ویسا ہی تھا۔ کرش کے بلاکوں سے گھر کی عمارت تو مکمل تیار ہو چکی تھی لیکن مزید والے کام ابھی

ادھورے تھے۔ کھڑکیاں تھیں، لیکن ان پر شیشے نہیں لگوائے گئے تھے۔ دروازے تھے اور ان پر کسی طرح کا رنگ وروغن نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ رنگ تو پورے گھر کی عمارت پر بھی نہیں کیا گیا تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ مزدور ابھی ابھی اس گھر کا کام مکمل کر کے گئے ہوں۔ ریت اور سیمنٹ کے آمیزے کے بہت سے چھوٹے بڑے دھبے اندر باہر موجود تھے۔ جنہیں بروقت صاف کیا جانا ضروری تھا۔ لیکن جو لاپروائی کی وجہ سے صاف نہیں کیے گئے تھے۔ اور اب اپنی اپنی جگہوں پر جم گئے تھے۔

"آجاؤ...... اندر آجاؤ......!"

میرزاد نے چابی سے دروازہ کھول کر اسے ایک بار پھر سے متوجہ کیا تھا جو گھر کو ایسے دیکھ رہی تھی جیسے کسی پرانے کھنڈر کو دیکھ رہی ہو۔ اپنے چہرے پر سے مایوسی کے تاثرات ختم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ گھر کے اندر چلی آئی تھی۔ اندر کی حالت باہر سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ صد شکر کہ اندر کمروں کے فرش بن چکے تھے۔ جس سے صندل کو ایک گونا تسلی ہوئی تھی۔ ورنہ وہ روز کچے پکے فرش پر جھاڑو دینے کے خیال سے ہی پریشان ہونے لگی تھی۔

"تم بیٹھو...... میں باہر سے سامان نکال کر لاتا ہوں۔" میرزاد کہہ کر ایک بار پھر سے باہر چلا گیا تھا۔

صندل چاروں طرف نظریں دوڑانے لگی تھی۔ وہ کہاں بیٹھتی؟ وہاں ایسا کچھ نہیں تھا جس پر بیٹھا جاتا...... کونے میں ایک اسٹول پڑا ہوا تھا جو شاید گھر کی تعمیر کا کام کرنے والے مزدوروں کے استعمال میں رہ چکا تھا۔ کیونکہ وہ سیمنٹ اور ریت کے آمیزے سے ڈھکا ہوا تھا۔ جو اس پر سوکھ کر لکڑی کا ہی حصہ لگتا تھا۔

میرزاد دو بیگ لیے اندر آیا تھا۔ جس میں ایک میں اس کے خود کے کپڑے تھے اور دوسرے میں صندل کے...... جو چاند امی نے جلدی میں بیگ میں بھر دیے تھے۔ دوسرے چکر میں میرزاد کے ہاتھ میں وہ والا سامان تھا جو ارشادی بابا نے انہیں الوداع کرتے وقت دیا تھا۔

"یہ لو...... اسے کچن میں جا کر رکھو......!" صندل نے میرزاد کے ہاتھ سے وہ سامان پکڑ لیا تھا

اور کچن کی طرف چلی گئی تھی۔ کچن میں آ کر اسے مزید مایوسی ہوئی تھی۔ کچن بھی ویسا ہی تھا جیسا کہ پورا گھر...... پلستر تو تھا لیکن نہ پینٹ ہوا تھا اور نہ ہی کوئی لکڑی کا کام کروایا گیا تھا۔ صندل نے سارا سامان شیلف پر رکھ دیا تھا جس پر ابھی پتھر لگنا باقی تھا۔ اور باہر گئی تھی۔ میرزاد گندے اسٹول پر بیٹھ کر اپنے شوز اتارنے میں لگا تھا۔

''میر! کچن میں تو بالکل بھی کام نہیں ہوا...... مجھے لگتا ہے کہ گیس بھی نہیں ہے۔''

''گیس اس پورے علاقے میں نہیں ہے۔''

''کیا......؟'' اسے حیرت ہوئی تھی۔ ''یہاں کے لوگ کھانا کیسے بناتے ہیں؟''

''لکڑیوں پر......!'' میرزاد کی بات پر اس کے چہرے کا تو جیسے رنگ ہی اڑ گیا تھا۔

''لکڑیوں پر......؟'' وہ بھلا اپنی حیرت پر کیسے قابو رکھتی۔

''ہاں......! لیکن سلنڈر بھی مل جاتا ہے۔ تم پریشان مت ہو۔ میں کرتا ہوں کچھ......'' میرزاد نے کچھ پریشان لہجے میں کہا تھا۔

صندل کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی شکوے شروع کر دیے تھے۔ میرزاد خود پریشان تھا۔ اور اس نے اپنی باتوں سے اسے مزید پریشان کر دیا تھا۔

''کوئی بات نہیں...... میں لکڑیوں پر بھی بنا لوں گی۔''

''دو ہی دن میں رنگت کالی ہو جائے گی۔'' وہ مسکرایا تھا۔

''تم فکر مت کرو...... میں خوب رگڑ رگڑ کر منہ دھو لیا کروں گی۔'' وہ کہہ کر خود ہی ہنسی تھی۔

''تمہیں کھانا بنانا تو آتا ہے نا؟''

''کچھ زیادہ نہیں...... لیکن تھوڑا بہت بنا لیتی ہوں۔''

''دیکھ لینا...... ارشادی بابا کا سامان ضائع مت کر دینا۔'' میرزاد نے ہنستے ہوئے کہا تھا اور

صندل نے نوٹ کیا تھا کہ میرزاد کی ہنسی بہت کھوکھلی تھی۔

''تمہیں کیا ہوا ہے میر؟''

''کیا ہوا ہے؟'' وہ شوز اتار کر ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں ہی چلتا ہوا اس کے پاس آیا تھا۔

''پریشان دکھ رہے ہو۔''

''نہیں تو......!'' اس نے بات کو ٹالنے والے انداز میں کہا تھا اور جیسے بلا مقصد کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ باہر دیکھ رہا تھا یا نہیں، اس متعلق صندل کو شک تھا۔

''بتاؤ میر...... کیا بات ہے؟'' صندل اس کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ کھڑکی کے سامنے بڑا سا درخت تھا۔ وہاں کوئی ایسا منظر نہیں تھا جسے دیکھا جاتا۔

''میں زویا آپی اور تانیہ کا سوچ رہا ہوں۔'' میرزاد نے صاف گوئی سے کہا تھا۔ صندل کے چہرے کے رنگ بدلے تھے۔ زویا آپی کی تو خیر تھی لیکن تانیہ کے نام پر صندل کو ناگواری محسوس ہوئی تھی۔

''تانیہ کا کیوں......؟''

''پتا نہیں کیوں...... لیکن تانیہ بھی میرے ذہن میں آ رہی ہے۔''

''کیا تم تانیہ کو چاہنے لگے تھے میر؟'' صندل نے بے جھجک ہو کر پوچھ لیا تھا۔ میرزاد نے رخ بدل کر حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''کیسی باتیں کر رہی ہو تم صندل......؟''

''نہیں...... مجھے لگا شاید......''

''اسے چاہتا تو تمہارے پاس آتا ہی کیوں......؟''

''جو بھی ہے، اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔''

''شاید......!'' اور وہ اس سے زیادہ بھلا اور کیا کہتی...... اسے تانیہ سے ذرا برابر ہمدردی محسوس

نہیں ہو رہی تھی۔

دونوں میں چند لمحوں کے لیے خاموشی در آئی تھی۔ میر ایک بار پھر سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا تھا۔ جہاں موٹے تنے والا درخت کسی دیو کی طرح ایستادہ تھا۔ پھر صندل نے ہی بات شروع کی تھی۔

''خیر جو ہونا تھا اب ہو چکا ہے میر...... ہمیں ماضی کا سوچنے کے بجائے حال کا سوچنا چاہیے۔ یہ نامکمل گھر، روزگار...... ہمیں بہت کچھ سوچنا ہے۔''

''ہاں...... یہ تو ہے۔''

''تم ایسا کرو کہ مجھے کہیں سے ایک جھاڑو لا دو۔ میں یہاں کی صفائی تو شروع کروں۔ روز ایک کمرا کروں گی تو پھر بھی نجانے کتنے دنوں میں یہ گھر صاف ہوگا۔''

''میں کہاں سے لا کر دوں۔ یہاں کسی کو نہیں جانتا ہوں۔ اور تم نے دیکھا تو ہے کہ یہاں گھر کتنی دور دور ہیں۔''

''پھر تم ایسا کرو کہ باہر سے خشک جھاڑ جھنکار اکٹھا کر کے لا دو۔ میں اس کا جھاڑو بنا لوں گی۔''

''کیا سچ میں؟'' میرزاد نے کچھ حیرت اور کچھ بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''ہاں...... چاند امی نے بچپن میں ایک کہانی سنائی تھی۔ جس میں لڑکی ایسا ہی کرتی ہے۔''

''اور بعد میں جادوگرنی بن جاتی ہے۔'' وہ ہنسا تھا۔

''نہیں...... شہزادی......!'' وہ بھی ہنسنے لگی تھی۔ ''چلو اب جلدی کرو...... ہمیں بالکل بھی دیر نہیں کرنی ہے۔ بہت کام ہونے والا ہے اس گھر کا...... سستی کی تو مہینوں میں ختم نہیں ہوگا۔''

میرزاد گھر سے باہر چلا گیا تھا۔ اس نے بہت سی خشک ٹہنیاں، خشک پتے اور جو جو اسے سمجھ میں آیا تھا سب اکٹھا کر لیا تھا۔ اور وہ لا کر گھر کے صحن میں لا پھینکا تھا۔

''یہ ٹھیک کیا کہ تم اتنا سب کچھ لے آئے ہو۔ یہ سوکھی لکڑیاں آگ جلانے کے کام بھی آئیں گی۔

لیکن فی الحال جھاڑو بنانے کی کوشش کرتی ہوں، تب تک تم ایسا ہی سامان باہر سے مزید اکٹھا کر لاؤ۔"

میر زاد ایک بار پھر سے گھر سے باہر چلا گیا تھا۔ صندل جھاڑو بنانے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ اس نے پتلی پتلی ٹہنیوں کو اکٹھا کیا تھا۔ اور جھاڑو بنانے کی اپنی سی کوشش کی تھی لیکن اس کے ابتدائی استعمال سے ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس نے بہت سخت ٹہنیوں کا استعمال کر لیا ہے۔ اس نے جھاڑو کو کھولا تھا اور پھر مزید باریک اور لچک دار ٹہنیوں کو قرینے سے اوپر تلے رکھ کر اس کو باندھ دیا تھا۔ اس بار کوشش کچھ بہتر تھی۔ جھاڑو صفائی بھی کر رہا تھا اور اسے تھکا بھی نہیں رہا تھا۔ ٹھنڈیانی کی آب و ہوا ویسے بھی نمی والی ہوتی ہے۔ گرد صاف تو ہو رہی تھی لیکن ہوا میں اڑ نہیں رہی تھی۔ جس سے اسے کام کرتے ہوئے الجھن کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔

میر زاد نے کچن میں آگ جلالی تھی لیکن آگ جلانے کے بعد اسے احساس ہوا تھا کہ آگ کو مصرف میں لانے کے لیے ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ ارشادی بابا نے انہیں کھانے پینے کا سامان تو دیا تھا لیکن کھانا پکانے کے لیے برتن نہیں دیے تھے۔

"صندل! ہمارے پاس کوئی ایسا برتن نہیں ہے جس پر کھانا بنایا جا سکے۔" کچن سے باہر نکل کر اس نے کمرے کی صفائی کرتی ہوئی صندل سے کہا تھا۔

"وہ ہی تو میں سوچ رہی تھی۔ خیر اس کے لیے ہمیں پاس پڑوس سے ہی مدد لینی ہوگی میر...... کیونکہ یہاں تو دور دور تک بازار بھی نہیں ہیں۔" میر زاد صندل کی بات سے متفق نظر آیا تھا۔

ٹھنڈیانی کے لوگ بہت اچھے تھے۔ وہ شہر والوں کی طرح بے دید نہیں ہوئے تھے۔ انہیں جب معلوم ہوا تھا کہ ان کے قریب میں ایک بے یار و مددگار جوڑا قیام کرنے آیا ہے تو انہوں نے دل کھول کر مدد کی تھی۔ بہت سے برتن اکٹھے ہو گئے تھے۔ دریاں، تکیے، لحاف، جس کی جتنی استطاعت تھی اس نے دینے میں بخل سے کام نہیں لیا تھا۔

کمرے کی صفائی کرنے کے بعد صندل نے ایک دری کو فرش پر بچھا کر دونوں کے بیٹھنے کا مناسب انتظام کر لیا تھا۔ پھر دونوں نے مل کر کھانا کھا لیا تھا۔ جو کھانے کے نام پر کچھ ملغوبہ سا تھا لیکن نجانے کیوں انہیں بہت لذیذ لگ رہا تھا۔

اگلے دن اس نے کچن اور دوسرا کمرا صاف کیا تھا۔ اور پھر اس سے اگلے دن باقی کے حصے...... آنے والا ہر دن ایک جیسا تھا۔ گرد سے اٹا ہوا...... کچھ الجھن زدہ اور کچھ پر جوش...... کچھ لطف دیتا ہوا اور کچھ اداس کر دینے والا......

میرزاد کے پاس کچھ نقد رقم تھی۔ وہ بازار سے گھر کا سامان لا سکتا تھا لیکن ابھی اس کا بازار جانا مناسب نہیں تھا۔ اس لیے وہ دونوں گھر میں قید تھے۔ فی الحال پاس پڑوس سے مانگے گئے برتن اور باقی چیزوں پر ان کا اچھا گزارا ہو رہا تھا۔ ان دنوں عجیب سی زندگی گزر رہی تھی۔ دونوں ایک اہم بات بھولے ہوئے تھے کہ یہ ان کی شادی کے شروع کے دن ہیں جو بہت سہانے ہونے چاہییں۔

☆......☆......☆

بڑے ہال کی چھت پر نصب ہزاروں چھوٹے شیشوں کے عدسوں میں ایک وجود کا عکس متحرک تھا۔ یہ وجود روشن بیگم کا تھا جو بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہی تھیں۔ ان کے جسم پر چڑھے ہوئے زیور کمرے میں ایک ترنم پیدا کر رہے تھے۔ روشن بیگم کی بہت سی خاصیتوں میں ایک یہ بھی خاصیت تھی کہ وہ کسی بھی طرح کے حالات کو اپنی ظاہری چمک دمک پر حاوی نہیں ہونے دیتی تھیں۔ وہ اپنے بناؤ سنگھار میں ناغہ نہیں کرتی تھیں۔ انہوں نے تو اپنی اکلوتی بہن کے مرنے پر بھی سفید لباس کے ساتھ زیورات کی ایسی میچنگ کی تھی کہ سب جنازے کو چھوڑ کر انہیں دیکھتے رہے تھے۔

صندل اور کمال کے حوالے سے جو جو ہوا تھا اس پر انہیں غصہ تو تھا، لیکن اتنا ہی جوان کا ذہن سہولت سے سہن کر سکے۔ اس بے چین انداز میں کمرے میں ٹہلنے میں بھی ایک ادا تھی۔ سالوں بعد ایک

لڑکی نے انہیں ٹکر دی تھی۔ وہ اس صورت حال سے لطف اندوز بھی ہو رہی تھیں۔

کافی دیر ہو چکی تھی، انہیں بستامی کو پیغام بھجوائے ہوئے کہ وہ ان سے آ کر ملے...... اور بستامی ابھی تک وہاں نہیں پہنچا تھا۔ انہیں بستامی پر غصہ آنے لگا تھا۔ وہ لڑکے کو بھیج کر پھر سے دین حویلی پیغام بھجوانے ہی لگی تھیں جب انہیں سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز سنائی دی تھی۔ یہ یقیناً بستامی ہی تھا۔

شیشے کے کام والے بڑے کمرے میں بستامی کچھ جھجکتے ہوئے داخل ہوا تھا۔ اسے روشن بیگم کے متوقع غصے کا ڈر تھا۔

''بستامی! تم اتنی دیر سے آئے ہو۔ میں کب سے تمہاری منتظر ہوں۔'' روشن بیگم اسے دیکھتے ہی بھڑکی تھیں۔ ''تمہیں میرا کچھ خیال ہے یا نہیں...... کہاں مصروف تھے تم؟''

''کہیں نہیں...... بس آپ سے ملتے ہوئے ڈر رہا تھا۔''

بستامی نے صاف گوئی سے کہہ دیا تھا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا تھا کہ روشن بیگم کا غصہ کچھ کم ہوا تھا۔ بستامی ان سے ڈرتا تھا، اس بات نے ان کی حاکمیت پسندی کو تقویت دی تھی۔ اندر ہی کہیں ان کا دل مسکرایا تھا۔ اور وہ غصے کو رفع کرتے ہوئے ایک جگہ پر بیٹھ گئی تھیں۔

''ڈرنے سے کیا ہوگا بستامی...... صندل تمہاری موجودگی میں اس گھر سے بھاگ گئی۔ میری تو اس بات پر حیرت نہیں جا رہی۔''

''مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ ایسا کرے گی۔ یہ رشتہ اس کی مرضی سے طے ہوا تھا۔'' بستامی بھی کچھ جھجکتے ہوئے روشن بیگم کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔

''پھر وہ بھاگ کیوں گئی؟''

''اس کی جس کے ساتھ مرضی تھی، اس کے ساتھ کچھ مسائل تھے۔''

''اور وہ مسئلے عین نکاح والے دن ہی حل ہونے تھے۔'' روشن بیگم کا غصہ کم تو ہو چکا تھا لیکن لہجے

کی تیزی بدستور موجود تھی۔

"کیا کمال بول رہا تھا؟"

"نہیں...... وہ خاندانی آدمی ہے۔ وہ بولتا نہیں ہوتا...... خاموش ہو جایا کرتا ہے۔ اس کے مزاج کو اچھے سے جانتی ہوں میں...... مجھے اس کی خاموشی سے ہی ڈر لگا رہتا ہے۔ وہ تو میرے اس کے ساتھ پرانے تعلقات ہیں، اس لیے لحاظ کر لیا اس نے میرا...... ورنہ اس کے آدمی آ کر میری بوٹیاں بنا دیتے۔"

"کس کو معلوم تھا کہ صندل ایسا کرے گی۔"

"وہ یہ کام اکیلے نہیں کر سکتی، یقیناً چاند نے اس کی مدد کی ہو گی۔"

"نہیں چاند نے ایسا نہیں کیا...... وہ خود صندل کے گھر سے بھاگ جانے پر بہت دکھی ہے۔"

"ڈرامہ کرتی ہے۔ تم آج تک اپنی بہن کی چالاکیوں کو سمجھ ہی نہیں سکے ہو۔"

"شاید اس کی مدد سے ہی بھاگی ہو۔ لیکن اب صندل کا واپس آ جانا بھی تو ہمارے لیے بے کار ہے۔ کمال اسے قبول نہیں کرے گا۔"

"اور اس کا وہ سونا بھی ہمارے لیے بے کار ہو چکا ہے جو اس نے صندل کے بدلے میں دیا تھا۔" روشن بیگم نے کہا تھا اور بستامی کو جیسے اس لمحے میں اپنے اصلی نقصان کا اندازہ ہوا تھا۔

"کچھ سوچیے روشن بیگم...... گھر آئی چیز کو کون واپس کرتا ہے۔"

"کمال کا سونا اسے واپس ہی کرنا ہو گا۔ اور کیا کیا جا سکتا ہے بھلا......"

دونوں میں چند لمحوں کی خاموشی رہی تھی۔ بستامی ہارے ہوئے جواری کی طرح نظر آنے لگا تھا۔ اس کی تجوری ایک بار پھر سے خالی ہونے والی تھی۔ صندل نے اس کے ساتھ بہت برا کیا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ صندل کو ڈھونڈ کر جان سے مار دے۔

"میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔"

''وہ کیا......؟'' مایوسی میں بستامی نے امید بھری نظروں سے روشن بیگم کو دیکھا تھا۔

''ہم صندل کی جگہ حویلی کی کسی اور لڑکی کو کمال کے حوالے کر دیتے ہیں۔'' روشن بیگم نے کہا تھا۔

بستامی کی آنکھیں روشن ہوئی تھیں۔

''ہاں...... یہ ٹھیک ہے۔ لیکن کیا کمال مان جائے گا؟''

''وہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ کمال کو میں راضی کر لوں گی۔ تم حویلی کی لڑکی کو رخصت کرنے کی تیاری کرو۔''

''کس کو......؟''

''ہمم...... میرے خیال سے تمہاری زہرہ پھوپھو کی چھوٹی بیٹی تعبیر بہتر رہے گی۔ وہ خوب صورتی میں صندل جیسی تو نہیں...... لیکن...... کم بھی نہیں ہے۔''

اور روشن بیگم کی ایک بات تھی کہ ان کی یادداشت بہت اچھی تھی۔ وہ بس ایک بار بستامی کے سارے گھرانے سے ملی تھیں۔ اور انہیں وہاں کا ایک ایک فرد ایسے یاد تھا جیسے وہ ان کے اپنے کوٹھے کی لڑکیاں ہوں۔

''ٹھیک ہے۔ میں آج ہی گھر جا کر بات کرتا ہوں۔''

''سب ویسا ہی ہوگا جیسے پہلے ہو رہا تھا۔ جھوٹا نکاح، جھوٹی رخصتی...... بعد میں بے شک بتا دینا کہ تعبیر کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ کیونکہ تعبیر ایک بار وہاں چلی گئی تو کمال اسے واپس یہاں نہیں آنے دے گا۔''

''ٹھیک ہے...... جیسا آپ کہیں......'' بستامی کو بھلا کسی بات پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

☆......☆......☆

راز کو راز ہی رہنے دو راز

ہر راز سے پردہ اٹھایا نہیں کرتے

چاند خانساماں کو رات کے کھانے کی ہدایت دے کر باہر نکلی تھی اور دلان سے ہوتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف جانے لگی تھی جب یہ آواز اس کے کانوں میں پڑی تھی۔ وہ رک گئی تھی۔ رحبانی ستون کی اوٹ سے باہر نکل کر اس کے سامنے آیا تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ کچھ زہر خند سے انداز میں...... چاند نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

راز کو راز ہی رہنے دو رازؔ

ہر راز سے پردہ اٹھایا نہیں کرتے

رحبانی نے پھر سے لہکتے ہوئے رفیق رازؔ کے شعر کو گنگنایا تھا۔ اس کے لہجے میں ایسا کچھ تھا کہ چاند کو گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔

"کیا...... کیا کہنا چاہ رہے ہو رحبانی......؟"

"انجان تو مت بنو...... جیسے میری بات کو سمجھ ہی نہیں سکی ہو۔" رحبانی نے طنزیہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"نہیں...... میں تمہاری بات کو نہیں سمجھ سکی ہوں۔"

"کس کو بے وقوف بنا رہی ہو چاند...... مجھے...... رحبانی کو...... میں تمہاری ایک ایک رمز سے آگاہ ہوں۔" رحبانی ترنگ میں بولا تھا۔

چاند اس کی شکل دیکھتی رہ گئی تھی۔

دل منافق تھا، افسردہ تھا، افسردہ ہی رہے گا

ضمیر فروشوں کا دل مردہ تھا، مردہ ہی رہے گا

رحبانی تو جیسے آج الگ ہی فضاؤں میں تھا۔

"کوئی کام کی بات کرنا ہے تمہیں رحبانی......"

"کام کی بات ہی تو کر رہا ہوں۔ تم سمجھ ہی نہیں رہی ہو۔ تمہاری پرسکون آنکھیں...... مطمئن چہرہ......تم بستامی کو تو بے وقوف بنا سکتی ہو......لیکن مجھے نہیں...... میں جانتا ہوں کہ صندل کو تم نے گھر سے بھاگ جانے میں مدد کی ہے۔"

رحبانی نے کہا تھا اور چاند کو اپنا سانس اکھڑتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

"ایسا کچھ نہیں ہے۔" چاند نے تھوک نگلتے ہوئے کہا تھا اور پھر جلدی سے اپنے کمرے میں جانے کو ہوئی تھی۔ رحبانی نے جلدی سے آگے ہو کر اس کا راستہ روکا تھا۔

"بتاؤ......کہاں ہے صندل اب؟"

"کیا کہہ رہے ہو رحبانی......صندل کے بارے میں مجھے کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔"

"چلانے سے حقیقت چھپ نہیں جائے گی۔"

"تمہیں جو سوچنا ہے سوچ لو......" وہ پھر سے اپنے کمرے میں جانے کو ہوئی تھی اور رحبانی تھا کہ اسے جانے ہی نہیں دے رہا تھا۔

"تم بہت چالاک ہو چاند...... بہت زیادہ...... بلکہ مکار......تم نے کتنی ہوشیاری دکھائی نا...... صندل کو بھگا دیا اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہونے دی۔"

"فضول کی باتیں مت کرو مجھ سے رحبانی......"

"میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔" رحبانی نے انکشاف کیا تھا۔ چاند کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔

"میں اس وقت باغ میں تھا۔ جب تم دونوں کو کھڑکی کے راستے بھگا رہی تھیں۔" رحبانی نے پورا منظر بتا دیا تھا۔ اب اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔ چاند کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ وہ تو جیسے سانس لینا ہی بھول چکی تھیں۔ رحبانی کو سب دیکھتے ہوئے جیسے مزا آ رہا تھا۔

"فکر مت کرو...... میں بستامی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

"کیا نہیں بتاؤ گے؟"

بستامی حویلی کے دروازے پر ظاہر ہوا تھا۔ اس نے رحبانی کی آخری بات سن لی تھی۔ رحبانی اور چاند دونوں نے ہی اسے دیکھا تھا۔ پھر چاند نے منت بھرے انداز میں رحبانی کو دیکھا تھا جیسے کہہ رہی ہو کہ وہ اس بارے میں بستامی کو کچھ نہ بتائے۔ رحبانی مسکرایا تھا۔

"نہیں...... کچھ نہیں...... بس آپس کی بات چیت کر رہے تھے۔"

"رحبانی! تم زہرہ پھوپھو کو میرے کمرے میں لے کر آؤ...... بلکہ ایسا کرو باقی سب کو بھی لے آؤ......اور چاند تم بھی میری بات سنو......"

"ٹھیک ہے۔ میں آتی ہوں۔"

بستامی اپنے کمرے کی طرف چلا گیا تھا۔ رحبانی نے پھر سے چہرے پر مسکراہٹ سجالی تھی۔ چاند نے نظریں چرائی تھیں اور بستامی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

☆......☆......☆

بستامی نے آتش دان میں چھوٹی بڑی لکڑیوں کو ڈال کر آگ کو مزید بھڑکا لیا تھا۔ کمرا کل سے بند تھا اور کافی ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ عثمان چھٹی پر تھا۔ وہ اپنے گاؤں گیا ہوا تھا ورنہ بستامی کے ایسے کام اسی کے ذمے تھے۔ یہ ہی وجہ تھی کہ بستامی کے کمرے میں کوئی نہیں آتا تھا۔ آگ جلانے کے بعد وہ اٹھا تھا اور آتش دان کی شیلف پر موجود عقاب کے ماڈل کو غور سے دیکھنے لگا تھا۔ چاند اس دوران خاموش رہی تھی۔ حویلی کے باقی مکین ایک ایک کر کے وہاں اکٹھے ہونے لگے تھے۔

"کیا بات ہے بستامی...... کیوں بلایا ہے ہم سب کو یہاں پر؟" شکیلہ پھوپھو نے آتے ہی پوچھا تھا۔ بستامی پلٹا تھا۔

''آپ سب جانتے ہیں کہ پچھلے دنوں ہمارے گھر میں کیا ہوا ہے۔ ہماری کس قدر بدنامی ہوئی ہے۔''

''ہاں...... جانتے ہیں۔'' شکیلہ پھوپھو نے چور آواز میں کہا تھا۔

''اس لیے آج کے بعد اس حویلی میں وہی ہوگا جو میں کہوں گا۔ گھر کی کوئی عورت میری مرضی کے بنا یہاں سے باہر نہیں جائے گی۔ خاص طور پر گھر کی لڑکیاں...... اور گھر میں کوئی غیر مرد نہیں آئے گا۔''

سب چند لمحوں کے لیے چپ ہو گئے تھے۔ پھر چاند بولی تھی۔

''ٹھیک ہے، جیسا تم چاہو......'' چاند نے کہا تھا۔

کوئی اور موقع ہوتا تو چاند بستامی کو سنا دیتی کہ بے عزتی کی بات وہ کیسے کر سکتا ہے۔ جس کے کومل سے میل ملاقات کی وجہ سے حویلی کی پہلے ہی بہت بے عزتی ہو چکی ہے۔

''کمال بہت ناراض ہوا ہے۔ وہ خاندانی لوگ تھے۔ انہیں بہت بے عزتی محسوس ہوئی ہے۔ صندل کے بھاگ جانے سے......''

کوئی کیا بولتا...... سب چپ رہے۔

''میں نے اس کا ایک حل سوچا ہے۔''

''کیا......؟'' چاند نے پوچھا تھا۔ بستامی کے حل عجیب ہوتے ہیں۔

''میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تعبیر کی شادی کمال کے ساتھ کر دیتے ہیں۔'' بستامی نے سب کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تھا۔

سب لمحے بھر کے لیے چپ ہو کر رہ گئے تھے۔ تعبیر کو اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو وہ کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔

''لگتا ہے کہ شرما گئی ہے۔'' بستامی نے خود ہی قیاس کر لیا تھا۔

زہرہ پھوپھو کے چہرے پر واضح تھا کہ انہیں بستامی کی بات زیادہ پسند نہیں آئی ہے۔

''آپ کیا کہتی ہیں اس بارے میں زہرہ پھوپھو......؟''بستامی نے زہرہ پھوپھو سے پوچھا تھا۔

''لڑکیو......!تم سب جاؤ یہاں سے۔'' زہرہ پھوپھو نے کھڑی سب لڑکیوں سے کہا تھا۔سب جیسے وہاں سے چلے جانے کے اشارے کی ہی منتظر تھیں۔فوراً سے وہاں سے کھسک گئی تھیں۔پھر زہرہ پھوپھو بستامی سے مخاطب ہوئی تھیں۔

''میں اپنی بیٹی کی شادی اتنی دور نہیں کرنا چاہتی بستامی......''

''کون سا دور...... یہ ساتھ ہی تو کشمیر ہے۔''

''میری زندگی میں میرا شوہر نہیں ہے۔صرف دو بیٹیاں ہیں۔میں نہیں چاہتی کہ ان میں سے کسی ایک کی شکل دیکھنے کو ترس جاؤں......میں تعبیر کی شادی کہیں پاس ہی کرنا چاہتی ہوں۔''

زہرہ پھوپھو کی بات پر بستامی کے چہرے پر غصہ جھلکا تھا جس سے زہرہ سے زیادہ تہمینہ ڈر گئی تھیں کیونکہ وہ بستامی کا ایک اور روپ دیکھ چکی تھیں۔

''چاند......!تم کچھ سمجھاؤ پھوپھو کو......''

''میں کیا سمجھا سکتی ہوں بستامی......پھوپھو کی اپنی مرضی ہے۔''

''آپ سوچ لیں پھوپھو......رشتہ بہت اچھا ہے۔''

''جانتی ہوں...... چاند کی تسلی ہے تو رشتہ واقعی ہی میں اچھا ہو گا۔لیکن وجہ میں تمہیں بتا چکی ہوں۔میں اپنی بیٹی کی شادی اتنی دور نہیں کرنا چاہتی۔''

''یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے؟''

''ہاں......!''

''ٹھیک ہے......جیسے آپ کی مرضی......تعبیر آپ کی بیٹی ہے۔میں اس کی زندگی کا فیصلہ خود سے کیسے لے سکتا ہوں۔''بستامی چلتا ہوا زہرہ پھوپھو کے پاس آیا تھا۔

''کل صبح گاڑی آجائے گی۔ تب تک تیاری کر لیجیے گا۔'' بستامی نے ان کے کان کے پاس آکر جیسے سرگوشی کی تھی۔

''کس چیز کی تیاری......؟'' زہرہ پھوپھو نے پوچھا تھا۔ باقی سب بھی کچھ کچھ حیران تھے۔

''آپ کو اپنی بیٹیوں کو لے کر یہاں سے جانا ہوگا کیونکہ یہ گھر میرے باپ کا ہے اور میں بتا چکا ہوں کہ اس پر بس میرا حکم چلے گا۔'' بستامی نے کہا تھا۔

زہرہ پھوپھو حیرت زدہ بستامی کو دیکھنے لگی تھیں۔ تہمینہ، شکیلہ اور چاند بھی...... بستامی کمرے سے باہر جانے کے لیے آگے بڑھا تھا۔ پھر دروازہ کے عین درمیان میں رک کر اس نے رخ پلٹے بنا ہی چاند سے کہا تھا۔

''چاند......! زہرہ پھوپھو سے سارا حساب کتاب لے لینا...... جو جو ہمارا ان پر اور ان کی بیٹیوں پر خرچ ہوا ہے۔ تم حساب کتاب اچھا کر لیتی ہو۔ اس لیے تم سے کہہ رہا ہوں۔ میں رات کو دیر سے گھر آؤں گا۔''

بستامی کہہ کر باہر چلا گیا تھا۔ اور سب ایک دوسرے کو ایسے دیکھنے لگے تھے جیسے شیش ناگ دیکھ رہے ہیں۔



ریت کی طرح کی دکھتی دیوار پر سفید پینٹ اپنی پرت چھوڑنے لگا تھا۔ اور وہ یک ٹک دیوار کو دیکھنے لگی تھی۔ یہ ایک نامکمل گھر کو مکمل کرنے کی طرف اس کا پہلا قدم تھا۔ میر زاد نے اس سے کہا بھی تھا کہ وہ آکر سب خود سے کر لے گا لیکن صندل سے صبر نہیں ہوا تھا۔ وہ پینٹ کے ڈبے خود ہی کھول کر بیٹھ گئی تھی اور پینٹ کرنے لگی تھی۔ جہاں جہاں تک اس کا ہاتھ جاتا رہا تھا وہ کرتی رہی تھی۔ پھر اس نے ایک اسٹول رکھ لیا تھا۔ اور دیوار کو اوپر تک پینٹ کرنے لگی تھی۔ یہ کام اس نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا اور پہلی

بار کرنا اسے بے حد اچھا لگ رہا تھا۔

''ارے...... یہ کیا ہو رہا ہے؟'' میرزاد نجانے کب وہاں آ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رنگ و روغن کا کچھ مزید سامان تھا۔

''دیکھ نہیں رہے...... میں پینٹ کر رہی ہوں۔''

''میں نے کہا تھا کہ میں کرلوں گا۔''

''ہاں...... لیکن مجھ سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔ دیکھو...... تمہارا کتنا کام میں نے کر دیا ہے۔''

''تم نے میرا کام بڑھا دیا ہے۔'' وہ سامان سائیڈ پر رکھ کر اپنے کف فولڈ کرنے لگا تھا۔

''وہ کیسے؟''

''پہلے ہمیشہ چھت پر پینٹ کرتے ہیں۔ پھر دیواروں پر...... کیونکہ چھت پر پینٹ کرتے وقت پینٹ کی چھینٹیں دیواروں پر پڑتی ہیں۔ اور تم پہلے دیواریں پینٹ کرنے لگی ہو۔''

''اوہ...... مجھے تو اس بات کا خیال ہی نہیں رہا۔''

''چلو...... اترو نیچے...... میں کرتا ہوں۔ تم کھانے کی تیاری کرو۔''

''تم آج کھانے کے لیے کیا لائے ہو؟'' وہ اسٹول سے نیچے اتر آئی تھی۔

''مرغا لایا ہوں۔ باہر بندھا ہوا ہے۔ تم اسے ذبح کر کے اس کی کھال اتارنے کی کوشش کرو۔''

''کیا......؟'' صندل نے چیخ مارنے کے سے انداز میں کہا تھا۔ میرزاد اونچی آواز میں ہنسنے لگا تھا۔

''مذاق کر رہا ہوں۔ گوشت کٹوا کر ہی لایا ہوں۔ شاپر میں موجود ہے، تم بنانے کی تیاری کرو۔''

''اللہ......! تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔'' شاپر پکڑ کر وہ کچن میں جانے لگی تھی۔

''آج اچھا بنا لو گی نا......؟''

''کوشش کروں گی۔'' اس نے کچھ منہ بناتے ہوئے کہا تھا۔

کھانا بنانے کے خیال سے ہی اسے الجھن ہونے لگتی تھی۔ اسے کھانا بنانا نہیں آتا تھا۔ وہ اپنے طور پر اچھا بنانے کی کوشش کرتی تھی لیکن بات نہیں بن رہی تھی۔ چاند نے اسے کبھی کھانا بنانا سکھانے کی طرف توجہ ہی نہیں دی تھی۔ ان کے گھر میں شروع سے کھانا خانساماں بنایا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ چاند نے اس کی شادی بھی ایسے ہی گھرانے میں کرنی تھی جہاں خانساماں موجود ہو۔ انہیں نہیں اندازہ تھا کہ حالات بدل جائیں گے اور صندل کو بھی کہاں احساس تھا کہ شادی کے بعد کے خوش گوار دن وہ اس طرح کے حالات میں بسر کرے گی۔

اس نے بہت دل سے گوشت کا سالن بنایا تھا۔ اسے مزید بہتر کرنے کے لیے اس نے اس میں کچھ اضافی مسالے ڈال دیے تھے۔ ساتھ میں اس نے چپاتیاں بنائی تھیں جو چپاتی کم اور خمیرہ نان زیادہ لگ رہی تھیں۔ فرش پر اخبار بچھا کر اس نے دستر خوان سجا دیا تھا۔ میر زاد ہاتھ دھو کر دستر خوان پر بیٹھا تھا۔ اس نے پلیٹ میں سالن ڈالا تھا اور پھر اسے چپاتی سے کھانا شروع کیا تھا۔

''کیسا بنا ہے؟''

''اچھا بنا ہے۔'' اس نے کھانے کو منہ میں گھماتے ہوئے کہا تھا۔ صندل نے بھی کھانا شروع کیا تھا۔ اور تب اسے معلوم ہوا تھا کہ میر زاد جھوٹ بول رہا ہے۔ کھانا مناسب کی حدود کو تو چھو رہا تھا لیکن اچھا نہیں بنا تھا۔

''تم میرا دل رکھنے کو جھوٹ بول رہے ہو میر...... کھانا تو بس مناسب بنا ہے۔''

''پھر کیا ہوا...... شروع میں سب کام مناسب ہی ہوتے ہیں۔ آہستہ آہستہ سب بہتر ہو جاتا ہے۔'' میر زاد نے پیار سے کہا تھا۔ صندل جیسے اداسی سے مسکرائی تھی۔

''تمہیں کیا ہوا ہے صندل......؟''

''میں پریشان ہو رہی ہوں میر...... تین چار باتیں اکٹھی ہو چکی ہیں۔ یہ گھر، میرا پھوہڑ پن، سب

سے چھپتے پھرنا...... اور چاندامی...... جو کہ مجھے بہت یاد آ رہی ہیں۔'' بات کرتے ہوئے وہ مزید اداس ہو چکی تھی۔ ''ہماری شادی عام حالات میں ہوئی ہوتی تو یقیناً ہمیں ان حالات کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔''

''آزمائش انسانوں پر ہی آتی ہے صندل...... جو جو باتیں تم نے کی ہیں، وہ سب ٹھیک ہو جائیں گی۔ لیکن چاندامی والے مسئلے کا میں کچھ نہیں کر سکتا ہوں۔ ہم ان سے ملنے نہیں جا سکتے، انہیں ملنے کے لیے نہیں بلا سکتے۔ تمہیں کچھ عرصے کے لیے چاندامی کو بھولنا ہوگا صندل...... ہمارا وہاں جانا مناسب نہیں اور نہ ہی ان کا یہاں آنا...... ہم پکڑے جا سکتے ہیں۔ پھر تم ہی بتاؤ...... ہم ادھر سے بھاگ کر کہاں جائیں گے۔''

''ہاں...... کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔ لیکن ہم باقی معاملات کے لیے کیا کریں گے میر...... میرا مطلب ہے کہ روزگار کے لیے...... اگر اسی طرح سونا بیچتے رہے، بچت سے خریداری کرتے رہے تو بہت جلد ہمارے پاس کچھ نہیں بچے گا۔ ہمیں روزگار کا کوئی مستقل حل سوچنا ہوگا۔''

''وہ میں نے سوچ لیا ہے۔'' وہ بناوٹی رغبت سے کھانا کھاتے ہوئے بولا تھا۔

''کیا......؟''

''ہم یہاں پر ایک ریسٹونٹ کھولیں گے۔'' میرزاد نے اپنا خیال پیش کیا تھا۔

صندل کے چہرے پر مسکراہٹ آئی تھی۔ اسے میرزاد کا خیال اچھا لگا تھا۔

''ٹھنڈیانی میں کافی سیاحت ہونے لگی ہے۔ یہاں پر ریسٹورنٹ کھولنے سے یقیناً ہمیں فائدہ ہوگا۔ ہم تو اپنے گھر کے دو تین کمرے ہوٹل کے لیے بھی مختص کر سکتے ہیں۔ کیسا......؟''

''بہت اچھا...... یہ کام بہت مصروف بھی کر دے گا ہمیں......''

''بالکل......!''

''لیکن ریسٹونٹ پر تو روز نئے نئے لوگ آتے ہیں میر...... کسی نے ہمیں پہچان لیا تو......؟''

صندل ایک دم سے ہی فکر مند ہوئی تھی۔

''ہم کسی کے سامنے نہیں جائیں گے۔ سارے کاموں کے لیے ورکر رکھ لیں گے۔''

''ورکر کو تو پیسے بھی دینا ہوں گے۔''

''یار! جب کمائی کریں گے تو تنخواہ بھی نکل آیا کرے گی۔''

''ہاں...... یہ تو ہے۔''

''اور ویسے بھی میرے گھر والے کراچی سے اتنی دور سیاحت کرنے نہیں آئیں گے۔ اور جہاں تک میرا خیال ہے، تمہارے گھر والوں کو بھی یہاں آنا مشکل ہے۔''

''ہمارے ہاں سیر و تفریح کو شادی کے بعد کا کام تصور کیا جاتا ہے۔''

''پھر تو کسی کا بھی اس طرف آنا مشکل ہے۔ کیونکہ شادی کے بعد زیادہ لوگوں کا رجحان مری جانے کی طرف ہوتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ جو تمہیں بہتر لگے۔''

''اب پریشانی کو دور کر کے کھانا کھا لو......'' میرزاد نے پیار سے کہا تھا۔ لیکن صندل نے کھانا کھانے کے بجائے میرزاد کے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا تھا۔

☆......☆......☆

سردی پوری شدت سے آنے کو بے تاب تھی۔ پہاڑوں پر ایک برف باری ہونے کی دیر تھی اور حویلیاں شہر نے دھند سے ڈھک جانا تھا۔ حویلیاں میں تو ویسے بھی دھند بہت زیادہ پڑا کرتی تھی۔ شام میں بھی جلدی شروع ہو جاتی تھی اور دن میں بہت دیر سے چھٹا کرتی تھی۔ لیکن اب کی بار والی سردیاں اپنے ساتھ کچھ اداسی لائی تھیں۔ درختوں کے پتے کیا جھڑے تھے ایسے جیسے انسانوں سے سارے اثاثے ہی چھین لیے گئے تھے۔

چاند کچھ زیادہ ہی تہی داماں تھی۔ نجانے کیوں اسے اس بار والا موسم مارے دے رہا تھا۔ حویلی

کی منڈیروں پر اسے گدھ بیٹھے نظر آنے لگے تھے۔ اور وہ گدھ ایسے تھے کہ جانے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ نہ تو پرواز بھرتے تھے اور نہ ہی سوتے تھے۔ ایسے جیسے کسی کے مرنے کے انتظار میں ہوں۔ حویلی میں کون مرنے والا تھا۔ یا کوئی مر چکا تھا لیکن بس چلتا پھرتا نظر آ رہا تھا۔ شاید تعبیر...... جو روتی ہوئی گھر سے رخصت ہو رہی تھی۔

بڑے دروازے کے ساتھ کھڑی چاند نے اوپر آسمان کو دیکھا تھا۔ گدھ پرواز کرنے لگے تھے لیکن چکر ہی چکر میں گھومتے وہ حویلی کے صحن میں ہی منڈلا رہے تھے۔ ایسا کیا نظر آ رہا تھا انہیں حویلی کے صحن میں......

تعبیر کا رونا کم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ جو صندل کی شادی پر اسے نہ رونے کا مشورہ دے رہی تھی کہ میک اپ خراب ہو جائے گا اب خود بری طرح سے رو رہی تھی۔

''مت رو میری بچی...... رخصت ہوتے وقت اتنا نہیں رویا کرتے۔''

زہرہ پھوپھو نے اسے دلاسا دیا تھا۔ لیکن اس دلاسے کے باوجود تعبیر کا رونا کم نہیں ہوا تھا۔ وہ ذہنی طور پر شادی کے لیے تیار نہیں تھی اور جو ہوا تھا، وہ محض ایک ہفتے کے اندر اندر ہو گیا تھا۔ شادی کا ارمان کس لڑکی کو نہیں ہوتا...... اسے بھی تھا۔ لیکن وہ اتنا دور نہیں جانا چاہتی تھی۔ سنا تھا کہ وہاں کے راستے خراب ہو جائیں تو پھر مہینوں ٹھیک ہی نہیں ہوتے تھے۔ سردیوں میں چھ چھ ماہ گھروں میں قید رہنا پڑتا ہے۔ لیکن وہ جو بھی کہتی اس کا انکار کیا اہمیت رکھتا تھا۔ جب بستامی بابا اپنا حکم نامہ جاری کر چکے تھے تو...... اس نے اپنی ماں کو کہا تھا کہ وہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی...... لیکن زہرہ پھوپھو بھی ایسی ہی ہو گئی تھیں جیسی افشیں کی شادی پر تہمینہ پھوپھو ہو چکی تھیں۔ بظاہر چلتی پھرتی لیکن اندر سے مری ہوئیں۔

اس ساری صورت حال میں چاند خاموش تھی۔ وہ خود کو مجرم سمجھ رہی تھی۔ تعبیر کی بھی اور زہرہ پھوپھو کی بھی...... اگر صندل گھر سے نہ جاتی تو تعبیر کو یہ قربانی نہ دینی پڑتی اور نہ ہی بستامی زہرہ پھوپھو

سے بدتمیزی کرتا...... لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا تھا۔

ستون کے ساتھ ٹیک لگائے چاند تعبیر کو رخصت ہوتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ سب کزنیں بھی اداس تھیں۔ حویلی کا ایک ایک فرد، سوائے بستامی اور رحبانی کے...... ان دونوں کو احساس نہیں تھا کہ وہ تعبیر کے ساتھ کیا ظلم کرنے جا رہے ہیں۔

اور تعبیر کے ساتھ اصل میں کیا ظلم ہونے جا رہا تھا، اس کا اندازہ حویلی کی کسی خاتون کو نہیں تھا۔ وہ سب نہیں جانتی تھیں کہ تعبیر رخصت ہو کر نہیں جا رہی...... بلکہ بک کر جا رہی ہے اور اس کا خریدار کمال ہے۔

آسمان میں چکر کھاتے گدھ غائب ہو گئے تھے۔ شاید وہ اس کار کے پیچھے پرواز کرنے لگے تھے جس میں تعبیر بیٹھ کر اس حویلی کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا چکی تھی۔ چاند بڑے دروازے سے باہر نہیں گئی تھی۔ وہ وہاں ہی ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی رہی تھی۔ ایسے جیسے کسی سزا کی سنوائی کی منتظر ہو۔

پھر ایک ایک کر کے سب واپس اندر آنے لگے اور اپنے اپنے کمروں میں جانے لگے۔ کسی نے چاند کو مخاطب نہ کیا۔ بلکہ وہ سب تو شاید ایک دوسرے بھی نظریں چراتے ہوئے گزر رہے تھے۔ زہرہ پھوپھو سب سے اختتام پر آئی تھیں۔ وہ دکھی ہونے سے زیادہ ٹوٹی ہوئی لگ رہی تھیں۔

''میں آپ کے لیے دودھ گرم کر دوں پھوپھو......؟'' چاند نے پوچھا تھا۔ اپنے کمرے کی طرف جاتی زہرہ پھوپھو نے کچھ ناگوار نظروں سے چاند کی طرف دیکھا تھا۔

''آگے میرے کام تم کرتی ہو چاند......'' انہوں نے رکھائی سے کہا تھا۔ جس سے واضح ہو گیا تھا کہ وہ چاند سے ناراض ہیں۔

چاند تو ان کی طرف دیکھ کر رہ گئی تھی۔

''مجھے جو چاہیے ہو گا میں خود ہی لے لوں گی۔ تم میری فکر مت کرو۔'' انہوں نے کہا تھا اور اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تھیں۔ چاند نے بے دلی سے اپنے کمرے کی سیڑھیاں طے کی تھیں۔

تعبیر کے رخصت ہونے کے اگلے دن ہی پہاڑوں پر پہلی برف باری ہوگئی تھی۔ جس کی وجہ سے موسم کی شدت میں اضافہ ہوگیا تھا۔ پانی استعمال کرتے وقت ہاتھ پاؤں سن ہونے لگے تھے۔ کان کی لوئیں سرخ دکھنے لگی تھیں۔ ایک سویٹر جسم پر کم لگنے لگا تھا۔ اس سال حویلی میں سردیوں کی کوئی تیاری نہ کی گئی تھی۔ نہ پنیاں بنائی گئی تھیں اور نہ پنجیری...... عجیب بے کیف سے دن تھے جو دل کو بے کل کر رہے تھے۔

آہستہ آہستہ سب بھولنے لگے تھے کہ چند دن پہلے اس گھر میں کیا واقعات ہوئے ہیں۔ صندل کے بعد تعبیر کی شادی نے سب کو جیسے صندل کو بھلا دینے میں مدد کی تھی۔ گھر والے تو جیسے بھولنے ہی لگے تھے کہ اس گھر میں کوئی صندل نام کی لڑکی بھی رہتی تھی۔ جیسے انہوں نے افشیں کو بھلا دیا تھا۔ اور جیسے بہت جلد تعبیر کو بھی بھلانے والے تھے۔ شاید دنیا کا یہ ہی دستور ہے۔ اوجھل ہو جانے والوں کو جلد بھلا دیا جاتا ہے۔

حویلی میں کوئی صندل کا نام نہیں لیتا تھا۔ صندل سے محبت الگ بات...... لیکن جو تعبیر کے ساتھ ہوا اس کے بعد حویلی کے مکین اندر ہی اندر صندل کے خلاف ہو چکے تھے۔ سوائے چاند کے...... جو اپنی ایک ایک سانس کے ساتھ صندل کو یاد کیا کرتی تھی۔ اسے ہر دم صندل کی فکر رہا کرتی تھی۔ وہ کیا کر رہی ہوگی، کہاں ہوگی، کن حالات میں ہوگی۔ وہ ان دنوں بس یہ ہی سوچے جاتی تھی۔ اسے اس بات کی تو خوشی تھی کہ صندل میرزاد کے ساتھ تھی، ساتھ ہی اس بات کی فکر بھی تھی کہ کہیں وہ کسی مشکل حالات کا سامنا نہ کر رہی ہو۔ بہت پیار سے پرورش کی تھی اس نے صندل کی...... بہت لاڈ سے...... اس تک کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچنے دی تھی۔ اسے سرد ہوا کبھی نہیں لگنے دی تھی۔ اور اب وہ نجانے کیسی ہواؤں کا سامنا کر رہی تھی۔ کیسے گزر اوقات کر رہی تھی۔ اسے بس ایک بات کی تسلی تھی کہ میرزاد اس کے ساتھ تھا۔ جو اس سے بے حد محبت کرتا تھا۔ وہ یقیناً صندل تک کوئی مشکل پہنچنے سے پہلے خود اس کا سامنا کرنے والا تھا۔

حویلی میں اڈے کا کام بدستور جاری تھا۔ کاری گر آ رہے تھے۔ جا رہے تھے۔ کام ہو رہا تھا۔ چاند نے پھر سے اپنی ذمہ داریوں کو سنبھال لیا تھا۔ لیکن اب کی بار انداز کچھ سست تھا۔ جیسے کوئی اور یہ کام

کر رہا ہو۔ اور اصل چاندا اپنے کمرے میں ہی کہیں دبک کر بیٹھی ہو اور صندل کو سوچ رہی ہو۔ اور یہ شاید اس کی فکر مندی ہی تھی جو خدا کو پسند آ گئی اور صندل کی خبر اس تک پہنچ گئی۔

اس دن بھی وہ کام والے کمرے میں موجود تھی۔ کاری گروں کو کام کرتا ہوا دیکھ رہی تھی جب حاجی بوا کمرے کے دروازے تک آئی تھیں اور اندر آنے کے بجائے انہوں نے وہاں کھڑے کھڑے ہی اوٹ میں ہو کر ہولے سے چاند کو پکارا تھا۔

''چاند...... بات سنو......'' ان کی آواز تو شاید چاند تک پہنچی ہی نہیں تھی۔ اشارے کو سمجھتے ہوئے چاند اٹھی تھی اور ان تک آئی تھی۔

''کیا بات ہے حاجی بوا......؟''

''کمرے میں چلو...... یہاں نہیں بتا سکتی۔'' حاجی بوا تجسس پھیلا رہی تھیں۔

چاند نے ان کو دیکھا تھا اور پھر ان کی بات مانتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف گئی تھی۔ کمرے میں پہنچنے کے بعد حاجی بوا نے دروازہ بند کر لیا تھا۔ اور پھر اس پر بھی جیسے ان کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے کھڑکیاں بند کرنا شروع کر دی تھیں۔

''ایسی کیا بات ہے حاجی بوا......؟''

''سنو گی تو خوشی سے پاگل ہو جاؤ گی۔''

''پھر تو جلدی سے بتا دیجیے...... ان دنوں میں بہت اداس ہوں۔ کوئی خوشی کی خبر سننے کے لیے بہت بے چین ہوں۔''

''جانتی ہوں۔ اور تمہاری اداسی کے سارے حل میرے پاس ہیں آج......'' حاجی بوا نے کہا تھا اور پھر اپنے گریبان میں سے ایک تہ کیا ہوا کاغذ باہر نکالا تھا۔

''یہ کیا ہے؟''

''صندل کا خط......!'' حاجی بوا نے مسکراتے ہوئے بتایا تھا اور چاند کے چہرے پر شدید حیرت پھیل گئی تھی۔ لیکن یہ حیرت خوش گوار تھی۔

''کیا......؟ صندل کا خط...... میری بیٹی کا خط......'' چاند نے فوراً اسے خط کو حاجی بوا کے ہاتھ سے پکڑ لیا تھا۔ اور پھر اونچی آواز میں پڑھنے لگی تھی۔

پیاری چاند امی!

امید کرتی ہوں کہ خیریت سے ہوں گی۔ میں بھی خیریت سے ہوں اور آپ کو بہت یاد کرتی ہوں۔ ہر وقت کرتی ہوں۔ دن کا کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا جس میں آپ کا خیال نہ آتا ہو۔ میں زندگی میں پہلی بار آپ سے جدا ہوئی ہوں اور یہ جدائی بھی ایسی ہے کہ جس کے ختم ہونے کا کسی کو علم نہیں...... خدا سے دعا ہی کرتی رہتی ہوں کہ یہ جدائی جلد ختم ہو جائے اور آپ مجھے اپنی آغوش میں چھپا لیں۔

میری طرف سے فکر مند مت ہوئیے گا۔ میں بہت خوش ہوں۔ میر زاد میرا بہت خیال رکھتا ہے۔ مجھے بالکل آپ کی طرح چاہتا ہے۔ میں اس کے ساتھ بہت خوش ہوں۔ ہم لوگ حویلیاں سے بہت دور رہ رہے ہیں۔ دنیا والوں کی نظروں سے اوجھل...... اپنی ایک الگ تھلگ دنیا میں...... اور بہت خوش رہتے ہیں۔ ہم نے اپنے لیے ایک گھر کو سجایا ہے۔ سنوارا ہے...... اور میں گھر داری سیکھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ آپ کی طرح کھانا بنانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ سلیقہ اپنانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ جس میں یقیناً کافی وقت لگ جائے گا۔ میر زاد میرے خراب کاموں پر بھی میری حوصلہ افزائی کرتا رہتا ہے۔ بالکل آپ پر گیا ہے۔

میں آپ کو وقتاً فوقتاً خط لکھتی رہا کروں گی۔ نہیں اندازہ کہ یہ خط آپ تک پہنچتا ہے یا نہیں...... جو پہنچ گیا تو پھر اس بارے میں ارشادی بابا کو مطلع کر دیجیے گا۔ ایک اور بات...... ارشادی بابا نے میرا اور میر زاد کا نکاح کروا دیا تھا۔ جس میں میں نے آپ کی کمی کو بہت محسوس کیا۔ جلد دوبارہ خط لکھوں گی۔ اور

آپ کو بتاؤں گی کہ آپ نے مجھے اپنی خیریت کے بارے میں کیسے آگاہ کرنا ہے۔

صندل!

چاند نے خط کو سینے سے ایسے لگالیا تھا جیسے صندل کو اپنی آغوش میں بھرلیا ہو۔

''یہ خط کون لایا تھا؟'' اس نے جیسے بڑے لمحے بیت جانے کے بعد پوچھا تھا۔

''مجھے ارشادی نے دیا ہے۔ میں وہاں سے گزر رہی تھی تو اس نے مجھے اپنی دکان میں بلالیا اور یہ خط تھمادیا۔''

''بہت اچھے ہیں ارشادی......''

''سچ میں...... یاد آیا...... اس نے تمہیں ملنے کے لیے بلایا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ کچھ ضروری بات کرنا ہے۔''

''ضروری بات...... کیا......؟''

''مجھے کچھ نہیں بتایا اس نے...... اشارہ بھی نہیں دیا۔ کہہ رہا تھا کہ بہت اہم بات ہے۔ صرف چاند کو ہی بتاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں جاتی ہوں ان سے ملنے...... ان کا شکریہ بھی تو ادا کرنا ہے۔ انہوں نے میرے حصے کا اہم کام اپنے ذمہ لیا ہے۔ صندل اور میرزاد کا نکاح کروایا ہے۔''

☆......☆......☆

سن ۲۰۰۰ء

پہاڑوں پر برف باری کا آغاز ہو چکا تھا۔ جس کی وجہ سے اسلام آباد کا موسم بھی کافی سرد ہو چکا تھا۔ دن میں دھوپ بے نور نظر آتی تھی اور راتیں روز بروز سرد ہو رہی تھیں۔ باریشہ نے اپنے گرد لپٹی چادر کو کھول کر خود پر مزید اچھے سے لیا تھا۔ اسے ٹھنڈ محسوس ہو رہی تھی۔ پہلے وہ ننگے پاؤں نرم گھاس پر چہل قدمی

کا ارادہ رکھتی تھی۔ لیکن پھر تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنے جوتے پہن لیے تھے۔ ٹھنڈی گھاس پر چہل قدمی کرنے سے وہ بیمار ہو سکتی تھی۔ اور وہ اس اجنبی گھر میں بیمار نہیں ہونا چاہتی تھی۔ یہ لوگ پہلے ہی اس کی بہت اچھے سے مہمان نوازی کر رہے تھے۔ بیمار ہو کر تو ان کا بوجھ بڑھانے والا حساب تھا۔

گیٹ سے باہر گاڑی کا ہارن سنائی دیا تو باریشہ کی نظریں بے اختیار ہی گیٹ کی طرف اٹھ گئی تھیں۔ چوکیدار نے گیٹ کھولا تھا اور دو بڑی سی گاڑیاں اندر داخل ہوئی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ شاید بستامی بابا گھر واپس آ چکے ہیں۔ لیکن جب ڈرائیور نے فرنٹ سیٹ سے اتر کر پیچھے کا دروازہ کھولا تو اندر سے نکلنے والے چہرے یکسر اجنبی تھے۔ دو گاڑیوں میں سے چھ لڑکیاں باہر نکلی تھیں۔ باریشہ نے ان کو دیکھا تھا اور وہ جیسے ان کو دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ وہ لڑکیاں تھیں یا پریاں...... ایسے لگتا تھا کہ جنت کی حوریں یہاں آ گئی ہوں۔ سب نے مغربی لباس پہنے ہوئے تھے اور ہاتھوں میں اس طرح کے بیگ تھے جیسے وہ کسی دوسرے شہر قیام کر کے آ رہی ہوں۔

ان سب کے بالوں کی کٹنگ جدید تھی اور ان پر بہت پیاری لگ رہی تھی۔ تنگ لباس جسموں کے ساتھ ایسے جڑے ہوئے تھے جیسے وہ انہی لباسوں کے لیے بنائی گئی ہوں۔ میک اپ نفاست سے کیا گیا تھا۔ اور وہ سب اتنی خوب صورت لگ رہی تھیں کہ باریشہ کی ان پر سے نظریں ہی نہیں ہٹ رہی تھیں۔ کچھ لڑکیاں تو بے اعتنائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اندر چلی گئی تھیں جبکہ کچھ نے اسے دیکھ لیا تھا۔ پہلے انہوں نے آپس میں ایک دوسرے کو اشارے کیے تھے۔ پھر دو لڑکیاں چلتے ہوئے اس کے پاس آئی تھیں۔

''کون ہو تم......نئی آئی ہو کیا......؟'' ایک نے پوچھا تھا۔ جو باریشہ کو انڈین ہیروئن ایشوریہ کی طرح لگی تھی۔

اس نے پچھلے ہی دنوں کومل اور ایمن مامی کے ساتھ اس ہیروئن کی فلم ''تال'' دیکھی تھی۔ جس میں اسے وہ ہیروئن بہت زیادہ اچھی لگی تھی۔ خاص کر تب جب وہ رقص کرتی تھی۔

''میں باریشہ ہوں...... بستامی بابا کی رشتے دار......؟''

''کہاں سے ہو؟''

''حویلیاں سے......''

''یہ کہاں ہے؟''

''ایبٹ آباد سے پہلے آتا ہے۔''

''اوہ......اچھا......تب ہی تم میں تمہارے علاقے کا اثر بہت زیادہ جھلک رہا ہے۔'' دوسری والی نے پہلی بار کچھ کہا تھا۔ جسے باریشہ سمجھ ہی نہیں سکی تھی۔

''مطلب......؟''

''میں نے تمہیں دور سے دیکھ کر ہی کہہ دیا تھا کہ تم کسی چھوٹے شہر کی لگتی ہو۔ دیکھو...... ایسا ہی نکلا۔ خیر یہاں رہنا ہے تو بہت محنت کرنا ہوگی۔ میں خود گجرات سے ہوں۔ بڑے شہر میں گھلنے ملنے کے لیے بہت محنت کرنا پڑی ہے مجھے......''

''کیسی محنت......میں سمجھی نہیں......'' باریشہ نے ناسمجھی سے کہا تھا۔

''پروڈکشن والے لینے سے انکار کردیتے ہیں۔ کہتے ہیں لہجے میں علاقائی تاثر آرہا ہے۔ دیکھو تم بھی اردو بول رہی ہو تو وہ کچھ انوکھی لگ رہی ہے۔ حویلیاں سے ہونا......اسی لیے کہہ رہی ہوں کہ بہت محنت کرنا ہوگی تمہیں آگے بڑھنے کے لیے......''

''میں تمہاری بات سمجھ ہی نہیں پارہی ہوں۔ کیسی پروڈکشن......؟'' وہ کچھ بھی تو نہیں سمجھ پارہی تھی۔

دونوں لڑکیوں نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیزی سے دیکھا تھا۔

''تمہیں میڈم کومل سب سمجھا دیں گی۔ خیر......میرا نام شیزا ہے۔ اور یہ سائرہ ہے۔ پھر ملاقات ہوتی ہے۔''

لڑکیاں کہہ کر اندر چلی گئی تھیں۔ باریشہ انہیں جاتا ہوا دیکھنے لگی تھی۔ ان کی باتیں اس قدر عجیب تھیں کہ نجانے کیوں باریشہ کو بے چینی محسوس ہونے لگی تھی۔

اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑا سانول باریشہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی ماں نے اس کو یہ ذمہ داری دی تھی کہ وہ باریشہ پر نظر رکھے۔ وہ گھر سے بھاگ نہ جائے۔ سانول یہ ذمہ داری بخوبی نبھا رہا تھا۔

''اس کے چہرے پر پریشانی بھی بھلی لگتی ہے۔'' باریشہ کو دیکھتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔



ناول **تاش گھر** ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **15** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 18

''ہیلو...... کیسے ہو بستامی؟'' کومل فون پر بستامی سے بات کر رہی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ تم کیسی ہو؟''

''میں بھی ٹھیک ہوں۔ تم یہ بتاؤ کہ تم واپس گھر کب آ رہے ہو بستامی؟''

''میں چند دنوں میں واپس آ جاؤں گا۔ گھر میں سب خیریت ہے نا؟''

''ہاں...... سب خیریت ہے۔ باریشہ تو تمہارے ذہن میں ہے نا...... میں بتا چکی ہوں نا کہ وہ ہمارے گھر آئی ہوئی ہے۔''

''ہاں...... یاد ہے مجھے۔ تم میرے آنے تک اسے گھر سے جانے مت دینا۔''

''ایمن آپی نے یہ کام سانول کے سپرد کر دیا ہے۔ سانول اس کا دھیان رکھ رہا ہے۔ لیکن دھیان نہ بھی رکھا جائے تو وہ جائے گی کہاں...... چاند کو چھوڑ کر آئی ہے وہ...... واپس نہیں جائے گی۔''

''پھر بھی...... اس پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ وہ کسی بھی وقت واپس جانے کا فیصلہ لے سکتی ہے۔ تب ہم اسے روک نہیں سکیں گے۔ تم جانتی ہو نا کہ اس کی ماں نے ہمارے ساتھ کیا کیا تھا۔ کتنی انسلٹ ہوئی تھی ہماری اس کی وجہ سے......'' یاد کرتے ہوئے بستامی کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔ صندل کا عین شادی والے دن گھر سے بھاگ جانا جیسے اسے ابھی تک طیش میں رکھے ہوئے تھا۔

''جانتی ہوں۔ سب یاد ہے مجھے...... تب روشن بیگم بھی کتنے دن پریشان رہی تھیں۔ اللہ انہیں جنت نصیب کرے۔''

"تم ایسا کرو کہ باریشہ کو اس سارے وقت میں اس گھر کی عادت ڈال دو۔ اسے اتنی آسائشیں دو کہ وہ اس گھر سے کبھی جانہ سکے۔"

"میں ایسا ہی کر رہی ہوں۔ میں نے اسے گھر کا سب سے شاندار کمرا رہنے کے لیے دیا ہے۔ مزید بھی دھیان رکھوں گی۔"

"کومل آنٹی......!" باریشہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا تھا۔ داخل ہونے کے بعد اس نے دیکھا تھا کہ وہ فون پر کسی سے بات کر رہی تھیں۔ "اوہ سوری...... میں بعد میں آجاتی ہوں۔"

"نہیں...... کوئی بات نہیں...... میں ویسے بھی بات مکمل کر چکی ہوں۔" کومل نے باریشہ سے کہا تھا۔ پھر فون پر بستامی کو اختتامی جملہ بولا تھا۔ "بعد میں بات ہوتی ہے۔" ریسیور واپس کریڈل پر رکھ کر وہ باریشہ کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

"کیا بات ہے میری جان...... بولو......!" اس نے بے حد پیار سے پوچھا تھا۔

"وہ بات تو کچھ خاص نہیں ہے۔ بس میں تھوڑا کنفیوز ہوگئی تھی تو سوچا کہ آپ سے پوچھ لوں۔"

"تو پوچھو نا میری جان...... کیا پوچھنا چاہتی ہو تم۔"

"یہ جو ابھی باہر لڑکیاں آئی تھیں، ان کے بارے میں پوچھنا تھا۔ یہ سب کون تھیں؟ اور یہاں کیا کام کرتی ہیں؟"

باریشہ نے پوچھا تھا اور کومل بیگم کے چہرے پر لمحے بھر کے لیے پریشانی در آئی تھی۔ لیکن روشن بیگم کی طرح بس لمحے بھر کے لیے...... وہ پریشانی کے تاثرات بہت جلد قابو پالینے والی عورت تھی۔

"وہ سب تو میں تمہیں بعد میں بتاتی ہوں۔ لیکن تم پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ یہ ڈریس تم نے مزید کتنے دن پہننا ہے۔ جب سے یہاں ہو تم اسے دوسری بار پہن رہی ہو اور تمہیں پہنے بھی دو تین دن تو ضرور ہو چکے ہیں۔"

کومل بیگم نے یہ بات اپنائیت سے کہی تھی لیکن اس کے باوجود باریشہ کچھ شرمندہ سی ہو گئی تھی۔

''تم گھر سے کتنے ڈریسز لائی تھی؟''

''کچھ زیادہ نہیں......''

''اوہ میرے خدایا...... پھر تو مجھے اس بات کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔ مجھے معاف کر دو باریشہ...... آئی ایم رئیلی سوری......'' پیار سے اس نے باریشہ کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے تھے۔

''آپ کیوں سوری بول رہی ہیں۔''

''تو مجھے سوری بولنا چاہیے نا...... تم ہماری رشتے دار ہو۔ تمہاری ایک ایک چیز کا مجھے خیال رکھنا چاہیے تھا۔ گھر کے کاموں میں اس طرف دھیان ہی نہیں گیا۔''

''کوئی بات نہیں......''

''تم ایسا کرو...... جلدی سے کوئی دوسرا ڈریس تبدیل کر آؤ...... ہم آج ہی جائیں گے۔ بلکہ ابھی......''

''کہاں......؟'' وہ نہیں سمجھی تھی۔

''خود ہی دیکھ لینا کہ کہاں...... چلو اب جلدی سے کپڑے تبدیل کر کے آؤ۔'' کومل نے پیار والی دھونس سے کہا تھا۔ اور وہ مسکرا کر چپ چاپ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔

☆......☆......☆

اس شاپنگ مال کو دیکھ کر باریشہ ششدر رہ گئی تھی۔ وہ اپنی ساری زندگی اتنے بڑے اور شاندار شاپنگ مال میں نہیں آئی تھی۔ اس نے ایسے شاپنگ مالز فلموں ڈراموں میں تو دیکھے تھے لیکن نہ تو حویلیاں میں دیکھے تھے اور نہ ہی وہ وہاں موجود تھے۔ ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے چھوٹے سے صاف ستھرے شہر کو ایک چھت تلے اکٹھا کر دیا ہو۔ اتنی دکانیں، اتنے لوگ، کیا کچھ نہیں تھا وہاں...... پھر بھی ایک سکون

تھا۔کوئی افراتفری والی کیفیت نہیں تھی۔

"تمہیں جو جو پسند آئے اپنے لیے خرید لینا باریشہ......" کومل اسے ایک شاپ پر لے آئی تھی۔ جہاں نت نئے ڈریسز شوکیس میں لگے ہوئے تھے۔"یہاں سے نہ پسند آئے تو کسی اور شاپ پر چلے جائیں گے۔میں تب تک اپنے لیے کچھ پسند کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔" کومل کہہ کر ایک طرف کو ہو گئی تھی، جہاں اس کے مطلب کے ڈریسز لگے ہوئے تھے۔

باریشہ چند لمحے تو وہاں ہی کھڑی رہی تھی پھر اس نے جیسے ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے قدم ریک کی طرف بڑھائے تھے۔دکان پر تقریباً ہر طرح کے لباس موجود تھے۔مشرقی اور مغربی......اور وہ سب اتنے خوب صورت تھے کہ وہ ایک کو دیکھ رہی تھی اور دوسرا بھول رہی تھی۔حویلیاں میں رہتے ہوئے اس نے ساری زندگی عجیب طرح کے گرم اور سرد کپڑے پہنے تھے۔گہرے رنگوں والے اور بڑے بڑے پھولوں والے......اور یہاں پر تو وہ سب کچھ پڑا ہوا تھا جو اس کے خیال میں صرف ڈراموں کی ہیروئنز ہی پہنتی تھیں۔اسے سب پسند آتا جا رہا تھا۔لیکن وہ زیادہ ندیدے پن کا مظاہرہ نہیں کر سکتی تھی اس لیے اس نے اپنے لیے دو ڈریسز پسند کیے تھے۔

"کچھ پسند آیا تمہیں باریشہ......؟"

"جی...... مجھے یہ اچھے لگے ہیں۔" اس نے ہاتھ میں پکڑے دو ڈریسز کومل کو دکھائے تھے جسے اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑ کر بغور دیکھا تھا۔

"تمہیں اس کے علاوہ کچھ اور پسند نہیں آیا؟" وہ اپنی ناگواری چھپا نہ سکی تھی۔

"کیا یہ آپ کو پسند نہیں آئے؟"

"سچ پوچھو تو نہیں...... کافی پرانے لگ رہے ہیں۔میرے خیال سے تم وہ سیل والے ریک کی طرف چلی گئی تھیں۔وہاں پرانا اسٹاک پڑا ہوتا ہے۔کچھ نئی چیزیں دیکھتے ہیں۔آؤ...... میں تمہاری مدد

کرتی ہوں۔'' اس بار کومل اس کے لیے خود سے کپڑے دیکھنے لگی تھی۔

''یہ دیکھو...... یہ کیسا ہے؟'' کومل اسے ایک ڈریس دکھا رہی تھی جو کچھ کچھ شلوار قمیص سے ملتا جلتا تو تھا لیکن وہ شلوار قمیص ہرگز نہیں تھا۔ شلوار کی جگہ ٹراؤزر تھا اور وہ بھی کافی تنگ تھا اور قمیص کچھ جدت لیے ہوئے تھی۔ اور گنجز اکی قمیص بازو سے کندھوں تک عریانی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

''میرے خیال سے تمہیں یہ ٹرائی کرنا چاہیے۔''

''مجھ پر یہ سوٹ نہیں کرے گا۔'' اس قمیص کو دیکھتے ہوئے ہی ایک عجیب طرح کی الجھن کا احساس ہوا تھا۔

''بنا پہنے تم نے کیسے کہہ دیا۔ جاؤ...... اسے پہن کر آؤ...... پھر جج کرنا خود کو......''

ڈریس پکڑ کر وہ چاروناچار ٹرائی روم کے اندر چلی گئی تھی۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد جب وہ کچھ جھجکتی ہوئی باہر آئی تھی تو کومل نے ستائش کے مارے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ اس کے چہرے پر خوش گوار حیرت پھیلی ہوئی تھی۔

''اللہ......! کتنی پیاری لگ رہی ہو تم باریشہ میری جان...... دیکھو ذرا خود کو......'' اس نے اس کا رخ شیشے کی طرف موڑ دیا تھا۔ اور ٹرائی روم میں شیشے ہونے کے باوجود بھی جیسے اس نے خود کو اب دیکھا تھا۔ ہلکے گلابی رنگ کا نفیس کڑھائی والا لباس اس پر واقعی ہی میں بہت پیارا لگ رہا تھا۔

''اور یہ تم نے کیا دوپٹے کو بوڑھی مائیوں کی طرح لپیٹ کر رکھا ہوا ہے۔ گلے میں لو اسے...... یا اتار ہی دو۔'' اس نے اس کا دوپٹا کھینچ کر اتار دیا تھا۔ اور دوپٹا جو اس کے نظر آتے بازوؤں کو چھپائے ہوئے تھا، اس کے اتر جانے پر وہ کچھ سہم سی گئی تھی۔

''اب دیکھو خود کو...... کتنی پیاری لگ رہی ہو'' اور کومل جانتی تھی کہ اسے نارمل کیسے کرنا ہے۔ خود کو دیکھتے ہوئے اس کی جھجک کچھ کچھ دور ہونے لگی تھی۔

"کیسا لگ رہا ہے؟"

"بہت پیارا......" اس نے دل سے کہا تھا۔

"بس پھر ٹھیک ہے۔ اب اسے تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں......ہم اس کا بل پے کر دیں گے۔"

"بات سنیے......" اس نے دکان کی ہیلپر لڑکی کو مخاطب کیا تھا۔

"جی؟"

"ٹرائی روم میں ڈریس پڑا ہے۔ وہ کسی کو دے دیجیے گا۔ ہمیں اب اس کی ضرورت نہیں......اور اس ڈریس کا بل بنا دیں۔"

"جی میم......"

اور وہ بنا کوئی احتجاج کیے خاموش کھڑی رہی تھی۔ پرانے لباس کے ہمیشہ کے لیے چلے جانے پر اسے دکھ ہوا تھا۔ لیکن یہ دکھ بہت لمحاتی تھا۔ اس شام نے اس کے سارے دکھ جیسے اپنے اندر سمو لیے تھے۔ وہ شام بہت رنگین تھی۔ اس کی زندگی کی پہلی خوب صورت ترین شام......جس میں چاند رات کے ہونے سے پہلے ہی اپنی پوری آب وتاب سے چمکنے لگا تھا۔

اس شام انہوں نے بہت زیادہ خریداری کی تھی۔ بہت سے کپڑے خریدے تھے۔ بہت سے جوتے، میک اپ، جیولری، ہینڈ بیگ، پرفیومز اور نجانے کیا کیا......سب کچھ نہ صرف بہت جدید اور نفیس تھا بلکہ بہت مہنگا بھی تھا۔ کومل اسے سب کچھ دلواتی جا رہی تھی۔ جس چیز کو وہ رک کر ذرا سا دیکھ لیتی تھی وہ تو جیسے کومل پر اس کے لیے خریدنا فرض ہو جاتا تھا۔

"آپ بہت زیادہ خرچ کر رہی ہیں کومل آنٹی......"

"ارے......تم تو تکلف کرنے لگی ہو۔ میں تو خود پر شرمندہ ہوں کہ مجھے اس سب کا خیال پہلے کیوں نہیں آیا۔" اس کی بات پر باریشہ مسکرائی تھی۔

''کیا اب گھر چلیں؟'' شاپنگ مال کے ہی کیفے ٹیریا سے پیزا کھانے کے بعد اس نے کہا تھا۔ جبکہ اس کا گھر جانے کا بالکل بھی دل نہیں کر رہا تھا۔ اس کا دل تو چاہ رہا تھا کہ آج کی شام جو رات سے مل رہی تھی، وہ کبھی ختم ہی نہ ہو۔

''ہاں...... جاتے ہیں لیکن جانے سے پہلے ایک اور اہم کام بھی آج ہی ہو جائے تو بہتر ہے۔''

''وہ کیا......؟'' اس نے پوچھا تھا۔ کومل پیار سے مسکرائی تھی۔ اس کی مسکراہٹ بھید بھری تھی۔ جیسے کچھ چھپا رہی ہو۔ اور ابھی نہ بتانا چاہتی ہو۔

☆......☆......☆

گاڑی جس جگہ کے باہر رکی تھی وہ باہر سے کوئی بنگلا دکھ رہا تھا۔ وسیع باغ اور باغ کے وسط میں ضرورت سے زیادہ روشن تین منزلہ گھر...... لیکن وہ گھر نہیں تھا۔ اسے بہت بعد میں پتا چلا تھا کہ یہ ''بیوٹی پارلر'' ہے۔ وہ تو اسے کوئی چھوٹا سا محل سمجھے ہوئے تھی۔ بھلا پارلر کب سے ایسے ہونے لگے۔ حویلیاں میں تو جو لڑکیاں پارلر کا کام کرنا جانتی تھیں، وہ ایک دکان کے اندر ہی پارلر بنالیا کرتی تھیں۔ یہ کیسا پارلر تھا جو محل کی طرح کا تھا۔

''جی میم...... کیا کروائیں گی آپ؟'' ریسپشنسٹ لڑکی نے کومل سے پوچھا تھا۔

''آج مجھے کچھ نہیں کروانا ہے، بلکہ یہ جو میرے ساتھ آئی ہے اس کا کروانا ہے۔''

''جی...... کیوں نہیں...... بتائیں...... کیا کیا کروانا ہے۔''

''ذرا غور سے دیکھو، میری نند کی نواسی کو...... کیا یہ ایشوریہ نہیں لگتی...... جس کی فلم تال کا ابھی تک چرچا ہے۔'' کومل نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ جواباً لڑکی ہنسنے لگی تھی۔

''جی...... تھوڑی لگتی تو ہے۔''

''اسی لیے تو لائی ہوں کہ جو کمی ہے، وہ تم پوری کر دو۔''

''ضرور کیوں نہیں......''

''ادھر آ جاؤ تم پیاری لڑکی......'' ریسپشنسٹ لڑکی نے اسے ایک طرف چلنے کو کہا تھا۔

''اس کا نام باریشہ ہے۔'' کومل نے پیچھے سے کہا تھا۔ ''دیکھو ذرا حسن اتفاق......ایشوریہ سے ملتا جلتا ہی نام ہے۔'' اور دونوں ہنسنے لگی تھیں جبکہ باریشہ صرف مسکرا سکی تھی۔

''ادھر بیٹھ جاؤ......'' لڑکی نے اسے ایک سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔ وہ چپ چاپ بنا مرضی والی لڑکی کی طرح سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ پھر اسی لڑکی نے ایک بیوٹیشن لڑکی کو اپنے پاس بلا کر کچھ ہدایات دی تھیں۔ بیوٹیشن لڑکی اس کے قریب آ کر اس کو پرکھنے لگی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ دوسری لڑکی کو بتاتی جا رہی تھی کہ اس کو کس کس چیز کی ضرورت ہے۔ ریسپشنسٹ لڑکی اسے ہر طرح سے رضامندی دے کر چلی گئی تھی۔ تب بیوٹیشن لڑکی اس سے مخاطب ہوئی تھی۔

''بالکل فکر مت کرنا......کچھ دیر کے بعد تم خود کو پہچان نہیں سکو گی۔''

لڑکی نے دو تین مزید لڑکیوں کو بلا لیا تھا۔ ایسے جیسے تینوں مل کر کوئی بڑا ٹاسک مکمل کرنے جا رہی ہوں۔ اگلے دو گھنٹے تک وہ تینوں بیوٹیشن اس پر ٹوٹ پڑی تھیں۔ باریشہ کو نہیں معلوم تھا کہ اس کے ساتھ کیا کیا ہو رہا ہے۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ آپریشن تھیٹر کے بیڈ پر بے ہوش پڑی ہو اور ڈاکٹر اس پر ہر طرح کی طبع آزمائی کر رہے ہوں۔ لیکن یہ سب کچھ تھکا دینے والا ہرگز نہیں تھا۔ بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ پرجوش ہو رہی تھی۔ وہ آئینے میں خود کو دیکھنے کے لیے بے قرار تھی کہ وہ اس سب کے بعد کیا روپ لیتی ہے۔

تین گھنٹوں کے بعد اس کا رخ شیشے کی طرف پھیر دیا گیا تھا۔

حویلیاں میں رات کا منظر بہت خوب صورت ہوا کرتا تھا۔ خاص طور پر چاندنی راتوں کا منظر......ایسے لگتا تھا کہ چاند کی روشنی اور زمین میں کوئی چیز حائل نہیں ہے۔ گرد کا ایک ذرہ بھی نہیں......

چاندنی جب درختوں کی شاخوں سے نکل کر زمین پر اپنے جال بنتی تھی تو وہ منظر بہت دل کش ہوا کرتا تھا۔ آج خود کو دیکھتے ہوئے باریشہ کو وہ منظر بھی ہیچ لگنے لگا تھا۔ اسے آج اندازہ ہوا تھا کہ اس کی خوب صورتی کو ظاہر کرنے میں بس ایک ہی چیز حائل تھی۔ چاند نانو...... جن سے اس نے بروقت اپنی جان چھڑوالی تھی۔

☆......☆......☆

سرما کی اوس سارے شہر پر مخملی کپڑے کی طرح چھا چکی تھی۔ رات جس کی بصارت پہلے سے کمزور تھی، اوس کی وجہ سے اندھی ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود وہ رات بہت شاندار تھی۔ خوشی کے مارے باریشہ کو نیند ہی کہاں آ رہی تھی۔ پرندے گھونسلوں میں سو چکے تھے پھر بھی نجانے کہاں سے اس کے کانوں میں پرندوں کی چہکاریں رقص کر رہی تھیں۔ وہ سونے کے لیے بیڈ پر لیٹتی تھی اور پھر سے اٹھ کر خود کو آئینے میں دیکھنے لگی تھی۔ وہ لائٹس آف کرتی تھی اور چند لمحوں کے بعد پھر سے ساری بتیاں جلا لیتی تھی۔ وہ ایک ایک زاویے سے خود کو دیکھ رہی تھی۔ ہر ہر انداز میں...... بال کھول کر، باندھ کر، لہرا کر...... گھوم کر، کھڑے ہو کر، اطراف سے...... ایسا کیا تھا جو چھپا ہوا تھا۔ جو تھا تو اس کے پاس اور وہ ہی اس سے غافل تھی۔ اور جسے کومل آنٹی نے کھوج لیا تھا۔

وہ ہمیشہ سے ہی سندر تھی۔ لیکن نانو کی گندی مندی جڑی بوٹیوں تلے دبی ہوئی تھی۔ اس کھنڈر حویلی نے اسے کبھی نکھرنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ آج کومل آنٹی نے اسے جڑی بوٹیوں کی گانٹھ سے باہر نکال لیا تھا۔ وہ ان کی احسان مند تھی۔ کتنی اچھی تھیں وہ...... کتنے اچھے تھے یہ سب لوگ...... پرائے ہو کر اس کی اتنی سیوا کر رہے تھے۔ اور ایک چاند نانو تھیں انہوں نے ساری زندگی اتنی سی بات نہ مانی کہ حویلی کو اب بیچ دینا چاہیے۔ اس کے دل میں نانو کو لے کر جو ذرا سا نرم گوشہ تھا وہ بھی اب ختم ہو چکا تھا۔ اسے ایک دم سے ہی نانو بہت بری لگنے لگی تھیں۔

خود کو دیکھنے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے اپنے آج کے خریدے ہوئے کپڑے نکال لیے

تھے۔ وہ ان ساری چیزوں کو ایک بار پھر سے دیکھنے لگی تھی۔ کومل آنٹی نے اسے نجانے کتنے ہزاروں کی شاپنگ کروادی تھی۔ یا شاید لاکھوں کی۔ کچھ خیال آنے پر اس نے ایک ڈریس پر لگے ٹیگ پر سے اس کی قیمت پڑھی تھی۔ اور اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ اس ڈریس کی قیمت اتنی زیادہ تھی کہ اتنا قیمتی لباس تو اس نے کبھی عید پر بھی نہیں پہنا تھا۔ چاند نانو کی تو پیسے دیتے وقت جان نکلا کرتی تھی۔ بہت کنجوس تھیں وہ......

چیزوں کو اور خود کو دیکھتے ہوئے اسے یہ کمرا آج اپنے شایان شان لگ رہا تھا۔ ایک شہزادی کے لیے ایک پر آسائش کمرا......

بہت رات گئے وہ سونے کے لیے لیٹی تھی۔ نیند تو اگرچہ اسے تب بھی نہیں آ رہی تھی۔ لیکن صبح وقت پر اٹھنے کے خیال سے وہ اپنے ساتھ زبردستی کرتے ہوئے سو گئی تھی۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ جس بڑھیا کو وہ خود غرض سمجھ رہی تھی اس کی ساری غرض اسی کے لیے تھی اور جن لوگوں کو وہ اپنے لیے بہت اچھا سمجھ رہی تھی وہ اس سے کیا فائدہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔

☆......☆......☆

حویلیاں شہر پر شام سمے سے ہی سیاہ بادل اُمڈ اُمڈ کر آنے لگے تھے۔ بارش کا موسم تھا تو نہیں...... لیکن بادل بتا رہے تھے کہ بے موسم کی بارش ہونے والی ہے اور خوب کھل کر ہونے والی ہے۔ رات ہونے تک ویسا ہی ہوا جیسا کہ توقع کی جا رہی تھی۔ پہلے تیز ہوا کے ساتھ رم جھم شروع ہوئی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے بارش طوفانی ہو گئی تھی۔ جیسے زمین والوں پر کوئی غصہ نکال رہی ہو۔

چاند نے دھوپ میں سوکھتی اپنی جڑی بوٹیوں اور دوائیوں کو بروقت اٹھا لیا تھا۔ ورنہ ان کے بھیگ جانے کا قوی امکان موجود تھا۔ کھڑکیاں بھی اس نے ایک ایک کر کے ساری ہی بند کر دی تھیں۔ ورنہ تیز ہوا سے خالی حویلی میں جب کھڑکیاں آپس میں بجتی تھیں تو چاند کا دل ہولنے لگتا تھا۔ اپنی طرف

سے اس نے سارے حفاظتی اقدامات کر لیے تھے لیکن بارش اپنے جو تیور دکھا رہی تھی اس سے احساس ہوا کہ اس کے پاس ایک بڑی چھتری بھی ہونا چاہیے تھی۔ اتنی بڑی کہ جو وہ پوری حویلی پر پھیلا کر اسے ایسی طوفانی بارش سے بچا سکتی۔

رسوئی کی کھڑکی سے بارش کو دیکھتے ہوئے وہ ساتھ ساتھ اپنے اور آمنہ کے لیے کھانا بھی بنا رہی تھی۔ چھوٹا سا کام بھی اسے ان دنوں بہت تھکا دیا کرتا تھا۔ پہلے باریشہ اس کے پاس ہوتی تھی تو اسے بہت سہولت رہا کرتی تھی۔ اب تو وہ بھی ناراض ہو کر نجانے کہاں چلی گئی تھی۔ اس نے اسے تلاش کرنا چاہا تھا لیکن ارشادی بابا نے اسے ایسا کرنے سے منع کر دیا تھا۔

''صندل کو واپس حویلی میں آ کر کیا مل گیا تھا جو باریشہ کو مل جائے گا۔ تم چاہتی ہو کہ باریشہ بھی اپنے ساتھ وہی کرے جو صندل نے اپنے ساتھ کیا تھا؟'' ارشادی بابا نے چاند سے پوچھا تھا۔ اور چاند کو خوف سے جھرجھری آ گئی تھی۔

''ہرگز نہیں......''

''پھر جہاں وہ چلی گئی ہے، اسے وہاں ہی رہنے دو...... وہ یہاں واپس آئی تو مر جائے گی۔''

''لیکن وہ ہے کہاں......؟''

''وہ جہاں بھی ہے، سکون میں ہے۔ بہت خوش ہے۔ اس نے اپنی کوئی اطلاع مجھے بھیجی تو تمہیں ضرور بتاؤں گا۔ فی الحال اسے تلاش کرنا بند کر دو۔ اس نے جب آنا ہوگا، خود ہی آ جائے گی۔'' ارشادی بابا کی باتوں سے چاند کو اندازہ ہو گیا تھا کہ باریشہ جہاں بھی ہے ارشادی بابا اس کے بارے میں جانتا ہے۔ جیسے وہ صندل کے بارے میں سب جانتا تھا۔ پھر اس کا یہ کہنا کہ جو صندل نے اپنے ساتھ کیا، باریشہ بھی اپنے ساتھ ایسا نہ کر لے۔ اس بات نے چاند کو ڈرا دیا تھا۔ اور اس نے باریشہ کو تلاش کرنا بند کر دیا تھا۔

دوافراد کا کھانا بنا کر وہ باہر نکلی تو بری طرح سے تھک چکی تھی۔ آمنہ کے کمرے میں جا کر اس نے بیڈ پر لیٹی ہوئی بوڑھی آمنہ کو پکارا تھا۔

''بوا......! اٹھ جاؤ...... کھانا لائی ہوں تمہارے لیے۔''

جواب میں آمنہ نے کوئی جنبش نہیں کی تھی۔

''بوا......!'' وہ پریشان ہوئی تھی۔ کھانا سائیڈ پر رکھ کر وہ آمنہ کے قریب ہوئی تھی۔ آمنہ کا چہرہ اس نے پلٹا تھا اور دھک سے رہ گئی تھی۔ وہ چہرہ ایسے لڑھک گیا تھا جیسے بے جان ہو چکا ہو۔ اس نے جلدی سے سانس چیک کی تھی۔ سانس چل رہی تھی لیکن ہلانے جلانے پر بھی آمنہ ہوش میں نہیں آ رہی تھی۔

''یا اللہ خیر!'' چاند بری طرح سے گھبرا گئی تھی۔ اپنی چادر پکڑ کر وہ جلدی سے حویلی سے باہر بھاگی۔ جب وہ بڑا دروازہ کھول رہی تھی تب تک تیز بارش مزید تیز ہو چکی تھی۔ وہ لمحے بھر میں ساری بھیگ چکی تھی۔

ارشادی بابا کی دکان بھی بند تھی۔ اس نے دروازے پر دستک دی تھی لیکن نجانے کتنی دستک دینے کے بعد بھی جواب نہیں آیا تھا۔ شاید ارشادی بابا اندر سو چکا تھا۔ وہ خود ہی ڈاکٹر کی دکان کی طرف بھاگی تھی۔ ڈاکٹر اپنے کلینک میں موجود تھا۔

''آپ میرے ساتھ میرے گھر چل سکتے ہیں؟'' اس نے التجا آمیز لہجے میں کہا تھا۔

''جی...... کیوں نہیں...... ہم لوگوں کی خدمت کرنے کے لیے ہی تو موجود ہیں۔''

''پھر جلدی کریں۔ کہیں دیر نہ ہو جائے۔''

ڈاکٹر اپنی گاڑی میں اسے بٹھا کر حویلی تک آیا تھا۔ بے ہوش آمنہ کا معائنہ کیا گیا تھا۔

''گھبرانے والی کوئی بات نہیں ہے۔ ان کا بلڈ پریشر ہائی تھا جس کی وجہ سے ان پر بے ہوشی طاری ہو چکی ہے۔ میں نے انجکشن لگا دیا ہے۔ اب یہ سکون سے سوتی رہیں گی۔ آپ انہیں ڈسٹرب

مت کیجیے گا۔'' ڈاکٹر نے اسے تسلی دی۔ ''کچھ دوائیاں لکھ دیتا ہوں۔کل سے بلاناغہ انہیں استعمال کروایئے گا۔''

''جی بہتر......''

ڈاکٹر اپنی فیس وصول کر کے چلا گیا تھا۔ چاند چند لمحے سوتی ہوئی آمنہ کو دیکھتی رہی تھی اور پھر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔ کمرے میں جا کر اس نے اپنے گیلے کپڑے تبدیل کیے تھے جو کہ ابھی تک ایسے ہی گیلے تھے جیسے صاف کرنے کے لیے کھلے پانی میں ڈالے گئے ہوں۔ اپنے جسم کو اس نے تولیے سے خشک کیا تھا اور نئے کپڑے پہن کر، انگیٹھی جلا کر سو گئی تھی۔

صبح دن چڑھے اسے آمنہ نے جگایا تھا۔ چاند کو چھونے پر آمنہ کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔ تڑپ کر وہ پیچھے ہوئی تھی۔ چاند کا جسم بری طرح سے تپ رہا تھا۔ آمنہ کو ٹھیک کرنے کے چکر میں اسے شدید بخار چڑھ چکا تھا۔

☆......☆......☆

''کیا کر رہی ہو باریشہ......؟'' کومل بنا دستک دیے اس کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ اس کی اچانک آمد پر باریشہ کچھ شرمندہ سی ہو گئی تھی کیونکہ وہ ایک بار پھر سے اپنی کل کی شاپنگ دیکھ رہی تھی۔

''کچھ خاص نہیں......'' اس نے جلدی سے چیزوں کو سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔ کومل مدھم سا مسکرائی تھی۔ وہ سب سمجھ رہی تھی کہ باریشہ کے دل و دماغ میں کیا چل رہا ہے۔

''ادھر بیٹھو میرے پاس......'' صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے باریشہ کو اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔ وہ خاموشی اور ادب سے ان کے برابر جا کر بیٹھ گئی تھی۔

''کل تم مجھ سے کیا پوچھ رہی تھیں باریشہ؟''

''کب......؟''

''شام میں...... شاپنگ پر جانے سے پہلے...... لڑکیوں کے بارے میں پوچھ رہی تھی تم شاید......''

''جی...... انہی کے بارے میں پوچھ رہی تھی کہ......''

''یہ کون ہیں اور ہمارے گھر میں کیوں رہ رہی ہیں؟'' اس نے اس کی بات مکمل کی تھی۔ باریشہ نے ہاں کے انداز میں سر ہلا دیا تھا۔ وہ یہی پوچھنا چاہ رہی تھی۔

''یہ لڑکیاں بے سہارا ہیں میری جان...... بے یارومددگار۔''

''بے سہارا......؟ کیا کوئی ان کا گھر بار نہیں ہے؟''

''ہے...... گھر بار تو ہے۔ لیکن ساتھ مجبوریاں بھی ہیں۔ یہ سب یہاں نوکریوں کی تلاش میں آئی ہوئی ہیں۔ تمہارے بستامی بابا ہمیشہ سے ہی بہت رحم دل رہے ہیں۔ وہ ان لڑکیوں کو اپنی جان پہچان سے کام دلوا دیا کرتے ہیں۔ پہلے پہل کسی ایک لڑکی کی مدد کی تھی۔ اب تو سب کو ہی جیسے اس گھر کا رستہ مل گیا ہے۔ تمہارے بستامی بابا کسی کو کچھ نہیں کہتے...... یہ گھر تو سمجھو کہ ہاسٹل بن چکا ہے۔ وہ بھی بنا کرائے کا ہاسٹل......'' کومل کہہ کر خود ہی ہنسنے لگی تھی۔

''میں نے کئی بار روکا بستامی کو اس کام سے...... لیکن وہ نہیں رکا۔ پھر میں بھی کچھ نرم پڑ گئی۔ میری خود کی تو کوئی اولاد ہے نہیں...... تو ان لڑکیوں کو اس گھر میں رکھ کر وہ کمی پوری کر لیتی ہوں۔''

''بستامی بابا بہت اچھے ہیں۔ آپ بھی بہت اچھی ہیں۔ آپ دونوں نے مجھے بھی اس گھر میں رکھا ہوا ہے۔''

''تم تو اپنی ہو۔ تمہاری بات اور ہے میری جان......'' کومل نے پیار سے کہا تھا۔ باریشہ آگے سے مسکرا دی تھی۔

''امید ہے تمہاری تسلی ہو چکی ہو گی۔ میں بس یہ ہی بتانے آئی تھی۔'' وہ اٹھی تھی۔ ''ایک اور

بات......ان لڑکیوں سے زیادہ بات چیت مت کرنا۔''

''کیوں؟''

''وہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ بھلا ان کی بات پر رضامندی نہ دیتی تو اور کس کی بات پر رضامندی دیتی۔ کومل بیگم نے اسمائل پاس کی تھی اور پھر کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔

دوپہر ہونے تک وہ اپنے کمرے میں ہی بند رہی تھی۔ اس نے بھرپور طریقے سے غسل کیا تھا۔ نئی پروڈکٹ کو استعمال کیا تھا۔ پہننے کے لیے بہت خوب صورت ڈریس نکالا تھا۔ اور پھر لائٹ سا میک اپ کر کے کمرے سے باہر آئی تھی۔

وہ سانول سے ملنے اس کے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ کافی وقت ہوا تھا اس کو سانول سے ملے ہوئے۔ اس کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اسے باہر لان میں چند ایک لڑکیاں بیٹھی باتیں کرتی ہوئی نظر آئی تھیں۔ اس میں سے دو تو وہی تھیں جن سے اس کی بات چیت ہو چکی تھی۔ وہ انہیں نظرانداز کر کے آگے بڑھ جانا چاہتی تھی کیونکہ کومل آنٹی نے اسے ان سے بات چیت کرنے سے منع کیا تھا۔ لیکن ان کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ انہیں پوری طرح سے نظرانداز بھی نہیں کر سکتی تھی اور واپس بھی نہیں مڑ سکتی تھی۔ پھر بھی وہ ایسے ظاہر کرتے ہوئے آگے بڑھتی رہی جیسے بے دھیانی میں چل رہی ہو۔ جب سائرہ نے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا تھا۔

''ہائے......!'' اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ ان کے پاس جا کر ان سے چند منٹ بات چیت کر لے۔

''ہیلو......کیسی ہو؟'' اس نے ان کے پاس جا کر مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ شیزا اسے دیکھ کر جیسے بری طرح سے چونکی تھی۔

''تم باریشہ ہو؟'' اس نے حیرت سے پوچھا تھا۔ ''وہ کون سا علاقہ ہے تمہارا...... ہاں...... حویلیاں سے؟''

باریشہ نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

''تم تو پہچانی نہیں جا رہی ہو باریشہ...... کیا کروایا ہے تم نے اپنے ساتھ......'' وہ حیرت کے مارے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''کومل آنٹی مجھے پارلر لے گئی تھیں۔''

''اللہ...... تم پر تو جیسے پارلر والی نے جادو کر دیا ہے۔ تم تو بہت بدل گئی ہو یار......''

جواباً وہ مسکرائی تھی۔ اپنی تعریف سننا اسے اچھا لگ رہا تھا۔

''تمہارے گھر والے تو تمہیں شاید پہچان ہی نہ سکیں۔'' سائرہ نے کہا تو وہ کچھ اداس سی ہو گئی۔

''میرے گھر والے نہیں ہیں۔''

''کیا کوئی نہیں ہے؟''

''ایک نانو ہیں۔ اور میں اب ان سے ملنا نہیں چاہتی ہوں۔''

''اوہ...... سو سیڈ...... خیر فکر مت کرو...... یہاں پر بیش تر لڑکیوں کے گھر والے نہیں ہیں۔ یا ہیں تو سہی...... لیکن وہ انہیں قبول نہیں کرتے ہیں۔''

''ہاں...... بتایا کومل آنٹی نے کہ یہ گھر ایک طرح سے فلاحی ادارہ ہے۔''

''کیا......؟ فلاحی ادارہ؟'' تینوں لڑکیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا اور پھر وہ تینوں دل کھول کر ہنسی تھیں۔ ان کے اس طرح ہنسنے پر باریشہ کو کچھ شرمندگی ہوئی تھی۔ ان کی ہنسی بہت دیر کے بعد تھمی تھی۔

''انہیں جھوٹ بولتے شرم نہ آئی۔''

''نہیں......ان کا مطلب تھا کہ اس گھر کو سب ہاسٹل سمجھ کر رہ رہی ہیں۔''

''کومل میم ہر نئی لڑکی سے یہ ہی سب کہتی ہیں۔ سن کر کچھ حیرانی نہیں ہوئی۔'' سائرہ نے منہ بناتے ہوئے کہا تھا۔ اس کی بات اور انداز پر باریشہ کو کچھ تشویش ہوئی تھی۔

''تم......کیا کہنا چاہتی ہو سائرہ؟''

''بات سنو میری باریشہ......تم مجھے کچھ معصوم سی لگتی ہو۔ اور معصوم سے زیادہ انجان لگتی ہو۔ چھوٹے شہر سے ہونا اس لیے......بلکہ میں تو اسے قصبہ کہوں گی۔ حویلیاں میں رہتے ہوئے تمہیں اندازہ تک نہیں کہ باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ بڑے شہروں میں زندگیاں کہاں تک پہنچ گئی ہیں۔ اور اس گھر کی زندگی کیا ہے؟''

''کیا ہے......بتاؤ مجھے......''

''نہیں سمجھ پاؤ گی۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم واپس حویلیاں چلی جاؤ۔''

''لیکن کیوں؟''

''یہ جگہ تمہیں راس نہیں آئے گی۔ یہ تمہاری معصومیت چھین لے گی۔''

''ایسا کیا ہے اس جگہ میں؟''

''سیدھی سی مثال ہے میری جان......چھوٹے گھر کا کرایہ کم ہوتا ہے۔ اور بڑے گھر کا زیادہ ہوتا ہے۔ اور یہ گھر تو بہت بڑا ہے۔ بہت زیادہ خراج لے گا تم سے......''

''خراج......؟''

''یہاں رہنا پل صراط پر چلنے کے مترادف ہے۔''

''سائرہ......!''

ایمن بیگم کی آواز گونجی تھی۔ اور یہ گونج تنبیہ ہونے کے ساتھ ساتھ غصیلی بھی تھی۔ سائرہ چپ ہو

گئی تھی۔ کیونکہ اسے ایسا ہی اشارہ کیا گیا تھا۔ ایمن ان کے قریب آئی تھی۔ وہ باری باری تینوں کو گھورنے لگی تھی۔

تینوں نے ڈر کے مارے سر جھکا لیا تھا۔

''تم سب جاؤ اندر اپنے اپنے کمرے میں......'' ایمن بیگم کے کہنے پر تینوں اپنے اپنے کمروں کو چلی گئی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد ایمن بیگم نے پیار سے باریشہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

''کیا کہہ رہی تھیں لڑکیاں......؟''

''نہیں...... کچھ خاص نہیں......''

''تم نے وہ بات تو سنی ہوگی۔ جس کے ساتھ نیکی کرو، اس کے شر سے بچو......''

''جی......''

''تو پھر ان لڑکیوں سے بھی بچ کر رہنا...... ان کے ساتھ بستامی اتنی نیکیاں کر چکا ہے کہ اب ان سے بچنا ہی بہتر ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گئی۔''

''اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔''

اور وہ سانول کے کمرے میں جانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے اپنے کمرے میں واپس چلی آئی تھی۔

☆......☆......☆

بہت دنوں کی سردی کے بعد آج موسم کچھ کھلا تھا۔ دھوپ میں شدت تو نہیں تھی لیکن روشن تھی اور اسی باعث آنکھوں کو بھا رہی تھی۔ وہ ٹیرس پر نکل آئی تھی۔ اور موسم کو انجوائے کرنے لگی تھی۔ کافی دنوں سے گرم شال اوڑھ اوڑھ کر اس کا وجود تھک گیا تھا اس لیے آج اس نے شال اوڑھنے کا تردد نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے لباس کے ساتھ کا دوپٹا گلے میں لیے ہی باہر ٹیرس پر کھڑی تھی۔ عریاں بازوؤں کو چھپانے کا

خیال اس کے دل سے جاتا رہا تھا۔

یہاں کے ماحول کا اثر اس پر پوری طرح سے ہونے لگا تھا۔ وہ یہاں کی لڑکیوں کے رنگ میں رنگنے لگی تھی۔

البیلا سجن آو رے...... البیلا سجن آو رے......

مورا اتی من سکھ پائیو رے، البیلا سجن آو رے......

وہ کل رات دیکھی ہوئی فلم کا گیت گنگنا رہی تھی۔ گانا مشکل تھا۔ اسے حیرت ہوئی تھی کہ کومل آنٹی نے کیسے اسے حرف بہ حرف بالکل ٹھیک بتایا تھا۔ انہوں نے نہ صرف اسے لفظ بتائے تھے بلکہ شاعری کا مطلب بھی سمجھایا تھا۔ شاید کسی زمانے میں انہیں شاعری کا شغف رہا ہو ورنہ اتنی مشکل شاعری کو سمجھنا خاصا مشکل کام تھا۔ اس فلم کے گانے اسے اچھے لگے تھے یا شاید اس نے ہی کسی گانے کو خوش گوار ماحول میں پہلی بار سنا تھا۔ حویلیاں میں رہتے ہوئے وہ اتنی خوش کبھی نہیں ہوئی تھی جتنی ان دنوں میں تھی۔

''باریشہ! یہ تم ہو......'' کومل وہاں تک آئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ ''یہ گانا تم گا رہی ہو کیا؟''

''جی...... میں ہی گا رہی تھی۔''

''تم تو ہو بہو بالکل ویسا ہی گا رہی تھی جیسا کہ میں نے فلم میں سنا تھا۔ مجھے لگا کہ کسی نے فلم کا گانا لگایا ہوا ہے۔''

جواباً اس نے مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔

''پھر سے گاؤ ذرا......'' اس نے فرمائش کی تھی۔ وہ کچھ جھینپ سی گئی تھی۔

''شرما رہی ہو کیا...... میری اتنی سی بات نہیں مان سکتیں۔''

اور اسے مجبوراً شرماہٹ کو رخصت کرتے ہوئے پھر سے گانا پڑا تھا۔

البیلا سجن آ ورے...... البیلا سجن آ ورے......

مورا اتی من سکھ پائیو رے، البیلا سجن آ ورے......

"خوب...... بہت خوب...... کمال ہو گیا۔ کیا تم نے گانا گانا سیکھا ہے کسی سے؟"

"نہیں...... بالکل نہیں......"

"جھوٹ بول رہی ہو نا؟"

"بالکل نہیں...... آپ سے کیوں جھوٹ بولوں گی۔" اس نے قطعیت سے انکار میں سر ہلایا تھا۔

"مجھے لگا شاید تم بھی اپنی ماں کی طرح آرٹ میں دلچسپی رکھتی ہو۔"

"اپنی ماں کی طرح......؟"

"صندل کی بات کر رہی ہوں...... وہ ستار بہت اچھا بجایا کرتی تھی۔"

"کیا سچ میں...... آپ کو کیسے پتا......؟"

"تمہیں کیسے نہیں پتا...... تمہاری نانو نے تمہیں کچھ نہیں بتایا کیا......؟"

"چاند نانو نے تو کبھی اس بات کا ذکر نہیں کیا۔"

"اف! بہت عجیب ہے تمہاری نانو...... کیا کہوں میں اس بارے میں......" اس نے گہرا سانس بھرا تھا۔

"آپ بتا دیں۔" باریشہ کے کہنے پر کومل نے چہرے پر مسکراہٹ سجائی تھی۔

"صندل بہت اچھا ستار بجایا کرتی تھی۔ ان فیکٹ...... اسے ستار بجاتا دیکھ کر ہی تو تمہارا باپ اس پر مر مٹا تھا۔" کومل کہہ کر ہنسنے لگی تھی۔ "لیکن اب تم مجھ سے میر زاد کے بارے میں کچھ مت پوچھنا۔ میں اس کے بارے میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے...... نہیں پوچھوں گی۔" مسکراتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

''میرے خیال سے تمہیں بھی اپنی ماں کی طرح کچھ ایسا ہی کرنا چاہیے میری جان......''

''مثلاً کیسا......؟''

''آرٹ میں دلچسپی لو......ٹھیک ہے ستار کی ڈیمانڈ آج کل کم ہے لیکن اور بہت سی چیزیں ہیں جو سیکھی جا سکتی ہیں۔رقص ہے، میوزک ہے، گائیکی ہے۔تمہارا گائیکی کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

کومل اس سے پوچھ رہی تھی اور اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دے۔کومل نے چند لمحے اس کے کچھ بولنے کا انتظار کیا تھا۔پھر وہ جیسے اس کی جھجک کو سمجھ گئی تھی۔

''دیکھو میری جان! تم نے ایک بہت ہی چھوٹے قصبے میں آنکھ کھولی ہے۔وہاں تھا ہی کیا......کچھ بھی تو نہیں......ایک بہتر طرز کا بازار تک تو ہے نہیں وہاں......نہ کوئی سینما ہے نہ تھیٹر......اسکولوں میں بھی روایتی تعلیم دی جاتی ہے۔جانتا ہی کون ہے حویلیاں کو......یہاں کسی کے سامنے نام لو......دس میں سے بمشکل دو لوگ ہی حویلیاں کو جانتے ہوں گے۔تم کیا چاہتی ہو کہ کیا تم بھی حویلیاں کی طرح گم نام رہو۔''

''نہیں......ایسا تو نہیں چاہتی میں......''

''پھر سمجھ لو کہ اپنی پہچان بنانے کے لیے کچھ کرنا پڑتا ہے۔کچھ ایسا جو لوگوں کو یاد رہ جائے۔وہ مدتوں اسے بھلا نہ پائیں۔تم میری باتوں سے اس لیے ہچکچا رہی ہو کہ خیر سے چاند تمہیں کبھی حویلیاں سے باہر لے کر ہی نہیں گئی۔تم نے کوئی بڑا شہر دیکھا ہی نہیں......دیکھا ہوتا تو میری بات پر فوراً آمادگی دے دیتیں......پھر بھی میں تمہیں سراہوں گی کہ اس کھنڈر حویلی میں رہتے ہوئے تم نے وہاں سے نکل جانے کے بارے میں سوچا۔تمہارا یہ اقدام قابل ستائش ہے۔ورنہ اس کھنڈر حویلی نے تمہیں بھی کھنڈر کر دینا تھا۔ویسے بھی وہاں کون بچ پایا ہے۔''

کومل بول کر چپ ہوئی تھی۔باریشہ کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کومل نے خود ہی کہا تھا۔

"کیا میں تمہارے لیے کسی استاد کا انتظام کروں؟"

ان کے سوال پر باریشہ کو سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کیا جواب دے۔ اس نے اپنی زندگی کو ایک سنگر کے طور پر کبھی بھی نہیں دیکھا تھا۔ اور یہ شعبہ اس کے لیے کچھ زیادہ قابل ستائش نہ تھا۔

"پتا نہیں...... فیصلہ نہیں لے پا رہی ہوں۔"

"ایسا کرو کہ پھر ٹرائی کر کے دیکھ لو...... ایک ہفتہ استاد جی کو دو...... اگر تو یہ چیز اچھی لگی تو مزید کلاس لیتی رہنا...... ورنہ اس سلسلے کو بند کر دیا جائے گا۔"

یہ بات اسے کچھ کچھ قابل قبول لگی تھی۔ "ٹھیک ہے، جیسا آپ کہیں۔" اور اس نے آمادگی دے دی تھی۔

کومل کے چہرے پر سکون نظر آنے لگا تھا۔ جیسے کوئی بہت ہی اہم کام سرانجام دیا ہو۔

"ٹھیک ہے۔ میں کل ہی تمہارے لیے کسی استاد کو دیکھتی ہوں۔" کومل نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ اندر سے وہ بہت زیادہ خوش تھی۔ یہ کام بہت آسان تھا جسے وہ بہت مشکل خیال کیے ہوئے تھی۔

☆......☆......☆

"سا...... رے...... گا...... ما...... پا...... دھا...... نی...... سا۔

اسے میرے پیچھے پیچھے گاؤ......"

اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ استاد طافو کے ساتھ اپنی آواز ملا دی تھی۔

"سا...... رے...... گا...... ما...... پا...... دھا......" اس نے استاد طافو کے ساتھ ہم آواز ہونے کی کوشش کی تھی۔ استاد نے درمیان میں رک کر اسے دیکھا تھا۔

"کیا پہلے گانا سیکھتی رہی ہو کسی سے؟" انہوں نے پوچھا تھا۔

باریشہ نے ناں میں سر ہلا دیا تھا۔

''میں نہیں مانتا......''

''میں جھوٹ نہیں بول رہی استاد جی......''

اس نے ہنس کر کہا تھا۔ اسے تو اپنی آواز میں ایسا کچھ انوکھا کبھی محسوس نہ ہوا تھا۔ پھر ہر کوئی اس کی تعریف کیوں کرتا جا رہا تھا۔ وہ اپنی معصومیت کی نظر ہٹا کر دیکھتی تو سب سمجھ جاتی...... یہ اسے جال میں پھانسنے کی تیاری ہو رہی تھی۔ ورنہ اس کی آواز ایسی تھی کہ اگر کوئی اصلی استاد سنتا تو شاید اسے گانا سکھانے سے ہی انکاری ہو جاتا۔

''بہت آگے جاؤ گی تم...... بہت......'' استاد طافو نے آنکھوں میں ستائش بھرتے ہوئے کہا تھا۔

''یاد رکھنا...... میری پیشن گوئی ہے یہ...... اور تب مجھے بھی یاد رکھنا۔ بھول نہ جانا......''

''بالکل نہیں...... سکھانے والوں کو انسان بھلا کب بھولتا ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

استاد طافو ایک ماہر گائیک تھے۔ اور گائیک سے زیادہ وہ چال باز انسان تھے۔ وہ برسوں سے یہاں آ رہے تھے۔ اور بستامی کے لیے کام کرتی لڑکیوں کو تیار کر رہے تھے۔ انہیں پتا تھا کہ یہاں کی لڑکیوں کو کیسے رام کرنا ہے۔ پھر باریشہ کی بات تو اور تھی۔ کومل بیگم نے کہا تھا کہ خاص ماحول میں پلی بڑھی لڑکی ہے، زیادہ محنت مانگے گی۔ لیکن باریشہ کو دیکھ کر انہیں اندازہ ہوا تھا کہ یہ لڑکی زیادہ محنت کیے بنا بڑا مقام بنا لے گی۔ کیونکہ آج کل گانا سننے سے زیادہ دیکھا جا رہا تھا۔

آنے والے چند دنوں میں استاد طافو نے باریشہ کو سکھایا کم تھا اور اس کی تعریف زیادہ کی تھی۔ اس سے دہرے فائدے حاصل ہوئے تھے۔ ایک تو یہ کہ اس کا اب کلاس چھوڑنے کا ارادہ ملتوی ہو گیا تھا۔ دوسرا یہ کہ وہ خود کو سنگر ہی سمجھنے لگی تھی۔ اس سے اس کے اندر اتراہٹ پیدا ہونے لگی تھی جو چھوٹے شہر میں پلنے بڑھنے کی وجہ سے اس کے اندر پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔ بستامی کے راستے صاف ہونے لگے تھے۔ باریشہ میں ایک خود اعتمادی پیدا ہونے لگی تھی۔ اب اگر وہ ان سے نظر بچا کر حویلیاں واپس چلی بھی

جاتی تو قوی امکان تھا کہ اگلے ہی روز خود بہ خود واپس آجائے گی۔

باریشہ ان دنوں خوش تھی۔ بہت زیادہ خوش...... اس کی وارڈ روب نت نئے کپڑوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس کی ڈریسنگ پر سونے اور سفید سونے کی بہت سی جیولری موجود تھی۔ ناشتا اور کھانا اس کی پسند کا بنتا تھا۔ ایک ڈرائیور اس کے لیے مختص تھا۔ وہ جہاں دل کرے آسکتی تھی۔ اس کے علاوہ کومل بہت بڑی رقم پاکٹ منی کے طور پر اسے دیتی تھی۔ وہ خوش کیسے نہ ہوتی...... اور اب تو وہ سنگر بننے جا رہی تھی۔ اس کی خود کی پہچان ہونے جا رہی تھی۔ جو خالص اس کی تھی اور اس سے کوئی نہیں چھین سکتا تھا۔

اور اس خوشی میں اسے اندازہ ہی نہیں ہو پایا کہ بستامی کے مشوروں پر کومل نے اسے طوائف بنانے کی پوری تیاری کر لی تھی۔

☆......☆......☆

''باریشہ بی بی......!'' کمرے کے دروازے پر کھڑی ملازمہ نے اسے مخاطب کیا تھا۔ ڈریسنگ پر اپنے وجود سے نظریں ہٹا کر اس نے ملازمہ کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا تھا۔

''بڑے صاحب گھر واپس آچکے ہیں۔ آپ کو یاد کر رہے ہیں۔''

''بستامی بابا......؟'' اس نے خوش گوار حیرت سے پوچھا تھا۔

''جی......!''

اور ملازمہ کے کہنے پر وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکلی تھی۔ بستامی لاؤنج میں کومل بیگم کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ باریشہ کو دیکھ کر وہ کھڑا ہوا تھا۔ باریشہ بھی اس کے سینے سے ایسے لگ گئی تھی جیسے اس سے برسوں سے جدا ہو۔ جبکہ یہ اس کی اس سے دوسری ملاقات تھی۔ بستامی کے سینے سے لگ کر اسے ویسی ہی راحت کا احساس ہوا تھا جیسا اس کا خود کا باپ ہوتا تو اس کے سینے سے لگنے سے اسے ہوتی......

بستامی نے باریشہ کا ماتھا چوم لیا تھا۔

''کیسی ہو باریشہ......؟'' اس نے پیار سے پوچھا تھا۔

''اچھی......بہت اچھی......'' وہ بہت کے لفظ کو کھینچتے ہوئے بولی تھی۔

''کوئی مشکل تو نہیں ہوئی اس گھر میں......؟'' وہ پھر سے صوفے پر بیٹھ گیا تھا اور اس نے باریشہ کو بھی اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

''بالکل نہیں......کومل آنٹی نے میرا ہر طرح سے خیال رکھا ہے۔'' وہ اس کے ساتھ لگ کر بیٹھتے ہوئے بولی تھی۔

''تم میری رشتے دار جو ہو......اور صندل کی بیٹی......تمہارا اچھے سے خیال رکھنا تو ہمارا فرض تھا۔ صندل بھی میری چہیتی ہوا کرتی تھی۔ چاند کے بعد وہ سب سے زیادہ پیار مجھ سے ہی کیا کرتی تھی۔''

''سچ میں......؟''

''ہاں......صندل زندہ ہوتی تو تم اس سے پوچھ سکتی تھیں۔''

''لیکن چاندنا نو نے تو کبھی ان باتوں کا ذکر نہیں کیا۔''

''وہ کیسے کرتی......اسے تو نجانے ہم سے کون سی نفرتیں ہیں جو ختم ہونے کا نام نہیں لے رہیں۔'' بستامی کے بجائے کومل نے کہا تھا۔ ''ورنہ اگر وہ مان جائے......تو وہ بھی یہاں آ کر رہے......کیا اس کھنڈر میں پڑی ہوئی ہے۔''

''جی......کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں۔''

ملازمہ تینوں کے لیے ڈیزرٹ لے آئی تھی جسے تینوں نے باتوں کے دوران انجوائے کیا تھا۔ اس دوران بستامی باریشہ سے پوچھتا رہا تھا کہ اسے گھر میں کسی چیز کی تنگی ہے تو وہ اسے بلا جھجک بتا سکتی ہے۔ اور باریشہ اس کی تسلی کرتی رہی تھی کہ اسے یہاں کوئی تنگی نہیں ہے۔ ڈیزرٹ ختم کر لینے کے بعد ملازمہ خالی برتن لے گئی تھی۔ اور پھر تینوں کے درمیان خاموشی آ گئی تھی۔ بستامی اور کومل اشاروں میں

ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے تھے۔

"میرے خیال سے اب اہم کام کر لینا چاہیے۔" بستامی نے باریشہ کو دیکھتے ہوئے کومل سے کہا تھا۔ باریشہ نے ناسمجھی سے بستامی کی طرف دیکھا تھا۔ کومل بیگم اشارہ سمجھتے ہوئے الماری کی طرف بڑھی تھی اور وہاں سے ایک فائل نکال لائی تھی۔ فائل اس نے باریشہ کے سامنے رکھی تھی۔ باریشہ کو کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

"یہ کیا ہے؟"

"ایک معاہدہ ہے۔ اس پر اپنے سائن کر دو۔"

"کیسا معاہدہ؟"

"یہ کہ تم اب ہمارے ماتحت ہو۔ تم یہاں سے واپس حویلی نہیں جا سکتی ہو۔ بلکہ ہماری مرضی کے بنا کہیں نہیں جا سکتی ہو۔ ہم تمہارے گارجین ہیں۔" کومل بیگم نے کچھ ایسے انداز سے کہا تھا کہ باریشہ کو اس لہجے میں اپنائیت ڈھونڈنے میں مشکل ہوئی تھی۔

"لیکن اس سب کی کیا ضرورت ہے؟"

"کل کو چاند کو پتا چلتا ہے کہ تم یہاں ہو تو وہ ہم پر تمہیں اغواء کرنے کا مقدمہ بھی کروا سکتی ہے۔"

"وہ ایسا نہیں کریں گی۔"

"یہ تو تم کہہ رہی ہو نا...... تم ماضی کو جانتی نہیں ہو۔ اس عورت نے ہمارے ساتھ کیا کیا نہیں کیا ہے۔ ہم اس کی طرف سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔ پھر دوسرا ہم نہیں چاہتے کہ پھر سے ہمارا دل دکھے۔" کومل نے لہجے میں اداسی بھرتے ہوئے کہا تھا۔ باریشہ نے ناسمجھی سے اسے دیکھا تھا۔

"تم چند دن یہاں رہی ہو اور مجھے ایسے لگ رہا ہے کہ جیسے تم ہمیشہ سے یہاں ہی رہتی چلی آ رہی ہو۔ مجھے بے اولاد ہونے کی محرومی بھولنے لگی ہے۔ لیکن اگر تم چلی گئیں تو......" کومل کہہ کر رونے لگی تھی۔

''میں نہیں جاؤں گی کومل آنٹی......''

''پہلے بھی ایک لڑکی تھی۔ وہ بھی یہی کہتی تھی۔ پھر جب اس کی ماں اسے گاؤں سے لینے آئی تو وہ چلی گئی۔ میں ہفتوں روتی رہی تھی۔ اس بار میں خود کے ساتھ ایسا نہیں ہونے دوں گی باریشہ...... تم جانا چاہتی ہو تو جا سکتی ہو، ہم تمہیں نہیں روکیں گے۔ بستامی خود تمہیں حویلیاں چھوڑ آئے گا۔ لیکن اگر یہاں رہنا ہے تو گارنٹی دو...... ان پیپرز پر سائن کر دو۔'' کومل نے کہا تھا۔ باریشہ نے فائل کھول کر دیکھی تھی۔ وہ بے دھیانی سے اندر کے کاغذات کو دیکھ رہی تھی۔

''اگر تسلی سے پڑھنا چاہتی ہو تو کمرے میں لے جا کر پڑھ سکتی ہو۔'' بستامی نے پیار سے کہا تھا۔

''نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' اس نے کہا تھا کیونکہ ایسا کرنا اسے ان کے خلوص پر شک کرنے جیسا لگ رہا تھا۔

''تو پھر کرو سائن ان پر......'' کومل نے جلدی سے اسے پین پکڑایا تھا۔ باریشہ نے پین پکڑ لیا تھا اور پھر کچھ بھی سوچے بنا تینوں پیپرز پر سائن کر دیے تھے۔ کومل اور بستامی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے اسے دیکھ رہے تھے۔

''اب تم اپنے کمرے میں جا سکتی ہو۔'' بستامی بابا نے اسے وہاں سے جانے کو کہا تھا۔

☆......☆......☆

شب و روز ایسے گزر رہے تھے جیسے وہ کسی طرح کا کوئی امتحان پاس کرنے جا رہی ہو۔ استاد طافو دن میں دو بار آتے تھے۔ ان کی کلاس جو کہ پہلے تو اسے کافی خوش گوار لگا کرتی تھی اب تھکا دیا کرتی تھی۔ راگ گا گا کر اس کا گلا خشک ہو جایا کرتا تھا۔ یہ مشق جو شاید مذاقاً شروع ہوئی تھی اب کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہوتی جا رہی تھی۔ استاد طافو بھی پہلے دن والے شفیق استاد نہیں رہ گئے تھے۔ وہ کچھ کچھ غصیلے انداز میں پیش آنے لگے تھے۔ جس سے باریشہ کو ان سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ آج کل ویسے بھی ''سکل بن

پھول رہی سرسوں'' کی مشق کی جا رہی تھی۔ اور امیر خسرو کی یہ شاعری اتنی مشکل تھی کہ اسے لگنے لگا تھا کہ وہ کبھی اس سرسوں کو سروں میں ڈھال ہی نہیں سکے گی۔ پھر مسئلہ یہ تھا کہ بات یہاں تک بھی نہیں رکی ہوئی تھی۔ کومل نے اسے جم جوائن کروا دیا تھا۔

''اس کی کیا ضرورت ہے؟'' وہ بس اتنا ہی پوچھ سکی تھی۔

''ورزش سے جسم شیپ میں رہتا ہے۔''

''میرے خیال سے مجھے اس کی ضرورت نہیں......''

''صحت مند جسم صحت مند ذہن کی علامت ہوتا ہے میری جان......''

اور اس نے چپ چاپ جم جوائن کر لیا تھا۔ اس کی ٹرینر جو پہلے تو استاد طافو کی طرح بہت نرم مزاج تھی دن بدن سختی کا مظاہرہ کرنے لگی تھی۔ وہ نہ صرف اس کی باڈی کو شیپ دے رہی تھی بلکہ اسے چلنے، اٹھنے بیٹھنے کے طریقے بھی سکھا رہی تھی۔ اسے یہ سب عجیب لگ رہا تھا۔

''جب پبلک کے سامنے ظاہر ہوتے ہیں تو مکمل اعتماد کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اگر انہی کی طرح کے ہو گے تو وہ تم میں دلچسپی نہیں لیں گے۔ ظاہر ہے ان سے کچھ آگے ہو گی تو وہ تمہیں دیکھیں گے۔ تمہارے فین ہوں گے۔''

ٹرینر لڑکی کی بات اسے اچھی لگی تھی۔ وہ محنت سے اس کے رولز فالو کرنے لگی تھی۔ اس نے اسے کھانے پینے کا ایک چارٹ بھی بنا دیا تھا۔ گھر میں اس کے لیے وہی بنتا تھا جو چارٹ پر لکھا ہوتا تھا۔ کومل اسے ہر ہفتے لازمی پارلر لے کر جایا کرتی تھی۔ پھر وہاں وہی سب کچھ ہوتا جو بہت بار ہو چکا تھا۔ یہ سب جو پہلے تو اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، اب اچھا لگنے لگا تھا۔ اگرچہ سمجھ میں اب بھی نہیں آیا تھا۔ لیکن وہ خود میں ہوتی تبدیلیاں دیکھ رہی تھی تو اسے سب اچھا لگنے لگا تھا۔ یہ جس بھی چیز کی تیاری تھی، اسے اس میں کامیاب ہونا تھا۔ اپنی خود کی پہچان بنانا تھی۔ اگر اس نے کنویں کا مینڈک ہی بن کر رہنا تھا تو بہتر تھا کہ

وہ حویلیاں میں ہی رہتی...... یہاں آ گئی تھی تو یہاں کی تیز رفتار زندگی کے ساتھ خود کو ایڈجسٹ کرنا ضروری تھا۔

صبح چھ بجے سے اس کی روٹین شروع ہوتی تھی۔ پہلے جاگنگ، پھر سنگیت کی کلاس......اس کی بعد شام میں جم......اور رات میں پھر سے سنگیت کی کلاس...... جب تک نیند سے اس کی آنکھیں بند نہیں ہونے والی ہو جاتی تھیں، استاد طافو اسے چھٹی نہیں دیا کرتے تھے۔ رات میں جب وہ اپنے کمرے میں جایا کرتی تھی تو بہت تھک چکی ہوتی تھی۔ اس باعث اسے نیند بھی اچھی آیا کرتی تھی۔

اس رات بھی وہ بہت تھک چکی تھی۔ کمرے میں آ کر اس نے جلدی سے کپڑے تبدیل کیے تھے اور سونے کے لیے بیڈ پر لیٹ گئی تھی۔ کمرے کی ساری بتیاں اس نے بجھا دی تھیں۔ نیند نے جلد ہی اسے اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ لیکن پھر رات کے کسی پہر اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ کچھ عجیب سا شور اس کے کانوں میں اترا تھا۔ کسی دھات کے ٹکرانے کا اور کسی کے چلانے کا۔ پہلے تو وہ اسے اپنا وہم سمجھتی رہی تھی۔ لیکن جب شور وقفے وقفے سے مسلسل جاری رہا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ سائیڈ لیمپ کو اس نے روشن کیا تھا اور آوازوں کی سمت کان لگا دیے تھے۔

آواز دور سے آ رہی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھا، جو بھی کہہ رہا تھا اسے سمجھنا مشکل تھا۔ لیکن ایک چیز واضح تھی اور وہ تھی زنجیر کی آواز...... جو یقیناً فرش پر ٹکرانے سے پیدا ہو رہی تھی۔ اسی چیز نے اس کے اندر تجسس کو پیدا کیا تھا۔ الماری سے چادر نکال کر اس نے خود پر اچھے سے لپیٹی تھی اور کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔

آواز گھر سے ہی آ رہی تھی۔ لیکن کسی ایسے گوشے سے جسے وہ نہیں جانتی تھی۔ پھر بھی وہ آواز کے تعاقب میں دائیں بائیں گھومتی رہی تھی۔ گھر کے بالکل پیچھے ایک پرانا چھوٹا سا گھر تھا۔ جس کے بارے میں اسے کومل نے بتایا تھا کہ وہ پہلے سرونٹ کوارٹر ہوا کرتا تھا لیکن اب سالوں سے بند پڑا ہے۔ آواز وہاں سے ہی آ رہی تھی۔ اور اب تو وہ کچھ کچھ لفظوں کو سمجھ رہی تھی۔

''کوئی ہے......کوئی بتائے مجھے کہ بستامی زندہ ہے یا مر گیا ہے۔کوئی سن رہا ہے مجھے......'' آواز نسوانی تھی اور بوڑھی بھی تھی۔باریشہ کو اس جملے پر کچھ حیرت ہوئی تھی۔بھلا کوئی بستامی بابا کے بارے میں اس انداز میں کیوں بات کر رہا تھا۔وہ بھی چلاتے ہوئے اور رات کے اس پہر......

''شیطان کو بھلا کب موت آتی ہے۔کوئی بتائے فرعون مرایا نہیں......''

وہ پرانے سرونٹ کوارٹر کی سمت بڑھتی جا رہی تھی۔قریب پہنچ کر اس نے دیکھا تھا کہ دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔اور زنجیر کے کھٹکنے کی آواز وہاں سے ہی آ رہی تھی۔

باریشہ وہاں کسی کھڑکی کو تلاش کرنے لگی تھی تاکہ جان سکے کہ اندر کون ہے۔لیکن ساری کھڑکیاں اندر سے بند تھیں۔

''کوئی سن رہا ہے مجھے......کوئی تو جواب دے۔'' اندر موجود بوڑھی چلا رہی تھی۔باریشہ کو ایک ایسی کھڑکی مل گئی تھی جو تھی تو بند لیکن اس کی حالت بتا رہی تھی کہ ذرا سا دھکا دینے پر وہ اندر کو کھل جائے گی۔باریشہ نے پورے ہاتھ کا زور لگا کر اسے کھولنا چاہا تھا۔

''باریشہ......!''

اپنے پیچھے اسے ایک رعب دار آواز پڑی تھی اور وہ کانپ کر رہ گئی تھی۔اس نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ وہ سانول تھا۔



ناول تاش گھر ابھی جاری ہے۔اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 15 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 19

''باریشہ!'' اپنے پیچھے اسے ایک رعب دار آواز پڑی تھی اور وہ کانپ کر رہ گئی تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ وہ سانول تھا۔ جس نے گرم چادر اوڑھ رکھی تھی۔ باریشہ وہاں سانول کی آمد کی توقع نہیں کر رہی تھی۔ اس لیے اپنے تاثرات کچھ نارمل کرنا اسے مشکل لگ رہا تھا۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو باریشہ......؟'' وہ معصوم لڑکا پیار سے پوچھ رہا تھا۔

''م......میں......کچھ نہیں......بس ویسے ہی ادھر چلی آئی تھی۔''

''رات کے اس وقت تم ویسے ہی ادھر چلی آئی تھیں۔'' اس نے کچھ حیرانی سے پوچھا تھا۔

''ہاں......کچھ آوازیں آ رہی تھیں مجھے......ان کے تعاقب میں آ گئی تھی۔'' اس نے سچ بتا دیا۔

''کیسی آوازیں......؟''

''کوئی بوڑھی عورت چلا رہی تھی۔'' باریشہ نے کہا تھا۔

سانول کے چہرے پر کچھ رنگ آ کر گئے تھے۔ وہ اسے ''وہم'' کے سہارے نہیں ٹال سکتا تھا۔

''کون ہے یہ عورت؟''

''میں ان کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا ہوں۔'' اس نے بھی سچ بتا دیا۔

''وہ بستامی بابا کے بارے میں برے الفاظ بول رہی تھی۔''

''وہ میرے بابا کے بارے میں بھی ایسا ہی کہتی ہیں۔''

"تو پھر تم لوگوں نے ان کو اپنے گھر میں کیوں رکھا ہوا ہے؟"

"ان کے بارے میں تم کل کومل خالہ سے یا میری والدہ سے پوچھ لینا۔ اب اپنے کمرے جاؤ......رات بہت ہو چکی ہے۔" معصوم لڑکے نے سنجیدگی سے کہنے کی کوشش کی تھی۔ ایک لڑکی کے سامنے وہ کچھ مردانگی کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا اور اس میں ناکام رہا تھا۔ کیونکہ اس کی ذات کے لیے معصومیت اور مردانگی دو الگ الگ چیزیں تھیں۔

"ٹھیک ہے۔" وہ فوراً سے رضامندی دیتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف جانے کے لیے بڑھی تھی۔

"باریشہ......!" سانول نے ایک بار پھر سے اسے پکارا تھا۔ اس بار کی پکار کچھ نرم تھی۔ جیسے کوئی زبان سے نہیں، دل سے بول رہا ہو۔ باریشہ رکی اور پلٹ کر اس نے سانول کو دیکھا۔ سانول آہستہ روی سے اس کے قریب ہوا۔

"تم......کچھ بدلی بدلی سی لگ رہی ہو۔ یا شاید مجھے کہنا چاہیے کہ پیاری لگ رہی ہو۔" اس نے پیار سے کہا۔

باریشہ کو پہلے تو سانول کی بات پر کچھ حیرت ہوئی۔ پھر اس کے معصومانہ انداز پر اسے ہنسی سی آ گئی۔

"تم ہنس کیوں رہی ہو؟" وہ کچھ جھینپ سا گیا۔

"وہ......کومل آنٹی مجھے پارلر لے گئی تھیں، شاید اس لیے......"

"نہیں......یہ بات نہیں ہے۔"

"پھر کیا بات ہے......؟"

"تمہارے اندر کی خوشی تمہارے چہرے تک چلی آئی ہے۔ اس سے......" سانول نے گہری بات کی تھی اور شاید حقیقی بات کی تھی۔ باریشہ کچھ جھینپ سی گئی تھی۔ سانول کے انداز پر بھی اور اس کے دیکھنے پر بھی......بچہ سا نظر آتا سانول آج اسے مرد لگنے لگا تھا۔

''میں......میں چلتی ہوں۔'' باریشہ کہہ کر رکی نہیں تھی، بلکہ فوراً سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔ سانول اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ پھر وہ بھی اپنے کمرے میں آ گیا اور چادر اتارتے ہوئے بیڈ پر لیٹ گیا۔

باریشہ آج اسے اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ وہ اسے ساری رات سوچ سکتا تھا۔

☆......☆......☆

رات کی بے چین نیند کے باوجود وہ صبح جلدی اٹھ گئی تھی۔ کچھ کمرے کے باہر کے عجیب وغریب شور نے اسے جلدی جگا دیا تھا۔ بیڈ سے نیچے اتر کر اس نے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکا تھا۔ باہر عجیب طرح کی چہل پہل تھی۔ گھر کی ساری لڑکیاں بنی ٹھنی کہیں باہر جا رہی تھیں۔ نجانے کہاں جا رہی تھیں وہ......لیکن جس قدر خوشی سے جا رہی تھیں ایسا ہی لگ رہا تھا کہ کسی اچھی جگہ کا پلان ہے۔ بیل بجا کر اس نے ملازمہ کو کمرے میں بلایا تھا۔

''یہ سب کہاں جا رہی ہیں؟''

''سب مری جا رہی ہیں۔'' ملازمہ نے بتایا۔

''کیوں......؟''

''ویسے ہی......ٹرپ پلان کیا تھا سب نے......''

''عجیب بات ہے۔ مجھے کسی نے آفر ہی نہیں کروائی۔'' ملازمہ سے زیادہ اس نے خود سے کہا تھا۔

ملازمہ کچھ دیر اس کے کچھ بولنے کی منتظر رہی تھی اور پھر اس کے اشارے پر کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔

''لگتا ہے کہ یہ گھرانہ مجھ سے اکتا رہا ہے۔'' اس نے خود ہی قیاس کر لیا تھا اور باتھ روم میں چلی گئی تھی۔

اچھی طرح سے غسل کر کے وہ تیار ہوئی تھی اور پھر ناشتا اس نے اپنے کمرے میں ہی منگوا لیا تھا۔ آج اس کا کمرے سے باہر نکلنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ناشتا ملازمہ نہیں، بلکہ کومل بیگم خود لے کر آئی تھی۔

''ارے آنٹی......! آپ کیوں چلی آئیں۔'' کومل بیگم کو دیکھ کر اس نے میگزین کو سائیڈ پر رکھ دیا تھا۔

''کیونکہ تمہیں ایک بہت ہی اہم خبر سنانی ہے۔'' وہ ناشتے کی ٹرے سائیڈ پر رکھ کر اس کے پاس بیٹھ گئی تھی۔

''وہ کیا......؟''

''سنو گی تو یقین نہیں آئے گا۔''

''پھر تو جلدی سنائیے......''

''تمہیں ایک شو ملا ہے۔''

''کس چیز کا؟''

''ارے بھئی گانے کی پرفارمنس کا......'' کومل بیگم نے اسے بتایا تو کتنی دیر تک تو باریشہ کو ان کی بات پر یقین ہی نہیں آیا۔

''تمہاری محنت کا پہلا صلہ ملنے جا رہا ہے تمہیں، میری جان......''

''کہاں ہو گا یہ......؟''

''تمہیں کراچی جانا ہو گا۔''

''کراچی......'' اس نے آہ سی بھرتے ہوئے کہا تھا۔

''ہاں......تو اتنا پریشان کیوں ہو رہی ہو۔ دو گھنٹے کی تو فلائٹ ہے کراچی کی...... تمہیں کون سا ٹرین پر جانا ہو گا۔ ایک ملازمہ تمہارے ساتھ ہو گی۔ وہاں ہوٹل میں اسٹے ہو گا۔ ہر طرح سے آرام ہی آرام ہو گا۔''

کومل بیگم نے جو کچھ بتایا تھا اس کے بعد تو واقعی باریشہ کی فکر کچھ معنی نہیں رہ گئی تھی۔ کراچی جانے کے خیال سے اس کے ذہن میں ٹرین کا تصور ہی آیا تھا۔ لیکن جب کومل بیگم کے منہ سے جہاز اور ہوٹل کا سنا تو اس کے ذہن سے سفر کی تھکن محو ہو گئی۔

''سب لڑکیوں نے مری جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ میں نے تم سے نہیں کہا تم کراچی جاؤ گی۔''

اسے اب سمجھ میں آیا تھا کہ مری جانے کے لیے اس سے کیوں نہ پوچھا گیا۔ اور اسے اپنی سوچ پر شرمندگی ہوئی۔ وہ پل بھر میں ہی ان لوگوں کے خلاف ہو گئی تھی۔ جبکہ یہ لوگ تو کس قدر اچھے تھے۔

''تم کراچی جانے کی تیاری کر لو باریشہ...... میں نتاشا کو کمرے میں بھیجتی ہوں۔ وہ تیاری کروانے میں تمہاری مدد کرے گی۔'' کومل بیگم کہہ کر اٹھی تھی۔ کمرے سے باہر جانے سے پہلے اسے پھر سے کچھ یاد آ گیا تھا۔

''استاد جی آج جلدی آ جائیں گے۔ ان کے ساتھ تن دہی سے مشق کرنا...... تمہیں اپنی پہلی پرفارمنس بہت ہی جان دار دینا ہوگی، یاد رکھنا۔''

''میں آپ کو مایوس نہیں کروں گی۔''

''امید کرتی ہوں۔'' کومل بیگم نے اسمائل پاس کی تھی اور پھر کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔

اس صبح باریشہ نے پہلی بار بہت کم ناشتا کیا۔ خوشی کے مارے اس سے ناشتا ہی نہیں کیا گیا تھا۔ پہلی بار اس کی بھوک خوشی کی وجہ سے اڑ گئی تھی۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ جس چیز کا خواب کومل آنٹی نے اسے دکھایا تھا وہ بات سچ ہونے جا رہی تھی۔ جو بات مذاق میں شروع ہوئی تھی، وہ اب حقیقت کا روپ دھارنے والی تھی۔ وہ گائیکہ بننے والی تھی۔ سنگر......

چاند نانو کی پرورش والی معصوم باریشہ نہیں جانتی تھی کہ اس بات کی شروعات مذاقاً اسے لگ رہی تھی۔ ورنہ جس گھرانے میں وہ قیام کیے ہوئے تھی اسے یہاں رہنے کے لیے ایسا ہی کچھ کرنا تھا۔ اور

ابھی تو یہ آغاز تھا۔ آگے آگے یہ گھرانہ اس سے ایسے ایسے کام لینے والا تھا، جس کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

دوپہر میں استاد طافو اپنے مقررہ وقت سے پہلے ہی آگئے تھے۔ وہ دن اور آنے والے بہت سے دن بے حد مصروف گزرے تھے۔ وہ استاد جی کے ساتھ مل کر "سکل بن پھول رہی سرسوں" کی تیاری کرنے لگی تھی۔ اور دل و جان سے کرنے لگی تھی۔ پہلے وہ مشق کی صورت میں گایا کرتی تھی اور اب وہ ایسے گا رہی تھی جیسے یہ گانا ہی اس کی زندگی کا واحد مقصد ہو۔ وہ ان دنوں جم نہیں جا رہی تھی۔ اسے تو اپنی بھی کوئی پروا نہیں رہی تھی۔ کھانے پینے کا ہوش ختم ہو چکا تھا۔ اس کے لیے ان دنوں سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ اپنی پہچان بنانے جا رہی ہے۔ اب خود اپنے بل پر کچھ کرنے جا رہی ہے۔ وہ ساری توجہ گانے کو دے رہی تھی۔ استاد طافو گانے کے ساتھ ساتھ اسے ہاتھ کو ایک خاص انداز میں چلانے کی مشق زیادہ کروا رہے تھے۔ یہ اسے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ لیکن اس نے اس پر توجہ نہیں دی تھی اور نہ ہی اعتراض اٹھا کر کوئی خراب صورت حال پیدا کی تھی۔ پھر بھی یہ اسے برا لگ رہا تھا۔ اس نے آئینے میں خود کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا تو اسے ایسا لگا جیسے وہ کوئی طوائف ہو اور کسی کوٹھے پر بیٹھ کر گانا گا رہی ہو۔ یہ چیز اسے اپنی شخصیت کے بالکل الٹ لگی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ یہاں تو وہ استاد طافو کی بات مان لے گی، لیکن کراچی میں جب وہ ایک بڑے مجمعے کے سامنے ہو گی تو وہ ہاتھوں کو نرتکیوں کی طرح استعمال نہیں کرے گی۔

دن گزرتے جا رہے تھے اور اس کا جوش بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک ہفتہ جیسے تیسے کر کے گزر گیا تھا۔ کومل بیگم نے نتاشا کو اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ جو بہت جلد اس کی بہت اچھی دوست بن گئی تھی۔ کومل بیگم خود اس کے ساتھ کراچی جانا چاہتی تھی لیکن اسے یہاں کچھ کام تھے اس لیے وہ نہیں جا سکی تھی۔ سانول نے سمندر دیکھنے کے بہانے اس کے ساتھ جانے کی فرمائش کی تھی لیکن اس کے پیپرز تھے۔ وہ بھی نہیں جا سکتا تھا اس لیے نتاشا کو اس کے ساتھ کر دیا گیا تھا۔ اور نتاشا کے ساتھ ہی وہ کراچی آئی تھی۔

زندگی کے اس پہلے لمبے سفر کے دوران اسے اپنی ذات کے پیچھے ہونے کا احساس ہوا تھا۔ کمرے سے باہر نکل کر اسے اندازہ ہوا کہ اسے تو کسی چیز کا علم ہی نہیں ہے۔ گھر سے باہر کی دنیا اس کے لیے اجنبی تھی۔ اگر نتاشا اس کے ساتھ نہ ہوتی تو وہ بری طرح سے سہم چکی ہوتی۔ نتاشا کو سب باتوں کا علم تھا۔ اسلام آباد کے ایئرپورٹ سے کراچی تک کے سفر میں نتاشا ہر طرح سے چاق و چوبند رہی تھی۔ ٹکٹ، بورڈنگ پاس، ویٹنگ لاؤنج، کنویئر بیلٹ پر سامان کا آنا...... اسے سب باتوں کی خبر تھی۔ گھر کی ملازمہ ہونے کے باوجود نتاشا کے آگے وہ خود کو پست گردانے لگی تھی۔

کراچی پہنچ کر اسے عجیب ہی احساس ہوا تھا۔ وہ پہلی بار اتنے بڑے اور اتنی آبادی والے شہر کو دیکھ رہی تھی۔ جہاں ہر طرف افراتفری تھی، رش تھا۔ ایک متحرک ماحول تھا۔ اگرچہ اسلام آباد کی طرح موسم سرد نہیں تھا لیکن چونکہ اس نے بڑے دنوں کے بعد دھوپ میں ایسی تیزی دیکھی تھی تو اسے یہ سب اچھا لگ رہا تھا۔

نتاشا کے ساتھ وہ اپنے ہوٹل میں پہنچی تھی۔ وہ شاید کراچی کا سب سے مہنگا ہوٹل تھا۔ وہاں کی راہداریاں، لابی، کمرے...... سب بہت شاہانہ تھے۔ اسے گھر سے باہر ہونے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔

”یہاں کے پرسکون ماحول میں آپ آرام سے پریکٹس کر سکتی ہیں۔“

”یہ تو ہے...... لیکن یہ بتاؤ کہ ہم سمندر پر کب جائیں گے۔“ اس نے کہا تو نتاشا مسکرائی تھی۔

”پہلے جو کام کرنے آئے ہیں، وہ کرلیں۔ اس کے اگلے دن ہی سمندر پر چلے جائیں گے۔ میں فنکشن آرگنائزر کو انفارم کر دیتی ہوں کہ ہم کراچی پہنچ چکے ہیں۔ وہ ہمیں آگے کی صورت حال سے آگاہ کر دے گا۔“ نتاشا کہہ کر دوسرے کمرے میں فون کرنے چلی گئی تھی۔

باریشہ نے اٹھ کر کھڑکی کے پردے پیچھے کیے تھے اور باہر رواں دواں کراچی شہر کو دیکھنے لگی۔



''چاندامی......'' زویا نے نفرت سے چاندامی کا نام پکارا تھا۔ ''وہ ایک انتہائی چالاک اور مکار خاتون تھی۔ پہلی نظر میں مَیں اسے پہچان ہی نہیں سکی۔ مجھے لگا وہ ایک نفیس خاتون ہیں۔ میں دھوکا کھا گئی۔ زندگی میں پہلی بار مجھے دھوکا ہوا۔'' زویا نفرت سے بولتی جارہی تھی اور سامنے والا خاموشی سے اس کی ساری بات چیت سن رہا تھا۔

''اور میں دھوکا کیسے نہ کھاتی...... تم اس عورت کو بولتا ہوا دیکھتے تو تمہیں بھی یہ ہی دھوکا ہوتا۔ وہ ایسے نرم انداز میں بولتی تھی کہ اس پر فرشتہ ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے جب میں پہلی بار اس کی حویلی میں گئی تھی۔ صندل نے ہماری دعوت کی تھی۔ وہاں اس نے ہمیں اپنی امی سے ملوایا تھا۔ چاندامی سے...... ہونہہ...... چاندامی......'' زویا نے شدید ترین نفرت سے ''چاندامی'' کا لفظ ادا کیا تھا۔ لفظوں کی شکل رنگوں میں بدلی جاسکتی تو زویا کے لہجے کا رنگ سیاہ ہوتا...... گہرا سیاہ...... ''کیا شیرینی تھی اس کے لہجے میں، کیا نفاست تھی، کیا لفظوں کی ادائی تھی۔ اس کا اردو لہجہ بے حد شائستہ تھا۔ بس یہاں سے ہی میں دھوکا کھا گئی۔ میں سمجھ ہی نہ سکی کہ فرشتے کے لبادے میں وہ ایک شیطان عورت ہے۔ وہ چاند نہیں، کوئلہ ہے۔ جس کا دل تو کالا ہے ہی سوچ بھی گھٹیا ہے۔''

''بھول جائیں آپ اب یہ سب...... سالوں گزر چکے ہیں۔ کیا فائدہ ہے یاد رکھنے کا۔'' سامنے والا جو یہ سب کتنی بار سن چکا تھا۔ اپنی ماں کو کول ڈاؤن کرنے کی غرض سے بولا۔

''میں نہیں بھول سکتی...... میں ہرگز نہیں بھول سکتی۔ میں کیسے بھول جاؤں۔ اس عورت نے میرے بھائی کی زندگی برباد کردی۔ اسے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ تباہ و برباد کردیا۔'' بے انت غم سے چور ہوکر زویا رونے لگی۔

''اتنا خوب صورت ہوا کرتا تھا میرا بھائی...... جہاں سے گزرتا تھا لڑکیاں رک رک کر اسے دیکھا کرتی تھیں۔ دل تھام لیا کرتی تھیں۔ تم سوچ نہیں سکتے کہ اس عورت نے کیا حال کردیا میرے میرزاد

کا۔ مجھے اندازہ ہوتا تو میں اس گھٹیا شہر میں اپنے بھائی کو لے کر ہرگز نہ جاتی...... اور اس حویلی میں تو ہرگز نہ جاتی...... مر کر بھی نہیں۔"

"مت سوچیں اب ان باتوں کو...... آپ سوچ سوچ کر خود کو اذیت دیتی ہیں۔ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا، سالوں گزر چکے ہیں ان سب باتوں کو...... آپ کو ابھی تک سب یاد ہے۔"

"کیونکہ میں بھولنا نہیں چاہتی۔"

"یاد رکھ کر کیا کریں گی آپ ممی......؟ بھول جائیں سب کچھ...... خود کو اذیت دینا بند کر دیں۔"

"میں سب ایسے نہیں بھول سکتی ہوں۔ جب تک میں اپنے بھائی کی حالت کا بدلہ نہیں لے لیتی ہوں۔"

"کیا کریں گی آپ......؟ کیسے قرار آئے گا آپ کے دل کو......؟ مجھے بتائیں۔" سامنے والے نے پوچھا تو زویا کی آنکھوں میں نفرت کا الاؤ روشن ہوا تھا۔

"جب تک میں اپنے ہاتھوں سے اس بڑھیا کا گلا نہیں گھونٹ دیتی، مجھے چین نہیں آئے گا۔" زہریلے لہجے میں پھنکارتے ہوئے لفظ اس کے ہونٹوں سے نکلے تھے۔

سامنے والے نے ترس بھری نظروں سے زویا کو دیکھا تھا۔

"آپ کیوں خود کو قاتلہ بنانا چاہتی ہیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ کراچی واپس آ کر آپ پھر سے ویسی ہو جائیں گی۔ ہم لندن میں ہی ٹھیک تھے۔ ڈیڈ ٹھیک کہہ رہے تھے پاکستان شفٹ ہونا آپ کے لیے بہتر نہیں ہے۔ آپ نے چند دنوں میں ہی اپنی حالت بگاڑ لی ہے۔ میری غلطی ہے جو میں نے آپ کے سائیکاٹرسٹ کی بات مان لی اور پاکستان چلا آیا۔"

"میں کیا کروں پھر...... مجھے کہیں چین نہیں آ رہا۔"

"بھول جائیں سب......"

"نہیں...... اتنی آسانی سے نہیں بھول سکتی ہوں۔"

''اتنے سالوں کے بعد بھی آپ کو یہ مشکل لگ رہا ہے۔ بولیے کیا کرنا چاہتی ہیں آپ پھر...... کیسے آپ کی تسلی ہوگی؟''

زویا چند لمحے خاموش رہی تھی۔ جیسے سوچ رہی ہو کہ اگر وہ چاند بی بی کو قتل نہیں کرنا چاہتی تو پھر کیا کرنا چاہتی ہے۔

''پھر میں چاہتی ہوں کہ اس عورت پر سانس تنگ ہو جائے۔ وہ زندہ ہو کر مرنے کی دعا کرے۔'' زویا نے نفرت سے کہا تھا۔

سامنے والا خاموش رہا تھا۔

''میں نے سب معلوم کرلیا ہے۔ باریشہ کراچی میں آچکی ہے۔''

''تو...... آپ کیا چاہتی ہیں کہ میں اس کے ساتھ کیا کروں؟''

''اسے اتنی تکلیف دو کہ اس کی چیخیں حویلیاں میں بیٹھی چاند کو سنائی دیں۔ اور وہ خدا سے اپنی موت کی دعا کرے۔ اس بڑھیا کا اب پوری دنیا میں بس ایک ہی سہارا ہے۔ باریشہ...... میں چاہتی ہوں کہ وہ برباد ہو جائے۔ آہستہ آہستہ...... رفتہ رفتہ...... جیسے اس نے میرے بھائی کو تباہ کیا۔ قدم بہ قدم...... آہستگی اور نرمی سے......''

☆......☆......☆

وہ کراچی کا ایک پوش ایریا تھا۔ اسلام آباد سے ملتا جلتا تھا علاقہ...... جہاں گھر بہت بڑے بڑے اور عالیشان تھے۔ سڑکیں بہت وسیع تھیں۔ نتاشا نے اسے اس جگہ کا نام بتایا تھا لیکن مانوس نہ ہونے کے باعث وہ اس جگہ کا نام بھول چکی تھی۔ انہیں پہلی منزل پر ایک کمرا دے دیا گیا تھا۔ جہاں ایک بیوٹیشن پہلے سے موجود تھی۔ تین چار ڈریسز بھی تھے کہ اسے جو پسند آئے وہ پہن سکتی ہے۔ نتاشا کے مشورے پر اس نے ایک قدرے بھاری سے ڈریس کو منتخب کیا تھا۔

ڈریس تبدیل کر کے وہ باہر نکلی تو بیوٹیشن نے اس کا میک اپ اسٹارٹ کر دیا تھا۔ شام ہو چکی تھی، نیچے تقریب کا آغاز ہو چکا تھا۔ اسے مقررہ وقت تک تیار ہو جانا چاہیے تھا لیکن تیاری سے زیادہ اسے اپنے گانے کی فکر تھی۔ وہ منہ ہی منہ میں اپنے گانے کے بول دہرا رہی تھی۔

"سکل بن پھول رہی سرسوں...... بن بن پھول رہی سرسوں

امبوا پھوٹے ٹیسو پھولے...... کوئل بولے ڈار ڈار

اور گوری کرت سنگار...... ملنیاں گڈھوا لے آئیں کرسوں"

مکمل دھیان لگا کر وہ مشق کر رہی تھی۔ استاد طافو کے علاوہ ایمن آنٹی نے بھی اس گیت کی مشق نجانے اسے کتنی بار کروائی تھی لیکن ایک بڑے مجمعے کے سامنے جانے کے خیال سے وہ کچھ گھبرائی ہوئی تھی۔

دو گھنٹے لگا کر بیوٹیشن اس کا میک اپ کر چکی تھی اور اب اس کے بالوں میں لہریں ڈال کر انہیں پھیلاؤ میں بڑا کر رہی تھی۔ کرسی پر بیٹھی اپنے بھاری لباس کو بے نیازی سے دائیں بائیں جھٹکے وہ "سرسوں" کو دہرائی جا رہی تھی۔ اور جب جب "سرسوں" کہتے ہوئے ہاتھ ہلاتی تو اس کے ہاتھوں میں پڑے ہوئے بھاری کنگن بجنے لگتے تھے جنہیں کچھ خیال آنے پر اس نے جلدی سے اتار دیا تھا۔ کنگنوں کی یہ آواز اس کے گیت میں خلل ڈال سکتی تھی۔

"نتاشا...... سننا ذرا...... میں ٹھیک گا رہی ہوں۔" اس نے نتاشا کو گیت گا کر سنایا تھا۔ اس کا تلفظ ٹھیک تھا۔ ادائی بھی ٹھیک تھی۔ لیکن گھبراہٹ تھی کہ جانے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

"سب ٹھیک ہے باریشہ بی بی...... آپ پریشان کیوں ہو رہی ہیں؟"

"پتا نہیں کیوں......؟"

"آپ بستامی بابا سے بات کر لیں۔ وہ اس موقع پر یقیناً آپ کو بہتر نصیحت کریں گے۔"

باریشہ کے سر ہلا دینے کے بعد نتاشا نے بستامی بابا کو کال کر کے فون باریشہ کو پکڑا دیا۔ باریشہ

نے چند منٹ بستامی بابا سے بات کی تھی۔ نتاشا نے ٹھیک کہا تھا۔ بستامی بابا نے اسے اتنے پیار سے پرسکون کیا تھا کہ اس کی ساری گھبراہٹ دور ہو گئی تھی۔

''گیت گاتے ہوئے اپنی ماں کو سوچو باریشہ...... اس نے اس قدر خوب صورتی سے ستار بجایا تھا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ کیونکہ تب اس کے سامنے وہ شخص بیٹھا ہوا تھا جسے وہ اپنا محبوب سمجھتی تھی۔ میرزاد...... تم بھی سمجھو کہ تم گیت کسی ایک خاص کے لیے گا رہی ہو۔''

بستامی بابا کی الوداعی بات نے اس کے اندر نئی توانائی بھر دی تھی۔ فون کے بند ہو جانے تک وہ مطمئن ہو چکی تھی۔

''پریشان مت ہوں۔ اب آپ بہت اچھے سے گیت گا رہی ہیں۔'' بیوٹیشن نے اس کے بال سیٹ کرتے ہوئے اس سے کہا۔

''کیا سچ میں......؟''

''جی...... جھوٹ کیوں بولوں گی...... بہت ترنم ہے آپ کی آواز میں......''

''پہلی بار اتنے بڑے مجمعے کا سامنا کر رہی ہوں تو تھوڑا نروس ہو گئی تھی۔''

''جوس پی لیں۔''

''نہیں...... گانے سے پہلے کچھ بھی ٹھنڈا نہیں پیتے۔''

''تو پھر چائے پی لیں۔ آپ کو پرسکون کر دے گی۔''

''ہاں...... ایک کپ چائے منگوا دیں۔''

بیوٹیشن نے کمرے میں پڑے فون پر ایک کپ چائے کا آرڈر دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی چائے آ گئی تھی۔ ساتھ ہی پیغام بھی آ گیا تھا کہ باریشہ بی بی کو نیچے بلایا جا رہا ہے۔

''بس تھوڑی دیر میں میم نیچے آتی ہیں۔'' نتاشا نے پیغام لانے والے کو کہا تھا۔

باریشہ نے جلدی جلدی چائے کو ختم کیا تھا۔ چائے پینے سے اسے واقعی مزید سکون ملا تھا۔ پتا نہیں یہ چائے کا ذائقہ تھا یا اس کی حدت...... وہ مطمئن ہو چکی تھی۔ وہ باہر جانے کے لیے کھڑی ہوئی تو بیوٹیشن نے اس کا دوپٹا سیٹ کر دیا۔ اس کا کام دار گاؤن بھاری ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے پاؤں کو چھو رہا تھا۔ وزنی دوپٹے کو بیوٹیشن نے اس طرح سے سیٹ کیا تھا کہ لباس کا گھیراؤ مزید وسعت اختیار کر چکا تھا۔

''اب آپ تیار ہیں۔ نیچے جا سکتی ہیں۔'' بیوٹیشن نے مسکراتے چہرے کے ساتھ کہا تو وہ بھی جواباً مسکرائی تھی اور پھر نتاشا کی تقلید میں نیچے کی طرف چلی گئی تھی۔

☆......☆......☆

محفل کا انتظام گھر کے وسیع باغ میں کیا گیا تھا۔ مہمانوں کی تعداد چار سو کے لگ بھگ تھی۔ دائیں بائیں گھومتے بیروں کی ٹیم نے تعداد کو مزید بڑھا دیا ہوا تھا۔ سج سج کر پاؤں رکھتی باریشہ وہاں تک آئی تھی۔ اس کے گھنگروؤں کی جھنکار سے سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ لوگوں کی نظروں میں اس کے لیے ستائش تھی۔ وہ نظروں ہی نظروں میں اس کی خوب صورتی کو سراہ رہے تھے۔ باریشہ کے چہرے پر مسکراہٹ آئی تھی۔ وہ اپنی زندگی میں یہ ہی سب چاہتی تھی۔ جو اسے بستامی بابا کی بدولت مل رہا تھا۔

سب مہمانوں کے سامنے پڑے تخت پر وہ بیٹھ گئی تھی۔ نتاشا نے اس کا لباس تخت پر کسی حد تک پھیلا دیا تھا۔ میزبان کے اشارے پر سازندوں نے اپنے سازوں کو چھیڑا تھا جو کہ چند لمحے بجتے رہے تھے۔ پھر باریشہ نے سر لگانے کے لیے آواز اٹھائی تھی۔

''سکل بن پھول رہی سرسوں......'' اس نے کہنا چاہا تھا۔ لیکن آواز کہیں اس کے حلق میں ہی بیٹھ گئی تھی۔

''سکل بن......''

اس نے پھر سے کہنا چاہا تھا اور اس بار آواز ایسے برآمد ہوئی تھی جیسے اس کے گلے میں کسی نے

روئی دفن کر دی ہو۔ میزبان اور مہمانوں نے اسے دیکھا تھا۔ نتاشا کے چہرے پر تو سخت گھبراہٹ تھی۔

اور باریشہ......

چند لمحے پہلے تک جو اس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پا لیا تھا تو وہ ساری کی ساری اس کے چہرے پر پھر سے نمودار ہو گئی تھی۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا تھا۔ لیکن گلا صاف نہیں ہوا تھا۔ اس کی کھنکار بھی لحافوں میں دبی ہوئی بر آمد ہوئی تھی۔ جس نے اس کے چہرے پر مزید وحشت طاری کر دی تھی۔

"سکل بن پھول......"

مہمانوں نے اب کے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔ ان کی نظروں میں باریشہ کے لیے تضحیک تھی۔

"کیا کرنے آئی تھی یہ لڑکی یہاں...... اگر اسے کچھ گانا ہی نہیں آتا تھا تو......"

سازندوں نے ساز بند کیا تھا۔ اور اس کے کہنے پر ایک بار پھر سے ساز اٹھائے تھے۔ اس نے ہمت سے کام لیتے ہوئے ایک بار پھر سے کوشش کی تھی۔

"سکل......"

بس...... اب مزید شک کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اور اگلے ہی پل وہ وہاں سے اٹھی تھی اور باہر کی طرف بھاگ گئی۔

بھاری لباس کے ساتھ بھاگتے سارے مجمعے نے اسے گھر سے باہر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ نتاشا اس کے پیچھے کو لپکی تھی۔ لیکن گیٹ سے باہر نکلتے ہی وہ جیسے غائب ہو گئی تھی۔ شرمندگی کے مارے وہ اس مجمعے سے ان لوگوں سے۔ بہت دور چلی جانا چاہتی تھی۔

بہت دور پہنچ کر اس نے ایک درخت کے سائے تلے رک کر اپنی سانس بحال کی تھی۔ بھاگتے بھاگتے وہ تھک چکی تھی اور شرمندگی کی وجہ سے نڈھال ہو چکی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بلند آواز میں رونا

شروع کر دے۔ اس کی زندگی کا اہم دن برباد ہو چکا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ سب کس کی وجہ سے ہوا ہے۔

چاندنی بی کی وجہ سے......

اسے چاندنی بی کی بددعا لگ چکی تھی۔ وہ بوڑھی مکارن انہی چیزوں میں تو ماہر تھی۔ اس نے تو اس کی ماں کی زندگی بھی برباد کر دی تھی۔ اب وہ اس کی زندگی کے در پے ہو چکی تھی۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا ہے، اس میں چاندنی بی کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ بلکہ یہ تو کوئی اور تھا جو اب اس کی پوری زندگی برباد کر دینا چاہتا تھا۔

☆......☆......☆

خشک موسم میں دھول کے بادل اڑتے ہوئے آسمان کے بادلوں سے مل رہے تھے۔ اس بار کا جاڑا بہت طویل تھا۔ درخت برہنہ کر دینے کے باوجود بھی نجانے اب مزید کیا چاہتا تھا۔ جاڑے نے پودوں، درختوں کے ساتھ ساتھ شاید جذبات کو بھی بے لباس کر دیا تھا۔ خوش نما مسکراہٹوں کے پیچھے کرب واضح ہو گئے تھے۔

وہ ٹرین کی کھڑکی سے باہر کے منظر کو دیکھ رہی تھی۔ منظر جو لمحے بھر میں دس بار بدلتا تھا۔ کبھی ہریالی نظر آتی، کہیں خشک سالی، کہیں بچے، کہیں کام میں مگن بوڑھے اور کہیں حد نگاہ ایک ویرانہ...... وہ خاموشی سے باہر دیکھ رہی تھی اور کتنی دیر سے دیکھ رہی تھی۔ ٹرین پنجاب کی حدود میں داخل ہوئی تو موسم نے ہلکی ہلکی انگڑائی لینی شروع کر دی تھی۔ سفید بادل سرمئی بادلوں میں چھپنے لگے تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی جس نے سردی کی شدت میں اضافہ کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے اپنی طرف کی کھڑکی کو کھلا رکھا تھا۔ اسے سردی، گرمی کچھ بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

ایک قطرہ اس کے گال سے ہو کر اس کے ہونٹوں پر آیا تھا۔ پانی کا ذائقہ اس کے ہونٹوں پر اترا تھا۔ وہ ذائقہ نمکین تھا۔ اور یہ قطرہ بارش کا ہرگز نہیں تھا۔ یہ اس کے آنسو تھے جو اپنی بے عزتی اور ناکامی پر

نکل رہے تھے۔ اپنی ناسپاسی کا احساس اتنا شدت آمیز تھا کہ اس میں اونچی آواز میں رونے کی بھی سکت نہیں رہی تھی۔ اسی لیے وہ بے آواز آنسو بہاتی جا رہی تھی۔

اسی کے ساتھ کیوں ہوا تھا یہ سب...... اس نے زندگی میں پہلی بار اپنے ساتھ کچھ اچھا کرنا چاہا تھا۔ اور وہ بری طرح سے ناکام ہوئی تھی۔ کتنی محنت کی تھی اس نے اس دن کے لیے...... استاد طافو کی ایک ایک بات کو فالو کیا تھا۔ کتنی تیاری کی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ جب وہ سب کے سامنے اپنا گانا پیش کرے گی تو سب اس کے دیوانے ہو جائیں گے۔ اس کی تیاری ہر طرح سے پوری تھی۔ اور اگر شاید وہ گا لیتی تو ایسا ہو بھی جاتا...... لیکن اس سے تو گایا ہی نہیں گیا تھا۔ سب کی نظروں میں اس کے لیے تضحیک تھی۔ جبکہ وہ تو ستائش کی خواہاں تھی۔

یہ کیا ہو گیا تھا اس کے ساتھ؟ کیا کسی نے اس پر کالا جادو کر دیا تھا؟

اور یہ کام کس کا تھا؟ یقیناً چاندنا نو کا......

وہ ان کے ساتھ رہتی تھی تب بھی اس کی زندگی بدحال تھی اب دُور تھی اور اب بھی وہ اس کی جان نہیں چھوڑ رہی تھیں۔ لیکن اسے یاد نہیں پڑتا تھا کہ چاندنا نو نے کبھی کسی پر کالا جادو کروایا ہو یا توں باتوں میں کالے جادو کا ذکر بھی کیا ہو۔ باریشہ کو ان سے لاکھ اختلاف سہی، لیکن یہ بات سچ تھی کہ ان کی زندگی اس حوالے سے بے داغ رہی تھی۔ وہ کبھی ان چکروں میں نہیں پڑی تھیں۔ انہوں نے کبھی کسی کا برا نہیں چاہا تھا۔

لیکن پھر یہ کام ان کے علاوہ اور کون کروا سکتا تھا۔ اس کا تو کوئی دشمن نہیں تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی کسی کے ساتھ اتنا برا نہیں کیا تھا کہ کوئی اسے بددعا دیتا۔ جو گانا وہ پانچ منٹ پہلے تک بالکل ٹھیک گا رہی تھی، وہی گانا اسٹیج پر جاتے ہی اس کے گلے میں دفن ہو گیا تھا۔ وہ اس کا ایک لفظ بھی ادا نہیں کر سکی تھی۔ یہ جادو تھا یا کسی کی بددعا...... اور بددعا اسے ایک ہی بندہ دے سکتا تھا۔ چاندنا نو......

نتاشا نے فون پر ساری بات کومل بیگم کو بتا دی تھی۔ جو تقریب والے دن ہوا تھا سب...... باریشہ

کا تب کا رویہ...... اور موجودہ رویہ...... کومل بیگم نے اسے کہا تھا کہ وہ جہاز پر واپس آنے کے بجائے ٹرین سے واپس آئے۔ اس طرح باریشہ کے رویے میں کچھ تبدیلی ہو گی۔ ٹرین کا لمبا سفر اس کے مزاج میں بدلاؤ لائے گا۔ اب اس کا کوئی فائدہ ہونے والا تھا یا نہیں...... لیکن بہر حال وہ دونوں ٹرین سے واپس اسلام آباد جا رہی تھیں۔ یہ سفر طویل تھا اور باریشہ کی خاموشی نے مزید طویل کر دیا تھا۔

''کیا میں آپ کے لیے کھانے کو کچھ منگواؤں؟'' نتاشا نے پیار سے پوچھا تھا۔

''نہیں...... میرا کچھ کھانے کو دل نہیں ہے۔'' بالآخر اس نے چند لفظ ادا کیے تھے۔ اگرچہ ناں میں کیے تھے۔

''جوس پی لیں پھر...... اتنی دیر بھوکا رہنا مناسب نہیں......''

''مجھے کسی چیز کی طلب نہیں ہے۔'' اس نے مہذب انداز میں کہا تھا کہ اسے مزید مخاطب نہ کیا جائے۔

نتاشا نے مزید کچھ نہیں کہا تھا۔ نتاشا ویسے بھی کافی سلجھی ہوئی اور سمجھدار لڑکی تھی۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والی تھی۔ اسے فضول کی کھد بد سے کوئی سروکار نہیں ہوتا تھا۔ اتنے دن ساتھ رہنے کے باوجود بھی اس نے باریشہ کے ماضی کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ اسی باعث اس کی چند ہی دنوں میں باریشہ سے اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ دونوں نے آتے وقت تو خوب باتیں کی تھیں اور اب جاتے وقت وہ اس کے کسی سوال کا جواب نہیں دے رہی تھی۔

باہر بارش مدھم انداز میں متواتر ہو رہی تھی۔ بارش کے تیور کچھ ایسے تھے کہ زمین کو بھگونا بھی چاہتی تھی اور تشنہ بھی رکھنا چاہتی تھی۔ بالکل اس کے آنسوؤں کی طرح...... جو بہتے ہوئے اس کا غم ہلکا کرنا چاہتے تھے لیکن اس کے دکھ کو مزید بڑھا رہے تھے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وقت کب یہ گتھی سلجھانے والا تھا کہ اس کے ساتھ کل شام کیا ہوا تھا۔ وہ چند لمحے اتنے منحوس تھے کہ اسے ان چند لمحوں میں ہی اپنے گلے پر بے اعتباری ہو چکی تھی۔ اگلے دن تک اس نے گا کر چیک ہی نہیں کیا تھا کہ اس کا گلا ٹھیک ہوا ہے

یا نہیں...... اس کے دل میں خوف بیٹھ گیا تھا کہ اب اگر وہ اپنی آواز سننے کی کوشش کرے گی تو اسے ایسی آواز سننے کو ملے گی کہ اسے اپنی خود کی آواز سے نفرت ہو جائے گی۔ اسی لیے وہ نتاشا کے بھی کسی سوال کا کوئی جواب نہیں دے رہی تھی۔

بیس گھنٹوں کے طویل سفر کے بعد ٹرین پنڈی کے اسٹیشن پر رکی تھی۔

☆......☆......☆

سانول کو باریشہ کی آمد کا بہت شدت سے انتظار تھا۔ وہ گھر میں موجود اپنے واحد دوست کے ساتھ بات چیت کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوئی اس کی امی نے اسے باریشہ سے بات کرنے اور ملنے سے منع کر دیا تھا۔

"لیکن کیوں...... میں اس سے بات کیوں نہیں کر سکتا؟" اس نے پوچھا تھا۔

مجبوراً ایمن کو سانول کو ساری بات بتانا پڑی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ بات سن کر وہ نزاکت کو سمجھ جائے گا لیکن بات جان لینے کے بعد وہ مزید شدت سے باریشہ سے ملنا چاہتا تھا۔ اسے لگا تھا کہ ایسے برے وقت میں ایک دوست ہی دوسرے دوست کے لیے دوا ثابت ہوتا ہے۔ وہ چپکے سے باریشہ کے کمرے میں گیا تھا لیکن اس کی آواز سن کر بھی جب باریشہ نے اس کے لیے دروازہ نہیں کھولا تو اسے مایوسی ہوئی تھی۔

اسلام آباد واپس آنے کے بعد سے باریشہ اپنے کمرے میں بند تھی۔ آج تیسرا دن تھا اور اس نے باہر نکل کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ باہر کے موسم سمیت باہر کے لوگوں سے بھی غافل تھی۔ اس کے کہنے پر اس کا کھانا اس کے کمرے میں آ جاتا۔ اس کے موڈ کو دیکھتے ہوئے کسی نے اسے کمرے سے باہر آنے کو نہیں کہا تھا۔ اور خود وہ باہر جانا نہیں چاہتی تھی۔ تین دن سے اس نے شاید منہ بھی نہیں دھویا تھا۔ لباس بھی تبدیل نہیں کیا تھا۔ وہ شدید مایوسی کے عالم میں مبتلا تھی۔ ایسے جیسے شو نہ نا کام ہوا ہو، بلکہ کسی نے اسے زندگی بھر نامراد رہنے کی خبر سنا دی ہو۔

استاد طافو اسے اہم اصول سکھانا بھول گئے تھے کہ کامیابی سے پہلے بہت سی ناکامیوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ اس نے کیسے سوچ لیا تھا کہ ایک شو کے بعد وہ سنگر بن جائے گی۔ شو بھی وہ جو ایک گھر میں منعقد تھا اور جو کہ سراسر نجی محفل تھی۔ امیر لوگوں نے اپنے دل بہلانے کو سنگیت کی محفل رکھ لی تھی۔ اور جس میں گیت گا کر وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ بہت بڑی سنگر بن جائے گی اور اپنی پہچان بنا لے گی۔ وہ سخت غلط فہمی کا شکار تھی۔

تیسرے دن ناشتے کے بعد کومل بیگم اس کے کمرے میں آئی تھی۔ اور تب وہ ناشتا کر کے اپنے بیڈ پر مردوں کی طرح لیٹی ہوئی تھی۔ کومل بیگم بنا دستک دیے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ آتے ہی انہوں نے کمرے کی ساری لائٹس آن کر دی تھیں اور کھڑکی کے پردوں کو پیچھے کر دیا تھا۔ اتنے دنوں کے بعد کمرے میں اتنی تیز روشنی باریشہ کی آنکھوں میں چبھن پیدا کرنے لگی تھی۔

''آنٹی! لائٹس بند کر دیں پلیز......'' اس نے بلینکٹ آنکھوں تک لاتے ہوئے کہا تھا۔ لیکن کومل بیگم نے اس کی ایک نہیں سنی تھی۔

''بہت ہوا میری جان......اب اٹھ جاؤ۔'' اس نے پیار سے کہا تھا۔ اور بیڈ پر اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔ باریشہ کو چار و ناچار اٹھ کر بیٹھنا پڑا تھا۔

''جب سے کراچی سے آئی ہو، کمرے میں بند ہو۔ ایسا کیا ہوا ہے میری جان۔''

''آپ سب جانتی تو ہیں۔ نتاشا نے آپ کو بتا تو دیا ہے۔''

''جانتی ہوں۔ تب ہی تو پوچھ رہی ہوں کہ ایسا کیا ہو گیا ہے۔''

وہ چپ رہی تھی۔ شاید اس کے پاس دینے کو کوئی جواب نہیں تھا۔

''ایسا ہو جاتا ہے میری جان...... یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے۔''

''میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا؟'' کہتے ہوئے اس کی آواز روہانسی تھی۔

''اس کا جواب تو نہیں ہے میرے پاس...... لیکن ہم سب کے ساتھ ہی کچھ اچھا کچھ برا ہوتا رہتا

ہے۔تم اتنی مایوس کیوں ہو رہی ہو۔ جیسے یہ تمہارا آخری موقع تھا۔ میری جان...... ابھی تو شروعات ہے۔ابھی توتم نے بہت آگے جانا ہے۔''

''اس شروعات نے ہی میری ساری خوداعتمادی چھین لی ہے۔''

''اتنی مایوسی کی باتیں نہیں کرتے۔''

''میں ایسا ہی محسوس کر رہی ہوں کومل آنٹی......''

''تم نے تو مجھے سخت پریشان کر دیا ہے میری جان...... تمہارے بستامی بابا بھی تمہاری وجہ سے بہت پریشان ہیں۔انہوں نے کہا ہے کہ میں تمہیں آج کمرے سے باہر لاؤں۔''

باریشہ چپ رہی تھی۔اس کا فی الحال کومل بیگم کی بات ماننے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

''تم جلدی سے فریش ہو جاؤ...... پھر میں تمہیں ایک گڈ نیوز سناؤں گی۔میرے پاس تمہارے لیے ایک گڈ نیوز ہے۔''اس نے چہکتے ہوئے کہا تھا۔

باریشہ نے ان کی طرف دیکھا تھا۔

''اس بار ہمیں لاہور جانا ہوگا۔شاہی قلعہ میں ایک شو ہے۔تمہیں وہاں پرفارم کرنا ہوگا۔''کومل بیگم نے اپنی طرف سے اس کے لیے ایک بڑی گڈ نیوز تیار کر رکھی تھی۔اس کا خیال تھا کہ باریشہ یہ سن کر کھل اٹھے گی۔لیکن باریشہ کے تاثرات اس کی توقع کے برخلاف تھے۔

''نہیں کومل آنٹی......اب نہیں......'' وہ بیڈ پر سے اٹھی تھی اور نیچے اتر کر کھڑی ہو گئی تھی۔ایسے وقت میں ایک بے چینی اس کے پورے وجود میں سرایت ہوتی نظر آ رہی تھی۔

''کیوں......کیا ہوا ہے؟''کومل بیگم بھی کھڑی ہوئی تھی۔

''میں اب گانا نہیں گا سکتی ہوں۔''

''اب کیا ہوا ہے؟''

"مجھے لگتا ہے کہ میں گا ہی نہیں سکتی ہوں۔ میری خود اعتمادی ختم ہو چکی ہے۔"

"کراچی والے واقعہ کا تم نے اتنا اثر لے لیا ہے میری جان......"

"شاید......یا پتا نہیں...... مجھے لگتا ہے کہ چاند نانو نے مجھ پر جادو کروا دیا ہے۔ اگر میں نے مزید ایسی کوئی کوشش کی تو میرے ساتھ کچھ برا ہو جائے گا۔" باریشہ نے کہا۔

کومل بیگم نے اس کا جواز سنا تھا اور پھر اگلے ہی پل ہنسنے لگی۔

"کیسی باتیں سوچتی ہو تم باریشہ...... چاند بھلا ایسا کیوں کرے گی؟"

"پھر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا ہے کومل آنٹی......؟"

"ہم سب کے ساتھ ہی ہو جاتا ہے۔ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ جب میں پہلی بار......" وہ روانی میں کچھ بتاتے بتاتے رکی۔ موضوع کی نزاکت کا احساس ہوتے ہی وہ چپ ہو گئی تھی۔ باریشہ نے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"کیا......؟"

"نہیں کچھ نہیں......بس اتنا کہنا چاہ رہی ہوں کہ پہل پہل کام بہتر نہیں ہو پاتے۔"

"اگر چاند نانو نے مجھ پر جادو نہیں کروایا تو پھر مجھے ان کی بددعا تو ضرور ہی لگ گئی ہے۔ وہ مجھے بددعائیں تو ضرور دیتی ہوں گی۔"

"بے شک دیتی ہوں گی۔ اس عورت کو میں اچھے سے جانتی ہوں۔ اس نے کسی کو بھی نہیں بخشا......وہ تو اپنے بھائی کے لیے بھی بددعائیں کرتی ہو گی۔ لیکن یاد رکھنا میری جان...... بددعا اسی کی لگتی ہے جو مظلوم ہو۔ اور چاند مظلوم نہیں ہو سکتی۔ بلکہ وہ تو ظالم ہے۔"

"شاید......"

"تمہیں وہم ہو گیا ہے اور کوئی بات نہیں...... فریش ہو جاؤ۔ اور تیاری کرو......"

''نہیں...... میں نہیں کر سکتی ہوں۔'' اس نے ایک بار پھر سے انکار کر دیا تھا۔ کومل نے کچھ تیکھے انداز میں اسے دیکھا تھا۔ اسے کسی کا انکار سننے کی عادت نہیں تھی۔ منانے کی عادت تو ہرگز نہیں تھی۔

''تم ضد کیوں کر رہی ہو باریشہ......؟''

''نہیں...... پلیز کومل آنٹی...... مجھے مت اکسائیں...... میں آپ کی بات ہرگز نہیں مان سکتی ہوں۔'' باریشہ نے کہا۔

کومل بیگم اپنا غصہ پی کر رہ گئی۔ اس کا دل کر رہا تھا کہ کھینچ کر ایک تھپڑ باریشہ کے منہ پر دے مارے۔ یہ لڑکی خود کو سمجھنے کیا لگی تھی۔ کیا یہ اپنی اوقات بھول گئی تھی۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ ابھی وقت کا تقاضا تھا کہ وہ خاموش رہے اور اپنے ہاتھ کنٹرول میں رکھے۔ گھی سیدھی انگلی سے نکل سکتا تھا تو پھر انگلی ٹیڑھی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس نے تو بڑی بڑی ٹیڑھی لڑکیوں کو سیدھا کر دیا تھا۔ پھر یہ باریشہ کیا چیز تھی اس کے سامنے...... روشن بیگم نے اس حوالے سے کومل اور ایمن دونوں کی ہی بہت اچھی ٹریننگ کی ہوئی تھی۔ انہیں ضدی لڑکیوں کو راہ راست پر لانے کے سارے گر سکھائے ہوئے تھے۔ لیکن ساتھ روشن بیگم نے یہ بھی سکھایا تھا کہ چاہے جو مرضی ہو جائے، نرمی اور مسکراہٹ کا دامن نہیں چھوڑنا ہے۔ یہ وہ ہتھیار ہیں جن سے دشمن خود بتا دیتا ہے کہ کس طریقے سے لڑ کر اس کو شکست دی جا سکتی ہے۔

''کیا اب تم مزید گانا ہی نہیں چاہتی ہو میری جان......''

''میرے خیال سے نہیں......''

''جلد بازی میں فیصلہ مت کرو میری جان...... چند دن سوچ لو۔''

''آپ کے کہنے پر سوچ لیتی ہوں...... لیکن چند دن کے بعد بھی میرا جواب ناں میں ہی ہو گا۔ آپ استاد جی کو فی الحال گھر آنے سے منع کر دیں۔'' باریشہ نے فیصلہ کن کہا تھا۔

کومل غصہ پی کر رہ گئی۔ اتنی محنت اور پیسہ بہا دینے کے بعد باریشہ گانے کے لیے تیار کی گئی تھی اور اب جب اس سے پیسہ کمانے کی باری آئی تھی تو وہ انکار کر رہی تھی۔

''ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی...... لیکن پلیز فریش ہو کر کمرے سے باہر آجاؤ میری جان...... تم کمرے میں بند ہو، مجھ سے دیکھا نہیں جا رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں فریش ہو کر باہر آتی ہوں۔'' اس نے رضامندی دے دی تھی۔ کومل نے اسمائل پاس کی تھی اور کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ باریشہ نے دروازہ بند کر لیا تھا۔

''ہاں...... کیا کہہ رہی ہے؟'' لاؤنج میں بستامی بیٹھا اپنی بیوی کا انتظار کر رہا تھا۔ کومل بیگم کے وہاں پہنچنے پر اس نے اس سے پوچھا۔

جواباً کومل بیگم نے انکار میں سر ہلا دیا تھا۔

''کیا مطلب......؟ انکار کیوں کر دیا ہے اس نے......؟''

''وہ کہہ رہی ہے کہ اب اسے گانا ہی نہیں گانا ہے۔''

''لیکن کیوں......؟''

''جو واقعہ ہوا اس کا بہت اثر لیا ہے۔''

''تم نے سمجھانا تھا۔''

''اپنی طرف سے کوشش تو بہت کی...... لیکن بہت ضدی ہے کم بخت اپنی ماں کی طرح......'' کومل بیگم نے نخوت سے کہا تھا۔

بستامی چپ رہا تھا۔ اسے صندل یاد آ گئی تھی جس کی وجہ سے اسے بہت ذلت سہنا پڑی تھی۔

''اگر وہ اپنی ضد پر قائم رہی تو کیا کریں گے؟ بٹھا کر اسے روٹیاں توڑنے کے لیے رکھیں گے کیا؟''

''میں رحبانی سے بات کرتا ہوں۔ وہ صندل کو بھی بہت اچھے سے جانتا تھا۔ اس کی بیٹی کو کیسے لائن پر لانا ہے، وہ بتا دے گا۔''

☆......☆......☆

۱۹۷۳ء

دسمبر کا مہینہ شروع ہوئے کافی دن بیت چکے تھے۔ ٹھنڈ پانی کا سرد موسم سرد تر ہو چکا تھا۔ برف کی ہلکی پرت سارے درختوں، پگڈنڈیوں اور خالی میدان پر چڑھ چکی تھی۔ یہ موسم گھر کی مرمت کے لیے نامناسب تھا۔ لیکن وہ گھر اس قدر نامکمل تھا کہ صندل اور میرزاد دونوں موسم کی پروا کیے بنا گھر کی مرمت کا کام جلد سے جلد مکمل کر رہے تھے۔ دونوں نے پورا ایک ہفتہ اس نامکمل گھر پر مزید کام کیا تھا اور وہ اس قدر بہتر ہو گیا تھا کہ وہاں سکون سے زندگی گزاری جا سکے۔ میرزاد نے کھڑکیاں لگوا دی تھیں، دروازے لگوا دیے تھے۔ کچن میں لکڑی کا کام کروا دیا تھا۔ ماربل کی سلیب لگ گئی تھی اور ہر ہر کمرے کا فرش ڈال دیا گیا تھا۔ رنگ و روغن تو صندل نے خود مکمل کیا تھا۔ اور چند دنوں میں گھر جگ مگ کرنے لگا تھا۔

دونوں نے قریبی بازار جا کر گھر کی ضرورت کا کچھ سامان اکٹھا کر لیا تھا۔ کچن کا سامان اور اپنے لیے آرام دہ بستر...... اس سب میں دونوں کی کافی بچت ختم ہو گئی تھی۔ صندل جب جب اپنی باقی ماندہ بچت کو دیکھتی تھی تو اسے پریشانی ہونے لگتی تھی۔ دونوں اگر اسی طرح بیٹھ کر کھاتے رہے تو چند مہینوں میں ان کے ہاتھ سے سب ختم ہو جانے والا تھا۔

"میر......! تم ریسٹورنٹ کی بات کر رہے تھے۔"

"ہاں...... لیکن اس کے لیے تو گھر میں کافی کام کروانا ہو گا۔"

"تو تم یہ کام شروع کروا لو...... کس چیز کا انتظار ہے۔"

"موسم کے بدل جانے کا...... اتنی شدید سردی میں کام کروانا مشکل ہے۔"

"موسم تو مہینوں کے بعد تبدیل ہو گا۔ ہم اگر موسم کے تبدیل ہونے کا انتظار کرتے رہے تو ہماری بچت گھر بیٹھے بیٹھے ہی ختم ہو جائے گی۔"

"یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔"

''میں کہتی ہوں کہ تم بالکل دیر مت کرو۔ ایک کام کا ارادہ کر لیا ہے تو شروع کر دیتے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو ہر چیز ہمارے لیے موزوں ہوتی جائے گی۔''

''ٹھیک ہے۔ میں کل ہی اس کام کے لیے ایبٹ آباد جاتا ہوں۔'' میر نے رضامندی دیتے ہوئے کہا تھا۔

اگلے دن میر ایبٹ آباد چلا گیا تھا۔ اور چند دنوں میں ان کے ریسٹورنٹ کا کام شروع ہو گیا تھا۔ اگرچہ صندل شروع شروع میں اس کام سے ہچکچا رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس گھر میں کوئی ایسا کام کریں جس سے لوگوں کی آمد و رفت میں اضافہ ہو۔ لیکن جب اسے اپنے اور میر کے لیے کوئی مناسب کام نظر نہ آیا تو اسے میر کا خیال اچھا لگا کہ ریسٹورنٹ میں باربی کیو کھانے رکھے جائیں۔ کباب، تکے اور ایسا ہی کچھ...... کیونکہ پہاڑوں پر آنے والوں کی پہلی پسند لذیذ کھانے اور مرغن غذائیں ہوتی تھیں۔ دونوں کو غالب گمان تھا کہ یہ کام ان کے لیے نقصان کا باعث نہیں ہو گا۔ دونوں دل و جان سے اس چیز کی تیاری کرنے لگے تھے۔

باقی ماندہ زیور بیچ کر ریسٹورنٹ کی مناسبت سے سامان خرید لیا گیا تھا۔ کرسیاں، ٹیبل، کراکری اور سجاوٹی سامان...... جو کہ حویلیاں اور ایبٹ آباد کی ثقافت کی تصویر کشی کرتا تھا۔ رنگ برنگی سجاوٹ کو دیکھ دیکھ کر صندل خوش ہوتی رہتی تھی۔ جلد ہی میر زاد کو اس کام سے منسلک لوگ بھی ملتے چلے گئے۔ جو ویٹر کا کام کرنا جانتے تھے اور جو بھٹی پر گوشت کو پکانا جانتے تھے۔ ساری تیاری کرنے کے بعد جلد ہی ریسٹورنٹ کا افتتاح کر دیا گیا تھا۔

شروعات کے دن مناسب گزرے تھے۔ مناسب گاہک آتے تھے۔ جو سامان بچ جاتا تھا وہ ان دونوں سمیت ملازموں کو کھانا پڑتا تھا۔ قیمہ اور مسالا لگے گوشت میں نقصان کم تھا۔ کیونکہ دو تین دن تک وہ آسانی سے تازہ رہتا تھا۔ پھر آنے والے دنوں میں انہیں کام کے حوالے سے مزید تجربات ملتے

گئے۔ یہ کہ چھٹی والے دن گاہکوں کا رش زیادہ ہوتا ہے۔ لوگ دوسرے شہروں سے چھٹی والے دن نکلتے ہیں۔ اس طرح یہ ہوا کہ وہ دونوں ان دنوں زیادہ گوشت کو مسالا لگوالیا کرتے تھے۔ ملازم بھی ایمان دار تھے۔ محنت اور خلوص سے کام کررہے تھے۔ جلد ہی انہیں اس کام سے اچھا خاصا منافع ہونا شروع ہوگیا تو روٹیوں کے لیے چھت پر تندور لگالیا گیا۔ اس سے پہلے صندل کو کچن میں کھڑے ہوکر روٹیاں بنانی پڑتی تھیں۔ تندور کے لگنے سے یہ ہوا کہ صندل کو کچھ فراغت میسر آگئی۔ اس نے میر سے فرمائش کی کہ وہ اس کے لیے کہیں سے ستار ڈھونڈ لائے۔ وہ فارغ وقت میں اسے بجالیا کرے گی۔ میر ایک دن لاہور گیا تھا اور وہاں سے صندل کے لیے ستار لے آیا تھا۔ جسے دیکھ کر صندل بہت خوش ہوئی تھی۔

''جب ہمارے گاہکوں کا رش زیادہ ہوگا تو میں ساتھ والے کمرے میں بیٹھ کر ستار بجایا کروں گی۔ اس طرح کھانا کھاتے ہوئے انہیں موسیقی لطف دیا کرے گی۔''

''خیال تو اچھا ہے، لیکن اس طرح تو ہمارے ریسٹورنٹ کا نام ستار ریسٹورنٹ پڑ جائے گا۔''

''تو ٹھیک ہے نا...... ویسے بھی ابھی تک ہمارے ریسٹورنٹ کا کوئی نام ہی نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے...... جیسا تم چاہو......'' میر نے رضامندی دے دی تھی۔

اس دن کے بعد سے صندل کا یہ معمول بن گیا تھا کہ وہ جمعرات اور جمعہ والے دن شام سے رات تک ستار بجایا کرتی تھی۔ ستار کی آواز کی گونج بڑے کمرے سے ہوتی ہوئی باہر تک سنائی دیتی تھی جس سے ماحول میں رومانیت گھلتی چلی جاتی تھی۔ اور پھر ویسا ہی ہوا تھا جیسا کہ میر زاد نے کہا تھا۔ ریسٹورنٹ کا نام جلد ہی ستار ریسٹورنٹ مشہور ہوگیا۔

وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ مشہوری ان کے لیے قاتل ثابت ہوگی۔ وہ جو سب سے اپنی شناخت چھپاتے پھر رہے تھے تو اسی ستار کی وجہ سے وہ پہچان میں آجائیں گے اور پکڑ لیے جائیں گے۔

☆......☆......☆

تعبیر رخصت ہو کر کمال کے فارم ہاؤس میں پہنچ چکی تھی۔ اسے نہیں اندازہ تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو چکا ہے۔ وہ کمال کو ہی اپنا شوہر خیال کیے ہوئے تھی جو ہر طرح سے اس کا خیال رکھ رہا تھا۔ اگرچہ اس میں سنجیدگی حد سے زیادہ تھی لیکن تعبیر کو اتنی سہولیات کے بعد یہ کمی گوارہ تھی۔

اس فارم ہاؤس میں تعبیر کو کسی چیز کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ہر طرح کا اناج، پھل ہر وقت موجود رہتا تھا۔ تین چار ملازم تھے جو گھر کی صفائی ستھرائی کے لیے رکھے گئے تھے۔ کھانا بھی ملازمہ بناتی تھی۔ تعبیر کو کوئی کام نہیں کرنا پڑتا تھا۔ زیور موتی اور کپڑوں کا ڈھیر الگ سے الماریوں میں موجود تھا۔ دن بدن اپنی موجودہ حیثیت کے ساتھ سمجھوتا کرتے ہوئے خوش ہونے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ تاہم ایک بات اسے کھٹکتی تھی کہ کمال کا کوئی رشتے دار نہیں تھا۔ گھر میں تو کوئی موجود تھا ہی نہیں، کمال سے ملنے بھی وہاں کوئی نہیں آتا تھا۔ تعبیر نے اس حوالے سے کمال سے بات کی تھی اور کمال نے اسے کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دیا تھا۔

اس نے ملازمہ کے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش کی تھی لیکن ملازمہ کو جیسے سخت ہدایت دی تھی کہ وہ تعبیر کے ساتھ غیر ضروری بات نہ کرے۔ اس لیے وہ تعبیر کی لاکھ کوششوں کے باوجود بھی اس سے ایک فاصلے پر رہتی تھی۔ اسی وجہ سے جو پہلی چیز تعبیر کو اس گھر میں محسوس ہوئی، وہ تنہائی تھی۔ جس پر موسم کی شدت نے مزید قہر ڈھا دیا تھا۔

خود کو مصروف رکھنے کے لیے وہ کوئی کام کرنا چاہتی تھی لیکن ملازمہ اسے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی تھی۔

"صاحب کو پتا چل گیا تو وہ غصہ ہوں گے بی بی...... رحم کریں ہم پر......" ملازمہ نے کچھ ایسی بے بسی سے کہا تھا کہ تعبیر نے پھر کسی کام کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

دوسری چیز جو اسے تنگ کر رہی تھی وہ کمال کا رویہ تھا۔ اگرچہ وہ اسے کچھ نہیں کہہ رہا تھا لیکن رات کے بعد وہ جیسے اس سے غافل ہو جاتا تھا۔ تعبیر سارا دن کہاں ہے، اسے اس سے کوئی غرض نہیں ہوا کرتی

تھی۔ وہ اس کے مشاغل، اس کی دن بھر کی مصروفیت جاننے سے کوئی سروکار نہ رکھتا تھا۔ اور جس چیز سے رکھتا تھا اس کے بارے میں تنہائی میں سوچتے ہوئے بھی تعبیر کو الجھن ہونے لگتی تھی۔ لیکن پھر جلد ہی اس کھیل کا ڈراپ سین ہو گیا۔ اور سب کھل کر تعبیر کے سامنے آ گیا۔

''یہ راستے کب ٹھیک ہوں گے کمال......؟'' ایک دن اس نے کمال سے پوچھا تھا جو کھڑکی کے سامنے بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔

''کافی وقت لگتا ہے راستوں کو کھلنے میں...... کیوں...... تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''مجھے امی کی یاد آ رہی ہے۔''

''تو......؟'' اخبار سے نظریں ہٹا کر اس نے کچھ ناگوار نظروں سے تعبیر کو دیکھا تھا۔

''تو یہ کہ اگر ان سے ملاقات ہو جائے تو......؟'' اس نے لجاجت سے کہا تھا۔

''برف ختم ہو گی تو ان کو یہاں بلوا لینا...... دو تین دن وہ یہاں رہ سکتی ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔'' کہہ کر وہ پھر سے اخبار بینی میں مصروف ہو گیا تھا۔

''اور اگر میں وہاں جانا چاہوں تو......؟''

''تم وہاں نہیں جا سکتی؟'' دو ٹوک کہا گیا تھا۔

''میں کیوں نہیں جا سکتی ہوں؟'' اسے انکار سے زیادہ انداز پر حیرت ہوئی تھی۔

''میں نہیں چاہتا کہ تم اس بدنام گلی میں دوبارہ جاؤ۔'' کمال نے کہا تھا اور تعبیر کو کمال کی بات سمجھنے میں دشواری ہوئی تھی۔

''کیا مطلب ہے آپ کا اس بات سے؟''

''میں مینا گلی کی بات کر رہا ہوں۔''

''مینا گلی......؟'' تعبیر کو شدید حیرت ہوئی تھی۔

کمال نے کیسے اس کا حوالہ بدنام مینا گلی سے جوڑ دیا تھا۔

"میرا مینا گلی میں کیا کام......؟"

"تم کہاں سے ہو......؟"

"دین حویلی سے اور کہاں سے......" تعبیر نے کہا تھا۔

کمال نے اخبار ایک طرف رکھ دیا تھا۔ بات اب کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔ صندل غائب ہو چکی تھی اور بستامی نے اپنے گھر کی لڑکی کو ان کے سپرد کر دیا تھا۔

"صندل کون تھی۔ جانتی ہو تم......؟"

"ہاں......صندل میری کزن ہے۔"

"کیا وہ روشن بیگم کی بیٹی نہیں ہے؟"

"نہیں......ہرگز نہیں......" اس نے قطعیت سے انکار میں سر ہلایا تھا۔ "وہ تو چاندامی کی بیٹی ہے۔ دین حویلی میں رہتی ہیں وہ......" تعبیر نے بتایا تھا۔

کمال چپ ہو گیا تھا۔ اسے سب سمجھ میں آ گیا تھا کہ اس کے ساتھ کیا کھیل کھیلا گیا ہے۔

"آپ سے کس نے کہا تھا کہ صندل روشن بیگم کی بیٹی ہے۔ ایسی گندی بات کس نے کی آپ سے؟"

"روشن بیگم نے خود کہا تھا۔"

"حیرت ہے انہوں نے جھوٹ کیوں بولا......"

تعبیر کی بات پر کمال نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ کچھ اور ہی سوچنے لگا تھا۔ اپنی کرسی سے اٹھ کر وہ حیران و پریشان کھڑی تعبیر کے پاس آیا تھا۔

"تم......تم جانتی ہو نا کہ میں شادی شدہ ہوں......اور میرے بچے بھی ہیں۔"

"کیا......؟" تعبیر کے سر پر جیسے کسی نے ہتھوڑا دے مارا تھا۔ "نہیں......میں کچھ نہیں جانتی

ہوں۔ نکاح سے پہلے مجھے ایسا کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔"

"کون سا نکاح......؟" اب کے کمال حیران ہوا تھا۔

"ہمارا نکاح......"

"تم ٹھیک تو ہو......تم سے کس نے کہا کہ میں نے تم سے نکاح کیا ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ کمال......؟ دین حویلی میں ہمارا نکاح ہوا ہے۔"

"میں کبھی دین حویلی نہیں گیا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سب گھر والے ہمارے نکاح میں شریک تھے۔"

"تم سے کوئی نکاح نہیں کیا گیا۔ تمہاری پوری قیمت ادا کی گئی ہے۔ بستامی کو...... چاہو تو اسے بلوا لیتا ہوں یہاں پر...... پوچھ سکتی ہو تم اس سے......"

"لیکن......اگر میرا اور آپ کا نکاح نہیں ہوا تو پھر میں یہاں کس حیثیت سے رہتی رہی ہوں۔"

"میری رکھیل کی حیثیت سے......"

کمال نے کہا تھا اور تعبیر کا دل چاہا تھا کہ کمال کا منہ نوچ لے یا اپنا گلا گھونٹ لے۔



ناول **تاش گھر** ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **15** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 20

دن شام کے قالب میں ڈھل رہا تھا اور تعبیر کو ویسا ہی بخار چڑھنے لگا تھا جو بچپن میں ایک بار چڑھا تھا۔ سارا دن وہ ٹھیک رہتی تھی اور شام ہوتے ہی اس کا جسم بخار سے تپنے لگتا تھا۔ اب بھی کچھ ایسی ہی صورت حال تھی۔ لیکن تعبیر جانتی تھی کہ صبح ہونے پر بھی یہ بخار نہیں اترے گا۔ شام کا یہ بخار ساری زندگی اس کا جسم تپاتا رہے گا۔ اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ اور یہ یقیناً پھٹ جاتا اگر اس کی سانسیں ابھی باقی نہ ہوتیں......

موت کا وقت ابھی نہیں آیا تھا۔ ورنہ جسم سے روح تو تب ہی نکل چکی تھی جب کمال نے اس سے کہا تھا کہ وہ اس کی بیوی نہیں بلکہ رکھیل بن کر یہاں اتنے دنوں سے رہ رہی ہے۔ ایک مرد کے ساتھ اس نے دو ہفتے ایک چھت تلے بتا دیے تھے۔ یہ جانے بنا کہ وہ اس کے لیے غیر محرم تھا اور وہ اسے اپنا محرم مان کر پیار کرتی رہی تھی۔ چومتی رہی تھی۔ اپنا آپ اس نے اس کے حوالے کر دیا تھا۔ اب اسے خود سے اتنی گھن آ رہی تھی کہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اپنے اوپر تیزاب پھینک کر اپنا سارا جسم جلا ڈالے۔

کمال نے فون پر اس کی بستامی سے بات کروادی تھی۔ اور اب شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ کمال نے جو کچھ بتایا تھا سب ویسا ہی ہوا تھا۔ نکاح کے لیے گھر میں کوئی اور لڑکا موجود تھا۔ کمال دین حویلی نہیں گیا تھا۔ اور نکاح اصل میں ہوا تھا یا نہیں، کوئی نہیں جانتا تھا۔ مردوں والے حصے میں تو حویلی کا کوئی فرد موجود ہی نہیں تھا جو وہاں کی بات بتاتا...... سوائے بستامی کے اور رحبانی کے...... اور کوئی بعید نہیں تھی کہ

بستامی کے اس عمل میں رحبانی بھی شریک رہا ہو۔ تعبیر نے نکاح کے وقت جن کاغذات پر سائن کیے تھے ان کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ جب اس کا کوئی دولہا ہی نہیں تھا تو قبولیت والا صفحہ کیا معنی رکھتا تھا۔

اس کا تو خریدار تھا۔ کمال...... جواب اس کا مالک تھا۔ تعبیر کی حیثیت سے بڑھ کر قیمت دی تھی اس نے اس کی...... اپنا سارا غصہ فون پر اس نے بستامی پر نکالا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ فوراً سے حویلیاں پہنچ کر بستامی کو جان سے مار دیتی۔

''آپ نے میرے ساتھ یہ کیا کیا ہے بستامی بابا......'' وہ روتے ہوئے چلائی تھی۔

''کیا کیا ہے میں نے تمہارے ساتھ تعبیر......؟'' تعبیر کے رونے پر بستامی کچھ ڈرا تھا۔ جان گیا تھا کہ تعبیر کو حقیقت کا علم ہو چکا ہے۔ لیکن خود کو کمزور نہیں ظاہر کرنا چاہتا تھا۔

''آپ نے میرا سودا کیا ہے؟''

بستامی خاموش رہا تھا۔ وہ جوڑ توڑ کر رہا تھا کہ وہ کیا کہہ کر تعبیر کو پر سکون کرے۔

''بولیے بستامی بابا...... آپ نے مجھے بیچا ہے؟''

''ہاں......!'' اس نے مختصر لفظ میں اعتراف کر لیا تھا اور تعبیر جو کہ کسی حد تک کمال کی بات پر یقین کر چکی تھی بستامی کے اعتراف کر لینے پر ٹوٹ کر رہ گئی تھی۔ جو تھوڑی بہت شک کی گنجائش تھی وہ بھی ختم ہو گئی تھی۔

''کیوں کیا آپ نے ایسا...... میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟'' دکھ سے بے انت ہو کر روتے ہوئے وہ بمشکل بول پا رہی تھی۔

''حویلی کے معاشی حالات خراب تھے۔ سب تجوریاں خالی ہو چکی تھی۔ اس لیے مجھے ایسا کرنا پڑا۔''

''تو کیا میری عزت کا سودا کرنے کے بعد حویلی کے حالات بہتر ہو جائیں گے؟''

''مجھے جو بہتر لگا میں نے کیا۔''

''اپنے گھر کی لڑکیوں کی عزت کے سودے کون کرتا ہے بستامی بابا......''

''کوئی ایک قربانی دے دے تو باقی سب کا بھلا ہو جاتا ہے۔تم نے وہ قربانی دی ہے۔''

''آپ کو احساس ہے کہ آپ نے میرے ساتھ کتنی بڑی زیادتی کی ہے۔''

''کوئی زیادتی نہیں کی ہے میں نے تمہارے ساتھ...... میری جگہ پر خود کو رکھ کر دیکھو! حویلی کے معاملات دیکھنا آسان نہیں تھا۔تم سب کو کھلانا پلانا، ہر ضرورت کا خیال رکھنا۔کہاں سے آتا اتنا پیسہ...... کاروبار میں لگانے کو کچھ بچا نہیں تھا۔ برتن تک بکنے پر آ گئے تھے۔اور تم کہہ رہی ہو کہ میں نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے۔میں نے باقی سب کا بھلا کیا ہے۔''

''امی کو جب پتا چلے گا کہ آپ نے میرے ساتھ یہ کیا ہے تو وہ آپ کو جان سے ماردیں گی۔''

''تمہاری ماں کو تب پتا چلے گا جب اسے کوئی بتائے گا۔''

''آپ کا کیا خیال ہے کہ میں چپ رہوں گی؟''

''تم اپنی ماں سے ملو گی تو اسے کچھ بتاؤ گی نا......'' بستامی نے کہا تھا۔تعبیر کا سانس اکھڑنے لگا تھا۔''کمال تمہیں کبھی وہاں سے نہیں جانے دے گا۔'' بستامی نے کچھ اتنے ٹھوس لہجے میں کہا تھا کہ تعبیر کو اپنے گرد شکنجہ کستا ہوا محسوس ہوا تھا۔

''میں یہاں مزید ایک لمحہ بھی نہیں رہوں گی۔اب تو کسی صورت نہیں......''

''کمال کی اجازت کے بنا تم وہاں سے نہیں نکل سکتی ہو۔یہ بات ذہن سے نکال دو۔میری مانو تو حالات کے ساتھ سمجھوتا کر لو۔کمال تمہیں کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دے گا۔رانیوں کی طرح رکھے گا۔رونے دھونے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔جس ماحول میں ہو،لڑکیاں اس کے خواب دیکھتی ہیں۔''

''میں لعنت بھیجتی ہوں اس عیش و آسائش پر......''

''وہ تمہاری مرضی...... رو کر یا ہنس کر...... تمہیں اب وہاں ہی رہنا ہے۔یہ بات اچھے سے سمجھ لو تم......''

بستامی نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔ اور وہ اپنا سر تھام کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ اس کے اپنوں نے اس کے ساتھ وہ کھیل کھیلا تھا کہ شیطان بھی ایسا کرتے ہوئے ہزار بار سوچے۔ اس کی عزت کا سودا کر دیا گیا تھا۔ اسے نیلام کر دیا گیا تھا۔ ایسا تو شاید کوئی جانوروں کے ساتھ بھی نہیں کرتا ہوگا جیسا بستامی نے اس کے ساتھ کیا تھا۔

درد سے دکھتا اپنا سر تھامے نجانے کتنی دیر تک وہ روتی رہی تھی اور اپنے آپ کو کوستی رہی تھی کہ وہ پیدا ہی کیوں ہوئی اور اگر ہو گئی تھی تو پیدا ہوتے ہی مر کیوں نہیں گئی۔ اور خود کو کوسنے کے انہی لمحوں میں اسے افشیں کا خیال آیا تھا۔

''تو کیا افشیں کے ساتھ بھی وہی ہوا ہے جو میرے ساتھ ہوا ہے۔'' اس نے سوچا تھا اور پھر افشیں کی شادی کا منظر یاد کرتے ہوئے اسے احساس ہوا تھا کہ افشیں کے ساتھ بھی وہی سب ہوا ہے جو اس کے ساتھ ہو چکا ہے۔ اور افشیں بھی اس وقت لاہور کے کسی بڑے گھر میں اپنا سر پکڑے رو رہی ہوگی۔

اور افشیں کو یاد کرتے ہوئے تعبیر کا دکھ مزید بڑھ گیا تھا اور وہ مزید شدت سے رونے لگی تھی۔

☆......☆......☆

کمال غصے میں تھا اور غصے کے عالم میں ہی اس نے روشن بیگم کو فون کیا تھا۔

''آپ نے میرے ساتھ جھوٹ کیوں بولا روشن بیگم؟''

''کون سا جھوٹ بولا ہے میں نے تمہارے ساتھ کمال؟''

''آپ نے کہا تھا کہ تعبیر آپ کی بیٹی ہے۔''

''تو......؟''

''وہ تو دین حویلی سے ہے...... بستامی کی رشتے دار ہے۔''

''تو اس میں کیا ہے کمال...... تمہیں اس سے کیا کہ وہ کس کی بیٹی ہے۔ میرا تو کام ہی ایسا ہے۔

سو جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ سو لڑکیاں میرے انڈر سے ہو کر مختلف شہروں کو گئی ہیں۔ میں سب کو اپنی بیٹیاں ہی تو کہتی تھی۔'' روشن بیگم نے کہا تھا۔

کمال چپ ہوا تھا۔ واقعی ہی بھلا اسے اس بات سے کیا سروکار تھا۔

''تعبیر کا بیک گراؤنڈ کیا ہے تمہیں اس سے مطلب نہیں ہونا چاہیے۔ تمہیں بس لڑکی سے مطلب ہونا چاہیے۔''

''آپ لوگوں نے مجھ سے تو چھپایا ہی تھا، تعبیر سے بھی سب چھپایا ہے۔ لیکن آپ کو بتا دوں کہ اسے اب سب پتا چل چکا ہے۔''

''اس سے فرق نہیں پڑتا۔''

''لیکن مجھے فرق پڑتا ہے روشن بیگم...... میں گھر پر ایسی لڑکی رکھنے کا قائل نہیں جو میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔''

''کیا عجیب بات کر رہے ہو کمال تم...... تم تو ایسے بات کر رہے ہو جیسے تم نے اپنی والدہ کو دین حویلی بھیجا تھا تعبیر کے رشتے کے لیے...... اور تمہارا تعبیر سے نکاح ہوا ہے۔ جس کے بعد تم تعبیر کی پسند ناپسند کی بات کر رہے ہو۔ تم شاید بھول رہے ہو کہ تم نے سودے بازی کی تھی۔ نکاح والی بات سے تم خود پیچھے ہوئے تھے۔ رکھیل بنا کر رکھنا چاہتے تھے تم لڑکی کو......''

''جی...... ایسا ہی ہے، اپنی کہی ہوئی بات یاد ہے مجھے۔''

''پھر جان لو کہ رکھیل کی کوئی مرضی نہیں ہوتی ہے۔''

''لیکن میں کسی کے ساتھ زبردستی نہیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیا بچوں والی باتیں کر رہے ہو کمال...... تم نہیں جانتے کہ اس دھندے میں کیا کیا ہوتا ہے۔ لڑکیوں کو کیسے سیدھا کرنا پڑتا ہے۔ لڑکیاں مرضی سے تھوڑی نہ کرتی ہیں یہ کام...... راہ راست پر لانا پڑتا

ہے۔" روشن بیگم نے توقف کیا تھا۔ "کیا سب جان لینے کے بعد تعبیر نخرے دکھانے لگی ہے؟"

"جی......!"

"دو دن بھوکا رکھو...... خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔"

"اور اگر نہ ہوئی تو......"

"تو اپنے آدمیوں سے کہنا کہ اسے بید کی مار ماریں۔ جس سے وہ گھوڑے کو سدھاتے ہیں۔ جب بید کی مار سے گھوڑے سیکھ جاتے ہیں تو تعبیر کیسے نہیں سیکھے گی۔"

"لیکن میں یہ سب......"

"دیکھو کمال...... جو پیسہ تم نے تعبیر کے بدلے میں دیا تھا وہ اب تمہیں واپس نہیں مل سکتا۔ میں یہ نہیں کہہ رہی کہ تمہارے ساتھ دھوکا ہو گیا ہے۔ بستامی کے معاشی حالات بہت خراب ہیں تب ہی تو اس نے اپنے گھر کی لڑکی کو تمہیں سونپا ہے۔ اب اس سے وہ تمام پیسے خرچ ہو چکے ہیں۔ جو کہ وہ تمہیں کسی طرح نہیں لوٹا سکتا ہے۔ حویلی بھی نہیں بک سکتی ہے کیونکہ وہ بستامی کی بہن چاند کے نام بھی ہے۔ اب جو سودا ہو چکا ہے تمہیں اسی پر گزارا کرنا ہے اور ویسے دیکھا جائے تو تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوئی کمال...... تم نے پیسہ دیا، لڑکی تمہارے پاس پہنچا دی گئی۔ کیسے پہنچائی وہ ہمارا سر درد ہے۔ اور کیسے تم نے رکھنا ہے وہ اب تمہارا سر درد ہے۔" روشن بیگم نے بات ختم کرنے کے سے انداز میں کہا تھا۔

کمال کو سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کس بات پر اعتراض کرے۔ روشن بیگم ایسی ہی تو گھاگ تھیں۔ جانتی تھیں کہ کس کو کس طرح اپنے دام میں لینا ہے اور کب چھوڑنا ہے۔

"پھر بھی اگر تم سمجھتے ہو کہ تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ تو میں ازالے کے لیے تیار ہوں۔ جب جب حویلیاں آیا کرو گے دل و جان سے تمہاری خدمت کروں گی۔ جس لڑکی پر ہاتھ رکھو گے وہ لڑکی تمہاری ہو گی۔ جب جب مجھے کشمیر بلاؤ گے بنا معاوضے کے مجرا کروایا کروں گی۔"

"ٹھیک ہے روشن بیگم...... میں دیکھتا ہوں کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔" کمال نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

"تعبیر بی بی! آپ کے کھانے کے لیے کچھ لاؤں؟" ملازمہ نے کمرے میں آ کر اس سے پوچھا تھا۔ آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے انکار میں سر ہلا دیا تھا۔

"آپ نے صبح سے کچھ نہیں کھایا ہوا ہے۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"صاحب نے کہا ہے کہ آپ کو کچھ کھلا دوں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ٹھہر کر بتا دوں گی کہ مجھے کیا کھانا ہے۔" ملازمہ کو ٹالنے کے لیے اس نے کہہ دیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ تب تک آپ نہا دھو کر تیار ہو جائیں۔" ملازمہ نے کہا تھا۔

تعبیر نے اچنبھے سے اس کو دیکھا تھا۔

"صاحب نے کہا ہے کہ وہ رات میں آپ سے ملیں گے۔" ملازمہ نے بتایا تھا۔

تعبیر کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ یہ ملازمہ کیا کہہ رہی تھی۔ جو وہ کہہ رہی تھی تعبیر اس کا مطلب بخوبی سمجھ رہی تھی۔ نکاح نہ ہونے والی بات تعبیر کے لیے نئی تھی۔ کمال کے لیے تو وہ اب بھی وہی حیثیت رکھتی تھی جو پہلے رکھتی تھی۔

"مجھے ان سے نہیں ملنا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں جا کر کہہ دیتی ہوں۔ لیکن ابھی مجھے وہی کرنا ہے جو انہوں نے کہا ہے۔"

ملازمہ کہہ کر بیڈ کی چادر بدلنے لگی تھی۔

"یہ کیا کر رہی ہو تم......؟"

"آپ کے اور صاحب کے لیے بیڈ تیار کر رہی ہوں۔"

"دفع ہو جاؤ یہاں سے تم......" اس نے چلا کر کہا تھا۔ ملازمہ اس کی شکل دیکھنے لگی تھی۔ یہ ایک ہی دن میں تعبیر کو کیا ہو گیا تھا۔

"میں نے کہا یہاں سے جاؤ تم......" وہ بلند آواز میں چلائی تھی۔

ملازمہ چپ چاپ کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ لاک کر لیا تھا۔ اوپر کی کنڈی بھی لگالی تھی۔ وہ کسی صورت اب کمال کو اس کمرے میں برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی تسلی نہ ہوئی تو صوفہ کھسکا کر دروازے کے ساتھ لگا لیا تھا۔

تعبیر بے چاری نہیں جانتی تھی کہ اب وہ چاہے جو مرضی کر لے، کمال کے ہاتھوں اس کی بے حرمتی لکھی جا چکی تھی۔

☆......☆......☆

بستامی اپنے کمرے میں موجود تھا۔ اور حسبِ معمول اپنا من پسند کھیل کھیل رہا تھا۔ ٹیبل پر تاش کے پتوں کو تکون شیپ دے کر ایک دوسرے کے اوپر رکھتے ہوئے وہ اس تکون کی اونچائی بڑھاتا جا رہا تھا۔ کافی عرصہ ہوا اسے یہ کھیل کھیلتے ہوئے لیکن وہ آج تک روشن بیگم جتنا ماہر نہیں ہو سکا تھا۔ آخری آنچ کی کسر رہ جاتی تھی۔ لیکن آج لگتا تھا کہ وہ یہ کھیل مکمل کر لے گا۔ اسی لیے اس نے تاش کا چوتھا پیکٹ بھی کھول لیا تھا۔

"تاش گھر" بناتے ہوئے بستامی ایک گہری سوچ میں بھی گم تھا۔ اس سوچ کے سرے تین چار لوگوں سے ملتے تھے۔ تعبیر سے، کمال سے، زہرہ پھوپھو سے، گھر کی باقی لڑکیوں سے اور خالی ہوتی تجوریوں سے...... ذرا سی غفلت سارا بنا بنایا کھیل بگاڑ سکتی تھی۔ اور اسے یہ کھیل کسی قیمت پر نہیں خراب ہونے دینا تھا۔ وہ پتے کے اوپر پتا رکھتا جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ایسا کیا کرے کہ سارے سرے اس

کے ہاتھوں میں رہیں۔ اور جب وہ آخری پتے کو سب سے اوپر رکھ رہا تھا تو جیسے اس کے ذہن میں ایک جھماکا ہوا تھا۔ دو کام بیک وقت مکمل ہوئے تھے۔ ایک تاش گھر اور ایک اس کی الجھن۔

فخر سے وہ بڑی دیر تک مکمل ہو چکے تاش گھر کو دیکھتا رہا تھا۔

''سلطان...... سلطان......!'' بستامی نے اپنے خاص ملازم کو آواز دی تھی۔ سلطان اگلے ہی لمحے وہاں آیا تھا۔

''جی مالک......؟''

''گھر کا فون کٹوا دو...... نیا نمبر لینا ہے۔''

''جی بہتر...... لیکن اس میں کچھ دن لگ جائیں گے۔''

''تب تک اس نمبر کی لائن کاٹ دو...... باہر جاؤ اور فون کی تار کاٹ دو...... لیکن دھیان سے...... کسی کو خبر نہ ہو۔''

''ہرگز نہیں ہو گی۔''

''اور زہرہ پھوپھو کو میرے پاس بھیجو۔''

''جی...... میں کہہ دیتا ہوں۔'' سلطان کہہ کر باہر گیا تھا۔

بستامی لفظوں کی جوڑ توڑ کرنے لگا تھا کہ اسے زہرہ پھوپھو سے کیا کہنا ہے۔ آگے کے لیے اس کی کیا پلاننگ تھی اس کو لے کر اس کا ذہن صاف تھا۔ لیکن زہرہ پھوپھو اور حویلی والوں کا ردعمل اسے کچھ خوف زدہ کر رہا تھا کہ نجانے کیا ہو جائے۔ وہ سب کو قابو میں کرنا تو جانتا تھا۔ لیکن اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں تھی کہ بستامی کی بات سن لینے کے بعد وہ سب پر سکون رہیں گے۔ وہ بھڑک بھی سکتے تھے۔

چند لمحوں کے بعد زہرہ پھوپھو وہاں آئی تھیں۔

''کیا بات ہے بستامی...... کیوں بلوایا ہے؟'' کمرے میں داخل ہوتے ہوئے زہرہ پھوپھو نے

پوچھا تھا۔ ان کے سامنے کرسی پر بیٹھا بستامی اپنا سر تھامے ہوئے تھا۔ زہرہ پھوپھو کی آمد اور سوال پر بھی اس نے سر نہیں اٹھایا تھا۔ اگرچہ تعبیر کی شادی کے بعد سے زہرہ پھوپھو بستامی سے ناراض تھیں لیکن بستامی کی موجودہ حالت انہیں تشویش میں مبتلا کر گئی تھی اور وہ ساری ناراضی بھول گئی تھیں۔

"کیا بات ہے بستامی......؟ تم ٹھیک تو ہو؟ کیا تمہارے سر میں درد ہو رہا ہے؟"

"میں تو ٹھیک ہوں پھوپھو...... لیکن جو خبر میرے پاس ہے وہ ٹھیک نہیں ہے۔" سر اٹھاتے ہوئے بستامی نے کچھ ہمدردی والا انداز اپناتے ہوئے کہا تھا۔ زہرہ پھوپھو کچھ سمجھی تو نہیں تھیں لیکن سہم ضرور گئی تھیں۔

"کیا بات ہے بستامی...... سب خیر تو ہے نا؟"

"خیریت نہیں ہے پھوپھو...... آپ کو تحمل سے سننا ہوگا۔"

"جو بات ہے بتا دو بستامی......" انہوں نے ڈرے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔ ان کا دل ہولنے لگا تھا۔ کہیں تعبیر کو تو کچھ نہیں ہو گیا۔

بستامی اٹھ کر ان کے پاس آیا تھا۔

"تعبیر کے شوہر کا فون آیا تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ تعبیر سیڑھیوں سے گر گئی ہے۔"

"کیا......؟" زہرہ پھوپھو نے چیخ ماردی تھی۔

"جی...... اس کی حالت تشویش ناک ہے۔ اور وہاں کے راستے بھی بند ہیں۔ پھر بھی وہ کہہ رہا ہے کہ وہ وہاں ڈاکٹر کو بلانے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"تم ابھی چلو بستامی میرے ساتھ...... فوراً سے جانے کی تیاری کرو۔"

"ہم وہاں نہیں جا سکتے ہیں زہرہ پھوپھو......"

"کیوں...... کیوں نہیں جا سکتے ہیں۔"

''راستے جگہ جگہ سے بند ہیں۔ ہمارا وہاں پہنچنا ناممکن ہے۔ ہمیں گھر پر بیٹھ کر دعا کرنی چاہیے۔''

''لیکن میں اس وقت اپنی بیٹی سے ملنا چاہتی ہوں۔ بستامی کچھ کرو...... نہیں تو میں مر جاؤں گی۔ میں فوراً وہاں جانا چاہتی ہوں۔'' زہرہ پھوپھو تو بس بے ہوش ہو جانے کے قریب تھیں۔

''زہرہ پھوپھو...... سنبھالیں خود کو......'' بستامی نے آگے بڑھ کر بے ہوش ہوتی زہرہ پھوپھو کو اپنی بانہوں کا سہارا دیا تھا۔ ''چاند......! تہمینہ پھوپھو......! کہاں ہو سب......؟'' بستامی نے باہر کو منہ کر کے آوازیں دی تھیں۔ لمحوں میں سب وہاں اکٹھے ہو گئے تھے۔

وہ شام حویلی والوں کے لیے بہت اذیت ناک تھی۔ تعبیر کی طرف سے ملنے والی خبر نے سب کو بے حال کیا ہوا تھا۔ پھر ستم یہ کہ وہ تعبیر سے ملنے بھی نہیں جا سکتے تھے۔ بستامی کا کہنا ٹھیک تھا۔ وہاں جانے والے راستے بند تھے۔ وہاں جانا خود کو خوار کرنے کے مترادف تھا۔ لیکن زہرہ پھوپھو یہ بات سمجھ نہیں رہی تھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اڑ کر اپنی بیٹی کے پاس پہنچ جائیں۔ شام ہونے تک انہوں نے خود کو تیز بخار چڑھا لیا تھا۔ سخت سردی میں چاند ان کے ماتھے پر ٹھنڈی پٹیاں رکھ رہی تھی۔ باقی لڑکیاں ان کے ہاتھ پاؤں دبا رہی تھیں۔ تہمینہ اور شکیلہ پھوپھو انہیں تسلی دے رہی تھیں۔ اور حاجی بوا، زہرہ پھوپھو کے لیے کچھ کھانے کو بنا رہی تھیں۔

''حوصلہ رکھو زہرہ...... کچھ نہیں ہو گا ہماری تعبیر کو...... اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' تہمینہ پھوپھو نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔

''مجھے میری بچی کے پاس جانا ہے۔'' بخار میں تپتی زہرہ پھوپھو بس یہ ہی بات کہتی جا رہی تھیں۔

''نہیں جا سکتے زہرہ...... رحبانی نے پتا کروایا ہے۔ راستے بند ہیں۔ پیدل تک جانے کی گنجائش نہیں ہے۔ تم اپنی بچی کے لیے دعا کرو۔''

شکیلہ پھوپھو بھی پریشان تھیں۔ لیکن کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ تعبیر کے پاس نہیں جایا جا سکتا تھا۔ زہرہ کو

صرف دلاسا ہی دیا جا سکتا تھا۔ لیکن کسی دلاسے کا ان پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ دعا ان سے ہو نہیں رہی تھی۔ وہ تو بس بخار میں تپ رہی تھیں اور اس ٹھنڈے پانی میں جو ماتھے پر رکھی پٹی میں سے رستا ہوا ان کے چہرے پر پھیل رہا تھا، اپنے کتنے ہی آنسو ملا رہی تھیں۔

''میں زہرہ کے لیے دلیہ بنا کر لائی ہوں۔'' حاجی بوا ہاتھ میں کٹورا لیے وہاں آئی تھیں۔

''میرا کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہ رہا ہے۔'' زہرہ پھوپھو نے انکار میں سر ہلایا تھا۔

''بیمار رہنے سے کیا ہوگا۔ تمہیں تو ہمت کرنا ہوگی اب...... آج نہ سہی، لیکن ایک دو دن میں کسی نہ کسی طرح تو وہاں جانا ہی ہوگا۔''

''کچھ تھوڑا بہت کھا لے میری بچی......'' حاجی بوا پیار سے منت کرنے لگی تھیں۔

''لڑکیو! تم ایسا کرو کہ وضو کر کے دو نفل پڑھ کر اپنی کزن کی صحت یابی کے لیے دعا کرو۔ اللہ تعبیر کو شفا دے گا ان شاء اللہ۔'' تہمینہ پھوپھو نے سب کو کہا تھا۔

لڑکیاں فوراً سے اپنی اپنی جگہ سے اٹھیں اور وضو کرنے کے لیے کمرے سے باہر جانے لگی ہی تھیں تب ہی کمرے کے دروازے پر بستامی ظاہر ہوا تھا۔

''کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' بستامی نے اداس صورت لیے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

سب نے چونک کر بستامی کو دیکھا تھا۔ زہرہ پھوپھو نے بھی سر اٹھا کر بستامی کو دیکھا تھا۔ بستامی کے لہجے سے نجانے کیوں سب کو کچھ انہونی ہو جانے کی بو محسوس ہوئی تھی۔

''کشمیر سے فون آیا ہے۔ تعبیر اب اس دنیا میں نہیں رہی۔'' ہچکی بھر کر روتے ہوئے بستامی نے کہا تھا۔ اور حاجی بوا کے ہاتھ میں موجود دلیے سے بھرا پیالہ چھوٹ کر فرش پر جا گرا تھا۔

اس شام کی رات کے ساتھ ایک گرہن بھی حویلی پر اتر آیا تھا۔ جو کبھی تحلیل نہیں ہونے والا تھا۔



''تعبیر! دروازہ کھولو......'' کمال نے پہلے تو دروازے پر دستک دی تھی۔ لیکن جب دروازہ نہیں کھلا اور اندر سے کوئی جواب بھی نہیں آیا تھا تو وہ تعبیر کو پکارنے لگا تھا۔

''تعبیر...... تم دروازہ کیوں نہیں کھول رہی ہو۔''

''میں دروازہ نہیں کھولوں گی کمال......'' اندر سہمی کھڑی تعبیر نے اونچی آواز میں کہا تھا۔

''کیوں...... کیوں دروازہ نہیں کھولو گی تم......''

''آپ کا اور میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔''

تعبیر کی بات پر کمال کو غصہ تو بہت آیا تھا لیکن چونکہ تعبیر پہلی بار نخرہ دکھا رہی تھی تو اس لیے وہ برداشت کر گیا۔

''تم شاید بھول رہی ہو کہ میں تمہارا مالک ہوں۔ خریدا ہے میں نے تمہیں۔''

''مجھے میرے گھر جانا ہے۔ وہاں جا کر میں آپ کو آپ کی رقم ادا کر دوں گی۔''

''تمہاری حویلی بھی بک گئی تو میری رقم ادا نہیں ہو سکتی ہے۔''

''میری والدہ کچھ بھی کر کے آپ کو رقم واپس کر دیں گی۔''

''تم یہاں سے کہیں نہیں جا سکتی ہو تعبیر......''

''پھر میں اس کمرے کے اندر ہی مر جانا پسند کروں گی لیکن آپ کو اندر نہیں آنے دوں گی۔'' تعبیر نے کہا تھا۔ جس سے کمال کو مزید غصہ آیا تھا۔

''آخری بار پوچھ رہا ہوں۔ تم دروازہ کھولو گی یا نہیں۔''

''ہرگز نہیں......'' تعبیر کا انداز اٹل تھا۔ اور کمال جانتا تھا کہ اسے کیسے ٹھیک کرنا ہے۔

''گل خان...... گل خان......!'' اس نے غصے سے ملازم کو آواز دی تھی۔

''جی صاحب......!'' ایک ہٹا کٹا ملازم وہاں آیا تھا۔

"رحمت خان کو بھی بلا لو......اور یہ دروازہ کھولو......چاہے اسے توڑنا ہی کیوں نہ پڑے۔" کمال نے کہا تھا اور اس کی آواز بند کمرے کے اندر کھڑی تعبیر نے بھی سن لی تھی اور وہ کانپ کر رہ گئی تھی۔

"جی مالک......!" گل خان باہر گیا تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ واپس آیا تھا تو اس کے ساتھ رحمت خان تھا اور دروازے کو کھولنے کے لیے ایک اوزار...... چند لمحے تک وہ دروازے کی تالے والی جگہ پر کچھ کرتا رہا تھا۔ تالا شاید کھل گیا تھا لیکن اندر سے لگی ہوئی اوپری چٹخنی دروازے کو کھولنے میں حائل تھی۔

ہٹے کٹے گل خان نے ایک زوردار لات دروازے کو رسید کی تھی اور دروازہ جھٹکا کھا کر کھل گیا تھا۔

سامنے تعبیر کھڑی تھی۔ ہاتھ میں دھاتی گل دان تھامے ہوئے...... انداز ایسا تھا کہ میرے پاس کسی نے آنے کی ہمت کی تو میں اسے یہ گل دان دے ماروں گی۔

"میرے قریب مت آیئے گا کمال...... میں بتا رہی ہوں۔ میں کچھ بھی کرنے سے پہلے ایک لمحہ نہیں سوچوں گی۔"

دھاتی گل دان کو اپنے دفاع میں پکڑے تعبیر نے خوں خوار لہجے میں کہا تھا۔ لیکن چونکہ کبھی تعبیر کو ایسی صورت حال کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا تو اسی باعث اس کی دھمکی کھوکھلی تھی۔ اس کا دفاع کمزور تھا۔ کمال چاہتا تو آگے بڑھ کر فوراً سے تعبیر کو دبوچ سکتا تھا۔ اسی لیے تعبیر کی دھمکی پر وہ مسکرا کر رہ گیا تھا۔ یہ لڑکی جو اتنے دنوں کے بعد اپنا نیا روپ دکھا رہی تھی تو نجانے کیوں کمال کو یہ روپ اچھا لگا تھا۔ روشن بیگم نے ٹھیک کہا تھا کہ یہ معاملات آسان نہیں ہوتے اور ان معاملات کی مشکلات ہی تو مردوں کو مزا دیتی ہیں۔

"تمہارے پاس دو اختیار ہیں۔ آج کی رات کمرے میں تم اور میں...... یا پھر دونوں ملازم اور تم......" کمال نے کہا تھا اور تعبیر نے شدید ترین حیرت سے کمال کو دیکھا تھا۔ اتنی گھٹیا بات کیسے کہہ دی تھی کمال نے......

"جلدی سے جواب دو مجھے......" وہ پوچھ رہا تھا اور تعبیر بھونچکی کھڑی اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔

دھاتی گل دان پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ کمال کی بات نے تو جیسے اس کے جسم سے روح ہی چھین لی تھی۔ اس نے کیسے سمجھ لیا تھا کہ کمال اس کے ساتھ خاندانی پن کا مظاہرہ کرے گا۔ اس نے اسے خریدا تھا۔ منہ مانگی قیمت دی تھی اس نے اس کے مالکوں کو...... وہ اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ وہ اس کی بیوی نہیں تھی جو اسے عزت دیتا، غیرت کا مسئلہ بناتا...... تعبیر کے حصے میں صرف ہار لکھی تھی۔ اسے سمجھ جانا چاہیے تھا۔

"ٹھیک ہے، تم پیار کی زبان نہیں سمجھنے والیں...... گل خان اور رحمت خان...... اس لڑکی کی عقل ٹھکانے آجائے تو بتا دینا۔ میں ساتھ والے کمرے میں ہوں۔" کمال کہہ کر کمرے سے باہر جانے لگا تھا۔

"نہیں......!" تعبیر نے چیخ ماری تھی۔ کمال رکا تھا۔ اس نے چند لمحے تک تعبیر کو دیکھا تھا۔ بے بسی سے جس کے آنسو رواں تھے اور دھاتی گل دان خود بخود اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گرا تھا۔

"تم دونوں جاؤ...... لگتا ہے کہ لڑکی کو عقل آ گئی ہے۔" کمال نے ملازموں سے کہا تو وہ باہر چلے گئے۔

کمال نے دروازہ بند کر لیا تھا۔ تعبیر کے لیے وہ رات قیامت کی رات ثابت ہونے والی تھی۔

☆......☆......☆

"کیا...... کیا سچ میں......؟" بستامی سے ساری بات سن لینے کے بعد روشن بیگم نے ایک قہقہہ بلند کیا تھا اور پھر ہنسنے لگی تھیں۔ بستامی نے اثبات میں سر ہلایا تو ان کی ہنسی مزید بڑھ گئی۔

"یہ خیال آیا کیسے تمہارے دل میں......؟"

"آپ کے ساتھ رہتے رہتے، بہت کچھ سیکھ چکا ہوں۔"

"یہ تو ہے۔ کافی سمجھدار ہو چکے ہو تم......" روشن بیگم کی ہنسی کچھ تھمی تو انہوں نے پاس پڑے چھوٹے سے ٹیبل کو قریب سرکا لیا تھا۔ جس پر جام اور جام کا پانی دونوں ہی موجود تھے۔ وہ اپنے اور بستامی کے لیے جام بھرنے لگی تھیں۔ "ویسے مجھے تم سے اتنی سمجھ داری کی امید نہیں تھی۔" روشن بیگم نے

ایک گلاس بستامی کو دیا تھا۔ اور ایک خود ہاتھ میں پکڑے گھونٹ پر گھونٹ بھرنے لگی تھیں۔

''میں نے کمال سے کہہ دیا ہے کہ اب وہ جانے اور تعبیر جانے......اس نے کیسے تعبیر کو ہینڈل کرنا ہے یہ اس کا مسئلہ ہے۔ تاہم یہ تاکید میں نے کر دی ہے کہ وہ مر کر بھی تعبیر کو ادھر کا رخ نہ کرنے دے۔ اور وہ کرنے دے گا بھی نہیں۔ تو اب جب کبھی تعبیر نے اپنی ماں سے ملنا ہی نہیں تو بہتر کیا کہ تم نے اسے مار دیا۔ اس طرح اس کی ماں کو قرار آ جائے گا۔''

''اسی لیے تو میں نے یہ سب کیا ہے۔ دوسرا تعبیر سب جان چکی تھی۔ اگر وہ حویلی واپس آ کر سب کو سچائی بتا دیتی تو میرے لیے مسئلہ ہوتا۔''

''بہت روئی ہوں گی تمہاری زہرہ پھوپھو۔''

''ہاں......کافی بیمار ہو چکی ہیں وہ......چند دنوں میں ہی انہوں نے اپنا برا حال کر لیا ہے۔''

''کوئی بات نہیں......بیٹی کی موت پر کون سی ماں نہیں روتی۔ کسی کی موت پر صبر کرنا ویسے بھی آسان کام نہیں ہوتا۔ تم فکر مت کرو۔ چند دنوں میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کشمیر جانے کی بات تو نہیں کی انہوں نے......؟''

''کی تھی......لیکن میں نے کہا کہ راستے بند ہیں۔ جتنے دن میں ہم پہنچیں گے تب تک میت کو رکھنا ٹھیک نہیں۔''

''ہم......میں تو کہتی ہوں کہ اب باقی لڑکیوں کو بھی جلدی ان کے گھر بھیجنے والی کرو۔ اس کام میں دیر مت کرو۔''

''جی......بالکل دیر نہیں کرنی۔''

''میں چاہ رہی تھی کہ اگر تم انہیں کسی طرح میرے پاس لے آؤ تو میں ان کے حسن کو نکھار دوں۔''

''یہ ناممکن ہے۔ چاند کبھی بھی لڑکیوں کو آپ کے پاس نہیں آنے دے گی۔'' بستامی نے فوراً سے

انکار کر دیا۔

روشن بیگم کو اسی بات کی توقع تھی۔ وہ کچھ اور سوچ کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ادھ بھرے جام کو انہوں نے ایک طرف رکھ دیا تھا۔ اب وہ بسطامی سے بہت ہی اہم بات کرنے والی تھیں۔

''پھر ایک اور حل ہے میرے پاس......''

''کیا......؟''

''تم کومل سے شادی کر لو۔'' روشن بیگم نے کچھ ناپ تول سے کام لیتے ہوئے کہا تھا۔

''اس سے کیا ہوگا؟''

''کومل تمہاری بیوی بن کر تمہاری حویلی میں چلی جائے گی۔ وہ ان لڑکیوں کے ساتھ رہے گی۔ ان کی تراش خراش کرے گی۔'' روشن بیگم کی بات پر بسطامی خاموش ہو گیا تھا۔ اس نے کبھی شادی کرنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ شادی اس کے لیے ایک غیر اہم چیز بن چکی تھی۔ اور پھر اپنی بیوی کے روپ میں کومل کو دیکھنا اس کے لیے بالکل نئی بات تھی۔

لیکن روشن بیگم کی بات اسے بری بھی نہیں لگی تھی۔ وہ گناہ کی دلدل میں اس بری طرح سے گر گیا تھا کہ اب درست اور غلط میں فرق کرنا بھول گیا تھا۔ روشن بیگم نہ بھی کہتیں تو شادی کے متعلق وہ جب بھی سوچتا تو اس کے ذہن میں لڑکی کو لے کر کوئی سوچ نہیں تھی۔ وہ کیسی بیوی چاہتا تھا وہ نہیں جانتا تھا۔ یا شاید وہ جب بھی اپنی شریک حیات کا تصور کرتا تب تب کومل کے بارے میں ہی سوچتا۔

''اب شکیلہ پھوپھو کی بیٹی زارا کو ہی دیکھ لو...... کتنی موٹی ہے وہ...... اس پر تو بہت اچھے سے کام ہونے والا ہے۔ کرن بھی تراشی جائے گی تو زیادہ نکھر جائے گی۔ تم کومل کو اپنے گھر رکھو گے تو یہ سب وہ خود ہی دیکھ لے گی۔ لڑکیوں کی چال ڈھال سمیت ہر چیز پر محنت کرے گی۔ اور اس طرح کرے گی کہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہو سکے گی۔ جو بات صندل میں تھی وہ تو کسی میں نہیں ہو سکتی...... لیکن اگر حسن کو

نکھارا جائے تو اچھے دام مل سکتے ہیں۔"

"کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں۔"

"تمہارے ساتھ کوئی زبردستی نہیں...... تمہارے بھلے کے لیے ہی کہہ رہی ہوں۔ تم اچھے سے سوچ لو...... پھر مجھے جواب دینا۔"

"سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کومل سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔" بستامی نے رضامندی دے دی تھی۔ روشن بیگم دل سے مسکرائی تھیں۔

"جیتے رہو...... اللہ تم دونوں کو تا زندگی ساتھ رکھے اور ہزاروں خوشیاں دکھائے۔"

روشن بیگم نے جس قدر دل سے دعا دی تھی اس سے ہزار گنا زیادہ وہ خوش تھیں۔ کومل کی ساری زندگی انہوں نے محفوظ کر دی تھی۔ اب بس ایمن کی بات تھی۔ اس کی شادی بھی رحبانی سے ہو جائے تو ان کی فکریں کچھ کم ہوں۔ مناسب موقع دیکھ کر وہ رحبانی سے بھی بات کرنا چاہتی تھیں۔ مرنے سے پہلے وہ یہ کام کرنا چاہتی تھیں۔ زندگی دھوکے باز چیز ہے۔ اور اس سے بھی بڑی قباحت کہ یہ دھوکا دینے سے پہلے انتباہ نہیں کرتی ہے۔ وہ اب جلد سے جلد ان کاموں کو سمیٹ لینا چاہتی تھیں۔ ان کے جسم نے ان کو الارم دینا شروع کر دیا تھا کہ وہ دن بہ دن بڑھاپے کی طرف جا رہی ہیں۔ اور بڑھاپے کے بعد جوانی نہیں آتی ہے، بلکہ صرف موت آتی ہے۔

☆......☆......☆

صندل نے میرزاد سے کہا تھا کہ وہ اس بار شہر جائے تو اس کے لیے پازیبیں لائے۔ اس کو کسی چیز کی طلب نہیں تھی۔ لیکن پازیبیں اسے اچھی لگتی تھیں۔ چاندامی نے بتایا تھا کہ ان کے وقتوں میں ہر لڑکی شادی کے بعد پازیبیں ضرور پہنا کرتی تھی۔ اس طرح نئی نویلی دلہن کے چلتے پھرتے وقت گھر میں رونق کا احساس ہوتا تھا۔ شادی کو لے کر اس کا اور تو کوئی شوق پورا ہی نہیں ہو سکا تھا۔ بہت سے دن تو خوف اور

پریشانی میں گزر گئے تھے۔ پھر گھر کو ترتیب دیتے دیتے اور چیزیں سیکھتے ہوئے کتنا بہت سا وقت گزر گیا۔ پھر ریسٹورنٹ کو کھولنے، اس کام میں ماہر ہونے میں بہت وقت لگا۔ لیکن اب حالات کچھ بہتر تھے۔ کم ہی سہی، لیکن آمدن ہو رہی تھی۔ کام کی چال کو وہ دونوں سمجھ گئے تھے اور اس سرسبز حصے میں ایک پرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ اس لیے اس نے ایک عرصے کے بعد میرزاد سے کوئی فرمائش کی تھی۔

''میں تمہیں سونے کی پازیبیں لا دوں گا میری جان......'' اس نے پیار سے کہا تھا۔ صندل مسکرانے لگی تھی۔

''فی الحال چاندی کی لے آنا...... جب مزید پیسہ اکٹھا ہو جائے گا تو سونے کی بھی لے لیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔''

اور اب میرزاد ایبٹ آباد کے بازار میں چاندی کی پازیبیں ہی تلاش کر رہا تھا جو کہ اسے جلد ہی مل گئی تھیں۔ باقی کا سامان بھی جو جو اسے درکار تھا اس نے جلد ہی لے لیا تھا۔ صندل کی پازیبیں لینے کے بعد اس کا باقی کی خریداری میں دل ہی نہیں لگا تھا۔ جلدی جلدی اس نے باقی کی چیزیں لی تھیں اور بس میں بیٹھ گیا تھا۔ ایبٹ آباد سے ٹھنڈیانی کا سفر گھنٹے بھر سے کچھ زیادہ کا تھا۔ جلد ہی بس نے اسے اس کے مطلوبہ اسٹاپ پر اتار دیا تھا۔

''صندل...... صندل......!'' گھر کا دروازہ چابی سے کھولنے کے بعد وہ اندر آ گیا تھا اور صندل کو پکارنے لگا تھا۔ صندل کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔

''صندل...... کہاں ہو تم؟'' میرزاد بیڈ روم میں آیا تھا۔ اور بیڈ روم میں داخل ہوتے ہی وہ چونکا تھا۔ صندل تو وہاں نہیں تھی لیکن سارا کمرا پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔ سارے فرش اور بیڈ پر پھول بکھیرے گئے تھے۔ اور سائیڈ ٹیبل پر گل دانوں میں پھول سجائے گئے تھے۔ میرزاد حیرت سے سب دیکھ رہا تھا۔

''کیسا لگا سب؟'' وہ اس کے پیچھے آ کر کھڑی ہوئی تھی۔

''تمہاری طرح حسین......'' اس نے اپنی بانہوں میں بھر لینا چاہا تھا جب صندل نے اس کے ہاتھ روکے تھے۔

''تمہیں اب احتیاط کرنا ہوگی میر......'' اس نے شرماتے ہوئے کہا تھا۔

''کیوں......کیا ہوا ہے؟'' وہ کچھ نہیں سمجھا تھا۔ بتایا صندل سے بھی نہیں جا رہا تھا۔

''کیا بات ہے......بولو......''

صندل نے اپنا منہ میر کے کان کے قریب کیا تھا۔ اور پھر پیار بھری سرگوشی کی تھی۔

''تم باپ بننے والے ہو۔''

''کیا......'' میرزاد کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ وہ بے یقینی سے صندل کو دیکھ رہا تھا۔ صندل نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ اور پھر اگلے ہی پل میرزاد نے اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا تھا۔ اور وہ ہنستے ہوئے اسے بس روکنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔

☆......☆......☆

''پیاری چاند امی......!

امید کرتی ہوں کہ آپ خیریت سے ہوں گی۔

آپ کو لکھے جانے والے بہت سے خطوط میں سے یہ سب سے اہم خط ہے۔ کیونکہ اس خط میں میں آپ کو بہت ہی خاص بات بتانا چاہتی ہوں۔ کاش کہ آپ اس وقت میرے پاس ہوتیں اور میرے بتانے سے پہلے ہی سب خود سمجھ جاتیں۔ لیکن جو خدا کو منظور...... آپ خود ہی تو کہتی ہیں کہ اللہ کی ترتیب پر شکوہ نہیں کرنا چاہیے۔ وقت کی یہ ترتیب یقیناً خدا کی طرف سے طے ہے۔ ہمارے درمیان رابطے کا یہ جو ذریعہ ہیں ارشادی بابا...... یہ بھی کسی نعمت سے کم نہیں ہیں۔ خیر بات کچھ یوں ہے کہ آپ کی بیٹی صندل امید سے ہے۔ اور بہت جلد ہی ایک ننھی جان کو جنم دینے والی ہے۔''

"اللہ!" رقت جذبات سے مغلوب ہو کر چاند نے خط کو سینے سے لگا لیا تھا۔ خوشی کی خبر نے اسے نہال ہی تو کر دیا تھا۔ اس نے خط کو ایسے خود میں بھینچا ہوا تھا جیسے صندل کو اپنی بانہوں میں بھرا ہو۔ شکر گزاری کے آنسو اس کی آنکھوں سے جھلکنے لگے تھے۔ پھر آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے باقی کا خط پڑھنا شروع کیا تھا۔

"آپ نے میرے لیے بالکل بھی پریشان نہیں ہونا ہے۔ میر زاد میرا اس طرح ہی خیال رکھ رہا ہے جیسے آپ یہاں ہوتیں تو رکھتیں۔ خود میری صحت بھی اچھی ہے۔ علاقے کی دایہ نے کہا ہے کہ کسی طرح کی کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ پیدائش کا وقت بہت اچھا گزر جائے گا۔ ان دنوں میر مجھے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہتا ہے۔ آپ کی یاد آنے پر اداس ہوتی ہوں تو وہ مجھے ہنسانے لگتا ہے۔ دایہ نے کچھ دیسی خوراکیں کھانے کو کہا ہے۔ جو کہ مجھے بنانی نہیں آتیں۔ اگر آپ جوابی خط کے ساتھ ارشادی بابا کو وہ سب بھی دے دیں تو مہربانی ہوگی۔ اس طرح آپ سے ملاقات نہ سہی...... لیکن آپ کے ہاتھوں کی خوشبو مجھ تک پہنچ جائے گی۔ خدا نے چاہا تو جلد ہی ملاقات ہوگی۔

آپ کی پیاری بیٹی۔

صندل!"

"چاندا!" بستامی نے دور سے چاند کو پکارا تھا۔ چاند نے جلدی سے خط کو اپنے پیچھے چھپا لیا تھا۔

"ہاں...... کیا بات ہے بستامی؟"

"تم کیا چھپا رہی ہو؟"

"نہیں...... کچھ بھی تو نہیں...... تم بولو۔" چاند نے جلدی سے اپنے چہرے کے تاثرات کو نارمل کیا تھا۔

بستامی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا۔

''تم سے ایک خاص بات کرنی ہے۔''

''کرو...... میں سن رہی ہوں۔''

''میں اب شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیا سچ میں......؟'' چاند نے خوش گوار حیرت سے کہا تھا۔

''ہاں...... مجھے احساس ہو رہا ہے کہ اب مجھے شادی کر لینی چاہیے۔''

''یہ تو اچھی بات ہے بستامی...... تم کہو تو تمہارے لیے کوئی رشتہ دیکھوں؟''

''نہیں...... اس کی ضرورت نہیں ہے۔ لڑکی میں تلاش کر چکا ہوں۔''

''کومل......'' چاند نے کہا تھا اور کہتے ہوئے اس کا لہجہ نا چاہتے ہوئے بھی کچھ بجھا ہوا تھا۔ بستامی نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ اور بستامی کے اثبات میں سر ہلا دینے کے بعد چاند مزید بجھ گئی تھی۔

''میں جانتا ہوں کہ تمہیں کومل پسند نہیں ہے۔ لیکن عمر کا ایک لمبا عرصہ میں نے اسی کے ساتھ گزار دیا ہے۔ اب کسی اور کے ساتھ نہیں رہ پاؤں گا۔ کوئی اور لڑکی میری زندگی میں آ گئی تو میرے ساتھ ساتھ اسے بھی مشکل ہو گی۔''

''مجھے کومل پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے بستامی...... بس اس کے خاندان پر ہے۔ لیکن تم اپنی زندگی کے خود مالک ہو۔ میں تمہیں منع کرنے والی کون ہوتی ہوں۔ تم نے بھی تو مجھے رحبان سے شادی کے لیے کتنا راضی کیا تھا لیکن میں نے تمہاری بات نہیں مانی تھی۔ اب تم پر اپنی مرضی کیسے مسلط کر سکتی ہوں۔ تم کومل سے شادی کرنا چاہتے ہو تو کر لو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ اسے بہن بنا کر رکھوں گی۔ اسے مجھ سے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔''

''مجھے اندازہ تھا کہ تم ایسی ہی بات کرو گی۔''

''کب تک ہے تمہارا شادی کا ارادہ؟''

''اگلے ہفتے تک......''

''کم از کم دو ہفتے تو دو بستامی...... ایک ہی تو بھائی ہو تم میرے...... بہت ارمان ہیں میرے دل میں...... پھوپھو اور لڑکیوں نے بھی تیاری کرنی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ کومل کا لباس گھر پر تیار ہو۔ بہت اچھا لباس تیار کرواؤں گی میں اس کا...... اسے بہت پسند آئے گا۔ ایک ہفتہ تو اس کے لیے بہت کم ہے۔ پھر تمہارا کمرا ابھی تیار کروانا ہے۔ کم از کم دو ہفتے تو ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ دو ہفتوں کے بعد جو جمعہ آئے گا اس دن نکاح ہوگا۔''

''خدا تمہیں خوش رکھے میرے بھائی......'' اور چاندنے بستامی کا ہاتھ پکڑ کر پشت سے چوم لیا تھا۔

☆......☆......☆

سنہ ۲۰۰۱ء

سردیوں کی ہلکی دھوپ گھر کے باغ میں اتری ہوئی تھی۔ دھوپ میں شدت نہیں تھی۔ لیکن اتنی گرماہٹ تو ضرور تھی کہ اس سے لطف لیا جا سکتا۔ باریشہ دور سے چلتی ہوئی وسط کے اس ڈھکے ہوئے حصے تک آ رہی تھی جہاں سانول کا والد بیٹھا ہوا تھا۔

اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی داڑھی تھی۔ نجانے اس کی عمر کیا تھی، لیکن وہ اپنی عمر سے کافی کم کا لگتا تھا۔ اس نے سفید شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ جس کے اوپر براؤن رنگ کا ویسٹ کوٹ تھا اور وہ اس پر بہت اچھا لگ رہا تھا۔ بائیں کلائی میں قیمتی گھڑی تھی اور وہ اس وقت کوئی مہنگا پرفیوم لگائے ہوئے تھا۔ جس کی مہک باریشہ کو دور سے ہی محسوس ہو چکی تھی۔

''السلام علیکم!'' اس نے قریب پہنچنے پر کہا تھا۔ اور اس کو قریب سے دیکھنے پر باریشہ کو احساس ہوا تھا کہ اس کے چہرے پر اس کی نوجوانی والی شادمانی برقرار تھی۔ جو دھوپ کی چمک میں کچھ زیادہ ہی

نمایاں تھی۔ لیکن چہرے کے اس پر سکون تاثر میں یہ بات بھی پوشیدہ تھی کہ اندر کہیں اس سکون میں ایک طوفان قید ہے۔ یا تو طوفان آنے والا ہے یا آ کر گزر چکا ہے۔

''وعلیکم السلام......! کیسی ہو باریشہ......؟'' باریشہ کے اس تک پہنچنے تک وہ کھڑا ہو چکا تھا۔

''جی ٹھیک ہوں میں......''

''میں رحبانی...... جانتی ہو مجھے؟''

''آپ کے بارے میں آپ کے بیٹے سانول سے پتا چلا تھا۔ یہاں آ کر......''

''کیا چاند نے تمہیں میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔''

''نہیں...... انہوں نے کبھی آپ کا ذکر نہیں کیا تھا۔'' باریشہ نے سچائی بتا دی تھی۔ رحبانی کے چہرے پر ایک اداسی جھلکی تھی۔ جس میں دکھ ہی دکھ تھا۔

''تمہاری نانو کو شاید سب سے زیادہ مجھ ہی سے نفرت ہے۔''

''اس کے بارے میں کچھ کہنے سے قاصر ہوں رحبانی بابا......''

''تم نے مجھے رحبانی بابا کہا، مجھے اچھا لگا۔'' وہ مسکرایا تھا۔ ''تمہاری ماں بھی مجھے اس لقب سے پکارا کرتی تھی۔ بیٹھو ادھر میرے پاس...... مل کر ماضی کی باتیں کرتے ہیں۔'' رحبانی کے کہنے پر باریشہ اس کے پاس بیٹھ گئی تھی۔

''آپ امی کو کتنا جانتے ہیں؟''

''ایک دوست کی طرح جانتا تھا میں اسے...... گھر میں چاند کے بعد وہ سب سے زیادہ باتیں مجھ سے ہی کیا کرتی تھی۔''

''کیا باتیں کرتی تھیں وہ آپ سے......؟''

''میر زاد کی باتیں کیا کرتی تھی۔ جب ابھی اس کی میر زاد سے شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہر وقت

اسی کا ذکر کرتی رہتی تھی۔ ستار بجانے کا شوق بھی اسے مجھے سنکھ کو بجاتا دیکھنے کے بعد آیا تھا۔"

"وہ کیسا ستار بجایا کرتی تھیں؟"

"بہت اچھا...... اتنا اچھا کہ اس کے ستار کی گونج ٹھنڈیانی سے ہوتی ہوئی حویلیاں تک آ گئی تھی۔"

"میں سمجھی نہیں......"

"سب کچھ اتنی جلدی سمجھ میں نہیں آئے گا تمہیں...... بس اتنا سمجھ لو کہ اسے آرٹ میں بہت دلچسپی تھی۔ وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتی رہتی تھی۔ عام لڑکیوں کی طرح کی نہیں تھی وہ...... فارغ رہنا اسے پسند نہیں تھا۔"

"کاش میں نے اپنی ہوش میں انہیں یہ سب کرتے ہوئے دیکھا ہوتا۔"

"کس کو پتا تھا کہ اس کی قسمت میں موت اتنی جلدی لکھی ہوگی۔" رحبانی نے افسوس سے کہا تھا۔ اور اس سے پہلے کہ باریشہ بھی اداس ہو جاتی، اس نے بات کو بدل دیا تھا۔ "لیکن تم اپنی ماں کے ادھورے کاموں کو پورا کر سکتی ہو باریشہ......"

"وہ کیسے رحبانی بابا......؟"

"جو کام تمہاری ماں کرنا چاہتی تھی وہ تم کرو۔"

"میں اب سنگیت میں نہیں جانا چاہتی ہوں رحبانی بابا......؟"

"مت جاؤ...... لیکن فارغ بھی مت رہو۔ کچھ اور کرو...... اپنی ایک الگ پہچان بناؤ۔ انفرادی حیثیت...... جس میں چاند کا نام نہ ہو۔ نہ میرا اور نہ ہی بستامی کا...... وہ پہچان تمہاری خود کی ہوگی جسے تم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔"

"ایسا کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔"

"تمہاری ماں نے بھی کسی گھر والے کی مدد کے بنا ٹھنڈیانی میں ایک ریسٹورنٹ کھولا تھا۔ اور

اسے کامیابی سے چلا رہی تھی۔ تمہیں تو اپنی ماں سے ہی بہت کچھ سیکھنا چاہیے۔ تم کومل بھابھی یا ایمن سے بات کر سکتی ہو۔ وہ تمہیں بہتر گائیڈ کر سکتی ہیں۔ لیکن تم چاند کے نقش قدم پر مت چلنا باریشہ......"

"ہرگز نہیں رحبانی بابا...... اسی لیے تو اس حویلی سے نکلی ہوں میں......"

"ساری زندگی چاند نے اڈے پر زردوزی کا کام کیا اور اب ہاون دستے میں دوائیاں کوٹ رہی ہے۔ کیا ملا زندگی سے...... ایک انا کی خاطر زندگی برباد کر لی اپنی بھی اور میری بھی......" رحبانی نے روانی میں کہہ دیا تھا۔

باریشہ نے کچھ اچنبھے سے اسے دیکھا تھا۔

رحبانی نے جلدی سے بات بدلی تھی۔ "تم ایسا مت کرنا باریشہ...... اپنے اندر کے ہنر کو پہچاننا...... خدا نے تمہارے اندر ہر انسان کی طرح بہت سے ہنر چھپا کر رکھے ہوں گے۔ انہیں پہچانو...... انہیں بروئے کار لاؤ۔ دیکھنا تم کتنی ترقی کرو گی۔"

"کومل آنٹی سنگیت کے لیے بضد ہیں۔ لیکن اب وہ کام مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔"

"تو مت کرو...... کچھ اور کر لو۔"

"کیا میں کوئی این جی او کھول سکتی ہوں؟" چند لمحے سوچنے کے بعد باریشہ نے کہا تھا اور باریشہ کی بات پر رحبانی نے کوفت سے سانس بھرا تھا۔ کیا تھکی ہوئی تربیت کی تھی چاند نے اس لڑکی کی......

"یہ کام تم تب بھی کر سکتی ہو جب تمہارے جسم میں کچھ اور کرنے کی قوت نہ رہے۔ فی الحال اپنے جسم کی قوت سے فائدے والا کام لو۔ اپنی ینگ ایج کو استعمال کرو۔" رحبانی کی بات باریشہ کو اچھی لگی تھی۔ وہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔

"کومل بھابھی کے پاس جاؤ...... وہ تمہیں کچھ اچھا بتائیں گی۔ پھر مجھ سے مشورہ کر لینا۔"

"ٹھیک ہے......"

''اب تم جاسکتی ہو۔'' رحبانی نے کہا تھا۔ باریشہ اٹھی تھی۔ وہاں سے جانے لگی تھی۔ پھر کچھ خیال آنے پر وہ پلٹی تھی۔

''آپ بہت اچھے ہیں رحبانی بابا...... آپ سے باتیں کر کے بہت اچھا لگا۔'' اس نے کہا تھا۔ رحبانی نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔



سارا دن کمرے میں بند رہنے کے بعد وہ شام کو کمرے سے باہر نکلی تھی۔ لاؤنج میں کومل بیگم اپنا سر پکڑے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کو دیکھ کر باریشہ کو فکر کوئی تھی۔

''کیا ہوا ہے کومل آنٹی؟''

''نہیں...... کچھ نہیں میری جان......'' اس نے ٹالنے کی غرض سے کہا تھا۔

''آپ پریشان لگ رہی ہیں۔'' اور باریشہ کہاں جانتی تھی کہ پریشانی کا یہ انداز سراسر بناوٹی ہے۔ اس کے قدموں کی آہٹ سنتے ہی تو کومل نے اپنا سر پکڑ لیا تھا۔

''اب تم سے کیا جھوٹ بولنا...... پریشان تو ہوں میں......''

''مجھے بتائیں کہ کیا ہوا ہے؟''

''تمہیں وہ سیلون یاد ہوگا جہاں میں تمہیں لے کر گئی تھی۔ جہاں تمہارا میک اوور ہوا تھا۔ شاید تمہیں وہاں کی اونر یاد ہو، نبیلہ نام ہے اس کا......''

''جی...... یاد ہے مجھے...... جن سے آپ باتیں کر رہی تھیں۔''

''ہاں...... میری تو بہت اچھی دوست ہے وہ...... اس نے شیزہ کا بھی میک اوور کیا تھا۔ کہیں باتوں باتوں میں اس نے شیزہ سے کہا تھا کہ وہ ان کے سیلون کے پبلسٹی ایڈ کے لیے ماڈلنگ کرے گی۔ شیزہ نے ہاں کر دی تھی۔ لیکن شیزہ ہاں کر کے شاید خود ہی ڈیٹ بھول گئی۔ اب کل شوٹ کی ساری تیاری

کر کے بیٹھی ہے اور شیزہ یہاں موجود نہیں......"

"تو آپ شیزہ کو بلوا لیں۔"

"فون کیا تھا۔ مجھے لگا کہ لڑکیاں مری میں ہیں۔ لیکن وہ ڈرائیور کو ساتھ ملا کر مری سے بھی آگے راولاکوٹ چلی گئی ہیں۔ وہاں کل بہت برف باری ہو چکی ہے۔ واپسی کے راستے بند ہو چکے ہیں۔ جن کے کھلنے میں نجانے کتنا وقت لگے۔ ادھر شوٹ کے بعد نبیلہ نے نئی برانچ کی اوپننگ کرنی ہے۔ جس کے سارے کارڈ بھی تقسیم ہو چکے ہیں۔"

"تو نبیلہ میم کسی اور لڑکی کو دیکھ لیں۔"

"ظاہر ہے کہ وہ تو دیکھ ہی لے گی لیکن ہمارے گھرانے کے بارے میں کیا سوچے گی نبیلہ...... کہ کیسی لڑکیاں رہ رہی ہیں ہمارے گھر...... جو اتنی غیر ذمہ دار ہیں۔"

"جی...... یہ تو ہے۔"

"ایک تو ساری لڑکیاں ہی چلی گئیں...... ورنہ میں کسی اور کی منت کر لیتی۔"

باریشہ خاموش رہی تھی۔ وہ بھلا اب اس موضوع پر مزید کیا بات کرتی۔

"ایک بات کہوں باریشہ......"

"جی کہیں......"

"کیا تم میرے کام نہیں آسکتی ہو؟"

"مطلب......؟ میں سمجھی نہیں آپ کی بات......"

"شیزہ کی جگہ تم چلی جاؤ...... تصویریں ہی تو بنوانی ہیں۔ وہ تم بنوا لو۔"

"میں...... میں کیسے جا سکتی ہوں۔"

"کیوں تم کیوں نہیں جا سکتی ہو۔ شیزہ سے کم پیاری نہیں ہو تم۔"

''بات یہ نہیں ہے۔ میں ماڈلنگ نہیں کرنا چاہتی ہوں۔''

''یہ ماڈلنگ تھوڑی نا ہے۔ سیلون کے اندر لگیں گی تصاویر...... تم ایسا سمجھنا جیسے تم کسی شادی کے لیے تصاویر بنوا رہی ہو۔''

باریشہ انہیں کیا بتاتی کہ وہ آج تک کسی شادی میں نہیں گئی ہے۔

''تم تو بھئی ابھی تک حویلیاں میں ہی موجود ہو۔ بس میں نے کہہ دیا ہے۔ کل تم میرے ساتھ نبیلہ کے سیلون جا رہی ہو۔ اس معاملے میں میں تمہاری ایک نہیں سنوں گی۔'' کومل بیگم نے پیار بھری دھونس جماتے ہوئے کہا تھا۔ اور باریشہ میں اتنی عقل ہوتی کہ وہ ان کی پیار بھری دھونس کے پیچھے چھپے ارادوں کو سمجھ پاتی تو چاند نانو کو چھوڑ کر حویلیاں سے بھاگتی ہی کیوں؟

☆......☆......☆

''میم! میری طرف دیکھیے......'' فوٹو گرافر نے اس سے کہا تھا۔ وہ جو بت بن کر کھڑی تھی تو اس نے اپنے چہرے کا رخ اس کی طرف موڑ لیا تھا۔ لیکن فوٹو گرافر کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ کیمرا ایک طرف رکھ کر وہ اس کے پاس آیا تھا اور اس نے اس کے چہرے کی ڈائریکشن کو اپنے ہاتھوں سے درست کیا تھا۔ وہ جو پہلے سے گھبراہٹ کا شکار تھی، مزید گھبرا گئی تھی۔

''اسمائل پلیز......'' وہ کیا بتاتی کہ اس سے مسکرایا نہیں جا رہا ہے۔ برائیڈل سوٹ کے نام پر جو لباس اسے پہنایا گیا تھا اس میں اس کی آدھی کمر ننگی تھی اور پیٹ بھی قدرے نظر آ رہا تھا۔ وہ ہر بار اپنے دوپٹے سے دونوں چیزوں کو ڈھانپنے کی کوشش کرتی تھی اور فوٹو گرافر کی ہیلپر لڑکی اتنی ہی بے نیازی سے اسے پرے کر دیتی تھی۔ ہیلپر لڑکی کو اس بات کی پروا نہیں تھی کہ باریشہ ایسا لباس پہن کر شرما رہی ہے۔

اس دن اس نے تین مختلف لباس پہنے تھے اور تین مختلف انداز میں اس کا میک اپ کیا گیا تھا۔ دوپہر میں ایک گھنٹے کی لنچ بریک تھی۔ اس کے علاوہ شام تک وہ مختلف بیک گراؤنڈ والے وال پیپرز کے

سامنے کھڑی رہی تھی۔ یہ دن کافی تھکا دینے والا تھا۔ گھر واپس آئی تو اسے آج کے بارے میں سوچنے کا وقت ہی نہیں ملا تھا۔ وہ جلدی ہی سو گئی تھی۔

اگلے دن نتاشا اس کے ساتھ گئی تھی۔ اس نے اسے کمفرٹیبل کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہر نئے میک اپ پر وہ اس کی تعریفیں کرتی رہی تھی۔ اور ہر لباس پر کہتی رہی تھی کہ وہ اس پر بہت سوٹ کر رہا ہے۔ اگلے دن کے لباس کچھ زیادہ جدت لیے ہوئے تھے۔ وہ کہہ نہ سکی کہ اس نے آج تک کسی دلہن کو بنا آستین کے قمیص اور کمر سے اتنے بڑے گلوں کے ساتھ نہیں دیکھا تھا۔ نتاشا سے اس نے چپکے سے یہ سب کہا تھا۔ اور نتاشا نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

''ان سب لوگوں کے کام کرنے کی اپنی لوجک ہوتی ہے۔ تم پلیز یہاں کچھ مت کہنا۔ کہیں کوئی تم سے ناراض نہ ہو جائے۔''

اگلے دو دن تک وہ چپ رہی تھی اور وہ سب کچھ کرتی رہی تھی جو جو اسے کرنے کو کہا جاتا رہا تھا۔ ان چار دنوں میں وہ بے حد تھک گئی تھی۔ دل ہی دل میں اس نے شیزہ کو خوب کوسا تھا جو نبیلہ میم سے وعدہ کر کے خود گھومنے چلی گئی تھی۔ چار دن بعد کام ختم ہوا تو اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔ تب تک لڑکیاں راولاکوٹ سے واپس آ چکی تھیں۔ لیکن اب کیا فائدہ...... شیزہ کے حصے کا کام تو باریشہ کر ہی چکی تھی۔ اسے اس بات پر حیرت ہوئی تھی کہ کومل آنٹی نے اسے بالکل بھی نہیں ڈانٹا تھا۔ بلکہ اس موضوع پر تو بات ہی نہیں کی تھی۔ اس نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دے لی تھی کہ شاید کومل آنٹی اس موضوع پر اکیلے میں شیزہ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔

''تم چلو گی کل کومل میم کے ساتھ؟'' رات میں نتاشا نے اس سے آ کر پوچھا تھا۔

''کہاں......؟''

''نبیلہ میم کی نئی برانچ کی اوپننگ پر......''

''میرا کیا کام وہاں......''

''چلی جاؤ......تم ان کی ماڈل رہ چکی ہو، وہاں جا کر تمہیں اچھا لگے گا۔''

''تم چلو گی؟''

''تم کہو گی تو چلی جاؤں گی۔ ویسے کومل میم تو جا رہی ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ تمہیں بھی تیار کرواؤں۔''

''کومل آنٹی نے کہا ہے تو چلی جاؤں گی۔''

اور اگلے دن وہ کومل بیگم کی پسند کے کپڑے پہن کر ان کے اور نتاشا کے ساتھ سیلون کی اوپننگ پر گئی تھی۔ جہاں اس نے ان لوگوں کو بھی دیکھا تھا جنہیں وہ بس ٹی وی پر دیکھتی تھی۔ لیکن اس سے بھی حیرت کی بات کچھ اور تھی۔ اس نے خود کو دیکھ لیا تھا۔ اور خود کو دیکھ کر وہ ٹی وی پر نظر آتی ماڈل کو دیکھنے سے بھی زیادہ حیران ہوئی تھی۔

سیلون کے در و دیوار پر جگہ جگہ باریشہ کی تصاویر لگائی گئی تھیں۔ اور ان سب میں وہ اس قدر پیاری لگ رہی تھی کہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ساری رات یہاں کھڑی رہ کر خود کو دیکھتی رہے۔ وہاں بہت سے لوگوں نے اس کے کام کی تعریف کی تھی۔ اور پہلی بار باریشہ نے دل ہی دل میں شیزہ کا شکریہ ادا کیا تھا کہ وہ راولاکوٹ چلی گئی اور اس کے حصے کا یہ حسین ترین کام اسے کرنا پڑا۔



ناول **تاش گھر** ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **15** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 21

سیلون کی نئی برانچ کی اوپننگ پر نبیلہ بہت مصروف تھی۔ نئی برانچ میں رش بھی کافی زیادہ تھا۔ کافی ماڈلز مدعو تھیں وہاں...... میڈیا کے ساتھ ساتھ وہ لوگ جو میک اپ انڈسٹری کے ساتھ کسی نہ کسی حوالے سے منسلک تھے سب کے سب وہاں موجود تھے۔ اتنا بڑا فنکشن تو باریشہ نے حویلیاں میں کسی شادی کا بھی نہیں دیکھا تھا جتنا وہ یہاں ایک پارلر کی اوپننگ پر دیکھ رہی تھی۔

جس وقت وہ نبیلہ کے پاس پہنچی وہ اخباری نمائندوں کے ساتھ بات چیت کر رہی تھی اور کافی مصروف نظر آ رہی تھی۔ ان سے بات کرنا خاصا مشکل نظر آ رہا تھا۔ باریشہ ان سے مل کر ان کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ نبیلہ میم نے جو کام کیا تھا اس کے لیے تو تہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرنا بنتا تھا۔ وہ ان کی اسسٹنٹ کے پاس گئی تھی جو میک اپ کے درست ریک کو خوامخواہ درست کر رہی تھی۔ اس طرح شاید وہ خود کو مصروف اور ذمہ دار ظاہر کرنا چاہتی تھی۔

''مجھے نبیلہ میم سے ملنا ہے۔ وہ کب تک فری ہو جائیں گی؟''

''تھوڑی دیر میں ریفریشمنٹ رکھ دی جائے گی۔ اس کے بعد رش خاصا کم ہو جائے گا۔'' اسسٹنٹ نے اس کی طرف دیکھے بنا کہا تھا۔

''کیا پھر میں ان سے مل سکتی ہوں؟''

''بالکل...... ویسے کیا بات کرنا ہے تمہیں ان سے......؟''

"مجھے ان کا شکریہ ادا کرنا ہے۔"

"کس بات کا......؟" اسسٹنٹ نے رخ اس کی طرف کیا تھا۔ وہ باریشہ کی بات کو سمجھی نہیں تھی۔

"وہ انہوں نے شیزہ کی جگہ مجھے اپنے شوٹ کے لیے منتخب کیا، اس لیے......" باریشہ نے کہا۔

اسسٹنٹ نے ہاتھ میں پکڑی میک اپ کٹ کو بند کر کے واپس شیلف پر رکھا اور پوری توجہ سے باریشہ سے مخاطب ہوئی۔

"کس کی بات کر رہی ہو تم؟"

"شیزہ کی......"

"وہ کون ہے......کیا کوئی نئی ماڈل ہے؟ میں نہیں جانتی اسے......"

"نہیں...... وہ ماڈل نہیں ہے۔ کومل آنٹی کے گھر میں رہتی ہے۔ نبیلہ میم نے شوٹ کے لیے اسے ہی تو بک کیا تھا۔"

"پتا نہیں تم کس کی بات کر رہی ہو لیکن اس شوٹ کے لیے مشہور ماڈل صدف کو بک کیا گیا تھا۔ بلکہ وہ تمہارے شوٹ کرنے کے بعد نبیلہ میم سے خاصی ناراض بھی ہو چکی ہے۔" اسسٹنٹ نے اسے بتایا تھا اور باریشہ نے حیرت سے اس کی ساری بات سنی تھی۔

"لیکن......"

"کومل میم کی طرف سے ریکوئسٹ آئی تھی کہ اس شوٹ کے لیے تمہیں چانس دیا جائے......" اسسٹنٹ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ باریشہ مزید کیا پوچھنے والی تھی۔ "نبیلہ میم تو تمہارے لیے مان ہی نہیں رہی تھیں۔ تم نے تو پہلے کبھی پرنٹ میڈیا کے لیے کوئی کام ہی نہیں کیا۔ یہ تو تمہاری آنٹی تھیں جنہوں نے نبیلہ میم سے تمہارے لیے اصرار کیا اور اس طرح نبیلہ میم تمہیں شوٹ پر لینے کے لیے راضی ہوئیں۔"

''لیکن کومل آنٹی نے تو مجھے بتایا تھا کہ اس شوٹ کے لیے شیزہ کو بک کیا گیا تھا۔''

''وہ تم انہی سے پوچھ لینا کہ انہوں نے تمہارے ساتھ یہ جھوٹ کیوں بولا۔'' اسسٹنٹ نے کچھ منہ بناتے ہوئے کہا اور وہاں سے چلی گئی۔

باریشہ ناسمجھی سے اسے جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

☆......☆......☆

اسلام آباد کی صاف ستھری سڑک پر بارش کی بوندیں اتنی نرمی سے گر رہی تھیں جیسے زور سے گرنے پر دھرتی کے خراب ہو جانے کا ڈر ہو۔ یہ بوندا باندی ایسی تھی کہ زمین کو پوری طرح سے بھگو بھی نہیں رہی تھی اور خشک بھی نہیں رہنے دے رہی تھی۔ کار میں بیٹھی باریشہ کو اس بوندا باندی کا شاید پتا بھی نہ چلتا لیکن اس نے گاڑیوں کی فلیش لائٹ میں ننھے ننھے قطروں کو چمکتے ہوئے دیکھ لیا تھا جس کی وجہ سے اسے احساس ہوا تھا کہ باہر بارش ہو رہی ہے۔

واپسی کا سفر خاموشی سے کٹ رہا تھا۔ کومل بیگم، نتاشا اور باریشہ تینوں ہی خاموش تھیں۔ نتاشا تو اس لیے کہ وہ فیشن میگزین کو دیکھ رہی تھی۔ کومل بیگم، باریشہ کے کچھ بولنے کی منتظر تھیں۔ اور باریشہ اس لیے خاموش تھی کیونکہ وہ بے چین تھی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اس کے ساتھ جھوٹ کیوں بولا گیا تھا۔ کومل آنٹی نے تو کہا تھا کہ نبیلہ میم نے اس شوٹ کے لیے شیزہ کو بک کیا تھا اور شیزہ کے راولاکوٹ چلے جانے سے وہ بہت پریشان بھی ہو گئی تھیں۔ ان کی پریشانی کی وجہ سے ہی تو باریشہ نے یہ کام کیا تھا۔ اگرچہ شوٹ دیکھ کر اسے اچھا لگا تھا۔ لیکن نبیلہ کی اسسٹنٹ کی باتوں نے اسے بے چین کر دیا تھا۔

''تمہیں اپنا شوٹ کیسا لگا باریشہ......؟'' باریشہ کے کچھ کہنے کا انتظار جب کافی طویل ہو گیا تو کومل بیگم نے خود ہی اس سے پوچھ لیا تھا۔ وہ جو کھڑکی کے باہر رواں دواں سڑک کو دیکھتے ہوئے سوچوں میں گم تھی۔ کومل بیگم کی بات پر چونکی تھی۔

"جی...... کیا کہا آپ نے......؟"

"کہاں کھوئی ہوئی ہو تم......؟" کومل بیگم کو باریشہ کا غائب دماغی سے بیٹھنا برا لگا تھا۔ یہ بات اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

"نہیں...... کہیں نہیں......"

"شوٹ پسند آیا تمہیں اپنا......؟"

"جی...... بہت اچھا لگا۔"

"مجھے یقین تھا کہ ایسا ہی رزلٹ آئے گا۔ میں تمہاری خوب صورتی کو پہچان گئی تھی۔" کومل بیگم ہنسی تھی۔ باریشہ مدھم سا مسکرائی تھی۔ "یہ تصاویر اپنی نانو کو سینڈ کر دو...... دیکھنا وہ تو پریشان ہی ہو جائیں گی۔" کومل بیگم ہنستی چلی گئی تھی۔

"ایسا تو میں ہرگز نہیں کر سکتی۔"

"لیکن انہیں معلوم ہو ہی جائے گا۔"

"شاید ہو جائے......"

"لیکن اب وہ کچھ نہیں کر سکتی ہیں۔ اب تمہارے گارجین ہم ہیں۔ ویسے بھی تم بالغ ہو چکی ہو۔ اور اپنی مرضی سے جہاں چاہے رہ سکتی ہو۔"

وہ خاموش رہی تھی۔ کومل بیگم کی بات پر اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ کیونکہ تبصرہ بات چیت کو بڑھا سکتا تھا اور اس کا مزید بولنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ باقی کا سفر خاموشی سے گزرا تھا۔ جس پر کومل بیگم کو کچھ تشویش ہوئی تھی۔ شوٹ کے منظر عام پر آنے کے بعد وہ باریشہ کی ایکسائٹمنٹ کی توقع کر رہی تھی لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ کیوں نہیں ہوا تھا۔ یہ بات اسے پریشان کر رہی تھی لیکن وہ جلد ہی اس کا پتا کروا لینے والی تھی۔

''میں بہت تھک چکی ہوں باریشہ...... سونا چاہتی ہوں۔ تم بھی جلد سو جانا۔ نیند پوری کرنا اسکن کے لیے بہتر ہوتا ہے۔''

اسے ہدایت دے کر وہ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔ تھکن تو باریشہ کو بھی محسوس ہو رہی تھی۔ آج رات کی طویل تقریب، اس سے پہلے کی تیاری اور اس کا وزنی لباس...... اس سب نے اسے تھکا دیا تھا۔ لیکن نیند پھر بھی اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس لیے وہ گھر کے اندر آ کر لابی کے اس حصے میں بیٹھ گئی تھی جہاں شیشے کی دیواروں کے پیچھے گھر کا صحن کی طرز پر بنا ہوا حصہ تھا۔ یہ صحن گھر کے بیچوں بیچ میں تھا۔ گھر کی باقی کی عمارت اس صحن کے اردگرد موجود تھی۔ اور گھر کے بیشتر کمروں کی کھڑکیاں یہاں ہی کھلتی تھیں۔ جس سے تازہ ہوا کا احساس ہوتا تھا۔ اس صحن کو دیکھتے ہوئے باریشہ کو اکثر حویلیاں میں موجود اپنی حویلی کا صحن یاد آ جایا کرتا تھا۔ لیکن وہ یاد خوش گوار ہرگز نہیں ہوا کرتی تھی۔ سورج مکھی کی طرز پر بنے اس صحن میں ایسا تھا ہی کیا کہ اسے یاد کرتے ہوئے مسکرایا جاتا یا اداس ہی ہوا جاتا۔ اینٹ اینٹ تو اس کی الگ ہو جانے کو تیار تھی۔ اور یہ تو حاجی بوا تھیں جنہوں نے باریشہ کو بتایا تھا کہ ان اینٹوں سے سورج مکھی کا پھول بنا ہوا ہے۔ وہ نہ بتاتیں تو باریشہ کے تو فرشتوں کو بھی اس بات کا علم نہیں ہو سکتا تھا۔ چاندنا نو ہی تھیں جو ایسی اجڑی حویلی سے چمٹ کر بیٹھی ہوئی تھیں۔

اچھا ہوا باریشہ بروقت وہاں سے الگ ہو گئی ورنہ وہ اس وقت اس صحن کو دیکھنے کے بجائے اس ٹوٹے پھوٹے صحن کو دیکھ رہی ہوتی اور اپنی قسمت پر رو رہی ہوتی...... اس صحن کی تو بات ہی اور تھی۔ جدت تھی، جاذبیت تھی اور کتنی طرح کے پودے وہاں موجود تھے۔ گھر کے مالی نے خلوص سے کام کرتے ہوئے صحن کو بے حد خوب صورت پودوں سے بھرا ہوا تھا۔

باریشہ شیشے کی دیوار کے پار اپنے قریب پڑے پودے کو دیکھنے لگی۔ جو شاید لاجونتی کا پودا تھا۔ جس کی بابت مشہور ہے کہ یہ ایک حیا والا پودا ہے۔ اگر اسے مرد چھو لے تو فوراً سے سکڑ جاتا ہے اور اگر

عورت چھو لے تو اسے کچھ نہیں ہوتا۔ اور لاجونتی کے پودے کو دیکھتے ہوئے اور اس کی بابت مشہور بات کو سوچتے ہوئے باریشہ کو احساس ہوا تھا وہ بھی لاجونتی کا ایک پودا ہے۔ ایک ایسا پودا جس کو خوشی کا چھونا راس نہیں...... جیسے ہی وہ خوشی کو محسوس کرنے لگتی ہے اس کا دل بجھ جاتا ہے۔

''تم نے بتایا نہیں کہ تم ماڈلنگ میں جانا چاہتی ہو۔'' اپنی پشت پر اسے سانول کی آواز سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے سامنے قد نکالتا سانول کھڑا تھا۔ سانول کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں عجیب سی چمک......

''نہیں...... یہ سب کومل آنٹی کی وجہ سے ہوا ہے۔'' باریشہ نے صاف گوئی سے بتایا۔

''ایک بات کہوں باریشہ......'' پیار سے کہتے ہوئے وہ اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔

''بولو سانول......''

''تم اس گھر میں کسی کے کہنے پر کچھ مت کرنا۔ جو بھی کرنا اپنی مرضی سے کرنا۔ جس میں تمہاری خوشی ہو۔'' سانول نے سرسری انداز میں عام سی بات کی تھی لیکن نجانے کیوں باریشہ کو اس کی بات پر بے چینی محسوس ہوئی تھی۔

''تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟''

''کیونکہ جو کام دوسروں کے کہنے پر کیے جاتے ہیں ان کا بوجھ دل پر پڑتا ہے۔'' سانول نے سنجیدگی سے کہا۔

باریشہ اسے دیکھتی رہ گئی۔ معصوم لڑکا سمجھدار مرد بن رہا تھا۔

''تم اتنی بڑی بڑی باتیں کب سے سوچنے لگے سانول......؟''

''پتا نہیں...... شاید انسان جیسے جیسے بڑا ہوتا ہے بڑی بڑی باتیں بھی خود ہی اس کے ذہن میں آنے لگتی ہیں۔''

''میں بھی تو تمہاری عمر کی ہوں۔ میرے ذہن میں تو ایسی باتیں نہیں آتیں۔''

''تم ذہن کو اجازت ہی کہاں دے رہی ہو کہ وہ کچھ نیا سوچے......'' سانول نے کہا تھا۔

باریشہ نے ناسمجھی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ یا شاید وہ اس کی بات سمجھ چکی تھی لیکن اس کے منہ سے سننا چاہ رہی تھی۔

''تم ابھی تک ماضی میں جی رہی ہو باریشہ...... غصے میں جی رہی ہو۔ نفرت میں...... جو تمہیں اپنی نانو سے ہے۔'' سانول نے سادگی سے کہا اور ایک جھماکا سا باریشہ کے ذہن میں ہوا تھا۔ وہ بات جو ایک عرصے سے وہ خود نہیں سمجھ پا رہی تھی، وہ سانول نے کیسے اسے بتا دی تھی۔ ایک دوسرا شخص اسے اس سے زیادہ سمجھنے لگا تھا۔ اس کا دل کیا کہ وہ آگے بڑھ کر سانول کو گلے سے لگا لے۔ اس نے اس کی سالوں کی الجھن دور کر دی تھی۔

''ہاں......شاید ایسا ہی ہے۔''

''تم اپنی چاند نانو سے نفرت کرنا چھوڑ دو باریشہ......''

''میں ان سے نفرت کرنا کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔ انہوں نے میرے ساتھ بہت برا کیا ہے۔ تم نہیں جانتے سانول......''

''میں جاننا چاہتا بھی نہیں...... پھر بھی کہوں گا کہ ان سے نفرت کرنا چھوڑ دو۔''

''تم ایسا کیوں چاہتے ہو؟''

''کیونکہ زندگی کئی بار انہی کی چوکھٹ پر گراتی ہے جن سے ہم بے پناہ نفرت کرتے ہیں۔'' سانول نے کہا اور باریشہ سے کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ شاید سانول ٹھیک کہہ رہا تھا۔

''میں تمہیں حویلیاں واپس جانے کو نہیں کہہ رہا...... بس اتنا ہی کہ انہیں فون کر لو۔ ان کا حال چال پوچھ لو۔''

''تمہاری بات پر سوچوں گی۔ کیونکہ تم نے ابھی خود ہی تو کہا کہ کسی کے کہنے پر کچھ مت کرنا۔ جب بھی کرنا اپنی مرضی سے کرنا۔'' اس نے بروقت اس کو اس کی بات لوٹائی تھی۔

''ٹھیک کہہ رہی ہو۔ خوشی ہوئی کہ تم نے میری بات مان لی اگرچہ اپنے مطلب کو ہی......''

سانول ہنسا تھا اور باریشہ نے دیکھا تھا کہ آج اس کی مسکراہٹ میں بھی ایک وقار تھا۔

''شب بخیر......!'' کہہ کر وہ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔

باریشہ نجانے کتنی ہی دیر تک لاجونتی کے پودے کو دیکھتی رہی تھی۔

☆......☆......☆

کومل بیگم نے اگلے دن صبح ہی میں باریشہ کی کل رات کی خاموشی کا سبب معلوم کر لیا تھا۔ اس بارے میں انہوں نے نتاشا سے بات کی تھی۔ نتاشا نے انہیں باریشہ کے پل پل کی رپورٹ دی تھی کہ باریشہ نے کل تقریب میں کس کس سے بات کی تھی۔ باقی کڑیاں انہوں نے خود ہی ملا لی تھیں۔ اس لیے اب صبح ہی صبح انہوں نے نبیلہ کو فون کر لیا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ نبیلہ دیر تک سونے کی عادی ہے۔

''تمہاری اسسٹنٹ کو کچھ سمجھ ہونی چاہیے نبیلہ...... اگر میں نے تم سے ایک ریکوئسٹ کر ہی لی تھی تو کیا ضرورت تھی اسے باریشہ کو سب بتانے کی......''

''اسے بھی کوئی غلط فہمی ہوئی ہے کومل...... وہ نہیں جانتی تھی کہ باریشہ اس سب سے لاعلم ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ نہیں جانتی تھی تو بات کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔''

''وہ کہہ رہی ہے کہ باتوں باتوں میں بات نکلی تھی۔''

''مجھے لگتا ہے کہ تمہارے سیلون کے سارے ملازم اس شوٹ پر صدف کو ہی دیکھنا چاہ رہے تھے۔ اور شاید تم بھی نبیلہ...... تم نے میرے اصرار پر میری بات مان تو لی لیکن تمہیں اس شوٹ کے لیے صدف کو نہ لینے کا دکھ ہے۔''

''ایسا کچھ نہیں ہے کومل...... صدف بے شک ایک اچھی ماڈل ہے۔ وہ شوٹ کرتی تو یقیناً شوٹ مختلف ہوتا۔ لیکن مجھے باریشہ کا کام بھی پسند آیا ہے۔ میں جھوٹ نہیں کہہ رہی ہوں۔''

''لیکن میں تمہاری اسسٹنٹ کی حرکت سے سخت خفا ہوئی ہوں۔''

''اس کی طرف سے میں ایکسکیوز کرتی ہوں۔ تم باریشہ کے سامنے اس بات کو سنبھال لو۔''

''ظاہر ہے، وہ تو اب کرنا ہی ہوگا۔'' کومل بیگم نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔ اور جوڑ توڑ کرنے لگی تھی کہ اب باریشہ کے سامنے انہیں کیا کہنا ہے۔ اپنے جھوٹ پر کیسے پردہ ڈالنا ہے۔

''گڈ مارننگ......!'' باریشہ نے وہاں آ کر کہا۔ اسے دیکھ کر کومل بیگم مسکرائی۔

''آج تم نے اٹھنے میں دیر نہیں کر دی۔''

''جی......! نیند مکمل کر رہی تھی۔''

''آؤ بیٹھو......! ناشتا کرتے ہیں۔''

''کیا آپ نے بھی ابھی تک ناشتا نہیں کیا۔''

''نہیں......! میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ ایمن صبح ہی صبح کہیں چلی گئی۔ مرد حضرات پہلے ہی ناشتا کر چکے تھے۔ تو سوچا کہ کیا اکیلے ناشتا کروں اس لیے تمہارا انتظار کرنے لگ گئی۔'' کومل بیگم نے بتایا اور پھر ملازمہ کو کہہ کر ٹیبل پر ناشتا لگوالیا۔ دونوں ٹیبل پر بیٹھ کر ناشتا کرنے لگیں۔

''مجھے آپ سے ایک بات پوچھنا ہے کومل آنٹی......'' چند لقمے کھانے کے بعد باریشہ نے ناپ تول سے کام لیتے ہوئے کہا۔ کومل بیگم اسی بات کی توقع کیے ہوئے تھی۔

''تمہیں جو پوچھنا ہے بعد میں پوچھنا میری جان...... پہلے میری بات سنو...... میں نے تم سے ایک بات چھپائی ہوئی ہے۔''

''وہ کیا......؟''

"میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا کہ نبیلہ شوٹ کے لیے شیزہ کو لینا چاہتی تھی۔" کومل بیگم نے خود ہی حقیقت بتا دی تھی۔ باریشہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "دراصل وہ اس شوٹ کے لیے مشہور ماڈل صدف کو لینا چاہتی تھی۔"

"لیکن پھر آپ نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟"

"کیونکہ میں چاہتی تھی کہ یہ شوٹ تم کرو۔"

باریشہ ابھی بھی اس کی بات نہیں سمجھی تھی۔

"دیکھو نا میری جان...... تم ایک کنویں کے مینڈک کی سی زندگی گزار رہی ہو۔ سنگیت کو تم نے دل چھوٹا کر کے چھوڑ دیا۔ اتنے عرصے کی محنت بے کار گئی۔ میں چاہتی تھی کہ تم کچھ کرو۔ اپنی پہچان بناؤ...... تمہیں اگر میں ڈائریکٹ شوٹ کا کہتی تو شاید تم نہ مانتیں...... انکار کر دیتیں۔ کیونکہ چاند نے تمہاری تربیت بہت عجیب کی ہے۔ وہ اپنے ساتھ ساتھ تمہیں بھی قدیم رکھنا چاہتی تھیں۔ اسی لیے میں نے جھوٹ بولا اور تم مان گئیں۔"

کومل بیگم نے ساری وضاحت دے دی تھی۔ اور باریشہ کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح کے رویے کا اظہار کرے۔

"پھر دیکھا تم نے...... کیا کمال کا ہنر نکل کر آیا ہے تمہارے اندر سے...... کل سب تمہاری کتنی تعریف کر رہے تھے۔ نبیلہ سے بھی ابھی بات ہو رہی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ تم نے صدف سے بڑھ کر کام کیا ہے۔" کومل بیگم نے مسکراتے ہوئے بتایا تھا۔ باریشہ ایسے مسکرائی تھی جیسے زبردستی مسکرائی ہو۔ اس کی خاموشی پر کومل بیگم کو تشویش ہوئی تھی۔

"کیا تم میرے جھوٹ پر ناراض ہو باریشہ......؟"

"نہیں...... ایسا تو ہرگز نہیں ہے۔"

''اس کا مطلب تمہیں اپنا شوٹ پسند آیا؟'' انہوں نے بات کی نوعیت بدلنے کی غرض سے کہا تھا۔
''جی...... پسند تو بہت آیا۔ اس میں تو کوئی شک نہیں۔'' اس نے سچائی سے کام لیا تھا۔ کومل بیگم مسکرائی تھی۔
''بس......اب میری تسلی ہے کہ میں نے کچھ اچھا کرنے کے لیے ہی تم سے جھوٹ بولا۔ تم خوش ہو تو اب میں بھی مطمئن ہوں۔''
جواباً باریشہ مسکرائی تھی۔
''اب بولو...... تمہیں کیا کہنا ہے مجھ سے......؟''
''نہیں...... مجھے کچھ نہیں کہنا۔'' اس نے انکار میں سر ہلایا تھا۔ وہ جو کہنا چاہتی تھی وہ کہنا اب بے کار تھا۔ اس نے ان لوگوں کی نیت پر شک کیا تھا۔ جبکہ کومل بیگم اس کے لیے نجانے کس کس سے ریکوئسٹ کر رہی تھیں۔ اسے تو ان کو شکریہ بولنا چاہیے تھا۔ الٹا وہ ان سے باز پرس کرنے چلی آئی تھی۔ چاند نانو نے واقعی ہی میں اس کی تربیت بہت خراب کی تھی۔ اسے سچے لوگوں کی پہچان نہیں کروائی تھی۔
خود پر شرمندگی کی وجہ سے باریشہ نے باقی کا ناشتا خاموشی سے کیا تھا۔

☆......☆......☆

چاند کا بخار کافی لمبا عرصہ چلا تھا۔ کچھ عمر کا تقاضا تھا، کچھ بڑھاپا اور کچھ دکھوں کا بوجھ...... بخار نے جانے میں بہت وقت لے لیا تھا۔ پھر بخار کی وجہ سے جو اس کے بوڑھے جسم میں کمزوری ہو گئی تھی اس کا خلا بھرنے کے لیے بھی بہت سا وقت درکار تھا۔ شکر تھا کہ گھر میں بوڑھی آمنہ موجود تھی۔ جو اگرچہ خود کوئی کام کرنے سے قاصر تھی لیکن چاند کے بخار میں اس نے ہی اس کا ساتھ دیا تھا۔ جیسا تیسا بھی وہ کھانا پکا دیا کرتی تھی۔ صفائی بھی کر دیا کرتی تھی اور بالکل ماں کی طرح چاند سے ضد کیا کرتی تھی کہ تھوڑا بہت ہی سہی، کھانا کھا لے۔ بخار کے ان دنوں میں اس نے ہی چاند کے کپڑے دھوئے تھے اور منہ ہاتھ

دھلانے کے لیے ایک چھوٹا سا عارضی انتظام اس نے چاندنا نو کے کمرے میں ہی کر دیا تھا۔

ارشادی بابا اکثر شام میں آجایا کرتا تھا۔ شرمندہ سا، سر جھکائے ہوا...... وہ آمنہ بی بی کا سامنا کرنے سے گھبراتا تھا اور بمشکل اپنے حواس میں موجود آمنہ بی بی کو اس بات کی خوشی ہوتی تھی کہ کوئی تو ہے جو اس کا بھی مجرم ہے۔ جس پر وہ بول سکتی ہے۔ زندگی بھر کے شکوؤں کا ذمہ دار قرار دے سکتی ہے۔ طعنے دے سکتی ہے۔ باتیں سنا سکتی ہے۔ کئی بار وہ لفظوں کی جوڑ توڑ کیا بھی کرتی تھی۔ سوچا کرتی تھی کہ ارشادی آج آئے گا تو وہ اسے کیا کہے گی۔ اسے اپنی خوشیوں کا قاتل کہے گی۔ دھوکے باز، وعدہ خلاف کہے گی لیکن پھر نجانے کیا ہوتا تھا۔ جب جب ارشادی حویلی میں آتا تھا آمنہ سارے شکوے بھول جاتی تھی۔ اور اس کا دل کیا کرتا تھا کہ ارشادی کا ہاتھ تھام کر وہ بنسواڑی علاقے میں چلی جائے۔ جہاں جوانی میں بیٹھ کر ارشادی ہاتھوں کے زائچے بنایا کرتا تھا۔ اور اس بار تو وہ ارشادی کو لے کر ایسے گم ہو کہ دنیا والے انہیں ڈھونڈتے رہ جائیں اور وہ دونوں کسی کو نہ ملیں۔

چاندان دنوں زیادہ تر سوئی رہتی تھی۔ وہ جاگ رہی ہوتی تو دیکھتی کہ کیسے ارشادی اور آمنہ حویلی کے دالان میں بیٹھ کر بیتے دنوں کو یاد کیا کرتے ہیں۔ ارشادی جو چاندنا نو کی خیریت معلوم کرنے آیا کرتا تھا۔ آمنہ کا حال زیادہ جان جاتا تھا۔ دونوں کے پاس کہنے کو جو جو کچھ تھا وہ کہنے کے بجائے دالان میں بیٹھ کر خاموش رہنے کو زیادہ بہتر سمجھتے تھے۔ ارشادی کے پاس بتانے کو جو کچھ تھا اس سے آمنہ کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ نہیں جاننا چاہتی تھی کہ قراقرم کے پہاڑوں پر سوامی جی نے ارشادی کو کیا کیا سکھایا تھا۔ اور ارشادی سب سیکھ بھی سکا ہے یا نہیں...... اور شادی کے بعد آمنہ کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ ارشادی نہیں سننا چاہتا تھا۔ کیونکہ ان باتوں میں کوئی خوش کن بات نہیں تھی۔ جو درد موجود تھے ان کے مجرموں میں وہ بھی شامل تھا۔

چاند کی طبیعت کچھ سنبھلی تو اس نے اپنی دوائیوں کا کام پھر سے شروع کر دیا۔ ظاہر ہے کہ انہیں کھانے پینے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ نقاہت سے ہی سہی، لیکن وہ کام کر رہی تھی۔ آمنہ بی بی

اس کی مدد کر دیا کرتی تھی۔ وہ دوائیوں کو صحن میں رکھ کر سکھا لیا کرتی تھی۔ انہیں مرتبان میں محفوظ کر لیا کرتی تھی۔ لیکن وہ اتنی بوڑھی تھی کہ ہاون دستہ نہیں چلا سکتی تھی۔ یہ کام چاند کو ہی کرنا پڑتا تھا۔ ارشادی اتنی مدد کر دیا کرتا تھا کہ وہ اسے جڑی بوٹیاں توڑ کر لا دیا کرتا تھا جس سے دونوں بوڑھیوں کا کچھ سہارا ہو جایا کرتا تھا۔ درحقیقت...... تینوں بوڑھے ایک دوسرے کو سنبھالے ہوئے تھے۔ چاند کو تو لگ رہا تھا کہ جیسے وہ تینوں ہی عرصے سے حویلی میں رہتے رہے ہوں۔ درمیان میں کوئی صندل، کوئی باریشہ نہ آئی ہو۔ وہ تینوں ہی جنم جنم سے اس حویلی کے مکین ہوں۔

آج بڑے دنوں کے بعد چاند اپنے اندر کچھ ہمت محسوس کر رہی تھی۔ اسی لیے وہ جڑی بوٹیاں توڑنے کے لیے خود حویلی سے باہر نکلی تھی۔ آمنہ بی بی نے اسے باہر جانے سے منع کرنا چاہا تھا لیکن جب اس نے دیکھا تھا کہ چاند نہا دھو کر کافی اجلی اجلی لگ رہی تھی تو اس نے اسے باہر جانے دیا تھا۔ ہلکے ہلکے قدم اٹھاتی چاند چھوٹے بڑے پہاڑوں کی چڑھائی چڑھنے لگی تھی اور بہت کم وقت میں اس نے بہت سی جڑی بوٹیاں اکٹھی کر لی تھیں۔ دوپہر تک اس کی ٹوکری بھر چکی تھی۔ باقی کام کسی اور دن پر ملتوی کر کے وہ حویلی کو واپس ہوئی تھی لیکن راستے میں ارشادی بابا کی دکان دیکھ کر وہاں رک گئی تھی۔

ارشادی بابا اپنی دکان میں موجود تھا اور نیم روشنی میں کسی میگزین کا مطالعہ کر رہا تھا۔

"کیسے ہیں آپ......؟" چاند نانو نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا تھا۔ ارشادی بابا فوراً سے چوکنا ہوا تھا۔

"آؤ آؤ چاند...... کیسے آنا ہوا ہے۔ سب خیریت تو ہے نا......؟"

"جی...... سب خیریت ہے۔ کچھ جڑی بوٹیاں چاہیے تھیں۔ بس وہی توڑنے نکلی تھی۔" ٹوکری ایک طرف رکھ کر چاند اسٹول پر بیٹھ گئی تھی۔

"تو مجھے کہا ہوتا۔"

''نہیں...... آج میں اپنے اندر توانائی محسوس کر رہی تھی تو سوچا کہ خود ہی باہر جاؤں۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔ لیکن جو خبر میرے پاس ہے ڈر ہے اسے سن کر تمہاری توانائی پھر سے ضائع نہ ہو جائے۔''

''سب خیریت تو ہے نا......'' چاند نے فکرمندی سے پوچھا۔

کیا زندگی نے اور بھی ابھی کچھ دکھانا تھا۔

جواباً ارشادی بابا نے ہاتھ میں پکڑا ہوا میگزین چاند کے سامنے کر دیا تھا۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے چاند نے میگزین پکڑ کر دیکھا تھا اور پھر اگلے ہی لمحے اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ میگزین میں باریشہ کی تصاویر تھیں۔ اور وہ تصاویر ایسی تھیں کہ اس کا دل کیا تھا کہ میگزین کو فوراً سے آگ لگا دے۔

''یہ...... یہ سب کیا ہے؟'' حیرت کے باعث اس سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔

''کسی بیوٹی پارلر کا افتتاح ہے۔ باریشہ نے اس کے لیے تصویریں بنوائی ہیں۔'' ارشادی بابا کو خود جتنی سمجھ تھی اس کے مطابق اس نے چاند کو بتا دیا تھا۔

''وہ...... وہ کہاں ہے اس وقت...... کیا وہ لاہور میں ہے یا کراچی جا چکی ہے؟''

''نہیں...... وہ اسلام آباد میں ہے۔''

''کس کے پاس......؟''

''پتا نہیں مجھے......'' ارشادی بابا نے جھوٹ بولا تھا۔

''کیا میں اس سے مل سکتی ہوں؟''

''اگر تم اس سے ملنے گئیں تو وہ اسلام آباد چھوڑ کر کہیں اور چلی جائے گی۔ پھر تم کیا کرو گی۔ کہاں تلاش کرو گی اسے......''

''تو میں ان کا کیا کروں......؟'' چاند نے میگزین کی تصویروں کی طرف دیکھتے ہوئے اشارہ کیا تھا۔

''برداشت کرو......اور خدا سے اس کی ہدایت کی دعا کرو۔''

''لیکن وہ کیوں ایسی ہو گئی ہے۔ میں نے اس کی تربیت ایسی تو نہیں کی تھی۔ کیا اسے یہ سب چاہیے تھا۔'' چاند دکھ سے ٹوٹ ہی تو چکی تھی۔

''شاید......اسے یہ سب ہی چاہیے تھا۔''

''میں اسے اپنے پاس واپس لانا چاہتی ہوں ارشادی بابا......'' چاند نے منت سے کہا تھا۔ جیسے باریشہ اس مقام پر پہنچ کر ارشادی بابا کی بات ہی تو ماننے والی تھی۔

''وہ نہیں آئے گی۔ جو شخص عروج کی منزلیں طے کر رہا ہو، وہ پیچھے پلٹ کر کب دیکھتا ہے۔''

''یہ عروج ہے؟''

''سب کا عروج الگ الگ ہوتا ہے۔ سب کی منزل الگ الگ ہوتی ہے۔ اپنی کامیابی کے لیے انسان صحیح اور غلط کو کب دیکھتا ہے۔ یاد کرو......صندل کو میر زاد کے ساتھ گھر سے بھگانے میں تم نے ان دونوں کی مدد کی تھی۔ تب صندل کی منزل میر زاد تھا اور تمہاری منزل صندل کی خوشی......جس کی خاطر تم نے حویلی کی بدنامی کو بھی نظر انداز کر دیا تھا۔'' ارشادی بابا نے ماضی کے صفحے پلٹے تھے۔ چاند چپ ہو کر رہ گئی تھی۔

''اب باریشہ بھی اپنی خوشی کے لیے صحیح اور غلط میں فرق نہیں کر پا رہی ہے۔''

''میں......میں اس سے ایک بار بات کرنا چاہتی ہوں ارشادی بابا......کیا آپ میری مدد کریں گے؟'' چاند نے منت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

ارشادی بابا خاموش ہو گئے تھے۔

''میں جانتی ہوں کہ آپ جانتے ہیں کہ باریشہ کہاں ہے۔ میں آپ سے نہیں پوچھوں گی۔ لیکن آپ ایک بار بات تو کروا ہی سکتے ہیں۔''

''وہ بات کرے گی یا نہیں، میں کچھ نہیں کہہ سکتا ہوں۔''

''آپ اس کی منت کر لیجیے گا۔''

''مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ مجھ سے بھی بات کرنا بند نہ کر دے۔''

''ایسا کبھی نہیں ہو گا۔''

''یہ تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو چاند......؟''

''باریشہ کو مجھ سے لاکھ نفرت سہی...... لیکن اسے اپنی ماں سے محبت ہے۔ اور اپنی ماں کی باتیں وہ صرف آپ سے ہی کر سکتی ہے۔ اس لیے وہ آپ سے بات کرنا کبھی بند نہیں کرے گی۔''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔''

''آپ بات کریں گے باریشہ سے میرے لیے......؟''

''ٹھیک ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ وہ تم سے بات کرنے کے لیے راضی ہو جائے۔ فی الحال تم گھر جاؤ اور اس کے لیے دعا کرو۔'' ارشادی بابا نے کہا تھا اور تھکے ہارے انداز میں چاند اسٹول پر سے اٹھی تھی۔

آج بہت دنوں کے بعد حویلی سے باہر نکلتے ہوئے وہ جس قدر خوش تھی، واپسی پر اتنی ہی زیادہ دکھی تھی۔

☆......☆......☆

کومل بیگم نے شہر کے سب سے مہنگے فوٹو گرافر کو ہائر کیا تھا۔ باریشہ کا پورٹ فولیو تیار کروانے کے لیے......

پورٹ فولیو کے تیار ہونے میں ایک ہفتہ لگا تھا۔ اس ایک ہفتے میں اس نے مختلف طرح کے ڈریس پہنے تھے جو کہ سب کے سب کومل بیگم نے خود منتخب کیے تھے۔ باریشہ نے ان پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ اب اعتراض کرنے کو کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ وہ اپنی مرضی سے اب یہ کام کرنے لگی تھی اور اس کام میں اپنی خوشی تلاش کر رہی تھی۔ یہ شاید واحد کام تھا جس کے لیے وہ دل و جان سے محنت کر رہی تھی اور جس

کے نتائج کے لیے وہ بہت پرجوش تھی۔ یہ سب اسے اچھا لگ رہا تھا۔ تیار ہونا، تصویریں بنانا...... ہر روز نئی لک...... اگر زندگی اسے اسی سمت میں آگے بڑھا رہی تھی تو وہ اسی سمت آگے بڑھنا چاہتی تھی۔ ان دنوں وہ بہت خوش تھی۔

اس ایک ہفتے کے ہر نئے دن میں اس کا الگ طرح سے میک اپ ہوا تھا اور الگ طرح کے ہیر اسٹائل بنائے گئے تھے۔ رات میں گھر آنے کے بعد اس کا منہ دھونے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ شیشے کے سامنے بیٹھ جائے اور خود کو دیکھتی رہے۔ مزید ایک ہفتے کے بعد اس کا پورٹ فولیو بن کر آ گیا تھا۔ اور وہ اس سے کہیں بڑھ کر خوب صورت تھا جتنا باریشہ نے سوچا ہوا تھا۔

''مجھے تو خود کو دیکھ کر بھی یقین نہیں آ رہا ہے کہ یہ میں ہوں۔'' پورٹ فولیو دیکھتے ہوئے اس نے نتاشا سے کہا تھا۔

''شہر کا سب سے بڑا فوٹو گرافر ہائیر کیا تھا کومل میم نے تمہارے لیے...... رزلٹ تو ایسا آنا ہی تھا کہ انسان حیران رہ جائے۔'' نتاشا نے اسے بتایا تھا۔

''بہت زیادہ پیسے لیے ہوں گے اس نے......''

''یس...... لاکھوں میں۔'' نتاشا نے بتایا تھا۔

باریشہ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ نتاشا نے کچھ حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''تو......؟ تم کیا سمجھ رہی تھیں؟''

''مجھے لگا شاید دس بیس ہزار......''

''کس دنیا میں ہو تم...... پورے تین لاکھ......'' نتاشا نے رقم بتا دی تھی۔ باریشہ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔

''سچ میں......؟''

''یس...... میں نے ہی تو کومل میم کے ہاتھ کا لکھا ہوا چیک اسے دیا تھا۔ پورے تین لاکھ کی رقم لکھی ہوئی تھی اس پر......''

''کومل آنٹی نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ اتنی رقم کون کسی پر خرچ کرتا ہے۔'' باریشہ نے کہا تھا۔

نتاشا کا منہ ایسے بن گیا تھا جیسے وہ اس بات پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتی ہے۔ وہ چاہ کر بھی باریشہ کو بتا نہیں سکتی تھی کہ جتنا پیسہ یہ لوگ تم پر خرچ کر رہے ہیں اس سے زیادہ وصول بھی کر لیں گے۔

''اب آگے کیا کرنا ہو گا نتاشا......؟''

''اس پورٹ فولیو کو تمام ایجنسیوں میں بھیج دیں گے۔''

''لیکن میں تو کسی ایجنسی کو نہیں جانتی ہوں۔''

''فکر کیوں کر رہی ہو۔ میں سب ایجنسیوں کو جانتی ہوں نا...... تمہارا پورٹ فولیو سینڈ کر دوں گی۔''

''تم کتنا کچھ جانتی ہو ناں نتاشا......'' باریشہ نے سراہتے ہوئے کہا تھا۔ نتاشا مسکرائی تھی۔

''کومل میم نے سکھایا ہے سب......''

''کومل میم اس سب کے بارے میں کیسے جانتی ہیں؟'' باریشہ نے کچھ حیران ہوتے ہوئے پوچھا تھا۔

نتاشا اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''باقی کی باتیں پھر کسی وقت...... ابھی مجھے دوسرے کام سنبھالنے ہیں۔ کچن کی صورت حال دیکھتی ہوں جا کر...... چند دن کچن میں نہ جاؤں تو وہاں کے ورکر کام چوری کرنے لگتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے جاؤ تم......''

نتاشا وہاں سے چلی گئی تھی اور باریشہ پھر سے اپنا پورٹ فولیو دیکھتے ہوئے مسکرانے لگی تھی۔



اس بار بہار کے رنگ ان گنت تھے۔اس نے دنیا جہاں کے پھول پودے اگا دیے تھے۔جن کی خوشبو پوری فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔امید تھی کہ بارش کے بعد کی قوس قزح میں بھی صرف سات رنگ نہیں ہوں گے بلکہ قوس قزح کپڑوں کی طرح ہر دن نئے پیراہن میں آسمان پر نمودار ہوا کرے گی۔کبھی ریشمیں، کبھی بنارسی، کبھی کتان میں...... باریشہ ان دنوں ایسی ہی بے سروپا باتیں سوچ رہی تھی اور خود پر ہنس رہی تھی۔

گھر قدرے خالی تھا ان دنوں...... بستامی بابا، رحبانی بابا اور سانول...... تینوں بہاول پور گئے ہوئے تھے۔کومل آنٹی کے ذریعے اسے پتا چلا تھا کہ بستامی بابا شوگر مل خریدنے میں دلچسپی لے رہے ہیں تو بس اسی سلسلے میں تینوں وہاں گئے ہوئے تھے۔گھر کی لڑکیاں بھی کچھ تو اپنے گھر کو گئی ہوئی تھیں اور کچھ کہاں تھیں، اس کے بارے میں نتاشا نے اتنے گول مول جواب دیے تھے کہ باریشہ کی کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا کہ لڑکیاں کہاں گئی ہیں۔نتاشا کی عادت تھی وہ ادھوری بات بتا کر کسی کام کا بہانا بنا کر منظر سے غائب ہو جایا کرتی تھی۔باریشہ نے اس کی ایسی شخصیت کو قبول کر لیا تھا۔

بوریت کے ان دنوں میں باریشہ مالی انکل کے ساتھ مل کر باغ کا کام کروا دیا کرتی تھی۔جس پر کومل اور ایمن اسے بہت ٹوکا کرتی تھیں لیکن اسے آج کل انہی کاموں میں مزا آ رہا تھا۔بلکہ اسے ہر طرح کا کام کرنا اچھا لگ رہا تھا۔شاید چاند نانو کے لیے جڑی بوٹیاں ڈھونڈنا اور انہیں کوٹنا بھی اسے ان دنوں اچھا لگتا۔خوش رہتے ہوئے وہ نئی زندگی کی تیاری کر رہی تھی۔کومل آنٹی کے کہنے پر وہ ٹی وی پر فیشن شو دیکھتی رہتی تھی۔اور فیشن شو میں چلتی ماڈلز کی طرح چلنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔اس سے اسے فائدہ ہوا تھا۔اس کی نشست و برخاست میں اتراہٹ سرائیت کرنے لگی تھی۔وہ روز نتاشا سے پوچھا کرتی تھی کہ کیا کسی ایجنسی سے اس کے لیے کال آئی ہے، اور نتاشا ناں میں سر ہلا دیا کرتی تھی۔جس سے باریشہ کو کوئی ناامیدی یا مایوسی نہیں ہوا کرتی تھی۔نجانے کیسے اس نے یقین کی طاقت حاصل کر لی تھی اور اسے اپنے

یقین پر یقین تھا کہ اب اسے کامیاب ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا ہے۔

مالی انکل اور باریشہ کی کوششوں سے باغ نے چند دن میں بہت خوب صورت شکل اختیار کر لی تھی۔ جسے دیکھ کر وہ خوش ہوتی رہتی تھی۔ مالی انکل تو ویسے بھی باغ کا بہت خیال رکھتے تھے لیکن اس بار باریشہ نے انہیں کچھ نئی تجاویز دی تھیں جس کی وجہ سے آرائشی پھول مزید خوش نما لگنے لگے تھے۔

گرمیوں کی آمد آمد تھی۔ اور وہ شام کے علاوہ صبح میں بھی باغ میں چہل قدمی کیا کرتی تھی۔ اس وقت وہ باغ میں چہل قدمی ہی کر رہی تھی جب نتاشا بھاگتی ہوئی اس کے پاس پہنچی تھی۔

"باریشہ...... باریشہ......!" نتاشا کا سانس پھولا ہوا تھا لیکن چہرے پر مسکراہٹ تھی جس کی وجہ سے باریشہ کو کوئی تشویش نہیں ہوئی تھی۔

"کیا ہوا ہے نتاشا......؟"

"ایک ایجنسی سے تمہارے لیے کال آئی ہے۔" نتاشا نے مسکراتے چہرے کے ساتھ اسے خوش خبری سنائی تھی۔

☆......☆......☆

شیشے میں موجود اس کا عکس کسی حور پری کا عکس تھا۔ کسی کوہ قاف کی شہزادی کا...... جس کی کہانیاں وہ بچپن میں حاجی بوا سے سنا کرتی تھی۔ وہ عکس اس کا ہرگز نہیں تھا۔ خود کو دیکھتے ہوئے بھی اسے لگ رہا تھا کہ یہ کوئی اور ہے۔ وہ نہیں ہے۔ یہ جو نظر آ رہی تھی یہ باریشہ نہیں تھی۔ اگر تھی تو وہ والی نہیں جو حویلیاں میں پیدا ہوئی تھی۔ یہ تو کوہ قاف میں پیدا ہوئی تھی۔

بیوٹیشن نے اس کی آنکھوں میں سنہرے رنگوں والی کہکشاں اتاری تھی۔ اور ہونٹوں پر سرخ رنگ کی لپ اسٹک لگائی تھی۔ یہ دونوں رنگ تو وہ خود بھی بارہا استعمال کر چکی تھی لیکن کبھی اتنی پیاری نہیں لگی تھی جتنی آج لگ رہی تھی۔ لہریں ڈالیں بال اس کے حسن کو مزید نکھار رہے تھے۔ آج وہ پہلی بار ریمپ پر

جانے والی تھی اور عزم تھا کہ پہلی ہی بار میں سب کو اپنا گرویدہ کر لے گی۔

گزرے تین ماہ میں بہت کچھ ہو چکا تھا۔ باریشہ کو بہت سی کامیابیاں مل چکی تھیں۔ اگر وہ کامیابیاں ہی تھیں تو...... چونکہ ان دنوں اس کے سوچنے سمجھنے کی ساری ڈوریں کومل اور ایمن کے ہاتھوں میں رہی تھیں تو اسے نہیں اندازہ ہو پا رہا تھا کہ کامیابی کیا ہوتی ہے اور ناکامی کیا ہوتی ہے۔ وہ صحیح اور غلط میں فرق کرنے سے قاصر تھی۔

ایک ایجنسی کے تحت اس نے اپنی پہلی پیپر ماڈلنگ کی تھی۔ لان کے ڈریسز کی ماڈلنگ تھی جو کہ کمپنی کے ان لے کارڈز پر پبلش ہونی تھی۔ یہ ماڈلنگ کسی میگزین کے لیے نہیں تھی لیکن باریشہ کو خوشی تھی کہ اس کے کام کی شروعات ہو چکی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ ایسی ہی آفرز آنے لگی تھیں جو کہ کومل بیگم کے کہنے پر وہ کرتی چلی گئی تھی۔ کچھ ایک دو چھوٹے لیول کے شوٹ تھے جو اس نے کیے تھے۔ کومل بیگم اس کے لیے بہت کوششیں کر رہی تھی جس پر باریشہ کا تو خیال تھا کہ وہ اس کی مدد کر رہی ہے۔ جبکہ حقیقت اس کے الٹ تھی۔ باریشہ کو وہاں رہتے ہوئے کافی وقت گزر چکا تھا اور کومل بیگم اس بات سے چڑنے لگی تھی کہ باریشہ مفت کی روٹیاں توڑ رہی ہے۔ اسے ایسی لڑکیوں سے نفرت ہونے لگتی تھی جو اسے کما کر نہ دیں۔ وہ روشن بیگم کی طرح مسکراہٹ چہرے پر سجائے رحم دلی کا مظاہرہ نہیں کر سکتی تھی۔ کومل بیگم کی عادت تھی کہ جب بات اس کے اعصاب پر سوار ہو جاتی تھی تو وہ اپنے چہرے کی سختی کو چھپا نہیں پاتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ باریشہ اس کا دوسرا روپ دیکھے۔ یہ ہی وجہ تھی کہ وہ چاہتی تھی کہ باریشہ جلد سے جلد اس کے لیے کمانا شروع کر دے۔ اور ان سب باتوں سے انجان باریشہ اس کے کمائی کے ذریعے کو اپنی کامیابی تصور کیے ہوئے تھی۔ آج کا شو بھی کومل بیگم کی کوششوں کی وجہ سے ہی ملا تھا اسے......

”تیار ہو......؟“ نتاشا نے اس کے پاس آ کر پوچھا تھا۔

”ہاں...... دیکھو مجھے...... کیسی لگ رہی ہوں؟“ اس نے اپنا آپ گھوم کر نتاشا کو دکھایا۔ نتاشا

اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ گہرے میرون رنگ کا لہنگا اور بلاؤز اس پر بہت پیارا لگ رہا تھا۔

''تم ......تم بہت پیاری لگ رہی ہو باریشہ......''

''آج مجھے بھی اپنا آپ پیارا لگ رہا ہے۔''

''ارشادی بابا کی کال آرہی ہے۔ وہ تم سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔''

''جانتی ہوں کہ انہوں نے مجھ سے کیا بات کرنی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں چاندنا نو سے بات کروں۔'' باریشہ نے منہ بناتے ہوئے کہا تھا۔

''تو کرلو......اس میں کیا ہے۔ وہ کافی دنوں سے تمہاری منتیں کر رہے ہیں۔'' نتاشا نے کہا تھا۔

باریشہ کا دل نہیں تھا چاندنا نو سے بات کرے۔

''یار، کرلو بات......ان بوڑھے لوگوں کی زندگی موت کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔''

''کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔''

''میں انہیں کہہ دیتی ہوں کہ تیس منٹ بعد کال کریں۔ ابھی تمہیں اسٹیج پر جانا ہے۔''

''ٹھیک ہے......کہہ دو پھر......''

''تم وہاں جاؤ......بہت جلد تمہاری باری آنے والی ہے۔'' نتاشا کے کہنے پر وہ اس حصے کی طرف گئی تھی جہاں لڑکیاں لائن بنا کر کھڑی تھیں اور اپنی باری پر اسٹیج پر جارہی تھیں۔

نتاشا ارشادی بابا کو کال کرنے لگی تھی۔

☆......☆......☆

سارا ہال روشنیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ریمپ کے دائیں بائیں ایلیٹ کلاس سرد چہرے لیے موجود تھی۔ پھر نئے ڈیزائنر کے شو کے لیے لائٹس بند کردی گئیں۔ اور پورے ہال میں نصرت فتح علی خان کے ''آفریں آفریں'' کی دھنیں گونجنے لگی تھیں۔ سب کی نظریں اسٹیج پر لگی ہوئی تھیں۔ سب سے پہلے

باریشہ بیک اسٹیج سے اسٹیج تک آئی تھی اور جیسا کہ ڈیزائنر نے اسے کہا تھا وہ درمیان میں آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ پھر دائیں بائیں سے لڑکیاں ایک ایک کر کے نکلنا شروع ہوئی تھیں اور لمبے اسٹیج کے آخری حصے تک جانے لگی تھیں جہاں میڈیا کے لوگ اور فوٹو گرافر موجود تھے۔

لڑکیاں وہاں تک جاتی تھیں اور پوز کر کے واپس ہوتی تھیں۔ اپنی باری کی منتظر باریشہ سانسوں کو نارمل کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ پھر جب ساری لڑکیاں اپنی پرفارمنس دے چکیں تو اس کی باری آ گئی۔

باریشہ نے دائیں بائیں دیکھا۔ سب اسے ہی دیکھ رہے تھے، کومل آنٹی کی بدولت اس شو کا سب سے بہترین لباس اسے پہننے کو دیا گیا تھا۔ اور وہ آج اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ اس سے بھی بڑھ کر خوب صورت لڑکیاں اسے رشک سے دیکھ رہی تھیں۔ اس کی چال میں خود بخود ہی اتراہٹ آتی چلی گئی تھی۔

آنکھیں دیکھیں تو میں دیکھتا رہ گیا

جام دونوں اور دونوں ہی دو آتشہ ......

نصرت فتح علی خان کا آفریں آفریں دوسرے بند پر پہنچ چکا تھا اور باریشہ اسٹیج کے وسط تک پہنچ چکی تھی۔ اسے بھی باقی لڑکیوں کی طرح اختتام تک جانا تھا اور فوٹو گرافرز کے آگے پوز کرنا تھا۔

آنکھیں ان کو کہوں یا کہوں خواب ہیں

وہ سہج سہج کر قدم رکھتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کے انگ انگ میں اتراہٹ تھی۔ لیکن پھر جب کہ وہ لمبے اسٹیج کا ایک بڑا حصہ طے کر چکی تھی اسے احساس ہوا کہ کچھ ہوا ہے۔ کچھ انوکھا جس نے اس کو فوراً الرٹ کر دیا تھا۔ اس کے چھوٹے سے بلاؤز کی تینوں ہکیں پیچھے سے کھل گئی تھیں۔ یا شاید ٹوٹ ہی گئی تھیں۔ اس سے اگلا قدم اٹھانا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ فق نظروں سے سامنے موجود فوٹو گرافرز کو دیکھنے لگی تھی۔ یہ کنفرم کرنے کے لیے کہ اس کی کمر پیچھے سے دوپٹے سے ڈھکی ہوئی ہے اس نے دوپٹے کو دیکھنا

چاہا تھا اور تب ہی اچھے سے سیٹ کیا ہوا دوپٹا بھی نجانے کیسے اس کے کندھوں سے اتر کر نیچے جا گرا تھا۔ وہ جلدی سے دوپٹے کو اٹھا کر کندھوں پر ڈال لینا چاہتی تھی جب اس کی لمبی ہیل ٹوٹ گئی تھی۔ وہ ایک پاؤں سے بری طرح لڑکھڑائی تھی اور سارا وزن دوسرے پاؤں پر ڈالے کھڑی تھی جب ہلکی سی آواز کے ساتھ دوسرے پاؤں کی ہیل بھی ٹوٹی تھی۔ وہ لڑکھڑا کر گری تھی اور اسٹیج پر پوری طرح لیٹ ہی گئی تھی۔

ہال کی لائٹس جلدی سے بجھا دی گئی تھیں۔ چاروں طرف اندھیرا چھا گیا تھا۔ اس اندھیرے میں بس ایک چیز چمک رہی تھی۔ باریشہ کی آنکھوں میں موجود آنسو......

آنکھیں جن میں ہے آسمان وزمیں

نرگسی نرگسی، سرمئی سرمئی

اس کا دل کیا تھا کہ وہ اتنا روئے کہ اس کی قسمت کے سارے دکھ آج ختم ہو جائیں۔

☆......☆......☆

پندرہ منٹ سے وہ مسلسل رو رہی تھی۔ نہ تو اس کا رونا کم ہو رہا تھا اور نہ ہی اس کے آنسو تھمنے میں آ رہے تھے۔ نتاشا پورے خلوص کے ساتھ اسے چپ کروا رہی تھی۔ جس سے بس اتنا ہی فائدہ ہوا تھا کہ اس کے رونے کی آواز بند ہو گئی تھی۔ لیکن آنسوؤں کو نتاشا بھی ختم نہیں کر سکی تھی۔ باریشہ کا دکھ بے انت تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اسٹیج کو آگ لگا دے یا خود کسی دریا میں کود جائے۔ اگرچہ دونوں کام ہی بے کار تھے۔ وہ اس کی بے عزتی کو کم نہ کر سکتے تھے۔

''ہو جاتا ہے باریشہ...... تم کیوں خود کو ہلکان کر رہی ہو۔'' نتاشا نے پیار سے اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

''میرے ساتھ ہی کیوں ہوتا ہے۔'' دکھ سے چور ہو کر روتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

''سب کے ساتھ ہی ہو جاتا ہے۔''

''میرے ساتھ یہ دوسری بار ہوا ہے۔'' باریشہ کی اس بات پر نتاشا بھی خاموش ہوگئی تھی۔ واقعی ہی میں باریشہ کے ساتھ دوسری بار ہوا تھا۔ اس کا رونا جائز تھا۔

''میم پتا کروا رہی ہیں کہ یہ کس کی سازش ہے۔ فکر مت کرو۔ سب پتا چل جائے گا۔ اور جو کوئی بھی اس سازش کے پیچھے ہوگا اس کے ساتھ بہت برا سلوک کیا جائے گا۔''

''میں جانتی ہوں کہ یہ کس کی سازش ہے۔'' آنکھوں میں نفرت سی بھرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

''کس کی......؟'' نتاشا کو اتنی جلدی پتا چل جانے پر حیرت ہوئی تھی۔

''چاندنا نو کی......'' باریشہ نے کہا تھا۔

نتاشا نے کوفت سے گہرا سانس بھرا تھا۔ وہ باریشہ کی طرح سوچنے کی عادی نہیں تھی۔

''میں جانتی ہوں کہ یہ چاندنا نو کا ہی کام ہے۔''

''وہ یہاں موجود نہیں تھیں باریشہ......''

''تم نہیں جانتیں اس عورت کو...... جادوگرنی ہے وہ۔''

نتاشا چپ ہوگئی تھی۔ وہ بھلا کیا تبصرہ کرتی۔

''میں تمہارے لیے کافی منگواتی ہوں۔''

''ارشادی بابا کو کال ملاؤ...... چاندنا نو وہاں ہی ہوگی نا......؟''

نتاشا جاتے جاتے رکی تھی۔

''ہاں...... انہوں نے کہا تو ایسا ہی تھا کہ وہ پندرہ منٹ تک چاند کو وہاں بلا لیں گے۔''

''کال کرو پھر ارشادی بابا کو......''

باریشہ کے کہنے پر نتاشا نے مزاحمت نہ کرتے ہوئے کال ملا دی تھی اور موبائل باریشہ کو دے دیا تھا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ پھر کال اٹینڈ کر کے جیسے فون چاندنا نو کو ہی دے دیا گیا تھا۔

"ہیلو باریشہ...... کیسی ہو میری جان؟" چاند نانو کی کپکپاتی ہوئی آواز سنائی دی تھی اور یہ آواز باریشہ کو اتنی بری لگی تھی کہ اس کا دل کیا تھا کہ اس آواز کا گلا گھونٹ دے۔

"کیا سمجھتی ہیں آپ خود کو چاند......؟" اس نے زہر خند لہجے میں کہا تھا۔

دوسری طرف چاند نانو باریشہ کے ایسے لہجے پر سہم گئی تھی۔ وہ اس بات کی امید تو ضرور ہی رکھے ہوئے تھی کہ باریشہ اس کا حال پوچھے گی۔ اگرچہ سرد مہری سے ہی پوچھے۔ لیکن باریشہ کے انداز پر وہ ڈر گئی تھی۔

"کیا آپ خود کو کوئی ولی اللہ خیال کیے ہوئے ہیں چاند نانو...... اگر آپ ایسا سوچتی ہیں تو میں آپ کو بتا دوں کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ آپ کوئی ولی اللہ نہیں ہیں۔ بلکہ آپ جادوگرنی ہیں۔ کالا جادو کرنے والی جادوگرنی...... جو زندگیاں برباد کرنے کا ہنر جانتی ہیں۔"

"یہ...... یہ تم کیا کہہ رہی ہو باریشہ......"

"میں آپ کو بتا دوں کہ مجھ پر آپ کا کوئی جادو نہیں چلنے والا ہے۔ آپ اپنے عملوں سے جتنی چاہے رکاوٹیں کھڑی کر لیں میرے راستے میں...... میں اب اس راستے پر ہی چلوں گی۔"

"میں تو تمہارا حال پوچھنے کے لیے تم سے بات کرنا چاہتی تھی باریشہ......"

"میرا حال پوچھنے کے لیے یا مجھ پر طنز کرنے کے لیے......"

"میں تم پر طنز کیوں کروں گی۔"

"کیونکہ کیسا عجیب اتفاق ہے۔ جس وقت میری بے انتہا بے عزتی ہوئی ہے اسی وقت آپ کا فون آیا ہے۔"

"ایسا کچھ نہیں ہے میری جان...... جیسا تم سوچ رہی ہو۔"

"مت کہیں مجھے میری جان...... نفرت ہے مجھے اس دوغلے رویے سے۔"

"ایسا کیا کر دیا ہے میں نے باریشہ...... میں نے تو ہمیشہ تمہاری بھلائی چاہی ہے۔"

"آپ میری بھلائی چاہتی ہیں تو دوبارہ مجھے فون کرنے کی کوشش مت کیجیے گا چاند نانو...... ورنہ

میں یہ ملک چھوڑ کر کہیں دور چلی جاؤں گی اور کبھی واپس نہیں آؤں گی۔'' باریشہ نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا تھا اور فون بند کر دیا تھا۔ گہرا سانس بھرتے ہوئے وہ خود کو نارمل کرنے لگی تھی۔ پاس پڑے ٹشو باکس میں سے اس نے اپنے لیے ٹشو نکالا تھا اور اپنے باقی ماندہ آنسو صاف کرنے لگی تھی۔

''کیا اب سنگیت کی طرح ماڈلنگ بھی چھوڑ دو گی؟'' بہت لمحے بیت جانے کے بعد نتاشا نے اس سے پوچھا تھا۔

''ہرگز نہیں...... میں چاند نانو کے عزائم کو کبھی پورا نہیں ہونے دوں گی۔'' اس نے ایک عزم سے کہا تھا۔

☆......☆......☆

بڑے کمرے میں زویا کا ایک جاندار قہقہہ گونجا تھا۔

''کیا سچ میں......؟ سب ایسا ہی ہوا جیسا تم بتا رہے ہو یا مجھے خوش کرنے کے لیے جھوٹ بول رہے ہو؟''

''میں کیوں جھوٹ بولوں گا۔ بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ جیسا بتایا سب ویسا ہی ہوا۔''

''باریشہ جب اسٹیج پر گری ہو گی تو سب خوب ہنسے ہوں گے۔''

''وہ گری ہی اس طرح سے تھی کہ ہنسی روکنے والے بھی اپنی ہنسی نہیں روک سکے ہوں گے۔'' زویا کے بیٹے نے اسے بتایا تھا اور زویا مزید کھلکھلا کر ہنسنے لگی تھی۔

''پھر...... پھر بیک اسٹیج کیا ہوا؟''

''بیک اسٹیج جا کر وہ پورے پندرہ منٹ تک روتی رہی...... پھر اس نے اپنی نانو کو فون کیا۔''

''کیا کہا اس نے چاند کو......؟'' چاند کا ذکر لبوں پر آتے ہی زویا کی ساری مسکراہٹ دور ہو گئی تھی اور لہجے سمیت پورے چہرے سے ایک نفرت جھلکنے لگی تھی۔

''میں دور کھڑا تھا۔ باتیں تو نہیں سن سکا۔ لیکن باریشہ بہت زیادہ رو رہی تھی۔ چیخ چلا رہی تھی۔''

''ایسا ہی ہونا چاہیے تھا اس کے ساتھ...... میرا بھائی بھی بہت رویا تھا۔ چیخا تھا، چلایا تھا۔ بہت درد سہا ہے میرے بھائی نے چاند کی وجہ سے...... اب چاند کی باری ہے۔'' زویا نفرت سے بولتی چلی گئی تھی۔ اس کا بیٹا خاموش کھڑا اسے دیکھتا جا رہا تھا۔ ماں کے اندر موجود غصے اور نفرت کی آگ نجانے کب بجھنے والی تھی۔

''کاش! تم مجھے بھی اپنے ساتھ اسلام آباد لے جاتے۔ وہ سارا منظر میں اپنی آنکھوں سے دیکھتی۔'' زویا نے خود ہی موضوع کو بدلا تھا۔

''پھر کچھ ایسا کریں گے تو ضرور لے کر جاؤں گا آپ کو......''

''اب تم کیا کرو گے؟''

''جو آپ کہیں گی۔''

بیٹے کے سوال پر زویا اٹھ کر کھڑکی کے پاس گئی تھی۔ کھڑکی کو اس نے کھول دیا تھا۔ سمندر کی نمی کو سموئے ہوئے کراچی کی ہوا کمرے میں چلی آئی تھی۔ جس میں زویا نے چند ایک گہرے سانس لیے تھے۔

''چاند سے اس کا آخری سہارا چھین لو...... باریشہ کو جان سے مار دو۔''

☆......☆......☆

برسات کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ بارش کا کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ کس وقت برسنا شروع ہو جائے۔ وہ جب گھر سے نکلی تو موسم اچھا خاصا خوش گوار تھا۔ لیکن پھر شام ہوتے ہوتے گہرے بادل آنے لگے تھے جنہوں نے شام کے منظر کو رات میں بدل دیا تھا۔ اس کا ارادہ فیصل مسجد تک واک کرتے ہوئے جانے کا تھا۔ آج ایک عرصے کے بعد گھر سے اکیلے نکلنا اسے اچھا لگ رہا تھا۔ جیسے وہ حویلیاں میں اکثر نکلا کرتی تھی۔ چاند کے لیے جڑی بوٹیاں اکٹھا کرنے کے لیے...... اور جڑی بوٹیوں اور ان کی کین والی ٹوکری کو یاد کرتے ہوئے باریشہ نے سر جھٹکا تھا۔ کیا وقت یاد آ جاتا تھا اسے بھی...... بھلا جڑی

بوٹیاں اکٹھا کرنا اور موسم کو انجوائے کرتے ہوئے گھر سے باہر نکلنے کا آپس میں کیا تعلق تھا۔لیکن بار بار کا سر جھٹکنا بھی اس کی یادوں کو نہیں جھٹک سکا تھا۔

ایک سڑک کا موڑ مڑ کر جب وہ دوسری سڑک تک آئی تو سامنے مرگلہ کی پہاڑیاں تھیں۔جن پر گاڑیوں کی فلیش لائٹ کی روشنیاں جگنوؤں کی طرح تیرتے ہوئے نظر آرہی تھیں۔انہی پہاڑوں کے پیچھے حویلیاں تھا۔ایک کم آبادی والا گمنام سا شہر...... سائرہ کے لفظوں میں ایک قصبہ...... جہاں کی ایک پرانی حویلی میں چاندنا نو بیٹھے ہوئے نجانے اس وقت کیا کر رہی ہوں گی۔

سوچوں میں گم وہ آگے بڑھتی جا رہی تھی جب اس پر بارش کا ایک قطرہ گرا تھا۔اس نے فوراً سے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا تھا۔کالے بادل ڈیرا ڈال چکے تھے۔وہ آج اسلام آباد کو پھر سے بھگونے کا ارادہ کیے ہوئے تھے۔باریشہ نے لمحے بھر کو سوچا تھا اور پھر واپسی کے قدم بڑھا لیے تھے۔اس کا ہینڈ بیگ تو اس کے پاس تھا لیکن اس میں موبائل فون نہیں تھا۔اگر بارش تیز ہو جاتی تو وہ گھر سے ڈرائیور کو نہیں بلا سکتی تھی۔بہتر تھا کہ واپس ہی جایا جائے۔

شام اتنی گہری ہوگئی تھی جیسے آدھی رات کا وقت ہو۔اسٹریٹ لائٹس کی روشنی بھی اس کے آگے کم لگنے لگی تھی۔شارٹ کٹ لینے کے لیے سڑک سے ملحقہ وہ ایک گلی میں داخل ہوگئی تھی۔گلی تاریک تھی اور سنسان بھی...... اسے وہاں جاتے ڈر محسوس ہوا تھا۔لیکن گلی زیادہ لمبی نہیں تھی اور گلی کے دوسرے سرے پر رواں دواں سڑک نظر آرہی تھی۔بے خوف ہو کر اس نے چلنا شروع کر دیا تھا۔ابھی وہ گلی کے وسط تک ہی پہنچی تھی کہ اپنی پشت پر اسے ایک بائیک کے گلی میں داخل ہونے کی آواز سنائی دی تھی۔بے اختیار ہی اس نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ایک نوجوان لڑکا بائیک چلا رہا تھا جو باریشہ کو ہی دیکھ رہا تھا اور پھر جلد ہی اس تک پہنچ گیا تھا۔تیزی سے آتی بائیک کو اس نے باریشہ کے آگے آکر اس طرح سے روکا تھا کہ باریشہ کا راستہ ہی رک گیا تھا۔اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتی...... بائیک پر موجود لڑکا جلدی سے اترا تھا اور اگلے

ہی پل اس نے اپنی پینٹ کی پشت سے پستول نکال کر باریشہ کے سامنے کیا تھا۔

''چلانا مت...... یہاں ویسے بھی تمہاری چیخ کوئی نہیں سنے گا......'' لڑکے نے کہا تھا اور تب ہی بادل زور سے گرج کر ٹوٹے تھے۔ لمحے بھر میں ہلکی بارش نے تیزی پکڑ لی تھی۔

''ک...... کیا چاہتے ہو؟'' باریشہ بری طرح سے گھبرا گئی تھی۔ پستول اس کی طرف تانے وہ لڑکا اسے دیکھ رہا تھا۔ ''یہ لو......''

باریشہ نے اپنا ہینڈ بیگ اس کی طرف اچھال دیا تھا کہ لڑکے کو وہی چاہیے ہوگا۔ لیکن لڑکے نے اپنے قدموں میں گرے بیگ کو ٹھوکر مار کر دور پھینک دیا تھا۔ جس سے واضح ہو گیا تھا کہ اسے پیسوں سے کوئی مطلب نہیں ہے۔

''کیا چاہتے ہو؟'' باریشہ پر خوف طاری ہو چکا تھا۔ لڑکے نے اگلے ہی پل اپنی کہنی اس کی گردن پر رکھتے ہوئے اسے دیوار کے ساتھ لگا دیا تھا۔ اس کے بازو کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ باریشہ پوری جان لگا کر بھی اپنا آپ نہیں چھڑوا سکتی تھی۔ پستول والا ہاتھ اس نے اس کے پہلو پر رکھ دیا تھا۔ پستول کی نال باریشہ کو اپنی پسلیوں پر چبھتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

''کیا مجھے مارنا چاہتے ہو؟'' ڈر سے کانپتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

''ہاں......'' اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے لڑکے نے اتنے ٹھوس لہجے میں کہا تھا کہ باریشہ کو یقین ہو گیا تھا کہ اب اس کے پاس زندگی کے بس چند لمحے ہی باقی بچے ہیں۔



ناول **تاش گھر** ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **15** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 22

''کیا مجھے مارنا چاہتے ہو؟'' ڈر سے کانپتے ہوئے باریشہ نے پوچھا تھا۔

''ہاں......!'' اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے لڑکے نے اتنے ٹھوس لہجے میں کہا تھا کہ باریشہ کو یقین ہو گیا تھا کہ اب اس کے پاس زندگی کے بس چند لمحے ہی باقی بچے ہیں۔ اور پھر اگلے ہی لمحے فضا میں ایک فائر کی آواز گونجی تھی۔ باریشہ نے دلدوز چیخ ماردی تھی۔ موت قریب تھی۔ اس نے سختی سے آنکھیں میچ لی تھیں اور خدا کو یاد کرنے لگی تھی۔

''لڑکی کو چھوڑ دو......'' کوئی تیسری مردانہ آواز گونجی تھی۔ باریشہ نے آنکھیں کھولی تھیں۔ اور اسے احساس ہوا تھا کہ گولی اس پر نہیں داغی گئی ہے۔

ایک لڑکا گلی کے سرے پر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ فائر اسی نے فضا میں کیا تھا اور اب پستول اس لڑکے پر تان لی تھی جو اپنی کہنی سے باریشہ کی گردن دبوچے کھڑا تھا۔

''میں کہتا ہوں کہ لڑکی کو چھوڑ دو......ورنہ میں گولی چلانے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگاؤں گا۔'' گلی کی شروعات میں کھڑے لڑکے نے دھمکی آمیز بلند آواز میں کہا تھا۔

''اور اگر نہ چھوڑوں تو......؟''

جواباً فضا میں دوسرا فائر کیا گیا تھا۔

''قسم کھاتا ہوں کہ تیسرا فائر تمہارا سر اڑا دے گا۔'' لڑکے نے اتنے دبنگ انداز میں کہا تھا کہ سو

فی صد امید کی جا سکتی تھی کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔ باریشہ نے اپنے چہرے تک آتے لڑکے کو دیکھا تھا جو غصے سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بادل زور زور سے گرج رہے تھے اور بارش دھواں دار ہو رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے جا رہے تھے۔

''آخری بار کہہ رہا ہوں۔ لڑکی کو چھوڑ دو......''

''آج تو بچ گئی ہو۔ اگلی بار نہیں بچ سکو گی۔'' لڑکے نے اپنی پستول سے اس کے چہرے پر دستک سی دیتے ہوئے کہا تھا اور پھر اس سے پرے ہو گیا تھا۔ پستول کو اس نے اپنی پینٹ کی بیک پر رکھا تھا۔ بائیک پر بیٹھا تھا اور کک مارتے ہوئے وہاں سے چلا گیا تھا۔ باریشہ کی جان میں جان آئی تھی۔ بہت دیر سے رکا ہوا سانس بحال ہوا تھا۔ اس نے اس لڑکے کی طرف دیکھا تھا جو گلی کے شروع میں کھڑا تھا۔ جواب آہستگی سے چلتا ہوا اس کے قریب آ رہا تھا۔

''تم ٹھیک ہو؟'' وہ پیار سے پوچھ رہا تھا۔

''ہاں......میں ٹھیک ہوں۔'' باریشہ نے بمشکل ہاں میں سر ہلایا تھا۔

''جانتی تھیں تم اسے......؟''

''نہیں بالکل نہیں۔''

''لگتا ہے کہ کوئی اوباش تھا۔ لڑکی کو اکیلا دیکھ کر تنگ کرنے لگا۔'' لڑنے نے آگے بڑھ کر فاصلے پر گرا ہوا باریشہ کا ہینڈ بیگ اٹھا لیا تھا۔

''یہ تمہارا ہے؟''

''ہاں......یہ میرا ہے۔''

''پکڑو......فون کر کے گھر سے کسی کو بلا لو۔''

''میں آج موبائل لانا بھول گئی ہوں۔'' بیگ پکڑتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

"یہ لو میرے موبائل سے کال کر لو۔" اس نے اپنا موبائل نکال کر اس کے آگے کیا تھا۔ باریشہ نے موبائل نہیں پکڑا تھا۔

"مجھے گھر میں کسی کا نمبر یاد نہیں ہے۔" اس نے کہا تو لڑکے نے اسے ایسے دیکھا تھا جیسے اس کی بے وقوفی پر افسوس کر رہا ہو۔

"کیا تم مجھے میرے گھر تک چھوڑ سکتے ہو؟" بارش میں سردی سے کانپتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

تیز بارش کی وجہ سے باریشہ کے ہونٹ جامنی ہونے لگے تھے۔ لڑکے کو فوراً سے اس کی حالت کا اندازہ ہوا تھا۔ اس نے اپنی شرٹ اتاری تھی اور باریشہ کی طرف بڑھائی تھی۔ خود وہ وائٹ سفید باریک ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ جو بارش کی وجہ سے اس کے کسرتی جسم سے چپک چکی تھی۔

"یہ خود پر لپیٹ لو...... موٹی تو نہیں ہے لیکن کچھ نہ کچھ فائدہ تو دے گی ہی......" باریشہ نے انکار نہ کرتے ہوئے شرٹ پکڑ کر خود پر لپیٹ لی تھی۔

"گھر کہاں ہے تمہارا؟"

"زیادہ دور نہیں ہے۔ تھوڑے فاصلے پر ہی ہے۔"

"چلو...... چلتے ہیں پھر......" اس نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ باریشہ اس کے پیچھے چلنے لگی تھی۔

"میرا نام ضامن ہے۔ تمہارا کیا ہے؟"

"باریشہ......" اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے باریشہ نے کہا۔

ساون کی وہ بارش رکنے کا نام نہ لیتی تھی۔ بارش جیسے سارے پرانے قرض آج اتارنے کا قصد کیے ہوئے تھی۔ بادل گرجتے ہوئے جاتے تھے اور نجانے کہاں سے پانی بھر کر واپس وہیں لوٹ آتے تھے۔ سڑکوں پر اسی باعث ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔

وہ دونوں درختوں کے نیچے سے ہوتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ لیکن یہ کام خود کو دھوکا دینے

کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ درختوں کے پتے بارش کے بوجھ سے بارش سے زیادہ پانی ٹپکا رہے تھے۔ وہ دونوں لحہ بہ لمحہ زیادہ گیلے ہو رہے تھے۔ پھر ایک جگہ رک کر ضامن نے ایک کیلے کے درخت کی نیچے جھکی ہوئی شاخ کو مزید نیچے جھکا لیا تھا۔ اس نے کیلے کا ایک بڑا سا پتا توڑا تھا اور باریشہ کو دیا تھا۔

''یہ خود پر رکھ لو...... چھتری کا کام دے گا۔''

باریشہ نے بڑا سا پتا پکڑ لیا تھا۔ جبکہ بارش میں وہ بری طرح سے بھیگ تو چکی ہی تھی۔

''تم......؟''

''میری خیر ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا اور باریشہ اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ وہ پھر سے اس کے آگے چلنے لگا تھا۔ کسی شہنشاہ کی طرح......

اور وہ سر پر دونوں ہاتھوں سے کیلے کا پتا رکھے ہوئے اس کی محکوم رعایا کی طرح اس کے پیچھے چل رہی تھی۔

☆......☆......☆

کمرے کی کھڑکی بند تھی پھر بھی باہر ہوتی بارش کا شور سنائی دے رہا تھا۔ رات وقت سے پہلے گہری ہو چکی تھی۔ کمرے میں پوری طرح سے اندھیرا اتر آیا تھا۔ لیکن اسے شاید اس بات کا احساس نہیں تھا۔ بازو کو اپنے سر کے نیچے رکھے، بیڈ پر لیٹا وہ نجانے کتنی دیر سے چھت کو گھور رہا تھا۔ لیکن در حقیقت وہ چھت کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ تو کسی منظر کو سوچ رہا تھا۔

''ک...... کیا چاہتے ہو؟'' باریشہ کا بری طرح سے گھبراتے ہوئے کہنا اسے یاد آ رہا تھا۔ اور یہ یاد ایسی تھی جو اس کے چہرے پر سنجیدگی کو ختم کرتے ہوئے مسکراہٹ بکھیرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''یہ لو......'' ڈر سے کانپتی باریشہ نے اپنا ہینڈ بیگ اس کی طرف اچھال دیا تھا۔ یاد کرتے ہوئے خیام کے چہرے پر مسکراہٹ نظر آنے لگی تھی۔

''کیا چاہتے ہو؟'' لڑکی پر خوف طاری تھا۔ اس نے اگلے ہی پل اپنی کہنی اس کی گردن پر رکھتے ہوئے اسے دیوار کے ساتھ لگا دیا تھا اور اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا تھا۔ اس نے اسے خوف زدہ کرنا تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وہ اپنا مقصد بھولنے لگا تھا۔ باریشہ کی آنکھوں میں متوقع موت کا خوف تھا۔ لیکن اس خوف نے بھی اس کی آنکھوں میں موجود معصومیت کو مندمل نہیں ہونے دیا تھا۔ اس کے چہرے پر پانی کی بوندیں گر رہی تھیں اور خیام کا دل چاہا تھا کہ وہ اسی طرح کھڑا رہے اور بہت دنوں تک اس لڑکی کو اسی طرح اپنے سامنے دیکھتا رہے۔

''کیا مجھے مارنا چاہتے ہو؟'' ڈر سے کانپتے ہوئے اس نے پوچھا تھا اور یاد کرتے ہوئے خیام ایک دم سے ہی ہنسنے لگا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی فلم کا منظر ہو۔ ہنستے ہوئے وہ بیڈ پر اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

''کیا ہوا ہے خیام......؟ آج بہت ہنس رہے ہو۔'' اس کی والدہ نے کمرے کا دروازہ ذرا سا کھول کر اندر جھانکا تھا۔

''نہیں کچھ نہیں......'' وہ تب بھی اپنی ہنسی پر قابو نہیں پا سکا تھا۔ شائستہ کمرے کے اندر چلی آئی تھیں۔ انہوں نے لائٹ آن کر دی تھی۔

''کچھ تو ہے۔'' وہ ذو معنی مسکرا رہی تھیں۔

''ایک جوک یاد آ گیا تھا۔'' اس نے جھوٹ بولا تھا۔ شائستہ نے اپنے جوان بیٹے کی طرف ایسے دیکھا تھا جیسے کہہ رہی ہوں کہ میں سب سمجھ رہی ہوں۔

''رات کھانے میں کیا کھاؤ گے؟''

''جو آپ کا دل کرے بنوالیں۔''

''تمہارا دوست کہاں ہے؟''

''وہ کسی کام سے باہر گیا ہے۔''

''ایسا کرو کہ فون کر کے اسی سے پوچھ لو کہ وہ رات کے کھانے میں کیا کھائے گا۔ وہ ویسے بھی ہمارا مہمان ہے ہمیں اس کی پسند سے کھانا بنوانا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے میں پوچھ لیتا ہوں۔'' خیام نے کہا تھا۔

شائستہ کمرے سے باہر چلی گئی تھیں۔ خیام نے موبائل پکڑ کر اپنے دوست کو کال کی تھی۔

''ہیلو ضامن! کہاں ہے تو؟''

''ابھی اس لڑکی کو اس کے گھر تک چھوڑا ہے۔''

''ویسے بہت بڑا بے غیرت ہے تو...... قسم کھانے کی کیا ضرورت تھی کہ اگلا فائر تمہارا سر اڑا دے گا۔'' خیام نے کہا تو ضامن ہنسنے لگا تھا۔

''وہ کیا کہتے ہیں...... جوش خطابت......'' ضامن نے کہا تو وہ دونوں ہنسنے لگے تھے۔

''مام پوچھ رہی ہیں کہ رات کے کھانے میں کیا کھائے گا۔''

''جو تیرا دل کرتا ہے بنوا لے۔ میں سب ہی کچھ کھا لیتا ہوں۔''

''چائنیز کھائے گا؟''

''کیوں نہیں......شوق سے......''

''ٹھیک ہے۔ میں مام سے کہہ دیتا ہوں۔''

''تھوڑی دیر میں پہنچتا ہوں تیری طرف......''

''بائے جانی......''

''بائے!''

فون بند ہو گیا تھا۔ ضامن نے موبائل جیب میں رکھا تھا۔ اور خیام کے گھر تک جانے کے لیے ایک ٹیکسی کو روکا تھا۔



''باریشہ......! کہاں تھیں تم اتنی دیر سے؟'' وہ اپنے کمرے میں جا رہی تھی جب کومل بیگم نے اسے روکا تھا۔

''میں گھر سے باہر تھی۔''

''تم تو کافی بھیگ چکی ہو۔''

''جی......راستے میں ہی بارش شروع ہوگئی تھی۔''

''یہ شرٹ کس کی ہے؟'' کومل بیگم کی نظر شرٹ پر اب گئی تھی۔

''راستے میں کسی نے میرا پرس چھیننے کی کوشش کی۔'' اس نے ادھوری بات بتائی تھی۔

''اوہ میرے خدایا......پھر......؟''

''ایک لڑکے نے بروقت مدد کی......اسی نے مجھے گھر تک چھوڑا ہے، یہ اسی کی شرٹ ہے۔ میرا لباس بری طرح سے گیلا ہو چکا تھا۔''

''تو تم اس لڑکے کو گھر کے اندر تو بلاتیں......میں اس کا اچھے سے شکریہ ادا کرتی۔''

''میں نے کہا تھا لیکن اس نے منع کر دیا۔''

''ٹھیک ہے تم کمرے میں جا کر فریش ہو جاؤ......پھر بات کرتے ہیں۔''

''جی......!'' کہہ کر وہ اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ اس نے دروازہ بند کیا تھا اور سست چال سے چلتی ہوئی بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے کپڑے بدلنے کا تردد بھی نہیں کیا تھا۔ حتیٰ کہ بال بھی نہیں سکھائے تھے۔ وہ نیم گیلے کپڑوں کے ساتھ ہی اپنے بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔ بارش کے جھلملاتے ہوئے قطرے اس کی آنکھوں میں اترے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلنے لگی تھی۔

''یہ خود پر لپیٹ لو......موٹی تو نہیں ہے، لیکن کچھ نہ کچھ فائدہ تو دے گی ہی......'' ضامن نے اپنی شرٹ اتار کر اسے دی تھی۔ منظر اس کی نظروں کے سامنے ایسے چل رہا تھا جیسے وہ کسی سنیما میں بیٹھی ہو اور

سامنے اسکرین پر سب چل رہا ہو۔

''میرا نام ضامن ہے۔'' ضامن کا خوشبودار لہجہ کمرے میں اتر آیا تھا۔

''میرا نام ضامن ہے۔'' بازگشت ہونے لگی تھی۔

''اور مسٹر ضامن...... کیا تم مجھ سے دوبارہ کبھی ملو گے یا نہیں......؟'' اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے خود سے سوال کیا تھا۔ اور اپنے سوال کا جواب نہ ملنے پر وہ بے چین ہونے لگی تھی۔

وہ کس بہانے سے اس سے ملنے آسکتا تھا؟

کیا شرٹ لینے کے بہانے......؟ جب کہ وہ اسے کہہ چکا تھا کہ وہ اسے اپنے پاس رکھ لے۔ پھر وہ کیسے اسے مل سکتا تھا۔ وہ اس بڑے شہر میں اسے کہاں تلاش کر سکتی تھی؟

اور یہ بھی حقیقت تھی کہ جب کسی کو تلاش کرنا ہو تو حویلیاں جیسا چھوٹا شہر بھی پورا ملک بن جاتا ہے۔

''مجھے اپنی زندگی میں اس سے ملاقات کا اتفاق بارہا چاہیے میرے اللہ!'' اور اس نے شدت سے خدا کے حضور دعا کی تھی۔ اسے نہیں یاد پڑتا تھا کہ اس نے آخری بار کب دعا کی تھی۔ وہ خدا سے ہم کلام ہونے میں بہت سست اور مطلب پرست تھی۔ صرف اپنی ضرورت کے وقت وہ خدا کو یاد کیا کرتی تھی۔ جیسے اب کر رہی تھی۔

''میں کیسے ملوں گی اسے دوبارہ......'' وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔ بازوؤں کو اس نے سختی سے بھینچ لیا تھا۔ تب ہی اس کا ہاتھ شرٹ کی پاکٹ میں موجود کسی سخت چیز سے ٹکرایا تھا۔ اس نے پاکٹ میں ہاتھ ڈالا تھا۔ وہ ایک کارڈ تھا۔ وزٹنگ کارڈ......

''ضامن عباس...... سیون سٹار میڈیا کمپنی...... فون نمبر......''

اور آج پہلی بار باریشہ کا دل کیا تھا کہ وہ شکر کے طور پر خدا کو سجدہ کرے۔

☆......☆......☆

شام کی متواتر بارش نے اسلام آباد کو وقت سے پہلے ہی سلا دیا تھا۔ سماں کچھ خاموش سا ہو گیا تھا۔ ایسے جیسے سارا شہر ہی تھک کر جلدی سو گیا ہو۔ بارش کے بعد کی رات کا مزا لینے کو باہر کوئی موجود نہیں تھا۔ فضا میں ان مینڈکوں کی آواز گونج رہی تھی جو بارش کے پانی میں مستیاں کر رہے تھے۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد ضامن جلدی سو گیا تھا۔ لیکن خیام کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ ایک انجان چہرہ اس کی نظروں میں سما چکا تھا۔ ایک ڈرا سہا چہرہ...... موت کے خوف سے لرزہ، معصومیت میں لپٹا ہوا۔ اور یہ چہرہ اسے بھول ہی تو نہیں پا رہا تھا۔ وہ جتنا بھولنے کی کوشش کرتا چہرہ مزید توانائی سے اس کے ذہن میں نقش ہوتا چلا جاتا۔ شاید یہ اس کا آرٹسٹک مائنڈ تھا اس لیے......

کسی بھی منظر کو دیکھ لینے کے بعد اس کا ذہن اس منظر کو تب تک نہیں بھولتا تھا جب تک وہ اسے پوری طرح سے کینوس پر نہیں اتار لیتا تھا۔ تو کیا اب یہ چہرہ جو اسے سونے نہیں دے رہا تھا یہ بھی کینوس پر اترنے کے بعد اس کے ذہن سے محو ہونے والا تھا۔ اور کون جانے کہ کینوس پر اترنے کے بعد وہ محو ہوتا تھا یا مزید پختہ ہوتا تھا۔

خیام بیڈ سے اترنا چاہتا تھا لیکن ساتھ میں لیٹے ہوئے ضامن کا بازو اس کے سینے پر تھا۔ جو اسے وہاں چپکائے ہوئے تھا۔ چار و ناچار اس نے سونے کی کوشش کی تھی لیکن نیند آنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ آج کی رات کیسے گزرے گی۔ نیند اور بیداری سے جاری جنگ میں ہار مانتے ہوئے اس نے بہت احتیاط سے اٹھنے کی کوشش کی تھی۔ ضامن کا بازو اپنے سینے پر سے ہٹا کر سائیڈ پر کیا تھا۔ سو رہے ضامن نے نیند سے جاگنے والی جنبش تو کی تھی لیکن وہ جاگا نہیں تھا۔ خیام اسے بچپن سے جانتا تھا۔ ضامن کی نیند کافی گہری ہوتی تھی۔

وہ بے سدھ ہو کر سویا کرتا تھا۔

خیام بیڈ سے نیچے اتر آیا تھا۔ کمرے کا دروازہ اس نے آہستگی سے کھولا تھا اور پھر باہر نکل کر

آہستگی سے ہی بند کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ضامن کے بچپن کا ریکارڈ خراب ہو جائے اور آج وہ بے سدھ نیند سے جاگ جائے۔

گھر کی تاریک راہداری کو پار کر کے وہ اپنے اسٹوڈیو میں گیا تھا۔ جہاں اس کے بہت سے مکمل اور نامکمل پورٹریٹ پڑے ہوئے تھے۔ اس نے ایک نامکمل پورٹریٹ کو اتار کر سائیڈ پر رکھا تھا اور اسٹینڈ پر نیا کینوس رکھ دیا تھا۔ آج سے پہلے اس نے بس قدرتی مناظر ہی بنائے تھے۔ اس لیے وہ جانتا تھا کہ آج رات اسے مشکل پیش آئے گی۔ آج وہ پہلی بار کسی لڑکی کا چہرہ بنانے جا رہا تھا۔ باریشہ کا چہرہ......

☆......☆......☆

ملازمہ سے کہہ کر اس نے ضامن کی شرٹ کو ڈرائی کلین ہونے کے لیے بھجوا دیا تھا۔ اور ملازمہ کو تاکید کی تھی کہ وہ شرٹ کو شام سے پہلے واپس منگوا لے۔ اور ساتھ میں یہ ہدایت بھی کی تھی کہ وہ اس کے بارے میں کسی کو نہ بتائے۔ ناشتا اس نے جلدی کر لیا تھا۔ اور پھر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ نتاشا اس سے بات کرنا چاہتی تھی۔ مستقبل کو لے کر کچھ پلان کرنا چاہتی تھی لیکن اس نے یہ کہہ کر "کل بارش میں بھیگنے کی وجہ سے میری طبیعت کچھ خراب ہے" نتاشا کو کمرے سے چلتا کیا تھا۔ آج وہ تنہا رہنا چاہتی تھی اور سوچنا چاہتی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔

اب اپنے کمرے میں بیٹھ کر ضامن کا وزٹنگ کارڈ ہاتھ میں پکڑے وہ سوچ رہی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ یہ تو طے تھا کہ اس نے ضامن کو کال کرنی ہے۔ لیکن کیا کہنا ہے یہ طے نہیں ہو پا رہا تھا۔ اور یہ بھی نہیں کہ اسے کس طرح بات کرنی چاہیے کہ جس سے ضامن کو احساس ہی نہ ہو کہ وہ رات بھر اس کے بارے میں سوچتی رہی ہے۔ اور پھر سے اس سے ملنے کے لیے بہت بے چین ہے۔ ذہن ہی ذہن میں وہ لفظوں کا جوڑ توڑ کرنے لگی تھی اور پھر اس نے موبائل پکڑا تھا اور ضامن کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ اسے نمبر ڈائل کرنے کے لیے کارڈ کو دیکھنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ نمبر اسے رات ہی رات میں ازبر ہو چکا تھا۔

ایف سیون ایریا سے دور، بہت دور...... بھارہ کہو کے ایک عالیشان گھر کے آرٹسٹک کمرے میں ضامن کھڑا کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ باہر دن پوری آب و تاب سے نکل آیا تھا۔ کل کی تیز بارش نے موسم کا سارا گرد و غبار ختم کر دیا تھا۔ وہ نہا کر فریش ہو چکا تھا۔ لیکن اس کا دوست ابھی تک سو رہا تھا۔ کھڑکی کے باہر سے نظر ہٹا کر ضامن نے خیام کو دیکھا تھا۔ جو کروٹ بدلے بدلے بے خبر سو رہا تھا۔ ضامن کو کچھ حیرت ہوئی تھی۔ خیام تو صبح اس سے بھی پہلے اٹھ جانے کا عادی تھا۔ پھر یہ آج کیوں ایسے سو رہا تھا جیسے رات بھر جاگ کر کوئی کام کرتا رہا ہو۔ اسے ناشتے کی طلب ہو رہی تھی لیکن وہ اپنے دوست کے بنا ناشتا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

وہ انہی سوچوں میں تھا جب اس کے موبائل فون کی بیل بجی تھی۔ جلدی سے اپنا موبائل پکڑ کر اس نے سائلنٹ کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ خیام نیند سے جاگے۔ پھر اس نے موبائل اسکرین پر آئے نمبر کو دیکھا تھا۔ نمبر انجان تھا۔ اور وہ جانتا تھا کہ یہ انجان نمبر کس کا ہوگا۔ ایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی تھی۔ کمرے سے باہر نکل کر اس نے کال ریسیو کی تھی۔

"ہیلو......!"

"ضامن......؟"

"جی...... آپ کون؟" جبکہ یہ سوال پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ باریشہ کی آواز پہچان چکا تھا۔

"میں باریشہ ہوں۔ کل جس کو تم نے گھر تک چھوڑا تھا۔"

"میرا نمبر کیسے ملا تمہیں؟" وہ انجان بنتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ جیسے وہ جانتا ہی نہ ہو کہ اپنا وزٹنگ کارڈ اس نے جان بوجھ کر اپنی شرٹ کی جیب میں چھوڑا تھا۔

"تمہاری شرٹ کی پاکٹ میں تمہارا وزٹنگ کارڈ تھا۔"

"اوہ...... اچھا......"

''تمہیں تمہاری شرٹ واپس کرنا تھی۔''

''میں کل بول تو چکا تھا کہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' ضامن نے کہا تھا۔ باریشہ کو سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ آگے سے کیا کہے۔

''ویل...... اگر واپس کرنا ہی چاہتی ہو تو پنالٹی کے ساتھ واپس کرنا ہو گی۔'' وہ کچھ شوخی سے بولا تھا۔

''کیسی پنالٹی؟''

''مجھے کافی پلانا ہو گی۔'' اس نے کہا تھا۔ اور ایسی خوب صورت پنالٹی پر باریشہ تو نہال ہی ہو گئی۔

''شوق سے......'' اس نے فوراً سے رضامندی دے دی تھی۔

''تو پھر کہاں سے پلاؤ گی کافی؟''

''جہاں تم کہو؟''

''میں اسلام آباد کو زیادہ نہیں جانتا ہوں۔ میں یہاں نیا ہوں۔''

''ویسے میں بھی اس شہر کی نہیں ہوں۔ میں حویلیاں سے ہوں۔'' باریشہ نے سرسری انداز میں کہا تھا۔ اور حویلیاں کے نام پر ضامن دانت پیس کر رہ گیا تھا۔

''کیا تم حویلیاں کو جانتے ہو؟'' اس نے بات برائے بات پوچھ لیا تھا۔

''نہیں...... بالکل نہیں...... میں یہ نام پہلی بار سن رہا ہوں۔ یہ کہاں ہے؟'' اس نے روانی سے جھوٹ بولا تھا۔

''اسلام آباد سے ایبٹ آباد کی طرف جائیں تو ایبٹ آباد سے پہلے حویلیاں آتا ہے۔''

''اوہ...... آئی سی......''

''ویل، میں اب اسلام آباد میں رہتی ہوں اور یہاں کی بہت سی جگہوں کو جانتی ہوں۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔ دیکھتے ہیں کہ آپ کتنا جان چکی ہیں اس شہر کو مس باریشہ!'' ضامن نے لہجہ

نارمل رکھتے ہوئے کہا تھا۔

یہ جملہ الوداعی تھا۔ جبکہ باریشہ کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ضامن سے باتیں کرتی رہے اور بس کرتی ہی رہے۔

☆......☆......☆

۱۹۷۴ء

تعبیر کی موت کی خبر کے بعد سب ہی کو سنبھلنے میں کافی وقت لگ گیا تھا۔ خاص طور پر زہرہ پھوپھو کو...... وہ بیمار رہنے لگی تھیں۔ ہر وقت ان کا جسم تپتا رہتا تھا اور وہ دیوانوں کی طرح تعبیر کو پکارتی رہتی تھیں۔ ایسے جیسے خواب وخیال میں بول رہی ہوں۔

"وہ جہاں جا چکی ہے اسے یاد کرنے کے بجائے بہتر ہے کہ تم اسے خدا کا کلام پڑھ کر بخشو......"
شکیلہ اور تہمینہ پھوپھو انہیں سمجھایا کرتی تھیں۔ لیکن اس ماں کو کیسے قرار آنے والا تھا جس کی جوان بیٹی شادی کے کچھ ہی عرصے کے بعد مر گئی ہو۔

بیٹی کی شادیوں کے بعد تو مائیں ایک ایک دن گنتی ہیں کہ کب ان کی بیٹی انہیں اپنے ماں بننے کی خوش خبری سنائے اور یہاں انہیں ایسی انہونی خبر سننے کو ملی تھی جس پر انہیں ابھی بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ نجانے کیوں انہیں لگتا تھا کہ تعبیر کسی دن زندہ سلامت ان کے سامنے آ کھڑی ہوگی اور اپنی غم زدہ ماں کو گلے سے لگا لے گی۔ چونکہ زہرہ پھوپھو نے اس کی میت نہیں دیکھی تھی اس لیے انہیں تعبیر کی موت پر یقین بھی نہیں آ رہا تھا۔

ایسی ہی بے یقینی انہیں تب لاحق ہوئی تھی جب بٹوارے کے ہنگامے میں ان کے شوہر کو قتل کیا گیا تھا۔ انہیں یقین ہی تو نہ آتا تھا کہ جن لوگوں کے ساتھ وہ برسوں رہی ہیں انہی کے جھگڑوں میں ان کا شوہر قتل کر دیا گیا ہے۔ اور وہ اب بیوہ ہو چکی ہیں۔ تب بھی وہ دن رات اپنے شوہر کو پکارا کرتی تھیں۔

لیکن شوہر واپس نہیں آیا تھا جیسے اب تعبیر بھی واپس آنے والی نہیں تھی۔ اس حقیقت کو وہ تسلیم نہیں کر پا رہی تھیں اور روز اس سے نبرد آزما ہونے کی کوششیں کرتی تھیں۔ یہ ہی وجہ تھی کہ ان کی طبیعت دن بدن گرنے لگی تھی۔

باقی لڑکیاں بھی اداس اداس تھیں۔ اس حویلی میں ان کی ہوش میں یہ پہلی موت تھی۔ اور کتنی ادھوری موت تھی۔ نہ تو جنازہ وہاں سے اٹھایا گیا تھا اور نہ ہی میت کو دیکھ کر انہیں قرار آیا تھا۔ وہ مر چکی تعبیر کا سرد چہرہ دیکھ لیتیں تو شاید انہیں کچھ راحت نصیب ہوتی۔ اب تو ایسے لگ رہا تھا جیسے قدرت ان کے ساتھ کوئی کھیل کھیل رہی ہو۔ تعبیر جو ہر وقت میک اپ سیکھنے میں لگی رہتی تھی۔ ساری کزنوں کا خاص دنوں کا میک اپ وہی کرتی تھی۔ ایسی زندہ دل لڑکی کی جان فرشتہ کیسے قبض کر سکتا ہے۔ دکھ بھری سوچوں میں گم وہ کھجور کی گٹھلیوں پر تعبیر کے لیے پڑھ پڑھ کر بخشتی رہتی تھیں۔ وہ سب نہیں جانتی تھیں کہ جسے وہ مرا ہوا سمجھ رہی ہیں، وہ زندہ ہے۔ اور اپنی قسمت کو رو رہی ہے۔

اداسی کے ان ہی دنوں میں چاند نے سب کو عجیب خبر سنائی تھی۔ بستامی اور کومل کی شادی کی خبر......جس پر پہلے تو سب حیران ہوئے تھے اور پھر جلد ہی صورتِ حال کو قبول کر لیا گیا تھا۔ کسی کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اور اعتراض بھی تب کرتے جب ان کے اعتراض کی کوئی اہمیت ہوتی۔ سب تو پہلے سے ہی یہ چاہتے تھے کہ بستامی اور رحبانی کے گھر بس جائیں۔ بے شک کومل اور ایمن کے ساتھ ہی......

حویلی میں ایک بار پھر سے شادی کی تیاریاں ہونے لگی تھیں۔ یہ تیاری اگرچہ بہت زیادہ پر جوش نہیں تھی۔ لیکن جو حالات حویلی پر ہو گزرے تھے اس کے بعد جیسے سب کو ہنسنے کا بہانہ مل گیا تھا۔ سب ہنسی خوشی شادی کی تیاریاں کرنے لگے تھے۔ چاند اپنی زیرِ نگرانی کومل کا لباس تیار کروانے لگی تھی۔ اس نے خوب صورت رنگ اور چمک دار نگینوں کا انتخاب کیا تھا۔ ڈیزائن بھی انہوں نے خود منتخب کیا تھا۔ اور کاریگروں سے کہا تھا کہ وہ جلد سے جلد اس لباس کو مکمل کریں۔ باقی سب بھی اپنے نئے پرانے جوڑے

نکال کر دیکھنے لگے تھے کہ شادی کے دنوں میں کس نے کیا پہننا ہے۔ چاند نے اپنے بہت سے سونے کے زیورات کومل کو دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جس پر تہمینہ پھوپھو نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ ان زیورات کو اپنے پاس رکھے۔

''وقت کا کچھ پتا نہیں ہوتا چاند...... کب برا وقت آجائے۔''

لیکن چاند پھر بھی ان زیورات کو کومل کو دینے کے فیصلے پر قائم رہی تھی۔

''میں بہت کچھ تو صندل کو دے چکی ہوں۔ اب باقی جو میرے پاس موجود ہیں اس کی مجھے ضرورت نہیں۔ میں نے صرف چند ایک چیزیں اپنے پاس رکھی ہیں جو التمش نے مجھے دی تھیں۔''

''ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی......'' تہمینہ پھوپھو نے کہا تھا۔

حویلی کا ماحول کچھ عرصے سے ایسا ہو چکا تھا کہ کوئی کسی کے کام میں مداخلت نہیں کر رہا تھا۔ ایک حویلی میں رہتے ہوئے سب اپنی اپنی ذات کے کمروں میں بند تھے۔

روشن بیگم بھی رسم دنیا نبھانے کو حویلی چلی آئی تھیں۔ چونکہ بستامی کا سگا قریبی رشتے دار صرف چاند ہی تھی اس لیے ان کی بیٹھک اسی کے ساتھ تھی۔ کسی اور نے ان دونوں کی بات چیت میں بیٹھنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ تہمینہ اور زہرہ پھوپھو تو ویسے بھی اب بستامی کو کم کم ہی منہ لگایا کرتی تھیں اور رہی شکیلہ پھوپھو...... وہ اپنی دونوں بہنوں کو دیکھ کر ہی سبق لے چکی تھیں۔ روشن بیگم کی میزبانی کرنے کو صرف چاند امی کمرے میں موجود تھی۔

''ویسے تو لڑکے والے جاتے ہیں لڑکی والوں کے گھر...... لیکن مجھے احساس تھا کہ تم اس بدنام گلی میں قدم نہیں رکھو گی۔ اس لیے میں خود تمہارے پاس چلی آئی ہوں۔'' اپنی میک اپ زدہ آنکھوں سے چاند کو گھورتے ہوئے روشن بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''زندگی اس دوراہے پر لے آئی ہے کہ بھائی کی خوشی کی خاطر میں مینا گلی بھی جا سکتی ہوں۔ مجھے

کوئی اعتراض نہیں......" چاند نے نرم لہجے میں کہا تھا۔

"اس رشتے کا افسوس تمہارے لہجے سے عیاں ہے چاند...... لگتا ہے کہ اس شادی میں تمہاری مرضی شامل نہیں ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔ اور اگر ایسی بات ہے بھی تو بے معنی ہے۔"

"یہ تو بستامی ہے جس نے کومل سے شادی کی ضد پکڑ لی ہے۔ اور بڑھاپے میں میرا سہارا چھین رہا ہے۔ ورنہ میرے نزدیک اس شادی کی ضرورت نہیں تھی۔ تعلق تو ویسے بھی چل رہا تھا۔" روشن بیگم نے سارا ملبہ بستامی پر ڈال دیا تھا۔

"بہتر ہے تعلق کو کوئی ایسا نام مل جائے جو معاشرے میں قابلِ قبول ہو۔"

"میں کہنے آئی تھی کہ میرے معاشی حالات بہت نازک جا رہے ہیں۔ میں کومل کو جہیز دینے سے قاصر ہوں۔" روشن بیگم اصل بات پر آئی تھیں۔ وہ چمڑی جائے دمڑی نہ جائے پر عمل کرنے والی خاتون تھیں۔

"جہیز کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ کا دیا ہمارے پاس بہت کچھ ہے۔ کمرے بھرے ہوئے ہیں۔"

"تم تو جانتی ہو کہ ہم میں شادیاں کرنے کا رواج نہیں ہوتا۔ اس لیے میں نے کومل کے لیے کچھ بھی جوڑا ہوا نہیں تھا۔ میں دو جوڑے میں لڑکی کو رخصت کروں گی۔"

"آپ بتا دیں وہ کیسے کپڑے پہننا پسند کرتی ہے۔ میں تیار کروا دوں گی۔"

"اسے شوخ رنگ پسند ہیں۔ جن پر نفیس کام کیا گیا ہو۔ سونے کے زیورات اسے بہت بھاتے ہیں۔ اور میں چاہتی ہوں کہ تم اس کا کمرا بھی عالی شان تیار کرواؤ۔"

"اپنے طور پر سب بہتر کرنے کی کوشش کروں گی۔ آپ فکر مت کریں۔ کومل کو یہاں کوئی تنگی نہیں ہوگی۔"

"امید کرتی ہوں کہ کومل کے آ جانے سے حویلی میں دو مالکوں والی کیفیت پیدا نہیں ہوگی۔ تم

کومل کے مالکانہ حقوق تسلیم کر لوگی۔تم سمجھ دار ہو۔اتنا تو سمجھتی ہی ہوگی کہ مرحوم باپ کا چھوڑا ہوا کاروبار بھائی اور بھابھی کا ہوتا ہے۔بیٹی کا نہیں۔''

روشن بیگم نے سرسری انداز میں جو بات کی تھی وہ چاند کو اندر تک تپا گئی تھی۔لیکن اس کی مجبوری تھی کہ اسے تحمل کا مظاہرہ کرنا تھا۔

''حیرت ہے۔آپ کبھی خاندان میں نہیں رہیں...... پھر بھی خاندانی روایات جانتی ہیں۔'' چاند نے چوٹ کی تھی۔روشن بیگم پہلو بدل کر رہ گئی تھیں۔''خیر فکر مت کریں۔بستامی کی بیوی ہونے کی حیثیت سے کومل ہی اس گھر کی مالکن ہوگی۔میں بہت جلد خود کو محدود کر لوں گی۔''

''تم ایک سمجھ دار خاتون ہو چاند۔مجھے امید تھی کہ تم سے بات چیت میری الجھن کو ختم کر دے گی۔''

چاند جیسے زبردستی مسکرائی تھی۔

''ایک الجھن اور دور کر دو گی تو احسان سمجھوں گی۔''

''جی...... کہیے!''

''ایمن...... میری بیٹی ہے۔نام سے تو تم واقف ہی ہوگی۔وہ رحبانی کے علاوہ کسی اور کو دیکھنا بھی نہیں چاہتی ہے۔اگر تم رحبانی کو منا لو کہ وہ ایمن سے شادی کر لے تو میں سکون سے مر سکوں گی۔''

''میں...... میں کیسے بات کر سکتی ہوں رحبانی سے......''

''سنا ہے وہ تمہاری ہر بات مانتا تھا۔'' روشن بیگم نے ذو معنی انداز میں کہا تھا۔''کب تک خود کے ساتھ باندھ کر رکھو گی اسے چاند...... اب تو اسے آزاد کر دو۔'' روشن بیگم نے چبھن زدہ بات کی تھی۔

''ایسا کچھ نہیں ہے۔آپ کا اشارہ جس طرف ہے وہ سب ماضی تھا۔''

''کیا تم میری درخواست پر بھی اس سے بات نہیں کر سکتی ہو؟''

''پھر میری بھی ایک التجا ہے۔'' چاند نے کہا تھا تو روشن بیگم نے سوالیہ انداز میں انہیں دیکھا تھا۔

''میرا باپ بہت دین دار آدمی تھا۔ میں نہیں چاہتی کہ قبر میں چلے جانے کے باوجود اس کا محراب داغ دار ہو۔''

''تم کیا کہنا چاہتی ہو چاند......''

''جب جب کومل سے ملنے کو دل کرے آپ اسے اپنے پاس بلوا سکتی ہیں۔ لیکن آپ خود یہاں مت آیئے گا۔ اور نہ ہی مینا گلی سے کوئی اور یہاں آئے۔ یہ میری درخواست ہے آپ سے...... میں دین حویلی کو اس گلی سے جڑتا ہوا نہیں دیکھ سکوں گی۔''

''تم نے پہلی بار کچھ کہا ہے تو ماننا پڑے گا۔'' روشن بیگم نے مسکراتے ہوئے رضامندی دے دی تھی۔ ان کا کام دور بیٹھے ہو سکتا تھا تو کیا ضرورت تھی انہیں یہاں آنے کی۔ وہ ویسے بھی ایسی جگہوں پر جانا پسند نہیں کرتی تھیں جہاں کے مالک ان کی اداؤں کے ماتحت نہ ہوں۔ ''میں یہاں دوبارہ نہیں آؤں گی۔ اور نہ ہی میری طرف سے کوئی اور آئے گا۔''

''بے حد شکریہ......!''

''اب چلتی ہوں۔'' روشن بیگم کھڑی ہوئی تھیں۔ چاند بھی اٹھی تھی۔ روشن بیگم دروازے کی طرف بڑھی تھیں۔ پھر کچھ خیال آنے پر رکی تھیں۔ انہوں نے پلٹ کر چاند کو دیکھا تھا۔

''ویسے...... صندل کیسی ہے؟'' انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔ اور چاند تو جیسے سانس لینا ہی بھول گئی تھی۔

''م...... م...... میں...... مجھے کیا معلوم؟''

''سچ میں......؟ تمہیں نہیں معلوم؟'' وہ مسکرائی تھیں۔ ''بہت مذاق کرتی ہو تم......'' اور قہقہہ سا لگا کر کمرے سے باہر چلی گئی تھیں۔

چاند ای دم سادھے کھڑے انہیں جاتا ہوا دیکھتی رہی تھیں۔

☆......☆......☆

بستامی کی شادی کسی حد تک سادگی سے ہوئی تھی۔ کیونکہ بستامی کسی بات میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ اسے جیسے شادی کا کوئی شوق ہی نہیں تھا۔ وہ شادی ایسے ہی کر رہا تھا جیسے کوئی کاروباری معاہدہ کر رہا ہو۔ شادی کو لے کر اس کے دل میں کوئی جوش نہیں تھا۔ اس نے چاند سے ایک بار بھی کومل کی تیاریوں کے حوالے سے بات نہیں کی تھی۔ اور چاند جس بھی طرح کمرا تیار کروا رہی تھی اسے اس سے بھی کوئی غرض نہیں تھی۔ پھر بھی چاندا اپنے طور پر ہر کام بہترین کرنے کی کوششوں میں لگی ہوئی تھی۔

لڑکیوں کے اصرار پر گھر پر ہی چھوٹی سی مہندی کی رسم کر لی گئی تھی جس میں حاجی بوا نے دل و جان سے ڈھولکی بجائی تھی۔ آج سے پہلے جو بھی شادیاں ہوئی تھیں وہ سب عجیب ماحول میں ہوئی تھیں۔ حاجی بوا کے اندر کا ہنر بستامی کی شادی پر نکل کر آیا تھا۔ انہوں نے اتنے پرانے گانے گائے تھے جن کے بول سن کر لڑکیاں لوٹ پوٹ ہو گئی تھیں۔

اگلے دن بارات تھی جو کہ حویلی کے مکینوں کے علاوہ مزید چند ایک افراد پر مشتمل تھی۔ روشن بیگم نے مینا گلی سے کافی فاصلے پر ایک گھر کو عارضی طور پر لے لیا تھا۔ بارات کا انتظام وہاں ہی کیا گیا تھا۔ کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ چاند بارات کو مینا گلی میں لانے پر دل سے خوش نہیں ہو گی۔ پھر اس شادی پر چاند کو خوش کر دینے کا مطلب تھا ایمن کے لیے دروازے کھولنا۔ اور وہ کومل کے بعد اب چاہتی تھیں کہ ایمن بھی جلد سے جلد رحبانی کے ساتھ بیاہ دی جائے۔

نکاح کے بعد کھانا کھایا گیا تھا اور پھر بجی دھجی کومل کو لے کر سب واپس حویلی پہنچے تھے۔ چاند نے خوش دلی سے کومل کی رسمیں کی تھیں۔ لڑکیاں بھی ہنسی ٹھٹھول کرنے لگی تھیں۔ رات کا پہلا پہر تو اسی میں بیت گیا تھا۔ پھر جب دروازے سے باہر بستامی نے دستک دی تو چاند نے لڑکیوں کو وہاں سے جانے کا کہا تھا اور خود وہ کمرے کے دروازے کے آگے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”لاؤ...... میرا نیگ دو بستامی......“ اس نے اپنا ہاتھ آگے کیا تھا۔

''کس بات کا......؟''بستامی واقعی ہی میں انجان تھا۔

''رسم ہوتی ہے...... دیکھ نہیں رہے میں تمہارا راستہ روکے کھڑی ہوں۔''

''اوہ اچھا......''بستامی نے جیب میں ہاتھ ڈالا تھا اور بہت سے پیسے نکالے تھے۔

''پیسے نہیں چاہئیں۔''

''تو پھر کیا چاہیے؟''

''وعدہ چاہیے......''

''کیسا وعدہ......؟''

''کہ جب جو مانگوں گی دو گے۔''

بستامی چند لمحے چاند کو دیکھتا رہا تھا۔ چاند نے آج عجیب انداز اپنایا ہوا تھا۔ مدتیں ہوئی وہ اس طرح کے لاڈ کرنے کی عادی نہیں رہی تھی۔ بستامی بھی آج الگ موڈ میں تھا۔ پھر چاند نے پہلی بار کچھ مانگا تھا۔ اسے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ وعدہ کرتا ہوں جب جو مانگو گی دوں گا۔''

''وعدے کی یاد کے طور پر اپنی انگوٹھی اتار کر دو۔''

بستامی نے چپ چاپ انگوٹھی اتار کر دے دی تھی۔

''اب تم اندر جا سکتے ہو۔''چاند دروازے کے آگے سے پرے ہو گئی تھی۔ بستامی نے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا تھا۔ چاند انگوٹھی پکڑے خوش تھی۔ اس وعدے کے بدلے وہ صندل کو واپس اس حویلی میں لانا چاہتی تھی۔ اگر اس نے آج موقع شناسی کا فائدہ اٹھا لیا تھا کچھ برا نہیں کیا تھا۔ سچے سے سچا انسان بھی اپنے مطلب کے لیے مطلب پرست بن ہی جاتا ہے۔

''اب تم بہت جلد اس حویلی میں واپس آ جاؤ گی میری جان......''مستقبل کو سوچتے ہوئے چاند خوش تھی۔

☆......☆......☆

صندل کو چھٹا مہینہ لگ گیا تو میر زاد نے اس کے لیے ایک ملازمہ کا انتظام کر دیا۔ وہ اس کے معاملے میں بہت محتاط ہو چکا تھا۔ چونکہ گھر میں ایسے وقت میں کوئی بڑا موجود نہیں تھا اس لیے وہ صندل کا خیال ایسے رکھ رہا تھا جیسے اگر چاند یہاں ہوتی تو رکھتی۔

''اب تم گھر کا کوئی کام مت کرنا۔'' اس نے پیار سے کہا تھا۔

''میں پہلے بھی کوئی کام نہیں کرتی تھی۔ بس تھوڑے بہت......''

''وہ تھوڑے بہت بھی نہ کیا کرو۔ ملازمہ سب دیکھ لے گی۔''

''تو پھر میں سارا دن کیا کروں گی؟'' وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''آرام اور مجھ سے پیار......'' اس نے شوخی سے اس کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ صندل شرما گئی۔

''جو کھانے کو دل کرے، مجھے بتا دینا۔ ہو سکتا ہے کہ کل یا پرسوں میں شہر جاؤں۔''

''چاند امی نے کچھ چیزیں بنا کر بھیجی ہیں۔ وہ بہت ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ مزید بھی بھیج دیں گی۔''

''کیا تم نے چاند امی سے چیزیں بنا کر بھیجنے کو کہا تھا؟''

''ہاں...... ویسے میں نہ بھی کہتی تو انہوں نے خود سے ہی بھیج دینا تھیں۔''

''کہیں حویلی میں کسی کو شک نہ ہو جائے۔''

''بالکل نہیں ہوگا۔ چاند امی نے صرف حاجی بوا کو بتایا ہوا ہے۔ حاجی بوا ہی ارشادی بابا کے پاس آتی جاتی ہیں۔ اور ارشادی بابا ہم تک خط اور چیزیں بھجوا دیتے ہیں۔ نہ تو حاجی بوا کسی کو کچھ بتائیں گی اور نہ ہی ارشادی بابا......''

''ٹھیک ہے۔ جو تمہیں بہتر لگے۔'' میر زاد کہہ کر چپ ہو گیا تھا۔ صندل نے اس کی خاموشی کو محسوس کیا تھا۔ وہ کافی دنوں سے میر زاد کی چپ کو دیکھ رہی تھی۔ شاید اس کی خاموشی کی وجہ اس کی تنہائی

تھی۔رشتوں سے تنہائی......

"میر......ایک بات کہوں؟"

"کہو......!"

"تم زویا آپی سے بات کرنا چاہو تو کر سکتے ہو۔میں بھی تو چاند امی سے رابطے میں ہوں۔"

"چاند امی تم سے ناراض نہیں ہیں۔لیکن زویا آپی مجھ سے سخت ناراض ہوں گی۔"

"تو تم انہیں جا کر منا لو......معافی مانگ لو ان سے......وہ تم سے پیار کرتی ہیں۔تمہیں یاد کرتی ہوں گی۔"

"پتا نہیں یاد کرتی ہوں گی یا بددعائیں دیتی ہوں گی۔"

"ایسے مت کہو......ایک بہن بھائی کو بددعا نہیں دے سکتی ہے۔"

"میں نے ان کے ساتھ برا بھی تو بہت کیا ہے۔"

"تم اتنے دنوں سے ان سے دور بھی تو ہو۔تمہاری جدائی میں وہ تمہاری غلطی فراموش کر چکے ہوں گے۔"

"میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔جو شاید کارآمد ثابت ہو جائے۔"

"وہ کیا ہے؟"

"ہم بچے کی ولادت کے بعد کراچی جائیں گے۔ہم تینوں......مجھے تمہارے ساتھ اور بچے کے ساتھ دیکھ کر زویا آپی یقیناً نرم پڑ جائیں گی اور زوہیب بھائی بھی......ہمارے بچے کو دیکھ کر زویا آپی اسے گود میں لیے بنا نہیں رہ سکیں گی۔"

"کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو میر......بچے کو دیکھ کر سب کے دل پگھل ہی جائیں گے۔"

"اسی لیے میں بچے کی ولادت کا انتظار کر رہا ہوں۔"

''پھر یہ انتظار ہنسی خوشی کا ٹو...... میں روز رات میں دعا کروں گی کہ زندگی ہم پر اپنی آسانی کرے۔ ہمارے ناراض رشتے داروں کے دلوں میں ہمارے لیے نرمی پیدا کرے۔''

''آمین!'' اداسی میں مسکراتے ہوئے میرزاد نے کہا تھا۔

☆......☆......☆

رات میں رینی بول رہی تھی۔ پہاڑی علاقوں میں تو ویسے بھی رینی کی آواز بہت واضح اور دور تک سنائی دیتی ہے۔ انسان کو رات میں بھی تنہا ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔ اور حویلیاں والوں کو تو ویسے بھی تنہا ہونے کا احساس نہیں ہو سکتا تھا۔ سالوں سے دین حویلی سے سنکھ کی آواز ان کی نیندیں خراب کیا کرتی تھی۔ نجانے رحبانی کو رات میں نیند کیوں نہیں آتی تھی۔ وہ تو دن میں بھی کم ہی سوتا ہوا نظر آتا تھا۔ رات میں جاگنے کی عادت اس نے کیسے اپنائی تھی۔

رحبانی کے کمرے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے چاند رک گئی تھی۔ سنکھ کی دکھ بھری آواز نے اس کے قدم روک دیے تھے۔ بہت دنوں کے بعد اسے احساس ہوا تھا کہ رحبانی کی بربادی میں اس کا کتنا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ بہت دنوں سے وہ یہ ہی سوچ رہی تھی کہ اس بربادی کے اثرات کو اب اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد کیسے ختم کیا جا سکتا ہے۔

چاند رحبانی کے کمرے میں آئی تھی۔ پہلے اس نے دستک دی تھی پھر رحبان کا نام پکارتے ہوئے دروازہ کھولا تھا۔ لیکن کمرا خالی تھا۔ رحبان وہاں نہیں تھا۔ وہ یقیناً چھت پر تھا۔ لیکن اس کی گرم چادر کرسی پر ہی پڑی ہوئی تھی۔ چاند نے چادر اٹھالی تھی۔ رات میں اب خنکی بڑھنے لگی تھی۔ رحبانی بنا چادر لیے ہی چھت پر چلا گیا تھا۔ کچھ فکر ہی نہیں رہتی تھی اسے اپنی......

چادر پکڑے چاند چھت پر آئی تھی۔ آگے سے متوقع منظر دیکھنے کو ملا تھا۔ چھت کی چھوٹی دیوار پر وہ ہلکے کپڑے پہنے اندھیرے میں لپٹے دور کے پہاڑوں کو دیکھ رہا تھا۔ چاند نے پیچھے سے جا کر چادر اس

کے کندھوں پر رکھی تھی۔ رحبانی چونکا تھا۔اس نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ پیچھے چاند کھڑی تھی۔

''کیسے ہو رحبان؟'' چاند نے پوچھا تھا۔نجانے یہ سادہ سا سوال بھی ایسے کیوں ادا ہوا تھا کہ جیسے کوئی مجرم اپنے کسی جرم کی معافی مانگ رہا ہو۔

''حیرت ہے۔ آج تم میرے پاس چلی آئی ہو چاند......؟'' رحبانی نے کچھ طنزیہ انداز میں کہا تھا۔وہ رخ بدل کر چاند کی طرف رخ کر کے بیٹھ گیا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ چاند صرف اسے چادر دینے چھت پر نہیں آئی ہو گی۔

''اس میں حیران ہونے والی کیا بات ہے۔ کیا میں تمہارے پاس نہیں آسکتی؟''

''تم تو میری زندگی میں بھی آسکتی تھیں۔ لیکن جو تمہاری مرضی ...... خیر بولو...... کس لیے آئی ہو؟'' پہلے دکھ سے اور پھر سرسری انداز میں رحبانی نے کہا۔

چاند کچھ اور گڑ گئی تھی۔

''ایمن کیسی ہے؟''

''کیا تم سچ میں ایمن کا حال پوچھنے آئی ہو؟''

''ہاں......!''

''یہ بات تو تم کومل سے بھی پوچھ سکتی تھیں۔''

''کومل نے اس کی ظاہری حالت بتائی تھی۔ اندرونی حالت تو تم ہی بتا سکتے ہو۔''

''تمہیں اس سے کیا مطلب چاند......؟''

''روشن بیگم بہت پریشان ہیں رحبانی......'' چاند اصل بات پر آئی تھی۔ رحبانی نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔''وہ چاہتی ہیں کہ تمہاری اور ایمن کی شادی ہو جائے۔''

''انہوں نے خود تم سے ایسا کہا......؟''

''ہاں......اور یہ کام میرے ذمے لگایا ہے۔''

''اور تم نے مہان بنتے ہوئے انہیں رضامندی دے دی ہوگی......'' رحبانی نے طنز کیا تھا۔ چاند اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔ ''اتنا مہان بننے کا شوق کیوں ہے تمہیں چاند......کیا کوئی دیوی بننا چاہتی ہو تم......؟''

''ایسے کیوں بات کر رہے ہو۔ ناراض ہو مجھ سے......؟''

''میں کیوں ناراض ہوں گا تم سے...... ناراض ہونے کے لیے بھی کسی تعلق کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور میری زندگی میں تم کوئی حیثیت نہیں رکھتیں چاند......ایک ذرے کے برابر بھی نہیں......'' چاند کو بے حیثیت کرنے کے لیے وہ اس کی حیثیت مزید بڑھا رہا تھا۔ جتا تو رہا تھا کہ وہ اس سے ناراض نہیں ہے لیکن در حقیقت دل میں بے پناہ نفرت پالے ہوئے تھا۔

''تم ایمن سے شادی کرو گے یا نہیں......؟''

''ہرگز نہیں......''

''پھر ساتھ کیوں ہو اس کے......؟''

''تم پوچھنے والی کون ہوتی ہو چاند......کیا لگتی ہو تم میری......؟ کس حیثیت سے میرے پاس چلی آئی ہو؟ کیا اس حویلی میں تم سے پوچھنے والا کوئی موجود ہے؟ تم نے خود ساری زندگی شادی نہیں کی۔ دین بابا اور بستامی کی بات نہیں مانی......اب تم مجھ سے کیسے باز پرس کر سکتی ہو؟'' رحبانی غصے سے بولتا چلا گیا تھا۔

''میں تو التمش کی بیوہ ہوں۔ اس لیے میں نے دوبارہ شادی نہیں کی...... میں اس کے جتنا کسی کو چاہ نہیں سکتی تھی۔''

''پھر جان لو کہ میں بھی ایمن سے اس لیے شادی نہیں کر رہا کہ اسے اتنا نہیں چاہ سکتا...... جتنا......'' اس نے چاند کو دیکھا تھا۔ ''جتنا ایک وقت میں کسی اور کو چاہا تھا۔''

رحبانی نے کہا تھا۔ کسی حد تک دکھ سے یا شاید نفرت سے...... پھر وہ جلدی سے وہاں سے چلا گیا تھا۔ چاند اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑی اسے جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

☆......☆......☆

چودھویں کی رات کا وہ چاند اماوس ہو چکا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دے رہا تھا۔ پھر پہاڑی علاقوں کی رات...... جہاں قدم قدم پر درخت ہوتے ہیں۔ اتنے گھنے درخت کہ چاند زمین پر بھی اتر آئے تو راستے دکھائی نہ دیں۔ تعبیر کو بھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ بھاگتی جا رہی تھی اور بس بھاگتی جا رہی تھی۔

اس نے گھر سے بھاگنے کے لیے رات کا وقت چنا تھا۔ بہت دنوں سے وہ آج رات کی پلاننگ کر رہی تھی۔ کمال اپنے بیوی بچوں کے پاس گیا ہوا تھا۔ وہ دو تین دن سے پہلے واپس آنے والا نہیں تھا۔ گھر کے مرد ملازم عشاء کی نماز کے بعد سو جایا کرتے تھے۔ چوکیدار جاگتا رہتا تھا۔ لیکن آج اتفاق سے وہ بھی کسی کام سے بڑے شہر گیا ہوا تھا۔ تعبیر کو ایسی ہی کسی صورتِ حال کا انتظار تھا۔ اور اس نے موقع کا فوراً فائدہ اٹھا لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ان بہت سے دنوں میں ملازمہ سے اس نے باتوں باتوں میں سڑکوں کے بارے میں پوچھ لیا تھا کہ کون سی سڑک کہاں جاتی ہے۔ بڑی سڑک کتنی دور ہے۔ اور چھوٹی والی کہاں کہاں جا کر ملتی ہے۔ ملازمہ اسے سب بتاتی گئی تھی اور تعبیر نے اپنے ہی اندازے سے صفحے پر اس جگہ کا ایک نقشہ بنا لیا تھا۔ نقشے کی اصلیت زیادہ اہمیت نہ رکھتی تھی۔ اہم یہ تھا کہ وہ اس فارم ہاؤس سے کیسے نکلتی ہے۔ راستے کہیں نہ کہیں تو جاتے ہی تھے۔ جو یقیناً اسے بھی کہیں پہنچا ہی دیں گے۔

اسے کھانا دے کر ملازمہ بھی اپنے کوارٹر میں سونے کے لیے چلی گئی تھی۔ تعبیر نے دکھاوے کو کھانا کھایا تھا۔ پھر جلدی سے اس نے اپنی دراز میں سے ان چابیوں کو نکال لیا تھا جو اس نے آج دوپہر میں ہی چرائی تھیں۔ موٹی شال اوڑھ کر گربہ پائی سے چلتی ہوئی وہ کمرے سے باہر نکلی تھی اور پھر اس سے بھی زیادہ آہستگی اور احتیاط سے آگے کی کارروائی کی گئی تھی۔ گھر کے دروازے تو کھلے ہوئے ہی تھے۔ باقی جو دروازے لاک تھے تعبیر نے بنا آواز کیے انہیں کھول لیا تھا۔

صدر دروازہ کھول کر جب وہ باہر نکلی تو چند لمحے تک تو اسے یقین ہی نہیں آیا تھا کہ وہ اس دلدل سے باہر آنے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ اس نے گہرا سانس لیا تھا اور پھر راستوں کا تعین کیا تھا۔ اسے سڑک پر نہیں بھاگنا تھا۔ سڑک پر کوئی بھی اسے دیکھ سکتا تھا۔ اس لیے وہ سڑک سے فاصلے پر درختوں اور جھاڑیوں کی اوڑ میں ہوتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ شروع میں اس نے اپنی رفتار کم رکھی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے پیروں تلے آتے خشک پتے بھی اپنی آواز پیدا کریں۔ پھر جب اسے اندازہ ہوا کہ وہ کافی دور نکل آئی ہے تو اس نے بھاگنا شروع کر دیا تھا۔ چونکہ زندگی میں وہ کبھی نہیں بھاگی تھی اس لیے جلد ہی اس کا سانس پھول گیا۔ لیکن آج وہ تھکنے والی نہیں تھی۔ اندھیرے میں وہ بمشکل سب کچھ ٹٹولتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

اس رات گیدڑوں نے بہت شور کیا تھا۔ جھینگر حلق پھاڑ کر چلائے تھے۔ سب جیسے اس قسمت کی ماری ہوئی لڑکی کا ساتھ دے رہے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس کے بھاگنے کی آواز یا اس کی پھولی ہوئی سانسوں کی سرگم کو کوئی سن لے۔ سب نے اسے اس جگہ سے بھاگ جانے میں مدد کی تھی۔ درخت جیسے خود بخود پیچھے ہوتے اس کے لیے راستہ بناتے چلے گئے تھے۔ پگڈنڈیاں اس کے پاؤں میں خود سے چلی آئی تھیں۔ پاؤں تلے کے پتھر نرم گھاس میں بدل گئے تھے۔ پھر بھی وہ جلد تھک گئی تھی۔ اس کے سینے میں درد ہونے لگا تھا۔ ایسے جیسے وہ خشک ہو چکا ہو۔ لیکن اس نے کسی بات کی پروا نہیں کی تھی۔ اسے کسی قیمت پر رکنا نہیں تھا۔ یہ کمال سے نفرت تھی جو اس کی ہمت بندھائے ہوئے تھی۔ اس لیے وہ بس بھاگتی جا رہی تھی۔

اور اسی طرح بھاگتے ہوئے نجانے کیا بات ہوئی تھی کہ تعبیر کو رونا آ گیا تھا۔ اپنی قسمت پر رونا...... وہ اپنی ماں سے ملنے جا رہی تھی۔ کیسا وقت آ گیا تھا اس پر کہ اسے اپنی ماں سے ملنے کے لیے دنوں پلاننگ کرنا پڑی تھی اور رات کے اس اندھیرے میں بھاگنا پڑ رہا تھا۔ وہ خطرے سے جان چھڑوا کر بھاگ رہی تھی۔ لیکن کیا یہ ایک نیا خطرہ نہیں تھا۔ رات کے اس پہر کوئی بھی اسے دبوچ سکتا تھا اور پھر

وہ اس کا کچھ بھی کر سکتا تھا۔اسے جان سے مار سکتا تھایا اس کی عزت سے کھیل سکتا تھا۔

جب اپنے اندازے کے مطابق تعبیر بہت دور نکل آئی تو وہ رک گئی۔اور ایک جگہ پر بیٹھ گئی۔اس نے اپنا سانس درست کیا تھا۔آنسو صاف کیے تھے۔وہ کافی دور نکل آئی تھی اور اتنے راستے گھوم چکی تھی کہ اگر ملازموں کو پتا چل بھی جاتا کہ وہ گھر سے بھاگ چکی ہے تو وہ اسے تلاش نہیں کر سکتے تھے۔

وہ رات بہت لمبی تھی۔جیسے ہفتوں پر چھا گئی ہو۔ٹیلے پر بیٹھے بیٹھے تعبیر نے اپنی پوری زندگی یاد کر لی تھی۔اپنا بچپن، جوانی، شادی اور پھر شادی کے بعد کے دن بھی......وہ نہیں جانتی تھی کہ صندل کہاں تھی لیکن اتنا ضرور جانتی تھی کہ صندل کے حصے کی جہنم کو اس نے سہا تھا۔

فجر کی پہلی اذان اس کے کانوں میں پڑی تھی جب وہ اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔اس نے ہمت مجتمع کی تھی اور اٹھ کر پھر سے بھاگنا شروع کیا تھا۔جب سورج کی ہلکی سی روشنی دھرتی پر پھیلنے لگی تو تب وہ سڑک کے سامنے ہوئی تھی۔اب اسے کوئی دیکھ بھی لیتا تو گھبرانے والی بات نہیں تھی۔وہ بہت دور نکل آئی تھی۔ سڑک پر بہت دیر تک کھڑے رہنے کے بعد اسے دور سے ایک ٹرک اپنی طرف آتا ہوا دکھائی دیا تھا۔وہ سڑک کے بیچوں بیچ کھڑی ہو گئی تھی۔ٹرک اس تک پہنچ کر رکا تھا۔وہ ڈرائیور والی کھڑکی کی طرف گئی تھی۔

"میں بہت مشکل میں ہوں بھائی......میری مدد کر دو۔خدا تمہارا بھلا کرے گا۔"اس نے منت بھرے انداز میں کہا تھا۔ڈرائیور نے سر سے پیر تک اس بدحال لڑکی کو دیکھا تھا۔

"کیا ہوا ہے؟ کیسی مدد چاہیے؟"

"مجھے بس اسٹاپ تک جانا ہے۔جہاں سے ایبٹ آباد یا حویلیاں کی بس مل جائے۔"

"ٹھیک ہے بیٹھ جاؤ......"

"بہت بہت شکریہ......"تعبیر فوراً سے گھوم کر دوسری طرف گئی تھی۔ڈرائیور نے دوسری طرف والا دروازہ کھول دیا تھا۔تعبیر وہاں بیٹھ گئی تھی۔ایک انجان مرد کے ساتھ بیٹھنا خطرناک ہو سکتا تھا۔لیکن

وہ اتنے مہینے ایک خطرناک ماحول میں رہی تھی کہ اب ہر طرح کا خطرہ اسے چھوٹا محسوس ہو رہا تھا۔

کشمیر کی اونچی نیچی سڑکوں پر سفر شروع ہوا تھا۔

"ٹرک میں تازہ سبزیاں ہیں۔ مجھے انہیں لے کر منڈی تک جانا ہے۔ آگے ایک چھوٹا بس اسٹاپ آئے گا۔ وہاں سے آسانی سے ٹیکسی مل جائے گی۔ تم وہاں سے اڈے تک جا سکتی ہو۔ اڈے سے حویلیاں یا ایبٹ آباد کی ویگن مل جائے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں چلی جاؤں گی۔ خدا تمہیں اس کا اجر دے گا۔" تعبیر نے کہا تھا اور پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی تھی۔ بالآخر وہ اس قید سے آزاد ہو گئی تھی۔ باہر کے سرسبز درختوں کو دیکھتے ہوئے اس نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا تھا۔

☆......☆......☆

اس صبح کی بادِ صبا عام دنوں کی نسبت زیادہ ٹھنڈی تھی۔ زیادہ خوش گوار......

یا شاید ویسا تعبیر کو محسوس ہو رہا تھا۔ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے وہ مسلسل مسکرا رہی تھی۔

وہ سفر آدھے گھنٹے تک جاری رہا تھا۔ دن پوری طرح سے نکل آیا تھا۔ لیکن ابھی سڑکوں پر آمد و رفت جاری نہ ہوئی تھی۔ لوگ گھروں میں تو جاگ چکے تھے لیکن ابھی باہر نہ نکلے تھے۔ ٹرک ایک ایسی جگہ پر رکا تھا جہاں ایک بڑا احاطہ تھا اور ایک چھوٹی سی دکان...... اور وہاں تین ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔

"میں باہر جا کر ٹیکسی کا انتظام کرتا ہوں۔" ٹرک ڈرائیور نے تعبیر سے کہا تھا۔ "تب تک تم یہاں ہی رہنا......" اسے تاکید کر کے وہ خود نیچے اتر گیا تھا۔ پہلے وہ دکان کے اندر گیا تھا۔ اس نے شاید وہاں سے اپنے لیے سگریٹ لیا تھا۔ پھر باہر نکل کر سگریٹ پیتے ہوئے وہ باری باری سب ٹیکسی والوں سے بات کرنے لگا تھا۔ ایک سے دوسرے کے پاس جا رہا تھا۔ لیکن شاید بات نہیں بن رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اس کے پاس واپس آیا تھا۔

''کیا ہوا؟''

''بڑے اسٹاپ جانے کو کوئی تیار نہیں ہے۔''

''لیکن کیوں......؟''

''وہاں جاؤ تو سو روپے کی پرچی کٹوانی پڑتی ہے۔ اس لیے وہاں جانے کے لیے کوئی تیار نہیں ہو رہا ہے۔''

''میں پرچی کے پیسے دے دوں گی۔'' تعبیر نے اپنی سونے کی انگوٹھی اتار کر ڈرائیور کے آگے کی تھی۔ ٹرک ڈرائیور نے چند لمحے انگوٹھی کو دیکھا تھا۔

''اسے تم اپنے پاس رکھو...... کوئی نیا ٹیکسی والا آتا ہے تو میں دیکھتا ہوں۔'' وہ کہہ کر پھر سے چلا گیا تھا۔

تعبیر بے چین ہونے لگی تھی۔ دن نکل آیا تھا۔ کہیں کوئی اسے دیکھ نہ لے۔ اور دیکھ کر پہچان نہ لے۔ کمال کے ملازم یقیناً اب تک اسے تلاش کرنے کے لیے نکل چکے ہوں گے اور بس اسٹاپ تک آنا تو ان کی پہلی ترجیح ہو گا۔

''ایک ٹیکسی والا جانے کے لیے تیار ہو گیا ہے۔ وہ دکان کے اندر ناشتا کر رہا ہے۔ ناشتے کے بعد تمہیں لے جائے گا۔ تم اندر چلی جاؤ...... مجھے منڈی جانا ہے۔ دیر ہو رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ تمہارا بہت بہت شکریہ بھائی......''

''کوئی بات نہیں......''

تعبیر نیچے اتر آئی تھی۔ ٹرک ڈرائیور واپس اپنی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس نے تعبیر کو ایک نظر دیکھا تھا پھر اپنا ٹرک اسٹارٹ کیا تھا اور آگے بڑھ گیا تھا۔

تعبیر دکان کے اندر گئی تھی۔ جہاں دو ایک ٹیبل لگے ہوئے تھے۔ ایک آدمی ٹیبل پر بیٹھا ہوا تھا۔

"کتنی دیر لگے گی بھائی......؟" اس نے آدمی کی پشت پر پہنچ کر اس سے کہا تھا۔ آدمی نے اٹھتے ہوئے رخ تعبیر کی طرف کیا تھا اور پورا کشمیر تعبیر کے پیروں تلے سے نکل گیا تھا۔ کاؤنٹر والے آدمی نے جلدی سے آگے بڑھ کر دکان کا دروازہ لاک کر دیا تھا۔ وہ ایسا نہ بھی کرتا تو تعبیر میں کہاں ہمت رہی تھی کہ وہ وہاں سے بھاگ سکتی۔

کمال غضب ناک نظروں سے تعبیر کو دیکھ رہا تھا۔ اور پھر اگلے ہی پل اس نے زوردار طمانچہ تعبیر کے منہ پر دے مارا تھا۔



ناول تاش گھر ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 15 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 23

روشن بیگم سے کہی گئی اپنی بات کے مطابق چاند اب دن بدن خود کو محدود کر رہی تھی۔ تہمینہ پھوپھو نے انہیں سمجھایا تھا کہ یہ حویلی جس قدر بستامی کی ہے، اتنی ہی چاند کی بھی ہے۔ اور کپڑے کے کاروبار کا خیال چاند کا تھا اور ساری محنت اسی نے کی تھی۔ بستامی اور رحبانی نے تو باہر کے معاملات دیکھے ہیں بس...... وہ بھی اتنی لاپروائی سے کہ دین بابا کی موت کے بعد نقصان ہی نقصان ہوا ہے۔ لیکن چاند نے کہا تھا کہ اسے اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ کاروبار میں کس نے کتنی زیادہ محنت کی ہے۔ وہ بنا کسی بدمزگی کے سب کچھ کومل کو سونپ دینا چاہتی تھی۔

چاند کومل کو کچن اور کارخانے کے بارے میں بتاتی رہتی تھی۔ اس طرح سے کہ کومل کو یہ سب بوجھ بھی نہ لگے اور وہ سب کچھ آسانی کے ساتھ سنبھال بھی لے۔ کتنے ملازم ہیں، کیسے کام لینا ہے، تنخواہ کا حساب کتاب، منڈی اور کپڑے کا حساب کتاب، ایک جوڑا کتنے دن میں تیار ہو جانا چاہیے۔ ملازموں کے لیے کیا کیا کھانا بنتا ہے۔ کب کب چھٹی دینی ہے۔ اور سال کے اختتام تک کس کس کا حساب کرنا ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ گھر کے معاملات...... مہمانوں کی خاطر تواضع، نیاز، پورے سال کا اناج ذخیرہ کرنا وغیرہ وغیرہ...... کومل سب سنتی تھی لیکن کسی بات میں دلچسپی ظاہر نہیں کرتی تھی۔ وہ چاند کی باتیں بے دلی سے سنا کرتی تھی۔ اسے دولت سے تو غرض تھی لیکن اس سب سے نہیں جو چاند اسے بتا رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ محنت کر کے کھانا کیا ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک ساری قیمت اداؤں کی تھی جو اسے اچھی

خاصی مل جایا کرتی تھی۔

چاند یہ ہی سمجھے ہوئے تھی کہ کومل کبھی خاندانی گھر میں نہیں رہی ہے اس لیے اب یہ سب سمجھنا اسے مشکل لگ رہا ہے۔ جبکہ درحقیقت چاند کی باتیں سنتے ہوئے کومل چاند کے لیے ترس محسوس کیا کرتی تھی۔ کن الجھنوں میں الجھایا ہوا تھا چاند نے خود کو...... گھر داری، ملازم، کپڑا، کارخانہ...... جبکہ ان کاموں کے لیے آرام سے ایک مینیجر رکھا جا سکتا تھا۔ جو خود ہی سب اچھے سے سنبھال سکتا تھا۔ کیا عورت اس لیے بنی ہے کہ اپنی زندگی ان سب کاموں میں برباد کر دے۔ چاند کو دیکھ کر اسے الجھن ہوا کرتی تھی جس نے اپنی جوانی اپنے مر چکے منگیتر کی خاطر ضائع کر لی تھی۔ کومل کے نزدیک یہ حماقت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ زندگی کی قیمت کا اندازہ اسے روشن بیگم کو دیکھ کر ہوتا تھا جو بڑی سے بڑی پریشانی کو کبھی خود پر اس لیے سوار نہیں کیا کرتی تھیں کہ کہیں ان کا حسن نہ مرجھا جائے۔ اور ایک یہ چاند تھی جس نے حسن کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی بھی پژمردہ کر لی تھی۔

کومل کو تو تب بھی شدید حیرت ہوئی تھی جب اس نے لڑکیوں کو سردیوں کے لیے پنیاں اور پنجیری بناتے دیکھ لیا تھا۔ اف! جب بازار سے ہر چیز مل جاتی ہے تو کیا ضرورت ہے گھر پر خواری اٹھانے کی۔ اسے تو لڑکیاں اپنے سوٹوں پر کڑھائی کرتے، بیل بوٹے بناتے اور اپنے کپڑوں کو رنگ دیتے دوسری ہی دنیا کی مخلوق لگا کرتی تھیں۔ انہی باتوں کا اظہار اس نے ایک روز لڑکیوں سے بھی کیا تھا۔

"ایسے کام لڑکیوں سے ان کی نزاکتیں چھین لیتے ہیں میری جان......" ایک دن اس نے سب کو پاس بٹھا کر پیار سے کہا تھا۔ کومل میں نجانے کیا بات تھی کہ لڑکیوں کو اس سے باتیں کرنا اچھا لگتا تھا۔ کومل کی باتوں میں انہیں تازہ ہوا کا جھونکا محسوس ہوتا تھا جو مدتوں سے حویلی کی بند فضا میں کسی اور طرف سے وارد نہ ہوا تھا۔

"تو پھر لڑکیوں کو کیا کرنا چاہیے؟" روشانے نے پوچھا تھا۔

''صرف اور صرف اپنے حسن پر توجہ دینی چاہیے۔'' کومل نے اتراتے ہوئے کہا تھا۔ باتیں کرتے ہوئے اس کے ہاتھوں کے کنگن بج اٹھتے تھے۔ لڑکیوں نے ایسے کردار بس فلموں میں دیکھے تھے۔ اب جب بنی ٹھنی ہیروئن ان کے سامنے آ بیٹھی تھی تو وہ اس سے متاثر ہوئے بنا کیسے رہ سکتی تھیں۔ لڑکیوں نے ایک دوجے کی طرف دیکھا تھا۔ کومل کی بات نئی تھی۔ ایسی باتیں ان کی ماؤں نے انہیں آج تک نہ کی تھیں۔

''گھر داری اچھی بات ہے لیکن جب اللہ نے ہمیں دولت دی ہے کہ ہم ملازم رکھ سکیں جو ہمارے گھر کو سنبھال سکیں تو کیوں نہ سب کام انہی کے سپرد کر دیں۔''

''سب کام ملازم کریں گے تو پھر ہم سارا دن کیا کریں گے؟''

''بھئی خود پر توجہ دو...... اپنے بال دیکھو سب...... کیسے اجڑے ہوئے لگتے ہیں۔ لباس دیکھو اپنا...... کتنے پرانے فیشن کا ہے۔ ایسے کپڑے تو ڈھونڈنے سے بھی نہ ملیں اب......'' کومل نے کہا تھا۔

لڑکیوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے لباس کو دیکھا تھا۔ کومل کی باتیں نجانے کیوں انہیں حرف بہ حرف سچ لگی تھیں۔ دو ایک نے اپنے بالوں کو بھی چھوا تھا۔ کومل کی زلفوں کے آگے تو ان کے بال گھونسلا تھے۔ سالوں سے بنتی آ رہی چٹیا انہیں ایک دم سے ہی بری لگنے لگی تھی۔

''ویسے تم لوگ کپڑے کہاں سے سلواتی ہو؟''

''چاند امی سی دیتی ہیں یا ہماری اپنی امی......''

سارہ نے بتایا تو کومل نے کوفت سے گہرا سانس لیا تھا۔

''ایک تو نجانے کیوں تم لوگ چاند پر نربھر کرتے ہو۔ بھئی وہ پرانے زمانے کی روح ہے۔ آج کے دور کے تقاضوں کو نہیں سمجھ سکتی ہے......'' کومل نے چاند کا مذاق بنایا تو سب کو ہنسی آ گئی۔ ''میں یہ نہیں کہہ رہی کہ اپنا جسم دکھاؤ...... لیکن کھلے ڈلے کپڑوں پر بھی جدت لائی جا سکتی ہے۔''

"جی...... دیکھا ہے ہم نے آپ کے کپڑوں پر......"

"میرے کپڑے تو شروع سے ماسٹر جی سیتے ہیں۔"

"ہمارے ہاں ماسٹر سے کپڑے سلوانے کا تصور نہیں......"

"اس لیے تم سب اپنی ماؤں کی بیٹیاں لگنے کے بجائے ان کی بہنیں لگتی ہو۔" کومل نے کہا تو نجانے کیوں سب کو شرمندگی ہوئی تھی۔ اور انہیں احساس ہوا تھا کہ ایسا ہی ہے۔ وہ اپنی ماؤں کی بیٹی کم، اور بہن زیادہ لگتی ہیں۔

"اگر تم کہو تو آج کے بعد تمہارے کپڑوں کی سلائی میں کروا دیا کروں گی۔"

"کیا سچ میں کومل آنٹی؟" لڑکیاں تو نہال ہی ہو گئی تھیں۔ خاص طور پر کرن......

"ہاں کیوں نہیں...... شوق سے۔ بس اپنی امیوں کو سمجھانا تمہارا کام ہے۔"

"اس کی آپ فکر مت کریں۔" زارا نے جی داری سے کہا تھا۔

"اور اس حویلی کا ماحول کتنا بورنگ ہے۔ کیا حویلی میں کوئی گیٹ ٹو گیدر نہیں ہوتی؟"

"وہ کیا ہوتا ہے؟"

"مطلب لوگوں کا آنا جانا، ملنا...... کھانا پینا...... ہنسی، مذاق، شور شرابا......"

"نہیں...... ایسا تو کچھ نہیں ہوتا ہے یہاں پر۔"

"لگتا ہے تم سب پاکستان بننے سے پہلے کے ماحول میں جی رہی ہو۔ کیا تمہارا کوئی سوشل سرکل نہیں ہے؟"

"سوشل سرکل؟" لڑکیوں نے سوالیہ انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔

"تمہاری کوئی سہیلیاں بھی نہیں ہیں کیا؟"

"ہیں نا...... بہت سی ہیں۔ لیکن گھر پر کم کم ہی آتی ہیں۔"

"تو ان کو بلاؤ...... ہم گھر پر ایک گیٹ ٹو گیدر کا اہتمام کرتے ہیں۔ تم اپنی تمام سہیلیوں کو بلاؤ۔ ہم اچھے اچھے کھانے بنوائیں گے۔ خوب ہلا گلا کریں گے۔ اس شام کے لیے بہترین کپڑے بنوائیں گے۔ کیا خیال ہے؟"

"خیال تو اچھا ہے۔ لیکن مانے گا کون......؟"

"اعتراض کون کرے گا؟"

"کوئی بھی کر سکتا ہے۔ چاند امی......"

"وہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ اب اس حویلی کی مالکن میں ہوں۔ چاند نہیں...... یہاں وہی سب کچھ ہو گا جیسا میں چاہوں گی۔ بس تمہیں میرا ساتھ دینا ہو گا۔" کومل نے کہتے ہوئے سب کی طرف دیکھا تھا۔

لڑکیوں نے مسکراتے ہوئے ہاں میں سر ہلا دیا تھا۔

نادان لڑکیاں نہیں جانتی تھیں کہ جسے وہ تازہ ہوا کا جھونکا سمجھ رہی ہیں، وہ انہیں کنوئیں کی دم گھوٹ فضا میں دھکیلنے کے ارادے رکھتی ہے۔

☆......☆......☆

شام کی اوس میں آنسوؤں کی تراوٹ تھی۔ ایسے جیسے آسمان رو رہا ہو۔ زمین میں ارتعاش تھا۔ جیسے دھرتی سینہ کوبی کر رہی ہو۔ اور نرم گداز قالین کی بنت میں تعبیر کی آنکھوں سے نکلتے آنسو جذب ہو رہے تھے۔ ہچکیوں کے باعث قالین کا رواں اس کے نتھنوں میں گھس رہا تھا۔ اور اس کا سانس گھٹ رہا تھا۔ اس کا سارا جسم کسی زخم کی طرح درد کر رہا تھا۔ ایسے جیسے کسی نے اسے خاردار تاروں پر ننگے بدن سے گھسیٹا ہو۔ شاید گھسیٹ لیتا تو اسے اتنا درد نہ ہوتا...... جتنا اپنی شکست کا ہو رہا تھا۔ اس کی کمر سے قطروں کی شکل میں خون رس رہا تھا۔ اور اس کی روح کو گھائل کر رہا تھا۔

بس اسٹاپ پر ایک طمانچہ تعبیر کے منہ پر مارنے کے بعد کمال نے اگلے ہی پل اسے بالوں سے

دبوچ لیا تھا۔ تعبیر نے ایک آہ بھری تھی۔ کمال کے ہاتھ کی گرفت مضبوط نہ بھی ہوتی تو وہ بھاگنے کا تردد نہیں کر سکتی تھی۔ اتنی دور بھاگ کر آنے سے وہ خود کو کمال کی دسترس سے بچا نہیں سکی تھی۔ اس لیے اب مزید بھاگنا بے کار تھا۔

''یہ سارا علاقہ میرا ہے۔ یہ سارے لوگ...... جو چل پھر رہے ہیں۔ انہیں میرا ملازم ہی سمجھو۔ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ تم یہاں سے بھاگ سکتی ہو۔'' کمال نے کہا تھا۔

اگر وہ نہ بھی کہتا تو اب تعبیر سمجھ گئی تھی کہ اس کے لیے یہاں سے بھاگ جانا ایک خواب کے سوا کچھ نہیں...... ایسا خواب جس کی تعبیر ہمیشہ الٹ ہوتی ہے۔

اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے کمال دکان سے باہر آیا تھا۔ باہر موجود تینوں ٹیکسی ڈرائیور اپنی اپنی ٹیکسیوں سے باہر نکل آئے تھے اور تعبیر کو دیکھنے لگے تھے۔ کمال نے ایک ٹیکسی کا دروازہ کھول کر اسے اندر پٹخا تھا اور خود اس کے برابر بیٹھ گیا تھا۔

صبح ہو جانے کے باوجود تعبیر کی آنکھوں میں رات اتر آئی تھی۔ یہ ایسی بھیانک رات تھی جو مدتوں چلنے والی تھی۔ شاید اس کی آخری سانس تک...... وہ ساری محنت جو اس نے اس چنگل سے بھاگ جانے کے لیے کی تھی، اس کی تھکن اس پر اب سوار ہوئی تھی۔ اس کے پیروں کے چھالے اب درد کرنے لگے تھے۔ نوک دار جھاڑیوں کی چبھن کا احساس اسے اب ہوا تھا۔

ٹیکسی کمال کے فارم ہاؤس کے باہر رکی تھی۔ بالوں سے پکڑے پکڑے ہی کمال اسے کھینچ کر اندر فارم ہاؤس میں لایا تھا۔ اور اسے قالین پر پٹخ دیا تھا۔ تعبیر نے بالکل بھی مزاحمت نہیں کی تھی۔ مزاحمت کرنے کے لیے ہمت چاہیے جو اب اس کے اندر سالوں نہیں پیدا ہونے والی تھی۔

''حاجرہ...... رقیہ......!'' کمال نے گرجدار آواز میں دونوں ملازماؤں کو آواز دی تھی۔ اگلے ہی پل وہ دونوں کسی جن کی طرح وہاں حاضر ہوئی تھیں۔

''اسے الٹا کر کے اس کے ہاتھ اور پاؤں اس طرح سے پکڑو کہ یہ ہلنے نہ پائے۔'' کمال نے حکم دیا تھا۔ سن کر تعبیر کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔

''کمال! آپ کیا کرنے والے ہیں؟'' وہ اتنا ڈر گئی تھی کہ کانپنے لگی تھی۔

''جو حرکت تم نے کی ہے، اس کا سبق سکھانا ضروری ہے۔'' کمال نے کہہ کر ملازماؤں کو اشارہ دیا تھا۔ انہوں نے ویسا ہی کیا تھا جیسا کمال نے انہیں کرنے کو کہا تھا۔ تعبیر زور آزمائی کرنے لگی تھی۔

''ایسا مت کریں کمال...... پلیز...... خدا کا واسطہ ہے۔'' وہ چلا رہی تھی۔

ہٹی کٹی ملازماؤں نے اسے سختی سے تھام لیا تھا۔ ایک نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے تھے اور دوسری نے اس کے دونوں پاؤں...... وہ ہل جل کرنے سے قاصر تھی۔ کمال نے اپنی دراز کھول کر اندر سے اپنی ایک چمڑے کی بیلٹ نکالی تھی۔ تعبیر آنکھیں پھاڑے سب دیکھ رہی تھی۔ اگلے ہی پل بیلٹ کی ضرب تعبیر کو اپنی کمر پر محسوس ہوئی تھی۔ شدید ترین درد سے اس نے اتنی بلند چیخ ماری تھی کہ فارم ہاؤس کے در و دیوار دہل کر رہ گئے تھے۔ لیکن کمال پر کسی چیز کا اثر نہیں ہوا تھا۔ لمحے بھر کا وقفہ ڈالے بنا اس نے پھر سے بیلٹ کا وار کیا تھا۔

''کمال......! خدا کے لیے ایسا نہ کریں۔'' درد سے کراہتے ہوئے وہ رونے لگی تھی۔ لیکن کمال غصے سے پاگل ہو چکا تھا۔

''جب تک میں نہ کہوں، اسے چھوڑنا نہیں ہے۔'' اس نے ملازمہ سے کہا تھا۔ اور پھر کمال تھا، اس کی بیلٹ اور تعبیر کی چیخیں...... جو پورے فارم ہاؤس میں گونجتی رہی تھیں۔

''مجھے معاف کر دیں کمال...... مجھے معاف کر دیں۔'' روتے ہوئے تعبیر نے معافی مانگ لی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ انا پرست کمال پر معافی کے الفاظ ہی کچھ اثر ڈال سکتے ہیں۔ کمال کے ہاتھ رک گئے تھے۔ ''میں وعدہ کرتی ہوں کہ دوبارہ ایسا کبھی نہیں کروں گی۔ میں قسم کھاتی ہوں۔''

''دوبارہ ایسی حرکت کی تو بھوکے کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔'' کمال نے غراتے ہوئے کہا تھا اور پھر غصے سے بیلٹ اس کے وجود پر پھینکی تھی۔

''دھیان رکھنا اس کا...... کل تک نہ تو یہ پانی پینے پائے اور نہ ہی کچھ کھا سکے۔'' اس نے ملازماؤں کو ہدایت دی تھی اور خود وہاں سے باہر چلا گیا تھا۔ ملازمہ نے اسے چھوڑ دیا تھا اور وہاں سے چلی گئی تھی۔ تعبیر پیٹ کے بل قالین پر ہی لیٹی رہی تھی۔ وہ جو کب سے رو رہی تھی۔ ایک بار پھر سے رونا شروع ہو گئی تھی۔

شام کی اوس میں آنسوؤں کی تراوٹ تھی۔ ایسے جیسے آسمان رو رہا ہو۔ زمین میں ارتعاش تھا۔ جیسے دھرتی سینہ کوبی کر رہی ہو۔ اور نرم گداز قالین کی بنت میں تعبیر کی آنکھوں سے نکلتے آنسو جذب ہو رہے تھے۔



چاند پچھلے کافی دنوں سے پریشان تھی۔ کہنے کو تو کوئی بات نہیں تھی لیکن محسوس کرنے کو بہت کچھ تھا۔ اس کی پریشانی کی وجہ کومل تھی۔ جس نے ساری لڑکیوں کو اپنے پیچھے لگا لیا تھا۔ لڑکیاں سارا سارا دن کومل کے کمرے میں گھس کر میک اپ کرتی رہتی تھیں۔ اس کے کپڑے دیکھتی رہتی تھیں۔ نجانے کس کس طرح کی باتیں کرتی رہتی تھیں۔ بستامی نے وی سی آر لا دیا تھا جس پر روز ایک نئی فلم دیکھنا لڑکیوں کا معمول بن گیا تھا۔ چاند کو سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ کس بات پر اعتراض کرے۔ لڑکیوں کو کومل سے کس حوالے سے میل جول بڑھانے سے منع کرے۔ اگر کوئی لڑکی منہ بھر کر یہ کہہ دیتی کہ وہ خود ہی تو کومل کو بیاہ کر اس گھر میں لائی ہیں تو کیا جواب تھا اس کے پاس دینے کے لیے...... اس ساری صورت حال پر تہمینہ، شکیلہ اور زہرہ پھوپھو بھی تشویش کا شکار تھیں لیکن وہ بھی چاند کی طرح کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔

پھر ایک دن تو چاند حیران رہ گئی تھی۔ جب اس نے لڑکیوں کو کومل کے ساتھ تاش کھیلتے ہوئے

دیکھ لیا تھا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' وہ غصہ ہونے سے زیادہ حیران تھی۔

''کیا ہوا ہے چاند...... بس کھیل ہی تو کھیل رہے ہیں۔ تم تو ایسے حیران ہو رہی ہو جیسے ہم سب کوئی جوا کھیل رہی ہوں۔'' کومل نے کہا تھا اور سب لڑکیاں کومل کی بات پر ہنسنے لگی تھیں۔ چاند شرمندہ ہو گئی تھی۔ لڑکیاں اب ڈھکے چھپے انداز میں کہنے لگی تھیں کہ انہیں کچھ آزادی چاہیے۔ اس ساری صورت حال نے چاند کو بہت پریشان کر دیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اب جلد سے جلد لڑکیوں کی شادیاں ہو جائیں۔

آج کل گھر میں کسی پارٹی کی تیاری ہو رہی تھی۔ لڑکیوں نے کہا تھا کہ وہ اپنی سہیلیوں کو حویلی میں مدعو کرنا چاہتی ہیں۔ کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے یہ ساری صورت حال عجیب تر ہوتی چلی گئی تھی۔ لڑکیاں نیا لباس بنوا رہی تھیں اور اس کام کے لیے کومل کے ساتھ ایبٹ آباد کے بازار جانے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ اس سے پہلے آج تک ایسا نہیں ہوا تھا۔ لڑکیوں نے اپنا لباس اپنی ماں کی پسند سے لیا تھا یا چاند نے جو بنا دیا، وہ پہن لیا تھا۔ لیکن اس بار سب کا بیان مشترکہ تھا۔

''آپ کی چوائس بہت اولڈ ہو چکی ہے چاند امی...... ہم کچھ نیا لینا چاہتی ہیں۔ پھر ویسے بھی اڈے کے کام والے سوٹ پہن پہن کر تھک چکی ہیں۔ کومل آنٹی نے کہا ہے کہ وہ ایبٹ آباد سے ایسے جوڑے لے کر دیں گی کہ حویلیاں والوں نے آج تک ویسے نہیں دیکھے ہوں گے۔'' لڑکیوں نے سادہ سے انداز میں اپنا موقف دیا تھا۔ بات کچھ خاص نہیں تھی۔ لیکن چاند کے اندر جیسے کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ ایسے جیسے اس سے اس کی خاص چیزیں کوئی چھین رہا ہو۔ ایسی تربیت تو نہیں ہوئی تھی لڑکیوں کی کہ وہ کسی کو جلانے کے لیے بناؤ سنگھار کریں۔

لڑکیاں کومل کے ساتھ ایبٹ آباد کا کہہ کر پنڈی کے بڑے بازار چلی گئی تھیں۔ انہوں نے کومل کی پسند سے خریداری کی تھی اور کومل کے ماسٹر درزی سے ہی سوٹ سلوائے تھے۔ ماسٹر جی حویلی آ کر سب

لڑکیوں کے ناپ لے گئے تھے۔اور کومل نے ان سے کہہ دیا تھا کہ اس ناپ کو نوٹ کرلیں۔اب لڑکیوں کے کپڑے انہی کے پاس سے سلا کریں گے۔

پارٹی سے ایک دو روز پہلے چاند نے پوچھا تھا کہ کھانا کیا بنوانا ہے۔جس پر لڑکیوں نے کچھ ایسی چیزوں کے نام لیے تھے جو چاند کے لیے نئی تھیں۔

''یہ سب بنائے گا کون......؟ کچن کے ملازم تو شاید نہ بنا سکیں۔''

''میرے گھر سے باورچی آئے گا۔وہ بنا دے گا۔'' کومل نے کہا تھا۔چاند اس کو دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔

''تم گھر کے معاملات میں ضرورت سے زیادہ مداخلت کر رہی ہو کومل......''

''میں گھر کے معاملات کو درست کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔میں یہاں کی باسی فضا کو بدلنے کی کوشش کر رہی ہوں۔''

''لیکن اس کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔''

''تمہاری بات کون کر رہا ہے چاند......تم تو شاید پیدا ہی بڑھاپا لے کر ہوئی تھی۔میں لڑکیوں کی بات کر رہی ہوں۔دیکھ نہیں رہی کہ وہ میرے ساتھ کس قدر خوش رہتی ہیں۔تم ہر وقت لڑکیوں کے اعصاب پر سوار رہنا بند کر دو چاند......تم انہیں اپنے جیسا بنانا چاہ رہی ہو۔انہیں وہ کرنے دو جو وہ کرنا چاہتی ہیں۔''

''میں نے انہیں کچھ کرنے سے روکا نہیں ہے۔''

''تم ان کی عمر کی نہیں ہو۔ان کے مشاغل الگ ہیں۔تم چاہتی ہو کہ وہ بڑے بوڑھوں کی طرح زندگی گزاریں۔''

''ایسا ہرگز نہیں ہے۔''

''پھر ان کے معاملات میں تم مداخلت کرنا بند کر دو۔''

چاند چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔وہ کومل سے مزید بحث نہیں کرنا چاہتی تھی۔جانتی

تھی کہ پانی اب پلوں کے نیچے سے گزر چکا ہے۔ کومل کی باتوں میں کہیں نہ کہیں لڑکیاں ہی بول رہی تھیں۔ چاند کا الجھنا بے کار تھا۔



۱۹۷۵ء

سردیاں پوری طرح سے رخصت ہو چکی تھیں اور بہار اپنے جوبن پر تھی۔ درختوں پودوں کے پرانے پتے جھڑ چکے تھے اور اب ان کے اوپر خوش نما رنگ پتے، تازہ بھور اور پھولوں کی نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ ٹھنڈیانی چونکہ ہمالیہ کے پہاڑی سلسلوں کی شروعات کہلاتا ہے، اس لیے وہاں سردیاں بس دن میں ہی ختم ہوتی ہیں۔ بے شمار درختوں کی وجہ سے راتیں سردیوں کی راتوں کی طرح ہی ٹھنڈی محسوس ہوتی ہیں۔

بہار کے انہی جوبن کے دنوں میں صندل کے گھر ایک پیاری سی بیٹی نے جنم لیا تھا۔ علاقے کی دایہ کے ہاتھوں بچی کی پیدائش ہوئی تھی اور سب کچھ بنا کسی پیچیدگی کے آرام دہ طریقہ سے ہو گیا تھا جبکہ زچگی سے پہلے تک صندل بہت ڈری ہوئی تھی۔ وہ اپنے گرد میر زاد کے علاوہ چاند امی کا ساتھ بھی چاہتی تھی۔ لیکن چاند امی کا وہاں موجود ہونا ناممکنات میں سے تھا۔ صندل کو پہلی بار اتنے عرصے کے بعد چاند امی کی کمی کا شدت سے احساس ہوا تھا۔ بچی کی پیدائش کے قریب کے دنوں میں وہ میر زاد سے چھپ کر بے آواز روتی رہی تھی۔ ساتھ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ایسے وقت میں صبر کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے اس نے صبر سے کام لیتے ہوئے اس وقت کو برداشت کیا تھا۔ علاقے کی دایہ اور اس کی بہو نے اس کی ہر طرح سے دل جوئی کی تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ ایک عورت کے لیے یہ سب کس قدر تکلیف دہ ہوتا ہے۔ جب اس کا کوئی اپنا اس کے پاس نہ ہو۔

میر زاد کمرے سے باہر صحن میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ جب دایہ اس کے پاس آئی تھی۔

"مبارک ہو، بیٹی ہوئی ہے۔" دایہ نے اسے بتایا تھا اور بے پناہ خوشی اس کے چہرے سے جھلکنے لگی تھی۔

''صندل کیسی ہے؟''

''وہ ٹھیک ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد تم اس سے مل سکتے ہو۔''

دایہ کہہ کر پھر سے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اور یہ تھوڑا سا وقت میرزاد کے لیے بہت طویل ثابت ہوا تھا۔ دایہ اور اس کی بہو اپنے پیسے لے کر چلی گئیں تو وہ کمرے میں گیا تھا۔ صندل بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی اور میرزاد کو دیکھتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے پہلے صندل کے ماتھے پر ایک بوسہ دیا تھا اور پھر لڑکی کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

''یہ تو بالکل تم جیسی ہے۔'' میرزاد نے کہا تھا۔ صندل مسکرائی تھی۔

''اتنی جلدی کیسے کہہ سکتے ہو تم...... ابھی تو بچی بہت شکلیں بدلے گی۔''

''پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ یہ بالکل تمہارے جیسی ہو، میں اپنی زندگی میں دو صندل چاہتا ہوں۔'' میرزاد نے پیار سے کہا تھا۔ دو آنسو صندل کی آنکھوں سے جاری ہو گئے تھے۔

''تم رو کیوں رہی ہو؟''

''یہ خوشی کے آنسو ہیں۔''

میرزاد نے پیار سے اس کی آنکھوں کے آنسوؤں کو صاف کیا تھا۔

''میں نہیں چاہتا کہ تم خوشی میں بھی آنسو بہاؤ......'' اس نے توقف کیا تھا۔ پھر کچھ یاد آنے پر کہا تھا۔

''ہم اس کا کیا نام رکھیں گے؟''

''میں چاہتی ہوں کہ اس کا نام چاندامی رکھیں۔ اگر تم اجازت دے دو۔''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' میرزاد نے کہا تھا۔ پھر کچھ خیال آنے پر اٹھا تھا۔ ''میں تمہارے لیے کچھ کھانے کو لاتا ہوں۔ دائی نے کہا تھا کہ تمہیں یخنی پلا دوں۔''

''کیا تم بنا لو گے؟''

"اتنا بھی پھوہڑ نہیں ہوں میں......" کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔

صندل بے تاثر چہرہ لیے چھت کو دیکھنے لگی تھی۔ نجانے کیوں اسے اپنی پیدائش کا وقت یاد آ گیا تھا۔ اسے تب ہوش نہیں تھی لیکن وہ سمجھ سکتی تھی کہ اس کی پیدائش کے بعد کیا ہوا ہوگا۔ گھر کا کوئی فرد بھی خوش نہیں ہوا ہوگا۔ شاید وہ لوگ بیٹا چاہتے ہوں گے۔ تب ہی تو بیٹی کو انہوں نے ایک غیر ضروری چیز سمجھ کر کسی کی دہلیز پر چھوڑ دیا تھا۔ ورنہ اپنے لخت جگر کے تو پرانے کپڑے بھی انسان کا باہر پھینکنے کو دل نہیں کرتا ہے۔

"تمہارے نصیب مجھ جیسے نہیں ہوں گے میری بچی...... تمہارے اردگرد ہمیشہ پیار کرنے والے لوگ موجود رہیں گے۔" اپنی بچی کو پیار سے دیکھتے ہوئے صندل نے خود کلامی کی تھی۔

آنے والے چند دن تو صندل کمزوری کی وجہ سے بیڈ پر سے اٹھ نہیں سکی تھی۔ اس دوران میرزاد ہی اس کے سارے کام کرتا رہا تھا۔ ملازمہ ہونے کے باوجود گھر کو اسے سنبھالنا پڑ رہا تھا۔ ریسٹورنٹ چند دن بند رہا تھا۔ اگرچہ وہاں کا سب کام ملازم ہی سنبھالتے تھے لیکن پھر بھی میرزاد چاہتا تھا کہ وہ یہ سارا وقت صندل کو اور اپنی بچی کو دے۔ بچی کی صورت میں دونوں کو جیسے ایک نیا کھلونا مل گیا تھا۔ دونوں ہر وقت اس کے ساتھ کھیلتے رہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ بچی ابھی سے ان کے ساتھ بات کرنے لگے۔ ان کے سوالوں کے جواب دینے لگے۔ صندل کی طبیعت کچھ بہتر ہوئی تو اس نے پہلی فرصت میں چاندامی کو خط لکھا تھا۔

"پیاری چاندامی!

امید کرتی ہوں کہ آپ خیریت سے ہوں گی۔ یہ خط آپ کے لیے سب سے زیادہ اہم ہونے والا ہے۔ کیونکہ اس میں آپ کے نانی بن جانے کی خوش خبری موجود ہے۔ اور جیسا کہ آپ دعا کر رہی تھیں کہ میرے گھر پیاری سی بیٹی جنم لے۔ جو ہو بہو میرے جیسی ہو تو میں آپ کو بتا دوں کہ خدا نے آپ کی دعاؤں کو قبول کر لیا ہے۔ پچھلے ہفتے جولائی کے شروع میں ہمارے گھر ایک پیاری سی بچی نے جنم لیا ہے۔ یوں ہمارے گھر اس سال دو بہاریں اتری ہیں۔ اور آپ کو بتا دوں کہ پریشانی کی کوئی بات

نہیں...... کسی طرح کا کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ میر زاد کے ساتھ اور آپ کی دعاؤں کی وجہ سے سارا مرحلہ خیرو خیریت سے ہو گیا۔ اور میں نے اس دوران آپ کی کمی کو شدت سے محسوس کیا۔

میں اور میر زاد بچی کے لیے خود سے کوئی نام تجویز کرنے سے قاصر ہیں۔ اس لیے چاہتے ہیں کہ آپ ہماری بیٹی کے لیے کوئی اچھا سا نام تجویز کریں۔ دوسرا میں چاہتی ہوں کہ میری بچی کا نام اس کی نانی کے توسط سے رکھا جائے جس کی وجہ سے وہ سب کو بتا سکے کہ اس کا پیارا سا نام اس کی نانی نے رکھا ہے۔ آپ خط میں کوئی پیارا سا نام لکھ کر ضرور بھیجیے گا۔

اور میر زاد بتا رہا تھا کہ اب جگہ جگہ فون کی سہولت بہت عام ہو چکی ہے۔ ٹھنڈیانی میں بھی تاریں بچھانے کا کام کیا جا رہا ہے۔ جلد ہی ہم بھی اپنے گھر میں فون لگوا لیں گے۔ پھر آپ سے فون پر بات ہو جایا کرے گی۔ آپ ارشادی بابا کے پاس جا کر مجھے فون کر سکیں گی۔ بہت دن ہو گئے ہماری بات چیت نہیں ہو سکی۔ کان آپ کی آواز سننے کو ترس چکے ہیں۔

میں اور میر زاد کراچی جانے کا بھی ارادہ رکھتے ہیں۔ میر زاد عرصے سے اپنی بہن سے ملنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے ہم بچے کی ولادت کا انتظار کر رہے تھے۔ جیسے ہی چلہ کے دن مکمل ہو جائیں گے ہم کراچی چلے جائیں گے۔ دعا کیجیے گا کہ زویا آپی مان جائیں اور میر زاد کو معاف کر دیں۔ میران کو بہت یاد کرتا ہے اور ان کو یاد کرتے ہوئے اداس رہتا ہے۔ میری تو خط کے ذریعے آپ سے بات ہو جاتی ہے۔ لیکن میران کو یادوں میں سوچنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔ زویا آپی مان جائیں گی تو وہ بہتر محسوس کرے گا۔

آپ کے جوابی خط کا انتظار رہے گا۔ جلد سے جلد نام تجویز کر کے بھیجیے گا۔

آپ کی پیاری بیٹی صندل!''

صندل نے پیار سے خط کو فولڈ کیا تھا اور پھر ملازم کو دے دیا تھا کہ وہ اسے ارشادی بابا کو پوسٹ کر دے۔

وہ دن اپنے اندر ہر طرح کا اطمینان لے کر دھرتی پر اتر رہے تھے۔ ایسے جیسے کہیں کوئی پریشانی نہ

ہو۔ ہر طرف سکھ ہی سکھ ہو۔ میر زاد کے ساتھ مل کر وہ کراچی جانے کی تیاری کرنے لگی تھی۔ میر زاد کراچی جانے کے حوالے سے کافی پر جوش تھا۔ وہ وقت سے بہت پہلے ہی ٹرین کی ٹکٹ لے آیا تھا۔ صندل دل ہی دل میں اس کے لیے بہت سی دعائیں کر رہی تھی کہ کراچی جا کر میر زاد کو مایوسی نہ ہو۔ کراچی روانگی سے دو دن پہلے صندل کو چاند امی کا خط ملا تھا۔

"جان سے بھی زیادہ عزیز بیٹی!

میں نے تمہارے اس خط کا بہت بے صبری سے انتظار کیا ہے۔ میں روز حاجی بوا سے کہتی تھی کہ وہ ارشادی بابا کے پاس جائیں اور ان سے پوچھیں کہ صندل کا کوئی خط آیا یا نہیں...... مجھے تمہاری فکر ہو رہی تھی کیونکہ میرے حساب سے یہ دن بچے کی ولادت کے دن تھے۔ تم نے خط نہیں لکھا تو مجھے فکر ہونے لگی۔ اور اب یہ جان کر کہ تم خیر خیریت سے ہو، میں مطمئن ہو چکی ہوں۔

میں نانی بن چکی ہوں۔ اس خبر کو سن لینے کے بعد میں جیسے پھر سے جوان ہو چکی ہوں اور تمہارے گھر ایک بیٹی نے جنم لیا ہے اس بات کی خوشی سب سے بڑھ کر ہے۔ کاش میں اس وقت تمہارے پاس ہوتی۔ لیکن اب جلد ہی ملاقات ہو جائے گی۔ وہ کیسے ہو گی، وہ میں تمہیں اگلے خط میں بتاؤں گی۔ تم اس حویلی میں واپس آجاؤ گی۔ بہت جلد ان شاء اللہ......

بچی کو لے کر میرے ذہن میں باریشہ نام ہے۔ میں جب دہلی میں تھی تو وہاں میری سہیلی ہوا کرتی تھی۔ اس کا نام باریشہ تھا۔ تم نے بچی کے نام کے بارے میں کہا تو نجانے کیوں مجھے میری وہی سہیلی یاد آ گئی۔ باریشہ کا مطلب خالص ہوتا ہے۔ دعا کرتی ہوں کہ یہ بچی تمہاری زندگی میں خالص خوشیاں لے کر آئے گی۔ امید کرتی ہوں کہ تم دونوں کو یہ نام پسند آئے گا۔

میر زاد کے حوالے سے دعا کروں گی کہ اس کے مسئلے جلد حل ہو جائیں۔ زویا اسے معاف کر دے اور تم سب کو قبول کر لے۔ نجانے کیوں مجھے لگ رہا ہے کہ اب ساری پریشانیاں ختم ہونے والی

ہیں۔ ساری مشکلات دور ہو جائیں گی۔ ہم سب پھر سے ملیں گے اور خوب باتیں کریں گے۔ تم لوگ کراچی سے ہو کر آ جاؤ تو پھر مجھے خط لکھنا۔ میں تمہارے خط کا انتظار کروں گی۔

تمہاری چاندامی!''

صندل نے خط کو پڑھ کر سینے سے لگا لیا تھا۔ ایسے جیسے خود چاندامی کے سینے سے لگی ہوئی ہو۔ وہ خط میں سے چاندامی کے وجود کی خوشبو کو محسوس کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور ایسا کرتے ہوئے دو آنسو خود بخود اس کی آنکھوں سے جاری ہو چکے تھے۔ جنہیں اس نے جلدی سے صاف کر لیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ میرزادان آنسوؤں کو دیکھے۔

الماری کھول کر اس نے اندر سے ایک لکڑی کا باکس نکالا تھا۔ جو سارا کا سارا چاندامی کے خطوط سے ہی بھرا ہوا تھا۔ اس نئے خط کو بھی اس نے اس باکس میں رکھ دیا تھا۔ پھر چھوٹا سا تالا لگا کر الماری میں واپس رکھ دیا تھا۔ چاندامی کے یہ خطوط اس کے لیے ہر طرح کے خزانے سے زیادہ اہم تھے۔

☆......☆......☆

بستامی کے توسط سے شکیلہ پھوپھو کی بڑی بیٹی سارہ کا رشتہ آیا تھا۔ چاند نے اس بار ساری ذمہ داری خود لی تھی۔ اس نے بستامی سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی تسلی کرے گی پھر رشتے کو منظوری دے گی۔ وہ سارہ کو نہ تو تعبیر کی طرح دور بیاہنا چاہتی تھی۔ اور نہ افشیں کی طرح کسی بوڑھے کے ساتھ باندھنا چاہتی تھی۔ بستامی نے کہہ دیا تھا کہ اسے کوئی اعتراض نہیں۔ چاند ہر طرح سے اپنی تسلی کر سکتی ہے۔

جو کوائف بستامی نے دیے تھے اس پر تو چاند مطمئن تھی اور شکیلہ پھوپھو بھی......لڑکا بھی پڑھا لکھا اور خوب صورت تھا۔ خوش حال گھرانہ تھا۔ اس لیے جمعے کے مبارک دن ان کو گھر پر بلا لیا گیا تھا۔

مہمانوں کی نشست کے لیے بہترین انتظام کیا گیا تھا اور کھانے پینے کے لیے بھی......لڑکے والوں کی طرف سے چار افراد آئے تھے۔ دو خواتین اور دو مرد......ان کا آپس میں کیا تعلق تھا، یہ دو بار

پوچھنے پر بھی چاند کو سمجھ میں نہیں آیا۔ خیر سارہ کو ان کے آگے کر دیا گیا۔ شکیلہ پھوپھو تو پہلے سے ہی سارہ کے معاملے میں بہت فکر مند تھیں۔ چاند نہیں چاہتی تھی کہ وہ بے معنی مین میخ نکال کر اس رشتے کو ہاتھ سے جانے دے۔

سارہ انہیں دیکھتے ہی پسند آ گئی تھی اور وہ اسی وقت سارہ کے ہاتھ پر پیسے رکھ دینا چاہتے تھے لیکن چاند نے منع کر دیا تھا۔ وہ ابھی مزید لڑکے والوں کے بارے میں چھان بین کرنا چاہتی تھی۔

سب کچھ بہت اچھا جا رہا تھا۔ لیکن پھر ایک عجیب بات ہوئی تھی۔ مہمانوں کے جانے سے تھوڑی دیر پہلے کومل وہاں آ گئی تھی۔ اور اس سے پہلے کہ چاند مہمانوں سے کومل کا تعارف کرواتی، مہمان خود ہی اٹھ کر کومل سے ملنے لگے تھے اور اس کا حال احوال دریافت کرنے لگے تھے۔ مہمانوں کا رویہ کومل کے ساتھ ایسا تھا جیسے وہ اسے اچھے سے جانتے ہوں۔ اور یہ ہی وہ لمحہ تھا جب چاند کی چھٹی حس نے الارم بجایا تھا۔ اور یہ وہ لمحہ بھی تھا جب بستامی کا سارہ کے لیے بچھایا جال الجھنے لگا تھا۔

"آپ کی والدہ کی طبیعت کیسی ہے اب...... کیا ان کی آنکھوں کو شفا ملی؟" ملنے ملانے کے بعد بیٹھتے ہوئے کومل نے مہمان خاتون سے پوچھا تھا۔

"جی...... اب بہتر ہے، روشن بیگم نے جس خانقاہ کا بتایا تھا وہاں جانا فائدہ مند ثابت ہوا ہے۔" مہمان خاتون نے جواب دیا تھا۔ چاند نے دونوں کو اچنبھے سے دیکھا تھا۔ روشن بیگم کے نام پر شک میں مبتلا چاند کو یقین ہو گیا تھا کہ کومل ان لوگوں کو پہلے سے بہت اچھے سے جانتی ہے اور وہ لوگ نہ صرف کومل کو جانتے ہیں بلکہ روشن بیگم سے بھی شناسا ہیں۔

"آپ روشن بیگم کو کیسے جانتی ہیں؟" چاند نے پوچھا تھا۔

خاتون نے کومل کی طرف دیکھا تھا۔ کومل گڑبڑا گئی تھی۔ خاتون سے کوئی جواب نہیں دیا گیا تھا۔

"کیسے جانتی ہیں آپ روشن بیگم کو؟" چاند نے پھر سے اپنا سوال دہرایا تھا۔

''بستامی سے ان کا ذکر سنا تھا۔ میں نے اپنی والدہ کی مشکل انہیں بتائی تو انہوں نے مشورہ دیا تھا۔'' خاتون نے وضاحت دی تھی۔ جس پر چاند کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ بیٹھے بیٹھے لمحے ہی لمحے میں اس کا ذہن نجانے کہاں سے کہاں چلا گیا تھا۔ افشیں کی بڑی عمر کے مرد سے شادی، پارٹی پر صندل کا رشتہ آنا، پھر وہاں تعبیر کی شادی کا ہو جانا...... اور اب سارہ کے لیے رشتہ...... ایک ایسا گھرانہ جو روشن بیگم سے رابطے میں تھا۔ یہ سب ہو کیا رہا تھا حویلی میں...... اسے دال میں کچھ کالا لگا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ بستامی بے جوڑ اور بے توقیر رشتے لا کر گھر کی لڑکیوں کی شادیاں کرتے ہوئے لڑکے والوں سے نذرانے وصول کر رہا تھا۔ یہ ایسی بات تھی جس نے اس کا ذہن چکرا کر رکھ دیا تھا۔ وہ بستامی کے اصل کرتوت جان جاتی تو شاید بیٹھے بیٹھے ہی بے ہوش ہو جاتی...... وہ جسے نذرانے خیال کیے ہوئے تھی وہ تو لڑکیوں کی قیمت تھی اور زارا بھی اب ایسی ہی قیمت کے بدلے فروخت ہونے جا رہی تھی۔

غصے سے چاند فوراً اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''معذرت چاہتی ہوں۔ یہ رشتہ نہیں ہو سکتا ہے۔ آپ لوگ جا سکتے ہیں۔'' اس نے ایک لمحہ بھی سوچے بنا کہہ دیا تھا۔ لڑکے والے اس کی شکل دیکھنے لگے تھے۔

''یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ......؟'' کومل نے مداخلت کی تھی۔

''تمہارا گھر کی لڑکیوں سے کچھ لینا دینا نہیں ہے کومل...... یہ فیصلہ کرنے کو گھر کے بڑے ابھی زندہ ہیں۔ تم اپنے کمرے میں جا سکتی ہو۔'' چاند نے کومل سے کہا اور پھر لڑکے والوں سے مخاطب ہوئی تھی۔ ''آپ لوگ جا سکتے ہیں۔ ہم روشن بیگم کے جاننے والوں سے رشتے داری نہیں کر سکتے۔'' چاند کہہ کر کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔ وہ حویلی میں مزید کوئی بے جوڑ رشتہ نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔

اس شام حویلی میں ایک طوفان آیا تھا۔ بستامی اتنے غصے سے چاند پر بولا تھا کہ سب اس کی شکل دیکھتے رہ گئے تھے۔

''تم کون ہوتی ہو چاند، حویلی کی لڑکیوں کی زندگی کا فیصلہ کرنے والی......'' وہ دھاڑا تھا۔

''میں بھی اسی گھر کا ایک فرد ہوں بستامی......شاید تم بھول رہے ہو۔''

''تم سے تو اپنی زندگی کا فیصلہ بہتر نہیں ہو سکا۔ کہاں تم حویلی کی لڑکیوں کی زندگیوں کے فیصلے بہتر کرو گی۔''

''جو بھی ہے۔ سارہ کی شادی ایسی جگہ نہیں ہو گی جو روشن بیگم کے مداح ہوں۔''

''تمہیں یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ خاندانی لوگ ہیں۔''

''خاندانی لوگ ایسی جگہوں پر نہیں جایا کرتے۔''

''پھر تم میرے بارے میں کیا کہو گی۔ اپنے بھائی کے بارے میں...... کیا میں خاندانی نہیں ہوں۔'' بستامی نے پوچھا تھا۔ چاند سے کوئی جواب نہیں دیا گیا تھا۔ ''بولو...... جواب دو۔''

''تمہارے معاملے میں میں بے بس تھی ورنہ یقیناً تمہیں سدھارنے کی کوشش کرتی۔''

''جیسے دین بابا تمہارے معاملے میں بے بس تھے۔'' اس نے طنزیہ کہا تھا۔ ''تم شاید بھول رہی ہو کہ بابا کی موت کی ذمہ دار تم ہو۔ تمہارے رحبان سے عین شادی والے انکار نے بابا کی جان لے لی تھی۔''

چاند گڑبڑا گئی تھی اور زمین کو گھورنے لگی تھی۔

''جیسے تم صندل کے معاملے میں بے بس تھیں۔ ایک ناجائز خون جس نے حویلی کی شان کو مٹی میں ملا دیا اور گھر سے بھاگ گئی۔''

''کون کس چیز کا ذمہ دار ہے اس بات کا فیصلہ وقت کرے گا۔ فی الحال جو بات ہو رہی ہے تم اس پر رہو۔ سارہ کے لیے جو رشتہ لائے تھے میں اسے انکار کر چکی ہوں۔ اور تم مزید کوئی رشتہ گھر کی کسی لڑکی کے لیے نہیں لاؤ گے۔ ان کی مائیں ابھی زندہ ہیں اور میں بھی...... تم فکر مت کرو۔''

''یہ حویلی میرے باپ کی ہے۔ یہاں کے فیصلے میری مرضی سے ہوں گے۔''

"تمہیں اس بات پر ناز ہے نا کہ پھوپھو اور ان کی بیٹیوں نے تمہارا کھایا ہے۔ تمہارے گھر میں رہی ہیں۔ تو ٹھیک ہے۔ ابھی حساب کر لیتے ہیں۔ تم بتا دو کہ تمہارا کیا خرچا آیا ہے۔ میں سارا حساب کتاب بے باک کروں گی۔ اور آج سے پھوپھو اور ان کی ساری بیٹیوں کا خرچا میرے ذمے ہوگا۔ ان کا سارا خرچ میں اٹھاؤں گی۔ رہی حویلی کی بات...... تو اس کے درمیان میں دیواریں کر لو۔ تم الگ رہو، اور ہم سب الگ...... یقیناً اس پر تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا کیونکہ حویلی میں میرا بھی حصہ ہے۔ لیکن سارہ کی شادی وہاں نہیں ہوگی جہاں تم کہہ رہے ہو۔ بلکہ اب حویلی کی کسی لڑکی کی شادی وہاں نہیں ہوگی جہاں تم کہو گے۔ تم اپنا خاندان بناؤ اور جہاں دل کرے اپنی اولاد کی شادیاں کرنا...... میں تم سے نہیں پوچھوں گی۔" چاند نے دوٹوک کہتے ہوئے ساری بات ختم کی تھی۔

تینوں پھوپھو نے فخر سے چاند کو دیکھا تھا۔ یہ تھا ان کے بھائی کا خون...... دین کا خون...... جو ان کے حق کے لیے کھڑا ہوا تھا۔

"کل مزدور بلا کر حویلی کے درمیان میں دیوار اٹھا دینا...... مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

☆......☆......☆

اگست کی تیز دھوپ نے زمین پر اپنے پنجے گاڑھے ہوئے تھے۔ دور دور تک پھیلے کھیت دھوپ میں نہائے ہوئے سورج کی روشنی کو مزید بڑھاوا دے رہے تھے۔ صندل ایک عرصے کے بعد اتنی شدید گرمی دیکھ رہی تھی۔ اس کا سارا جسم پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ ٹرین کے سفر نے ویسے بھی دونوں کو تھکا دیا تھا۔ باریشہ تو صندل کی گود میں سوتی رہی تھی لیکن حویلیاں سے کراچی تک کے طویل سفر میں، صندل اور میرزاد کو لمحے بھر کے لیے بھی نیند نہیں آئی تھی۔ اس کی وجہ شاید ایک نامحسوس بے چینی تھی یا شاید اضطراب...... جو بھی تھا دونوں کے لیے وہ طویل سفر بہت زیادہ تھکن کا باعث ثابت ہو رہا تھا۔

صندل نے میرزاد کو دیکھا تھا جو بہن سے ملنے کے خیال سے خوش تو تھا، لیکن شاید ڈرا ہوا بھی

تھا۔اس کے چہرے پر ملے جلے تاثرات نظر آرہے تھے جن میں پریشانی نمایاں تھی۔نجانے زویا کس طرح کا ری ایکشن دے۔ ہوسکتا ہے زوہیب بھائی اسے معاف ہی نہ کریں۔گھر میں ہی داخل نہ ہونے دیں۔ان کو میرزاد اپنی بہن سے زیادہ تو عزیز نہیں ہوسکتا نا......

"کیا سوچ رہے ہو میر......؟" صندل نے پیار سے میرزاد سے پوچھا۔

"تم جانتی ہو کہ میں اس وقت کیا سوچ رہا ہوں۔" میرزاد نے کہا تھا۔صندل نے پیار سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا۔

"پریشان مت ہو۔وہ غصہ ہوں گی۔تم پر بولیں گی۔برا بھلا کہیں گی۔لیکن پھر تمہیں گلے سے بھی لگالیں گی۔"

"مجھے ان کے غصے کی یا برا بھلا کہنے کی پروانہیں ہے۔"

"تو پھر......؟"

"ڈر ہے کہ وہ مجھے نفرت سے دھتکار نہ دیں۔میرے لیے اپنے گھر کا بند دروازہ ہی نہ کھولیں۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوگا۔"

"تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"تمہاری والدہ بچپن میں ہی فوت ہو چکی تھیں۔زویا آپی نے تمہیں ماں بن کر پالا ہے۔اور ایک ماں اپنی اولاد سے کیسے اتنی دیر ناراض رہ سکتی ہے۔دیکھنا وہ تو تم پر غصہ ہوں گی کہ تم اتنے عرصے کے بعد کیوں آئے ہو۔"

"دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے۔"

"فکر مت کرو۔سب اچھا ہوگا۔" صندل نے اسے تسلی دی تھی۔یہ تسلی کھوکھلی ہرگز نہیں تھی۔اندر ہی اندر صندل کو سو فیصد یقین تھا کہ زویا اپنے بھائی کو دیکھتے ہی گلے سے لگالے گی۔

بالآخر کھیت در کھیت کا سلسلہ تھما تھا اور آبادی نظر آنا شروع ہو گئی تھی۔ ٹرین شہر کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔ اور اس کی رفتار بھی سست ہو چکی تھی۔ اسٹیشن تک پہنچنے میں اس نے مزید بہت سا وقت لیا تھا۔

دونوں نے اسٹیشن سے باہر نکل کر ایک ٹیکسی لی تھی۔ اور میر زاد کے گھر جانے کے لیے اس میں بیٹھ گئے تھے۔ وہ سارا سفر کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا تھا اور صندل کا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رہا تھا۔ پھر بھی شاید میر زاد کی گھبراہٹ کم نہیں ہوئی تھی۔ صندل کے مخاطب کرنے پر وہ پریشانی میں مسکراتے ہوئے صندل کو دیکھ لیا کرتا تھا۔ ورنہ وہ سارا وقت کھڑکی سے باہر ہی دیکھتا رہا تھا۔

پھر ٹیکسی ایک بڑے سے گھر کے سامنے رکی تھی۔ یہ زوہیب کا گھر تھا۔ میر زاد کا خیال تھا کہ زویا اپنے سسرال میں ہی ہوگی۔ آبائی گھر تو یقیناً بند ہی ہوگا۔ باریشہ کو گود میں اٹھائے ہوئے صندل ٹیکسی سے باہر نکلی تھی۔ ڈرائیور کو پیسے دے کر میر زاد بھی اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''ڈور بیل بجاؤ میر......'' صندل نے کہا تھا۔ میر زاد نے ہمت کرتے ہوئے ڈور بیل بجا دی تھی۔ اپنے ہی گھر میں اجنبی بن کر آنا اسے بہت پریشان کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک آدمی باہر آیا تھا۔ میر زاد اس آدمی کو نہیں جانتا تھا۔

''جی...... کس سے ملنا ہے؟''

''زویا آپی سے...... زوہیب بھائی سے......''

''وہ لوگ تو اب ادھر نہیں رہتے۔''

''تو کہاں رہتے ہیں؟''

''وہ سب تو لندن شفٹ ہو چکے ہیں۔'' آدمی نے کہا تھا اور کراچی کی زمین میر زاد کے پیروں کے نیچے کانپنے لگی تھی۔ ''یہ گھر ان سے ہم نے خرید لیا ہے۔ کیا آپ میر زاد ہیں؟'' آدمی نے پوچھا تھا۔

''جی......!'' میر زاد کے بجائے صندل نے جواب دیا تھا۔ کیونکہ میر زاد تو لندن شفٹ ہو جانے والی بات سن کر بت ہی بن چکا تھا۔

"ایک منٹ ٹھہریں...... " آدمی اندر چلا گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک خط تھا۔ "یہ آپ کے لیے ہے۔ غالباً آپ کی بہن نے دیا تھا کہ جب کبھی آپ آئیں تو یہ آپ کو دے دوں۔"

میر زاد نے آدمی سے خط لے کر کھولا تھا۔ اور اسے پڑھا تھا۔ مختصر خط میں دل کو چیر دینے والی عبارت درج تھی۔

"تم جانتے ہو میر کہ میری طبیعت میں انا پرستی اور کینہ پروری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ لوگوں کی باتیں بھول جانا میرے لیے آسان نہیں ہوتا۔ اس لیے انہیں معاف کرنا بھی میرے لیے ناگزیر ہوتا ہے۔ تمہیں بھی معاف نہیں کر سکتی۔ اس خط کو ہماری آخری بات چیت سمجھنا۔ اور دوبارہ مجھ سے ملنے کی کوشش مت کرنا۔"

اور اگر میر زاد مضبوط اعصاب کا مالک نہ ہوتا تو یقیناً بے ہوش ہو کر زمین پر گر چکا ہوتا۔

☆......☆......☆

خالی کمرے میں بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے رحبانی خالی نظروں سے سامنے کی دیوار کو دیکھ رہا تھا جہاں مینا کماری کی تصویر والا قالین ٹنگا ہوا تھا۔ مینا کماری کے عکس میں اسے چاند نظر آ رہی تھی۔ چاند بھی تو مینا کماری سے ملتی جلتی تھی۔ اسی کی طرح زیادہ تر سفید لباس پہنتی تھی۔ بالوں کو ایک ہی طرز پر بناتی تھی۔ چوڑی دار پاجامہ پہنتی تھی جن کے نیچے کبھی کبھی پازیبیں پہن لیتی تھی تو ان کی جھنکار سے رحبانی کے دل کے تار چھڑ جایا کرتے تھے۔ اور چاند کو یاد کرتے ہوئے رحبانی نے سر جھٹکا تھا۔ نفرت سے یا شاید ملال سے......

اپنے بھاری لباس کے ساتھ ایمن کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ وہ مجرا کر کے سیدھا وہیں آ رہی تھی۔ اس نے رحبانی کو دیکھا تھا جو اس کی وہاں آمد سے بھی نہیں چونکا تھا۔ ایمن قالین پر بیٹھ کر اپنے گھنگھرو کھولنے لگی تھی اور مسلسل رحبانی کو گھورتی جا رہی تھی۔

"کیا ہوا؟ کن سوچوں میں گم ہو؟" اس نے پیار سے پوچھا تھا۔ رحبانی چونکا تھا۔ اس نے ایمن کو اب دیکھا تھا۔

''تم کمرے میں کب آئیں؟''

''تھوڑی دیر ہی ہوئی...... نہ تو میری خوشبو تمہیں مہکا سکی اور نہ میرے گھنگھرو تمہیں جھنجھوڑ سکے۔''

رحبانی خاموش رہا تھا۔

''کیا بات ہے۔ بتاؤ......'' وہ وزنی دوپٹے کو خود سے الگ کرتے ہوئے اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی تھی۔

''نہیں...... کچھ نہیں...... کچھ بھی تو نہیں۔'' رحبانی نے کہا تھا۔ ایمن نے ایک گہرا سانس لیا تھا۔

''تم آج تک مجھ پر آشکار نہیں ہو سکے رحبانی...... جب جب لگتا ہے کہ میں تمہیں زیادہ جانتی ہوں، دھوکا کھاتی ہوں۔''

''کیا جاننا ہے تمہیں...... کیا اب بھی جاننے کو کچھ رہ گیا ہے؟''

''میں تمہارے ماں باپ، حسب نسب یا پہلی محبت چاند کے بارے میں نہیں پوچھ رہی رحبانی...... وہ سب تو میں جانتی ہوں۔''

''تو...... پھر......؟'' رحبانی نے پوچھا تھا۔ کومل نے اپنی شہادت کی انگلی رحبانی کے سینے پر رکھ دی تھی۔

''اس کا حال بتاؤ...... دل کا...... کون ہے یہاں پر؟''

''تم ہو اور کون ہوگا؟'' رحبانی نے کہا تھا۔ اور کہتے ہوئے اس کا انداز کچھ ایسا ہو گیا تھا کہ کہنے والا بھی جانتا تھا کہ یہ جھوٹ بولا جا رہا ہے اور سننے والا بھی جانتا تھا کہ اسے جھوٹ بتایا جا رہا ہے۔

''نہیں...... میں یہاں نہیں ہوں رحبانی...... یہاں چاند ہے۔ اور اگر چاند بھی نہیں ہے تو یہ جگہ خالی ہے۔''

''تم آج کیسی باتیں کر رہی ہو ایمن......'' رحبانی نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ ایمن پیچھے ہوئی تھی۔

''تم مکمل طور پر میرے نہیں ہو رحبانی...... تم میرے پاس ہوتے ہوئے بھی میرے نہیں ہو۔''

رحبانی چپ رہا تھا۔ وہ کیا بولتا......

''مجھے دنوں تمہارا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ بستامی کے ہاتھ تمہیں پیغام بھجوانے پڑتے ہیں۔ ملازموں کو کہنا پڑتا ہے کہ تمہیں ڈھونڈ کر میرا حال بتائیں۔ تمہیں بلانے کے لیے بہانے گھڑنے پڑتے ہیں۔''

''پھر آ بھی تو جاتا ہوں میں......''

''چاند کا غم بھلانے کے لیے...... مجھے تو بارہا ایسا لگا ہے کہ تم میرے ساتھ ساتھ خود کے ساتھ بھی دھوکا کر رہے ہو۔ جب میرے پاس ہوتے ہو تو نجانے کس کو سوچتے ہو۔ کون ہوتی ہے تمہارے ذہن میں...... کون کیا...... چاند ہی ہوتی ہوگی۔'' ایمن کہتے ہوئے کچھ روہانسی سی ہوگئی تھی۔ اور رحبانی گھبرا گیا تھا۔ ایمن اس کے ذہن کی کارستانی کے بارے میں جان گئی تھی۔

''ایسا کچھ نہیں ہے۔'' اس نے کھوکھلے سے انداز میں موٴقف دیا تھا۔

''کئی بار میرا دل کرتا ہے کہ چاند کو زہر دے دوں۔ پھر سوچتی ہوں کہ اس کا کیا فائدہ ہوگا۔ تب تو تم اسے زیادہ یاد کیا کرو گے۔''

''اچھا ناراض مت ہو۔ بتاؤ تم کیسے راضی ہوگی؟'' رحبانی نے پیار سے پوچھا تھا۔ وہ موضوع بھی بدلنا چاہتا تھا۔ چاند کا ذکر اس کے دل کو مجروح کر دیا کرتا تھا۔ ''بولو...... کوئی فرمائش ہی کر دو۔''

''مجھے ٹھنڈیانی لے جاؤ......''

''وہاں کا خیال کیسے آیا تمہارے ذہن میں......؟''

''وہاں اونٹوں اور گھوڑوں کا میلہ سجا ہوا ہے۔ رخشندہ بتا رہی تھی۔ میں بھی وہاں جانا چاہتی ہوں تمہارے ساتھ۔ چند دن سکون سے گزارنا چاہتی ہوں۔ بتا رہی تھی کہ وہاں ایک ریسٹورنٹ بھی ہے جہاں بہت اچھا ستار بجایا جاتا ہے۔ بہت پیارا ماحول ہوتا ہے۔ رخشندہ کہہ رہی تھی کہ ہم جتنے دن وہاں رہے اسی ریسٹورنٹ میں جاتے رہے۔ میں بھی تمہارے ساتھ وہاں جانا چاہتی ہوں۔''

ایمن نے پیار سے کہا تھا۔اور رحبانی اس کی شکل دیکھنے لگا تھا۔لمحے بھر کے لیے اسے ایمن بھی ایک نیا رحبانی لگی تھی جو اس کی محبت کی آگ میں جل رہی تھی۔جیسے وہ چاند کی محبت کی آگ میں جھلس چکا تھا۔

"کیا لے چلو گے مجھے ٹھنڈیانی؟"

"ہاں......تیاری کرو۔اسی ہفتے چلتے ہیں۔" رحبانی نے فوراً سے رضامندی دے دی تھی۔

☆......☆......☆

کافی دنوں سے گھر کی چاروں لڑکیوں کا باغ میں جانے کا پروگرام بن رہا تھا۔انہوں نے چاند سے اس بات کی اجازت لے لی تھی۔چاند نے نا صرف خوشی سے اجازت دے دی تھی بلکہ ان کے لیے خاص کھانے بھی بنا کر ان کے ساتھ کیے تھے۔حاجی بوا کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔اس لیے انہوں نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔زہرہ پھوپھو تو تعبیر کی موت کے بعد سنبھل ہی نہیں پا رہی تھی۔کومل کے ساتھ چاند لڑکیوں کو بھیجنا نہیں چاہ رہی تھی۔اس لیے پھر تہمینہ پھوپھو کو ساتھ جانا پڑا تھا۔

لڑکیاں صبح ہی صبح تیار شیار ہو کر تانگوں میں بیٹھ کر گھر سے نکل گئی تھیں۔ان کی واپسی شام کو ہونا تھی۔دوپہر میں کاریگروں کو کام کی ہدایات دے کر چاند اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلی گئی تھی۔ابھی وہ لیٹی ہی تھی کہ نیچے سے کوئی شور سنائی دیا تھا۔یہ شور بڑا عجیب تھا۔چاند نے دالان سے نکل کر نیچے صحن میں جھانکا تھا اور پھر جلدی سے نیچے اتر آئی تھی۔

تہمینہ، روشانے، زارا اور کرن......چاروں بری طرح سے بوکھلائی ہوئی تھیں۔ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"کیا ہوا ہے؟ اتنی جلدی کیوں واپس آ گئی ہو تم سب......؟"

"وہ......سارہ نہیں مل رہی ہے۔" روشانے نے بتایا تھا۔

"کیا مطلب نہیں مل رہی ہے۔وہ تو تمہارے ساتھ گئی تھی۔

"جی ساتھ ہی گئی تھی لیکن پھر اچانک سے غائب ہو گئی۔اور اب مل نہیں رہی ہے۔"

''میرے اللہ!'' حاجی بوا نے اپنا سر تھام لیا تھا۔ شکیلہ پھوپھو نے خود کو بے ہوش ہونے سے بچانے کے لیے ستون کو تھام لیا تھا۔

''ہم نے اسے باغ میں ہر جگہ دیکھا۔ لیکن وہ کہیں نظر نہیں آئی۔''

''جلدی جاؤ...... کوئی رحبانی کو بلا کر لائے۔'' حاجی بوا نے دہائی دی تھی۔ ایک لڑکی جلدی سے جا کر رحبانی کو بلا لائی تھی۔

''کیا ہوا ہے؟''

''قیامت آ گئی ہے ہمارے گھر پر......'' حاجی بوا سینہ کوبی کرنے لگی تھیں۔

''ہوا کیا ہے؟''

''سارہ کا کچھ اتا پتا نہیں ہے۔ باغ سے کہیں غائب ہو چکی ہے۔ جلدی جاؤ...... دیکھو کہاں چلی گئی ہے میری سارہ......''

''ٹھیک ہے۔ ابھی جاتا ہوں۔'' رحبانی دو تین مرد ملازموں کے ساتھ فوراً وہاں سے باہر گیا تھا۔

''اللہ میری بچی کو اپنی حفاظت میں رکھنا......'' شکیلہ پھوپھو رونے لگی تھیں۔ باقی سب انہیں تسلی دینے لگی تھیں۔ چاند بت بنی کھڑی تھی۔ نجانے کیوں اسے اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ سارہ اب کبھی نہیں ملے گی۔ وہ لوگ ساری زندگی سارہ کی شکل نہیں دیکھ سکیں گے۔

شام ہونے کے قریب تھی۔ جب رحبانی ملازموں کے ساتھ حویلی واپس لوٹا تھا۔

''کیا ہوا رحبانی...... سارہ کہاں ہے؟'' چاند نے اسے دیکھتے ہی کہا تھا۔

''اس کا کچھ پتا نہیں چلا......'' رحبانی نے مایوسی سے کہا تھا۔ شکیلہ پھوپھو بے ہوش ہو کر گری تھیں۔ سب انہیں تھامنے لگے تھے۔

''کیوں پتا نہیں چلا...... کہاں چلی گئی سارہ......'' چاند نے پوچھا تھا۔ اور رحبانی بھلا اس کی بات کا کیا جواب دیتا۔

شام گہری ہونے تک سب کو یقین ہو چکا تھا کہ سارہ اغوا ہو چکی ہے۔ اور اب نجانے وہ کس حال میں ملتی ہے۔ ملتی بھی ہے یا نہیں...... اس یقین نے بنا ملک الموت کے ہی سب کی روحوں کو ان کے جسموں سے کھینچ لیا تھا۔

ماسوائے بستامی اور کومل کے......

بستامی اور کومل دونوں اپنے کمرے میں موجود تھے۔ بستامی تاش کے پتوں سے تکون ''تاش گھر'' بنا رہا تھا۔ اور کومل اس کے سامنے بیٹھی محبت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

بستامی کافی دیر تک اپنے مشغلے میں مگن رہا تھا۔

''لو...... بن گیا روشن بیگم سے بڑا تاش گھر......'' بستامی نے آخری دو پتے چوٹی پر رکھتے ہوئے جوش سے بھرپور لہجے میں کہا تھا۔

کومل مسکرائی تھی۔

''ہاں واقعی...... تم تو روشن بیگم سے بھی بڑھ کر ماہر ہو چکے ہو بستامی...... تمہارے آج کے کارنامے سے مجھے تمہاری صلاحیتوں کا اعتراف کرنا پڑے گا۔''

جواباً بستامی کے چہرے پر فخریہ تاثرات پھیلے تھے۔ اور جن میں وہ بے حد برا لگا تھا۔

''کیا سارہ اب ملتان تک پہنچ چکی ہوگی؟''

''بالکل...... اور کل صبح تک وہ ڈھاکا پہنچ جائے گی۔'' بستامی نے بتایا تھا۔ اور پھر دونوں ایک دوجے کو دیکھ کر ہنسنے لگے تھے۔



ناول **تاش گھر** ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **15** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 24

کل کی دھواں دھار بارش کے بعد شام بہت بھیگی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے پھر سے شہر کو بھگونے کا ارادہ باندھ رہی ہو۔ آج سارا دن دھوپ نہیں نکلی تھی۔ جس باعث شہر نکھرا ہوا اور نم نم محسوس ہو رہا تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک معمول کے مطابق رواں دواں تھی جو باریشہ کو ریسٹورنٹ کے بڑے شیشے سے واضح نظر آ رہی تھی۔

ٹیبل پر کہنیاں ٹکائے اور ہاتھوں میں چہرہ سجائے وہ ایسی نم شام میں باہر ٹریفک کو دیکھتے ہوئے ضامن کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے اپنی کلائی میں پہنی گھڑی کو دیکھا تھا۔ پانچ بج کر پانچ منٹ ہو چکے تھے اور ضامن نے اسے پانچ بجے کا وقت ہی دیا تھا۔

پھر وہ کہاں رہ گیا تھا؟

کیا وہ کہہ کر بھول چکا تھا......؟

یا اس کے نزدیک یہ ملاقات اس قدر عامیانہ تھی کہ وہ آج کی غیر حاضری کے بعد باریشہ سے سوری بول سکتا تھا۔

وہ مرد تھا۔ اخلاقی طور پر اسے باریشہ سے پہلے وہاں موجود ہونا چاہیے تھا لیکن وہ ابھی تک وہاں نہیں پہنچا تھا۔ جبکہ باریشہ وہاں چار بجے سے موجود تھی۔ اس کا دل چاہا تھا کہ وہ ضامن کو کال کرے۔ لیکن اس نے یہ مناسب نہیں سمجھا تھا۔ کہیں اس طرح سے ضامن پر اس کی بے چینی عیاں نہ ہو جائے۔ وہ ایسا ہرگز نہیں چاہتی تھی۔ وہ مزید کافی دیر تک اس کا انتظار کر سکتی تھی۔

درحقیقت یہ باریشہ کی بے چین فطرت تھی جو ضامن کو چند منٹ مزید کی چھوٹ نہیں دے رہی تھی۔ ورنہ وہ خود ساری زندگی کوئی ایسی وقت کی پابند نہیں رہی تھی جس قدر آج بن رہی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کے تمام اہم کام وقت گزر جانے کے بعد ہی کیے تھے۔ اپنے ہینڈ بیگ میں سے اس نے ایک چھوٹا سا شیشہ باہر نکالا تھا اور ایک بار پھر خود کو دیکھا تھا۔ ترتیب شدہ بالوں کو پھر سے سیٹ کیا تھا۔ اپنے چہرے کو دیکھا تھا جو بے حد پیارا لگ رہا تھا۔ اور اپنے لباس کو، جہاں کوئی شکن نہیں تھی۔

نتاشا کو اس کی آج کی تیاری پر کچھ حیرت ہوئی تھی۔ میک اپ، جیولری، اور لباس کو دیکھ کر وہ یہ سمجھ سکتی تھی کہ باریشہ آج کسی خاص سے ملنے جا رہی ہے۔ اس نے باریشہ سے تو اس بارے میں کم ہی پوچھا تھا لیکن حسبِ عادت کومل بیگم کو ساری رپورٹ دے دی تھی۔ اور وہ اسی کام کے لیے تو رکھی گئی تھی۔

اور انتظار کی کوفت سے جب باریشہ مایوس ہو جانے کے قریب تھی تب ہی اسے اپنی پشت پر ایک آواز سنائی دی تھی۔

''ہائے!'' خوب صورت آواز ریسٹورنٹ کے کھانوں کی خوشبو میں کسی تیز میٹھے عطر کی طرح پھیل گئی تھی۔

باریشہ نے پلٹ کر دیکھا تھا اور پھر بے اختیار کھڑی ہو گئی تھی۔

ضامن نے بلیو جینز پر سفید شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس نے لڑکوں کو اکثر اس کنٹراسٹ میں دیکھا تھا۔ شاید یہ لڑکوں کا فیورٹ کنٹراسٹ تھا لیکن ضامن تو اس کنٹراسٹ میں قیامت ڈھا رہا تھا۔ اس نے کلائی پر گھڑی باندھی ہوئی تھی اور گلے میں چین پہنی ہوئی تھی۔ جسے دیکھ کر باریشہ کو حیرت ہوئی تھی۔

کیا لڑکے بھی فیشن کرتے ہیں؟

کیا وہ پہلے سے ہی کامل نہیں ہوتے؟

باریشہ کا دل کیا تھا کہ وہ اسے دیکھتی رہے اور بس دیکھتی رہے۔

''کیسی ہو؟''

''گڈ......!''اس کے وجود پر سے نظریں ہٹا کر اس نے کہا تھا۔

''کیا میں لیٹ تو نہیں ہو گیا؟''اس نے بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔

''بالکل بھی نہیں......''

جھوٹ بولتے ہوئے باریشہ بھی بیٹھ گئی تھی۔ ضامن نے نجانے کون سا پرفیوم لگایا ہوا تھا۔ پرفیوم کی خوشبو اس کے وجود کی باس سے مدغم ہو کر باریشہ تک پہنچی تھی۔ باریشہ نے سوچ لیا تھا کہ ملاقات کے اختتام تک وہ ضامن سے پرفیوم کا نام ضرور پوچھ لے گی۔ چند لمحے خاموشی کے گزر گئے تھے اور پھر ایک ویٹر دونوں کے پاس آیا تھا۔

''کیا پینا پسند کرو گے؟''باریشہ نے پوچھا تھا۔

''کافی......کیونکہ پنالٹی تو کافی کی ہی ہے۔''

''بے شک......لیکن تم کافی کے ساتھ کچھ اور بھی آرڈر کر سکتے ہو۔''باریشہ نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''جانتا ہوں۔ بہت امیر ہو تم......''ضامن نے جیسے روانی میں کہہ دیا تھا۔

باریشہ نے اچنبھے سے اسے دیکھا تھا۔

''تمہارے گھر کی شان و شوکت سے تمہارے گھر کا اندازہ ہو گیا تھا۔''اس نے جلدی سے بات بنائی تھی۔

''کہہ سکتے ہو۔''وہ مسکرائی تھی۔ ویٹر کافی کے ساتھ مختلف طرح کی ریفریشمنٹ کا آرڈر لے کر چلا گیا تھا۔

''کل والا لڑکا دوبارہ تو نظر نہیں آیا؟''

''نہیں......میں تو اس وقت کو یاد بھی نہیں کرنا چاہتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ پھر کوئی اور بات کرتے ہیں۔ بتاؤ...... تمہاری باتیں کریں یا میری؟'' وہ آگے کو ہو کر بیٹھا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ظاہر ہوئی تھی۔

باریشہ نے تھوک نگلتے ہوئے خود کو نارمل کیا تھا۔

''میں تو تمہیں سننا چاہوں گی۔''

''میں لندن سے آیا ہوں۔ اور یہاں نیا بزنس اسٹارٹ کرنے جا رہا ہوں۔''

''کس طرح کا بزنس؟''

''میں اور میرے کچھ فرینڈز ایک پروڈکشن ہاؤس کھولنے کا سوچ رہے ہیں۔ سنا ہے کہ پاکستان میں بہت سے نئے چینل لانچ ہونے جا رہے ہیں تو ہمیں لگتا ہے کہ اس بزنس میں کافی اسکوپ ہے۔''

''تم نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔ بہت سے لائسنس ایشو ہو چکے ہیں۔ جلد ہی تم ان چینلز کو ٹی وی اسکرین پر دیکھو گے۔''

''تم یہ سب کیسے جانتی ہو؟''

''شاید تم نہیں جانتے...... تمہارے سامنے ایک ماڈل بیٹھی ہوئی ہے۔'' باریشہ نے کچھ اتراتے ہوئے کہا تھا۔

''کیا تم ماڈلنگ کرتی ہو؟''

''ابھی اسٹارٹ کی ہے...... زیادہ نام نہیں بنا میرا۔''

''کہیں تم وہی تو نہیں ہو جس کا ریمپ واک کے دوران ڈریس بے ترتیب ہو گیا تھا؟'' ضامن نے ایسے ظاہر کیا تھا جیسے اس نے یہ بات روانی میں کہہ دی ہے جبکہ اس نے بہت سوچ سمجھ کر یہ بات کی تھی۔

باریشہ نے نظریں جھکاتے ہوئے سر ہلایا تھا۔

''وہ کسی کی سازش تھی۔''

"کس کی......؟" ضامن نے اپنی مسکراہٹ کو بمشکل چھپایا تھا۔

"اندازہ نہیں......" اس نے کندھے اچکائے تھے۔ "لیکن میں جلد پتا کروالوں گی۔ میرے لیے وہ دن بہت اذیت ناک تھا۔"

"پھر اس دن کی بات بالکل نہیں کرتے...... ابھی کی بات کرتے ہیں۔ تو مس باریشہ...... کیا آپ ہماری ٹیم کا حصہ بنیں گی؟ کہیں کمٹڈ تو نہیں ہو؟"

"بالکل نہیں ہوں۔"

"یہ تو گڈ ہو گیا۔ تو ہمیں باقی کے معاملات کیسے طے کرنا ہوں گے؟"

"تمہیں میری گارجین سے ملنا ہوگا۔"

"وہ کون ہیں؟"

"کومل آنٹی......" باریشہ نے کہا تھا اور ضامن کو کچھ حیرت ہوئی تھی۔

اس نے "چاندنا نو" کا نام کیوں نہیں لیا تھا۔

"ٹھیک ہے مل لیتے ہیں...... تمہاری کومل آنٹی سے مل لیتے ہیں۔" تذبذب کے سے انداز میں اس نے کہا تھا۔

آنے والے وقت کو سوچتے ہوئے باریشہ محبت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ضامن سے ملاقاتوں کے لیے قدرت نے راہیں ہموار کر دی تھیں۔

☆......☆......☆

شام کا سورج غروب کے بادلوں میں چھپ رہا تھا۔ افق کی دھار گہرے رنگوں میں بدل رہی تھی۔ چند لمحوں پہلے تک دیو قامت کھڑکی پر پڑنے والی سورج کی تیز روشنی اب مدھم سے مدھم ہونے لگی تھی۔ لیکن خیام کو اس بات کا ہوش نہیں رہا تھا۔ اسے لائٹ جلانے کا بھی خیال بھولا ہوا تھا۔

وہ کافی دیر سے اپنے اسٹوڈیو میں بند انہماک سے کام کرنے میں مصروف تھا۔ وہ رنگوں کو مکس کر رہا تھا اور اپنے ادھورے کینوس پر اسٹروک لگاتے ہوئے اسے مکمل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ پورٹریٹ کافی دن لے لے گا۔ ایک تو انسانی چہرہ...... اوپر سے ایسا چہرہ جو وہ جب جب یاد کرتا تھا اس کے دل کی کھال سکڑنے لگتی تھی۔ ہاتھ کی جنبش تیز ہو جاتی تھی۔ اسے امید تھی کہ وہ پورٹریٹ خراب کر دے گا۔ اور پھر بالکل صحیح پورٹریٹ تک پہنچنے کے لیے نجانے اسے کتنے پورٹریٹ خراب کرنا ہوں گے۔ اس سب میں کتنے دن ضائع ہوں گے۔ کتنا وقت برباد ہو گا۔

اسے وقت کی تو بالکل پروا نہیں تھی لیکن وہ اپنے ذہن پر اعتبار کھونے لگا تھا۔ کہیں چہرے کا عکس اس کے ذہن سے محو نہ ہو جائے۔

پھر وہ کیا کرے گا؟ کیا ضامن کی منت کرے گا کہ وہ اسے ایک بار پھر سے باریشہ سے ملوا دے۔

اسٹوڈیو کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تھی اور پھر شائستہ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

"خیام......؟"

"یس ممی......؟" خیام نے جلدی سے کینوس پر کپڑا اپنے نیچے کیا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ پینٹ ابھی گیلا تھا۔ اور وہ پورٹریٹ کو خراب کر سکتا تھا۔

"کس کا پورٹریٹ بنا رہے ہو خیام......؟" اپنی بات بھول کر اس نے کچھ حیرت سے پوچھا تھا۔

"نہیں...... کسی کا نہیں......"

"کیا تم کوئی انسانی چہرہ بنا رہے ہو؟"

"ایسا کچھ نہیں ہے ممی......" وہ کچھ خفت سے بولا تھا۔

"جھوٹ مت بولو...... میں نے ایک جھلک کینوس کو دیکھ لیا ہے۔ تم پہلی بار انسانی چہرہ بنانے جا رہے ہو۔ اور وہ بھی کسی لڑکی کا چہرہ...... یقیناً کچھ خاص ہو گا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

نا چاہتے ہوئے بھی خیام مسکرایا تھا۔

''اگر تم نہیں بتاؤ گے تو میں ضامن سے پوچھ لوں گی۔ یقیناً وہ سب جانتا ہوگا۔''

''اس سے کچھ مت پوچھیے گا ممی...... وہ کچھ نہیں جانتا ہے۔''

''یہ تمہارے حوالے سے پہلی بات ہوگی جو ضامن نہیں جانتا ہوگا۔''

''جی...... ایسا ہی ہے۔''

''کہاں ہے وہ؟''

''کسی سے ملنے گیا ہے۔''

''اکیلے......؟'' شائستہ کو مزید حیرت ہوئی تھی۔

''جی......''

''تمہیں کیوں ساتھ لے کر نہیں گیا؟''

''اس کا کچھ ذاتی کام تھا۔''

''حیرت ہے۔ تم سے ہٹ کر بھی اس کا کچھ ذاتی کام ہو سکتا ہے۔'' شائستہ واقعی ہی میں حیران تھی۔

خیام اور ضامن...... دونوں میں اتنی دوستی تھی کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی تھی کہ یہ واش روم میں اکیلے کیسے چلے جاتے ہیں۔ اور خیام کیا جواب دیتا کہ اس بات پر تو خیام کو خود حیرت تھی۔ ضامن نے آج تک اس سے کوئی بات نہیں چھپائی تھی۔ چھپانے کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ دونوں جو بھی کام کرتے تھے ساتھ ساتھ کرتے تھے۔

لیکن یہ پہلا کام تھا جس پر ضامن نے خیام سے کہا تھا کہ وہ اس کے بارے میں کسی سے بات نہیں کرنا چاہتا ہے۔ اور خیام خاموش ہو گیا تھا۔

خیام اور ضامن...... دونوں کی دوستی ان کے بچپن سے شروع ہوئی تھی۔ خیام کی فیملی کو لندن میں

رہتے ہوئے دو سال ہو چکے تھے جب ضامن کی فیملی بھی وہاں شفٹ ہوئی تھی۔ وہ لوگ کراچی سے اپنا سب کچھ چھوڑ کر وہاں آئے تھے۔ اور نئی زندگی شروع کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے خیام کے گھر کے ساتھ والا گھر خریدا تھا۔ اور یوں دیارِ غیر میں وہ ان کے واحد پاکستانی ہمسائے بن گئے تھے۔

ضامن اور خیام دونوں ہم عمر تھے۔ دونوں میں جلد ہی دوستی ہو گئی تھی۔ اتفاق سے دونوں ایک ہی اسکول میں جانے لگے تھے۔ خیام کے والد جمال اور ضامن کے والد زوہیب میں بھی اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ دونوں ویک اینڈ پر ایک ساتھ گھومنے پھرنے کا پروگرام بنا لیا کرتے تھے۔ کبھی کسی جنگل جانے کا پلان تو کبھی پہاڑوں پر جانے کا......

لیکن خیام کی والدہ شائستہ کی ضامن کی والدہ زویا سے دوستی نہیں ہو سکی تھی۔ زویا کچھ عجیب مزاج کی لیڈی تھی۔ وہ کم بولتی تھی اور لوگوں کو کم ہی منہ لگاتی تھی۔ نجانے کراچی سے وہ لوگ کن حالات کا سامنا کر کے لندن شفٹ ہوئے تھے کہ زویا کے سخت اعصاب ڈھیلے ہونے کا نام نہیں لیتے تھے۔

سردی بڑھتی تھی تو اسے برف سے نفرت ہو جاتی تھی۔ دو چار دن دھوپ نکلتی تھی تو وہ سورج کو ناگواری سے دیکھا کرتی تھی۔ وہ کسی حال میں خوش نہ رہنے والی خاتون تھی۔

شائستہ اکثر ان سب کو اپنے گھر دعوت پر بلایا کرتی تھی لیکن زویا نے یہ تردد کبھی نہیں کیا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اسے شائستہ کی فیملی سے چڑ تھی۔ بس شاید وہ کچھ آدم بیزار خاتون تھی۔ پھر آنے والے دنوں میں وہ کچھ بیمار بھی رہنے لگی تھی۔

خیام زیادہ تو نہیں جانتا تھا، لیکن بس اتنا ہی کہ پاکستان میں ان کا کوئی بھائی ہے، جس کا انہوں نے غم لے لیا ہے۔ آنے والے دنوں میں یہ غم اتنا بڑھ گیا تھا کہ ان کا نفسیاتی علاج شروع ہو چکا تھا۔ جس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ ان دنوں کے بعد سے خیام نے انہیں کبھی نارمل نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ ان کی صحت دن بدن گرتی ہی رہی تھی۔

ضامن کے گھر سے اکثر زویا کے چلانے کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ اسے غصے کے یا شاید صدمے کے دورے پڑا کرتے تھے۔ وہ چیزوں کو اٹھا اٹھا کر پھینکا کرتی تھی۔ اور نجانے کس کس کو گالیاں دیا کرتی تھی۔ ایسے میں ضامن، خیام کے گھر آ کر وقت گزارا کرتا تھا۔

اولیول کے بعد اے لیول کے لیے بھی دونوں کا ایڈمیشن ایک ہی سنٹر میں ہوا تھا۔ دونوں ٹین ایج سے نکل چکے تھے۔ لیکن ایک دوسرے کے حوالے سے ان کا خلوص کم نہیں ہوا تھا۔ ایک دوسرے کو لے کر ان کے مزاج میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ دیارِ غیر میں دونوں کو ایک دوسرے کا ساتھ باقی سب سے بڑھ کر لگتا تھا۔ دونوں رات کا کھانا ساتھ میں کھاتے تھے۔ یا تو خیام، ضامن کے گھر چلا جاتا تھا یا ضامن خیام کے گھر آ جاتا تھا۔

شائستہ کو خیام کے ساتھ ساتھ ضامن کی پسند ناپسند کا بھی علم تھا۔ اتنا کہ شاید اتنا تو خود زویا کو بھی اپنے بیٹے کی پسند ناپسند کا علم نہ ہو۔ عید تہوار پر وہ دونوں کے ایک جیسے کپڑے لایا کرتی تھی۔ زویا کو ضامن سے کچھ زیادہ سروکار نہ تھا۔ اسے اس بات پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ ضامن اس کے بجائے شائستہ کے ساتھ زیادہ وقت گزارتا ہے۔

ہر لمحہ ساتھ گزارنے اور ہر کام میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک رہنے کے باوجود دونوں کے مزاج میں انفرادی تبدیلی موجود رہی تھی۔ خیام کا ذہن تخلیقی کاموں کی طرف زیادہ تھا۔ اسے موسیقی اچھی لگتی تھی۔ کہانیاں پڑھنا، جادو دیکھنا، پینٹنگ کرنا......

جبکہ ضامن کو جسمانی سرگرمیوں میں دلچسپی تھی۔ وہ اسپورٹس میں جانا چاہتا تھا۔ جم خانہ اس کی محبوب جگہ تھی۔ سوئمنگ اس کا روز کا معمول تھی۔

پھر لندن میں ایک لمبا عرصہ قیام کرنے کے بعد خیام کے والد کی پوسٹنگ اسلام آباد میں ہو گئی اور خیام کی فیملی کو اسلام آباد شفٹ ہونا پڑا تھا۔ خیام کچھ عرصہ ضامن لوگوں کے ساتھ رہا تھا۔ چند سال

کے بعد اپنی تعلیم مکمل ہو جانے پر وہ بھی اسلام آباد اپنے والدین کے پاس آ گیا تھا۔ خیام، لندن اور ضامن کو چھوڑنے کے خیال سے اداس تھا لیکن ضامن نے اس سے کہا تھا کہ شاید وہ بھی جلد ہی پاکستان شفٹ ہو جائیں۔ اور پھر ایسا ہو بھی گیا تھا۔ ایک سال کے بعد ضامن کی فیملی بھی کراچی شفٹ ہو گئی تھی۔ شاید ایسا زویا کے ڈاکٹر کے مشورے پر کیا گیا تھا۔ جو بھی تھا، ضامن کی فیملی کے پاکستان شفٹ ہو جانے سے خیام کو بے حد خوشی ہوئی تھی۔

اب پچھلے کافی دنوں سے ضامن اسلام آباد میں موجود تھا۔ وہ خیام کے گھر میں رہ رہا تھا۔ اس کا قیام لمبا تھا لیکن وہ کس مقصد کے لیے اسلام آباد آیا تھا اس نے یہ نہیں بتایا تھا۔ پستول سے باریشہ کو ڈرانے والے معاملے پر بھی اس نے بس اتنا ہی کہا تھا کہ وہ بس اس لڑکی کی توجہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔

''کیا تو اس سے محبت کرتا ہے؟'' خیام نے پوچھا تھا۔

''ہرگز نہیں...... میں اس سے بالکل محبت نہیں کرتا اور نہ ہی کر سکوں گا۔'' ضامن نے اس قدر ٹھوس لہجے میں کہا تھا کہ اسی ٹھوس لہجے کی بدولت خیام کو باریشہ میں دلچسپی لینے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی تھی۔

جب ضامن نے قطعیت سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تو بھلا خیام کیوں اپنے جذبات پر پہرا لگاتا۔ وہ مطمئن تھا۔ وہ دوستی کے درمیان محبت کو لانے والا کام نہیں کر رہا تھا۔

''لیکن وہ لڑکی ہے کون......؟ تو اسے کیسے جانتا ہے اور کب سے؟''

خیام کو تجسس تھا۔ اور اس کے سوال پر ضامن چند لمحے خاموش رہا تھا۔ جیسے سوچ رہا ہو کہ اسے کیا کہنا چاہیے۔ سچ بتا دینا چاہیے یا سب چھپا لینا چاہیے۔ سچ بتانے کا ایک نقصان تھا۔ خیام نے اسے ایسا ہرگز نہیں کرنے دینا تھا جیسا وہ سوچ کر بیٹھا ہوا تھا، اس لیے اس نے چھپا لینے کا فیصلہ کیا تھا۔

''اس بارے میں مجھ سے کبھی کچھ مت پوچھنا خیام...... میں نہیں بتا سکوں گا۔'' ضامن نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا تھا۔

خیام کو کچھ حیرت ہوئی تھی۔

''لیکن کیوں...... ایسی کیا بات ہے؟''

''میں تجھے اپنی دوستی کا واسطہ دیتا ہوں خیام......'' ضامن نے منت سے کہا۔

''ایسا کیا ہے؟'' اس کا تجسس جائز تھا۔

''کچھ ایسا نہیں ہے جو برا ہو۔ لیکن شاید مجھ سے بتایا نہیں جائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ دوستی کے واسطے کے بدلے میں اس بارے میں کبھی کچھ نہیں پوچھوں گا۔'' خیام نے صرف کہا نہیں تھا بلکہ طے بھی کر لیا تھا کہ وہ کبھی ضامن سے باریشہ کے بارے میں نہیں پوچھے گا۔ ضامن اس کا بچپن کا دوست تھا۔ وہ اسے اچھے سے جانتا تھا۔ وہ کسی کے بارے میں کچھ برا نہیں سوچ سکتا تھا۔ کرنا تو دور کی بات تھی۔

اور اگر وہ اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا تھا تو یقیناً اس میں کچھ بہتری ہو گی۔

☆......☆......☆

''کہاں گئی تھیں تم باریشہ......'' وہ گھر کے اندر داخل ہو رہی تھی جب سانول کسی طرف سے نکل کر اس کے سامنے آیا تھا۔

''کسی کو کچھ بتا کر ہی نہیں گئی، میں تمہیں کال کر رہا تھا، تم نے کال بھی پک نہیں کی۔''

''خیریت......؟ تم کیوں کال کر رہے تھے؟''

''ویسے ہی...... کافی وقت ہوا تم سے بات کیے ہوئے؟'' وہ سنجیدگی سے کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''موبائل سائلنٹ پر تھا۔ اس لیے پک نہیں کر سکی۔''

"بتا کر تو جانا چاہیے تھا۔" بڑا بچہ معصومیت سے کہہ رہا تھا۔

"معذرت چاہتی ہوں، کچھ خیال نہیں رہا۔"

"تم کافی خوش نظر آ رہی ہو؟"

"اچھا...... نہیں کچھ خاص نہیں۔" اس نے جلدی سے خود کو نارمل کیا تھا۔ جب سے وہ ضامن سے ملی تھی، نوٹ کر رہی تھی وہ کچھ زیادہ ہی خوش نظر آ رہی تھی۔

"تو پھر عام ہی بتا دو۔" وہ مسکرایا تھا۔

"چلو...... بیٹھتے ہیں پھر......" اس نے باغ کے وسط میں لگی سیٹنگ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا تھا۔ ابھی دونوں وہاں بیٹھنے ہی لگے تھے جب ایک ملازمہ ان کے پاس آئی۔

"باریشہ بی بی! آپ کو کومل بیگم بلا رہی ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں آتی ہوں۔" باریشہ نے ملازمہ سے کہا تھا اور پھر سانول کو دیکھا تھا۔

"ہم شام میں بات کرتے ہیں سانول......"

"کیوں نہیں......" اس نے خوش دلی سے کہا تھا۔

باریشہ وہاں سے چلی گئی۔ سانول کو کومل آنٹی پر شدید غصہ آیا۔

کومل بیگم لاؤنج میں ٹہل رہی تھی اور کچھ غصے میں نظر آ رہی تھی۔ باریشہ وہاں آئی۔

"آپ نے بلایا آنٹی......"

"دیکھ رہی ہوں کہ تم دن بدن خود سر ہوتی جا رہی ہو باریشہ......" کومل نے چھوٹتے ہی کہا تھا۔

باریشہ نے حیرت سے انہیں دیکھا تھا۔

"کہاں جا رہی ہو، کہاں سے آ رہی ہو۔ گھر میں کسی کو بتانا مناسب نہیں سمجھتی ہو۔"

"ایسا نہیں ہے۔" کومل کے بدلے ہوئے لہجے پر وہ تو گھبرا ہی گئی تھی۔

''مت بھولو کہ ہم تمہارے گارجئین ہیں۔ تمہاری حرکات وسکنات کا ہمیں علم ہونا چاہیے۔''

''جی......''

''اب بتاؤ کہ کہاں گئی تھی تم......؟'' کومل نے بیٹھتے ہوئے پوچھا تھا۔ باریشہ کھڑی رہی تھی۔ کومل نے آج اسے کچھ ڈرا دیا تھا۔

''کل جس لڑکے نے مجھے گھر تک چھوڑا تھا، میں آج اسی سے ملنے گئی تھی۔'' باریشہ نے بتایا تھا۔ کومل نے ناگواری سے اسے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سوال ہی سوال تھے۔

''وہ ایک پروڈکشن کمپنی اوپن کرنے والا ہے۔ میڈیا میں جانا چاہتا ہے۔ مجھے اپنی ٹیم کا حصہ بنانا چاہتا ہے۔''

''پھر تم نے کیا کہا؟''

''میں نے اسے رضامندی دے دی۔''

''کس سے پوچھ کر......؟'' کومل بیگم تو آج ڈرانے پر تلی ہوئی تھی۔ باریشہ سے کوئی جواب نہیں دیا گیا تھا۔

''کیا تم اب اتنی بڑی ہوگئی ہو کہ اپنی زندگی کے فیصلے خود کروگی۔''

''ایسا نہیں ہے۔ آپ کہیں گی تو میں اسے انکار کر دوں گی۔'' باریشہ نے شرمندگی سے کہا تھا۔ کومل بیگم چند لمحے غور وفکر کرتی رہی تھی۔

''کل اس لڑکے کو گھر پر بلاؤ۔ میں اپنی تسلی کروں گی، پھر سوچوں گی کہ کیا کرنا ہے۔''

''جی بہتر......'' باریشہ نے کہا تھا۔ پھر اجازت پاکر وہ جلدی سے اپنے کمرے کی طرف گئی تھی۔

☆......☆......☆

برسات کی الوداعی کے دن قریب آچکے تھے۔ درختوں، پودوں اور سبزے نے بہت دن پانی

میں گزارے تھے۔ حویلی کی دیواروں پر گہرے سبز رنگ کی کائی جم چکی تھی۔ جو کہ اب رفتہ رفتہ ہی جانے والی تھی۔ اشیاء جو چالیس دنوں سے زیادہ نمی والی فضا کے زیر اثر سانسیں لے رہی تھیں، ان کی جانچ کا وقت قریب آ گیا تھا۔

چاند بہت دنوں کے بعد آج بڑے کمرے میں آئی تھی۔ درگا مورتی والے کمرے میں...... یہ کمرا کافی دنوں سے بند پڑا تھا۔ باریشہ حویلی میں ہوتی تھی تو عید وغیرہ پر پوری حویلی کی صفائی کرنے کے ساتھ ساتھ اس کمرے کی صفائی بھی کر دیا کرتی تھی لیکن اب جب سے باریشہ حویلی سے گئی تھی، چاند سے اکیلے حویلی سنبھالی نہیں جاتی تھی۔ آمنہ بی بی تو چاند سے بھی زیادہ بوڑھی تھی۔ زندگی کے دکھوں نے اسے بوڑھے سے زیادہ کمزور کر دیا تھا۔ بھلا وہ کیسے چاند کی مدد کر سکتی تھی۔ وہ تو اب موت کا انتظار کر رہی تھی کہ اللہ کب اس کا پردہ ڈھانک لے۔ اور ارشادی آ کر اس کی آنکھوں کو اپنے ہاتھوں سے بند کرے۔

آنکھیں...... جو اب عرصہ دراز سے اسی کام کی منتظر تھیں۔

چاند جھاڑو اور جھاڑ پونچھ والا کپڑا لیے کمرے میں آئی تھی۔ اسے اپنی والدہ کی بات نہیں بھولی تھی کہ جس جگہ مٹی ہو وہاں فرشتے نہیں آیا کرتے...... یہ ہی وجہ تھی کہ وہ ان کمروں کی بھی صفائی کیا کرتی تھی جو اب کسی کے استعمال میں نہیں رہے تھے۔

سب سے پہلے وہ کمرے میں سائیڈ پر پڑے ہوئے ٹرنکوں کو صاف کرنے لگی تھی۔ اندر موجود سامان اب کسی کام کا نہیں رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے اس سامان پر صدیاں بیت چکی ہوں۔ کچھ ساز تھے، کچھ پوجا سے متعلق سامان اور کچھ ایسا ہی غیر ضروری سامان...... وہ اندر سے ساری چیزوں کو نکال نکال کر انہیں صاف کرتے ہوئے پھر سے ترتیب سے رکھنے لگی تھی۔ گرد زیادہ تو نہیں تھی پھر بھی اسے کھانسی ہونے لگی تھی۔ اس سب کے باوجود وہ لگی رہی تھی۔ ایک کے بعد ایک خالی اور بے کار سامان سے بھرے ہوئے ٹرنکوں کی گرد صاف کرتی رہی تھی۔

یہ سب کام کرنے کے بعد چاند نے درگا مورتی کی سب سے بڑی مورتی پر پڑی بڑی سی سفید چادر کو اتار دیا تھا۔ درگا ماں اپنی پوری آن بان شان کے ساتھ شیر کے اوپر براجمان، گوٹے کناری سے مزین سرخ جوڑا پہنے ہوئے عیاں ہوئی تھی۔ اپنے دس ہاتھوں میں دس مختلف ہتھیار پکڑے ہوئے۔ کنول، تلوار، تیر کمان، عصا، وجرا، کلہاڑا، سانپ، سنکھ، سدرا شن اور ترشول......

نہ چاہتے ہوئے بھی چاند نے ترشول کو پکڑ لیا تھا۔ اس ترشول کے بھیتر کہیں التمش کا خون ابھی تک جما ہوا تھا۔ وہ نظر تو نہیں آتا تھا لیکن وہ اندر موجود تھا۔ وہ جانتی تھی۔ اس نے ترشول کو اپنے وجود میں بھینچ لیا تھا جیسے التمش کو بھینچ رہی ہو۔ دو آنسو اس کی آنکھوں سے جاری ہوئے تھے۔ وہ مزید نہیں رونا چاہتی تھی اس لیے اس نے جلدی سے ترشول کو واپس اس کی جگہ پر رکھ دیا تھا۔ اور پھر دھیان بٹانے کو جلدی سے گرد صاف کرنے لگی تھی۔ جلدی جلدی کپڑا اجھاڑتے اس کے ہاتھ تب رکے تھے جب اسے کوئی چیز ہلتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اور اس چیز کو دیکھ کر چاند کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

سیاہ کھال پر پیلی چتیوں والا ایک سانپ مورتی کے وجود سے لپٹا ہوا تھا۔ چاند فوراً سے پرے ہوئی تھی۔ سانپ نے پھنکار کی تھی۔ اس کی پھنکار میں خوف تھا۔ کچھ اور سمجھ میں نہ آیا تو اس نے ہاتھ میں پکڑا کپڑا سانپ پر دے مارا تھا۔ سانپ مورتی کی ٹانگ سے الگ ہوا تھا اور پھر کمرے کے کونے میں جانے لگا تھا۔ اس کی چال میں دہشت تھی۔ اپنے وجود کو بل پر بل دیتے ہوئے وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ چاند سب دیکھ رہی تھی اور خوف کا شکار تھی۔ نجانے یہ سانپ کب سے یہاں تھا اور اسے خبر تک نہ ہوئی تھی۔

گھبرا کر جلدی سے چاند وہاں سے بھاگی تھی اور اپنے کمرے میں جا کر اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ بہت دنوں کے بعد اسے کسی چیز نے ڈرایا تھا۔ وہ بیڈ پر لیٹ گئی تھی اور سانپ کے وجود کو یاد کرتے ہوئے اس کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔

کب سے تھا وہ یہاں پر...... اور کیوں تھا۔ پہاڑی علاقوں پر تو سانپ نہیں ہوا کرتے۔ اس نے

کبھی نہیں سنا تھا کہ دائیں بائیں کے کسی گھر سے کوئی سانپ نکلا ہے۔ پھر وہ یہاں کیا کر رہا تھا۔ اور اب وہ کیسے یہاں سے جائے گا۔ اس نے اسے ڈس لیا تو......؟ یا آمنہ بی بی کو......؟

پھر یہاں کون کس کا سہارا بننے کو موجود رہ جانے والا تھا؟

رات گہری ہونے تک وہ اس سانپ کے بارے میں ہی سوچتی رہی تھی۔ اس مسلسل سوچ نے اس کے خوف کو کچھ کم کیا تھا۔ پھر نجانے اس کے دل میں کیا آئی تھی۔ وہ بیڈ سے اٹھ کر کچن میں آئی تھی۔ ایک کٹوری میں اس نے دودھ ڈالا تھا اور درگا مورتی والے کمرے میں آگئی تھی۔ دودھ سے بھری کٹوری کو اس نے کمرے کے وسط میں رکھ دیا تھا اور پھر کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔ اس کام نے نجانے کیوں اسے بے حد خوشی دی تھی۔

☆......☆......☆

باریشہ کے کہنے پر ضامن کومل بیگم سے ملا تھا اور اس سے ملنا کافی فائدہ مند ثابت ہوا تھا۔ کومل بیگم ان معاملات میں ضامن کی سوچ سے زیادہ معلومات رکھتی تھی۔

''کسی بھی پروڈکشن کمپنی کو اپنے آغاز میں ایک بینگ کا دینا بے حد ضروری ہوتا ہے۔ اس سے کمپنی کی تشہیر ہوتی ہے۔'' کومل بیگم نے کہا تھا۔

''کس طرح کا بینگ......؟''

''ظاہر ہے جو تمہارے کام سے منسلک ہو۔ ایک جاندار ڈرامہ...... جو شروع ہونے سے ختم ہونے تک ناظرین کو اپنے ساتھ جوڑے رکھے۔''

''جی...... یہ تو ہے۔''

''کیا تمہارے پاس انویسٹر ہے؟''

''میری ساری سیونگ اس پروڈکشن ہاؤس کو کھولنے میں لگ چکی ہیں۔''

''میں سمجھ سکتی ہوں کہ پروڈکشن ہاؤس کھولنے کے بعد تمہارے پاس زیادہ سیونگ نہیں ہوگی۔ تم فکر مت کرو۔ انویسٹر میں تمہیں دے دوں گی۔ میں بہت سے لوگوں کو جانتی ہوں جو ڈرامہ میں انویسٹ کرنا چاہتے ہیں۔ تم اپنی کمپنی کو کب تک لانچ کرنا چاہتے ہو؟''

''جلد سے جلد......''

''ٹھیک ہے۔ پھر ایسا کرتے ہیں کہ پروڈکشن ہاؤس کی افتتاحی تقریب پر ہی ڈرامہ بھی اناؤنس کردیں گے۔''

''کیا اتنی جلدی یہ ممکن ہوگا؟''

''بالکل...... میرے ہوتے ہوئے تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' کومل بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

اور پھر واقعی ہی میں ایسا ہی ہوا تھا جیسا اس نے کہا تھا۔ یا وہ کہہ کر کر دینے والی خاتون تھی۔ اس کی معلومات حیرت انگیز تھیں۔ اس کا حلقہ احباب کافی وسیع تھا۔ بہت جلد اس نے ضامن کو پروڈکشن سے منسلک تمام لوگوں سے ملوا دیا تھا۔ اور جلد ہی ایک ٹیم اکٹھی ہوگئی تھی۔

پروڈکشن کمپنی کا پہلا اسکرپٹ جلد ہی مکمل ہوگیا تھا۔ ڈرامہ ملک کے مشہور مصنف سے لکھوایا گیا تھا۔ ڈرامے کا نام ''دوریاں'' تھا اور جسے چینل سے پاس بھی کروا لیا گیا تھا۔ کومل بیگم نے خود مصنف سے بات کر کے باریشہ کے کردار کو بہت جاندار لکھوایا تھا۔ وہ کہانی کو اپنے حساب سے توڑتی مروڑتی رہی تھی۔

''آپ کی توانائی پر میں تو حیران ہوں۔'' ضامن نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ کومل بیگم اتراہٹ سے مسکرائی تھی۔

بہت زیادہ مددگار کومل بیگم کے رویے پر ضامن کو تب بہت زیادہ حیرت ہوئی تھی جب کومل بیگم نے اس سے باریشہ کی پے منٹ کے حوالے سے بات کی تھی۔ اس نے ضامن سے ایک بڑی رقم کا

مطالبہ کیا تھا اور اس حوالے سے اس کا رویہ بہت سخت تھا۔ کومل بیگم نے اسے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اتنے پیسوں سے ایک پیسہ کم نہیں لے گی۔ اس کی بات پر ضامن الجھن کا شکار ہوا تھا لیکن اس نے اسے رضامندی دے دی تھی۔ ایک تو اس وجہ سے کہ اس نے اس کا بہت ساتھ دیا تھا۔ دوسرا یہ کہ وہ ہر صورت باریشہ کے ساتھ کام کرنا چاہتا تھا۔ اس بات کا جب باریشہ کو علم ہوا تھا تو اس نے کومل بیگم سے اس بارے میں باز پرس کی تھی۔

''کبھی بھی اپنی قیمت کم نہیں لگاتے میری جان...... پھر لوگ بھی قدر نہیں کرتے۔''

''لیکن یہ اس کی پروڈکشن کا پہلا پراجیکٹ ہے۔''

''پہلا ہو یا آخری...... مفت میں کوئی کام نہیں کر رہا ہے۔ پھر تم کیوں مفت میں کام کرو۔''

''لیکن مطالبے میں کچھ کمی تو کی جا سکتی ہے نا......''

''جو مجھے بہتر لگا میں نے کیا باریشہ...... بہتر ہے کہ تم پراجیکٹ پر توجہ دو۔ ان باتوں پر نہیں......''

اس نے دوٹوک کہا تھا۔

باریشہ چپ ہو گئی تھی۔ کیونکہ اس کا رویہ باریشہ کے ساتھ دن بدن سخت ہوتا جا رہا تھا۔ باریشہ کو تب مزید حیرت ہوئی تھی جب اسے معلوم ہوا تھا کہ گھر کی مزید لڑکیوں کو پراجیکٹ میں سائن کروا دیا گیا ہے۔

''وہ سب بھی کام کرنا چاہتی ہیں۔ اچھا ہے کہ انہیں بھی موقع مل رہا ہے۔'' کومل بیگم نے بتایا تھا۔

''لیکن انہوں نے تو کبھی اس طرف توجہ نہیں دی۔''

''تم سے زیادہ میں جانتی ہوں انہیں...... وہ اپنے چھوٹے چھوٹے شہر چھوڑ کر اس بڑے شہر میں کوئی نام بنانے ہی آئی ہیں۔''

کومل بیگم کی بات پر باریشہ تذبذب کا شکار ہوئی تھی۔ گھر کے متعلق اور لڑکیوں کے متعلق آئے روز نئے نئے انکشافات ہو رہے تھے۔ جو اسے حیرت میں مبتلا کر رہے تھے۔ لڑکیوں کا راتوں کو نکل جانا اور صبح

میں آنا اسے عجیب لگتا تھا۔ لیکن جس وقت میں وہ موجود تھی ایسے میں اسے پریشان ہونے کے بجائے اپنے کام پر توجہ دینا تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ جلد ہی فارغ ہو کر اس سب کی چھان بین کرے گی۔

''ڈرامے کا او ایس ٹی لکھا گیا ہے۔ یقیناً یہ تمہاری آواز میں اچھا لگے گا۔'' ضامن نے ایک دن اس سے کہا تھا۔

''تمہیں کیسے معلوم کہ مجھے گانے کا شوق بھی ہے۔''

''بس...... جانتا ہوں۔ تمہاری آنٹی سے باتوں باتوں میں اس بات کا بھی ذکر ہوا تھا۔'' ضامن نے بتایا تھا۔ باریشہ کو حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی ہوئی تھی۔

''دیکھا...... کسی وقت کی سیکھی ہوئی چیز کسی وقت میں کام آ ہی جاتی ہے۔'' نتاشا بھی خوش تھی۔

''یہ تو ہے......''

''اب تمہیں کامیابی سے کوئی نہیں روک سکتا ہے باریشہ......''

آنے والے دن بہت مصروف گزرے تھے۔ وہ اور ضامن کی پوری ٹیم دن رات کام میں مصروف رہے تھے۔ اور پھر بالآخر پروڈکشن کی افتتاحی تقریب کا دن آ پہنچا تھا۔ جس کا سب کو شدت سے انتظار تھا۔



دھرتی کا سفر کرتا ہوا سورج پھر سے حویلیاں کی سرزمین کے اوپر آ گیا تھا۔ اور حویلیاں کی اونچی نیچی زمین کو منور کرنے لگا تھا۔

ناشتا کرنے اور آمنہ بی بی کو ناشتا دینے کے بعد چاند بہت پرجوش انداز میں درگا مورتی والے کمرے میں آئی تھی۔ نجانے اسے کس بات کی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ خود نہیں جانتی تھی۔

آہستگی سے اس نے بڑے کمرے کا دروازہ کھولا تھا۔ جیسے ڈر ہو کہ زیادہ شور سے اندر موجود

سانپ بھاگ نہ جائے۔ کمرے کے وسط میں دودھ سے بھری ہوئی کٹوری اب خالی تھی۔ اور پیلی چیتیوں والا موٹا سانپ درگا موورتی کی ٹانگ سے لپٹا ہوا تھا۔ خوشی سے چاند کا چہرہ دمکنے لگا تھا۔ اس نے آہستگی سے آگے بڑھ کر کٹوری کو اٹھا لیا تھا اور کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔ اس دن کے بعد یہ اس کا معمول بن گیا تھا۔ وہ روز رات کو وہاں دودھ سے بھری کٹوری رکھ دیا کرتی تھی۔ جو اگلے دن خالی ہوتی تھی۔

پہلے صندل، پھر باریشہ، پھر آمنہ......اور اب......

چاند نے ایک سانپ کو گود لے لیا تھا۔

☆......☆......☆

ڈائریکٹر نے اس دن دس سین شوٹ کیے تھے۔ جس کے باعث باریشہ بہت تھک چکی تھی۔ سین کو تین تین چار چار طرح سے عکس بند کروا کر اور کپڑے تبدیل کر کر کے......میک اپ کی بار بار تبدیلی نے بھی اسے تھکا دیا تھا۔ پھر اس سب میں رات کے تین بج چکے تھے۔ سارا عملہ ہی نڈھال تھا۔ سب کو نیند آنے لگی تھی۔

دسویں سین کے مکمل ہوتے ہی ڈائریکٹر نے پیک اپ کال دے دی تھی۔ جس سے سیٹ پر ہلچل بڑھ گئی تھی۔ سب پیک اپ میں مصروف ہو گئے تھے۔ لائٹس والے لائٹس کو سمیٹنے لگے تھے۔ آڈیو ڈیپارٹمنٹ کے لڑکے اپنے مائیک وغیرہ کو پیک کرنے لگے تھے۔

کپڑے تبدیل کرنے کے بعد باریشہ ضامن کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی جو اپنی سیٹ پر کافی دیر سے خاموش بیٹھا تھا۔

”شوٹ سے مطمئن ہو؟“

”بالکل......تمہاری کومل آنٹی نے بہت اچھی ٹیم بنا دی ہے میری......ڈائریکٹر، اسسٹنٹ ڈائریکٹر، سب بہت محنت سے کام کر رہے ہیں۔ میں متوقع کامیابی کے حوالے سے پر جوش ہوں۔“

''ہونا بھی چاہیے۔ میں بھی بہت ایکسائٹڈ ہوں۔'' اس نے کہا تھا۔

ضامن نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔

''میں تمہیں مایوس نہیں کروں گی ضامن......''

''جانتا ہوں۔'' کہہ کر وہ پھر سے خاموش ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر کچھ پریشانی جھلک رہی تھی۔ ایسے جیسے اپنے ساتھ کچھ جوڑ توڑ کر رہا ہو۔

باریشہ اسے دیکھنے لگی تھی۔ وہ آج صبح سے ہی کچھ چپ چپ تھا۔ اس نے دوپہر اور رات کا کھانا بھی کچھ زیادہ دلچسپی سے نہیں کھایا تھا۔ باریشہ نے اس سے اس بارے میں پوچھا تھا لیکن اس نے کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دیا تھا۔

''کوئی بات ہے جو تمہیں پریشان کر رہی ہے ضامن......؟''

''نہیں......ایسی کوئی بات نہیں......وہ پروڈیوسر تم سے ملنا چاہتا ہے۔''

''ٹھیک ہے......کب ملنا ہے؟''

''کل مل لو......''

''کہاں پر......؟''

''میں تمہیں لوکیشن سینڈ کر دوں گا۔ تم جا کر ان سے مل لینا۔''

''تم ساتھ ہو گے؟''

''کوشش کروں گا آنے کی...... ورنہ تم چلی جانا۔ میرا ویسے بھی وہاں کیا کام...... ہیروئن تم ہو......میں نہیں......''

''ٹھیک ہے، جیسا تم کہو......'' باریشہ نے کہا تھا۔

ضامن اٹھ کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ باریشہ اسے جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ اور سوچ رہی تھی کہ اس

بات میں ایسا کیا تھا جس کی وجہ سے ضامن آج صبح سے ہی چپ تھا۔ یہ تو بے حد نارمل بات تھی۔ اس میں پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی۔

☆......☆......☆

شیراز آفندی کا فارم ہاؤس شہر سے کافی دور تھا۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ وہاں جا رہی تھی اور اکیلی جا رہی تھی۔ وہ نتاشا کے ساتھ وہاں جانا چاہتی تھی لیکن کومل آنٹی نے اس سے کہا تھا کہ اب وہ اپنے اندر کچھ خود اعتمادی پیدا کرے۔ نتاشا کے ساتھ جانے میں یہ چیز پیدا کرنا مشکل تھا۔

کومل آنٹی کی بات پر اسے بھی اپنے اندر خود اعتمادی کی کمی محسوس ہوئی تھی۔ اس لیے وہ ڈرائیور کے ساتھ اکیلی ہی شیراز آفندی سے ملنے اس کے فارم ہاؤس چلی آئی تھی۔ وہ فارم ہاؤس اتنا دور تھا کہ اسے ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ کسی دوسرے شہر جا رہی ہو۔

"کتنا فاصلہ رہ گیا ہے؟" اس نے کوئی تیسری بار پوچھا تھا۔

چونکہ وہ ساری زندگی حویلیاں شہر سے باہر نہیں نکلی تھی، اس لیے اسے اندازہ نہیں تھا کہ فارم ہاؤس شہر سے دور ہی بنائے جاتے ہیں۔

"بس چند منٹ اور......" ڈرائیور نے بتایا۔

پھر جس جگہ گاڑی رکی تھی اس جگہ کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھی۔ وہ جگہ کافی سرسبز اور خوش گوار فضا والی تھی۔ فارم ہاؤس کافی بڑا تھا۔ بہت بڑا رقبہ تو باغ پر مشتمل تھا۔ تعمیر شدہ عمارت آنے میں کافی وقت لگ گیا تھا۔ ملازمہ نے دروازہ کھولا تھا اور پھر وہ ملازمہ کی ہی تقلید میں اندر عالیشان لاؤنج میں چلی آئی تھی۔

"آپ کچھ پینا پسند کریں گی؟"

"نہیں...... شکریہ!" اس نے مسکرا کر کہا۔ ملازمہ وہاں سے چلی گئی تھی۔

باریشہ بیٹھ گئی تھی اور فارم ہاؤس کی خوب صورتی کو دیکھنے لگی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہاں شیراز

آفندی داخل ہوا۔ بڑی عمر کا اور بھاری وجود کا آدمی...... لیکن اس عمر میں بھی کسی حد تک جوان دکھتا ہوا۔ باریشہ اسے پہلی بار دیکھ رہی تھی اور اسے پہلی بار دیکھ کر ہی باریشہ بے چین ہو گئی تھی۔

شیراز آفندی نے کھلی ڈلی پولوٹی شرٹ کے نیچے کھلی نیکر پہنی ہوئی تھی جو اس کے گھٹنوں سے اونچی تھی۔ اس کے چربی زدہ وجود کے گھٹنے دہرے پیڑے کی طرح نظر آ رہے تھے۔ وہ ہاتھ میں کسی سوڈا مشروب کا کین پکڑے ایسے داخل ہوا تھا جیسے کلب سے سیدھا وہیں آ رہا ہو۔ پھر بھی باریشہ اسے دیکھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کے اندر کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ وہ ارشادی بابا کی طرح کے کسی آدمی کو سوچ کر چلی آئی تھی اور یہاں اس کے سامنے اس کا متضاد آ بیٹھا تھا۔

''السلام علیکم!'' اس نے ادب سے سلام کیا تھا۔

شیراز آفندی نے سر کے اشارے سے جواب دیتے ہوئے ہاتھ سے اسے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا تھا۔ اور پھر اپنے ہاتھ میں پکڑے سوڈا کین میں سے ایک گھونٹ بھرا تھا۔

باریشہ اس کے سامنے بیٹھ گئی تھی۔ شیراز آفندی نے اسے سر سے پیر تک دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کسی گناہ کی چمک تھی۔ بستامی نے اب تک اس کے پاس بہت سی لڑکیاں بھیجی تھیں لیکن باریشہ کی تو بات ہی اور تھی۔ شیراز آفندی کی نظروں کی تپش کو محسوس کرتے ہوئے باریشہ کچھ سہم گئی تھی۔

''جوس......؟ کافی......؟''

''نہیں......کچھ نہیں۔''

''کام کیسا جا رہا ہے؟''

''اچھا جا رہا ہے۔''

''کافی بڑی انویسٹ کا پراجیکٹ ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری رقم ڈوب جائے۔''

''ہم سب بہت محنت سے کام کر رہے ہیں۔ کامیابی ملے گی۔'' اس نے مسکرانے کی کوشش

کرتے ہوئے کہا تھا۔

''ہوپ سو......'' شیراز آفندی نے جیسے بے دلی سے کہا تھا۔

وہ اتنا امیر تھا کہ پراجیکٹ کے فیل یا کامیاب ہونے کی اسے کوئی پروانہیں تھی۔

''Come! Sit with me.'' (آؤ میرے پاس آ کر بیٹھو) چند لمحے گزرنے کے بعد اس نے باریشہ سے کہا۔ باریشہ نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

''پلیز......کم......!''

چند لمحے تو باریشہ کو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

''تم سن رہی ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟'' اس نے رعب سے کہا تھا۔

باریشہ اٹھی تھی اور اس کے پاس جا کر کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی تھی۔ فاصلے پر بیٹھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا کیونکہ باقی کا فاصلہ شیراز آفندی نے قریب ہوتے ہوئے خود سے کور کرلیا تھا۔ وہ اسے محبت سے دیکھنے لگا تھا یا شاید کمینی نظروں سے......

''کافی حسین ہو تم......'' اس نے اس کے بالوں کی لٹ کو اپنی انگلی سے چھوتے ہوئے کہا تھا۔

''تھینکس!'' باریشہ نے بالوں کو کان کے پیچھے کیا تھا۔ شیراز آفندی کے چہرے پر سختی آئی تھی۔

''تمہارے جیسا چہرہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ حتیٰ کہ کسی بازار حسن میں بھی نہیں......'' باریشہ کے کانوں میں جیسے کسی نے جلتا ہوا سیسہ انڈیلا تھا۔

''مطلب......؟''

''کچھ نہیں......میں تو بس تمہاری تعریف کررہا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''تم اس سال کا سب سے کامیاب چہرہ ثابت ہوگی باریشہ......میں یہ بات لکھ کر دینے کو تیار ہوں۔'' شیراز آفندی نے کہتے ہوئے اپنا ہاتھ باریشہ کی ران پر رکھ دیا تھا۔

"آپ کی پیشن گوئی کا شکریہ!" باریشہ نے کہتے ہوئے اس کا ہاتھ پیچھے کیا تھا۔

شیراز نے سوڈا کین سے آخری گھونٹ لینے کے بعد کین کو سائیڈ پر رکھ دیا تھا۔اور پھر پوری توجہ سے باریشہ کو دیکھنے لگا تھا۔

"تم بہت حسین ہو باریشہ...... بہت خوب صورت......"

اس نے جیسے کسی خمار میں کہا تھا اور کہتے ہوئے اپنا سر باریشہ کی گردن پر جھکا دیا تھا۔اگلے ہی پل اس کے ہونٹ باریشہ کو اپنی گردن پر محسوس ہوئے تھے اور باریشہ تڑپ کر اٹھی تھی۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟" اس نے غصے سے چلا کر کہا تھا۔

شیراز آفندی بھی کھڑا ہو گیا تھا۔

"جس کے لیے تم یہاں آئی ہو......"

"کیا مطلب ہے آپ کا اس بات سے......؟" وہ چلائی تھی۔

"تم مجھے خوش کرنے کے لیے یہاں آئی ہو۔"

"یہ آپ نے کیسے سوچ لیا؟"

"تو پھر تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"میں تمہارے ساتھ رات گزارنا چاہتا ہوں۔" شیراز آفندی نے صاف گوئی سے کہا تھا اور باریشہ کا دل کیا تھا کہ وہ اس کا منہ نوچ لے۔"میں کیوں تم جیسی دو ٹکے کی ماڈل سے ملنا چاہوں گا۔تمہارے جیسی کتنی ماڈل میرے گھر کی ملازمہ بننے کے لائق نہیں ہیں۔تم نے کیا مجھے اپنا مداح سمجھ لیا تھا۔"

وہ بول رہا تھا اور باریشہ کی سانسیں بے ترتیب ہونے لگی تھیں۔

"تم کیا سمجھتی ہو۔ایسے ہی مل جاتا ہے ڈرامہ...... ایسے ہی مل جاتی ہے شہرت...... بہت کچھ کرنا پڑتا ہے اس کے لیے......"

"میں لعنت بھیجتی ہوں اس طرح کی سودے بازی پر......"

"یہ تمہیں پہلے سوچنا چاہیے تھا۔بیس دن کا شوٹ مکمل ہو چکا ہے۔ جانتی ہو کتنا پیسہ لگ چکا ہے اب تک......تم بک بھی جاؤ تو وہ پیسہ ادا نہیں کر سکتی ہو۔" اس نے گالی دینے والے انداز میں کہا تھا۔

"بستامی بابا آپ کو آپ کی رقم لوٹا دیں گے۔"

"کیا......؟ بستامی......؟" شیراز آفندی ہنسا تھا۔ "جو خود بھوکوں کا سردار ہے، وہ میرا پیسہ لوٹائے گا؟" شیراز آفندی نے نفرت سے کہا تھا۔

باریشہ سے کوئی جواب نہیں دیا گیا تھا۔ نجانے کس نے کس سے زیادہ فائدہ حاصل کیا تھا، وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔

"بے وقوفی مت کرو......لڑکیاں ترستی ہیں ایسے چانس کے لیے......آؤ......میرے پاس آؤ۔" اس نے باریشہ کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ باریشہ خود کو چھڑوانے لگی تھی۔

"چھوڑ دیں مجھے......"

"ضد مت کرو پلیز......مجھے زبردستی کرنا پسند نہیں ہے۔" وہ پھر سے اس پر جھکا تھا اور تب ہی باریشہ نے پوری شدت سے ایک زوردار طمانچہ اس کے منہ پر دے مارا تھا۔

طمانچہ کھانے کے بعد شیراز آفندی اسے دیکھنے لگا تھا۔ اس کا سارا نشہ جیسے ختم ہو گیا تھا۔ اور اب وہ باریشہ کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے کچا چبا جائے گا۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے......اس سے پہلے کہ میں تمہیں جان سے مار دوں۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے......" شیراز آفندی نے غصے میں چلاتے ہوئے کہا تھا۔

باریشہ اگلے ہی پل باہر کو بھاگی تھی۔

☆......☆......☆

چودھویں کا چاند سیاہ بادلوں کے ساتھ آنکھ مچولی کر رہا تھا۔ اس کی چاندنی کسی پل دھرتی پر پڑتی تھی اور کسی پل چھپ جاتی تھی۔ فیصل مسجد کے سفید مینار چاند کی روشنی میں چمکنے لگتے تھے۔ باریشہ نے میناروں کو دیکھا تھا اور پھر مارگلہ کی پہاڑیوں کو دیکھنے لگی تھی جہاں رات کے جگنو جگمگ کر رہے تھے۔

وہ فیصل مسجد کے صحن کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ آنکھوں میں آنسو لیے...... چہرے پر اداسی لیے......اور دل میں اپنے لیے خود ترسی لیے...... فارم ہاؤس کے بعد وہ سیدھا یہاں ہی آگئی تھی۔ اس کا گھر جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ کسی سے بات کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ تو فی الوقت خود سے بھی نظریں نہیں ملا پا رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ مارگلہ کے پہاڑ پار کر کے دور حویلیاں چلی جائے۔ اپنی پرانی حویلی کے اپنے پرانے سے کمرے میں بوسیدہ بستر پر جا کر گہری نیند سو جائے۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سالوں سے سوئی ہی نہیں ہے۔ اسے کسی نے سونے ہی نہیں دیا ہے۔ وہ اپنی پیدائش سے جاگ رہی ہے۔ تب ہی تو اس کے وجود پر اتنی تھکن سوار ہو چکی ہے۔ اس کے دل پر اتنا بوجھ بڑھ گیا ہے۔

لیکن وہ حویلیاں نہیں جا سکتی تھی۔ اپنی حویلی، اپنے کمرے اور اپنے بستر پر جانا، خود کو مارنے کے مترادف تھا۔ اس لیے وہ یہاں بیٹھی تھی۔ فیصل مسجد کے صحن کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے۔ ایک آنسو اس کی آنکھ سے جاری ہوا تھا اور پھر وہ باقی کے آنسو بھی رکے نہیں تھے۔ بلکہ ایک کے بعد ایک بہتے ہی رہے تھے۔

چاند کی لاڈلی نواسی...... صندل کی چہیتی بیٹی...... اپنی بے عزتی پر بے آواز رو رہی تھی۔

☆......☆......☆

فیصل مسجد کے صحن کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی وہ فیصل مسجد کی سفید عمارت کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں روشنی تھی۔ چہرے پر مدھم سی مسکراہٹ تھی۔ جس باعث اس کے گال کچھ چمک دیتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

خیام نے اپنے پورٹریٹ پر آخری اسٹروک لگایا تھا اور پھر ذرا فاصلے پر ہو کر اپنے پورٹریٹ کو دیکھا تھا۔

بار یشہ کا چہرہ پوری آب وتاب سے پورٹریٹ پر اتر چکا تھا۔ ایسے جیسے بس یہ چہرہ ابھی سانس لینے لگے گا اور وہ اس سے پوچھے گا کہ اسے کس نے کینوس پر اتارا ہے۔ پھر خیام اسے بتائے گا کہ اسے بنانے والا وہ خود ہے۔

چودھویں کا چاند سیاہ بادلوں کے ساتھ آنکھ مچولی کر رہا تھا۔ تصویر میں موجود فیصل مسجد کے سفید مینار چاند کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ اور مارگلہ کی پہاڑیوں پر رات کے جگنو جگمگ کر رہے تھے۔

خیام آج ساری رات اس تصویر کو دیکھتے ہوئے گزار سکتا تھا۔

☆......☆......☆

جھینگر کی آواز فضا میں گونج رہی تھی۔ جب سے برسات شروع ہوئی تھی ان کی آوازوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ پھر اسلام آباد جیسے خاموش شہر میں تو ان کی آواز کچھ زیادہ ہی خوف پھیلایا کرتی تھی۔

بار یشہ کو کبھی ان آوازوں سے خوف محسوس نہیں ہوا تھا کیونکہ حویلیاں میں ان آوازوں کے ساتھ ساتھ گیدڑوں کی آوازیں بھی آیا کرتی تھیں۔ جو عشاء اور فجر کی اذان ہوتے وقت تو ضرور ہی شور مچایا کرتے تھے۔

لیکن اس رات جھینگروں کی ان آوازوں کے ساتھ ساتھ کوئی اور آواز بھی فضا میں گونج رہی تھی۔

"کوئی بتائے مردود زندہ ہے یا مر گیا ہے۔"

گہری رات کے سناٹے میں آواز دور تک پھیلتی چلی گئی تھی۔ لیکن اس آواز کی گونج بہت مدھم تھی۔ ایسے جیسے کوئی لحافوں کے تلے دبا بول رہا ہو۔ اگر کسی نے یہ الفاظ پہلے نہ سنے ہوں تو اسے بالکل سمجھ میں نہ آئے۔ لیکن جو ایک بار سن لیتا ہے وہ بڑھیا کے پہلے ہی لفظ پر جان جاتا ہے کہ بوڑھی کیا کہہ رہی ہے۔

"فرعون مر گیا یا زندہ ہے۔ کیا کوئی ہے جو اس شیطان کو جہنم میں جلائے۔"

رات کی رانی کی خوشبو کی طرح آواز پورے گھر میں پھیلی تھی۔ اپنے کمرے میں سو رہی بار یشہ کی آنکھ کھل گئی تھی۔ آج دن میں ہوئے واقعہ کی وجہ سے ویسے ہی اس کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ اور جب آئی تھی

تو اب ایسے آنکھ کھلی تھی جیسے کسی نے اسے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا ہو۔

''خدا تجھے فرعون کی طرح پانی میں غرق کرے گا بستامی......'' بوڑھی چلا رہی تھی۔ باریشہ جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ اس آواز کو کیسے بھول گئی تھی۔ یہ آواز ایسی تو نہیں تھی جسے بھلایا جا سکتا۔ اس نے تو اس بارے میں کومل آنٹی سے پوچھنا تھا۔ اور وہ کیسے بھول گئی۔

اللہ...... اتنی بڑی غلطی کیسے ہو گئی اس سے......

سائیڈ لیمپ جلا کر باریشہ نے وقت دیکھا تھا۔ رات کے تین بج چکے تھے۔ وہ بیڈ سے نیچے اتری تھی۔ وارڈ روب کھول کر اس نے اپنے لیے ایک شال نکالی تھی اور اپنے نائٹ ڈریس کے اوپر اس نے شال کو لپیٹ لیا تھا۔ پھر وہ کمرے سے باہر نکلی تھی۔

گھر کے سارے افراد سو رہے تھے۔ رات کے تین بجے کون جاگتا ہے۔ سارا گھر نیم تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ باریشہ گھر کے اس حصے میں آ گئی تھی جہاں وہ عورت چلا رہی تھی۔ پرانا سا دکھتا وہ سرونٹ کوارٹر آج کچھ زیادہ ہی تاریک لگ رہا تھا۔ اس حصے کی ساری کھڑکیاں بند تھیں۔ اور ایسے بند تھیں جیسے اس کے اندر کسی کو قید رکھنے کے لیے ہی انہیں بند کیا گیا ہو۔ دروازے پر باہر سے تالا لگا ہوا تھا۔ جس پر ہاتھ لگاتے ہوئے باریشہ کے چہرے پر مایوسی پھیلی تھی۔ نجانے یہ کیسا تجسس تھا جس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ اس اندر موجود عورت سے ملنا چاہتی تھی۔

''خدا کا قہر آئے اس گھر پر......'' عورت چلاتی جا رہی تھی۔

باریشہ نے کھڑکیوں کو دھکا لگا کر دیکھا تھا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ کھڑکیوں کے پٹ اپنی جگہ سے ہلے تک نہیں تھے۔ کچھ عقل سے کام لیتے ہوئے اس نے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا تھا۔ وہ بال پن سے تالا کھولنا چاہتی تھی لیکن اس نے بالوں میں کوئی پن نہیں لگائی ہوئی تھی۔ وہ سونے سے پہلے سب اتار دیا کرتی تھی۔ لیکن پن کمرے سے لائی جا سکتی تھی۔ تالا کھولنے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں تھا۔

لمحہ بھر سوچے بنا وہ اپنے کمرے میں گئی تھی اور وہاں سے بال پن لے آئی تھی۔ یہ بس اس کا خیال تھا کہ پن سے تالا کھل جائے گا۔ اس نے ایسی کوشش ہرگز نہیں کی تھی۔ بس سنا ہوا تھا یا فلموں میں دیکھا ہوا تھا۔

بال پن کو تالے میں گھسائے وہ زور آزمائی کرنے لگی تھی۔ چند لمحے اس نے ایسا کیا تھا۔ لیکن کچھ نہیں حاصل ہوا تھا۔ وہ اس کام میں ماہر نہیں تھی۔ اس لیے جلد ہی مایوس ہونے لگی تھی۔ آخری کوشش کا ہدف دیتے ہوئے وہ پن اور تالے کے ساتھ کشتی کر رہی تھی جب تالا جھٹکا کھا کر کھل گیا تھا۔ باریشہ کو اپنی کامیابی پر خوشی سے زیادہ حیرت ہوئی تھی۔ اس نے یہ کر دیا تھا۔ پھر مزید وقت ضائع کیے بنا وہ اندر آ گئی تھی۔ اندر سارا کوارٹر نیم اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اسے کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ عورت کہاں تھی، وہ نہیں جانتی تھی۔

''یہاں کوئی ہے؟'' اس نے کہا تھا۔

چند لمحے پہلے تک چلانے والی عورت جیسے سہم کر خاموش ہو گئی تھی۔

''کیا یہاں کوئی ہے؟'' اس نے پھر سے کہا تھا۔

عورت نے تب بھی کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ لیکن کسی زنجیر کو جھٹکنے کی آواز سنائی دی تھی۔

نیم اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے وہ آگے بڑھی تھی۔ اندر ایک کمرا تھا جہاں سے زنجیر کی آواز آ رہی تھی۔ باریشہ وہاں پہنچی تھی اور دھک سے رہ گئی تھی۔ ایک بوڑھی عورت کمرے کے فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس طرح سے کہ اس کے پاؤں پر زنجیر باندھی گئی تھی۔ عورت کا حلیہ بتا رہا تھا کہ یا تو وہ عورت پاگل ہے یا زندہ درگور کر دی گئی ہے۔

''آپ...... آپ کون ہیں؟'' باریشہ نے پوچھا تھا۔

بوڑھی عورت اپنی دھنسی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔ وہ کچھ نہیں بولی تھی۔ باریشہ عورت کے قریب ہوتے ہوئے اس کے پاس بیٹھ گئی تھی۔

''آپ بستامی بابا کو کیوں برا بھلا کہتی ہیں؟''

''شیطان کی تعریف کون کرتا ہے؟''

''کیا کیا ہے انہوں نے آپ کے ساتھ......؟''

''تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''جاننا چاہتی ہوں۔''

''میرا مذاق بنانے کے لیے......؟''

''میں کیوں آپ کا مذاق بناؤں گی؟''

''تم مجھ سے ہمدردی بھی کیوں کرو گی؟ بوڑھی نے پوچھا۔

باریشہ لاجواب ہوئی تھی۔

''بستامی کو بابا کہہ رہی ہو اپنے بابا کے بارے میں کیسے کچھ جان کر میرا یقین کرو گی۔''

''پتا نہیں......لیکن وہ تو بہت اچھے ہیں۔ بہت شفیق......پھر آپ کیوں ان کے بارے میں برا بولتی ہیں؟''

''کیونکہ میں پاگل ہوں۔'' عورت نے کہا تھا۔ پھر کچھ چلائی تھی۔ ''پاگل ہوں میں......''

باریشہ اس کی بڑک سے ڈر گئی تھی۔

''بستامی نے پاگل کر دیا مجھے......'' اس نے چلا کر کہا لیکن پھر ایک دم سے دکھی ہو گئی تھی۔

نجانے کیوں باریشہ کو وہ عورت پاگل نہیں لگی تھی۔ ورنہ وہ وہاں سے اٹھ کر چلی جاتی۔

''سنو......میرا ایک کام کرو گی؟'' اس نے رازداری والے انداز میں کہا تھا۔

''کیا......؟''

''بستامی کو زہر دے سکتی ہو؟'' عورت نے پوچھا تھا۔

اتنے سنگین اور سفاک مطالبے پر باریشہ تو سہم ہی گئی تھی۔ ''اسے جان سے مار سکتی ہو؟''

''میں......میں انہیں کیسے جان سے مار سکتی ہوں؟''

''پھر دفع ہو جاؤ یہاں سے......'' عورت نے چلا کر کہا۔

باریشہ اٹھی تھی۔ پھر دفعتاً اس کے ذہن نے کچھ کام کیا تھا۔ اس نے کچھ عقل سے کام لینے کا سوچا تھا۔
وہ پھر سے بوڑھی کے قریب بیٹھ گئی تھی۔
"آپ مجھے اپنے بارے میں سب بتایئے۔ پھر میں سوچوں گی کہ مجھے آپ کا کام کرنا ہے یا نہیں......"
"جان کر تم میرا کام کرنے سے انکار کر ہی نہیں سکتی ہو۔"
"پھر بتایئے......کون ہیں آپ......؟"
"حویلیاں کو جانتی ہو؟" بوڑھی عورت نے پوچھا تھا اور باریشہ جیسے سکتے میں چلی گئی تھی۔ "یہاں سے کافی دور ہے۔ لیکن اتنا بھی نہیں ہے۔ ایبٹ آباد کے پاس ہے۔ وہاں ایک حویلی ہے۔ دین حویلی......اب کا تو پتا نہیں، لیکن وہاں چاند رہتی تھی۔"
"آپ کیسے جانتی ہیں چاند نانو کو......؟" باریشہ نے پوچھا تھا اور اس سے پہلے کہ بوڑھی عورت کچھ بولتی......وہاں ایک مردانہ بڑک سنائی دی تھی۔
"باریشہ......!" رحبانی بابا کی آواز کوارٹر میں گونجی تھی۔ باریشہ نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ اور کھڑی ہوئی تھی۔ "تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"
"وہ......بس ویسے ہی اندر چلی آئی تھی۔"
"تالا کس نے کھولا تھا؟"
"تالا کھلا ہوا تھا۔" اس نے جھوٹ بولا۔
"تم باریشہ ہو......صندل کی بیٹی......؟" زنجیروں میں بندھی عورت نے حیرت سے کہا۔
وہ باریشہ کو دیکھتی جا رہی تھی۔
اور اس کی بات پر باریشہ کے چہرے پر بھی حیرت اتر آئی تھی۔
"آپ میری امی کو کیسے جانتی ہیں؟"

"باریشہ...... چلو تم یہاں سے......" رحبانی بابا نے اسے بازو سے تھام لیا تھا اور اسے وہاں سے لے کر باہر جانے لگے تھے۔

"خدا تجھے غارت کرے رحبانی...... تو نے صندل کی بیٹی کو بھی نہ چھوڑا۔" عورت ان کے پیچھے سے چلانے لگی تھی۔ "خدا تجھے جہنم میں جلائے گا التمش کے قاتل...... چاند کی بددعائیں لگیں گی تجھے......"

باریشہ بت بنی سب سن رہی تھی۔

رحبانی بابا اسے باہر لا کر پھر سے تالا لگانے لگے تھے۔

"اس کی باتوں پر دھیان نہ دینا...... پاگل ہے یہ۔"

"یہ میری ماں کو کیسے جانتی ہیں؟"

"ملازمہ تھی دین حویلی میں...... اس لیے جانتی ہے سب کو......" رحبانی نے بات بنائی تھی۔

"لیکن وہ آپ سب کو برا بھلا کیوں کہہ رہی تھی؟"

"کہا نا...... پاگل ہے وہ......"

"تو ان کا علاج......"

"باریشہ! رات بہت ہو چکی ہے۔ تمہیں سو جانا چاہیے۔" رحبانی نے رعب سے کہا تھا۔

"جی......" کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف جانے لگی تھی۔

"دوبارہ اس طرف مت آنا......" اپنے پیچھے اسے رحبانی بابا کی ہدایت دیتی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔

اور اس ہدایت کو ماننے کا باریشہ کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔



ناول **تاش گھر** ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **15** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 25

"باریشہ آئی تھی اور فوراً سے چلی گئی۔" شیراز آفندی نے ضامن کو بتایا۔

"کیا مطلب آئی اور فوراً سے چلی گئی۔" ضامن نے ناسمجھی سے پوچھا۔

"وہ اس سب کے لیے تیار نہیں تھی۔ جو تم نے مجھے اس کے ساتھ کرنے کو کہا تھا۔"

"تو اسے تیار کرنا تھا نا...... تمہیں کیا ٹاسک دیا گیا تھا۔"

"میں کیا کرتا اس کے ساتھ......؟"

"زبردستی......"

"کیسے کرتا زبردستی...... تم نے یہاں جگہ جگہ کیمرے چھپائے ہوئے تھے۔ ویڈیو بنا کر تم نے اسے کیا بدنام کرنا تھا۔ الٹا میں نے قانون کی گرفت میں آ جانا تھا۔" موٹا وجود کہتے ہوئے دھپ سے صوفے پر بیٹھا تھا۔

"تو اسے پیار سے اس راستے پر لانا تھا نا...... اسے بتانا تھا کہ ڈرامہ مل جانا آسان نہیں ہوتا۔ یہ بہت بڑا چانس ہے۔ بہت کوشش کرنا پڑتی ہے۔ بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔"

"سمجھایا تھا۔ یہ سب کہا تھا میں نے اس سے...... لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔"

"تم نے کہنا تھا کہ میں تمہیں ڈرامے سے نکال دوں گا۔"

"اسے اس بات سے بھی فرق نہیں پڑا تھا۔" شیرازی نے اسے بتایا تھا۔

ضامن دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام کر بیٹھ گیا تھا۔ کتنی پلاننگ کی تھی اس نے اس سب کے لیے......اور سب بے کار گیا تھا۔

اس کا خیال تھا کہ باریشہ پھسل جائے گی۔ لیکن بد قسمتی سے ایسا نہیں ہو سکا تھا۔ جو اس کی بد قسمتی تھی وہ باریشہ کی خوش قسمتی ثابت ہوئی تھی۔

''اب کیا کرنا ہے؟''

''جو کرنا ہوگا میں خود ہی کرلوں گا۔'' ضامن نے غصے سے کہا تھا۔

اسے اپنے پلان کے ناکام ہو جانے پر غصہ تھا۔ شیزار آفندی چپ چاپ صوفے پر دبکا بیٹھا تھا۔

تب ہی ضامن کا موبائل بجنے لگا تھا۔ اس نے پاکٹ سے موبائل نکال کر اسکرین کو دیکھا۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی کال آ رہی تھی۔

''ہاں......کیا بات ہے؟''

''شوٹ رکی ہوئی ہے۔ باریشہ میم نہیں آئی ہیں۔''

''اسے کال کرنا تھی۔''

''کی تھی۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ ڈرامہ چھوڑ چکی ہیں۔'' اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے اسے بتایا تھا۔

ضامن کا غصہ مزید بڑھ گیا تھا۔ اس نے غصے سے فون بند کر دیا تھا۔

''وہ ابھی ہیروئن بنی نہیں اور نخرے دکھانے لگی ہے۔''

''میں نے تو تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ ڈرامے پر لعنت بھیج چکی ہے۔''

''وہ جانتی نہیں کہ اس بار اس کا پالا ضامن کے ساتھ پڑا ہے۔'' غصے کے باعث ضامن کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

☆......☆......☆

ساری رات باریشہ کو ٹھیک سے نیند نہیں آ سکی تھی۔کل کا دن اس کے لیے بہت برا ثابت ہوا تھا۔ پہلے شیراز آفندی کے فارم ہاؤس میں ہوا واقعہ......اور پھر رات کو سرونٹ کوارٹر میں موجود بوڑھی پاگل عورت سے آدھی ادھوری ملاقات......جس کی باتیں ساری رات اس کے دماغ میں گھومتی رہی تھیں۔ بعض واقعات معمولی ہوتے ہوئے بھی انسان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔

وہ عورت دین حویلی کو کیسے جانتی تھی؟ چاند تانو کو کیسے جانتی تھی......؟ التمش کو کیسے جانتی تھی؟ اس نے کیوں کہا کہ رحبانی بابا التمش کے قاتل ہیں۔اور چاند کی بددعائیں لگیں گی رحبانی بابا کو......وہ میری ماں کو کیسے جانتی تھی......اور سب سے بڑی بات کہ وہ مجھے کیسے جانتی تھی؟ میرا نام اس نے ایسے لیا جیسے وہ مجھے اچھے سے جانتی ہے۔جبکہ میں تو ساری زندگی حویلیاں سے باہر ہی نہیں گئی تھی۔اور اس عورت کو میں نے اپنی حویلی میں کبھی نہیں دیکھا۔پھر وہ کون ہے۔

یہ سب ایسی باتیں تھیں جس نے باریشہ کا ذہن الجھا دیا تھا۔کمرے میں آنے کے بعد رات کا باقی کا حصہ وہ سو نہیں سکی تھی۔صبح اسی باعث اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔وہ جلد سے جلد اس عورت سے دوبارہ ملنا چاہتی تھی۔لیکن اس کے لیے اسے کچھ صبر کا مظاہرہ کرنا تھا۔یہ آج کی رات نہیں ہو سکتا تھا۔کل کی رات بھی نہیں......

رحبانی بابا نے اسے وہاں جانے سے منع کیا تھا۔عین ممکن ہے چند دنوں میں وہاں جانے پر پھر اسے کوئی دیکھ لے۔اس طرح وہ مشکوک ثابت ہو سکتی تھی۔بوڑھی عورت سے دوبارہ ملنے کے لیے اسے کچھ وقت صبر کرنا تھا۔

دستک دینے کے بعد نتاشا اس کے کمرے میں آئی تھی۔

''کیا بات ہے۔آج بہت دیر تک سوتی رہی ہو تم......''

''میں بس لیٹی رہی ہوں۔نیند نہیں آ رہی تھی۔'' باریشہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھی۔

"خیریت......؟ سب ٹھیک تو ہے؟"

"ہاں......سب ٹھیک ہے۔"

"شوٹ نہیں تھا کیا آج......؟"

"نہیں......" اس نے جھوٹ بولا۔

"پھر ضامن کیوں آیا ہے گھر تمہیں لینے......؟" نتاشا نے بتایا تھا۔

باریشہ کے چہرے پر حیرت آئی تھی۔

"کیا......؟ ضامن آیا ہے؟"

"ہاں......میں نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔تم تیار ہو کر آ جاؤ۔" نتاشا کہہ کر کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔

باریشہ جلدی سے بیڈ پر سے اٹھی، وارڈ روب کھول کر اس نے آج پہننے کے لیے خوب صورت ڈریس نکالا تھا۔ جو اس کا عام دنوں میں گھر پر پہننے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اور پھر واش روم میں چلی گئی۔ اسے جلدی جلدی میں بہت سے کام کرنا تھے۔ نہانا تھا، تیار ہونا تھا۔ اور یہ سب کچھ اس طرح سے کرنا تھا کہ ضامن کو ایسا نہ لگے کہ اس کے لیے کچھ تردد کیا گیا ہے۔ بلکہ کچھ ایسا ظاہر کرنا تھا جیسے وہ عام طور پر گھر میں ایسے ہی تیار رہتی ہے۔

☆......☆......☆

ضامن گھر کے عالی شان ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ جس کی سجاوٹ میں کومل نے پچھلے ہی دنوں خاصی تبدیلیاں کی تھیں۔ اسے چند ماہ کے بعد گھر کا پینٹ اور سجاوٹ بدلنے کی عادت تھی۔ اس کے پاس بہت سارو پیہ تھا وہ ایسے شاہانہ شوق پال سکتی تھی۔ ضامن نئی سجاوٹ دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ بستامی کو اتنا امیر کرنے میں اس کے ماموں میر زاد کی دولت کا بھی بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔

اس کی مام زویا نے اسے بتایا تھا کہ جب صندل میرزاد کو چھوڑ کر گئی تھی تو ساری دولت اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ اس نے کوئی زیور، موتی، کوئی پیسہ نہیں چھوڑا تھا اور چاند کی تربیت یافتہ اس چالاک عورت نے ٹھنڈیانی کا وہ گھر بھی اپنے نام کروالیا تھا۔ جو اس نے اپنے جانے کے بعد فوراً بیچ کر میرزاد کو سڑک پر لا کھڑا کیا تھا۔

ملازمہ اس کے سامنے چائے رکھ گئی تھی۔ جو پینے کو اس کا بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اسے وہاں باریشہ کا انتظار تھا۔ وہ لفظوں کی جوڑ توڑ کر رہا تھا کہ اسے باریشہ کے سامنے کیا کہنا ہے۔ کیسے خود کو معصوم ثابت کرتے ہوئے ساری غلطی شیراز آفندی کے کھاتے میں ڈال دینا ہے۔ تھوڑی مزید دیر کے بعد باریشہ وہاں آئی تھی۔ ضامن اسے دیکھ کر کھڑا ہوا۔ باریشہ نے لائٹ پنک کلر کا سوٹ پہنا ہوا تھا جس پر گہرے گلابی رنگ کے پھول بوٹے بنے ہوئے تھے۔ بالوں کے کنارے پر کرل ڈال کر اس نے بال کھلے چھوڑے ہوئے تھے اور لائٹ پنک میک اپ کر کے گہرے پنک کلر کی لپ اسٹک لگائی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر ضامن نا چاہتے ہوئے بھی چند لمحوں تک ساکت رہا تھا۔

"کیسے آنا ہوا؟" اس نے بیٹھتے ہوئے ایسے پوچھا تھا جیسے وہ جانتی ہی نہ ہو کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے۔

"تم آج شوٹ پر نہیں آئیں......" اس نے سادہ سے انداز میں پوچھا۔ باریشہ چپ رہی۔

"بولو باریشہ......"

"میں ڈرامہ چھوڑ چکی ہوں۔" اس نے ضامن کی طرف نہ دیکھتے ہوئے کہا۔

ضامن اس کی شکل دیکھتا رہ گیا تھا۔ دل تو اس کا کیا تھا کہ ایک زوردار تھپڑ باریشہ کے منہ پر دے مارے، لیکن وہ خاموش رہا۔ موجودہ وقت کا تقاضا خاموشی اور برداشت تھی۔

"ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟ کیا ہوا ہے؟" اس نے پیار سے پوچھا۔ باریشہ پھر سے خاموش ہو گئی تھی۔ جو وجہ تھی وہ اس سے بتائی نہیں جا رہی تھی یا شاید وہ نخرے دکھا رہی تھی۔

''بولو یار...... کیا ہوا ہے؟ کسی نے کچھ کہا ہے کیا؟'' اس نے پھر سے پوچھا تو باریشہ نے شیراز آفندی کے فارم ہاؤس میں ہونے والا سارا واقعہ بتا دیا۔

''اوہ...... تو یہ بات ہے۔'' ضامن بھی انجان بننے کی پوری پوری اداکاری کر رہا تھا۔

''میں اب یہ ڈرامہ نہیں کر سکتی ہوں ضامن......''

''یہ سب تو چلتا ہے یار، اس فیلڈ میں......''

''لیکن میرے ساتھ نہیں چل سکتا۔''

''ہر فیلڈ میں بہت کچھ ہوتا ہے۔ برداشت کرنا پڑتا ہے۔''

''یہاں میری برداشت جواب دے چکی ہے۔'' وہ ایسے بات کر رہی تھی جیسے وہ کوئی ہالی وڈ کی ہیروئن ہو۔ شاید وہ بھول چکی تھی کہ وہ ایک گم نام ماڈل ہے۔ جس کا ڈرامہ ابھی نشر نہیں ہوا ہے۔ اور نشر ہو کر بھی وہ کیا کرتا ہے کوئی نہیں جانتا تھا۔

''پلیز باریشہ...... ایسے تو مت کہو۔'' ضامن اٹھ کر اس کے پاس آ بیٹھا تھا۔

''میری جگہ خود کو رکھ کر سوچو ضامن......''

''میں سمجھ سکتا ہوں تم پر کیا گزر رہی ہے۔ لیکن تم میری پوزیشن بھی سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم اس ڈرامے کے لیے بہت اہم ہو۔ میں اپنا پہلا پراجیکٹ تمہارے بغیر بنانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا ہوں۔'' کہتے ہوئے اس نے باریشہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

گرم اور مردانہ ہاتھوں کا لمس باریشہ کے وجود میں اترا اور اس کا پورا وجود سنسنا اٹھا تھا۔ اسے نہیں یاد پڑتا تھا کہ اسے زندگی بھر کسی مرد نے چھوا تھا۔ اس نے تو کبھی ارشادی بابا کے ہاتھ کا لمس بھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اب جو ضامن نے اسے چھوا تو وہ پگھل کر رہ گئی تھی۔

''پلیز...... میری بات مان جاؤ۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ باریشہ نے

بھی اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ سیاہ تھیں۔ سفیدی کے پیالے میں گہری سیاہ آنکھیں۔ اس کی پلکیں چھوٹی تھیں اور پلکیں اور بھنویں گہری سیاہ تھیں۔ اس کا چہرہ سفید تھا۔ جس پر ہلکی داڑھی تھی۔ اور ضامن کے ہونٹ گلابی رنگ سے ملتے جلتے رنگ کے تھے۔ اس نے گردن میں حسب عادت موٹی سلور چین پہنی ہوئی تھی۔ اور شرٹ کے کھلے گریبان سے اس کے سینے کے بال جھانک رہے تھے۔

باریشہ کو وہ لمحہ اپنی زندگی کے تمام لمحوں سے زیادہ خالص لگا تھا۔ اس کی پیدائش کے لمحوں کی طرح کا خالص لمحہ...... یہ لمحہ صدیوں پر بھی محیط ہو جاتا تو اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ اپنے دل پر ٹوک لگانا چاہتی تھی۔ ضامن کو دیکھتے ہوئے اس کے خیالات اخلاقی حدود پھلانگنے لگے تھے۔ وہ ایسا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن یہ محبت...... اس پر بھلا کسی کا اختیار ہی کب رہا ہے۔

ملازمہ چائے کے برتن لینے نہ آجاتی تو وہ نجانے کتنی دیر اسے دیکھتی رہتی۔

''ٹھیک ہے۔ میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی، میں کل شوٹ پر آجاؤں گی۔''

☆......☆......☆

پیلی چیتیوں والا وہ سیاہ موٹا سانپ چاند کی رکھی کٹوری میں سے روز دودھ پی رہا تھا۔

حویلیاں میں شام کے ہوتے ہی چاند درگا مورتی والے کمرے میں پہنچ جایا کرتی۔ اور دودھ سے بھری کٹوری کو کمرے کے فرش پر رکھ دیا کرتی تھی۔ صبح ہونے پر کٹوری خالی ہوتی تھی۔ پھر دن گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ سانپ چاند سے مانوس ہونے لگا۔ چاند کی موجودگی میں ہی وہ فوراً اسے کٹوری کی طرف بڑھا کرتا تھا اور دودھ پینا شروع کر دیا کرتا تھا۔ چاند کو بھی اب سانپ سے ڈر نہیں لگا کرتا تھا۔ وہ بھی کھڑی سانپ کو دودھ سے بھری کٹوری خالی کرتے ہوئے دیکھتی رہتی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ سانپ اور چاند کی اتنی دوستی ہو گئی کہ وہ کمرے سے باہر آنے لگا اور چاند اسے کمرے سے باہر دودھ دینے لگی۔ چاند نہیں جانتی تھی کہ وہ سانپ کس نسل کا تھا۔ وہ زہریلے پن کی اس نسل میں سے تھا کہ اگر اس کی جاتی کے سانپ کسی

ہٹے کٹے انسان کو بھی ڈس لیتے تھے تو وہ انسان کو کوئی وصیت کرنے کی بھی مہلت نہیں رکھتا تھا۔

بوڑھی آمنہ بی بی سب تماشا دیکھ رہی تھی اور خاموش تھی۔ حویلی میں اس کی ایسی حیثیت نہیں تھی کہ وہ چاند کو کچھ کرنے سے منع کرتی۔ اس لیے وہ ایک اچھی ناظر کے طور بس خاموشی سے سب دیکھا کرتی تھی۔

اس دن بھی حویلیاں میں شام ہونے کے قریب تھی۔ چاند حسب معمول کچن میں گئی اور کٹوری کو اس نے دودھ سے بھرنا چاہا جب اسے پتا چلا کہ دودھ ختم ہو چکا ہے۔ چاند کو یاد آیا کہ اس نے دوپہر میں آمنہ کو دودھ کے ساتھ رس دیے تھے۔ جس کی وجہ سے دودھ ختم ہو چکا تھا۔ وہ اپنے دودھ والے کو کتنی بار کہہ چکی تھی کہ انہیں اب روز دودھ زیادہ چاہیے ہوتا ہے لیکن دودھ والا بھی نجانے کس مٹی کا بنا تھا۔ روز ہی یہ بات بھول جاتا تھا۔ چاند کتنے دنوں سے خود دودھ استعمال نہ کرتے ہوئے سانپ کو دودھ پلا رہی تھی۔ اب جب دودھ ختم ہو چکا تھا تو چاند کو فکر ہونے لگی تھی اور ایسے فکر ہونے لگی تھی جیسے اس کا کوئی بچہ دودھ سے بھوکا بیٹھا ہو اور بلک بلک کر رو رہا ہو۔ ڈول پکڑ کر وہ گھر سے باہر نکلی تھی۔ کچھ فاصلے پر ایک چائے والا ہوٹل تھا۔ وہاں سے شام کے وقت بھی دودھ آسانی سے مل جایا کرتا تھا۔

''ایک کلو دودھ دینا بیٹا......'' ہوٹل پہنچ کر انہوں نے کام کرتے لڑکے سے کہا تھا۔ لڑکے نے چاند نانو سے ڈول لے لیا تھا اور اس میں دودھ ڈالنے لگا تھا۔ چاند نے پیسے دے کر ڈول پکڑنا چاہا تھا جب اس کی نظر ہوٹل کی دیوار پر چلتے ٹی وی پر گئی تھی۔ وہاں کسی ڈرامے کا اشتہار چل رہا تھا۔ چاند نے اشتہار کو دیکھا اور اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ ٹی وی اسکرین پر اسے باریشہ نظر آ رہی تھی۔ وہ کیا کر رہی تھی۔ چاند کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''اماں جی دودھ پکڑ لیں......'' لڑکا کہہ رہا تھا۔ اور چاند جیسے وہاں موجود ہی نہیں تھی۔

''یہ...... یہ کیا ہے؟'' بے دھیانی میں ڈول پکڑتے ہوئے چاند نے لڑکے سے پوچھا۔

''کوئی نیا ڈرامہ آ رہا ہوگا۔ اسی کا ٹریلر ہے۔'' لڑکے نے لاپروائی سے کہا۔

چاند کے ہاتھ سے دودھ سے بھرا ڈول چھوٹ کر گر گیا تھا۔ لڑکا حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

''کیا ہوا اماں جی......'' اس نے پوچھا۔ لیکن چاند کو تو جیسے اپنی ہی ہوش نہیں رہی تھی۔ تیز تیز قدم اٹھاتی وہ ارشادی بابا کے پاس بھاگی تھی۔

''ارشادی بابا......ارشادی بابا......'' دکان میں پہنچ کر اس نے تیز آواز میں ارشادی بابا کو پکارا۔

''کیا ہوا ہے چاند......؟'' زائچوں کی کتاب ایک طرف رکھ کر ارشادی بابا چاند کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

''باریشہ نے ڈراموں میں کام کرنا شروع کر دیا ہے۔'' چاند نے اپنی طرف سے دھماکا کیا تھا۔

''اچھا؟'' ارشادی بابا کو چہرے پر حیرت لانا پڑی تھی۔ کیونکہ وہ یہ بات پہلے سے ہی جانتے تھے۔ باریشہ نے چند دن پہلے ہی انہیں یہ خوش خبری سنانے کے لیے فون کیا تھا۔

''جی......میں ابھی دیکھ کر آ رہی ہوں۔'' چاند نے پریشانی اور دکھ سے کہا تھا۔

''تو اتنا گھبرا کیوں گئی ہو چاند......'' ارشادی بابا نے فکرمندی سے کہا۔ انہیں چاند کی واقعی ہی میں فکر ہونے لگی تھی۔ اس خبر نے تو جیسے چاند کو نڈھال ہی کر دیا تھا۔ چاند کی عمر ایسی نہیں تھی کہ بڑے غموں کا بوجھ اٹھا سکتی۔ جو پہلے ہی سے غموں کے بوجھ تلے تھی۔

''تو کیا خوش ہوں؟''

''میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ باریشہ کے بارے میں سوچنا چھوڑ دو۔''

''ایسے کیسے کر سکتی ہوں میں......میری نواسی ہے وہ......''

''وہ تمہیں اپنی نانو نہیں سمجھتی ہے۔''

''اس کے سمجھنے یا نہ سمجھنے سے کیا ہوتا ہے۔''

”زمانہ بدل گیا ہے چاند...... تمہاری لے پالک بیٹی کی بیٹی ہے وہ...... کوئی سگا رشتہ نہیں ہے تمہارا اس کے ساتھ۔ تم اس پر دھونس نہیں جما سکتی ہو۔“

”تو کیا ہوا۔ کیا رشتے صرف سگے ہوتے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو آمنہ آپ کے پیچھے پاگل نہ ہوگئی ہوتی۔“

چاند نے ارشادی بابا کو لاجواب کیا تھا۔

”آمنہ کو محبت کا رشتہ لے ڈوبا...... جیسے مجھے......“

”میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ باریشہ تمہیں کچھ نہیں سمجھتی ہے۔ تم اسے کیسے کسی چیز سے روک سکتی ہو۔“

”اس کی منت تو کر سکتی ہوں۔“

”اس پر کسی چیز کا اثر نہیں ہوگا۔ نہ تمہاری منت کا نہ تمہارے واسطے کا......“

”آپ مجھے بتائیں کہ وہ کہاں ہے؟“

”میں نہیں جانتا......“

”جھوٹ مت بولیں ارشادی بابا...... میں جانتی ہوں کہ آپ جانتے ہیں کہ وہ کہاں ہے۔“

ارشادی بابا چپ رہے تھے۔

”خدا کے لیے مجھے بتائیں کہ وہ کہاں ہے۔ میں اسے اس کی مری ہوئی ماں کا واسطہ دوں گی۔ شاید وہ میری بات مان جائے۔“

”وہ بستامی کے گھر میں ہے۔“ ارشادی بابا نے اسے بتایا تھا۔ اور چاند کے پیروں تلے حویلیاں کی سرزمین کانپنے لگی تھی۔

”کیا......؟“

”ہاں...... وہ بستامی کے گھر میں ہے۔“

”کب سے؟“

''جب سے وہ یہاں سے گئی ہے۔ بستامی کے گھر میں ہی ہے۔'' ارشادی بابا نے سب سچ بتا دیا تھا۔ چاند کے پورے جسم پر سوئیاں چبھنے لگی تھیں۔ جس شخص سے انہوں نے بے انتہا نفرت کی تھی۔ ان کی جان سے زیادہ پیاری چیز وہاں تھی۔ وہ کیا نہیں کر سکتا تھا اس کا...... جو اس نے افشیں کا کیا، تعبیر، سارا، کرن، روشانے، زارا، صندل اور...... اور اب باریشہ......!

چاند جلدی سے باہر کو بھاگی تھی۔

''کہاں جا رہی ہو چاند......؟''

''بستامی......''

ارشادی بابا کی بات نہ سنتے ہوئے اس نے اتنی بلند آواز اور نفرت سے کہا تھا کہ بازار میں چلتے لوگ رک گئے تھے۔ یہ آواز اتنی بلند تھی کہ اگر درمیان میں پہاڑ نہ ہوتے تو اسلام آباد میں موجود بستامی کے گھر تک سنی جا سکتی تھی۔ اور اس آواز میں اتنی نفرت تھی کہ پہاڑوں کو ہلا سکتی تھی۔

☆......☆......☆

''دوریاں'' ڈرامے کا ٹریلر جاری ہو چکا تھا۔ اور وہ ایک نئے چینل پر جاری ہوا تھا۔ چینل کی ابھی ٹیسٹ ٹرانسمیشن چل رہی تھی۔ چینل کے افتتاح میں ابھی کچھ دن باقی تھے۔ اور وہاں ایک ساتھ بہت کچھ جاری ہونے والا تھا۔ اس میں ''دوریاں'' ڈرامہ بھی شامل تھا اور کہیں دب کر رہ گیا تھا۔ لیکن اتنی مایوسی والی بات نہیں تھی۔ ضامن نے یقین دلایا تھا کہ جب ڈرامہ چلے گا تو عوام کی توجہ حاصل کرے گا۔

اسی حوالے سے آئے روز کوئی نہ کوئی تقریب ہو رہی تھی۔ کبھی چینل کے حوالے سے، کبھی ڈرامے کے حوالے سے...... جہاں ساری ٹیم کے ساتھ ساتھ وہ بھی جا رہی تھی۔ وہ تمام دن رات تھکن زدہ تھے۔ دیر تک باہر رہنے کی وجہ سے اس کی نیند بھی ٹھیک سے پوری نہیں ہو پا رہی تھی کیونکہ اگلے دن پھر سے شوٹ پر جانا ہوتا تھا۔

اس رات بھی وہ دیر سے گھر واپس لوٹی تھی۔ تھکن کی وجہ سے اسے بہت نیند آ رہی تھی۔ اس نے ضامن سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اس کے سین دوپہر کے بعد رکھے جائیں۔ وہ دوپہر تک سیٹ پر آئے گی۔ اس کا ارادہ دیر تک سونے کا تھا۔ لیکن پھر صبح دس بجے کے قریب...... جب اس کی نیند ابھی پوری نہ ہوئی تھی اسے اٹھنا پڑا تھا۔

"باریشہ...... باریشہ......" کوئی چلاتے ہوئے اس کا نام پکار رہا تھا۔ باریشہ کی آنکھ کھلی تھی۔ پہلے پہل تو اسے لگا کہ یہ اس کا وہم ہے۔ لیکن پھر اگلی آواز پر اسے احساس ہوا کہ یہ اس کا وہم نہیں ہے۔ بلند آواز میں جو اس کا نام پکار رہا تھا وہ اسے جانتی تھی اور بہت اچھے سے جانتی تھی۔ اس آواز سے اسے بے پناہ نفرت تھی۔ اتنی جتنی کہ اسے ماضی سے تھی۔

سلیپنگ سوٹ پر جلدی سے گاؤن ڈال کر وہ کمرے سے باہر نکلی تھی۔

"باریشہ...... باریشہ......" چاند نانو ڈرائنگ روم میں موجود چلا رہی تھی۔

"ذرا طریقے سے برتاؤ دکھاؤ چاند...... یہ تمہاری حویلی نہیں ہے، میرا گھر ہے۔" کومل نے سخت انداز میں کہا تھا۔

"طریقے اور برتاؤ کی بات تم کر رہی ہو۔ جو ساری زندگی لوگوں کے اشاروں پر ناچتی رہی ہو۔ اپنے وقار کا سودا کرتی رہی ہو۔ اب تم طریقے اور برتاؤ کی بات کرو گی۔" چاند نانو نے طنزیہ کہا تھا۔ کومل نے جیسے بڑی مشکل سے اس بات کو ضبط کیا تھا۔

"میں تمہارا لحاظ کر رہی ہوں ورنہ ایک منٹ بھی نہیں لگے گا تمہیں یہاں سے باہر کرنے میں......"

"میں خود بھی یہاں ایک منٹ رکنا نہیں چاہتی ہوں۔ میں باریشہ کو لینے آئی ہوں۔ کہاں ہے باریشہ......"

"میں یہاں ہوں۔" باریشہ نے وہاں پہنچ کر کہا تھا۔

چاند نے پلٹ کر اسے دیکھا تھا اور پھر آگے بڑھ کر جلدی سے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ کتنے

دنوں کے بعد دیکھ رہی تھی وہ باریشہ کو..... اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اسے خود سے جدا ہونے ہی نہ دے۔ اور ساری زندگی اسی طرح اپنے سینے سے لگائے رکھے۔ لیکن پھر جلد ہی اس کی گرم جوشی ختم ہونے لگی۔ جب اسے احساس ہوا کہ اس نے تو باریشہ کو اپنے گلے سے لگایا ہوا ہے لیکن باریشہ کے ہاتھ ہوا میں ہی معلق ہیں۔ جیسی گرم جوشی وہ محسوس کر رہی تھی باریشہ کے لیے..... ویسی وہ نہیں کر رہی تھی۔ اس کے لیے وہ لمحے کوفت زدہ تھے۔ چاندنے اسے خود سے الگ کر کے حیرت سے دیکھا تھا۔ کوئی کسی سے اتنا ناراض کیسے ہو سکتا ہے۔

"کیا کرنے آئی ہیں آپ یہاں چاندنانو....."

"میں تمہیں لے جانے آئی ہوں۔"

"سوری..... میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی ہوں۔" باریشہ نے چہرے کا رخ بدلتے ہوئے کہا تھا۔

کومل بیگم مسکرائی تھی۔ اسے باریشہ سے اسی بات کی توقع تھی۔

"میں..... تمہاری ساری باتیں ماننے کو تیار ہوں باریشہ..... تم حویلی بیچ کر لاہور یا کراچی جانا چاہتی تھیں نا..... میں تیار ہوں۔ تم چاہو تو کل ہی حویلی بیچ دو۔ جس شہر کہو گی ہم وہاں چلے جائیں گے۔ یا تم وہ کہہ رہی تھیں کہ حویلی کسی ہوٹل والے کو دے دیتے ہیں۔ میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔"

"اب ان سب باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے چاندنانو..... میں آپ کے ساتھ واپس نہیں جانے والی ہوں۔"

"کیوں نہیں جاؤ گی۔ میں تمہاری ہر بات ماننے کو تیار تو ہو چکی ہوں۔"

"اب بہت دیر ہو چکی ہے۔"

"کسی بھی کام کے لیے کبھی بھی دیر نہیں ہوتی ہے باریشہ....."

"میں بہت آگے نکل آئی ہوں چاندنانو..... اب واپس مڑ کر نہیں دیکھ سکتی ہوں۔"

''میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہیں ہر آسائش دینے کی پوری کوشش کروں گی۔''

''کیا آسائشیں دے سکتی ہو تم اسے چاند..... '' باریشہ کے بجائے کومل بیگم نے پوچھا تھا۔ چاند نے نفرت سے اسے دیکھا تھا۔

''کتنے کی ہے تمہاری حویلی..... تیس لاکھ، چالیس لاکھ..... اس سے زیادہ کی جیولری ہے باریشہ کی وارڈروب میں..... جاؤ جا کر دیکھو اپنی نواسی کا کمرا..... بیڈ، پردے، صوفے، قالین..... یہ سب آسائشیں تم اسے مر کر بھی نہیں دے سکتی تھیں۔ پرانی روح ہے تمہارے اندر..... اسی لیے تم نے اسے دوزخ میں رکھا ہوا تھا۔ اب دیکھو وہ کس جنت میں رہ رہی ہے۔''

''وہ انجان ہے۔ نہیں جانتی کہ یہ جنت دوزخ سے بڑھ کر ہے۔''

''تمہیں تو نجانے ہم سب سے کیا مسئلے رہے ہیں۔ کیوں اتنی نفرت کرتی ہو تم ہم سب سے.....''

''اس کی وجہ تم جانتی ہو کومل..... باریشہ کے سامنے انجان بن رہی ہو تو وہ الگ بات ہے۔'' چاند نے کہا تھا۔ کومل کے چہرے پر گھبراہٹ نمایاں ہوئی تھی۔ ''بہر حال تم باریشہ کو کسی صورت اپنے پاس نہیں رکھ سکتی ہو۔''

''باریشہ کو اپنے پاس رکھنے کے سارے اختیار تم کھو چکی ہو چاند..... صندل مر چکی ہے اور میر زاد بھی..... تم کس رشتے سے اسے اپنے پاس رکھ سکتی ہو۔''

''اگر میرا کوئی رشتہ نہیں تو پھر تو تمہارا کوئی رشتہ بنتا ہی نہیں.....''

''تم شاید بھول رہی ہو کہ باریشہ اب بالغ ہو چکی ہے۔ اس نے ہمیں اپنا سرپرست بنا لیا ہے۔'' کومل نے چاند کو بتایا تھا۔ اور چاند کے کانوں میں جیسے کوئی دھماکا ہوا تھا۔ بے یقینی سے اس نے باریشہ کو دیکھا تھا۔ باریشہ نے نظریں چرائی تھیں۔

''پھر بھی میرے پاس اس مسئلے کا ایک حل ہے۔ اگر تم بیٹھ کر تحمل سے سنو تو.....'' کومل نے کہا تھا۔

اس کا انداز کچھ پیش کش کرنے والا تھا۔ چاند کھڑی رہی تھی۔ وہ کومل کی کوئی بات نہیں سننا چاہتی تھی۔

''بیٹھ جاؤ چاند...... کچھ مروت کا مظاہرہ ہی کر دو۔ دین بابا کی بیٹی ہونے کا مظاہرہ......'' کومل نے نرم لہجے میں کہا تھا۔

چاند چار و نا چار صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ کومل بھی اس کے سامنے بیٹھ گئی تھی۔ باریشہ کھڑی رہی تھی۔ اور رحم طلب نظروں سے کومل آنٹی کو دیکھ رہی تھی کہ وہ اس کی چاند جیسی مصیبت سے جان چھڑوائے...... کومل نے اسے پرسکون رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

کومل نے ملازمہ کو بلا کر اسے اشاروں میں کچھ بات کہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد ملازمہ ہاتھ میں بہت سے روپے کی گڈیاں پکڑے وہاں آئی تھی۔ گڈیاں دیکھ کر ہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ رقم لاکھوں میں ہے۔

''اسے چاند کے سامنے رکھ دو۔''

ملازمہ نے ایسا ہی کیا تھا۔ لاکھوں روپے چاند کے سامنے ٹیبل پر رکھ دیے تھے۔

''یہ کیا ہے؟''

''دس لاکھ ہیں۔''

''کس لیے......؟''

''اسے لے جاؤ......اور سمجھو کہ ہم نے تم سے باریشہ کو خرید لیا۔'' کومل نے کہا تھا اور چاند نے اگلے ہی پل غصے سے روپوں کی گڈیوں پر زور سے ہاتھ مارا تھا۔ گڈیاں قالین پر دور تک بکھرتی چلی گئی تھیں۔

''تم نے ثابت کیا کہ تم روشن بیگم کی بیٹی ہو۔ مینا گلی کی پیدائش......'' چاند نے نفرت سے کہا تھا۔ ''فوراً سے سودے بازی پر اتر آئی ہو۔''

کومل کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اسے برداشت کرے۔

''میں تو تمہارے بھلے کی بات کر رہی ہوں۔ تمہاری مدد کرنا چاہ رہی ہوں۔ باریشہ کے مالک تو اب ہم ہیں۔ بہتر ہے کہ تم اس بات سے کچھ فائدہ اٹھالو۔''

''میں تم لوگوں کا سایہ بھی باریشہ پر نہیں پڑنے دوں گی۔''

''کیا کرو گی تم؟ کورٹ میں جاؤ گی؟ اور اگر وہاں باریشہ نے بیان دے دیا کہ وہ ہمارے ساتھ رہنا چاہتی ہے تو پھر کیا کرو گی؟'' کومل نے بھی اسے لاجواب کیا تھا۔ ''بہتر ہے کہ میری پیش کش کے بارے میں سوچو...... پیسے کم ہیں تو بتاؤ...... میں زیادہ بھی دے سکتی ہوں۔''

''میں لعنت بھیجتی ہوں تمہاری پیش کش پر......'' چاند نے تھوک پھینکنے کے سے انداز میں کہا تھا۔

کومل کے چہرے پر سختی آئی تھی۔ بہت برداشت کرلیا تھا اس نے اس بڑھیا کو......وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ تمہاری نواسی تمہارے سامنے کھڑی ہے۔ لے کر جاسکتی ہو تو لے جاؤ...... مجھ پر اور بستامی پر تو پہلے ہی بہت الزام ہیں۔ ہم مزید نہیں لینا چاہتے۔ باریشہ سے خود ہی بات کرلو۔ اسے لے کر جاسکتی ہو تو لے جاؤ...... لیکن یاد رکھنا چاند...... اگر آج باریشہ تمہارے ساتھ نہ گئی تو پھر تمہیں ہمیشہ کے لیے باریشہ کو بھولنا ہوگا۔''

کومل نے کہا تھا۔ پھر ایک نظر چاند کو دیکھا تھا اور وہاں سے چلی گئی تھی۔ ڈرائنگ روم کے دروازے کے باہر جا کر وہ کان لگا کر کھڑی ہوگئی تھی۔ وہ گھاگ عورت تھی جانتی تھی کہ باریشہ کبھی بھی چاند کے ساتھ حویلیاں نہیں جائے گی۔ ایسے وقت میں جبکہ اس کا پہلا ڈرامہ بہت جلد ٹی وی اسکرین پر آنے والا ہے۔ وہ کیسے اپنے مستقبل کو لات مار سکتی تھی۔ اور جس قدر آسائشیں اسے اس گھر میں مل چکی تھیں، باریشہ پرانی حویلی جانے کے بارے میں خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔

''میرے ساتھ حویلیاں واپس چلو باریشہ......'' کومل کے جانے کے بعد چاند اٹھی تھی اور اس نے

باریشہ کی منت کی تھی۔

”میں بول چکی ہوں کہ میں حویلیاں واپس نہیں جاؤں گی۔ میں یہاں سکون میں ہوں۔“

”تم نہیں جانتی کہ تم کیسی دوزخ میں جی رہی ہو۔“

”اگر یہ دوزخ ہے تو بھی مجھے منظور ہے۔ وہ حویلی بھی میرے لیے کوئی جنت ثابت نہیں ہوئی تھی۔“

”میں نے تمہیں کبھی بستامی اور رحبانی کے بارے میں نہیں بتایا۔ حویلی کے ماضی کے بارے میں نہیں بتایا۔ میں آج بتاتی ہوں۔ میری تین پھوپھیں اور ان کی چھ بیٹیاں...... یہ جس کے گھر میں تم رہ رہی ہو، اس نے ان سب کا سودا کیا تھا۔ پہلے افشیں کو لاہور کے ایک بوڑھے تاجر کے ہاتھ بیچا، پھر تعبیر کو کمال کے ہاتھ فروخت کیا۔ پھر سارا کا اغواء کروایا۔ اور پھر......“ بتاتے بتاتے چاند جیسے اس وقت کو یاد کرتے ہوئے رونے لگی تھی اور باریشہ ہاتھ باندھے سن رہی تھی۔

”اور......؟ اور کیا کیا کہانیاں ہیں آپ کے پاس مجھے ان لوگوں سے متنفر کرنے کے لیے......؟“ اس نے طنزیہ انداز میں کہا تھا۔

”یہ کہانیاں نہیں ہیں۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میں نے تمہیں آج تک نہیں بتایا کہ تمہاری ماں کیسے مری...... میں آج بتاتی ہوں۔ وہ بستامی اور رحبانی کی وجہ سے مری تھی۔ اور تمہارا باپ بھی......“

”کتنی نفرت ہے آپ کے دل میں ان لوگوں کے خلاف چاند نانو...... کس قدر نفرت ہے۔ جبکہ یہ لوگ آپ کے ساتھ کتنے مخلص ہیں۔ وہ تو ابھی بھی آپ کو اپنے پاس رکھنے کو تیار ہیں۔ کتنی بار بستامی بابا مجھے کہہ چکے ہیں کہ میں منت کر کے آپ کو یہاں بلالوں لیکن آپ کی ضد اور ہٹ دھرمی نے آپ کی زندگی برباد کر دی ہے اور مزید بھی برباد ہی رہے گی۔“ اس نے جیسے بددعا دینے والے انداز میں کہا تھا۔

”شکر ہے کہ میں آپ کے چنگل سے جلدی نکل آئی ہوں۔ ورنہ نجانے میرا ابھی کیا حال کرتیں آپ...... جو آپ نے اپنی پھوپھو کی بیٹیوں کا کیا...... اور آپ کو اب خیال آیا ہے حویلی بیچنے کا۔ ساری زندگی میں

کہتی رہی کہ تب تو آپ نے میری بات نہ مانی۔ اور اب کہہ رہی ہیں کہ حویلی بیچ دو یا کسی کو ٹھیکے پر دے دو۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ ایک سنکی عورت ہیں۔ چھوٹے چھوٹے حادثوں پر آپ نے فضول میں بڑے فیصلے کیے۔ ساری زندگی التمش کی بیوہ بنے رہنے کا فیصلہ، سب کو پالنے کا فیصلہ، حویلی کو نہ بیچنے کا فیصلہ...... اور نجانے کیا کیا۔" وہ نفرت سے بولتی چلی گئی تھی۔

"میں کہہ تو رہی ہوں کہ تم نے جو کرنا ہے کرلو۔"

"اب دیر ہو چکی ہے چاندنانو...... مجھے اس گھر کی عادت ہو چکی ہے۔"

"سب جان لینے کے بعد بھی تم یہاں رہنا چاہتی ہو؟" چاندنانو کو حیرت تھی۔

"کیا سب جان لینے کے بعد چاندنانو...... کیا سب جان لینے کے بعد...... آپ نے جو بتایا وہ کچھ بھی میرے لیے حیران کن نہیں ہے۔ آپ انہیں برا ثابت کرنا چاہ رہی ہیں اور آپ خود کیا ہیں؟" باریشہ نے پوچھا تھا۔ چاند بٹر بٹر اسے دیکھ رہی تھی۔ "آپ سمجھتی ہیں کہ آپ ایک اچھی خاتون ہیں؟"

"تمہیں شک ہے مجھ پر......"

"نہیں...... یقین ہے۔ چلیں یہاں ہی فیصلہ کر لیتے ہیں کہ کون برا ہے اور کون اچھا...... آپ نے بس میرے سوالوں کا سچ سچ جواب دینا ہے۔ بولیں دیں گی؟"

"ہاں...... دوں گی۔" آنسو پیتے ہوئے چاند نے آمادگی دی تھی۔

"میری ماں کو عین بارات والے دن گھر چھوڑ کر جانے پر کس نے مدد کی تھی۔" باریشہ نے پہلا سوال پوچھا تھا۔ چاند اس کی شکل دیکھنے لگی تھی۔ اس سوال کا جواب اس کے لیے صرف شرمندگی تھی۔

"بولیے چاندنانو......"

"میں نے......" چاند نے شرمندگی سے نظریں چراتے ہوئے کہا تھا۔

"تہمینہ پھوپھو کی بیٹی روشانے کو زہر کس نے دیا تھا؟" باریشہ نے پھر سے پوچھا تھا۔ چاند کے

چہرے پر حیرت آئی تھی۔

”میں نے......“

”میری ماں کے مرنے کے بعد رحبانی بابا کو جان سے مارنے کی کوشش کس نے کی تھی؟“

”میں نے......“

”ابھی بھی آپ کہہ رہی ہیں کہ آپ اچھی ہیں اور یہ لوگ برے۔ آپ تو خود گناہوں سے بھری ہوئی ہیں چاندنا نو...... آپ ان لوگوں کو برا کیسے کہہ سکتی ہیں۔“

چاند چپ چاپ سب سنتی رہی تھی۔ بستامی نے ایک بار پھر سے اس کھیل کو بہت شاندار انداز میں کھیلا تھا۔ جس میں وہ اور اس کا دوست ماہر تھے۔

”آپ کیا سمجھتی ہیں کہ ماضی کو صرف آپ ہی جانتی ہیں۔ میں کچھ نہیں جانتی...... مجھے بھی سب بتا دیا گیا ہے۔ اور میں سب جان کر ہی یہاں رہ رہی ہوں۔“

”اس وقت کی بات اور تھی باریشہ...... تمہیں یہ سب تو بتا دیا گیا ہے لیکن اس وقت کی نزاکت نہیں بتائی گئی۔“

”وقت کی نزاکت کا بہانہ بنا کر آپ سچی ثابت نہیں ہوتی ہیں چاندنا نو...... اگر یہ چیز آپ کے لیے ہے تو یہ ہی چیز بستامی بابا اور رحبانی بابا کے لیے بھی ہے۔ ان کے کھاتے میں آپ جو کام ڈال رہی ہیں ہو سکتا ہے کہ تب بھی وقت کا تقاضا کچھ اور ہو۔ بلکہ وہی ہو جو انہوں نے کیا۔“

چاند لاجواب ہو چکی تھی۔

”آپ کہہ رہی ہیں کہ بستامی بابا نے افشیں کو بوڑھے تاجر کے ہاتھ بیچ دیا۔ لیکن یہ کیوں نہیں بتا رہیں کہ پھر افشیں نے کیا کیا۔ اس بوڑھے تاجر کے مرنے کے بعد ساری جائیداد پر وہ خود قابض ہو گئی اور اس کے بچوں کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔

اور تعبیر......اف...... کیا کیا اس نے کمال کے ساتھ......ایسا کوئی کسی بے جان چیز کے ساتھ کرتے بھی سو بار سوچتا ہے۔ جو اس نے ایک جیتے جاگتے آدمی کے ساتھ کیا۔ ابھی بھی آپ کہہ رہی ہیں کہ وہ سب ٹھیک تھیں۔"

چاند جان چکی تھی کہ اسے یہاں سے خالی ہاتھ ہی جانا ہوگا۔

"میرے ہوش سے پہلے کی باتیں تو ایک طرف ہوئیں۔ حاجی بوا کا انتقال تو میرے ہوش میں ہوا ہے۔ کیوں انہوں نے مرتے وقت کہا تھا کہ انہیں رحبانی بابا کے ہاتھوں میں مرنا ہے۔ رحبانی بابا تو آپ کے نزدیک بہت برے ہیں نا......اور حاجی بوا آپ کی دیرینہ تعلق دار تھیں۔ پھر انہوں نے رحبانی بابا کو ہی کیوں یاد کیا۔ کیوں وہ رحبانی کو اپنا بیٹا کہا کرتی تھیں۔"

جواب دینے کے لیے چاند کے پاس کچھ نہیں تھا۔

"اگر یہ بھی برے ہیں اور آپ بھی تو کیا فرق ہے آپ دونوں میں...... مجھے دو بروں میں سے کسی ایک کے ساتھ ہی رہنا ہے تو میں یہاں رہنا پسند کروں گی۔" باریشہ نے فیصلہ کن کہا تھا۔ "یہاں سے چلی جائیں چاند نانو...... میں مر تو جاؤں گی لیکن آپ کے ساتھ ہرگز نہیں جاؤں گی۔"

باریشہ نے قطعیت سے کہا تھا اور پھر وہاں سے چلی گئی تھی۔ چاند اسے روکنا چاہتی تھی لیکن نجانے کیا ہوا، اس نے بولنا چاہا تو اسے لگا کہ اس کے بولنے کی سکت ختم ہو چکی ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے روکنا چاہا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کے قدم فرش پر ہی جم چکے ہیں۔

☆......☆......☆

آسمان کے شکم میں سوراخ ہو چکا تھا۔ وہاں سے قطرہ قطرہ پانی رس رہا تھا اور اس پانی کا رنگ سرخ تھا۔ چاند نے آسمان کو دیکھا تھا اور ایسا لگا کہ آسمان وہ قطرہ اس کے گال پر گرا رہا ہے اور آسمان کی جان کنی اس کی اپنی آنکھوں میں اتری ہوئی ہے۔

"چاند......"

روتے ہوئے وہ گھر سے باہر نکل رہی تھی۔ جب اپنے پیچھے اسے کوئی آواز سنائی دی تھی۔ کسی نے اسے پکارا تھا۔ چاند پلٹی تھی۔ اس کے پیچھے رحبانی کھڑا تھا۔ جواب دور سے چاند کے قریب آنے لگا تھا۔ چاند کو اپنے سامنے پا کر رحبانی کے دل کی کھال سکڑتی چلی گئی تھی۔ ایسا کیا تھا اس عورت میں جو ابھی بھی اس کے دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کر رہا تھا۔ اب تو وہ خوب صورتی رخصت ہوئی۔ وہ جوانی تباہ ہوئی۔ اب تو اس کے چہرے پر ان گنت جھریاں آچکی تھیں، پھر بھی کیوں......؟

رحبانی کے دل میں خدا کے لیے یہ شکوہ جاگا کہ لاکھ دعاؤں اور تعویزوں کے بعد بھی اس نے اسے یہ عورت نہ حاصل ہونے دی۔

"کیسی ہو چاند......؟" رحبان نے پیار سے پوچھا تھا۔ چاند کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ اور وہ یک ٹک اس لومڑ کی شکل دیکھ رہی تھی۔ جس کی شکل کبھی نہ نظر آنے کی اس نے خدا سے التجا کی تھی۔

"تمہیں میرے حال سے کیا رحبان......"

"چلو پھر میرا ہی حال پوچھ لو۔"

"تم ٹھیک ہو۔ بہت زیادہ بہتر اور خوش ہو۔ تم نے جو چاہا پا لیا۔ تم نے مجھے برباد کرنا چاہا، میں ہو گئی۔ تم نے مجھے سسکتا ہوا دیکھنا چاہا اور دیکھو...... میری آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی ہیں۔ میرے انکار کا بدلہ لینا تھا تم نے......اور خوب اچھے سے لے چکے ہو۔" چاند نے آنکھوں کے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا تھا۔ نجانے کیوں رحبانی کو اس پر ترس آ گیا تھا۔

"کیوں اس عمر میں خود کو ہلکان کر رہی ہو۔ سب بھول جاؤ اور ادھر آ جاؤ۔"

"سب بھولنا اتنا آسان ہوتا تو مشکل ہی کیا تھی رحبانی...... تم مجھے بھول سکتے تھے۔ میرے انکار کو بھول سکتے تھے۔"

"وہ جوانی تھی۔ اب بڑھاپا آ چکا ہے۔ اب تو اپنی یادداشت کو کچھ دیر آرام کرنے دو۔ حویلی کو بے شک مت بیچو، لیکن ادھر آ جاؤ۔ یہاں تمہاری ہر ضرورت کا خیال رکھا جائے گا۔ وعدہ کرتا ہوں تم سے......" رحبانی نے کہا تھا۔

اور چاند آنسوؤں کے درمیان استہزائیہ انداز میں ہنسی تھی۔

"قسمت بھی کیسے کیسے چونچلے بدلتی ہے نا رحبان...... تو وہی نوکر ہے نا جو ہمارے گھر کے کام کاج کیا کرتا تھا۔ سودا سلف لا کر دیا کرتا تھا۔ یتیم مسکین ہو جانے کے بعد تجھے میرے باپ نے پناہ نہ دی ہوتی تو تو آج کسی یتیم خانے میں پل کر بوڑھا ہوا ہوتا۔ آج تیری ہمت اتنی بڑھ گئی ہے کہ تو اسی مالک کی بیٹی کو رحم کرتے ہوئے اس کی مدد کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مت بھول کہ میں دین کی بیٹی ہوں۔ بہت ہمت ہے ابھی مجھ میں...... تیری مدد کی ضرورت نہیں ہے مجھے......" چاند نے نفرت سے کہا تھا۔ رحبانی اس کی شکل دیکھنے لگا تھا۔

"اتنی نفرت کہاں سے لائی ہے چاند...... کڑوی دوائیاں کوٹ کوٹ کر کڑوی ہو چکی ہے تو بھی......"

"کاش تو سمجھ پاتا کہ میں کڑوی دوائیوں کو نہیں کوٹتی ہوں...... میں نفرت کوٹتی ہوں۔ جو میرے دل میں تیرے خلاف ہے۔ بستامی کے خلاف ہے۔ اسی نفرت کو پیستی ہوں۔ دھوپ لگواتی ہوں۔"

"کیا ملا اس سب سے تجھے......؟ کیا بگاڑ لیا تم نے میرا یا بستامی کا......"

"میرا انصاف اللہ کے ذمے ہے رحبان...... وہ کارساز ہے۔ یقیناً بہتر انداز میں انصاف کرے گا۔"

"نفرت خود پال کر انصاف اللہ کے ذمے لگایا ہوا ہے۔ واہ چاند!" رحبانی نے طنز کیا تھا۔ "تیرا دل نفرت لیے ہوئے ہی پیدا ہوا تھا ورنہ اس نفرت کے بجائے تو تم خوش حالی میں بھی زندگی گزار سکتی تھی۔"

"تجھ سے شادی کر کے......" چاند نے طنزیہ پوچھا تھا۔

"ہاں......"

''التمش کے قاتل سے کیسے شادی کر لیتی......''

''تو اس قتل کو اپنے حسن کا فخر بھی بنا سکتی تھی۔ لیکن نہیں...... تو نے اسے بدلے کی آگ بنا لیا۔ جبکہ میں معافی مانگ چکا تھا اور تیرا بدلہ لینا بھی تجھے معاف کر دیا تھا۔''

''وہ بدلہ التمش کا نہیں تھا، صندل کا تھا۔''

''ایک بدلے سے تو دونوں بدلے لے لینا چاہتی تھی۔ میں مر جاتا تو پھر کون سا التمش کا بدلہ باقی رہ جانا تھا۔ یاد تو ہوگا تجھے بھی سب...... میں شراب کے نشے میں تھا۔ تو میرے کمرے میں چلی آئی تھی۔ اور تو نے تکیے سے میرا دم گھوٹنے کی کوشش کی تھی۔''

''لیکن تو مرا نہیں تھا۔''

''کوشش تو نے پوری کی تھی۔''

''اپنی کوشش کے ادھورے رہ جانے کا مجھے دکھ ہے۔'' چاند نے کہا۔ اور عرصے کے بعد رحبانی کو پھر سے دکھ ہوا۔

''ساری کوشش خود کر لینے کے بعد اب اللہ پر سب چھوڑ دینا زیادتی ہے۔''

''زیادتیوں کے حساب کتاب بھی یقیناً کسی دن بے باک ہوں گے۔'' چاند نے کہا۔

''انتظار میں خود کو مزید کتنا جلائے گی۔''

''یہ انتظار ہی اب میری زندگی ہے۔ چلتی ہوں اب......''

چاند نے کہا تھا اور پھر وہاں سے باہر کی طرف چلی گئی تھی۔ رحبانی یک ٹک اسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی ایمن رحبان اور چاند دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ دل کی کھال اس کی بھی سکڑ رہی تھی۔ دھڑکنیں اس کی بھی بے ترتیب تھیں۔ اور آنکھیں اس کی بھی بھری ہوئی تھیں۔ ایک شخص جو زندگی میں شامل ہو، کمرے میں موجود ہو، اس کی قربت بھی دستیاب ہو۔ اور وہ پھر بھی آپ کا نہ

ہو۔اس سے بڑھ کر اذیت کیا ہوگی۔

☆......☆......☆

دن وقت سے پہلے ہی ڈوب رہا تھا۔سورج پہاڑوں کی اوٹ میں چھپنے لگا تھا۔ابھی اس کے چھپنے کا وقت نہیں ہوا تھا لیکن فضا مقررہ وقت سے بہت پہلے ہی شام کو خوش آمدید کہنے لگی تھی۔

اسلام آباد سے حویلیاں تک کا وہ سفر نجانے کیوں اتنا طویل ہو چکا تھا۔تانگے والا ایسے جیسے سورج کے پار جا رہا تھا۔یا شاید حویلیاں آج کہیں کھو گیا تھا۔وہ روئے زمین پر کہیں تھا ہی نہیں......

چاند نے اپنے آنسو صاف کیے تھے۔جو آج رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔باریشہ اس کا آخری سہارا تھی اور یہ آخری سہارا آج جیسے اس سے چھینا گیا تھا۔اس کی سانسیں باریشہ میں تھیں اور اب یہ سانسیں اکھڑنے لگی تھیں۔اسلام آباد جاتے وقت وہ سوچ رہی تھی کہ باریشہ اس سے روٹھے گی،ناراض ہو گی لیکن بالآخر وہ اسے منا ہی لے گی۔اور اپنے ساتھ واپس لے آئے گی لیکن ایسا نہیں ہو سکا تھا۔

''کیا ہوا؟'' وہ حویلی کے اندر داخل ہوئی تھی جب ارشادی بابا نے اس سے پوچھا تھا۔وہ ارشادی بابا کو حویلی اور آمنہ دونوں کا خیال رکھنے کو چھوڑ گئی تھی۔

''وہ نہیں آئی میرے ساتھ......'' اس نے ٹوٹے دل کے ساتھ بتایا تھا۔

''میں نے تو تم سے پہلے ہی کہا تھا چاند......وہ نہیں مانے گی۔وہاں جانا بے کار تھا۔''

''دل میں خلش تو نہیں رہے گی کہ میں نے اسے نہیں منایا......''

''اب جو دل پر زخم لے کر آئی ہو اس کا کیا......''

''میرا دل زخموں سے بھرا ہوا ہے۔کوئی نیا زخم درد نہیں دیتا اب۔''

''پھر رو کیوں رہی ہو؟''

''اس لیے کہ اب شاید وہ مجھ سے زیادہ نفرت کرنے لگے۔''

"ایسا کیوں......؟"

"اس نے باریشہ کو سب بتا دیا ہے اور اپنی مرضی کے مطابق بتایا ہے۔ میر اروشانے کو زہر دینا اور رحبان کو جان سے مارنے کی کوشش کرنا۔"

"یہ تو برا ہوا۔"

"اب اس کے واپس آنے کی کوئی امید نہیں مجھے......" چاند نے آنسو صاف کیے تھے۔

"میں بات کروں گا اس سے......تم فکر مت کرو۔"

چاند درگا مورتی والے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

"کہاں جا رہی ہو چاند......؟"

ارشادی بابا نے پوچھا تھا لیکن چاند نے جیسے سنا ہی نہیں تھا۔ بڑا کمرا کھول کر اس نے اندر سے بند کر لیا تھا۔

"چاند دروازہ کھولو......" ارشادی بابا فکر مند تھے۔ دروازہ کھٹکھٹانے لگے تھے۔

نیم اندھیرے کمرے میں چاند فرش پر لیٹ گئی تھی۔ سانپ کل شام سے بھوکا تھا۔ چاند نے سن رکھا تھا کہ سانپ بھوکا ہو تو اپنے مالک کو بھی ڈس لیتا ہے۔ اسی لوک داستان کی آس پر اس نے فرش پر لیٹ کر اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔

زندگی سے اب اسے یہ ہی امید بچی تھی۔

☆......☆......☆

باریشہ کی بے چینی جانے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ چاند نانو نے وہاں آ کر اسے منتشر کر دیا تھا۔ اسے لگا تھا کہ حویلیاں، دین حویلی اور چاند نانو سے اب اس کی جان چھوٹ چکی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا تھا۔ دل تو اس کا کر رہا تھا کہ ارشادی بابا کو فون کرے اور انہیں خوب خوب سنائے۔ لیکن پھر

اس نے اس بات کو نظر انداز کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ارشادی بابا کا بھی کوئی قصور نہیں تھا۔ ان کو بھی نجانے کون سا احساس جرم ہر وقت ستاتا رہتا تھا کہ وہ ستائے ہوئے لوگوں کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ پھر چاہے وہ صندل ہو، چاندنا نو یا خود باریشہ......

سوچتے سوچتے اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ اسے چاندنا نو سے لاکھ شکایتیں سہی......لیکن ایک خلش اسے تنگ کر رہی تھی۔ کچھ تھا جو اسے بے چین کر رہا تھا۔ جن لوگوں کے گھر وہ رہ رہی تھی وہ ان کی احسان مند تھی۔ لیکن کچھ ایسا تھا کہ جو اسے شک میں مبتلا کر رہا تھا۔ اتنے دنوں میں وہ یہ بات تو جان گئی تھی کہ کومل بیگم کوئی فلاحی ادارہ نہیں چلا رہی ہے۔ بلکہ فلاحی ادارے کی آڑ میں کچھ اور کام لیا جا رہا تھا۔ کیا کام لیا جا رہا تھا، یہ وہ نہیں جانتی تھی۔

اس نے جاننے کی کوشش کی تھی لیکن کومل نے گھر کی لڑکیوں کو باریشہ سے بات کرنے سے اتنا سختی سے منع کیا ہوا تھا کہ باریشہ کو کچھ علم نہیں ہو سکا تھا۔ اپنی دانست میں اس نے سمجھ لیا تھا شاید کومل بیگم چھپ کر کوئی کام کر رہی ہیں۔ رحبانی بابا، بستامی بابا یا سانول کو اس کی خبر نہیں تھی۔

حقیقت یہ بھی تھی کہ موجودہ وقت میں باریشہ کچھ مطلب پرست ہو چکی تھی۔ اگر وہ خود کا اچھے سے احتساب کرتی تو جان جاتی کہ گھر میں کیا چل رہا تھا۔ یہ جاننے کی اس نے دل سے کوشش نہیں کی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ جن لوگوں کے گھر میں وہ آرام و سکون سے رہ رہی ہے ان کے بارے میں اسے کچھ ایسا پتا چلے جو اسے جھنجھوڑ کر رکھ دے اور اسے یہاں سے جانا پڑے۔ وہ اس وقت میں اتنی مطلب پرست ہو چکی تھی کہ اگر اسے یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ کومل بیگم اس گھر میں چکلا چلا رہی ہے تو وہ شاید اس بات کو بھی درگزر کر دیتی۔ اور ان لوگوں سے کبھی ناراض نہ ہوتی۔

اس سب کے باوجود باریشہ میں ایک کھلبلی تھی۔ جو کچھ پوشیدہ تھا وہ اسے جان لینا چاہتی تھی۔ ایک رات وہ تین بجے کا الارم لگا کر سو گئی تھی۔ اور پھر رات کو تین بجے اٹھی تھی۔ اس کے خیال میں یہ ایسا

وقت تھا جب سب ہی سو رہے ہوتے ہیں۔ اس نے اپنے دراز میں سے کچھ بال پن اور ایک ٹارچ پکڑی تھیں اور چادر اوڑھ کر کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔ گہری رات میں دائیں بائیں دیکھتے ہوئے وہ چوروں کی طرح دبے قدموں سرونٹ کوارٹر تک آئی تھی۔ اندر موجود ایک عورت سے اس کی بات چیت ادھوری رہ گئی تھی۔ باریشہ آج انہی ادھوری باتوں کو مکمل کرنے آئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اندر موجود عورت بہت کچھ جانتی ہے جو اس کی تسلی کر سکتی ہے۔

سرونٹ کوارٹر کے دروازے پر حسب معمول تالا تھا۔ باریشہ نے بال پن سے اسے کھول لیا تھا۔ پھر ٹارچ روشن کر کے وہ اندر گئی تھی۔ گندے کوارٹر میں آج انتہا کی خاموشی تھی۔ شاید بوڑھی عورت سو رہی تھی۔

"کوئی ہے......؟" باریشہ نے آواز لگائی تھی۔ "آپ مجھے سن سکتی ہیں؟"

لیکن کوئی جواب نہیں آیا تھا۔

باریشہ اسی کمرے میں گئی تھی جہاں وہ پہلے عورت سے مل چکی تھی۔ اور وہاں پہنچ کر وہ دھک سے رہ گئی تھی۔ وہ کمرا خالی تھا۔ نہ تو وہاں زنجیر تھی اور نہ ہی بوڑھی عورت...... باریشہ ایک کے بعد ایک کمرے میں گئی تھی۔ کوارٹر کچھ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ جلد ہی اس نے سارا کوارٹر دیکھ لیا تھا۔ وہ کسی بنجر کنویں کی طرح خالی تھا۔

"کہاں گئی وہ بوڑھی عورت......" باریشہ نے خود سے سوال کیا تھا۔ اپنے کمرے میں واپس آنے تک وہ اسی بات کو سوچتی رہی تھی۔

"کیا وہ مر گئی ہے......" وہ خود سے ہر طرح کا سوال پوچھتی جا رہی تھی۔ "یا اسے پاگل خانے میں جمع کروا دیا گیا ہے۔"

اور بھلا وہ خود کو کیسے کوئی جواب دے سکتی تھی جبکہ وہ کچھ جانتی ہی نہ تھی۔

☆......☆......☆

''خیام......'' وہ اپنے اسٹوڈیو میں کام کررہا تھا جب شائستہ کی آواز سنائی دی تھی۔

''جی ممی......میں یہاں ہوں۔'' اس نے جلدی سے اپنے پورٹریٹ پر پردہ ڈال دیا تھا۔

''میرے خیال سے یہ ضامن کا موبائل ہے۔ وہ اسے یہاں ہی بھول گیا ہے۔'' شائستہ نے ایک موبائل خیام کو دکھایا تھا۔

''جی......یہ اسی کا موبائل ہے۔''

''اسے اس کی ضرورت نہ ہو۔''

''ہوسکتا ہے، لیکن میں اسے اس تک کیسے پہنچا سکتا ہوں۔''

''ڈرائیور سے ایڈریس پوچھ لو۔ وہ گھر کے ڈرائیور کے ساتھ ہی تو روز جاتا ہے۔''

''اس نے مجھے اپنے کام والی جگہ پر آنے سے منع کیا ہوا ہے۔''

''ایسا کیوں؟'' شائستہ نے حیرت سے پوچھا تھا۔

''پتا نہیں......''

''پھر میں کچھ نہیں کہہ سکتی ہوں۔ فون کر کے ڈرائیور کو بلا لو کہ وہ گھر سے آ کر اس کا موبائل لے جائے۔ وہ یہ نہ سمجھ رہا ہو کہ اس کا موبائل کہیں کھو گیا ہے۔'' شائستہ کہہ کر وہاں سے چلی گئی تھیں۔ خیام نے چند لمحے تک سوچا تھا اور پھر ڈرائیور کو کال کی تھی۔ یہ کہنے کے لیے نہیں کہ وہ گھر سے آ کر ضامن کا موبائل لے جائے۔ بلکہ یہ پوچھنے کے لیے کہ ضامن اس وقت کہاں ہے۔

ضامن جو عرصے سے اس سے چھپا رہا تھا وہ جاننے کا تجسس خیام میں بڑھتا جا رہا تھا۔

☆......☆......☆

اپنے آفس میں ضامن کام میں مصروف تھا۔ جب خیام وہاں چلا آیا تھا۔

''سرپرائز......'' خفت مٹانے کو اس نے ''سرپرائز'' کا بہانہ بنایا تھا اور خیام کو وہاں دیکھ کر

ضامن اپنی سیٹ پر اچھلا تھا۔

"خیام......تو یہاں کیا کر رہا ہے؟"

"تیرا موبائل دینے آیا ہوں۔" خیام نے پاکٹ سے موبائل نکال کر ضامن کے آگے کیا تھا۔

"گھر پر رہ گیا تھا۔"

"کیا ضرورت تھی۔"

"مجھے لگا کہ تجھے اس کی ضرورت نہ ہو۔"

"ضرورت ہوتی تو ڈرائیور کے ہاتھ منگوا لیتا۔"

"اس بات کا تو مجھے خیال ہی نہیں آیا تھا۔" وہ انجان بنتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے......اب گھر جاؤ، شکریہ یہاں آنے کا......"

"کیا میں تھوڑی دیر یہاں رک نہیں سکتا ہوں۔ اپنے دوست کے پاس......" وہ آرام دہ انداز میں آفس میں لگے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

"خیام......پھر سے وہی بات......ہمارے درمیان کچھ طے پایا تھا۔" ضامن نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا تھا۔

"مجھے وہ اتنا اہم نہیں لگتا۔"

"لیکن میرے لیے وہ بہت اہم ہے۔ کمٹمنٹ کمٹمنٹ ہوتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ چلتا ہوں۔" نا چاہتے ہوئے بھی خیام کا موڈ آف ہو گیا تھا۔ ضامن نے یہ بات نوٹ کی تھی۔

"سوری......"

"اٹس او کے......چلتا ہوں۔"

وہ آفس سے باہر جانے لگا تھا جب ضامن نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا تھا۔

''سوری میرے دوست......'' اس نے چند لمحوں تک اسے اپنے گلے سے ہی لگائے رکھا تھا۔ خیام کا سارا شکوہ ختم ہو گیا تھا۔ دونوں جب الگ ہوئے تھے تو آفس کے دروازے کی طرف دیکھ کر شاکڈ رہ گئے تھے۔ آفس کے دروازے پر باریشہ کھڑی تھی۔

خیام نے باریشہ کو دیکھا تھا اور بس دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ اس کا وہاں آنا رائیگاں نہیں گیا تھا۔ جس چہرے کو وہ پھر سے دیکھنا چاہتا تھا وہ چہرہ اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ کسی جھرنے کی طرح کا شفاف چہرہ، جس نے دھوپ کی تمازت نہ دیکھی ہو۔ کسی تاریک غار میں کھلا ہوا کوئی روشن پھول...... جو نہ جانتا ہو کہ غار سے باہر کی فضا کتنی آلودہ ہے۔

اور خیام کو دیکھتے ہوئے باریشہ کے چہرے پر خوف پھیلنے لگا تھا۔ وہ ایک لمحے میں پہچان گئی تھی کہ یہ وہی لڑکا ہے جس نے اسے جان سے مارنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن یہ یہاں کیا کر رہا تھا۔ ضامن کے پاس، اس کے آفس میں......اور یہ دونوں گلے کیوں مل رہے تھے۔

کیا دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ چہرے پر شدید حیرت لیے وہ دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ ضامن کو اور خیام کو...... جس کا وہ نام تک نہیں جانتی تھی۔

باریشہ کو احساس ہو چکا تھا کہ اسے بہت طریقے سے بے وقوف بنا لیا گیا ہے۔

ضامن نے باریشہ کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سوال ہی سوال تھے۔



ناول **تاش گھر** ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **15** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 26

۱۹۷۵ء

حویلیاں قصبے کی اس پرانی حویلی میں آج ایک خون آشام شام وارد ہو چکی تھی۔ جو نجانے کس کس کا خون کر کے آئی تھی اور اب یہاں نجانے کس کس کو مار کر جانے والی تھی۔ کائی زدہ دیواریں کچھ مزید بدنما ہو گئی تھیں۔ سرخ حویلی نجانے کیوں سیاہ دکھنے لگی تھی۔ یہ شام رات سے زیادہ تاریک تھی۔ اور اس کی صبح نجانے کب ہونے والی تھی۔

شکیلہ پھوپھو بے ہوش تھیں۔ حکیم کو بلایا گیا تھا۔ حکیم نے اپنے طور پر دوائی دے دی تھی جو اس کے بس میں تھا اس نے کیا تھا لیکن شکیلہ پھوپھو کی طبیعت بہتر نہیں ہو سکی تھی۔ شکیلہ پھوپھو ہوش میں آتی تھیں، ''سارا سارا'' پکارتی تھیں اور پھر سے بے ہوش ہو جاتی تھیں۔ ان کا ہوش میں آنا لمحاتی تھا اور اذیت ناک بھی...... آنسو بھری آنکھوں سے وہ سب کو دیکھتی تھیں اور بس ایک ہی بات پوچھتی تھیں۔

''سارا کہاں ہے؟''

سارا کہاں تھی یہ بھلا کوئی انہیں کیسے بتا سکتا تھا۔ سارا کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں معلوم تھا۔ سب بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ جو سوال سب کی آنکھوں میں اترا ہوا تھا اس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ اور جو اندیشے ان کے ذہنوں میں وارد ہو رہے تھے وہ انہیں خوف زدہ کر رہے تھے۔

سارا کے بارے میں جن کو معلوم تھا وہ بے معصومیت کی ساری حدود پھلانگے ہوئے تھے۔ کومل اور بستامی ایسے ظاہر کر رہے تھے جیسے سارا کے اغوا ہو جانے کا سب سے زیادہ دکھ انہیں ہی ہے۔ بستامی کبھی کسی ڈاکٹر کو لا رہا تھا اور کبھی کسی حکیم کو...... کبھی وہ کوئی دوائی لاتا، کبھی کوئی پھکی لاتا۔

''اسے شکیلہ پھوپھو کو دو...... نجانے کس چیز سے شکیلہ پھوپھو کی طبیعت بہتر ہو جائے۔''

چاند کو بستامی کے اتنے اپنائیت بھرے رویے پر حیرت ہوئی تھی۔ اسے گھر والوں سے کبھی کوئی سروکار نہیں ہوا کرتا تھا۔ کون ٹھیک ہے، کون بیمار ہے، اس نے کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بستامی کے اس بدلاؤ کی وجہ چاند کی نظر میں یہ تھی کہ اب اس کی خود کی شادی ہو چکی تھی۔ وہ جان گیا تھا کہ زندگی میں گھرانے کی کیا اہمیت ہوتی ہے اور گھرانے کی فکر کرنا کس قدر ضروری ہوتا ہے۔

''میں نے اپنے سارے ملازم اور جاننے والوں کو سارا کی تلاش میں بھیج دیا ہے۔ ان شاء اللہ اچھی خبر ملے گی۔'' بستامی نے زندگی میں پہلی بار شاید ان شاء اللہ کا لفظ استعمال کیا تھا۔ پریشانی میں بھی چاند کو خوشی ہوئی تھی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح بستامی کے حوالے سے غلط فہمیاں نہیں پالی تھیں۔

کومل بھی شکیلہ پھوپھو کے حوالے سے کچھ زیادہ ہی فکر مندی کا اظہار کر رہی تھی۔

''میں شکیلہ پھوپھو کے لیے سوپ بنا کر لائی ہوں۔'' ہاتھ میں سوپ کا پیالہ لیے کومل بڑے کمرے میں آئی تھی جہاں رات سے ہی سب موجود تھے۔

شکیلہ پھوپھو تخت پر نڈھال لیٹی تھیں اور سب ان کے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔

سب نے حیرت سے کومل کی طرف دیکھا تھا۔ وہ سب ''سوپ'' کا نام پہلی بار سن رہے تھے۔ کومل نے دل ہی دل میں ان کے ادھورے علم پر ماتم کیا تھا۔ یہ قدیم لوگ تاعمر قدیم ہی رہنے والے تھے۔

''یخنی سمجھ لیں آپ اسے......'' اس نے پیالہ چاند کی طرف بڑھا دیا تھا۔ ''آپ شکیلہ پھوپھو کو یہ پلانے کی کوشش کریں۔ انہیں اس وقت انرجی...... میرا مطلب طاقت کی ضرورت ہے۔'' کومل کہہ کر خود

بھی وہاں شکیلہ پھوپھو کے تخت پر پاؤں والی سائیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

باقی سب جو ارد گرد کھڑے تھے اور بیٹھے تھے کسی معجزے کے انتظار میں تھے کہ جیسے ابھی باہر سے سارا بھاگتی ہوئی اندر آئے گی اور کہہ دے گی کہ وہ باغ میں کہیں کھو گئی تھی۔ یا کوئی آدمی اندر آ کر کہے گا کہ سارا مل چکی ہے۔ یا کوئی عورت حویلی کے دروازے تک سارا کو لیے آ جائے گی اور کہے گی کہ یہ لڑکی راستہ بھول چکی تھی اور میں نے اسے ساری رات اپنے گھر میں پناہ دی ہے۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہونے والا تھا۔ معجزے کا انتظار کرتے سب کے سب جانتے تھے کہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ بلکہ انہیں کچھ برا ہی سننے کو ملے گا۔

سارا کے اغوا کی خبر اس قدر ہولناک تھی کہ سب کو اس خبر کے بدلے میں سارا کی موت کی خبر مل جانا منظور تھی۔ اغوا کے ساتھ جو کچھ جڑا ہوا تھا وہ سانسوں کو بے ترتیب کیے دے رہا تھا۔ بے حرمتی، پامالی، حبس بے جا، تشدد، زبردستی ......اور نجانے کیا کیا...... اس سب کو سوچتے ہی تو شکیلہ پھوپھو اپنی طبیعت خراب سے مزید خراب کیے جا رہی تھیں۔ وہ ماں تھیں۔ وسوسے ایک کے بعد ایک کر کے ان کے ذہن میں آ رہے تھے۔ انہوں نے ہندوستان سے ہجرت کر کے آتے ہوئے بہت کچھ دیکھا تھا، بہت کچھ سنا تھا۔ اور یہ سب انہیں آج ہی کیوں یاد آ رہا تھا۔ لڑکیوں کی چیخ و پکار، آہیں، سسکیاں...... یہ سب انہیں آج کیوں یاد آ رہا تھا۔

''کیا میں کچھ بول سکتی ہوں؟'' کومل نے جھجکنے کی اداکاری کرتے ہوئے چاند سے کہا تھا۔

''کیا بات ہے کومل......؟ تمہیں جو کہنا ہے کہہ سکتی ہو۔''

''میرے خیال سے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنا ٹھیک نہیں...... ہمیں سارا کو تلاش کرنا چاہیے۔''

''گھر کے مرد یہی کام کر رہے ہیں۔''

''کچھ باتیں گھر کی عورتیں زیادہ بہتر جانتی ہیں۔'' کومل نے کہا تھا۔ کوئی اس کی یہ بات نہیں سمجھا تھا۔

''کیا کہنا چاہتی ہو؟''

"کیا سارا کسی لڑکے کو پسند کرتی تھی؟" کومل نے صاف گوئی سے پوچھ لیا تھا۔

سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔ انہیں کومل کا یہ سوال بے محل لگا تھا۔

کومل نے جلدی سے وضاحت دی تھی۔

"ہم صرف یہ ہی کیوں سوچ رہے ہیں کہ سارا اغوا ہوئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خود گھر سے بھاگ گئی ہو۔"

اور کومل کی وضاحت پر سب کے چہروں پر سختی آئی تھی۔

"تم ہوش میں تو ہو کومل......؟" چاند کو غصہ آیا تھا۔

"غصہ مت ہو۔ اس رخ پر سوچو تو سہی...... ہو سکتا ہے کہ کچھ سراغ مل جائے۔"

"سارا کسی کو پسند کرتی تو مجھے یا اپنی ماں کو ضرور بتاتی...... یا اپنی کزنوں کو...... کیوں لڑکیو؟ کیا سارا نے کبھی ایسی کوئی بات کی تم سے......؟"

"نہیں...... سارا نے کبھی ایسی بات نہیں کی۔" لڑکیوں کا بیان مشترکہ تھا۔

"سن لیا تم نے......" چاند نے کچھ جتاتے ہوئے کہا تھا۔

"ہو سکتا ہے کہ وہ لڑکا ہماری ذات کا نہ ہو۔ اس لیے سارا نے کسی کو بتایا ہی نہ ہو۔" کومل ہار ماننے والی نہیں تھی۔

"تم بلاوجہ اپنی ناقص عقل کے گھوڑے مت دوڑاؤ...... اس گھر کی لڑکیاں اپنی حدود جانتی ہیں۔"

"جی...... صندل کی غیر موجودگی اس بات کا ثبوت ہے۔" کومل نے بے ساختہ ہی طنز کیا تھا۔

سب کومل کو دیکھ کر رہ گئے تھے۔ انہیں کومل سے وقتی ناپسندیدگی ہوئی تھی۔ یہ وقت اس طرح کے طنز کا نہیں تھا۔

"کاش سارا کا رشتہ بستامی کے لائے ہوئے لوگوں کے ساتھ طے پا چکا ہوتا تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔" اٹھتے ہوئے اس نے افسوس سے گہرا سانس بھرتے ہوئے کہا تھا۔

''اس رشتے کے ختم ہو جانے کا آج کے واقعے سے کیا تعلق بنتا ہے؟''

''آپ خود ہی تو کہتی ہیں ستاروں کا آپس میں سنجوگ ہوتا ہے۔ سارا کا رشتہ اس لڑکے سے طے ہو چکا ہوتا تو ستاروں کا سنجوگ یقیناً آج کا واقعہ نہ ہونے دیتا۔ لیکن تم کو تو اپنی مرضی کرنا تھی۔ جو تم کر چکی ہو۔''

کومل کہہ کر کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔ چاند اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی تھی۔ اور اس کی بات پر غور کرنے لگی تھی۔ شاید کومل ٹھیک کہہ رہی تھی۔ سارا کا رشتہ طے ہو چکا ہوتا تو شاید اس کی قسمت میں اغوا ہونا نہ لکھا ہوتا۔ اور ایسا باقی سب بھی سوچنے لگے تھے۔ کومل میں روشن بیگم والی یہ خاصیت موجود تھی کہ لفظوں کی خوب صورتی سے سب کو اپنی سوچ کی ڈگر پر لے آیا کرتی تھی۔

''سارا...... سارا......'' شکیلہ پھوپھو چیخ مار کر اٹھی تھیں۔

''سارا مل جائے گی پھوپھو...... حوصلہ رکھیں۔ سارا جلد مل جائے گی۔'' چاند نے کہا تھا اور پھر ان کی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو اپنی چادر کے پلو سے صاف کرنے لگی تھی۔

☆......☆......☆

موسم ہر شام کچھ بدل جاتا تھا۔ پہلے کی نسبت مزید ٹھنڈا ہو جاتا تھا۔ سردیوں کی آمد شروع ہونے والی تھی اور کسی کو خیال نہیں تھا کہ لحافوں اور گرم کپڑوں کو دھوپ لگوانی ہے۔ سارے حویلی میں بدروحوں کی طرح رہ رہے تھے۔

رحبانی نے چاند سے کہا تھا کہ وہ سارا کو ڈھونڈنے کراچی اور لاہور جا رہا ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ جو لڑکیاں چھوٹے شہروں اور قصبوں سے اغوا ہوتی ہیں انہیں کراچی اور لاہور کے بازاروں میں بیچ دیا جاتا ہے۔ چاند یہ بات سن کر ہی دہل گئی تھی۔ رحبانی کی بات کے ساتھ نجانے کون کون سا تصور اس کے ذہن میں آ چکا تھا۔

''اللہ......! یہ کیوں اتنی بڑی آزمائش میں ڈال دیا ہے تو نے ہم سب کو......''

''امید ہی ہے کہ سارا وہاں سے مل جائے۔''

''میں دعا کروں گی کہ سارا مل جائے۔'' چاند نے کہا تھا۔

شکیلہ پھوپھو کی طبیعت اتنی بگڑ چکی تھی کہ چاند چاہتی تھی کہ سارا جس بھی حال میں ہو، واپس آ جائے۔ خواہ مردہ حالت میں ہی سہی...... لیکن وہ گھر تک آ جائے۔ رحبانی کو دل لگا کر سارا کو ڈھونڈنے کے وعدے دے کر چاند کچھ مطمئن تھی۔ اسے نجانے کیوں رحبانی پر یقین ہو چکا تھا کہ وہ سارا کو تلاش کر لے گا۔ وہ دل و جان سے چاند کا کام کرے گا۔ جیسے وہ بچپن میں بھاگ بھاگ کر چاند کے کام کیا کرتا تھا۔

رحبانی نہ تو لاہور گیا تھا اور نہ ہی کراچی...... وہ ایمن کو لے کر ٹھنڈیانی آ گیا تھا۔ اس نے ایمن سے وعدہ کیا ہوا تھا کہ وہ اسے ٹھنڈیانی کا میلہ دکھائے گا۔ سارا کے اغوا کی وجہ سے یہ منصوبہ کچھ التوا کا شکار ہو گیا تھا۔ لیکن اب اسے فراغت تھی۔ اس نے اپنا وعدہ جلد ہی پورا کر دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایمن پھر سے اس سے ناراض ہو جائے۔ ایمن ناراض تو نہیں ہوئی تھی، لیکن ٹھنڈیانی آ کر اس کا منہ بن گیا تھا۔ کیونکہ اونٹوں اور گھوڑوں کا میلہ ختم ہو چکا تھا۔ ٹھنڈیانی اپنی سرسبز وادیوں سمیت خاموش اور پرسکون تھا۔

''تم نے آنے میں دیر کر دی رحبانی...... میلہ تو ختم ہو چکا ہے۔'' ایمن کا شکوہ کرنا جائز تھا۔

''معافی چاہتا ہوں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میلہ اتنی جلدی ختم ہو جائے گا۔''

''میلے سدا کے لیے تھوڑی نہ ہوتے ہیں۔''

''یہ تو ہے۔ وعدہ کرتا ہوں کہ اگلی بار کا میلہ ضرور دکھاؤں گا۔''

''نجانے اگلے سال ہم دونوں کہاں ہوں۔''

''پچھلے کئی سالوں سے ہم ساتھ ہی ہیں ایمن...... آنے والے سالوں میں بھی ساتھ ہی ہوں گے۔'' رحبانی نے اس کے گال پر چٹکی کاٹی تھی۔

ایمن نے چہرہ نامحسوس طریقے سے پیچھے کیا تھا۔ رحبانی کا پیار بڑا بے کیف تھا۔

''امید کے سہارے تو دنیا قائم ہے۔ ہمارا یہ رشتہ بھی سہی......''

''یہاں آکر تو خوشی محسوس کرو...... دیکھو باہر کے نظارے...... کتنے دلفریب ہیں۔''

''فی الحال فریش ہو جاؤ...... مجھے بھوک لگی ہے۔ باہر جا کر کچھ کھاتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' رحبانی کہتے ہوئے واش روم کی طرف بڑھا تھا۔

''میں تمہارے کپڑے نکال کر لاتی ہوں۔'' ایمن نے کہتے ہوئے سوٹ کیس کھول لیا تھا۔

☆......☆......☆

ٹھنڈیانی ٹھنڈا ہونے جا رہا تھا۔ موسم جس حساب سے بدل رہا تھا ایسے لگ رہا تھا کہ اس بار وقت سے پہلے ہی برف باری شروع ہو جائے گی۔ اس بار خزاں بھی بہار کی طرح آئی تھی۔ آتے ہی ہر درخت پر چھا گئی تھی اور اس نے درختوں کو دنوں میں بے لباس کر دیا تھا۔ ایسا موسم دیکھتے ہوئے نجانے کیوں صندل کا دل گھبرانے لگتا تھا۔

باریشہ کی پیدائش کے بعد سے صندل کی طبیعت ویسے بھی کچھ زیادہ بہتر نہیں تھی۔ پھر باریشہ کے

بہت سے کام بھی ہوتے تھے۔ اسے دودھ پلانا، نہلانا، کپڑے تبدیل کروانا۔ میرزاد نے اسے ملازمہ رکھنے کو کہا تھا لیکن وہ باریشہ کا ہر کام خود کرنا چاہتی تھی۔ جیسے چاند امی نے حویلی میں اتنے ملازم ہونے کے باوجود بھی صندل کے سارے کام اپنے ہاتھوں سے ہی کیے تھے۔ وہ ہر بار میرزاد کی ملازمہ والی بات پر انکار کر دیا کرتی تھی۔ لیکن پھر کراچی سے واپسی پر صندل نے میرزاد کی معمولی سے معمولی بات بھی ٹالنا ختم کر دی۔ وہ جو کہتا تھا صندل ویسا ہی کرتی تھی۔

جب سے وہ کراچی سے واپس آیا تھا اور اس نے زویا آپی کا آخری خط پڑھا تھا تب سے ہی وہ کچھ چپ چپ تھا۔ صندل اس موضوع پر اس سے بات نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس موضوع پر بات چیت میرزاد کو کوئی تسلی تو کیا دے گی، الٹا مزید اذیت ہی دے گی۔ لہٰذا وہ چپ تھی۔ اور ہمیشہ کی طرح کسی معجزے کے انتظار میں تھی۔ وہ اتنا ضرور چاہتی تھی کہ میرزاد جلد سے جلد اس بات کو بھول جائے۔ زویا کی انا اور کینہ پروری سے جیت جانا ناممکنات میں سے تھا۔ شاید قدرت ہی اس کے دل میں رحم ڈال دے اور وہ خود سے میرزاد سے ملنے چلی آئے۔ جو حالات ہو چکے تھے اس میں بس دعا ہی کی جا سکتی تھی۔

میرزاد نے باریشہ کے لیے ایک ملازمہ رکھ لی تھی۔ ملازمہ لڑکی نے جلد ہی باریشہ کے ساتھ انسیت پیدا کر لی تھی۔ جس کی وجہ سے صندل کو کچھ سہولت ملی تھی اور وہ میرزاد کے ساتھ مل کر ریسٹورنٹ کے معاملات دیکھنے لگی تھی۔

آج ایک لمبے عرصے کے بعد اس نے ملازمہ سے کہہ کر اپنے ستار کو صاف کروایا تھا۔ اور جالی دار کھڑکی کے پاس رکھوا دیا تھا جہاں سے نیچے ریسٹورنٹ کا بڑا ہال نظر آتا تھا۔ پچھلے کافی دنوں سے ٹھنڈیانی میں میلہ لگا ہوا تھا لیکن صندل کی طبیعت اتنی بہتر نہیں تھی کہ وہ ستار بجاتی...... میرزاد نے اس کام کے لیے کسی اور کو تلاش کرنا چاہا تھا لیکن پورے ٹھنڈیانی میں انہیں ایسی کوئی لڑکی یا لڑکا نہیں ملا تھا جو ستار بجانا جانتا ہو۔ ان کے مستقل گاہکوں نے اس بات کی شکایت کی تھی لیکن میرزاد سوائے معذرت کے اور کچھ نہیں کر

سکتا تھا۔ اب میلہ ختم ہو چکا تھا۔ گاہک کم تھے لیکن صندل جلد سے جلد پرانی روٹین کو اپنا لینا چاہتی تھی۔

ٹھنڈیانی کے پہاڑوں پر جوں ہی سورج غروب ہونے کا سندیسہ دیا کرتا تھا توں ہی گاہک ریسٹورنٹ میں وارد ہونا شروع ہو جاتے تھے۔ جب سے میلہ ختم ہوا تھا ریسٹورنٹ کچھ زیادہ اچھا نہیں جا رہا تھا۔ بہت کم لوگ ہوتے تھے جس کے باعث دونوں میاں بیوی پریشان تھے لیکن آج اتفاق سے ہال کسی حد تک بھرتا جا رہا تھا۔ صندل کو خوشی ہوئی تھی۔ سیاحت پھر سے عروج پکڑنے لگی تھی۔ اسی خوشی میں اس نے ستار بجایا تھا۔ کافی عرصہ نہ بجانے کی وجہ سے اسے ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ آج پہلی بار ستار بجا رہی ہو۔ وہ کوئی خاص ماہر نہیں تھی۔ اس نے بہت کم بجانا سیکھا تھا۔ لیکن جتنا سیکھ لیا تھا اسے بھولنا نہیں چاہتی تھی۔

رات اپنے پر کھول کر پورے ٹھنڈیانی پر چھا چکی تھی۔ وہ رات سرخ تھی۔ سرخ چاند نے ساری دھرتی کو سرخ کر دیا تھا۔ صندل کی انگلیوں میں درد ہوا تھا اور نہ ہی وہ تھکی تھی۔ وہ دھن میں گم تھی جب کسی نے اسے جھنجھوڑا تھا۔ صندل نے چونک کر دیکھا تھا۔ وہ میرزاد تھا۔

''کیا ہوا ہے میرزاد؟''

''اسے بجانا بند کرو صندل......'' وہ گھبرایا ہوا تھا۔ اور گھبراہٹ میں اس سے اصل بات نہیں ہو پا رہی تھی۔

''ہوا کیا ہے؟'' صندل کھڑی ہوئی تھی۔

''نیچے ہال میں رحبانی بابا آئے ہوئے ہیں۔'' اس نے بتایا تھا۔

''کیا...... رحبانی بابا آئے ہیں؟'' صندل نے نیچے ہال میں دیکھا تھا لیکن رحبانی اور ایمن نجانے کہاں بیٹھے تھے کہ وہ صندل کو جالی والی کھڑکی سے نظر نہیں آسکے تھے۔

''ہاں وہ کسی عورت کے ساتھ ہیں۔ انہیں تو نہیں معلوم نا کہ تم ستار بجاتی ہو؟''

''انہیں معلوم ہے لیکن تم اتنا ڈر کیوں رہے ہو میر...... رحبانی بابا باقی سب سے الگ ہیں، تم مجھے

ان سے ملنے دو۔ وہ ہم سے مل کر خوش ہوں گے اور کسی کو کچھ نہیں بتائیں گے۔"

"تم پاگل ہوگئی ہو کیا صندل...... ایسا مت کرنا۔ ان سے ہرگز نہیں ملنا۔ میں اتنا بڑا رسک تمہارے اندازے پر نہیں لے سکتا ہوں۔"

"کیا انہوں نے تمہیں دیکھا تھا؟"

"نہیں...... انہوں نے مجھے نہیں دیکھا۔ میں نے شیشے میں انہیں دیکھا تھا اور جلدی سے اوپر آگیا۔"

"میرا یقین کرو...... رحبانی بابا کو ہم سے مل کر خوشی ہوگی۔"

"تم تو کہتی تھیں کہ زویا آپی مجھے دیکھتے ہی گلے سے لگالیں گی لیکن ایسا تو نہیں ہوا تھا۔ بلکہ جو ہوا بہت برا ہوا۔"

میر نے نا چاہتے ہوئے بھی اسے لاجواب کیا تھا۔ صندل چپ ہو کر رہ گئی تھی۔ زویا کے معاملے میں اس کے اندازے تباہ کن حد تک غلط ثابت ہوئے تھے۔

"جب تک رحبانی بابا اس جگہ پر ہیں ہم گھر سے باہر نہیں نکلیں گے۔ تم کھڑکی میں نہ کھڑی ہونا۔"

"ٹھیک ہے جیسا تم کہو......" اس نے رضامندی دے دی تھی۔ جب کہ اس کا شدت سے دل چاہ رہا تھا کہ وہ رحبانی بابا کو گلے سے لگالے۔ ان سے حویلی والوں کا حال دریافت کرے اور تعبیر کا اور افشین کا پوچھے کہ دونوں اب کیسی ہیں۔

☆......☆......☆

"تم اداس ہو رہی تھی نا کہ ٹھنڈیانی کا میلہ ختم ہو چکا ہے۔ میرے پاس ایک آئیڈیا ہے۔ یہاں سے ہم اسکردو چلے جائیں گے۔ وہاں پر بھی تو خوب رونق ہوتی ہے۔ پھر ناران، کاغان...... میں تمہیں وہاں کی وہ عورتیں دکھاؤں گا جو سیپیوں سے بنا لباس پہنتی ہیں اور بہت خوب صورت لگتی ہیں۔" گرما گرم تکے کو منہ سے پھاڑتے ہوئے رحبانی نے کہا تھا۔ ایمن اس کی شکل دیکھنے لگی تھی۔

"یہ سب خیال کیسے آیا تمہارے ذہن میں......؟"

"تم یہاں کا میلہ ختم ہو جانے کا افسوس جو کر رہی تھی۔"

"تم تو ٹھنڈیانی آنے پر آمادہ نہیں تھے۔ کہاں اب سکردو اور ناران کاغان کی بات کر رہے ہو۔"

"تم نہیں جانا چاہتیں کیا؟"

"جانا چاہتی ہوں۔ لیکن تم خوش کس بات پر ہو۔ یہ تو بتاؤ......"

"نہیں...... کسی بات پر نہیں۔" رحبانی سے اپنی خوشی چھپائی نہیں جا رہی تھی۔ اسے صندل کا پتا چل چکا تھا۔ ستار کی پہلی ہی دھن پر اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ صندل ہے۔ وہ جانتا تھا کہ صندل ستار بجانے میں زیادہ ماہر نہیں ہے۔ وہ زیادہ اچھے سے ستار نہیں بجاتی تھی۔ اور جیسا بجاتی تھی اسے بھولا نہیں جا سکتا تھا۔ اس کے استاد نے اسے صرف ایک ہی دھن پر دسترس دلوائی تھی۔ وہ اسی دھن کو بار بار بجائے جا رہی تھی۔

"ہوٹل سے نکلتے وقت بھی تم چپ چپ ہی تھے۔ یہاں آتے ہی چہکنے لگے ہو۔ لگتا ہے کہ اس ریسٹورنٹ کا کھانا تمہیں بے حد پسند آیا ہے۔"

"ہاں...... بہت زیادہ۔"

"میں نے فرخندہ سے سنا تھا اس ریسٹورنٹ کے بارے میں...... اس نے بھی یہاں کے کھانے اور ماحول کی بہت تعریف کی تھی۔"

"یہاں کی ہر چیز واقعی ہی لاجواب ہے۔"

"ماننا تو پڑے گا۔ دیکھو خود کو ایک دم سے کیسے خوش باش دکھنے لگے ہو۔"

رحبانی مسکرایا۔ وہ اصل بات ایمن کو نہیں بتا سکتا تھا۔

"لیکن ٹھہرو...... یہ ستار بجنا کیوں بند ہو گیا ہے۔" ایمن کو تشویش ہوئی تھی۔ اس نے ایک ویٹر کو بلا کر اس کے بارے میں پوچھا تھا۔

"میم کی طبیعت خراب ہو چکی ہے۔" ویٹر نے اسے بتایا تھا۔ رحبانی جانتا تھا کہ وہ میڈم اصل میں کون ہے اور اس کی طبیعت کیوں خراب ہوئی ہے۔ اس نے شیشے میں میرزاد کو خود کو گھورتے دیکھ لیا تھا۔ جو بھاگا بھاگا اوپر کی طرف گیا تھا۔ یقیناً اس نے جا کر صندل کو بتایا ہو گا کہ نیچے رحبانی آیا ہے اور صندل کی طبیعت خراب ہو گئی ہو گی۔

رحبانی مسکرایا تھا۔

جس بربادی سے چاند نے خود کو بچا لیا تھا وہ پھر سے رحبانی کے ہاتھ لگ چکی تھی۔

☆......☆......☆

اس بار کا موسم ایک انگڑائی میں ہی بدل گیا تھا۔ سردیاں پوری طرح سے آ چکی تھیں۔ لیکن حویلی والوں کے لیے یہ سردیاں کچھ گرم تھیں۔ یا شاید یہ اندر کی بے قراری تھی جو جسموں کو تپش فراہم کر رہی تھی۔ روحیں بے چین تھیں اور سانسیں اتنی تنگ جیسے برسات کے موسم کا حبس چل رہا ہو۔

سارا نے نہیں ملنا تھا اور وہ نہیں ملی تھی۔ پولیس کو اطلاع دینا بھی بے کار گیا تھا۔ سارا کی کسی طرف سے کوئی خبر موصول نہیں ہوئی تھی۔ پولیس نے سارے قحبہ خانے اور سارے ایسے اڈے بھی کھنگال ڈالے تھے جہاں اغوا کی جانے والی لڑکیوں کو بیچا جاتا تھا۔ لیکن سارا کا کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ سارا کی تلاش میں بستامی صبح کا جاتا رات گئے واپس آیا کرتا تھا۔ لیکن ہر بار ناکام لوٹا کرتا تھا۔ بستامی کی انہی کوششوں کی وجہ سے گھر والوں کو جو اس سے شکوے تھے وہ ختم ہو گئے تھے۔ کومل نے ساری حویلی کو سنبھال لیا تھا۔ سارے ملازم، کام کاج، کھانا پینا سب وہ دیکھ رہی تھی۔ چاند کو خوشی ہوئی تھی کہ جو باتیں کومل نے غیر دلچسپی سے سنی تھیں کم از کم ان میں سے آدھی تو سمجھ ہی گئی تھی۔

شکیلہ پھوپھو کی طبیعت دن بدن بگڑتی جا رہی تھی۔ وہ ہر وقت سارا سارا کرتی رہتی تھیں۔ نیند میں وہ جاگ رہی ہوتی تھیں اور جاگنے میں وہ بے ہوش ہوتی تھیں۔ انہیں دیکھ دیکھ کر حویلی والوں کی خود کی

طبیعت خراب ہو رہی تھی۔

نجانے کیا ہوا تھا۔ کہاں بدشگونی ہوئی تھی۔ کس کی نظر لگی تھی۔ کیسی انہونی ہو چکی تھی کہ عرصے سے حویلی کے سارے کام بگڑتے ہی جا رہے تھے۔ کوئی خوشی حویلی کو راس نہیں آ رہی تھی۔ الٹا وہ خوشی صدمہ بن کر مزید دکھ دیا کرتی تھی۔

رحبانی بھی کافی دن ہوئے سارا کو ڈھونڈنے نکلا ہوا تھا۔ لیکن ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ چاند کو امید تھی کہ رحبانی سارا کے بارے میں ضرور کوئی خیر کی خبر لائے گا۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہونے والا تھا۔

رحبانی دو ہفتوں کے بعد حویلی واپس ہوا تھا۔

''سارا کا کچھ پتا چلا؟'' چاند نے اسے دیکھتے ہی پوچھا تھا اور اچانک سے جیسے رحبانی کو یاد آیا تھا کہ وہ تو حویلی سے سارا کو تلاش کرنے کا کہہ کر نکلا ہوا تھا۔

''نہیں......'' اس نے کہا تھا۔ اور وہ بھلا کیا کہتا۔

''لاہور، کراچی...... کیا کہیں بھی اس کی کوئی خبر نہیں ملی؟''

''نہیں...... لیکن میں وہاں کے لوگوں کو سارا کے حلیے کے بارے میں بتا آیا ہوں۔ انہوں نے کہا ہے کہ اس حلیہ کی کوئی لڑکی آئے گی تو وہ مجھے بتا دیں گے۔''

''امید کی جا سکتی ہے کہ سارا کا کچھ پتا چل جائے گا؟''

''پتا نہیں...... لیکن مجھے کسی اور کا پتا چل گیا ہے۔'' رحبانی نے چاند کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا تھا۔

''کس کا؟'' چاند نے پوچھا تھا۔ رحبانی چاند کو ایسے دیکھنے لگا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ چاند خود میں سمٹی تھی۔

''تمہیں یاد ہے چاند ایک بار تم نے رنگولی بنائی تھی۔ التمش نے جب باہر کے ملک سے آنا تھا

تب......" رحبانی نے کہا تھا۔

چاند کو اس کی بات پر تعجب ہوا تھا۔ رحبانی نے ایک دم سے ہی کچھ عجیب اور بے موقع سی بات کر دی تھی۔

"ہاں...... یاد ہے۔ پچیس سال پرانی بات ہے۔ میں نے صحن میں بنائی تھی وہ رنگولی...... حاجی بوا نے میری مدد کی تھی۔ تم نے رنگ لا کر دینے سے انکار کر دیا تھا تو میں نے ملازم سے کہہ کر منگوائے تھے۔"

"اور میں نے اس رنگولی کو خراب کر دیا تھا۔ التمش کے آنے سے کچھ دیر پہلے......"

چاند سے کچھ بولا نہیں گیا تھا۔ یہ رحبانی آج کیا باتیں کر رہا تھا۔ اتنی پرانی اور اس قدر بے موقع......

"یاد تو ہوگا تمہیں چاند...... ایسی باتیں کیسے بھول سکتی ہو تم۔"

"یاد ہے۔ لیکن میں نے بدلے میں تمہیں کچھ نہیں کہا تھا رحبانی......"

"بدلہ تو تم نے لے لیا چاند...... پورے دل و جان سے لیا۔ میں نے تو صرف تمہاری رنگولی خراب کی تھی اور تم نے میری زندگی خراب کر دی۔" رحبانی کے چہرے پر سختی آئی تھی۔

چاند نے تھوک نگلا تھا۔

"یہ کیا باتیں کرنے لگے ہو رحبانی...... چھوڑو پرانی باتوں کو۔"

"میں نے جس قدر تجھ سے محبت کی ہے اس سے کہیں زیادہ تجھ سے نفرت کرنے لگا ہوں چاند...... جیسے میرا دل سالوں سے جلتا رہا ہے۔ سوچا تھا کبھی تیرا بھی جلاؤں گا۔ اور اب شاید اس کا وقت آ گیا ہے۔"

چاند نے حیرت سے رحبانی کو دیکھا تھا۔ وہ پوری طرح سے آشکار ہوا تھا۔ جیسے سانپ نے کینچلی بدل کر پہلے سے مزید بدنما اور سیاہ کینچلی پیدا کر لی ہو۔

"صندل میر زاد کے ساتھ بارات والے دن گھر سے بھاگ گئی ہے اور سارا بھی اب کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ بستامی کو دونوں کے بارے میں پتا چلے گا تو وہ غصے میں نجانے کیا کیا کرے۔ شاید

دونوں کو جان سے ہی مار دے۔"

"بستامی کو صندل کے بارے میں بتائے گا کون......؟"

"میں......" رحبانی نے کہا تھا۔ "مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ صندل کہاں ہے۔ وہ ٹھنڈیانی میں ہے۔" رحبانی نے بم پھوڑا تھا۔ چاند کی جان نکل کر رہ گئی تھی۔ "دیکھو ذرا...... میں سارا کو ڈھونڈنے نکلا تھا اور صندل کا پتا چل گیا۔" رحبانی ترنگ میں بولا تھا۔

"تم بستامی کو کچھ نہیں بتاؤ گے رحبان...... میں خود بستامی سے بات کرنے والی ہوں۔ میں نے اس سے نیگ کے بہانے وعدہ لے لیا ہے۔"

"تمہیں کیا لگتا ہے کہ میں تمہاری بات مانوں گا چاند...... میں تو بستامی کو ضرور بتاؤں گا۔ پھر وہ صندل کا جو حال کرے گا نا تمہاری آنکھوں کے سامنے...... بس وہی دیکھنے کو میرا دل بے قرار ہے۔"

"تم ایسا نہیں کرو گے رحبانی...... میں تمہاری منت کرتی ہوں۔" چاند کی آواز روہانسی ہو گئی تھی۔

"منت کا کوئی فائدہ نہیں ہونے والا چاند...... میں ایسا ضرور کروں گا۔" رحبانی کہہ کر وہاں سے اپنے کمرے کی طرف جانے کے لیے آگے بڑھا تھا۔

"میں تمہیں ماضی کی ہر غلطی معاف کر دوں گی رحبان......" چاند نے بلند آواز میں کہا تھا۔ رحبانی جاتے جاتے پلٹا تھا۔ "تم اپنی زبان بند رکھو گے تو میں تمہیں ماضی کی ہر غلطی معاف کر دوں گی۔" چاند نے دہرایا تھا۔

رحبانی نے کچھ سوالیہ انداز میں چاند کو دیکھا تھا۔

"میرے خط جو تم نے التمش تک نہیں پہنچائے میں وہ بھی معاف کر دوں گی۔ میری رنگولی جو تم نے خراب کی میں وہ بھی معاف کر دوں گی۔ اور......" نجانے کیا ہوا تھا۔ چاند کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

"اور کیا......؟"

"میں تجھے التمش کا قتل بھی معاف کر دوں گی۔" چاند نے کہا تھا اور رحبان ایک قدم ایسے پیچھے ہوا تھا جیسے اس نے ملک الموت کو اپنے سامنے دیکھ لیا ہو۔

☆......☆......☆

۱۹۴۹ء

چاند اور رحبان کی شادی کے دن قریب آتے جا رہے تھے۔ حویلی میں ایک بار پھر سے شادی کی تیاریاں ہونے لگی تھیں۔ پھوپھیاں پھر سے چاند کو ابٹن ملنے لگی تھیں۔ چاند چپ چاپ یہ سب کام کروا رہی تھی۔ وہ نہ تو اداس تھی اور نہ ہی خوش......بس خاموشی سے اور ساکت چہرے کے ساتھ وہ یہ سب کام کرواتی جا رہی تھی۔ وہ اب رحبان کے نکاح میں جانے والی تھی۔ بہت بہتر تھا کہ وہ التمش کو بھولنے کی کوشش کرتی......ورنہ یہ بے چارے رحبان کے ساتھ زیادتی تھی۔

چاند ان دنوں بابا کے کمرے میں رہ رہی تھی۔ بابا کا حکم تھا کہ شادی تک اب رحبان اور چاند دونوں ایک دوسرے کو نہ دیکھیں۔ جب کہ رحبان اس کے باوجود اپنے کمرے سے چاند کو دیکھنے کے لیے تانک جھانک کرتا رہتا تھا۔ لیکن چاند اتنی لمبی شال میں لپٹی ہوئی کمرے سے باہر آتی تھی کہ اسے کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ پھر چاند کے ساتھ لازمی کوئی نہ کوئی ہوتا تھا۔ حاجی بوا یا پھوپھو میں سے کوئی......جو رحبان کو اوپر کھڑے دیکھ لیتیں تو وہاں سے ہی کہتیں۔

"رحبان! تم باز نہیں آؤ گے۔ لگتا ہے کہ دین بھائی کو بتانا پڑے گا۔"

اور رحبان ہنستے ہوئے پیچھے ہو جایا کرتا تھا۔

"کتنے دن......اب جلد ہی یہ چاند میرا ہونے والا ہے۔ اس چاند کی چاندنی صرف میری ہوگی۔" یہ سوچ کر وہ خود کو تسلی دے لیا کرتا تھا۔ ان دنوں وہ یہ بات بھولا ہوا تھا کہ وہ چاند کی محبت کا قاتل ہے۔

التمش کا قتل کر کے اس نے کتنا عظیم گناہ کر لیا ہے۔ اس کے ذہن پر بس شادی سوار تھی۔ چاند کی قربت......

بارات والے دن تک بابا نے جہاں چاند کے سارے ارمان پورے کیے تھے وہاں رحبان کے لیے بھی ساری رسمیں نبھائی تھیں۔ اس کی شیروانی بابا نے خود اپنی پسند سے سلوائی تھی۔ جسے پہن کر وہ خوب پیارا لگ رہا تھا۔ بابا تو اس کی نظریں اتارتے نہ تھک رہے تھے۔

''سوچا تھا کہ تمہاری اور بستامی کی شادی ایک ساتھ کروں گا۔ لیکن جو خدا کو منظور......'' اور کہتے ہوئے بابا نے بہت سے نوٹ رحبان کے سر سے وار کر ملازم کو دے دیئے تھے کہ غریبوں میں بانٹ دو۔

نیچے بابا کے کمرے میں چاند بھی تیار ہو چکی تھی۔ اس کے ہاتھوں پر مہندی کا رنگ خوب سرخ رنگ لایا تھا۔ جو اس کے سرخ لباس سے بھی مل رہا تھا۔ یہ لباس اس نے التمش کی دلہن بننے کے لیے زیب تن کرنا تھا اور اب اسے پہنے وہ چند لمحوں بعد رحبان کے نام کی قبولیت بھرنے والی تھی۔ آئینے میں اپنے عکس کو اداسی سے دیکھتے ہوئے وہ لایعنی سوچوں میں غرق تھی۔

بابا کمرے میں آئے تھے۔ انہوں نے چاند کو دیکھا تھا اور اسے دیکھتے ہوئے بابا کو لگا تھا کہ جیسے ان کی بیٹی میں جنت کی کوئی حور سرائیت کر گئی ہو۔

''رحبان خوش قسمت ہے کہ اسے تم مل رہی ہو۔'' بابا نے اسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا تھا۔

''لیکن رحبان کا بھی ایک احسان ساری زندگی رہے گا مجھ پر کہ اس کے فیصلے کی بدولت تم میری آنکھوں کے سامنے رہو گی۔ میرے مرنے تک......''

چاند پھیکا سا مسکرائی تھی۔

''نکاح کے لیے مولوی صاحب آ چکے ہیں بابا......'' بستام نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا تھا۔

''انہیں باہر بٹھاؤ...... میں آتا ہوں۔''

''جی اچھا......'' بستام کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔ بابا نے چاند کو خود سے الگ کرتے ہوئے جی

بھر کر دیکھا تھا۔

''اس سفید دوپٹے کو اب اتار دو چاند...... سرخ دوپٹا اوڑھ لو میری جان......'' بابا نے کہتے ہوئے آہستگی سے اس کے سر پہ رکھا سفید دوپٹا ڈھلکا دیا تھا۔

''التمش کی بیوگی کو آج ختم کر دو...... اور ہو سکے تو اسے بھول ہی جاؤ...... سرے سے بھول ہی جاؤ اسے تم......'' آنسو بھری آواز کے ساتھ کہتے ہوئے بابا جلدی سے کمرے سے باہر چلے گئے تھے۔

چاند رخ بدل کر خود کو آئینے میں دیکھنے لگی تھی۔ قسمت کے کھیل...... اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ دلہن بن کر مسکرانا بھول چکی ہوگی۔ اداسی کو دور کرنے کے لیے اسے کوشش کرنی ہوگی۔ غم بھلانے کے لیے جتن کرنے ہوں گے۔ ڈھلکے ہوئے سفید دوپٹے کو اس نے اپنے جسم سے الگ کیا تھا۔ تخت پر اس کے لباس والا سرخ کام دار دوپٹا پھیلا ہوا تھا۔ مردہ ہمتوں کو اکٹھا کرتے ہوئے اس نے سرخ دوپٹے کو تھاما تھا۔ جو اسے منوں وزنی لگا تھا۔

اپنی قسمت پر ایک آخری بار تاسف کر کے چاند نے خود کو آئینے میں دیکھتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی تھی اور وہ سرخ دوپٹے کو سر پر رکھنے ہی لگی تھی جب آئینے کے عکس میں اس کے عکس کے ساتھ ساتھ ایک اور عکس بھی ظاہر ہوا تھا۔ چاند نے فوراً پیچھے پلٹ کر دیکھا تھا۔

حاجی بوا گم صم صورت لیے چاند کو دیکھتی جا رہی تھیں اور بس دیکھتی جا رہی تھیں۔

''کیا ہوا ہے حاجی بوا...... آپ کچھ پریشان دکھ رہی ہیں۔'' چاند فوراً سے ان کے پاس آئی تھی۔

''یہ شادی مت کرو چاند......'' انہوں نے اپنے ہاتھ مسلتے ہوئے کہا تھا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ......؟'' چاند ان کی بات پر حیران ہوئی تھی۔

''تمہیں میری بات سمجھ میں تو نہیں آئے گی۔ لیکن یہ شادی مت کرو۔ ورنہ ساری زندگی پچھتاؤ گی۔''

''کس وجہ سے...... کیا رحبان میں کوئی خرابی ہے؟'' چاند نے پوچھا تھا۔ حاجی بوا نے اثبات

میں سر ہلایا تھا۔

"کیا......؟"

"نہیں بتا سکتی ہوں۔ مجھ سے نہیں بتایا جائے گا۔"

"پھر مجھے انکار کرنے کو کیوں کہہ رہی ہیں۔ نکاح کے لیے مولوی صاحب آچکے ہیں۔ بنا کوئی بات جانے میں انکار نہیں کر سکتی ہوں۔"

حاجی بوا چپ رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر بے چینی ہی بے چینی تھی۔ کیا جانتی تھیں وہ...... کیا نہیں بتایا جا رہا تھا ان سے......

"کچھ بولیے حاجی بوا...... خدا کے لیے کچھ تو بتائیں کہ کیا بات ہے۔ کچھ جانے بنا انکار میں کر نہیں سکتی ہوں اور اب ہاں کہنا بھی میرے لیے مشکل ہو رہا ہے۔"

"رحبان نے التمش کا قتل کیا ہے۔" حاجی بوا نے فوراً سے بتا دیا تھا۔ جیسے انہیں خود پر بھروسا نہ ہو کہ اگر انہوں نے بتانے میں دیر کر دی تو پھر ان سے کچھ بتایا ہی نہیں جائے گا۔ یک لخت چاند کے قدموں کے نیچے جیسے گہرا کنواں کھد گیا تھا۔ وہ کہیں نیچے ہی نیچے پاتال میں گرنے لگی تھی۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

"بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔ رحبان نے قتل کیا ہے اسے...... میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے۔ درگا مورتی کے ہتھیار ترشول سے ہوا ہے التمش کا قتل......" حاجی بوا نے بتایا تھا۔

چاند دھپ سے تخت پر بیٹھی تھی۔ جیسے جسم سے جان نکل گئی ہو۔ اس کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔

"اس سے نکاح مت کرو...... قتل کا راز کبھی راز نہیں رہتا ہے۔ تمہیں ساری زندگی اپنے اس اقدام پر پچھتاوا ہوگا چاند...... میں نے بس اسی وجہ سے تمہیں یہ بات بتائی ہے۔ اگر معاف کرنے کا حوصلہ ہے تو بے شک معاف کر دو۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ تم سے یہ کام بھی نہیں ہو سکے گا۔" حاجی بوا نے

کہا تھا اور پھر وہاں سے باہر چلی گئی تھیں۔

چاند کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر چکی تھیں۔ دکھ کی کوئی شکل ہوتی تو شاید چاند جیسی ہی ہوتی......

رحبان کو تو وہ اپنا دوست کہتی تھی۔ اپنا سب سے بہترین دوست مانتی تھی۔ اور اس کے دوست نے اس کے محبوب کا قتل کر دیا تھا۔ اسے لگا تھا کہ یہ قتل جیسے آج ہی ہوا ہو۔ ابھی ابھی ہی رحبان التمش کو قتل کر کے واپس لوٹا ہو اور اب اس کے لیے دلہا بن کر کھڑا ہو گیا ہو۔

''آ جائیے مولوی صاحب......اندر آ جائیے۔'' بستام مولوی صاحب کو لیے اندر آیا تھا۔ دین بابا اور ایک دو اور بزرگ بھی ساتھ تھے۔ بابا نے اندر داخل ہو کر چاند کو دیکھا تھا اور کچھ حیران ہوئے تھے۔ بستام جلدی سے چاند کے قریب ہوا تھا۔

''کیا کرتی ہو چاند......میں نے کہا تو تھا کہ مولوی صاحب آ رہے ہیں۔'' بستام نے جلدی سے آگے ہو کر چاند کے سر پر دوپٹا رکھا تھا۔ مولوی صاحب اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئے تھے۔ باقی سب کھڑے رہے تھے۔

''بنتِ دین! کیا تمھیں رحبان احمد سے نکاح قبول ہے؟''

مولوی صاحب نے اس سے پوچھا تھا۔ چاند خاموش رہی تھی۔ اس نے مولوی صاحب کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ وہ تو اس وقت التمش کو سوچ رہی تھی۔ جب التمش لندن سے پہلی بار آیا تھا اور اسے سیب کے باغ میں انگوٹھی پہنانا چاہ رہا تھا۔

''یہ میں تمھارے لیے لایا ہوں۔ اور اسے میں خود تمھیں پہنانا چاہتا ہوں۔''

التمش نے محبت سے چاند کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ چاند شرما کر خاموش ہو گئی تھی۔ التمش خود ہی اس کے قریب ہوتا چلا گیا تھا۔ آہستگی سے چاند کا ہاتھ تھام کر اس نے گرفت مضبوط کر لی تھی۔ مبادا چاند کہیں شرما کے ہاتھ چھڑوا لے......لیکن چاند کیسے اپنا ہاتھ چھڑواتی۔ وہ تو بت بنی یک ٹک التمش کو دیکھے جا رہی

تھی۔ چار سالوں میں وہ کتنا بدل گیا تھا۔ اس کی بھنوئیں کس قدر سیاہ ہو چکی تھیں۔ اس کی آنکھیں کس قدر روشن تھیں۔ اس کی ناک، ہونٹ سے اس کی گردن تک آتے ہوئے نظریں اس کے سینے پر آ کر رکی تھیں، جہاں سفید شرٹ میں سے اس کے سیاہ بال جھلک رہے تھے۔

اور وہ خوب صورت جوان بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔

''رحبان...... جب تو نے التمش کو قتل کرنے کا ارادہ کر ہی لیا تھا تو کیا تجھے پورے شہر میں کہیں سے زہر نہ مل سکا جو تو التمش کو دے دیتا...... تاکہ وہ سکون سے مر تو سکتا۔ ترشول کے نجانے کتنے وار کرنے کے بعد التمش کی جان نکلی ہو گی۔''

بابا نے مسکرا کر خاموش بیٹھی چاند کی طرف دیکھا تھا۔

''میری بیٹی شرما رہی ہے مولوی صاحب...... اس نکاح میں اس کی پوری رضامندی شامل ہے۔''

''منہ سے یا سر کے اشارے سے اقرار کرنا ضروری ہے۔'' مولوی صاحب نے دین بابا سے کہا تھا اور پھر سے چاند کو مخاطب کیا تھا۔

''کیا تمہیں رحبان احمد سے نکاح قبول ہے بیٹی......؟''

چاند تب بھی خاموش رہی تھی۔ اب وہ اس وقت کو یاد کر رہی تھی جب التمش بارات سے پہلے زیورات کا بہانہ بنا کر حویلی تک آ گیا تھا اور زہرہ پھوپھو اس کی اس حرکت کو سمجھ گئی تھیں۔

''اب بارات کے ساتھ ہی آؤ گے یا بارات سے پہلے بھی کوئی بہانہ بنا کر آ جاؤ گے۔ جیسے آج آ گئے ہو۔'' زہرہ پھوپھو نے تبصرہ کیا تھا۔ التمش مسکرایا تھا۔ اس کی چوری پکڑی گئی تھی۔

''نہ تنگ کرو بچے کو...... بابا نے مسکراتے ہوئے ٹوکا تھا۔

جیپ کو اسٹارٹ کر کے چلانے سے پہلے التمش نے نظریں جھکائے کھڑی چاند کو دیکھا تھا اور تب ہی چاند نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ دونوں کی نظریں ملی تھیں اور دونوں ہی مسکراہٹ کو قابو میں نہیں رکھ سکے تھے۔

چاند کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ جہاں سے اب قطرہ قطرہ آنسو ٹپکنے لگے تھے۔ خوب صورت نوجوان منوں مٹی تلے دفن ہو گیا تھا۔ کبھی نہ واپس آنے کے لیے...... اور وہ اس کے قاتل سے شادی کرنے جا رہی تھی۔

بستام نے دین بابا کو دیکھا تھا۔ دین بابا نے تھوک نگلا تھا۔ چاند کی خاموشی انہیں بے چین کر رہی تھی۔

''کیا ہوا ہے چاند بیٹی......'' دین بابا نے چاند سے پوچھا تھا۔

چاند نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا تھا۔ دین بابا دہل کر رہ گئے تھے۔ چاند کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور دکھ کے پانی سے بھری ہوئی تھیں۔

''رو کیوں رہی ہو۔ تم کون سا رخصت ہو کر کہیں دور جا رہی ہو۔ کہو کہ تمہیں نکاح قبول ہے۔''

''نہیں قبول ہے۔'' اس نے نہ میں سر ہلاتے ہوئے کہا تھا اور جھٹکے سے سرخ دوپٹے کو سر سے اتار دیا تھا۔ بابا حیرت سے جیسے سکتے میں چلے گئے تھے۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم بیٹی......''

''جو آپ نے سنا بابا...... مجھے یہ نکاح نہیں قبول ہے۔ میں رحبان کے ساتھ شادی نہیں کر سکتی ہوں۔ ہر گز نہیں کر سکتی ہوں۔'' چاند اٹھی تھی اور کمرے سے باہر کو بھاگی تھی۔

''چاند رکو...... بات سنو......'' بستام چلایا تھا۔ لیکن اس نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں تھا۔ بنا دوپٹے کے وہ کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

باہر عورتوں کا ہجوم اکٹھا تھا جو چھوہارے کی ٹوکریاں ہاتھوں میں پکڑے چھوہارے بانٹنے کو بس تیار کھڑی تھیں۔ چاند نے چھوہارے کی ٹوکری کو ہاتھ مار کر الٹا دیا تھا۔

''کیا ہوا چاند......'' تہمینہ پھوپھو جیسے بھاگ کر اس کے قریب آئی تھیں۔

''رحبان کو بتا دیں۔ مجھے یہ نکاح قبول نہیں ہے۔'' کہہ کر وہ دیوارنہ وار باہر کو بھاگی تھی۔ بنی ٹھنی

عورتیں ہکا بکا اسے جاتا ہوا دیکھ رہی تھیں۔

''نہیں قبول ہے۔ ہرگز نہیں قبول ہے۔'' اور اسی بات کی گردان کرتی ہوئی وہ حویلی کا دروازہ پار کر گئی تھی۔

☆......☆......☆

وہ تین پودے تین ہیبت ناک جنوں کی طرح کچی سڑک کے کنارے موجود تھے۔

اخروٹ، بادام اور چلغوزے کے پودے......

ان پودوں کی آب بیاری خون سے کی گئی تھی۔ التمش کے خون سے۔ ان کے بیجوں میں التمش کی روح تھی۔ ان کے تنوں میں التمش کی سانسیں تھیں۔ ان کے پتوں پر قتل لکھا ہوا تھا۔ التمش کا قتل...... ایک معصوم کا قتل...... جس کی ذات سے کسی کو گزند نہیں پہنچایا گیا تھا۔ یہ پودے کبھی نہیں مرجھانے والے تھے۔ کبھی نہیں مرنے والے تھے۔ یہ اس قتل کی گواہی کی یاد میں ہمیشہ کھڑے رہنے والے تھے۔

چاند بھاگتی ہوئی وہاں تک آئی تھی۔ تین پودوں تک...... جہاں التمش کا قتل ہوا تھا۔ اس نے دوپٹا نہیں لیا ہوا تھا۔ اسے جوتی پہننے کا ہوش بھی نہیں رہا تھا۔ اس کے پاؤں چھل چکے تھے۔ اور ان سے خون رس رہا تھا۔ لیکن اسے اس کی پروا نہیں تھی۔ اسے تو درد کا احساس بھی نہیں ہو رہا تھا۔ اسے وہ تکلیف محسوس ہو رہی تھی جو اس کے محبوب نے مرتے وقت سہی تھی۔

وہ گھٹنوں کے بل ان پودوں کے آگے بیٹھ گئی تھی اور ایسے رونے لگی تھی جیسے اس کے سامنے التمش کی لاش پڑی ہو۔

''مجھے میرے اللہ نے بچا لیا التمش...... مجھے میرے اللہ نے بچا لیا۔ میں تمہارے قاتل سے شادی کرنے جا رہی تھی۔ مجھے میرے اللہ نے بروقت بچا لیا۔'' روتے ہوئے اس نے پودوں کے آگے دہائی دی تھی۔ ''میں ساری زندگی خود کو معاف نہ کر سکتی تھی۔ شکر کہ حاجی بوا نے سب پہلے ہی بتا دیا۔ اب مجھے کسی

کی پرواہ نہیں ہے۔ کوئی جو مرضی کہے، میں اپنے فیصلے سے پیچھے نہیں ہٹوں گی۔" وہ روتے ہوئے پودوں سے ایسے کہہ رہی تھی جیسے جیتے جاگتے التمش سے کہہ رہی ہو۔"ان پودوں میں تمہارا خون شامل ہے التمش...... یہ اخروٹ، بادام اور چلغوزے کے پودے تمہارے خون سے پروان چڑھے ہیں۔ ترشول کی تین نوکوں نے ان تین پودوں کو جنم دے دیا ہے۔ یہ گواہ ہیں تمہارے قتل کی...... یہ نوکیں میرے دل میں ہمیشہ قائم رہیں گی۔ میں خدا سے دعا کروں گی کہ اسی مقام پر تمہارے قتل کا بدلہ پورا ہو۔ انہی پودوں کے درمیان......" چاند نے روتے ہوئے التمش سے کہا تھا اور پھر اپنی قمیص کا دامن اٹھا کر خدا کو التجا بھیجی تھی۔

یہ دعا خدا نے بھی سن لی تھی اور تین پودوں نے بھی...... جو اس دعا کو ہرگز ہرگز نہیں بھولنے والے تھے۔

☆......☆......☆

سردیوں کا سورج جلد ہی غروب ہو چکا تھا۔ آج یہ سورج غروب نہیں ہوا تھا بلکہ ڈوب گیا تھا۔ شاید کبھی نہ ابھرنے کے لیے...... آسمان ایسے سرخ ہو رہا تھا جیسے آندھی آنے سے پہلے ہوا کرتا ہے۔ اور جس کی بابت اکثر مشہور ہے کہ آسمان اتنا سرخ ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ کہیں کسی معصوم کا قتل ہوا ہے۔

اسے واپس حویلی آتے ہوئے بہت دیر ہو گئی تھی۔ وہ بہت دیر تک پودوں کے آگے گھٹنوں کے بل بیٹھی روتی رہی تھی۔ جب رونا ختم ہو گیا تھا تو وہ بے آواز آنسو بہاتی رہی تھی۔ دل کے آنسو ختم ہونے میں تو بہت وقت لگ گیا تھا۔ اس کے عروسی لباس کی حالت ایسی ہو چکی تھی جیسے اس نے پچھلے ایک سال سے اسے مسلسل پہنا ہو۔ اس کے پاؤں مزید زخمی ہو چکے تھے۔ بال کھل کر بکھر چکے تھے جیسے وہ اپنے سر پر راکھ ڈال کر آ رہی ہو۔ اور مسلسل رونے کے باعث سارا کاجل چہرے پر پھیل کر اسے بدنما کر رہا تھا۔

چاند کو کوئی خوف نہیں تھا کہ کوئی اسے کیا کہے گا۔ اور کیا کیا پوچھے گا۔ وہ کسی کے سوال کا جواب دینے کی پابند نہیں تھی۔ وہ طے کر چکی تھی کہ وہ کسی کو کچھ نہیں بتائے گی۔ یہ راز ہمیشہ راز رہے گا۔ التمش کا قتل کا بدلہ پورا ہو جانے تک...... شاید بابا یا گھر والے اسے پھر سے رحبان سے شادی کرنے کے لیے زور دیں

لیکن اس کا انکار اٹل ہوگا۔ وہ خود کی جان تو لے سکتی ہے لیکن التمش کی جان لینے والے کو اپنی زندگی میں شامل نہیں کر سکتی ہے۔ کسی کی منت سماجت کے باوجود بھی وہ اب رحبان سے شادی نہیں کرے گی۔

کچھ نڈر انداز اپناتے ہوئے وہ آگے بڑھنے لگی تھی۔ لیکن حویلی کا آگے کا جو منظر تھا وہ چاند کی سوچ سے بڑھ کر تھا۔ تخت پر دین بابا کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اور سارے اس لاش کے ارد گرد کھڑے رو رہے تھے۔

''یہ کیا ہوا ہے؟'' چاند غش کھا کر گرنے ہی تو لگی تھی۔

''بھائی صاحب مر چکے ہیں۔'' تہمینہ پھوپھو نے اسے بتایا تھا اور اس سے پہلے کہ چاند اپنے بابا کی لاش کے پاس جاتی اور رونے لگتی، بستام اس پر چلایا تھا۔

''یہ کیا کیا تم نے چاند...... یہ کیا کیا تم نے...... تم نے بابا کو مار دیا۔'' بستام نے چلاتے ہوئے کہا تھا۔ دین بابا کی میت کے پاس جاتے اس کے قدم رک گئے تھے۔ حیران و پریشان کھڑی وہ بستام کی بات سن رہی تھی اور تخت پر پڑی دین بابا کی میت کو یک ٹک دیکھنے لگی تھی۔

''میں نے...... میں نے کیا کیا ہے؟'' ہونق بنی وہ ناسمجھی سے پوچھنے لگی تھی۔

''پوچھتی ہو کیا کیا ہے۔ تم قاتلہ ہو بابا کی...... تمہاری وجہ سے بابا کی موت ہوئی ہے۔ تم نے مارا ہے بابا کو...... تم نے......'' روتے ہوئے بستام چلاتا جا رہا تھا۔ اور چاند کے تو سارے آنسو ہی جیسے خشک ہو چکے تھے۔

بڑے تخت پر دین بابا کا مردہ وجود پڑا ہوا تھا۔ رحبان تخت پر گرا ہوا زار زار رو رہا تھا۔ اتنا وہ اپنے سگے ماں باپ کے مرنے پر نہیں رویا تھا جس قدر آج رو رہا تھا۔ تینوں پھوپھیاں بھی واویلا کر رہی تھیں اور نفرت سے چاند کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کے خیالات بھی بستام سے ملتے جلتے تھے کہ چاند کی وجہ سے بابا کی موت ہوئی ہے۔ چاند بابا کی قاتلہ ہے۔

گھر کے سب ملازم بھی بابا کے کمرے میں موجود تھے اور سب ہی بابا کی موت پر رو رہے تھے۔ سوائے چاند کے...... اسے رونا کیوں نہیں آ رہا تھا۔ بستام کی بات پر اسے اتنی حیرت ہوئی تھی کہ وہ بس گم صم انداز میں بابا کی میت کو دیکھتی جا رہی تھی۔

''کیا آپ کو میں نے مارا ہے بابا......'' وہ بابا کی میت کے قریب آ کر ان سے پوچھنے لگی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میت جواب نہیں دیا کرتی۔

''تمہاری ضد نے بابا کی جان لے لی ہے چاند...... اب اس میت کو دیکھنے کا بھی تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔'' تہمینہ پھوپھو نے آگے بڑھ کر چادر سے دین بابا کا چہرہ ڈھک دیا تھا۔

☆......☆......☆

۱۹۷۵ء

رحبانی نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا تھا۔ جس نے اس کا سینہ اندر تک جلا دیا تھا۔ اس پر بھی اسے سکون نہیں ملا تھا۔ اس نے مزید گہرا کش لیا تھا۔ جو آگ اس کے اندر لگی ہوئی تھی وہ سگریٹ کے کش کے آگے کچھ بھی نہیں تھی۔ سگریٹ تو ختم ہونے پر بجھ سکتی تھی لیکن سینے کی آگ کو کون بجھانے والا تھا۔

''تو یہ حاجی بوا تھی جس نے چاند کو سب بتا دیا تھا۔ اور جس وجہ سے چاند میری نہ ہو سکی۔ یہ خبیث بڑھیا...... اس سے میری خوشی دیکھی ہی نہ گئی۔ کیا تھا جو وہ اس راز کو پی جاتی...... میں چاند کو حاصل کر لیتا، اس وقت چاند میری بیوی ہوتی، ہمارے بچے ہوتے...... اور التمش...... اس کو تو چاند بھول ہی چکی ہوتی۔''

رحبانی بے چینی سے اپنے کمرے میں چکر کاٹ رہا تھا۔ اس کی حالت ایسی تھی جیسے کسی نے اس کی شہ رگ تو کاٹ دی ہو، لیکن ابھی اس کی موت کا وقت نہ آیا ہو یا فرشتے اس کی جان نہ قبض کر تے ہوں۔ اپنی بد قسمتی کا سارا غصہ اسے حاجی بوا پر آ رہا تھا۔ اس بڑھیا نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ اتنا تو ترشول سے التمش کو درد نہیں ہوا ہوگا جتنا اب رحبانی کو ہو رہا تھا۔ اپنی برباد ہو چکی جوانی، ادھوری حسرتیں،

نامکمل آرزوئیں، سب کا ملال اسے آج ہو رہا تھا اور رہ رہ کر حاجی بوا پر غصہ آ رہا تھا۔ چونکہ اسے اس سب کی ابھی تک کوئی وجہ نہیں ملی تھی اور آج مل گئی تھی تو اس کا غصہ شدید سے شدید ہوتا جا رہا تھا۔ جبکہ غصہ اسے خود پر بھی آنا چاہیے تھا۔ کہانی کی شروعات اس نے کی تھی۔ التمش کا قتل اس نے کیا تھا۔ حاجی بوا نے تو بس یہ بات چاند کو بتائی تھی۔ چاند کو حاصل کرنے کا اس کا طریقہ کار ہی غلط تھا تو پھر حاجی بوا کیسے قصوروار ہوئی۔ لیکن ماضی کا دکھ اتنا گہرا تھا کہ وہ اپنے گناہ بھول کر سارا ملبہ حاجی بوا پر ڈال رہا تھا۔

رحبانی نے پھر سے ایک کش لینا چاہا تھا لیکن دھواں اس کے اندر نہ جا سکا تھا۔ سگریٹ ختم ہو چکی تھی۔ رحبانی نے سگریٹ کو دیکھا تھا اور پھر پرے پھینک دیا تھا۔ نجانے وہ لمحہ کیسا تھا۔ رحبانی کے دل میں کیا سمائی تھی۔ وہ اپنے الماری کے پاس گیا تھا۔ اپنی دراز کھول کر وہاں سے اس نے ایک تیز دھار چاقو باہر نکالا تھا۔

"مجھے معلوم ہوتا تو اس بڑھیا کو پہلے ہی اس دنیا سے بھیج چکا ہوتا۔ التمش کے ساتھ ساتھ اس کا بھی قتل کر دیا ہوتا میں نے......"

کمرے سے باہر جاتے ہوئے غصے کے باعث رحبانی کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

☆......☆......☆

حاجی بوا اپنے کمرے میں موجود تھیں اور پلنگ پر بیٹھے ہوئے اپنے کپڑے تہہ کر رہی تھیں۔ رحبانی وہاں آیا تھا۔ چاقو اس کے ہاتھ میں تھا جو اس نے اپنی پشت پر چھپا رکھا تھا۔ وہ چاہتا تو پہلے ہی وار میں حاجی بوا پر حملہ کر سکتا تھا اور انہیں موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا لیکن پھر اسے لگا کہ جو سوال اس کے اندر پنپ رہے ہیں ان کے جواب کون دے گا۔ جوابات کے لیے وہ تو ساری زندگی دیواروں سے ہی سر ٹکرا ٹکرا کر مر جائے گا۔

"حاجی بوا......!" رحبانی نے بلند آواز میں انہیں پکارا تھا۔ حاجی بوا کی پشت دروازے کی طرف

تھی انہیں رحبانی کے وہاں آنے کا پتا نہیں چلا تھا۔ بلند پکار پر انہوں نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ دروازے پر رحبان کھڑا تھا۔ جو خون اتری آنکھوں کے ساتھ انہیں دیکھ رہا تھا۔

"کیا بات ہے رحبانی...... کچھ چاہیے کیا تمہیں؟" حاجی بوا نے پیار سے پوچھا تھا۔

"کیوں کیا آپ نے میرے ساتھ ایسا......" حاجی بوا کے قریب ہوتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔ حاجی بوا اس کی بات نہیں سمجھی تھیں۔

"کیا کہہ رہے ہو تم رحبانی...... کیا کیا ہے میں نے تمہارے ساتھ؟"

"کیوں بتایا چاند کو کہ التمش کا قتل میں نے کیا تھا۔" رحبانی نے پوچھا تھا۔

حاجی بوا کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ تو جیسے سانس لینا ہی بھول گئی تھیں۔ رحبانی کے سرخ ہوتے چہرے اور خون اتری آنکھوں کی طرف ان کا دھیان اب گیا تھا۔

"بولیے...... کیوں بتایا آپ نے چاند کو یہ سب......؟" وہ بلند آواز میں پوچھ رہا تھا۔ حاجی بوا سے کوئی جواب نہیں دیا گیا تھا۔ وہ بھلا کیا جواب دیتیں۔

"بولیے حاجی بوا......"

"میں...... وہ...... مجھے اس وقت یہ ہی بہتر لگا رحبانی...... وہ تم سے شادی کرنے جا رہی تھی اس لیے......"

"تو کیا ہوا۔ پھر کیا ہو جاتا اگر میری اور چاند کی شادی ہو جاتی تو......"

"اسے بعد میں پتا چلتا تو زیادہ دکھ ہوتا......"

"بعد میں کون بتاتا اسے......؟"

"قتل نہیں چھپتے رحبانی......"

"میں نے موقع دیکھ کر چاند سے معافی مانگ لینا تھی۔ لیکن آپ نے...... آپ نے میری زندگی برباد کر دی حاجی بوا...... مجھے برباد کر دیا۔" خود ترسی کے باعث رحبانی کی آواز روہانسی ہو گئی تھی۔ اس

نے اپنی پشت کے پیچھے سے چاقو نکال کر حاجی بوا کے سامنے پلنگ پر پھینک دیا تھا جسے دیکھ کر حاجی بوا وقتی طور پر ڈر گئی تھیں۔

"اب اسے میرے سینے میں اتار دیں۔ جیسے آپ نے چاند کا زخم ہمیشہ کے لیے میرے دل میں اتار دیا ہے۔" رحبانی کے لہجے سے اس کے دکھ جھلک رہے تھے۔ جو چاقو وہ حاجی بوا کو قتل کرنے کے لیے لایا تھا اب اسی سے خود موت کے گھاٹ اتر جانا چاہتا تھا۔ حاجی بوا چاقو دیکھنے لگی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

"چاند کو بتانے سے بہتر ہوتا کہ آپ مجھے زہر دے دیتیں۔"

"مجھے اس وقت جو بہتر لگا میں نے وہی کیا رحبانی......" حاجی بوا شرمندہ ہو رہی تھیں۔ پتا نہیں کیوں انہیں احساس ہوا تھا کہ انہوں نے چاند کو حقیقت بتا کر غلطی کی ہے۔ چاند بھی ساری زندگی کنواری رہی اور رحبانی کا بھی گھر نہ بس سکا۔

"پھر اب مجھے بھی اپنے ہاتھوں سے قتل کریں۔" رحبانی حاجی بوا کے قریب ہوا تھا۔ تخت سے چاقو اٹھا کر اس نے زبردستی اسے حاجی بوا کے ہاتھ میں دیا تھا۔

"پکڑیں اسے...... میرے سینے میں اتار دیں اسے...... تا کہ آپ کو مزید سکون مل جائے۔ چاند کی مزید وفادار ثابت ہو جائیں آپ......" رحبانی نے ان کا چاقو والا ہاتھ اپنے سینے پر رکھوایا تھا۔

"یہ کیا کر رہے ہو رحبانی......"

"اسے میرے سینے میں اتاریں۔" وہ شاید رونے لگا تھا۔ بس منہ سے نہیں رو رہا تھا۔ لیکن آنکھیں پوری آنسوؤں سے بھیگ چکی تھیں۔ حاجی بوا کے آنسو بہہ نکلے تھے۔

"چھوڑو رحبانی...... چوٹ لگ جائے گی تمہیں۔"

"یہ چوٹ بہت معمولی ہو گی۔ جو چوٹ آپ مجھے دے چکی ہیں۔" وہ حاجی بوا کے ہاتھوں سے

زبردستی چاقو اپنے سینے کے اندر کھبوانا چاہتا تھا۔

''رحبانی! میں کہتی ہوں پیچھے ہٹ جاؤ۔''

''آپ نے صرف چاند سے وفاداری نبھانی ہے تو شوق سے نبھائیں۔ ختم کردیں مجھے حاجی بوا......''

وہ حاجی بوا کے ساتھ زبردستی کرنے لگا تھا۔ حاجی بوا بہت مشکل سے اس سے الگ ہوئی تھیں اور پھر دور ہو کر رحبان کو دیکھنے لگی تھیں۔

کیا وہ واقعی ہی مرنا چاہتا تھا۔ کیا انہوں نے اس کی قبر کھود دی تھی۔ آج سے سالوں پہلے......

''مجھے معاف کردو رحبان...... مجھے معاف کردو۔'' حاجی بوا نے روتے ہوئے کہا تھا۔ ''مجھ سے غلطی ہوگئی۔ مجھے واقعی ہی میں چاند کو کچھ نہیں بتانا چاہیے تھا۔ مجھے معاف کردو۔'' حاجی بوا دل سے معافی مانگنے لگی تھیں۔

رحبانی دھپ سے تخت پر بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ مدتوں کے آنسو، سالوں کی جدائی بہنے کے آنسو...... ایک جوان جہان مرد رو رہا تھا۔ حاجی بوا کا دل پسیج کر رہ گیا تھا۔

چاقو حاجی بوا کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے فرش پر گرا تھا۔ رحبانی کے رونے کی آواز اس شور پر غالب رہی تھی۔ اور رحبانی کو روتا ہوا دیکھ کر حاجی بوا کے اندر جیسے بہت کچھ ٹوٹ گیا تھا۔

دو مہاجر ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ وہ خود ہندوستان سے ہجرت کر کے یہاں آئی تھیں۔ ان کا یہاں کوئی نہیں تھا۔ جو تھے ان میں سے آدھے ہندوستان ہی رہ گئے تھے اور آدھے مر گئے تھے۔ شادی انہوں نے کی نہیں تھی۔ اگر کی ہوتی تو شاید اب رحبانی جتنا ان کا خود کا بیٹا ہوتا۔ وہ پلنگ پر اس کے بہت قریب بیٹھ گئی تھیں۔

''مجھے معاف کردو رحبانی......'' اپنی چادر کے پلو سے رحبانی کی آنکھیں خشک کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔ ''مجھے معاف کردو...... مجھ سے غلطی ہوگئی۔ بہت بڑی غلطی......''

رحبان چپ چاپ بیٹھا ان کی چادر کے پلو سے اپنی آنکھیں خشک کرواتا رہا تھا۔

طویل رات کے بعد صبح بہت گریہ پائی سے وارد ہوئی تھی۔ کچھ اجلی اجلی سی صبح...... جس میں میٹھی خنکی تھی اور ہلکی گرمائش...... پرندے اپنی چہکار سے ٹھنڈیانی کے باسیوں کو جگانے لگے تھے جبکہ وہ یہ بات اچھے سے جانتے بھی تھے کہ یہ باسی اب دیر سے اٹھنے کے عادی ہو چکے تھے۔

چاند حاجی بوا کے کمرے میں آئی تھی۔ صبح ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی اور حاجی بوا ابھی تک نہیں اٹھی تھیں۔ جبکہ وہ تو بہت جلد اٹھ جانے کی عادی تھیں۔ چاند کو تشویش ہوئی تھی۔ کہیں ان کی طبیعت نہ خراب ہو۔

"حاجی بوا......" چاند ان کا نام پکارتے ہوئے وہاں تک آئی تھی لیکن پھر ٹھٹک کر رک گئی تھی۔ سامنے کا منظر حیرت میں مبتلا کر دینے کے لیے کافی تھا۔ حاجی بوا پلنگ کی پشت سے کمر ٹکا کر سو رہی تھیں اور ان کی گود میں رحبانی لیٹا ایسے سو رہا تھا جیسے کوئی نوزائیدہ بچہ میٹھی اور گہری نیند سو رہا ہو۔ ایک دوسرے میں سمٹے اور ایک دوسرے کو خود میں سمیٹے ہوئے دونوں ایسے سو رہے تھے جیسے انہیں باقی دنیا کی کوئی پرواہ ہی نہ ہو۔

حاجی بوا کی گود میں رحبانی کو سوتا دیکھ کر چاند کو سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ اس رشتے کو کیا نام دے۔ اسے بالکل سمجھ میں ہی تو نہیں آسکا تھا۔



ناول **تاش گھر** ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **15** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 27

گہری اندھیری رات میں تاروں کا جال بچھا ہوا تھا جو کشمیر کی کھلی فضا میں زیادہ روشن اور زیادہ قریب دکھتے تھے۔ ایسے جیسے ذرا سا ہاتھ بڑھاؤ اور انہیں چھو لو۔ تعبیر کو بھی تو وہ تارے، بہت بے ترتیبی سے تاریک آسمان پر پھیلے ہوئے نظر آتے تھے اور کبھی زیادہ غور سے دیکھنے پر اسے ان کے درمیان میں راستے بنتے محسوس ہوتے تھے۔ وہ خیالوں ہی خیالوں میں خود کو تاروں کے درمیان میں کھوجتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ اس طرح ایک تارے سے دوسرے تارے تک جانا اس کے لیے بہت آسان تھا۔ وہ اونچ نیچ کا وہ کھیل کھیل رہی تھی جو وہ سب کزنز اکثر حویلیاں کی ٹیلوں والی جگہوں پر جا کر کھیلا کرتی تھیں۔

اور تادیر تاروں کو گھورتے رہنے سے تعبیر کو اچانک سے محسوس ہوا تھا کہ یہ سب اس کی نظر کا دھوکا ہے۔ نہ تو تاروں کے درمیان کوئی راستہ ہے اور نہ ہی وہ بے ترتیب ہیں۔ بلکہ وہ تو آسمان والے کا جال ہیں۔

ایک مہا جال......

جسے نہ کاٹا جا سکتا ہے، نہ توڑا جا سکتا ہے۔ اور ایسی چیز سے بھلا باہر بھی پھر کیسے نکلا جا سکتا ہے۔

تعبیر کو لگنے لگا تھا کہ وہ جال صرف اور صرف اسی کے لیے بنایا گیا ہے جہاں نہ تو اس کا شکاری اسے پوری طرح سے دبوچتا ہے اور نہ ہی آزاد کرتا ہے۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس مہا جال سے زندہ سلامت کیسے نکلے گی۔ نکلے گی بھی یا نہیں...... کیا وہ کبھی اپنی ماں اور کزنوں کو دیکھ سکے گی۔ ان سے مل سکے گی۔ موجودہ حالات پر نظر ثانی کرتے ہوئے اگر وہ ایمانداری سے قیاس کرتی تو ایسا ہونا ناممکن

تھا۔ رخصتی کے وقت وہ شاید آخری دیدار تھا جو اس نے اپنی ماں اور کزنوں کا کر لیا تھا۔

کمال کے لیے وہ ایک کھلونا تھی۔ ایک ایسا کھلونا جس سے وہ تب ہی کھیلتا تھا جب اس کا دل چاہتا تھا۔ ورنہ کھلونا کسی بے کار چیز کی طرح پڑا رہتا تھا۔ تعبیر کو کھانے پینے کی کمی نہیں تھی، اسے پہننے اوڑھنے کی بھی کمی نہیں تھی۔ اسے کمی تھی تو اس رشتے کی جس کے تحت وہ اس گھر میں رہ سکتی۔ دن رات اپنی قسمت پر کڑھتے ہوئے وہ کچھ کچھ ذہنی عارضے کا شکار ہونے لگتی تھی۔ وہ سخت سردی میں بھی روز نہاتی تھی۔ رگڑ رگڑ کر اپنا جسم صاف کیا کرتی تھی۔ روز نئے کپڑے پہنتی تھی۔ پھر بھی گندگی کا احساس تھا کہ اس کے ذہن سے اترتا ہی نہیں تھا۔ ایک دن اس نے ہمت کرتے ہوئے کمال سے بات کی تھی۔

"میں ساری زندگی آپ سے کچھ نہیں مانگوں گی کمال...... بس مجھ پر ایک احسان کر دیں۔"

کمال نے شطرنج سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا تھا۔ جو وہ اکثر اکیلا ہی کھیلا کرتا تھا۔

"مجھ سے نکاح کر لیں......" اس نے منت بھرے انداز میں کہا تھا۔ "میں بنا نکاح کے یہاں مزید رہی تو مر جاؤں گی۔"

"اور میرے باپ کو پتا چل گیا کہ میں نے ایک بنا خاندان والی لڑکی سے نکاح کر رکھا ہے تو وہ مجھے زندہ دفن کر دے گا۔"

"میرا خاندان ہے۔ میں روشن بیگم کی بیٹی نہیں ہوں۔ میں دین حویلی سے ہوں۔"

"تم دین کی بیٹی بھی نہیں ہو۔ تمہارا باپ بٹوارے کے وقت مر چکا ہے۔ اور تمہارا ماموں بستامی...... وہ ایک دلال بن چکا ہے۔ کیا تعارف دوں گا میں اپنے باپ کو تمہارے گھر والوں کا......؟"

کمال نے سخت لہجے میں کہا تھا۔

تعبیر لاجواب ہوئی تھی۔

"آپ اپنے والد کو کچھ مت بتائیے گا۔ میں قسم کھاتی ہوں ساری زندگی اس گھر سے باہر قدم

نہیں نکالوں گی۔ جیسا کہیں گے ویسا ہی کروں گی۔ بس مجھ سے نکاح کرلیں۔"

"یہ حویلیاں نہیں ہے تعبیر...... جہاں راز حویلی کی بنیادوں میں دفن ہو جاتے ہیں۔ یہ کشمیر ہے۔ یہاں درخت کی ایک شاخ بھی گم ہو جائے تو سب جان جاتے ہیں۔ میرا باپ جانتا ہے کہ میں نے تمہیں یہاں رکھا ہوا ہے۔ میرے ملازم مجھ سے زیادہ میرے باپ کے ساتھ وفادار ہیں۔ میرے باپ نے آج تک اس موضوع پر بات نہیں کی...... اسے یہ تو منظور ہے کہ میں نے گھر پر کسی رکھیل کو رکھا ہوا ہے لیکن تم سے نکاح کیا تو پھر منظور کرنے اور نا منظور ہونے کو کچھ نہیں رہ جائے گا۔ میرا باپ میرے منہ میں پستول ڈال کر فائر چلا دے گا۔"

کمال کی باتوں پر تعبیر چپ ہو کر رہ گئی تھی۔ اسے لگنے لگا تھا کہ کمال اتنا بے بس نہیں ہے جتنی اس کی قسمت خراب ہے۔ اس کی قسمت اس کا ساتھ دیتی تو کیا نہیں ہو سکتا تھا۔ شاید اللہ اس سے ناراض ہو گیا ہے۔ اس نے تعبیر کی دعاؤں کو قبول کرنا تو دور، سننا بھی ترک کیا ہوا تھا۔ مصلے پر بیٹھی وہ ہر وقت روتی رہتی تھی۔ اس کی نمازیں بے ترتیب ہونے لگی تھیں۔ وہ کتنی بار سجدہ کرتی تھی، کتنی بار رکوع میں جاتی تھی اس چیز کا اسے حساب نہیں رہتا تھا۔ خدا کی حمد پڑھتے ہوئے وہ اپنی ماں کو یاد کرتی رہتی تھی اور اپنی کزنوں کو...... وہ نہیں جانتی تھی کہ سب کس حال میں ہوں گی۔ لیکن اتنا ضرور جان گئی تھی کہ بستامی ان کا بھی وہی حال کرنے والا تھا جو افشیں کا ہو چکا تھا۔ اور جو اس کا ہو رہا تھا۔

"دعا کرتی ہوں کہ تمہیں جو بھی ملے وہ تم سے نکاح کر لے۔ میری طرح تمہیں گناہ کا تعلق نصیب نہ ہو میری کزنو......" وہ روتے ہوئے دعائیں کرتی تھی۔ اس سے یہ ہوتا تھا کہ اسے دلی طور پر سکون مل جایا کرتا تھا۔

ایک نماز کے بعد وہ کچھ دیر ٹھیک رہتی تھی اور پھر سے اگلی نماز میں خدا کے آگے سجدہ کرنے کے انتظار میں ہوتی تھی۔

آج کل اس کی طبیعت کچھ خراب رہنے لگی تھی۔ ڈاکٹر کے پاس تو اس نے جانا نہیں تھا اور نہ ہی وہاں کوئی ڈاکٹر موجود تھا۔ اس لیے گھر کی ملازمہ حاجرہ نے اسے کچھ جڑی بوٹیاں دی تھیں جس سے پیٹ صاف ہو جاتا تھا لیکن دوائی کھا لینے کے بعد بھی اس کی الٹیاں بند نہیں ہو رہی تھیں۔ سر میں درد لگ سے تھا۔ اور پورا جسم جیسے ٹوٹنے لگا تھا۔ حاجرہ نے ایک دن اس کا پیٹ پکڑ کر ٹٹولا تھا اور پھر چپ سی ہو گئی تھی۔

''کیا ہوا ہے؟'' تعبیر نے پوچھا تھا۔

حاجرہ کے چہرے کو دیکھتے ہوئے اسے تشویش ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر جیسے کوئی پریشانی لکھی گئی تھی۔

اگر تعبیر کو کوئی بیماری ہو گئی تھی تو یہ تو خوشی کی بات تھی۔ اگر مر کر ہی اس جہنم سے جان چھوٹنے والی تھی تو وہ بخوشی موت کو قبول کرنے کو تیار تھی۔

''تم ماں بننے والی ہو۔'' حاجرہ نے اسے بتایا تھا۔

چند لمحے تو تعبیر کو سمجھ میں ہی نہیں آسکا تھا کہ وہ کس جذبے کا اظہار کرے۔ وہ خوش ہو یا دکھی ہو۔ یہ بچہ گناہ کی پیداوار تھا۔ وہ کیسے خوش ہو سکتی تھی۔ لیکن اس خبر میں نجانے کیا بات تھی کہ تعبیر کو اپنے ماں بننے کا سن کر بے حد خوشی ہو رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ ماں بننے کی خواہش اور خوشی عورت عالم ارواح سے ہی اپنے ساتھ لے کر آتی ہے۔

''میں ماں بننے والی ہوں۔'' اس نے کمال کو بتایا تھا۔

شکاری بندوق ہاتھ میں پکڑے کمال درخت کی شاخ پر بیٹھے پرندے کا شکار کرنے والا تھا جب اس کے ہاتھ رکے تھے۔ چند لمحے وہ ساکت رہا تھا اور پھر اس نے فائر کھول دیا تھا۔ فائر نشانے پر لگا تھا۔ مجروح پرندہ خون میں لت پت نیچے گھاس پر آگرا تھا۔

''حاجرہ سے کہہ دوں گا۔ وہ اس مسئلے کو ختم کروا دے گی۔'' کمال نے کہا تھا۔

تعبیر کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ وہ پاگل لڑکی سمجھ رہی تھی کہ کمال یہ بات سن کر خوش ہوگا اور وہ موقعے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پھر سے نکاح کی بات کرلے گی۔ لیکن سب کچھ اس کی سوچ کے الٹ ہوا تھا۔

''میں...... میں یہ بچہ چاہتی ہوں کمال......'' تعبیر نے ڈرتے ہوئے کہا تھا۔

کمال نے سخت نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''تم بیویوں کی طرح بات کیوں کر رہی ہو تعبیر......؟'' کمال نے اسے لاجواب کیا تھا۔ ''مت بھولو کہ تم میری رکھیل ہو۔ اور رکھیل کی کوئی مرضی نہیں ہوتی ہے۔''

''میں عورت ہوں کمال!''

''میں گھر سے اپنے بچے لے آیا کروں گا۔ تم ان سے دل بہلا لیا کرنا۔'' بندوق تھامے وہ کسی نئے پرندے پر نشانہ باندھنے لگا تھا۔

''لیکن کمال......!''

''بکواس بند......'' کمال نے رخ اس کی طرف کرتے ہوئے سخت انداز میں کہا تھا۔ ''مزید ایک لفظ بھی کہا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' کمال نے اسے پرے دھکیلا تھا۔

وہ لڑکھڑا کر سنبھلی تھی۔

''حاجرہ سے کہہ دوں گا میں...... وہ بچے کو ختم کر دے گی۔'' کمال کہہ کر پھر سے اپنے کام کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔

تعبیر کا دل چاہا تھا کہ وہ اسی درخت کی شاخ سے رسا ڈال کر خودکشی کرلے۔ اسے خون میں لت پت پرندہ اپنے سے بہتر محسوس ہوا تھا۔

حاجرہ چند دن اسے نجانے کون کون سی دوائیاں دیتی رہی تھی جس سے تعبیر کی الٹیاں بجائے کم ہونے کے مزید بڑھ گئی تھیں۔ اس نے حاجرہ سے کہا تھا کہ اس کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ جیسے ہی بہتر

ہوتی ہے وہ اپنا حمل ساقط کروالے گی۔کمال نے بھی اس کی دکھی شکل دیکھتے ہوئے اسے چند دن کی رعایت دے دی تھی۔

ان دنوں وہ روتے ہوئے دن رات گزار رہی تھی۔ایک بچہ اس کے پیٹ میں پل رہا تھا۔اس کا باپ کون تھا، کیسا تھا وہ نہیں جانتی تھی۔لیکن وہ اس کی ماں تھی۔اپنے وجود کو کیسے وہ خود سے الگ کرسکتی تھی۔اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ کہیں دور چلی جائے۔کسی غار میں چھپ جائے،اور وہاں اپنے بچے کو پیدا کرے۔اور پھر بے شک ساری زندگی اسی غار میں گزار دے۔وہ اس بچے کو مارنا نہیں چاہتی تھی بلکہ اسے اپنی بانہوں میں بھرنا چاہتی تھی۔

ایک شام مغرب کی نماز کے بعد جب وہ خوب رو رو کر خدا سے دعا کر چکی تھی، مصلے کو تہ کرکے رکھتے ہوئے اس کی نظر کھڑکی سے باہر باغ میں کنیر کے پودے پر گئی تھی۔اسے یاد آیا کنیر کو لے کر حاجی بوا بڑی کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔یہ خوش رنگ پودا زہریلا بھی ہوتا ہے۔اس کے بیج سم قاتل ہوتے ہیں۔پرانے زمانے میں لوگ اس کے بیجوں کا زہر بنا کر جان لیا کرتے تھے۔

کچھ فیصلہ کر لینے کے بعد رات گہری ہونے پر تعبیر باہر باغ میں گئی تھی۔اور اس نے کنیر کے بہت زیادہ پھول توڑ لیے تھے۔کمرے میں آکر اس نے دروازہ بند کیا تھا۔اور پھر ان پھولوں میں سے بیج نکالنے لگی تھی۔بہت زیادہ پھولوں میں سے بیجوں کی تعداد بہت کم نکلی تھی۔تعبیر مایوس نہیں ہوئی تھی۔وہ چند دن تک ہر روز یہ کام کرسکتی تھی۔



پرانے زمانے میں ایک کہانی بہت مشہور تھی کہ چاند پر ایک بڑھیا رہتی ہے جو ہر وقت چرخا کاتتی رہتی ہے۔یہ کہانی بچوں کے لیے نہیں تھی۔شاید یہ کہانی بڑوں کے لیے تھی۔بڑی بوڑھیاں بچوں سے زیادہ اپنا دل بہلانے کے لیے ایسی کہانیاں گھڑ لیا کرتی تھیں۔وہ ایک ایسی تصوراتی دنیا تخلیق کرلیا کرتی

تھیں جو انہیں دن رات مسحور کرتی رہتی تھی۔ شاید ایسا وہ اس لیے کیا کرتی تھیں کہ اس سے گھر کی گھٹن کا ازالہ ہو جایا کرتا تھا۔

افشیں بھی آج کل یہی کر رہی تھی۔ اس نے ایک تصوراتی دنیا تخلیق کر رکھی تھی۔ ایک چھوٹا سا گھر اور اس میں اس کی بہت سی گڑیاں...... جن سے وہ باتیں کیا کرتی تھی اور ننھی ننھی بے جان گڑیاں بھی اس سے باتیں کیا کرتی تھیں۔ وہاں کوئی گڈا نہیں تھا۔ سب گڑیا تھیں اور وہ کسی گڈے کو وہاں لانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ اپنی کسی گڑیا کی شادی کسی گڈے سے نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ ساری زندگی انہیں اپنے سینے سے لگا کر رکھنا چاہتی تھی۔ جیسے اب اس کا دل اپنی ماں سے ملنے کو تڑپ رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی گڑیاں بھی اسے ملنے کو تڑپیں۔ گڑیوں سے جدائی کی سوچ جسم کو کپکپا دینے والی ہوتی تھی اور ایسے میں افشیں اپنی گڑیوں کو سینے سے لگا کر خوب رویا کرتی تھی۔

اس کا بوڑھا شوہر آج کل شدید بیمار تھا اور اس کے جوان بچے اس کے مر جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ سب کو جائیداد کی فکر تھی۔ ابھی سے بٹوارے ہونے لگے تھے۔ کسی کو پلاٹ چاہیے تھا، کسی کو کوٹھی، کسی کو کارخانہ...... افشیں کا تو کہیں کوئی ذکر ہی نہیں تھا۔ وہ تو سب افشیں کے منہ پر کہہ دیتے تھے کہ وہ اپنے باپ کی جائیداد میں سے افشیں کو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں لینے دیں گے۔ افشیں سب چپ چاپ سنتی رہتی تھی۔ وہ انہیں کیا بتاتی کہ اسے کچھ نہیں چاہیے۔ وہ کسی چیز کی طلب لے کر اس گھر میں نہیں آئی تھی۔ اور اگر وہ اسے کچھ نہیں بھی دیتے ہیں تو اسے کوئی شکوہ نہیں ہوگا۔ شادی کے بعد جو کچھ ایک لڑکی کو چاہیے ہوتا ہے اسے وہ نہیں ملا تھا۔ نہ اسے ڈھنگ سے شوہر کی قربت نصیب ہو سکی تھی اور نہ وہ ماں بن سکی تھی۔ پھر جائیداد لے کر کیا کرتی وہ......

"کیا میں امی سے ملنے جا سکتی ہوں؟" ایک روز اس نے بستر مرگ پر پڑے اپنے شوہر سے کہا تھا۔

"تمہارا سایہ بھی مجھ سے دور ہوا تو یہ مجھے زہر دے دیں گے۔ جانتا ہوں میں انہیں۔"

"اتنے برے نہیں ہیں آپ کے بچے......"

"مکافات عمل ہو کر رہتا ہے۔ میں نے بھی تو اپنے باپ کے ساتھ یہی کیا تھا۔ اسے زہر تو نہیں دیا تھا، لیکن جان بوجھ کر اس کا ڈھنگ سے علاج نہیں کروایا تھا تا کہ وہ جلدی مر جائے۔

"کیا میں امی کو یہاں بلوا لوں؟"

"تمہاری ماں مجھے بستر مرگ پر دیکھے گی تو وقت سے پہلے مر جائے گی۔ میرے مرنے کا انتظار کر لو۔ پھر جہاں دل کرے چلی جانا......" بوڑھا شوہر کھانسی کے دوران بڑبڑایا تھا۔ پھر وہ خلاؤں میں دیکھنے لگا تھا۔

"مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی جو میں نے تم سے شادی کر لی افشین...... مجھے معاف کر دینا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تمہاری جوانی برباد کر دی میں نے......اور وہ لڑکا عادل بھی میری وجہ سے جان سے گیا۔"

"ایسے مت کہیں...... آپ ہی میرے لیے اب سب کچھ ہیں۔ آپ مجازی خدا ہیں میرے......"

"جب نکاح ہوا تھا تب میں کتنا صحت مند تھا۔ مجھے لگا تھا کہ تا قیامت صحت مند ہی رہوں گا۔ لیکن اب دیکھو......بستر پر پڑا موت کا انتظار کر رہا ہوں۔"

"کیوں بار بار موت کی بات کرتے ہیں۔"

"میں سب کچھ تمہارے نام کر دوں گا افشیں......ان کمینوں کو کچھ نہیں دوں گا۔ جو میری موت کے لیے ایک ایک پل گن رہے ہیں۔"

"مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ آپ اپنی زندگی میں ہی سب کچھ اپنے بچوں میں بانٹ دیں۔ اس سے بہتر کیا ہوگا۔"

''نہیں...... میں انہیں کچھ نہیں لینے دوں گا۔ تم نے میری بہت خدمت کی ہے۔ جبکہ میں تمہیں کبھی پسند بھی نہیں رہا۔ اس کے باوجود تم نے میرا ہر طرح سے خیال رکھا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میری ایک ایک چیز پر تمہارا حق ہو۔ تم وکیل کو فون کرو۔ اسے کہو گھر آئے۔''

''لیکن......''

''فون کرو...... مجھے لگتا ہے کہ میرے پاس اب بہت کم وقت بچا ہے۔''

چاروناچار افشیں اٹھی تھی اور فون کی طرف بڑھی تھی۔

☆......☆......☆

جب سے وہ کمال کے گھر میں رہ رہی تھی کمال نے شاید آج پہلی بار اسے چائے بنانے کو کہا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے کام ملازمہ کو کہا کرتا تھا۔ بلکہ تعبیر کے سارے کام بھی ملازمہ ہی کیا کرتی تھی۔ لیکن آج نجانے کیوں کمال نے اسے چائے بنانے کو کہہ دیا تھا۔ خیر تعبیر نے اس بات کو موقع غنیمت جانا تھا۔ اس نے دو کپ چائے بنائی تھی۔ کمال کے ساتھ چائے پیتے ہوئے وہ اس کا دھیان لگائے رکھنا چاہتی تھی۔ ٹرے میں اس نے بادام پستے بھی رکھے تھے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ کنیر کے بیجوں کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے۔ لیکن جیسا بھی ہوتا ہے بادام اور پستے کا ذائقہ یقیناً اس پر حاوی ہو جائے گا۔ اس نے چائے میں الائچی بھی ڈالی تھی اور ڈھیر ساری شکر بھی...... پھر وہ اپنے کمرے سے جا کر کنیر کے بیج لے آئی تھی۔ پچھلے چند دنوں میں اس نے کافی بیج اکٹھے کر لیے تھے اور ملازمہ سے چھپ کر انہیں سکھا بھی لیا تھا اور پیس بھی لیا تھا۔ اس نے کمال کی چائے میں وہ سارا سفوف ڈال دیا تھا۔

''یہ لیں۔'' کمال کے آگے چائے رکھ کر اس نے اپنی طرف والا کپ جلدی سے پکڑ لیا تھا مبادا کمال وہ پکڑ لے۔ اور پھر کمال کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی۔

''پی کر بتائیں کہ کیسی بنی ہے۔'' اس نے اپنے کپ سے گھونٹ بھرنے کے بعد کہا تھا۔ کمال نے

اخبار کو سائیڈ پر رکھا تھا۔ اور پھر ہاتھ آگے کر کے تعبیر سے کپ پکڑ لیا تھا۔

"مجھے تمہارے ہونٹوں کی چھوئی ہوئی چائے پینا پسند ہوگا۔" کمال نے تعبیر کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

اور پھر ٹرے میں رکھا کپ اٹھا کر تعبیر کے سامنے کیا تھا۔

"تم یہ والا پی لو......"

تعبیر کی تو جان ہی نکل کر رہ گئی تھی۔ کانپتے ہاتھوں کے ساتھ اس نے کپ پکڑا تھا۔ کمال خاموشی سے چائے پینے لگا تھا۔

"کیا بات ہے تم چائے نہیں پی رہیں۔"

"میرا دل نہیں چاہ رہا...... ایک دم سے ہی دل اچاٹ ہو گیا ہے۔" اس نے کہہ کر کپ واپس ٹرے میں رکھ دیا تھا۔

"چائے تو آج تمہیں پینا ہوگی۔" کمال کے لہجے میں سرد مہری جھلکی تھی۔ "اٹھاؤ کپ...... اور منہ سے لگاؤ۔" اس نے کچھ حکم دیتے ہوئے کہا تھا۔

تعبیر کا وجود جامد ہو گیا تھا۔

"اٹھاؤ کپ......" وہ بلند آواز سے بولا تھا۔

تعبیر نے کچھ ڈرتے ہوئے کپ واپس پکڑ لیا تھا۔

"پیو اسے......" اس نے کہا تھا۔

لیکن تعبیر کیسے پی سکتی تھی۔ چائے میں تو زہر تھا۔ اور وہ ابھی مرنا نہیں چاہتی تھی۔ زندہ رہنا چاہتی تھی، اپنے بچے کو دیکھنا چاہتی تھی۔

"پیو......" وہ پھر سے دھاڑ اٹھا تھا۔ اس کی آواز اتنی گونج دار تھی کہ پورے فارم ہاؤس میں گونجی تھی۔

تعبیر کانپنے لگی تھی۔

کمال غصے سے اٹھا تھا اور اس نے تعبیر کے ہاتھ سے چائے کا کپ پکڑ لیا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے تعبیر کی گردن دبوچ کر اس نے کپ اس کے ہونٹوں سے لگا دیا تھا۔

''پیو اسے......''

تعبیر مزاحمت کرنے لگی تھی۔ لیکن ساری مزاحمت بے کار گئی تھی۔ کمال نے ساری چائے اس کے منہ میں انڈیل دی تھی۔ اور پھر نفرت سے دیکھنے لگا تھا۔ تعبیر کو کھانسی آنے لگی تھی اور پھر جب وہ کھانستے کھانستے تھک گئی تو اس پر مدہوشی طاری ہونے لگی۔ بہت جلد اس کے منہ سے جھاگ نکلنا شروع ہو گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اب اس کی موت قریب ہے۔

''حاجرہ......رقیہ......!'' کمال نے ملازمہ کو آواز دی تھی۔ اگلے ہی پل دونوں وہاں موجود تھیں۔

''یہ پوری طرح سے بے ہوش ہو جائے تو بچہ ضائع کر دینا۔''

''جی اچھا......!'' حاجرہ نے کہا تھا۔

کمال نے ایک سخت نظر اس پر ڈالی تھی اور پھر کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔

حاجرہ اور رقیہ دونوں نے مل کر اسے کرسی سے اٹھا کر بیڈ پر لٹا دیا تھا۔ دروازہ بند کر کے رقیہ اسقاطِ حمل کی تیاری کرنے لگی تھی۔

''پاگل لڑکی......اتنا بھی نہیں جانتی ہو کہ کنیر کی اس قسم سے صرف غشی طاری ہوتی ہے۔ انسان مرتا نہیں ہے۔'' حاجرہ نے اس کے کان کے پاس آ کر سرگوشی کی تھی۔

☆......☆......☆

سارا کزنوں کے ساتھ باغ میں گئی تھی جب اسے پانی کی طلب ہوئی تھی۔ گھر سے لایا پانی ختم ہو چکا تھا اور باغ میں پانی کی جگہ کافی فاصلے پر تھی۔ بڑا کولر پکڑ کر وہ اکیلی ہی پانی والی طرف چلی گئی تھی۔

راستے میں اسے کسی بچی کے رونے کی آواز آئی تھی۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا تھا۔ ایک چھوٹی بچی درخت کے پیچھے کھڑی رو رہی تھی۔ سارا جلدی سے اس کے پاس گئی تھی کہ بچی شاید کھو گئی ہے یا اسے کسی مدد کی ضرورت ہے۔

اور جیسے ہی وہ بچی کے پاس پہنچی تھی کسی نے اس کے منہ پر نم رومال رکھ دیا تھا۔ رومال اور ہاتھ کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ سارا چلا بھی نہیں سکی تھی۔ چند ہی لمحوں میں اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ اور اسے کسی چیز کا کوئی ہوش نہیں رہا تھا۔

اسے بہت دیر کے بعد ہوش آیا تھا۔ لیکن وہ کس جگہ تھی، وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ شاید کسی گاڑی میں تھی کیونکہ اسے ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کسی گاڑی میں بیٹھی ہوئی ہے اور گاڑی تیز رفتاری سے کہیں جا رہی ہے۔ وہ کچھ آڑی ٹیڑھی سی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں پر بھی پٹی بندھی ہوئی تھی لیکن آنسو تو بند آنکھوں میں بھی آ جاتے ہیں۔ ان کو کون روک سکتا ہے اور سارا کو اس وقت احساس ہوا تھا کہ دنیا کی سب سے طاقت ور چیز آنسو ہوتے ہیں۔ وہ ہر حالت میں نکل کر ہی رہتے ہیں۔ ان پر کوئی بندھ نہیں باندھا جا سکتا۔

وہ سفر بہت طویل تھا یا شاید سارا کو ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے ایسے لگنے لگا تھا جیسے وہ دوسری دنیا کا سفر کر رہی ہے۔ بہت دیر کے بعد گاڑی رکی تھی اور پھر اسے باہر نکال کر ایک کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔ کمرے میں کیا تھا اور کیا نہیں وہ نہیں جانتی تھی۔ کیونکہ کمرے میں اتنا اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں کھول دیے گئے تھے اور آنکھوں پر سے پٹی بھی ہٹا دی گئی تھی۔ وہ چیخی نہیں تھی، نہ اس نے دروازہ پیٹا تھا۔ وہ جہاں بیٹھی تھی، وہاں ہی بیٹھی رہی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یہاں چلانے کا کوئی فائدہ نہیں ہونے والا ہے۔ کمرے میں کوئی کھڑکی یا روشن دان نہیں تھا جس سے وہ اندازہ کر سکتی کہ وہ کہاں ہے۔

وہ تین دن تک وہاں رہی تھی۔ دروازہ ذرا سا کھول کر ایک کھانے کی ٹرے اس کی طرف بڑھا دی جاتی تھی۔ جس سے وہ اپنا پیٹ بھرتی تھی۔ وہ بھوکی نہیں رہ رہی تھی۔ اب جس طرح کے حالات اسے پیش ہونے والے تھے بہتر تھا کہ وہ اپنی طاقت کو ضائع نہ ہونے دے۔ اس نے اپنی ساری ہمتوں کو جمع کر لیا تھا۔ وہ ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے کو تیار تھی۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے کس نے اغوا کیا تھا، کس مقصد کے لیے کیا تھا۔ لیکن وہ اتنا ضرور جانتی تھی کہ لڑکیوں کا اغوا کس مقصد کے لیے کیا جاتا ہے۔ وہ ہمت ہارنے والی نہیں تھی۔ چاند امی اور گھر کی عورتوں نے اسے نازک نہیں بنایا تھا۔ اب جو بھی ہونے والا تھا وہ اس کے لیے تیار تھی اور وہ جس بھی جنگل میں زندگی گزارنے والی تھی، وہاں سے اپنا راستہ بنا کر نکلنے والی تھی۔

ان تین دنوں میں اس نے نہ تو اپنی ماں کو یاد کیا تھا اور نہ ہی اپنی کزنوں کو...... اس نے ان تین دنوں میں بس خدا کو پکارا تھا۔ اسے خدا کے جتنے بھی نام آتے تھے وہ سب دہراتی جاتی تھی اور ایک ہی دعا کرتی رہتی تھی کہ اس کی ماں اس کا یہ غم برداشت کرنے کی طاقت رکھتی ہو۔ وہ یہاں سے واپس جا کر کچھ اور نہیں چاہتی تھی، بس اپنی ماں کو زندہ دیکھنا چاہتی تھی۔

تین دن کے بعد اس نے سورج کی شکل دیکھی تھی۔ اسے کمرے سے نکالا گیا تھا۔ تب اس نے دیکھا تھا کہ بہت سے چھوٹے چھوٹے کمروں میں سے، بہت سی لڑکیوں کو باہر نکالا جا رہا تھا۔ جو دکھنے میں مختلف شہروں کی لگ رہی تھیں۔ تمام لڑکیوں کو ایک ٹرک میں سوار کر دیا گیا تھا۔ ٹرک پہلے سے ہی لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ نجانے وہ کہاں سے تھیں، کس شہر سے تھیں۔ وہ رو رہی تھیں، چلا رہی تھیں۔ سب ہی جانتی تھیں کہ اب انہیں مزید کہاں لے کر جایا جا رہا ہے۔ صرف ایک سارا تھی جو چپ تھی۔ ایسی چپ جیسے کبھی کوئی لفظ نہ بولی ہو۔

ٹرک کو بھر کر اوپر ترپال ڈال دی گئی تھی۔ پھر اس ترپال پر پرالی ڈال دی گئی تھی۔ اور پھر اوپر بوریوں کو ایسے رکھ دیا گیا تھا جس سے لگا کہ سارا ٹرک اناج کی بوریوں سے بھرا ہوا ہے۔ ایک نائیکہ

عورت بھی ٹرک میں سوار ہو گئی تھی۔ سارا کو اس عورت کی شکل کچھ جانی پہچانی سی لگی تھی۔ ذہن پر بہت زور ڈالنے پر بھی سارا کی یادداشت نے کام نہیں کیا تھا۔ لیکن پھر جب وہ عورت بولی تو سارا کو ساری بات سمجھ میں آ گئی تھی۔

''کسی نے زیادہ ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو اس سروتے سے زبان کاٹ دوں گی۔'' اس نے بڑک مارنے والے انداز میں کہا تھا۔

اور سارا کے قریب جیسے کوئی دھماکا ہوا تھا۔ وہ عورت ہو بہو روشن بیگم کی طرح کی تھی۔ ویسا ہی لہجہ، ویسا ہی وجود...... سارا جان گئی تھی کہ رہبر ہی رہزنوں سے جا ملے ہیں۔ گھر کے فرد نے ہی گھر پر نقب لگایا ہے۔ کومل کو جو وہ نئی ہوا کا جھونکا سمجھ رہی تھی تو اس نے نجانے کتنے پیسوں کے عوض گھر کی لڑکی کو بیچ دیا تھا۔ یقیناً بستامی بابا بھی اس کے اس کام میں شریک رہے ہوں گے۔ اور جب اس کی کڑیاں گھومتی ہوئی بستامی تک گئیں تو اسے افشیں اور تعبیر کا خیال آ گیا تھا۔

''تعبیر زندہ ہے...... تعبیر زندہ ہے۔'' اس کے دل نے جیسے چلاتے ہوئے کہا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ تعبیر کی موت کا ڈرامہ کس وجہ سے کھیلا گیا تھا۔

''آخری بار اس جگہ کو دیکھ لو، پھر شاید زندگی بھر یہاں نہ آنا ہو۔'' نائیکہ عورت نے کہا تھا۔ لڑکیاں مزید اونچی اونچی آواز میں رونے لگی تھیں۔ ٹرک کا گیٹ بند کر دیا گیا تھا۔ اور سفر شروع ہو گیا تھا۔ لڑکیاں باریک جھریوں میں سے باہر اپنے وطن کو آخری بار دیکھ رہی تھیں۔

''نہیں...... میں اس جگہ کو آخری بار نہیں دیکھ رہی۔ یہ دھرتی میری ہے اور مجھے اس پر لوٹ کر آنا ہے۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ میں یہاں واپس آ کر رہوں گی۔'' باہر کی طرف دیکھنے کے بجائے سارا نے سختی سے اپنی آنکھیں میچ لی تھیں۔



دین حویلی کے مکین آج کل دو افراد کا الگ ہی روپ دیکھ رہے تھے۔ ایک حاجی بوا اور ایک رحبانی کا...... رحبانی کے کام جو پہلے ملازم کیا کرتے تھے اب حاجی بوا اپنے ہاتھوں سے کرنے لگی تھیں۔ صبح کا ناشتا، رات کا کھانا...... حاجی بوا سب کی فکر کرنے لگی تھیں۔ بلکہ رحبانی کے لیے وہ اپنے ہاتھوں سے کھانا بنایا کرتی تھیں۔ ٹھنڈے گرم پانی کا مسئلہ، کپڑے دھونا، استری کرنا...... یہ سب کام ان دنوں حاجی بوا کر رہی تھیں۔ رحبانی بھی ایسے برتاؤ کرنے لگا جیسے ان کا سگا بیٹا ہو۔ وہ حاجی بوا کے لیے ڈھیروں جوڑے لایا تھا۔ انتہائی مہنگے اور نفیس جوڑے...... جنہیں پہن کر حاجی بوا اترائی پھر رہی تھیں۔ اور حویلی والے حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

دونوں کمرے میں بند ہو کر باتیں کرتے رہتے تھے۔ ایک دوسرے کو اپنے خاندانوں کے قصے سناتے رہتے تھے۔ حاجی بوا کا سروتا چلتا تھا اور رحبانی کی زبان...... رات کی چائے تو دونوں اب ہر رات دالان میں بیٹھ کر اکٹھے ہی پیتے تھے۔ رحبانی ہر روز گھر واپسی پر حاجی بوا کے لیے ضرور کچھ لاتا تھا۔ کھانے کی کوئی چیز یا پہننے اوڑھنے کی...... ان سب باتوں پر حویلی والوں کا حیران ہونا تو بنتا تھا۔ رحبانی ساری زندگی لیے دیے رہا تھا۔ اور اب ایک دم سے ہی جیسے گھل مل گیا تھا۔

اچانک سے دونوں میں اتنی محبت کیسے پیدا ہو گئی تھی؟

پھپھیوں نے چاند سے بات کی تو چاند بھی ہوں ہاں کر کے رہ گئی تھی۔

حاجی بوا ان دنوں رحبانی کے لیے سوئیٹر بن رہی تھیں۔ کہا تو کئی بار چاند نے بھی ان سے تھا، لیکن حاجی بوا آگے سے آنکھوں کی کمزوری کا کہہ دیا کرتی تھیں۔ اب پتا نہیں کیسی روشنی بھر آئی تھی ان کی آنکھوں میں...... سوئیٹر بنتے ہوئے خوش باش حاجی بوا چاند سے نظریں چراتی پھر رہی تھیں۔ جبکہ چاند نے ان سے اس بارے میں کچھ پوچھا تک نہیں تھا۔ لیکن اندر ہی اندر کوئی بات جیسے انہیں خود سے ہی تنگ کر رہی تھی۔

''تم مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتی ہو چاند!'' ایک دن انہوں نے خود ہی ہمت کرتے ہوئے پوچھ لیا تھا۔

''کس بارے میں؟''

''رحبانی کے بارے میں......''

''بالکل نہیں...... میں کیوں اس کے بارے میں بات کروں گی۔'' چاند نے دوٹوک کہا تھا۔ جس پر حاجی بوا کی بے چینی مزید بڑھ گئی تھی۔

حاجی بوا کے رویے نے چاند کو دکھی کر دیا تھا۔ وہ التمش کے قاتل کو اپنا بیٹا بنائے ہوئے تھیں۔ ایسا کون سا کارنامہ کر دیا تھا رحبانی نے جو حاجی بوا کو وہ ایک دم سے ہی پیارا ہو گیا تھا۔ دراصل حاجی بوا اور رحبانی کا تعلق سمجھنے میں چاند کو ایک عمر درکار تھی۔ شاید وہ عمر کے کسی حصے میں پہنچ کر یہ جان جائے کہ دو تنہا لوگ بنا بات چیت کے تعلق میں بندھے ہوتے ہیں۔ ایک درد سے اور ایک کیفیت سے گزرنے والوں میں سانجھ ہوتی ہے۔

وہ حاجی بوا پر دھونس نہیں جمانا چاہتی تھی۔ وہ اب کسی پر بھی حکم نہیں چلانا چاہتی تھی۔ سب کو اپنی مرضی سے جینے کا حق ہے۔ جس کا جو دل چاہے وہ کرے۔ چاند کے فیصلوں سے کون خوش ہوا تھا آج تک...... بہتر تھا کہ سب اپنے فیصلے خود لیں۔ تاکہ وہ ملبہ چاند پر تو نہ ڈال سکیں۔

شکیلہ پھپھو کی طبیعت سنبھلنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ بہت سے ڈاکٹر اور حکیم حویلی پر بلا لیے گئے تھے لیکن ان کی طبیعت میں بہتری کی کوئی امید نہیں تھی۔ چاند نے اتنا کچھ دیکھ لیا تھا کہ وہ شکیلہ پھپھو کی موت کا دکھ بھی جھیلنے کو ذہنی طور پر تیار تھی۔ لیکن پھر آخری کوشش کرتے ہوئے اس نے سوچا تھا کہ کیوں نا شکیلہ پھپھو کو یہ بتا دیا جائے کہ سارا کی موت ہو چکی ہے۔ شاید شکیلہ پھپھو کو مزید صدمہ ہو۔ لیکن موجودہ صدمے سے نکل آنے کے چانسز بہرحال موجود تھے۔

چاند نے گھر والوں سے بات کی تھی۔ گھر والوں نے بھی چاند کی بات کی تائید کی تھی۔ سب کے مشورے سے شکیلہ پھپھو کو بتا دیا گیا تھا کہ سارا کی موت ہو چکی ہے۔ لاہور کے ایک علاقے سے اس کی

لاش ملی ہے۔اور چونکہ پولیس کو وارث نہیں مل سکے تو لاش کو دفنا دیا گیا ہے۔ یہ خبر شکیلہ پھپھو پر بجلی بن کر گری تھی۔ پہلے سے ہوش سے بے گانہ شکیلہ پھپھو مزید مدہوشی میں چلی گئی تھیں۔ چاند انہیں لاہور سارا کی قبر پر بھی لے گئی تھی۔اور پھر حسب توقع انہیں واقعی ہی میں قرار آ گیا تھا۔واپس حویلیاں تک آتے آتے وہ کچھ سنبھل چکی تھیں۔ سارا کی موت کا ڈرامہ کھیلنا حویلی والوں کے لیے ضروری ہو گیا تھا۔ورنہ وہ جانتے تھے کہ شکیلہ بھی جلد ہی ہمیشہ کے لیے حویلی چھوڑ دیں گی۔ جیسے تعبیر نے چھوڑ دی ہے۔

چاند اب جلد سے جلد بستامی سے صندل کی بات کر لینا چاہتی تھی۔ اس نے بستامی کی شادی والے دن نیگ کے بہانے اس سے وعدہ لیا تھا۔ اس وعدے کے بدلے چاند چاہتی تھی کہ صندل گھر میں آ جائے اور بستامی اس پر غصہ نہ ہو۔ کافی عرصے سے حویلی پر گرہن لگا ہوا تھا۔ سب خوشی کو ترسے ہوئے تھے۔ایسے میں صندل کی حویلی میں آمد یقیناً ماحول کو خوش گوار کر سکتی تھی۔

بہت سوچ کر چاند بستامی کے کمرے میں گئی تھی۔ دروازے پر دستک دینے پر کومل نے دروازہ کھولا تھا۔

”کیا بات ہے چاند؟“

”بستامی کہاں ہے؟“

”کسی کام سے باہر گیا ہے۔“

”کیا شام تک آ جائے گا؟“

”میرے خیال سے کل آئے گا۔ دور گیا ہے۔ کسی دوسرے شہر......“

”کہاں......؟“

”شاید ٹھنڈیانی......“ کومل نے بتایا تھا اور چاند کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔

☆......☆......☆

ٹھنڈیانی میں گھوڑوں اور اونٹوں کا میلہ ختم ہوئے کافی دن ہو چکے تھے۔ وہ لوگ جو اپنے اپنے جانور لے کر ٹھنڈیانی پہنچے ہوئے تھے اب وہ بھی جا چکے تھے۔ ان کی رہائش کا انتظام کرنے والی انتظامیہ بھی جا چکی تھی۔ اور ٹھنڈیانی ایسے سنسان ہو گیا تھا جیسے کبھی یہاں آبادی موجود ہی نہیں تھی۔

صندل کے مشورے پر ریسٹورنٹ کو چند دنوں کے لیے بند کر لیا گیا تھا۔ کاریگروں کو ایک ایک ہفتے کی چھٹی دے دی گئی تھی۔ سب ہی کچھ آرام وہ دن گزارنا چاہتے تھے۔ مسلسل کام نے انہیں تھکا دیا تھا۔ میرزاد تو کچھ زیادہ ہی تھکا ہوا دکھنے لگا تھا۔ صندل باریشہ کے ساتھ مصروف رہتی تھی اس لیے کام کا سارا بوجھ اس کے کندھوں پر آ گیا تھا۔ اس لیے اب صندل بھی چاہتی تھی کہ سب کچھ آرام کر لیں۔ یہ سارا ہفتہ وہ میرزاد کے ساتھ بتانا چاہتی تھی۔

دونوں ماضی کی باتیں کرنا چاہتے تھے اور مستقبل کی منصوبہ بندی کرنا چاہتے تھے۔

''میر...... تم نے کہا تھا کہ ٹھنڈیانی میں فون کی لائنیں بچھائی جا رہی ہیں۔''

''ہاں...... بچھ تو گئی ہیں۔ کام کافی حد تک مکمل ہو گیا ہے۔''

''کیا وہ فون کے کنکشن دینا بھی شروع ہو گئے ہیں۔''

''درخواستیں وصول کرنے کا کام تو شروع ہو چکا ہے۔ باقی کنکشن لگنے میں کچھ دن لگ جائیں گے۔''

''تو پھر تم بھی جا کر درخواست دے آؤ۔''

''ایبٹ آباد جا کر درخواست دینا ہو گی، بڑے دفتر میں......''

''تم جلد ہی یہ کام کر لو۔ فون لگ جائے گا تو مجھے چاند امی سے باتیں کرنے میں آسانی ہو جائے گی۔ پھر وہ ہمیں بتائیں گی کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ بہت جلد ہی تم حویلی واپس آ جاؤ گی۔ میں تمہیں خط میں بتاؤں گی۔ لیکن کافی دیر ہوئی، ان کا کوئی خط بھی نہیں آیا ہوا۔ خدا کرے حویلیاں میں سب ٹھیک ہو۔''

''سب ٹھیک ہی ہوگا۔ تم فکر مت کرو۔ کچھ ایسا ویسا ہوتا تو کیا رحبانی بابا ٹھنڈیانی گھومنے کے لیے نکلتے......''

''ہاں...... یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ کیا وہ چلے گئے ہیں؟''

''ہاں...... وہ چلے گئے ہیں۔ ان کا یہاں قیام مختصر تھا۔ پھر وہ واپس چلے گئے۔''

''پھر تم ایبٹ آباد کب جاؤ گے؟''

''جب تم کہو گی۔''

''آج ہی چلے جاؤ...... پھر ریسٹورنٹ کھل جائے گا تو تمہارے لیے جانا مشکل ہو جائے گا۔''

''ٹھیک ہے، میں ناشتے کے بعد چلا جاؤں گا۔''

''میں تمہارے کپڑے پریس کر دیتی ہوں۔''

''تم کیوں کرو گی؟ کام والی لڑکی کہاں ہے؟''

''میں نے اسے بھی چند دنوں کی چھٹی دے دی ہے۔''

''ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی......''

ناشتا کرنے کے بعد صندل نے میر زاد کے کپڑے پریس کر دیے تھے۔ اور دس بجے کے قریب وہ ایبٹ آباد کے لیے چلا گیا تھا۔

صندل ایک عرصے کے بعد گھر کے کام کاج میں مصروف ہو گئی تھی۔ کام کچھ زیادہ نہیں تھے۔ وہ آسانی کے ساتھ سب سنبھال رہی تھی۔ اس نے کچھ کپڑے دھوئے تھے۔ باریشہ کے چند سوٹ استری کر کے رکھے تھے۔ پھر وہ رات کے لیے کھانا بنانے لگی تھی۔ میر زاد کی پسند کا کھانا...... جو اس نے آج اس کے لیے بہت محبت سے بنایا تھا۔

میر زاد کو مٹر والے چاول پسند تھے۔ ساتھ کوفتے کا سالن، رائتہ......اور صندل نے سب آسانی

سے بنالیا تھا۔

کوفتے اس سے اچھے نہیں بنتے تھے لیکن آج کوئی خرابی نہیں ہوئی تھی۔

میرزاد نے کہا تھا کہ وہ سہ پہر تک آجائے گا لیکن اب شام ہونے لگی تھی اور وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ اسے صرف دفتر ہی تو جانا تھا۔ ایک درخواست ہی تو دینا تھی۔ پھر ایبٹ آباد کون سا ٹھنڈیانی سے اتنا دور ہے اور ٹریفک جام ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

شام کے گہرے رنگوں میں نجانے کیسا خوف تھا کہ صندل کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ پتا نہیں کیوں بعض اوقات وہ بہت حساس ہو جایا کرتی تھی۔ اسے فضول میں رونا آنے لگ جاتا تھا۔ بیٹھے بٹھائے چکر آنے لگتے تھے۔

صندل نے بلاوجہ ہی باریشہ سے کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ وہ باریشہ سے زیادہ اپنا دل بہلانا چاہتی تھی۔ شام گہری ہونے لگی تھی جب باہر دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ صندل کی سانس میں سانس آئی تھی۔ جلدی سے اس نے دروازہ کھولا تھا اور پھر برف کی طرح اپنی جگہ پر ہی منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔

دروازے پر بستامی کھڑا تھا۔ جس کے چہرے پر مردنی نظر آرہی تھی۔

''بستامی بابا...... آپ یہاں......''

صندل نے حیرت زدہ کہا تھا اور بستامی نے آگے بڑھ کر ایک زوردار طمانچہ صندل کے منہ پر دے مارا تھا۔

☆......☆......☆

۲۰۰۲ء

لمبی راہداری میں وہ آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ ضامن تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا۔

''باریشہ...... باریشہ بات تو سنو!'' وہ اسے پکار رہا تھا لیکن باریشہ نہیں رک رہی تھی۔ آنسو اس کی آنکھوں میں آتے چلے گئے تھے۔ کتنی آسانی سے اسے بے وقوف بنالیا گیا تھا۔ کیا وہ ہمیشہ سے ہی ایسے بے وقوف رہی تھی...... یا اب ہو چکی تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی آگے بڑھ رہی تھی۔

''باریشہ...... میری بات تو سنو یار!'' ضامن تقریباً بھاگ کر اس تک پہنچا تھا۔ اور اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ باریشہ رک گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ضامن کو اس سے شدید نفرت نہ ہوتی تو یقیناً اس کا دل پگھل جاتا۔

''کیا ہو گیا ہے۔ اتنا غصہ...... بات تو کرو۔''

''تم نے کیوں کیا میرے ساتھ ایسا......؟'' بولتے ہوئے اس کی آواز روہانسی ہو چکی تھی۔ ضامن جواب دینے کے لیے لفظوں کے جوڑ توڑ کرنے لگا تھا۔

''مجھے لگا تھا کہ لڑکی سے بات چیت بڑھانے کا یہ طریقہ بہت کول ہوتا ہے۔'' اس نے بتایا۔

باریشہ اس کی شکل دیکھتی رہ گئی تھی۔

''میں تم سے بات کرنا چاہتا تھا، ملنا چاہتا تھا، تعلق بنانا چاہتا تھا۔ اسی لیے میں نے یہ سب کیا۔ اپنی شرٹ میں اپنا وزٹنگ کارڈ بھی میں نے جان بوجھ کر رکھا تھا۔''

''لیکن کیوں...... کیوں بات کرنا چاہتے تھے مجھ سے...... کیوں ملنا چاہتے تھے؟''

''میں نے تمہاری پیپر ماڈلنگ دیکھی تو تم مجھے اچھی لگی تھیں۔ اس لیے......'' ضامن نے جھوٹ بولا تھا۔ ''تمہارا چہرہ میرے دل کو بھایا تھا۔'' اس نے مزید بتایا۔

اور ضامن سے لاکھ ناراضی سہی...... لیکن اس کی یہ بات باریشہ کو نہال کر گئی تھی۔ اس کا غصہ کم ہونے لگا تھا۔

''تم سیدھے طریقے سے بھی تو مجھ سے بات چیت کر سکتے تھے۔''

''مجھے لگا کہ تم ماڈل ہو، مجھے کہاں منہ لگاؤ گی۔''

''میرا کام ابھی تک میرا نام نہیں بنا سکا ہے۔''اس نے صاف گوئی سے کہہ دیا تھا۔

''پھر بھی...... مجھے تو ایسا ہی لگا۔''ضامن نے تو جھوٹ بولنے کا آج سارا بیڑا ہی اٹھایا ہوا تھا۔

ضامن جتنی اہمیت اسے دے رہا تھا کوئی بھی اور لڑکی ہوتی تو اس کا غصہ ختم ہو جاتا تھا۔اور باریشہ تو اس سے محبت کرتی تھی۔وہ کیسے اس سے مزید ناراض رہ سکتی تھی۔

''اب سوری دو گی یا نہیں......''

''ایک شرط پر......''

''مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔''

''کوئی اور جھوٹ بولا ہے تو ابھی بتا دو...... بعد میں میں معاف نہیں کروں گی۔''

''کوئی جھوٹ نہیں بولا ہوا...... سب سچ بتایا ہوا ہے۔''گلا صاف کرتے ہوئے اس نے پھر سے جھوٹ بولا تھا۔''بس خیام کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔خیام میرا دوست ہے۔بچپن کا دوست...... مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے۔''

''اور مجھے بھی ضامن سب سے زیادہ عزیز ہے۔''خیام کی آواز گونجی تھی۔

دونوں نے پلٹ کر دیکھا تھا۔راہداری کے دوسرے سرے پر خیام کھڑا تھا جس کے چہرے پر مسکراہٹ نمایاں تھی۔

''ویسے ضامن کا تو پتا نہیں...... لیکن میں تمہارا فین ہوں باریشہ......''ان تک پہنچتے ہوئے خیام نے کہا تھا۔''تمہاری ماڈلنگ سے نہیں...... بلکہ تمہارے اس چہرے کا...... جو تم نے موت کا خوف محسوس کرتے ہوئے بنایا تھا۔''

ناچاہتے ہوئے بھی ضامن کے چہرے پر مسکراہٹ نمایاں ہوئی تھی۔

باریشہ نے سخت نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ دونوں دوست مل کر اس کا مذاق بنانے میں مصروف تھے۔

''اب تو مسکرا دو یار!'' ضامن نے التجائیہ کہا تھا۔ باریشہ دُور کہیں دیکھنے لگی تھی۔ اس کا ابھی نخرہ دکھانے کا موڈ تھا۔

''ٹھہرو...... یہ ایسے نہیں مانے گی۔'' خیام آگے کو ہوا تھا اور اس نے اپنی انگلی پستول کی طرح اس کی کنپٹی پر رکھ دی تھی۔ ''چلانا مت...... یہاں ویسے بھی تمہاری چیخ کوئی نہیں سنے گا۔''

باریشہ یک بارگی ہنسنے لگی تھی۔ ضامن اور خیام بھی ہنسنے لگے تھے۔

''تم دونوں بہت خراب ہو۔ بہت زیادہ......'' ہنس کر کہتے ہوئے وہ وہاں سے چلی گئی تھی۔

''شکر ہے لڑکیوں کو گالیاں دینا نہیں آتیں...... ورنہ اس نے آج ہمیں بہت موٹی موٹی گالیاں دینا تھیں۔'' اس کے جانے کے بعد خیام نے تبصرہ کیا تھا۔

☆......☆......☆

سانول کے دن رات بوریت لیے ہوئے تھے۔ ایمن چاہتی تھی کہ وہ لندن چلا جائے۔ وہاں جا کر اپنی تعلیم مکمل کرے۔ ایمن کا خود کا بھی مستقبل میں لندن شفٹ ہو جانے کا ہی ارادہ تھا۔ زندگی کا بہت لمبا عرصہ یہاں ہی گزر چکا تھا۔ اب وہ چاہتی تھی کہ آخری عمر میں رحبانی کو لے کر یہاں سے کہیں دور چلی جائے۔ جہاں کوئی حویلیاں جیسا شہر نہ ہو، کوئی حویلی نہ ہو اور...... کوئی چاند نہ ہو۔ عمر کے اس حصے میں وہ کچھ سکون لینا چاہتی تھی۔ مدت سے ہوتی محبت کی کشمکش نے اسے تھکا دیا تھا۔ ایسے میں سانول کا سہارا ہی لیا جا سکتا تھا۔ ایمن نے سانول سے بات کی تھی اور سانول نے انکار کر دیا تھا۔

''تم لندن کیوں نہیں جانا چاہتے؟''

''مجھے پاکستان پسند ہے۔''

''میں ہمیشہ کے لیے جانے کو نہیں کہہ رہی ہوں۔''

''میں تھوڑے عرصے کے لیے بھی نہیں جا سکتا ہوں۔''

''اس کی کیا وجہ ہے؟'' ایمن نے پوچھا تھا۔

سانول چپ رہا تھا۔

''کیا ایسا باریشہ کی وجہ سے کہہ رہے ہو؟'' ایمن نے کہا تھا۔

جو بیٹے کے دل میں تھا۔ بھلا وہ اس سے چھپا کیسے ہو سکتا تھا۔

''ایسا کچھ نہیں ہے۔'' سانول نے جھوٹ بولا تھا۔

''مجھے نہیں لگتا کہ باریشہ تم میں دلچسپی رکھتی ہے۔ اور نہ ہی مستقبل میں ایسا ہونے کا چانس ہے۔ بہتر ہے کہ تم اپنے دل کو سمجھا لو۔ کیونکہ زبردستی کی حاصل کی گئی محبت زیادہ دکھ دیتی ہے۔'' ایمن نے جیسے اپنا دل کھول کر بیٹے کے آگے رکھ دیا تھا۔

سانول دکھی ماں کو دیکھتا رہ گیا تھا۔ جسے ساری زندگی محبت کا روگ لگا رہا تھا۔ لیکن وہ اپنے دل کو پھر بھی نہیں سمجھا سکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ باریشہ اب چاند پر جا پہنچی ہے۔ جس کا حصول مشکل ہے۔ لیکن اس دل کو سمجھانا اس سے بھی مشکل تر تھا۔ جو دن بدن باریشہ کی محبت میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

وہ باریشہ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا لیکن باریشہ کے پاس اس کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا تھا۔ وہ صبح جلدی چلی جایا کرتی تھی اور رات کو اتنی تھکی ہوئی ہوتی تھی کہ سانول سے بات نہیں کر سکتی تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ اسے مسکرا کر گڈ نائٹ کہہ دیا کرتی تھی۔

''ترجیحات کی بات ہوتی ہے مس باریشہ..... شاید میں تمہاری ترجیح میں کبھی نہیں رہا اور شاید نہ ہی کچھ رہوں۔''

سانول خود کو سمجھانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اس معصوم مرد میں محبت کا وہی جوش ٹھاٹھیں مارنے لگا تھا جو کبھی اس کے باپ میں چاند کو لے کر ابلتا رہتا تھا۔

"لوگ کہتے ہیں کہ میرے باپ کی محبت بہت پر جوش تھی۔ سارا حویلیاں اس کی محبت کو جانتا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ عورت اس کی نہ ہو سکی۔ کہتے ہیں کہ میرے باپ نے اس عورت کو پانے کے لیے بہت کچھ کیا تھا۔ اس کے منگیتر کو غائب کر دیا تھا۔ بہت سے تعویز کروائے تھے۔ لیکن کیا فائدہ ہوا اس سب کا...... وہ عورت تو میرے باپ کو پھر بھی نہ مل سکی۔ بلکہ محبت کے ساتھ ساتھ میرے باپ نے مزید گناہوں کا بوجھ بھی اپنے کندھوں پر ڈال لیا۔ تب ہی وہ وقت سے پہلے ہی بوڑھا ہو گیا ہے۔ اس کے پاس سب کچھ ہے لیکن دکھی نظر آتا ہے۔ اس کی سنکھ کی آواز کبھی مسحور کن نہیں لگی۔ وہ ہمیشہ کانوں کو چبھتی ہوئی ہی محسوس ہوتی ہے۔

اور اب میں کیا لائحہ عمل اپناؤں؟ کیا باریشہ کی محبت کی آگ میں چپ چاپ جلتا رہوں۔ یا انتظار کروں کہ وہ کب میری محبت کی شدت کو محسوس کرے گی اور مجھے چاہنے لگے گی۔ یہ انتظار کتنا طویل ہو گا کون جانتا ہے۔ کہیں میری پوری عمر ہی نہ کھا جائے۔ جیسے میرے باپ کی کھا گیا ہے۔"

سانول نے ڈائری بند کی تھی اور پھر سائیڈ پر رکھ کر خود بیڈ پر لیٹ گیا تھا۔ تکیہ پر سر ٹکا کر وہ چھت کو گھورنے لگا تھا۔ چھت کی سیلنگ میں باریشہ کا چہرہ جگمگ کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

باریشہ اپنی زندگی کے سہانے ترین دنوں سے گزر رہی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ ہر طرف خوشی ہی خوشی ہے۔ چرند پرند جانور سب خوش ہیں۔ کسی کو کوئی غم نہیں ہے۔ اسے درخت ہنستے ہوئے لگتے تھے، پودے مسکراتے ہوئے، پھول محبت کرتے ہوئے۔ وہ تو ان دنوں بے جان چیزوں میں بھی شبیہ دیکھنے لگی تھی۔ سڑک، فٹ پاتھ، اسٹریٹ لیمپ...... اسے لگتا تھا کہ سب اس کے لیے خوب صورت مناظر تخلیق کرنے میں مشغول ہیں۔

ایک چاند نا تو تھیں جو اس کے دل میں نجانے کون کون سے وسوسے ڈال گئی تھیں جو کہ شاید ہمیشہ

سے ہی ان کا کام رہا تھا۔ وہ کسی کو خوش نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ ورنہ پہلے بھی سب ٹھیک جا رہا تھا اور اب بھی سب ٹھیک ہی جانے والا تھا۔ ان دنوں وہ چاند نانو کی باتوں اور کوارٹر میں چلاتی ہوئی بوڑھی عورت کے بارے میں بھولی ہوئی تھی۔

خیام بھی اب روز سیٹ پر آنے لگا تھا۔ چونکہ راز آشکار ہو چکا تھا تو اس لیے اب خیام کو چھپ کر رہنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ضامن نے اسے کہا تھا کہ وہ سیٹ پر آ سکتا ہے لیکن مزید کسی بات میں اپنا تجسس نہیں دکھائے گا۔ خیام کو اب کسی بات میں کوئی تجسس نہیں رہ گیا تھا۔ اسے تو بس باریشہ کا چہرہ دیکھنا ہوتا تھا۔ جواب وہ روز ہی دیکھ سکتا تھا۔ وہ آئے روز باریشہ کے اسکیچ اور پورٹریٹ بنانے لگا تھا۔ وہ اس چہرے کو مختلف اینگل دیتا تھا۔ مختلف روپ دیتا تھا اور ہر روپ اسے پہلے سے بڑھ کر محسوس ہوتا تھا۔ ضامن نے اسے بتا دیا ہوا تھا کہ وہ باریشہ میں دلچسپی نہیں رکھتا ہے لیکن خیام پھر بھی گاہے بگاہے اپنی تسلی کر لیا کرتا تھا۔

”کیا مستقبل میں چانس ہے کہ تو باریشہ کو پسند کرنے لگے؟“

”تو بار بار ایک ہی سوال مختلف طرح سے کر کے جاننا کیا چاہتا ہے؟“

”نہیں......بس ویسے ہی پوچھا تھا۔“

”باریشہ میرے ٹائپ کی لڑکی نہیں ہے۔ میں اسے اپنی زندگی میں شامل نہیں کر سکتا ہوں۔“ ضامن نے کہا تھا۔

خیام کی کسی طور تسلی ہو چکی تھی۔ اس نے بہت سی فلمیں دیکھ رکھی تھیں جس میں دو دوستوں کی دوستی لڑکی کی وجہ سے ختم ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی اور ضامن کی دوستی میں ایسا کچھ نہیں چاہتا تھا۔

شوٹ کے بعد تینوں باہر گھومنے نکل جایا کرتے تھے۔ وہ سڑکوں پر گھومتے تھے۔ تیز ڈرائیونگ کرتے تھے اور بے تکا کھانا کھاتے تھے۔ سنسان جگہوں پر جا کر وہ بلند آوازوں سے چلایا کرتے تھے اور پھر ہاتھوں پر ہاتھ مار کر ہنستے تھے۔

ضامن کو یہ سب پسند نہیں تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس سب کے بعد خیام کا ایک نیا ہی روپ نکل کر آ رہا ہے تو اس نے سب ویسے ہی چلنے دیا جیسا چل رہا تھا۔ خیام ساری زندگی تنہائی پسند رہا تھا۔ وہ کم بولتا تھا، اور اس کی سرگرمیاں محدود تھیں۔ ضامن اب حیران تھا کہ باریشہ کے ساتھ کے بعد ایسا کیا ہوا ہے کہ خیام کے اندر کا بچہ نکل کر باہر آ گیا ہے۔

اس دن تینوں راول ڈیم کے کنارے آئے تھے۔ رات گہری ہو چکی تھی اور سارے میں پانی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ کار میں سے نکل کر تینوں نرم گھاس پر بیٹھ گئے تھے۔ پانی کے دوسری طرف جگمگ کرتے روشن گھر نظر آ رہے تھے جن کی پرچھائیاں پانی پر تیرتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔

باریشہ کتنی دیر اس منظر میں کھوئی رہی تھی......

اور خیام باریشہ میں......

چند لمحوں کے بعد باریشہ کی نظر خیام پر پڑی تھی تو وہ جلدی سے نظریں پھیر گیا تھا۔

"تمہارا دوست اتنا بول کر بھی مجھے بہت چپ چپ لگتا ہے ضامن......" باریشہ نے تبصرہ کیا تھا۔

ضامن سوڈا کین کھول رہا تھا۔ خیام کے بعد باریشہ کو ایک ایک کین پکڑا دینے کے بعد وہ ایک خود پینے لگا تھا۔

"اس سے مسلسل گفتگو نہیں ہو پاتی تھی۔ آج کل یہ خود کو کچھ پرجوش ظاہر کرنے میں لگا ہوا ہے۔ ورنہ یہ ایسا نہیں ہے۔"

"تو پھر یہ کیسا ہے؟"

"بتایا تو ہے کہ تنہائی پسند ہے۔ یہ بس مجھ سے ہی پہروں بات کر سکتا ہے۔" ضامن نے اسے بتایا تھا۔

"کیوں......تم میں ایسا کیا ہے؟" بڑا سا گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے بات کو بڑھانے کی

خاطر پوچھ لیا تھا۔

''ہم دونوں ایک دوسرے کے ہر راز سے واقف جو ہیں۔ یہ جان کاری بھی جھجک دور کر دیتی ہے۔''

''شاید ایسا ہی ہے......'' خیام نے بھی ضامن کی بات کی تائید کی تھی۔

''انسان کے ہر راز سے کوئی بھی واقف نہیں ہوتا ہے ضامن...... کچھ راز ایسے ضرور ہوتے ہیں جو انسان خود تک ہی محدود رکھتا ہے۔ کسی ایک کو بھی اس میں شریک نہیں کرنا چاہتا ہے۔''

باریشہ نے بات برائے بات کی تھی، اور ضامن اور خیام دونوں ہی چپ ہو کر رہ گئے تھے۔

ایسے جیسے باریشہ نے ان کے دل کا چور پکڑ لیا تھا۔

ضامن کے دل کا چور...... جو باریشہ کو برباد کر دینا چاہتا تھا۔

اور خیام کے دل کا چور...... جو باریشہ کو ٹوٹ کر چاہنے لگا تھا۔

''کیوں خیام...... ٹھیک کہہ رہی ہوں نا میں......؟ تم تو بہت کتابیں پڑھتے ہو۔ یہ بات تو جانتے ہی ہو گے۔''

''ہاں...... ٹھیک کہہ رہی ہو تم...... کچھ راز ہوتے ہیں جو انسان کسی سے شیئر نہیں کرنا چاہتا۔''

''پھر آج ہم تینوں اسی راز کو شیئر کرتے ہیں۔'' باریشہ نے کہا تھا۔ دونوں نے ناسمجھی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''ایک گیم ہی سمجھ لو یار...... ایک ایسا راز جو ہم کسی کو بتانا نہیں چاہتے، آج اسے یہاں بتائیں گے۔ ایک دوسرے کے سامنے...... بولو...... کیا کہتے ہو؟'' باریشہ کے لیے سب ایک چیلنج تھا۔ وہ ہنس رہی تھی۔

''ٹھیک ہے......'' دونوں نے سر ہلاتے ہوئے آمادگی دے دی تھی۔

''لیکن ایک شرط ہے۔ جو جتنی بات بتائے گا بس اتنی ہی بات کو کافی سمجھا جائے گا۔ مزید کچھ نہیں پوچھا جائے گا۔ کسی طرح کی کوئی وضاحت نہیں...... کوئی سوال جواب نہیں......''

''ٹھیک ہے، منظور ہے۔'' خیام نے رضامندی دے دی تھی۔

''تم کیا کہتے وہ ضامن......؟''

''اس طرح تو راز مزید گہرا راز بن جائے گا۔''

''تب ہی تو یہ گیم مزا دے گا۔''

''او کے......لیکن پھر شروعات تم سے ہوگی۔ پہلے تمہیں اپنا راز شیئر کرنا ہوگا کیونکہ یہ بات تم نے ہی شروع کی ہے۔'' ضامن نے کہا تھا۔

اور اب جب بات خود پر آئی تو باریشہ کچھ گڑبڑا گئی تھی اور سوچ میں پڑ گئی تھی۔

''بولو......اب چپ کیوں ہو؟'' وہ اسے چڑانے لگا تھا۔

''میں اپنی چاند نانو سے سخت نفرت کرتی ہوں۔''

باریشہ نے ایک دم سے ہی کہہ دیا تھا۔ ضامن نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی بات اور اس کے انداز نے اسے حیران کیا تھا۔

وہ فوراً اسے ''کیوں'' کہنا چاہتا تھا لیکن چونکہ سوال پوچھنے، وضاحت مانگنے کی اجازت نہیں تھی اس لیے وہ خاموش رہا تھا۔

باریشہ کے نفرت زدہ انداز پر ضامن سمیت خیام بھی حیران ہوا تھا۔

''تمہاری باری ضامن......''

''میں کسی کو برباد کر دینا چاہتا ہوں۔ لیکن اس کا نام نہیں بتا سکتا۔'' ضامن نے بھی کہہ دیا تھا۔

خیام نے شدید ترین حیرت سے اپنے دوست کو دیکھا تھا۔

کیا واقعی ضامن نے کچھ ایسا کہا تھا یا اس کے کانوں نے غلط سن لیا تھا۔ وہ کسی کو برباد کر دینا چاہتا تھا۔ لیکن کس کو......؟ اور کیوں......؟ وہ اتنا منفی کب سے ہو گیا تھا؟

مجبوری تھی کہ اسے چپ رہنا تھا۔ خیام کو اس مجبوری نے بہت تکلیف دی تھی۔

اور باریشہ بس تھوک نگل کر رہ گئی تھی۔ ضامن کا لہجہ نفرت لیے ہوئے تھا۔ یقیناً وہ جلد ہی اس شخص کو برباد کر دینے والا تھا۔

''تم بولو اب خیام......'' باریشہ نے چہرے پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کرتے ہوئے خیام سے کہا تھا۔

''مجھے محبت ہو چکی ہے۔'' خیام نے مسکراتے ہوئے بتا دیا تھا۔

ضامن نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ خیام نظریں چرا گیا تھا۔ وہ ضامن کی سرد نظروں کا مطلب جان گیا تھا۔ یہ بات شاید سب سے پہلے خیام کو ضامن کو بتانی چاہیے تھی لیکن اس نے اس بات کو نجانے کیوں راز میں رکھا۔ کیا یہ ایسا راز تھا جو وہ صرف اپنی ذات تک رکھنا چاہتا تھا۔ اس میں ایسا کیا تھا۔ بہت چاہنے کے باوجود بھی ضامن نہیں پوچھ سکتا تھا کہ وہ کون ہے۔

تینوں اپنے اپنے راز بتا کر چپ ہو گئے تھے۔ وہ بات جو ہنسی مذاق کی خاطر شروع کی گئی تھی جب ختم ہوئی تھی تو نجانے کیوں نہ تو ہنسی آئی تھی اور نہ ہی مزا آیا تھا۔

راول ڈیم کے کنارے گھاس پر بیٹھے ہوئے وہ تینوں ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے۔

☆......☆......☆

خیام نے باریشہ کا ایک نیا پورٹریٹ بنا لیا تھا جو کہ اب مکمل طور پر خشک ہو چکا تھا۔ کینوس سے اتار کر اس نے اسے فولڈ کر کے اس پر ایک ربن باندھ دیا تھا تب ہی شائستہ اس کے کمرے میں آئی تھیں۔

''یہ پھول تم نے منگوائے ہیں؟'' ان کے ہاتھوں میں پھولوں کا گلدستہ تھا۔

''جی......''

''جس کے پورٹریٹ بناتے رہتے ہو اس کے لیے؟''

''بتایئے ان پھولوں میں سب سے زیادہ حسین پھول کون سا ہے؟'' اس نے بات بدل دی تھی۔

''سب ہی اچھے ہیں۔لیکن یہ والا زیادہ کھلا ہوا اور پیارا لگ رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے، پھر اسے نکال لیتے ہیں۔''

خیام نے وہ والا پھول نکال لیا تھا۔اور پھر اسے فولڈ کیے ہوئے پورٹریٹ کے اندر ڈال دیا تھا۔ شائستہ اسے یہ سب کرتا ہوا دیکھ رہی تھیں۔

''شاید رات آنے میں دیر ہو جائے۔'' کہتے ہوئے وہ جلدی سے کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ شائستہ مسکرانے لگی تھیں۔

خیام سیٹ پر پہنچا تھا جہاں شوٹ جاری تھا۔خیام سائیڈ پر ہو کر کھڑا ہو گیا تھا کیونکہ سین کے دوران خلل ڈالنے والے کو بری نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

''کیا ہو گیا ہے باریشہ...... ایک چھوٹا سا سین کیوں نہیں ہو پا رہا ہے آج تم سے...... کبھی ڈائیلاگ بھول جاتی اور کبھی مومنٹ......'' ڈائریکٹر باریشہ سے کہہ رہا تھا جو شرمندہ کھڑی تھی۔

''پتا نہیں...... میں کچھ کنفیوز ہو گئی ہوں شاید......''

''پلیز یہ مت کہنا کہ ایسا رومانٹک سین کی وجہ سے ہو رہا ہے۔یہ سین تو تمہارے کہنے پر ہی ایڈ کروایا گیا ہے۔''

وہ چپ رہی تھی۔بے چارہ ہیرولڑ کا بھی کچھ کچھ اکتاہٹ کا شکار نظر آ رہا تھا۔

''پھر سے کریں...... ریڈی ہو؟''

''جی......''

''اوکے...... ٹیک یور پوزیشن......'' ڈائریکٹر نے کہا تھا۔دونوں اپنی اپنی پوزیشن پر آ گئے تھے۔

''لائٹ، کیمرا، ایکشن......''

''تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟''

''پھول ہیں...... تمہیں گلاب کے پھول پسند ہیں نا...... تو تمہارے لیے وہی لایا ہوں۔'' ہیرو لڑکے نے پشت سے چھپایا ہوا پھولوں کا گلدستہ باریشہ کے سامنے کیا تھا۔

''نہیں...... مجھے گلاب پسند ہے۔ گلاب کے پھول نہیں......''

''اچھا...... کیا فرق ہوتا ہے دونوں میں......؟'' وہ مسکراتے ہوئے پوچھنے لگا تھا۔

''گلاب...... گلاب......''

''کٹ......'' ڈائریکٹر چلایا تھا۔ ''تم تو ایسے بات کر رہی ہو جیسے کوئی زبردستی تم سے یہ سب کہلوا رہا ہو۔''

ہیرو لڑکے نے کوفت سے گہرا سانس بھرا تھا۔ دس ری ٹیکو کے بعد وہ کچھ جھنجھلا گیا تھا۔

''مس......! کچھ ریلیکس ہو جائیں تو مجھے بتا دیجیے گا۔ میں کمرے میں آرام کرنے جا رہا ہوں۔ کسی اور لڑکے کو یہاں کھڑا کر کے پریکٹس کروالی جائے۔ میری ہمت جواب دے چکی ہے۔'' طنزیہ انداز میں کہتا ہوا وہ وہاں سے چلا گیا تھا۔

''کوئی لڑکا پریکٹس کے لیے آجائے۔'' اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے آواز لگائی تھی۔ ضامن اس کے پاس آیا تھا۔

''کیا ہوا ہے باریشہ؟ کیا کر رہی ہو آج تم......؟''

''مجھے خود نہیں پتا......'' وہ سچ میں پریشان ہو چکی تھی۔

''تم میرے ساتھ کرو۔ جب تک ٹھیک نہیں ہو جاتا، ہم شوٹ نہیں کریں گے۔''

''ٹھیک ہے......'' کہہ کر وہ پھر سے اپنی پوزیشن پر کھڑی ہو گئی تھی۔

خیام مسکراتے چہرے کے ساتھ باریشہ کی پریشان صورت دیکھ رہا تھا۔ آج وہ باریشہ کو پرپوز

کرنے والا تھا۔نجانے باریشہ مزید کتنا حیران ہونے والی تھی۔ خیام کے دل میں ڈر بھی بیٹھا ہوا تھا کہ کہیں باریشہ اسے انکار ہی نہ کر دے۔ اتنے بہت سے دنوں کی ملاقاتوں سے اس نے اتنا اندازہ تو لگا ہی لیا تھا کہ باریشہ کی زندگی میں کوئی اور نہیں ہے۔

ضامن پشت پر ہاتھ رکھے اس کے پاس آیا تھا۔ باریشہ نے اسے دیکھا تھا۔

''تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟''

''پھول ہیں...... تمہیں گلاب کے پھول پسند ہیں نا...... تو تمہارے لیے وہی لایا ہوں۔'' ضامن نے پشت پر چھپایا ہوا پھولوں کا گلدستہ باریشہ کے سامنے کیا تھا۔

''نہیں...... مجھے گلاب پسند ہے۔ گلاب کے پھول نہیں۔''

''اچھا...... کیا فرق ہوتا ہے دونوں میں......؟'' وہ مسکراتے ہوئے پوچھنے لگا تھا۔

''گلاب کے پھول کے تو بہت سے مقاصد ہوتے ہیں۔ یہ سیج پر سجتا ہے، قبر پر چڑھتا ہے۔ اس سے عیادت کا اظہار ہوتا ہے۔ تعزیت کا، تہنیت کا......'' کچھ ٹہلتے ہوئے وہ شوخی سے بولی تھی۔

''جبکہ ''گلاب'' صرف زندہ لوگوں کو دیا جاتا ہے۔ اس کا صرف ایک ہی مقصد ہے۔''

''کیا......؟'' ضامن نے ڈائیلاگ بولا تھا۔

''اظہارِ محبت......'' ضامن کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے باریشہ نے کہا تھا۔ دونوں چند لمحے تک ساکت و جامد کھڑے رہے تھے۔

''ویری گڈ......!'' ڈائریکٹر نے کہا تھا۔ ''کمال ہو گیا۔ بس ایسے ہی تمہیں دوبارہ کرنا ہے باریشہ......'' اس نے کہا تھا۔

''لنچ ٹائم......!'' اعلان کرنے کے سے انداز میں کہا گیا تھا۔ اور ہر طرف ہلچل شروع ہو گئی تھی۔

خیام اپنی جگہ پر بت بنا کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں باریشہ کا پورٹریٹ تھا۔ جو اس کی مٹھی کی

مضبوط گرفت کی وجہ سے بری طرح سے بھنچا گیا تھا۔ اندر موجود پھول میں لگا کانٹا اس کی انگلی میں چبھ کر درد کرنے لگا تھا۔

لیکن یہ درد بہت کم تھا۔ اس درد سے جو اس کے دل میں اٹھ رہا تھا۔

”اظہارِ محبت......“

باریشہ کے بولے گئے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ وہ جان گیا تھا کہ وہ الفاظ ڈائیلاگ نہیں تھے۔

ضامن کے لیے وہ باریشہ کے دل کی آواز تھی۔



ناول **تاش گھر** ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **15** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 28

''دوریاں'' ڈرامہ نشر کر دیا گیا تھا۔

ایک نئے چینل کا افتتاح ہو چکا تھا اور اس چینل پر بہت سے نئے ڈرامے نشر کیے جا رہے تھے۔ دوریاں ڈرامہ بھی انہی میں سے ایک تھا۔ کومل بیگم کو ڈرامے سے جتنی توقعات تھیں ڈرامہ ان پر پورا نہیں اترا تھا۔ جبکہ سب نے ہی کام بہت محنت اور دل لگا کر کیا تھا۔ شاید ایسا اس لیے ہو رہا تھا کہ چینل نیا تھا اور لوگ نئی چیزوں کو اتنی جلدی قبول نہیں کرتے ہیں۔

ایک دو ہفتے اسی پریشانی میں گزرے تھے۔ سیٹ پر بھی سب کو مایوسی ہونے لگی تھی۔ شوٹ کا اختتامی کام بے دلی سے مکمل کیا جا رہا تھا۔ کاسٹ سمیت باقی سب بھی اپنی دلچسپی ختم کر چکے تھے۔ لیکن تب ہی ایک عجیب بات ہوئی تھی۔ ڈرامہ دیکھتے ہی دیکھتے مقبول ہونے لگا تھا۔ اور ڈرامے سے زیادہ باریشہ کا نام مقبول ہوا تھا۔ لیکن باریشہ کے لیے یہ بات خوش آئند نہیں تھی۔

ڈرامے کی مقبولیت نے باریشہ کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ پہلے پہل تو اسے یقین ہی نہیں آیا تھا کہ یہ کام ہو چکا ہے لیکن خود کو اسکرین پر دیکھ لینے کے بعد بھی وہ خدا سے دعا کرتی رہی تھی کہ کوئی اسے بتا دے کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ حقیقت نہیں ہے۔

اس کا دل چاہا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ کوئی زبردستی اس کے منہ میں زہر ڈال دے اور وہ اللہ کو پیاری ہو جائے۔

لیکن ایسا کچھ نہیں ہونے والا تھا۔ اس کی موت کا وقت ابھی دور تھا۔ اور اسے زندہ رہتے ہوئے یہ سب برداشت کرنا تھا۔

نتاشا اسے مختلف ڈاکٹرز کے پاس لے کر جا رہی تھی۔ لیکن اس کی طبیعت سنبھلنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ اس کے سر میں مسلسل درد رہنے لگا تھا۔ ایسے جیسے بس وہ پھٹ جانے والا ہو۔ اس کا دل کرتا تھا کہ وہ اس جگہ سے، اس شہر سے بہت دور چلی جائے۔ اتنا دور کہ وہاں کوئی اسے پہچاننے والا نہ ہو۔ مہینوں بعد اسے چاند نانو کی یاد آئی تھی۔ اس کا دل کیا تھا کہ وہ چھوٹے سے شہر کی پرانی حویلی جا کر چاند نانو کی گود میں سر رکھے اور ہمیشہ کے لیے سو جائے۔ وہ جب جب ویڈیو کلپ کو دیکھتی تھی اس کا سر چکرانے لگتا تھا اور پورا جسم کانپنے لگتا تھا۔

ویڈیو کلپ......

جو چینجنگ روم میں کیمرا چھپا کر بنایا گیا تھا اور جس میں باریشہ کو کپڑے بدلتے ہوئے دیکھا جا سکتا تھا۔

☆......☆......☆

نجانے وہ کون سا موسم چل رہا تھا۔ برسات تو مہینوں پہلے کی ختم ہو چکی تھی لیکن حبس تھا کہ جانے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اس حبس میں سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ ہر وقت ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی گلا دبا رہا ہو۔ باریشہ تو رات میں ڈر کے مارے اٹھ کر بیٹھ جایا کرتی تھی۔ سائیکاٹرسٹ سے ملنا بھی کچھ زیادہ کارگر ثابت نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی طبیعت میں کچھ زیادہ تبدیلی نہیں آ پا رہی تھی۔

آج ہمت کر کے وہ نہا دھو کر، نئے کپڑے پہن کر کھڑکی کے سامنے آ کر بیٹھ گئی تھی اور باہر اجلے موسم کو دیکھتے ہوئے اپنی زندگی کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔

کیا جو راستے اس نے چن لیے تھے وہ راستے ہی کانٹوں بھرے تھے یا اس کی قسمت خراب تھی جو

کوئی بھی خوشی، کوئی بھی کامیابی اسے راس نہ آتی تھی۔ کیا یہ بھی چاند نانو کی بددعاؤں کا اثر تھا یا ان کی دعاؤں کا......

وہ کافی دیر سوچتی رہی تھی اور کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی تھی۔ ہمیشہ کی کند ذہنیت ان دنوں اس پر بری طرح سے غالب تھی۔

کمرے کے دروازے پر ہونے والی دستک نے اس کے خیالات کا سلسلہ توڑا تھا۔

''اندر آجاؤ......''اس نے کہا۔

دروازہ کھول کر سانول اندر داخل ہوا۔

''کیا بات ہے سانول......؟''اس نے رخ سانول کی طرف کیا۔

''تم نے جو چیک دیا تھا وہ کیش نہیں ہوسکا ہے۔''اس نے چیک باریشہ کو دیتے ہوئے بتایا تھا۔

''کیش نہیں ہوسکا ہے؟ لیکن کیوں......؟''

''پتا نہیں...... کچھ کہہ نہیں سکتا۔''

''ٹھیک ہے میں دیکھتی ہوں کہ کیا وجہ بنی ہے۔''باریشہ نے چیک پکڑ لیا تھا۔

سانول چند لمحے وہاں ہی کھڑا رہا تھا کہ شاید باریشہ کچھ اور بات کرے۔ لیکن باریشہ کو چیک نے کچھ زیادہ ہی پریشان کر دیا تھا۔

سانول کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔

پچھلے کچھ دنوں سے باریشہ کو چاند نانو کا خیال ستانے لگا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ ایک بڑی رقم چاند نانو کو بھجوائے گی۔

نجانے کیوں، کس ہمدردی کے تحت......

اس نے سوچا تھا کہ وہ پیسے چاند نانو کو بھجوا دے گی اور ساتھ ایک پیغام بھی کہ جو پیسے میری پرورش

پر خرچ ہوئے یہ ان کی پہلی قسط ہے۔ یہ جواز اس نے چاندنا نو کے لیے بھی سوچ لیا تھا اور خود کے بدلتے ہوئے مزاج کے متعلق بھی...... وہ چاندنانو کی مدد کرنا چاہتی تھی۔ اس عمر میں چاندنا نو دوائیاں کوٹ کوٹ کر اپنا پیٹ پورا کر رہی تھیں۔ باریشہ کے پیسوں سے ان کی کافی مدد ہو سکتی تھی۔

اس نے ارشادی بابا کو اس بارے میں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ کسی ملازم کے ہاتھ ان تک پیسے بھجوائے گی جو وہ چاندنا نو کو دے دیں۔ اگر چاندنا نو لینے سے انکار کریں تو وہ کسی بھی طرح سے انہیں راضی کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن اب چیک تھا کہ کیش ہی نہیں ہوا تھا۔ باریشہ حیران و پریشان کھڑی تھی کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ اکاؤنٹ میں تو کافی رقم موجود تھی۔

چیک پکڑ کر وہ اپنے کمرے سے باہر آئی تھی۔ لاؤنج میں کومل بیگم بیٹھی کوئی فیشن میگزین دیکھ رہی تھی۔

''میرا چیک کیش نہیں ہو سکا ہے کومل آنٹی......!'' اس نے انہیں بتایا۔

''ہاں...... جانتی ہوں۔'' کومل نے میگزین سے نظریں ہٹائے بنا کہا تھا۔

باریشہ نے حیرت سے کومل کو دیکھا تھا۔ کومل کو اس سب کی خبر کیسے ہو گئی تھی۔ اس نے تو سانول کو بھی کہا تھا وہ یہ کام رازداری سے کرے۔ پھر کومل کیسے یہ سب جانتی تھی؟

''بینک کے مینیجر نے مجھے کال کی تھی۔ تم اتنی بڑی رقم کس کے لیے نکلوا رہی تھیں؟'' کومل کی ساری بات پر باریشہ کو حیرت کے ساتھ ساتھ گھبراہٹ بھی ہوئی تھی۔ جو کام وہ رازداری سے کر رہی تھی، وہ پہلے سے جانتی تھی۔

''چاندنا نو کے لیے......''

''اوہ...... تو یہ بات ہے۔ چاند کی ہمدردی جاگنے لگی ہے تمہارے دل میں......'' اس نے سخت نظروں سے باریشہ کو دیکھا۔

''جی...... کچھ ایسا ہی سمجھ لیں۔''

''میرے پیسے تم چاند کو نہیں بھجوا سکتی ہو باریشہ......''

''آپ کے پیسے......؟ لیکن یہ تو میرے پیسے ہیں۔ جو مجھے میرے کام سے ملے ہیں۔''

''تمہارا کام......؟'' میگزین سائیڈ پر پٹخ کر کومل بیگم کھڑی ہوئی تھی۔ ''تم نے جو بھی کام کیا ہے وہ میری سپورٹ سے کیا ہے۔ میرے بنا تم کچھ بھی نہیں ہو۔ اس لیے تمہاری کمائی پر پہلا اور آخری حق میرا ہے۔ تمہارا ابھی نہیں...... سمجھ گئیں تم......'' کومل نے سخت لہجے میں کہا۔

''لیکن چاندنا تو وہاں اکیلی......''

''وہ سب میں نہیں جانتی ہوں۔ چاند کی اتنی ہی فکر ہے تو اسے چھوڑ کر نہیں آنا تھا۔ اس کے پاس ہی رہ جانا تھا۔''

کومل بیگم نے اسے لاجواب کیا تھا۔

''اور تم نے حیدر کو شوٹ کے لیے انکار کیوں کیا ہے۔ ابھی اس کی کال آئی تھی مجھے......وہ کہہ رہا تھا کہ تم نے شوٹ کے لیے انکار کر دیا ہے۔''

''جی......میں نے انکار کر دیا ہے۔ کیونکہ مجھے کسی شوٹ پر نہیں جانا ہے۔''

''کیوں......؟''

''ویڈیو کلپ آجانے کے بعد مجھ میں کسی کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں رہی ہے۔''

''اف......! میں نے سمجھا کہ پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔'' وہ اس کی عقل پر ماتم کرنے کے سے انداز میں بولی تھی۔

''آپ کے نزدیک یہ عام بات ہے؟ میری انسلٹ ہوئی ہے۔''

''اس ویڈیو کلپ کے آجانے سے تمہیں ہی فائدہ ہوا ہے۔ تمہاری شہرت میں اضافہ ہوا ہے۔ لوگ تمہیں مظلوم سمجھ رہے ہیں۔ وہ تمہارے خلاف نہیں ہیں۔ دیکھو کتنے پراجیکٹ کی آفر آ رہی ہے

تمہیں......نتاشا تو تمہاری ڈیٹس فائنل کر کر کے تھک چکی ہے۔ بے چاری! اگلے چند ماہ تک تمہارے پاس تو سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ہو گی۔"

باریشہ چپ رہی تھی۔ وہ اس بار کومل کی کوئی بات نہیں ماننے والی تھی۔

"ان باتوں کو بھول جاؤ......آگے بڑھو۔"

"فی الحال میرا کوئی کام کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" اس نے قطعیت سے کہا تھا۔ کومل اس کی شکل دیکھنے لگی۔

"مجھے سختی کرنے پر مجبور مت کرو باریشہ......" کومل نے لفظ لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا تھا۔

باریشہ کے چہرے پر حیرت آئی تھی۔ لیکن اس نے بھی اب اس بار اس ساری صورت حال کا ڈراپ سین کرنے کا سوچ لیا تھا۔

"کیا کریں گی آپ......؟" اس نے بدتمیزی سے پوچھا تھا اور کومل نے اگلے ہی پل ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا تھا۔

☆......☆......☆

وقت کی چال میں خم آچکا تھا۔ وہ آگے چلنے کے بجائے پیچھے کو چل رہا تھا یا شاید رک گیا تھا۔ ایک ٹھک ٹھک تھی جو ان دنوں باریشہ کے دماغ میں ہوتی رہتی تھی۔ دستے کے ہاون پر پڑنے کی ٹھک ٹھک......چاند نانو کے دوائی کوٹنے کا شور......وہ دین حویلی میں یہ شور سنا کرتی تھی تو کس قدر جھنجلا جایا کرتی تھی۔ وہ چاند نانو پر بولا کرتی تھی۔ اس کا دل کرتا تھا کہ ہاون دستے کے ساتھ ساتھ چاند نانو کو بھی حویلی سے باہر پھینک دے۔ لیکن وہ ایسا کرنے کے لیے خود کو بے بس محسوس کرتی تھی۔ وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ پھر اس شور سے جان چھڑوانے کے لیے اس کا ذہن عجیب عجیب خیالات گھڑنے لگا۔ ان ہی میں سے ایک یہ بھی خیال تھا کہ وہ حویلی کو چھوڑ کر کہیں دور چلی جائے۔

اسے بستامی بابا ملے اور اس نے ایسا کرنے میں بالکل دیر نہ کی...... چاندنا نو سمیت حویلی کو بھی چھوڑ دیا۔ کیونکہ وہ سکون چاہتی تھی۔ لیکن کہاں جانتی تھی کہ یہاں آ کر مزید کتنی بے سکونی اس کی قسمت میں لکھ دی جائے گی۔

ٹھک ٹھک......

وہ سمجھ رہی تھی کہ یہ لوگ کس قدر اچھے ہیں۔ اس کا اتنا خیال رکھ رہے ہیں۔ اس خیال رکھنے کے پیچھے چھپے ان کے مفاد کو وہ نہیں سمجھ سکی تھی۔ یہ سب ان کی منصوبہ بندی تھی۔ وہ وہاں آنے والی ہر لڑکی کو ایسے ہی شروع میں ہاتھوں ہاتھ لیا کرتے تھے۔ اور پھر بعد میں اپنا تھوک چاٹنے پر مجبور کر دیا کرتے تھے۔

باریشہ کے ساتھ بھی تو انہوں نے ایسا ہی کیا تھا۔ پہلے اسے آسائشوں کی عادت ڈالی تھی اور جب وہ ان کی دی ہوئی آسائشوں میں بری طرح سے ڈوب گئی تھی تو پھر اس کا سانس بند کر دیا گیا تھا۔

اب وہ ان کی اجازت کے بنا سانس بھی نہیں لے سکتی تھی۔ کہاں زندگی کا کوئی اور بڑا فیصلہ......

باریشہ کو سب یاد آ رہا تھا۔ پہلا کام تو اسے پارلر لے کر جانے سے شروع ہوا تھا۔ اس کا لباس تبدیل کیا گیا تھا۔ جدت کے نام پر اسے جسم دکھاتے کپڑے پہنائے گئے تھے۔ پھر اسے موسیقی کی طرف راغب کیا گیا تھا۔ جبکہ اس کا موسیقی سیکھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لیکن یہ کومل بیگم تھی جو اسے اس چیز کے لیے فورس کرتی رہی تھی۔ استاد طافو بلاوجہ اس کی تعریفیں کرتے تھے۔ اس سب نے اسے آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا تھا۔ اب جب وہ حقیقت پسندانہ طور پر اپنا تجزیہ کر رہی تھی تو جان چکی تھی کہ وہ تو کچھ بھی نہیں تھی۔

اسے چند ایک سُر صرف اس لیے سکھائے گئے تھے تاکہ وہ مردوں کے لیے بہترین شو پیس بن سکے۔

پھر ماڈلنگ کی طرف جانے کا سفر شروع ہوا۔ اسے نبیلہ کی اسسٹنٹ لڑکی کی بات یاد آئی تھی۔

"کومل میڈم کی طرف سے ریکوئسٹ آئی تھی کہ اس شوٹ کے لیے تمہیں چانس دیا جائے۔ نبیلہ میم تو تمہارے لیے مان ہی نہیں رہی تھیں۔ تم نے تو پہلے کبھی پرنٹ میڈیا کے لیے کوئی کام ہی نہیں کیا۔

یہ تو تمہاری آنٹی تھیں جنہوں نے نبیلہ میم سے تمہارے لیے اصرار کیا اور اس طرح نبیلہ میم تمہیں شوٹ پر لینے کے لیے راضی ہوئیں۔"

وہ کیوں نہ سمجھ سکی...... کیا وہ آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اندھی ہو چکی تھی؟ دماغ رکھتے ہوئے بھی ماؤف ہو چکی تھی یا پھر اسے انجان بن کر ہواؤں میں اڑنا اچھا لگ رہا تھا۔

وہ چھوٹے شہر سے تھی۔ اس نے زندگی بھر اتنی چکا چوند نہیں دیکھی تھی۔ دیکھی تھی تو اس کا اندھا ہو جانا بنتا تھا۔

بیڈ سے اتر کر وہ آئینے کے پاس گئی تھی۔ اس نے غور سے اپنی شکل دیکھی تھی۔ وہ کچھ ایسی انوکھی نہیں تھی۔ اس میں بس خوب صورتی تھی اور اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ وہ نہ تو موسیقی کے لیے موزوں تھی، نہ ماڈلنگ کے لیے اور نہ اب اداکاری کے لیے...... تب ہی تو اس کا ڈرامہ، کلپ کے آنے سے پہلے تک کچھ زیادہ شہرت نہیں سمیٹ سکا تھا۔ یہ تو کلپ تھا جس نے اسے مشہور کر دیا تھا۔

"میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ یہاں سے چلی جاؤ...... یہ جگہ تمہارے لیے نہیں ہے۔ لیکن تم میری بات کو سمجھی ہی نہیں......" شیزا نے ایک طرح سے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... مجھے تمہاری بات سمجھنے میں کافی دیر لگ گئی۔" وہ اداسی سے بولی۔

"تو اب چلی جاؤ...... اب کون سا دیر ہو چکی ہے؟" سائرہ نے کہا تھا۔

"اب میں ساری کشتیاں جلا چکی ہوں۔" وہ کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح بولی۔

"تمہیں پارلر لے کر جایا گیا۔ تمہاری تراش خراش کی گئی۔ تمہیں سنگیت سکھایا گیا۔ تم سمجھ ہی نہ سکیں کہ یہ لوگ تمہارے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔ یہ تمہیں طوائف بنا رہے تھے۔ نئے معاشرے کی جدید طوائف...... یہاں یہ ہی سب کیا جاتا ہے۔ لڑکیوں کو نکھارا جاتا ہے۔ تاکہ ان کی اچھی قیمت لگ سکے۔ تمہارے ساتھ بھی یہ ہی کیا گیا۔ تم سے ماڈلنگ کروائی گئی جبکہ مجھ سے حقیقت پوچھو تو میں تو تمہیں کسی

رخ سے بھی ماڈل نہیں سمجھتی ہوں۔ تم پیاری ہو...... بہت پیاری ہو...... لیکن تمہارے اندر کچھ پینڈو پن بھی موجود ہے۔ اس سب کے باوجود تمہیں باقی لڑکیوں کی دوڑ میں شریک کیا گیا تاکہ تمہارا اچھا ریٹ مل سکے۔ تم نے اس سب کو ان لوگوں کی کرم نوازی سمجھا۔ جبکہ تم جانتی ہی نہیں کہ جتنا پیسا انہوں نے تم پر لگایا ہے یہ دگنا تم سے وصول کریں گے۔"

شیزا کی صاف گوئی کے آگے باریشہ چپ ہو کر رہ گئی تھی۔

"ہمارا کیا ہے...... ہم تو اسی محلے سے ہیں۔ جہاں کوئی دن کے وقت جانا پسند نہیں کرتا۔ ان ہی بدنام گلیوں میں ہمارے گھر ہیں۔ جہاں سے روشن بیگم تھیں...... ایمن بیگم اور تمہاری کومل آنٹی......"

"لیکن مجھے یہ سب بہت بعد میں پتا چلا شیزا...... چاند نانو نے یہ تو بتایا تھا کہ کومل اور ایمن اچھے خاندانوں سے نہیں تھیں، لیکن یہ کبھی نہیں بتایا تھا کہ یہ بدنام محلوں سے تھیں۔"

"مجھے تو لگتا ہے کہ تم نے جان بوجھ کر انجان بننے کی اداکاری کی ہے۔" سائرہ نے کہا تھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا سائرہ......"

"تمہیں اپنے ہی رشتے داروں کے بارے میں ٹھیک سے نہیں معلوم تھا۔ انسان کی آنکھیں اتنی بند نہیں ہوتیں یا وہ جان بوجھ کر اندھا بننے کی اداکاری کرتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ تم نے جان بوجھ کر آنکھیں بند کی ہوئی تھیں۔ ورنہ کومل بیگم کے کمرے میں کومل بیگم کی اتنی بڑی تصویر لگی ہوئی ہے جس میں وہ مردوں کے ہجوم میں ناچ رہی ہیں اور تم کومل بیگم کے کمرے میں کتنی بار جا چکی ہو۔"

باریشہ نے تھوک نگلا تھا۔ اس نے واقعی ہی میں جان بوجھ کر آنکھیں بند کی ہوئی تھیں۔ ورنہ یہ تو سامنے کی باتیں تھیں۔ دراصل اسے آسائشوں کی اس قدر عادت پڑ چکی تھی کہ وہ ان سب کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے آگے بڑھنا چاہتی تھی۔

"چلو یہ بات بھی چھوڑو...... ہو سکتا ہے کہ تم نے اس طرف توجہ ہی نہ دی ہو۔ لیکن کیا تم دیکھ نہیں

رہی تھیں کہ لڑکیاں کہاں آ رہی ہیں، کہاں جا رہی ہیں۔ یہ کون سا فلاحی ادارہ ہے جہاں لڑکیاں اتنا تیار ہو کر راتوں کو گھر سے باہر جاتی ہیں۔ تمہارے بستامی انکل کے پاس کہاں سے اتنی دولت آ رہی ہے؟''

''شاید میری ہی غلطی ہے۔ اپنی آسائشوں کے پیچھے میں نے جان بوجھ کر ان چیزوں پر توجہ نہیں دی۔''

''یہ گھر، گھر نہیں بلکہ ایک کوٹھا ہے میری جان...... جدید کوٹھا...... اور تمہارے بستامی اور رحبانی بابا اسلام آباد کے مشہور دلال ہیں۔'' شیزا نے سخت لہجہ اپناتے ہوئے اسے بتا دیا تھا۔

اپنے کمرے کی کھڑکی سے کومل یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ اس تک ان تینوں کی آوازیں تو نہیں پہنچ رہی تھیں، لیکن وہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ کیا بات چیت ہو رہی ہو گی۔ اسے اب کوئی پروا نہیں تھی۔ راز کو راز رکھنے کی ضرورت ختم ہو چکی تھی۔ اب باریشہ کو جو مرضی معلوم ہو...... اسے کوئی پروا نہیں تھی۔

''اب میں کیا کروں شیزا......؟''

''اپنی نانو کے پاس واپس چلی جاؤ......''

''انہوں نے مجھے قبول نہ کیا تو......؟''

''وہ تم سے محبت کرتی ہیں۔ وہ تمہیں قبول کر لیں گی۔ لیکن ایک بات تو بتاؤ...... تم نے کسی پیپر پر تو سائن نہیں کیے ہوئے نا......؟'' کچھ خیال آنے پر سائرہ نے پوچھا تھا۔

باریشہ کو یاد آیا تھا کہ اس نے ایسا کیا تھا۔

''ہاں...... کیے ہیں۔''

''اف...... میرے خدایا!'' سائرہ نے ماتھے پر ہاتھ مارا تھا۔ ''کتنی چالاک ہیں یہ کومل میم...... انہوں نے یہ کام بھی کر لیا۔ پھر تمہارا کچھ نہیں ہو سکتا ہے باریشہ...... اب تم کہیں بھی چلی جاؤ...... کومل اور بستامی تمہیں ڈھونڈ لیں گے اور واپس یہاں لے آئیں گے۔''

''لیکن ایسا کیوں......؟''

''کیا سائن کرنے سے پہلے تم نے پیپرز نہیں پڑھے تھے۔ تم انہیں گارجین تسلیم کر چکی ہو۔ ان کی مرضی کے بنا شادی نہیں کر سکتیں۔ کچھ اور کام نہیں کر سکتیں۔ کسی اور گھر میں نہیں رہ سکتیں۔ حتیٰ کہ اپنے پیسے بھی اپنی مرضی سے نہیں خرچ کر سکتیں۔'' شیزا نے بتایا تھا۔

باریشہ اس کی شکل دیکھتی رہ گئی تھی۔

''تم نے اپنے لیے قید پر خود سائن کر دیے ہیں۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ تمہیں وہی کرنا ہوگا جو یہ لوگ چاہیں گے۔''

''اب جلد ہی تمہاری بھی بولی لگے گی۔ تمہیں بھی کسی امیر کبیر شخص کے گھر جانا ہوگا۔ وہاں اس کے ساتھ رات گزارنا ہوگی۔''

''چپ ہو جاؤ پلیز......!'' اس نے تیزی سے کہا تھا۔ شیزا کی بات پر اسے الٹی آنے لگی تھی۔

''میرے چپ ہو جانے سے یہ سب بدل نہیں جائے گا۔ ڈرامہ بنوا کر تمہاری بولی کو بڑھا لیا گیا ہے۔ تمہیں کیا لگتا ہے کہ تمہیں ملک کی کوئی بڑی ہیروئن بنانا ان کا خواب تھا۔ یہ تو انوسٹمنٹ تھی۔''

''کوئی تو حل ہوگا؟'' وہ سخت پریشان ہو چکی تھی۔

''ایک حل ہے...... یہاں سے بھاگ جاؤ...... جتنا دور بھاگ سکتی ہو۔'' سائرہ نے اس سے کہا تھا۔

اور باریشہ سوچ میں گم ہو گئی تھی۔

شاید صرف ایک یہ ہی حل بچا تھا یہاں سے باہر جانے کا......

☆......☆......☆

''یہ...... یہ کیا ہو رہا ہے؟'' سائرہ اور شیزا سے بات کر کے وہ اپنے کمرے میں واپس آئی تھی جب اس نے کمرے میں عجیب وغریب صورت حال دیکھی تھی۔ سامنے کا منظر اسے حیران کر دینے کے لیے کافی تھا۔ نتاشا ایک ملازمہ کے ساتھ وہاں موجود تھی اور اس کے کمرے سے منسلک وارڈ روب

کھولے کھڑی اندر کا سامان باہر نکال رہی تھی۔

''یہ کیا کر رہی ہو تم نتاشا......؟ میری وارڈ روب کے اندر سے کیا تلاش کر رہی ہو تم......؟''

''مجھے کومل میم نے ایسا کرنے کو کہا ہے۔''

''لیکن تم تلاش کیا کر رہی ہو؟''

''کچھ تلاش نہیں کر رہی ہوں۔ کومل میم نے کہا ہے کہ تمہارے کمرے سے ساری قیمتی چیزیں اٹھا لی جائیں۔'' نتاشا نے اسے بتایا تھا۔

باریشہ اس کی شکل دیکھتی رہ گئی تھی۔ اسے نتاشا پر غصہ نہیں آیا تھا۔ وہ تو وہی کام کر رہی تھی جو کومل آنٹی نے اسے کرنے کو کہا تھا۔ وہ یہ سب نہ کرتی تو کوئی اور کر لیتا۔

پھر باریشہ کے دیکھتے ہی دیکھتے سارے زیورات باہر نکال لیے گئے تھے۔ مہنگی جیولری، مہنگے لباس، جوتے، ہینڈ بیگ......سب کچھ وارڈ روب سے باہر نکال لیا گیا تھا۔ کچھ جو تھوڑے بہت پیسے باریشہ کے پاس موجود تھے، نتاشا نے وہ بھی دراز سے نکال کر سامان کے اوپر رکھ دیے تھے۔ آنکھوں میں آنسو لیے باریشہ یہ سب دیکھتی جا رہی تھی۔

''میں نے چند جوڑے وارڈ روب میں ہی رہنے دیے ہیں۔ تمہیں اپنے سامان سے کچھ بھی واپس چاہیے ہو تو تم کومل میم سے کہہ سکتی ہو۔ میں اس سب میں بے بس ہوں۔

نتاشا ملازمہ کے ساتھ وہ سارا سامان لے کر کمرے سے باہر چلی گئی تھی اور باریشہ دھپ سے بیڈ پر بیٹھی تھی۔ کتنے بے رحم لوگ ہو گئے تھے یہ سب لوگ......اپنی اوقات دکھانے میں ان لوگوں نے بالکل بھی وقت ضائع نہیں کیا تھا۔ وہ ہی پاگل تھی جوان کو اپنا سب کچھ مان چکی تھی۔ چاند نانو اسے کتنا سمجھاتی رہی تھیں، لیکن تب اس کی آنکھوں پر دولت کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اور اب...... جب یہ پٹی اتری تھی تو سب کتنا گندا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے خود سے بھی گھن محسوس ہو رہی تھی۔ اچھا ہوا کہ نتاشا سب کچھ لے گئی

تھی۔ ورنہ شاید اب وہ خود بھی ان چیزوں کو استعمال نہ کر سکتی۔ ان سب چیزوں میں حرام چھپا ہوا تھا۔

لیکن اب اسے آگے کیا کرنا تھا؟

وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ اسے یہاں سے جانے کے لیے کچھ کرنا تھا۔ ورنہ یہ لوگ اب اس کے ساتھ کسی بھی طرح کا سلوک کر سکتے تھے۔ یہ تو طے تھا کہ وہ ان کی بات نہیں مان سکتی تھی۔ وہ اپنی عزت نہیں گنوا سکتی تھی۔ اس کی رگوں میں اس کی ماں کا خون تھا۔ وہ کومل بیگم یا روشن بیگم کے خاندان سے نہیں تھی جو وہ سب کرتی جو اس گھر کی باقی لڑکیاں کر رہی تھیں۔ وہ مر کر بھی اپنی عزت پر حرف نہیں آنے دینا چاہتی تھی۔

لیکن شیزا کا کہنا بھی ٹھیک تھا کہ اگر وہ یہاں رہی تو جلد ہی اسے کسی سیٹھ، تاجر یا بزنس مین کے پاس بھجوایا جائے گا۔ جو باریشہ کے ساتھ رات گزارے گا۔ اور اسے پامال کر دے گا۔ یہ سب سوچتے ہوئے ہی باریشہ کا سانس اکھڑنے لگتا تھا۔

آج کل وہ دن رات خود کو ملامت کرنے کے علاوہ یہاں سے بھاگ جانے کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔ پھر ایک دن اس نے فیصلہ کرتے ہوئے ارشادی بابا کو فون کیا تھا۔ اس نے انہیں بتایا تو کچھ نہیں تھا بس اتنا ہی کہ وہ رات کے وقت اپنی دکان میں موجود رہیں۔ وہ رات کے کسی بھی پہر ان تک پہنچ جائے گی۔ اور کچھ پیسے بھی اپنے پاس رکھیں۔ ٹیکسی والے کو کرایہ دینا ہے۔ ارشادی بابا نے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ باریشہ کسی مشکل میں پھنس چکی ہے جو ایسے رات میں ان کے پاس آرہی ہے۔

انہوں نے باریشہ کو "ٹھیک ہے" کہہ دیا تھا۔

اس نے گھر سے بھاگ جانے کے لیے ایک ایسی رات کا انتخاب کیا تھا جب گھر کے افراد کسی فنکشن میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ وہ رات کو دیر سے واپس آئے تھے۔ تھکے ہارے ہونے کے باعث خیال تھا کہ سب کو بیڈ پر گرتے ہی نیند آجائے گی۔ پھر بھی وہ مزید دو گھنٹے انتظار کرنے کے

بعد کمرے سے باہر نکلی تھی۔ ایک لمبی شال کو اس نے خود پر اچھے سے اوڑھ لیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں صرف اس کا موبائل فون تھا اور کچھ پیسے...... جو تلاشی لیتے ہوئے نتاشا کی نظروں سے نجانے کیسے بچ گئے تھے۔ اور اس نے اس گھر سے کچھ نہیں لیا تھا۔ اس نے ہر چیز پر لعنت بھیج دی تھی۔

رات گہری ہو کر خاموش اور تاریک ہو چکی تھی۔ آسمان پر بادل چھائے تھے یا کوئی اور بات تھی۔ چاند کے ساتھ ساتھ ستارے بھی غائب تھے۔ کمرے سے باہر نکل کر وہ راہداری میں آئی تھی۔ رات کے تین بجے کا وقت ہو چکا تھا۔ کمروں میں یقیناً سب سو چکے تھے۔ کیونکہ کسی کمرے کی لائٹ نہیں جل رہی تھی۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ دونوں چوکیدار رات بھر جاگتے رہتے ہیں۔ باریشہ صدر دروازے سے نہیں بھاگنے والی تھی۔ وہ پیچھے والے دروازے سے جانے والی تھی۔ جو پچھلی گلی میں کھلتا تھا۔ وہاں سے باہر نکل کر یقیناً کسی ٹیکسی کے مل جانے کا چانس موجود تھا۔ ورنہ وہ پیدل چلتے ہوئے بڑی سڑک تک تو جا ہی سکتی تھی۔

دائیں بائیں دیکھتے ہوئے وہ پچھلے دروازے تک آئی تھی۔ اسے ڈر لگ رہا تھا لیکن اب یہ سب کرنا بھی ضروری تھا۔ پچھلا گیٹ بند تھا۔ لیکن آہنی سلاخوں سے بنا ہوا وہ دروازہ پھلانگا جا سکتا تھا۔ ہمت سے کام لیتے ہوئے اس نے احتیاط سے دروازے کو اونچائی سے پکڑ کر پہلا قدم اٹھایا تھا۔ اور سلاخوں میں کہیں پیر اڑانے کی کوشش کی تھی۔ وہ کچھ اوپر کو اٹھ گئی تھی۔ دوبارہ سے اسی طرح کرتے ہوئے اس نے مزید اوپر ہاتھ ڈال کر قدم کو مزید اونچا کیا تھا۔ اسے اس کام کی مشق نہیں تھی، لیکن کچھ کام بنا مشق کے بھی کرنا ضروری ہو جاتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ کوئی اسے دیکھ لیتا، وہ جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ ابھی وہ مزید اوپر اٹھ ہی رہی تھی جب گھر کا کتا ٹامی اسے دیکھ کر تیزی سے چلتا ہوا اس تک آیا۔

گھر کے کتوں کو رات کے وقت سیکیورٹی کی وجہ سے کھلا چھوڑ دیا جاتا تھا۔

باریشہ کو ٹامی کو دیکھ کر خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ اس ٹامی کو کوئی بار خود کھانا کھلا چکی تھی۔ ٹامی اس سے مانوس تھا۔ پاس آنے پر باریشہ نے اسے پچکارا تھا۔ لیکن پھر اگلے ہی پل باریشہ کی حیرت کی انتہا نہ

رہی جب ٹامی نے اس پر بھونکنا شروع کر دیا تھا۔ باریشہ اسے چپ ہو جانے کا کہہ کر پچکارتی رہی لیکن ٹامی مزید تیز تیز بھونکنے لگا اور پھر اس نے عجیب حرکت کی......

اوپر کو چھلانگ لگاتے ہوئے اس نے باریشہ کے ٹراوزر کا پائنچہ منہ میں جکڑ لیا۔ باریشہ خوف سے کانپ کر رہ گئی۔ اس کے دونوں ہاتھ دروازے کی آہنی سلاخ کو تھامے ہوئے تھے۔ اور ٹراوزر کا پائنچہ ٹامی کے منہ میں تھا جو اسے مسلسل کھینچ رہا تھا۔ ٹامی کو ٹانگ مارتے ہوئے باریشہ اپنا پائنچہ چھڑوانے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ ٹامی بھی پورا زور لگا رہا تھا اور اس زور آزمائی میں باریشہ زیادہ دیر تک ہمت کا مظاہرہ نہیں کر سکی تھی۔ ٹامی نے زور سے اس کا پائنچہ کھینچا تھا اور تب ہی باریشہ کا توازن بگڑا تھا اور وہ نیچے گھاس پر آ گری تھی۔

وہ زیادہ اونچائی پر سے نہیں گری تھی اور گری بھی نرم گھاس پر ہی تھی۔ لیکن نجانے کیوں اسے ایسا لگنے لگا تھا جیسے اسے کسی پہاڑ کی چوٹی پر سے دھکا دے دیا گیا ہو۔ ٹامی بھونکتا ہی جا رہا تھا اور اس میں اٹھنے کی ہمت نہیں تھی۔ گھاس کی خوشبو مٹی سے مل کر اس کے نتھنوں میں گھس رہی تھی۔ جو اسے کافور کی بو کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔

فاصلے پر اسے کچھ قدموں کی آہٹ سنائی دی تھی۔ باریشہ ویسی ہی لیٹی رہی تھی۔ اس نے نہیں دیکھا تھا کہ کون اس طرف آ رہا ہے۔ پھر قدم اس کے قریب پہنچ کر رکے تھے۔ اور ان میں سے کسی ایک نے ہنسنا شروع کر دیا تھا۔ بنا دیکھے ہی باریشہ جانتی تھی کہ یہ ہنسنے کی آواز کس کی تھی۔ اسے اس آواز سے شدید نفرت محسوس ہوئی تھی۔

باریشہ کی بے وقوفی کا تمسخر اڑاتے ہوئے کومل فتح مندی کے جذبات سے ہنستی چلی جا رہی تھی۔

اور بستامی غصے سے چت پڑی باریشہ کو گھور رہا تھا۔

☆......☆......☆

دھوپ کی کرنیں کھڑکی کے شیشے سے چھن کر اندر داخل ہو رہی تھیں۔ خیام نے اپنے اسٹوڈیو میں قد آدم کھڑکی رکھوائی ہوئی تھی۔ اسے قدرت سے محبت تھی۔ وہ قدرت کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ یہ ہی وجہ تھی کہ اس کی زیادہ تر پینٹنگز قدرتی مناظر پر ہی مشتمل ہوا کرتی تھیں۔ اس نے انسانی چہرہ نہیں بنایا تھا۔ پہلی بار بنایا تھا اور اب اسے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ اسے یہ کام نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اپنے اصول پر کاربند رہنا چاہیے تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس غلطی کی سزا اسے اب ساری زندگی ملنے والی تھی۔

خیام نے اداسی سے اپنے اسٹوڈیو پر ایک نظر ڈالی تھی۔ جو باریشہ کے پورٹریٹ سے بھرا ہوا تھا۔ کسی میں باریشہ مسکرا رہی تھی۔ کسی میں ہنس رہی تھی۔ کسی میں چاند کو دیکھ رہی تھی اور کسی میں دریا کے بہتے پانی کو......

اس نے باریشہ کے چہرے کو اتنی بار پورٹریٹ کر لیا تھا کہ اب یہ چہرہ اسے ازبر ہو چکا تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے بھی باریشہ کا چہرہ کینوس پر اتار سکتا تھا۔ لیکن اب یہ ساری ازبری بے کار ہو چکی تھی۔ باریشہ تو ضامن کو چاہتی تھی۔ وہ ضامن کی محبت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ بھلا ایسے میں پھر خیام کا کیا چانس بنتا تھا۔ اس نے باریشہ سے محبت کرنے سے پہلے بہت بار ضامن سے پوچھا تھا کہ کیا وہ باریشہ سے محبت کرتا ہے؟ ضامن نے انکار کیا تھا۔ اس نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔

لیکن خیام کو باریشہ سے بھی پوچھ لینا چاہیے تھا کہ کیا وہ ضامن سے محبت کرتی ہے؟ اتنے بہت سے دنوں میں خیام کے دل میں یہ خیال پیدا کیوں نہیں ہوا کہ باریشہ بھی تو اس کے دوست کو چاہ سکتی ہے۔ وہ اپنی محبت کو دوستی کے درمیان نہیں لایا تھا۔ لیکن باریشہ جیسے خود سے ان کی دوستی کے درمیان آ گئی تھی۔ اس کی پہلی محبت بنا کسی غلطی کے ادھوری رہ گئی تھی۔

خیام نے شوٹ پر جانا چھوڑ دیا تھا۔ بلکہ پھر شوٹ مکمل ہو جانے کے بعد اس نے ضامن اور باریشہ کے ساتھ کہیں بھی جانا چھوڑ دیا تھا۔ ضامن اسے بارہا اپنے ساتھ چلنے کو کہہ چکا تھا۔ لیکن خیام

مختلف بہانوں سے انکار کر دیتا تھا۔ ضامن کو اس کے بدلے رویے پر حیرت ہوئی تھی، لیکن وہ اس بارے میں خیام سے کچھ پوچھ نہیں سکا تھا۔

”تمہیں معلوم ہے کہ باریشہ تمہیں چاہتی ہے؟“ ایک روز رات کے کھانے کے بعد اس نے ضامن سے کہا تھا۔ شائستہ جلدی سونے کا کہتے ہوئے وہاں سے اٹھ کر چلی گئی تھیں۔

”تمہیں کس نے کہا؟“ ضامن نے چونکنے کی اداکاری کی تھی۔

”میں جانتا ہوں۔ باریشہ کی آنکھوں میں پیار دیکھا ہے میں نے تمہارے لیے......“

”پھر میں کیا کر سکتا ہوں۔ یہ اس کا مسئلہ ہے۔ میرا نہیں......“ ضامن کے لیے یہ جیسے کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ خیام کو ضامن کے اتنے لاپرواہ سے ردعمل کی توقع نہیں تھی۔ لیکن خاموش ہو جانے کے علاوہ بھلا وہ اور کیا کر سکتا تھا۔

پھر ان ہی دنوں باریشہ کا ویڈیو کلپ آ گیا تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے ہر جگہ وائرل ہونے لگا۔

خیام اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اسے اس کلپ کا اتنا ہی دکھ ہوا تھا جتنا شاید باریشہ کو ہوا تھا۔

”یہ کام کس نے کیا ہوگا؟ چینجنگ روم میں کیمرا کس نے چھپایا ہوگا؟“ خیام نے ضامن سے پوچھا تھا۔

”پتا نہیں...... میں تو خود حیران ہوں۔“ چاہنے کے باوجود بھی ضامن حیران ہونے اور اس بات پر دکھی ہونے کی اداکاری نہیں کر سکا تھا۔

”تمہاری پروڈکشن کی بھی تو بدنامی ہے۔ تمہیں اس مجرم کو ڈھونڈنا چاہیے۔“

”پولیس انویسٹی گیشن کر رہی ہے۔“

”تم کیا کر رہے ہو؟“

”میں کیا کر سکتا ہوں؟“ ضامن نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا تھا۔

اور یہ اس کا لاپرواانداز ہی تھا جس نے خیام کو کچھ اور سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسے راول ڈیم کے کنارے ایک دوسرے کو راز بتانے والی رات یاد آ گئی تھی۔ ضامن کا اپنا راز بتانا کہ وہ کسی کو برباد کر دینا چاہتا ہے۔

"کہیں وہ شخصیت باریشہ ہی تو نہیں جس کو ضامن تباہ کر دینا چاہتا ہے۔" خیام نے بہت غور سے ساری صورت حال کا جائزہ لیا تھا۔

ضامن کا پروڈکشن ہاؤس کھولنا، کراچی سے اسلام آباد آ کر کام کرنا، پھر خیام کو اپنے کام سے دور رہنے کا کہنا...... یہ سب کیا تھا؟ ضامن کو تو کبھی میڈیا سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ پھر وہ کیوں اس سب میں الجھ گیا تھا۔

شاید یہ باتیں بھی خیام کا شک یقین میں نہ بدلتیں...... لیکن پھر ایک اور بات ہو گئی۔ جب ضامن نے خیام کو بتایا کہ وہ اپنا پروڈکشن ہاؤس بند کر رہا ہے۔

"ایسا کیوں......؟ تم نے تو بہت جوش میں یہ کام شروع کیا تھا۔"

"میرے خیال سے میں اس کام کے لیے نہیں بنا ہوں۔ بس شوق تھا جو اب پورا ہو چکا ہے۔" ضامن نے بتایا تھا۔ وہ تیزی سے اپنا سامان پیک کر رہا تھا۔ خیام یک ٹک اسے دیکھے گیا۔

"کیا وہ لڑکی باریشہ ہی ہے جسے تم برباد کر دینا چاہتے ہو؟" خیام نے سنجیدگی سے پوچھا۔

کپڑے تہہ کر کے سوٹ کیس میں رکھتے ہوئے ضامن کے ہاتھ رک گئے تھے۔ حیرت سے اس نے خیام کو دیکھا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"تم نے کہا تھا نا کہ تم کسی کو برباد کر دینا چاہتے ہو۔ کیا وہ باریشہ ہے؟"

"ہم نے کہا تھا کہ اس موضوع پر مزید بات نہیں ہوگی۔ یہ طے پایا تھا۔"

"بھاڑ میں گیا، جو طے پایا تھا۔ تم بتاؤ کہ وہ کون ہے جسے تم برباد کر دینا چاہتے ہو؟" خیام نے غصے سے پوچھا تھا۔ ضامن نے گہرا سانس بھرتے ہوئے خود کو نارمل کیا تھا۔

"کوئی نہیں ہے۔ وہ سب میں نے مذاق میں کہا تھا۔" ضامن سرے سے ہی انکاری ہو گیا تھا۔ خیام حیرت سے اسے دیکھنے لگا تھا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ ایسا کوئی نہیں ہے۔" وہ اپنی بات پر قائم رہتے ہوئے بولا تھا۔ خیام چپ ہو گیا تھا۔ کہیں اندر ہی اندر اس نے ضامن کی بات پر یقین کر لیا تھا کہ ایسا کوئی نہیں ہے جسے وہ تباہ کر دینا چاہتا ہو۔ باقی سب اس کے ذہن کی خرافات ہیں۔

لیکن یہ یقین اس وقت ختم ہوا تھا جب اس نے ضامن کو چیئر لفٹ سے باریشہ کو نیچے دھکا دیتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔



کسی جاندار کے مردہ وجود کی مہک تھی جو سارے کوارٹر میں پھیلی ہوئی تھی۔ یا شاید وہ دیمک تھی۔ لیکن دیمک کی تو بو نہیں ہوتی ...... باریشہ نے غور سے اس بو کو محسوس کرنا چاہا تھا۔ جسے وہ کبھی حشرات اور کبھی کسی جاندار کی مردہ باس سے جوڑ رہی تھی۔ اگلے دن جا کر اسے احساس ہوا تھا کہ وہ تو اس کے زخموں کی بو تھی۔ جو اس کی کمر اور رانوں پر بیلٹ کی مار کے بعد پڑ چکے تھے۔ اور جن سے ساری رات خون رستا رہا تھا۔ یہ بو اس کے خون کی بو تھی۔ جو ان لوگوں میں آ کر گندا ہو گیا تھا۔

اتنی مار مارنے کے بعد بھی کومل کا غصہ کہاں کم ہوا تھا۔ وہ اپنے اصلی روپ میں کھل کر باریشہ کے سامنے آئی تھی۔ اس نے ملازموں سے کہہ کر باریشہ کے ہاتھ پاؤں بندھوائے تھے اور پھر سب کے سامنے اس کی کمر پر بیلٹوں سے مارنے لگی تھی۔ باریشہ کی چیخیں سارے گھر میں گونجنے لگی تھیں۔

"تیری اتنی ہمت کہ تو ہمیں دھوکا دے کر جا رہی تھی۔" مارتے ہوئے نفرت سے کومل بیگم نجانے

کیا کیا بولتی جا رہی تھی۔ دائیں بائیں کھڑی ہوئی لڑکیاں ترس بھری نگاہوں سے باریشہ کو دیکھ رہی تھیں۔

''شکل دیکھی ہے اپنی...... تجھے خاک سے آسمان پر پہنچایا اور ہمیں ہی دھوکا دینے چلی ہے۔ جتنا پیسا ہم نے تم پر لگایا ہے نا......اس سے دگنا تم سے وصول کریں گے۔ پھر تمہاری جان چھوڑیں گے۔''

کومل بیگم جانتی تھی کہ لڑکیوں کو کیسے سیدھا کیا جاتا ہے۔ روشن بیگم سے بہت کچھ سیکھا تھا اس نے...... یہ باریشہ کیا چیز تھی اس کے آگے...... کسی لڑکی کی گستاخی جب حد سے بڑھ جاتی تھی تو وہ اسے ایسی ہی مار مارا کرتی تھی اور سب کے سامنے مارا کرتی تھی۔ اس سے دہرے فائدے حاصل ہوجاتے تھے۔ بگڑی لڑکی سدھر جاتی تھی اور اسے دیکھ کر باقی ایسا کرنے کی جسارت ترک کردیتی تھیں۔

اچھی طرح سے اپنا غصہ اتار لینے کے بعد باریشہ کو کوارٹر میں بند کروادیا گیا تھا۔ اسی کوارٹر میں جہاں اس سے پہلے ایک بوڑھی عورت بند تھی۔ وہ بوڑھی عورت تو نجانے کہاں چلی گئی تھی لیکن باریشہ کو لگنے لگا تھا کہ اب وہ یہاں رہتے ہوئے بوڑھی ہوجائے گی۔ اس نے اپنے پیروں پر خود کلہاڑی ماری تھی۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ کسی سے شکوہ نہیں کرسکتی تھی۔ اپنی قسمت کو یہاں پہنچانے والی وہ خود تھی۔ پھر کسی سے کیسا شکوہ کرنا۔

اندھیرے کوارٹر میں بند وہ ہر وقت چاندنانو کو یاد کرتی رہتی تھی۔

کاش! اس نے ان کی باتیں مان لی ہوتیں، اپنی خواہشات کو اپنے اوپر حاوی نہ کیا ہوتا۔ لیکن شاید یہ اس کے جنم کا ستارہ تھا...... کیکڑا...... جو اس پر بری طرح سے اپنے پنجے گاڑھ چکا تھا۔ اور اس نے بھی تو اس سے بچنے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ اسے ایک ایک فرد نے سمجھانا چاہا تھا۔ تنبیہ کرنا چاہی تھی۔ سائرہ نے، شیزا نے، چاندنانو نے...... اور کوارٹر میں بند بوڑھی عورت نے...... جو اس کی ماں کے بارے میں بھی یقیناً بہت کچھ جانتی تھی۔ لیکن یہ تو وہ تھی جو دکھاوے کی زندگی میں اتنی مگن ہوگئی تھی کہ اس نے اس بوڑھی عورت سے ملنے کی بھی دوبارہ کوشش نہیں کی تھی۔

کوارٹر میں رہتے ہوئے اسے آج تیسرا دن تھا۔ تین وقت کا کھانا اسے کوارٹر میں ہی دے دیا جاتا تھا۔ پہلے دن اس نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ وہ سارا دن بھوکی رہی تھی۔ لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ رات ہوتے ہوتے اسے بہت زوروں کی بھوک لگی تھی اور بھوک اس سے برداشت نہیں ہو پا رہی تھی۔ اسے اندازہ ہوا تھا کہ وہ ایک بہت ہی بے ہمت لڑکی ہے۔ اس میں بھوک تک برداشت کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ مجبوراً اس نے کھانا کھا لیا تھا۔ اس اندھیرے کوارٹر میں اس پر اپنی ذات کے اور بھی راز آشکار ہوئے تھے۔

وہ لالچی تھی، جلد باز تھی اور مطلب پرست تھی۔ اس نے جان بوجھ کر آنکھیں بند رکھیں۔ ورنہ سائرہ اور شیزا ٹھیک کہہ رہی تھیں کہ یہ تو سامنے کی باتیں تھیں کہ اگر وہ ذرا سا دھیان سے کام لیتی تو جان جاتی کہ اس گھر میں جو ہو رہا ہے، وہ سب غیر اخلاقی ہے۔

چوتھے دن رات کے وقت دروازہ کھلا تھا۔ باریشہ دیوار سے سر ٹکائے آدھی نیند اور آدھی ہوش میں تھی۔ دروازے کی آہٹ پر اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ یہ کھانا دینے کا وقت نہیں تھا۔ پھر دروازے پر کون تھا؟ باریشہ نے دیکھا کہ وہ سانول تھا۔

''کیسی ہو باریشہ......؟'' اس نے پیار سے پوچھا تھا۔

باریشہ نے نفرت سے منہ پھیر لیا تھا۔

''کیا ہوا ہے تمہیں باریشہ...... مجھ سے ناراض ہو گیا؟'' وہ حیران ہوا تھا۔ اس نے باریشہ سے ملنے کے لیے اپنی ماں کی کتنی ہی تو منت کی تھی۔

''مجھے نہیں اندازہ تھا کہ تم بھی ان جیسے نکلو گے سانول......''

''میں ان جیسا نہیں ہوں...... میں ان سے الگ ہوں......'' اس نے کہا۔

باریشہ کا اس کی بات ماننے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

وہ باریشہ کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔

''یاد کرو...... میں نے ہی تم سے کہا تھا کہ ان کی کوئی بات مت ماننا...... یہاں سے چلی جاؤ...... اپنی نانو کے پاس واپس چلی جاؤ......'' سانول نے کہا تھا۔

باریشہ نے اس کی طرف دیکھا۔ سانول سچ بول رہا تھا۔ اس نے باریشہ سے ایسا ہی کہا تھا۔ واضح نہ سہی لیکن یہاں سے واپس چلے جانے کا اشارہ دیا تھا۔ لیکن سائرہ اور شیزا کی طرح باریشہ نے سانول کی باتوں کو بھی کچھ اہمیت نہیں دی تھی۔

''تم نے میری بات ہی نہیں مانی......''

''تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ یہاں اتنا سب کچھ ہوتا ہے۔''

''تم نے خود کیوں محسوس نہیں کیا باریشہ......؟'' اس نے پوچھا۔

''پتا نہیں...... میں نہیں محسوس کر سکی۔''

''سچ تو یہ ہے کہ میں تمہیں اس سب کے بارے میں بتا بھی دیتا تو پھر بھی تم نے یہاں ہی رہنا تھا۔ کیونکہ تمہارے خوابوں کی تعبیر یہاں ہی تھی۔ اسی گھر میں......'' سانول کہہ رہا تھا اور بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ باریشہ لاجواب ہوئی تھی۔

''اب پھر تم یہاں سے کیوں جانا چاہتی ہو؟ یہ دلدل تمہارا خود کا انتخاب ہے۔ رہو یہاں...... آسائشوں میں...... بس تمہیں ان لوگوں کی کچھ باتیں ہی تو ماننا ہیں۔''

''میں نہیں مان سکتی سانول...... شاید اس لیے کہ میری رگوں میں میری ماں کا خون ہے۔ میں دیر سے ہی سہی، لیکن اس دلدل سے نکلنا چاہتی ہوں......''

''یہاں سے بھاگ کر کہاں جاؤ گی؟''

''شاید واپس حویلیاں...... یا شاید کسی دارالامان میں......''

''واپس پہلے جیسی زندگی گزار لوگی؟''

''ہاں......اب تو گزار ہی لوں گی۔ اتنا کچھ سہنے کے بعد......''

سانول خاموش رہا تھا۔ باریشہ بے چارگی میں اور زیادہ حسین دکھ رہی تھی۔ سانول کا بس چلتا تو وہ ابھی باریشہ سے شادی کر لیتا۔

''میری مدد کرو سانول......اگر تم ان جیسے نہیں ہو تو......''

''بولو......کیا مدد کروں میں تمہاری؟''

''میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے، میں تمہیں یہاں سے بھگانے میں مدد کروں گا۔'' چند لمحے سوچنے کے بعد سانول نے کہا۔

باریشہ نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں......میں تمہاری مدد کروں گا۔ لیکن تمہیں وہی سب کرنا ہوگا جو میں تم سے کرنے کو کہوں گا۔''

''کیا کرنا ہوگا مجھے؟''

''فی الحال جو کومل خالہ نے کہا ہے وہ کرو......تم زیادہ دن اس زندان میں رہیں تو مر جاؤ گی۔ اس لیے جیسا وہ کہہ رہی ہیں ویسا کرو۔''

''وہ مجھے دولت کما کر دینے کو کہہ رہی ہیں۔''

''تو کر لو......وہ تمہیں جہاں بھیجیں چلی جانا......تمہارے ساتھ گارڈ ہوں گے۔ تم وہاں سے کہیں بھاگ نہیں سکو گی۔ لیکن چند دن انتظار کرنا۔ کسی دن تم گھر سے باہر گئیں تو میں گارڈ کے طور پر تمہارے ساتھ چلا جاؤں گا۔ پھر تم وہاں سے کہیں بھی جا سکتی ہو۔'' سانول نے اسے سارا منصوبہ بتا دیا تھا۔

''لیکن میں وہ سب نہیں کرنا چاہتی ہوں جو کومل آنٹی مجھے کرنے کو کہہ رہی ہیں۔''

''چند دن تک تو کر ہی سکتی ہو۔اپنی رہائی کے لیے......''

''ہاں...... چند دن تو کر سکتی ہوں۔''

''مجبوری سمجھ کر کر لو۔'' سانول نے پیار سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبایا تھا۔وہ محبت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔باریشہ کو اس پر خود سے بھی زیادہ یقین تھا۔وہ اسے کسی صورت دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔

''لیکن تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟ میری مدد کیوں کر رہے ہو؟ اپنے گھر والوں کے خلاف کیوں جا رہے ہو؟'' کچھ خیال آنے پر باریشہ نے پوچھا۔

اور سانول نظریں چرا گیا تھا۔

وہ اسے کیا بتاتا کہ وہ اسے چاہتا ہے۔اس لیے وہ اس کے لیے یہ سب کر رہا ہے۔وہ اس سے محبت کرتا ہے۔بہت زیادہ محبت کرتا ہے۔لیکن وہ نہیں کہہ سکتا۔کیونکہ اسے اپنی محبت کا جواب انکار میں ملنے کا ڈر ہے۔

''پھر کسی دن بتاؤں گا۔'' اس نے کہا اور جلدی سے اٹھ کر باہر چلا گیا تھا۔

باریشہ اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی تھی۔

☆......☆......☆

وہ پتھر میں ڈھل چکی کسی مورتی کی طرح ساکت تھی۔اس کے جذبات اور احساسات بھی سنگ میں بدل چکے تھے۔مری کا دلفریب موسم بھی اس کے مزاج پر کوئی خوش گوار اثر نہیں ڈال سکا تھا۔سانول کے کہنے پر اس نے کومل بیگم کی بات مان لی تھی۔وہ شوٹ کے لیے آ گئی تھی۔لیکن اب اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کچھ بھی ایسا کر لے جس پر اسے واپس اسلام آباد نہ جانا پڑے۔

بے شک اس کے لیے یہاں ہی کسی کھائی میں چھلانگ لگا کر اسے مرنا ہی کیوں نہ پڑے۔

اسے کسی نے بتایا تھا کہ یہاں سے ٹھنڈیانی زیادہ دور نہیں ہے۔ اس کا دل چاہا تھا کہ وہ اڑ کر ٹھنڈیانی پہنچ جائے۔ اپنی جائے پیدائش...... وہاں جا کر وہ اپنی ماں اور اپنے باپ کا گھر تلاش کرے۔ وہ جیسا بھی ہو، چھوٹا، بڑا، گندا...... ساری زندگی وہاں ہی گزار دے۔ سب سے چھپ کر، اور شاید خود سے بھی نظریں چرا کر...... لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ جیسا کہ سانول نے کہا تھا دو گارڈ اس کے ساتھ تھے۔ اس جنگل سے بھاگنے کے لیے اب وہ سانول کے کہے کے مطابق چند دن انتظار ہی کر سکتی تھی۔

اللہ کے بعد سانول اس کی آخری امید تھا۔

دوپہر تک وہ بے دلی سے شوٹ میں مصروف رہی تھی۔ تاہم دوپہر کے بعد ضامن کو وہاں دیکھ کر اس کے چہرے پر کچھ خوش گواریت آئی تھی۔ ضامن کو وہاں دیکھ کر اسے کچھ حوصلہ ہوا تھا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو ضامن......؟" وہ پھیکی سی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر بولی۔

"تم سے ملنے آیا ہوں۔ تم گھر پر بھی نہیں مل رہی تھیں، اور میسج کال کا بھی جواب نہیں دے رہی تھیں۔"

"ہاں...... کچھ بزی تھی میں......" اس نے جھوٹ بولا۔

"پھر مجھے پتا چلا کہ آج یہاں تمہارا شوٹ ہو رہا ہے تو میں بھی چلا آیا۔ سوچا اسی بہانے پاکستان کو بھی دیکھ لوں گا۔ ورنہ میں تو اسلام آباد اور کراچی کے درمیان میں پھنسا ہوا ہوں۔"

"خیام کہاں ہیں؟"

"وہ آج کل کچھ عجیب ہو رہا ہے۔ میں نے کہا تھا ساتھ چلنے کو...... لیکن اس نے انکار کر دیا۔" ضامن نے جھوٹ بولا۔

"اچھا کیا تم نے یہاں چلے آئے...... میں کسی دوست سے ملنا چاہ رہی تھی، جس سے میں اپنے دل کی ساری باتیں کر سکوں......"

"لیکن آج تو ساری باتیں مجھے کرنا ہیں۔" اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا تھا۔

''کیا......؟ کون سی باتیں؟''

''یہاں نہیں......چیئر لفٹ پر بیٹھ کر کروں گا۔''

باریشہ نے ناسمجھی سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں نے کبھی لی نہیں......سوچ رہا ہوں کہ یہ تجربہ تمہارے ساتھ کروں۔''

''ہاں......کیوں نہیں......میرا کام ویسے بھی ختم ہو چکا ہے۔بس مجھے ڈریس تبدیل کرنا ہے۔''

اس نے کہا اور پھر ڈریس تبدیل کرنے چلی گئی۔

ضامن اس کا ویٹ کرنے لگا۔اور چیئر لفٹ کو دیکھنے لگا جو بہت اونچائی تک جاتی تھی۔چند لمحوں کے بعد لباس تبدیل کر کے باریشہ باہر آئی۔اس نے چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ سجائی ہوئی تھی۔وہ ضامن کو گمان بھی نہیں ہونے دینا چاہتی تھی کہ ان چند ہی دنوں میں اس کے ساتھ کیا کیا کچھ ہو چکا ہے۔ ورنہ وہ کیا سوچتا کہ اس کے خون کے رشتے کیسے ہیں؟ وہ کس قدر گھٹیا ہیں اور کس طرح کے نیچ کاموں کے ساتھ منسلک ہیں۔

''پہلے کبھی چیئر لفٹ لی ہے؟'' ٹکٹ خرید کر وہ اس تک آیا۔

''نہیں......!''

''ڈر تو نہیں لگے گا؟''

''لگے گا تو آنکھیں بند کر لوں گی۔''

اس کی بات پر ضامن ہنسا تھا۔

پھر دونوں چیئر لفٹ میں سوار ہو گئے تھے۔چند لمحوں کے بعد ہی گہرائی بڑھنے لگی تھی۔زمین نیچے ہی نیچے جانے لگی تھی۔درخت پودے دکھنے لگے تھے اور پہاڑ بہت چھوٹے ٹیلے......

باریشہ نے سختی سے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔اور اپنے آگے والے حفاظتی اسٹینڈ کو مضبوطی سے

پکڑ لیا تھا۔

''یہ سفر کتنا لمبا ہے؟''

''بیس منٹ کا...... گھبراؤ مت...... ابھی تھوڑی دیر کے بعد تمہیں اچھا لگنے لگے گا۔ لیکن اس کے لیے آنکھیں کھولنا شرط ہے۔'' ضامن نے ہنستے ہوئے کہا۔

باریشہ نے کچھ ہمت سے کام لیتے ہوئے آنکھ ذرا سی کھولی تھی اور دائیں بائیں دیکھا۔ پہلے تو اسے ڈر لگا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ نارمل ہونے لگی تھی۔ اونچائی کے خوف سے زیادہ اسے منظر نے مبہوت کر دیا تھا۔ اونچے درخت، پہاڑ...... فضا میں پھیلی چیڑ کے درختوں کی خوشبو...... گہرے سیاہ کوؤں کی چہکار...... اور روشن آسمان...... یہ سب بہت ہی دلکش تھا۔ اس کی اداسی والی مسکراہٹ کھلنے لگی تھی۔ تب ہی یک لخت لفٹ رک گئی تھی۔

''یہ کیا ہوا؟''

''لگتا ہے کہ لائٹ چلی گئی۔ گھبراؤ مت...... تھوڑی دیر میں آجائے گی۔'' کہتے ہوئے ضامن نے حفاظتی اسٹینڈ اوپر اٹھا دیا تھا۔

''ضامن! یہ کیا کر رہے ہو؟'' وہ بری طرح سے ڈر گئی تھی۔

''ڈر کیوں رہی ہو یار...... کچھ نہیں ہوتا۔'' اس نے کہا۔ ''میں ہوں نا تمہارے پاس......'' لیکن حفاظتی اسٹینڈ نہ ہونے پر باریشہ بری طرح سہم گئی تھی اور اپنی سیٹ سے چپک کر بیٹھ گئی تھی۔

''جب تک لائٹ نہیں آتی...... تب تک ہم اپنی باتیں کر لیتے ہیں۔''

اونچائی کے خوف کے غلبے تلے باریشہ سے کچھ بولا نہیں گیا تھا۔

''بعض اوقات ہمیں جن سے جتنی نفرت ہوتی ہے۔ ہمیں ان کو اتنی ہی برتری دینا پڑتی ہے۔ کسی کو اونچائی سے گرانے کے لیے اسے اونچائی پر پہنچانا پڑتا ہے نا......'' ضامن نے کہا تھا۔

باریشہ نے کچھ حیرت سے اس کی طرف دیکھا...... یہ ضامن نے اچانک سے کیسی عجیب باتیں کرنا شروع کر دی تھیں۔

''ہوتا ہے نا ایسا باریشہ......؟''

''شاید......'' وہ بھلا مزید کیا کہتی۔

ضامن کی بات اسے بہت ہی بے موقع محسوس ہوئی تھی۔ اس کا لہجہ بھی کچھ بدلا بدلا محسوس ہوا تھا۔

''تم...... تم کچھ خاص بات کرنا چاہتے ہو ضامن...... جو تمہید باندھ رہے ہو۔''

''پتا نہیں خاص ہے یا نہیں...... اس کا فیصلہ تم کرو گی...... چند ایک راز ہیں جو تمہیں بتا دینا بہتر ہیں۔ تا کہ میرے کراچی جانے سے پہلے تمہارے ذہن میں کوئی سوال موجود نہ رہے۔''

''تم کراچی جا رہے ہو؟'' اپنا دکھ چھپاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''ہاں...... چند دنوں کے لیے...... امی سے ملنا ہے۔''

''کب واپس آؤ گے؟''

''جلد ہی......''

''ٹھیک ہے تم بولو...... کیا بات کرنی ہے تمہیں......؟'' سیٹ پر چپک کر بیٹھی وہ ضامن کی بات غور سے سننے کی کوشش کرنے والی تھی۔

''تم جب پہلی بار کراچی میں گیت گانے آئی تھیں تو تمہاری چائے میں میں نے دوائی ڈلوا دی تھی۔ جس سے تمہارا گلا خراب ہو گیا تھا۔ اور تم وہاں گا نہیں سکی تھیں۔''

ضامن نے بتایا اور باریشہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ کیا واقعی ضامن نے ایسا کہا تھا یا اس کے کانوں نے غلط سن لیا تھا۔

لمحے بھر میں وہ حیرت کا بت بن گئی تھی۔

''ریمپ کے دوران تمہارا ڈریس میری وجہ سے بے ترتیب ہوا تھا۔اس سازش کے پیچھے میں تھا۔'' اس نے مزید بتایا تھا۔

بار یشہ کی آنکھیں پھٹنے پر آ گئی تھیں۔

''شیراز آفندی کے پاس تمہیں میں نے بھیجا تھا۔تا کہ وہ تمہارا فائدہ اٹھا سکے۔اس فارم ہاؤس میں کیمرے لگے ہوئے تھے۔تمہاری نازیبا ویڈیو بنانے کے لیے......تا کہ تمہاری بدنامی کی جا سکے۔'' وہ سامنے پہاڑوں کو دیکھتے ہوئے بولتا جا رہا تھا۔

اور بار یشہ......

اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔کوئی بہت ہی بھیانک خواب......!

''تمہارا ویڈیو کلپ بھی میں نے بنوایا تھا۔تمہاری جگ ہنسائی کے لیے......'' بنا شرمندگی کے اس نے آخری بات بھی بتا دی تھی۔اور بار یشہ کو رازوں کی آشکاری سے زیادہ اس کی ڈھٹائی مار رہی تھی۔ اونچائی کا خوف ختم ہو چکا تھا۔وہ اپنی سیٹ پر بیٹھی ہی ٹوٹ کر بکھر چکی تھی۔

''لیکن کیوں......کیوں ضامن......؟'' وہ رو دینے کو ہی تو تھی۔

''تا کہ تم ٹوٹ جاؤ......بکھر جاؤ......'' اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔''لیکن تم ٹوٹ نہیں رہی تھیں بار یشہ......نجانے کس مٹی کی بنی ہو......تم ٹوٹ ہی تو نہیں رہی تھیں۔کتنا توڑنا چاہا میں نے تمہیں......سوچا تھا اتنی انسلٹ کے بعد تم خودکشی کر لو گی۔اور تمہاری چاندنا تو جیتے جی مر جائیں گی۔لیکن نہیں......ایسا نہیں ہوا۔تم نے زندہ رہنے کو ترجیح دی۔تم پھر سے کیسے کھڑی ہو جاتی تھیں۔اتنی مضبوطی کہاں سے آ گئی تھی تمہارے اندر......ہر بار تم نے مجھے ہرایا بار یشہ......ہر بار......لیکن آج نہیں بار یشہ......آج نہیں......آج تمہیں میر زاد کی موت کا بدلہ دینا ہوگا۔''

''میر زاد......میرا باپ......!''

''ہاں......تمہارا باپ......!اور میری ماں کا اکلوتا بھائی......اس کی موت کے ذمہ دار بہت سے لوگ ہیں۔تمہاری ماں، تمہاری نانو......لیکن اب تمہاری ماں تو مر چکی ہے۔اور چاند نانو کو اس عمر میں مار کر مجھے کیا ملے گا۔انہیں تو روز مرنا چاہیے۔صبح و شام......''

باریشہ حیرت سے بٹر بٹر ضامن کو دیکھ رہی تھی۔

''آج ہر صورت میری جیت ہو گی باریشہ......آج تمہیں ٹوٹنا ہو گا۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔'' ضامن نے کہا تھا اور پھر اگلے ہی پل اسے بازو سے پکڑ کر نیچے دھکا دے دیا تھا۔

اس سے پہلے کہ باریشہ کچھ سمجھ پاتی......بہت دیر ہو چکی تھی۔

ایک چیخ اس کے حلق سے برآمد ہوئی تھی اور پھر کھائیوں میں اس کے وجود کے ساتھ گم ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

۱۹۷۵ء

فضا میں بانس کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ برسات کے حبس زدہ موسم میں اس خوشبو سے دم گھٹ رہا تھا۔ایسے لگتا تھا کہ بانس کی نوکیں ہوا کے دوش پر سوار ہوں۔ چاند کا دل تو ویسے ہی کسی پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔اسے کسی پل قرار نہیں آ رہا تھا۔ساری رات آنکھوں میں گزر چکی تھی۔جس کے باعث اس کا چہرہ پژمردہ نظر آ رہا تھا۔سوچیں اسے تنگ کر رہی تھیں۔وسوسے اسے ڈرا رہے تھے۔

بستامی کیا کرنے گیا تھا ٹھنڈیانی......؟ اس کا کیا کام ٹھنڈیانی میں......؟ وہ تو آج تک کبھی ٹھنڈیانی نہیں گیا تھا۔پھر اب کیا کرنے چلا گیا تھا۔اگر وہ وہاں سیر و تفریح کے لیے جاتا تو کومل کو اپنے ساتھ لے کر جاتا۔چار مرد ملازموں کی موجودگی میں وہ وہاں کیا کر رہا تھا؟

کام کے حوالے سے بھی ٹھنڈیانی نہیں جایا جا سکتا تھا۔حویلی کا کام کبھی ٹھنڈیانی کے بازاروں تک نہیں گیا تھا۔

پھر وہ وہاں کیا کر رہا تھا؟

لگتا ہے کہ رحبانی نے بستامی کو سب کچھ بتا دیا ہے۔اس خبیث نے بتا دیا ہے کہ صندل ٹھنڈیانی میں ہے۔ جبکہ چاند نے رحبانی کی منت بھی کی تھی کہ وہ بستامی کو کچھ نہ بتائے۔ چاند نے حاجی بوا کی سفارش بھی کروائی تھی۔لیکن چالاک لومڑ اپنی شیطان مزاجی سے کہاں باز آسکتا ہے۔ رحبانی نے بستامی کو سب بتا دیا تھا اور اب بستامی ٹھنڈیانی میں تھا۔صندل کے پاس......

نجانے وہ وہاں کیا کرے۔کس انداز میں صندل سے پیش آئے۔

چاند کو یاد آ رہا تھا کہ جب صندل عین شادی والے دن گھر سے بھاگی تھی تو بستامی کس طرح غصے سے پاگل ہو گیا تھا۔وہ تب صندل کو جان سے مار دینا چاہتا تھا۔پھر جب چند دن کے بعد زویا حویلی میں چلی آئی تھی تو تب بھی بستامی کا غصہ دیکھا نہ جاتا تھا۔اسے تب صرف شک ہوا تھا کہ چاند نے صندل کا ساتھ دیا ہے۔یقین ہو جاتا تو نجانے وہ کیا کرتا۔

چاند کو وہ وقت بھی یاد آ رہا تھا جب بستامی نے صندل سے پیپرز پر سائن کروا لیے تھے۔

''مجھے بہت لوگوں نے دھوکا دیا ہے چاند......اس لیے میں اب ہر کام لکھ پڑھ کر کرتا ہوں۔'' اس نے چاند سے کہا تھا۔

''ٹھیک ہے...... میں کر دیتی ہوں۔'' صندل نے رضامندی دے دی تھی۔اور پھر بستامی سے کاغذ پکڑ کر اس پر سائن کر دیے تھے۔

''تمہیں بھی وعدہ دینا ہو گا چاند...... کہ اگر صندل نے اپنے حلف کی پاسداری نہیں کی تو پھر تم اس کی طرف داری نہیں کرو گی۔''

چاند نے تب آمادگی دے دی تھی۔اور اب بھلا چاند صندل کی حمایت کہاں کر سکتی تھی۔نجانے کیا ہونے والا تھا حویلی میں......چاند کا دل چاہ رہا تھا کہ اُڑ کر ٹھنڈیانی پہنچ جائے۔بستامی کی منت کرے کہ وہ صندل کو کچھ نہ کہے۔لیکن چاند کو تو صندل کے گھر کا ہی نہیں معلوم تھا۔اتنے بڑے ٹھنڈیانی میں وہ صندل کا گھر کہاں تلاش کرتی بھلا......

وہ سارا دن چاند نے بے چینی میں گزارا تھا۔ اس کی نماز بھی کچھ عجلت کا شکار رہی تھی اور دعا اس سے مانگی نہیں جا رہی تھی۔ وہ خدا کے حضور ہاتھ اٹھاتی تھی تو لفظ بھول جاتی تھی کہ اسے کیا مانگنا چاہیے۔ نہ اسے بھوک لگ رہی تھی اور نہ اس سے کچھ کھایا پیا جا رہا تھا۔

حویلی میں آہستہ آہستہ سب کو معلوم ہو گیا کہ چاند کو کیا بات کھائے جا رہی ہے۔

''ڈر کیوں رہی ہو چاند...... بستامی غصے کا تیز ہے۔ لیکن صندل کو جان سے تھوڑی نہ مار دے گا۔ گھر کی لڑکی ہے۔ غصہ ہوگا لیکن کس قدر......'' زہرہ پھپھو نے انہیں سمجھایا تھا۔ چاند کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔

''اگر میری بیٹی کو کچھ ہوا تو میں رحبانی کو جان سے مار دوں گی زہرہ پھپھو...... یہ سب اسی کا کیا دھرا ہے۔''

''وسوسے مت پالو...... کچھ نہیں ہوگا۔''

پھر رات کے وقت گھر کے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ سب اپنے اپنے کمروں سے باہر صحن میں آئے تھے۔ تہمینہ، شکیلہ، زہرہ پھپھو، حاجی بوا، زارا، کرن اور روشانے...... رحبانی بھی اوپر کے دلان سے نیچے جھانکنے لگا تھا۔ ملازم نے دروازہ کھولا تھا۔ حسب توقع سامنے بستامی کھڑا تھا۔

''کہاں گئے تھے بستامی......؟ ٹھنڈیانی کیا کرنے گئے تھے تم؟'' چاند نے چھوٹتے ہی پوچھا تھا۔

''صندل کو ڈھونڈنے گیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ چاند ہونق سی بستامی کو دیکھنے لگی۔ ''تم نے نیگ کے بہانے وعدہ لیا تھا نا...... میں تب ہی سمجھ گیا تھا تم صندل کو حویلی میں واپس لانا چاہتی تھیں۔ لو...... میں صندل کو واپس لے آیا ہوں۔'' بستامی نے کہا تھا اور پھر اپنے پیچھے کھڑے چار آدمیوں کے جھرمٹ میں سے صندل کو نکال کر چاند کے سامنے کیا تھا۔

گہری ہوتی رات میں چاند نے صندل کو دیکھا تھا۔ جس کی گود میں باریشہ تھی۔ اس نے ایک سیاہ چادر لی ہوئی تھی اور اس کے وجود سے زیادہ اس کی ذات سیاہ دِکھ رہی تھی۔

اس کی ذات میں کیا عجیب بات تھی کہ چاند والہانہ اس کی طرف بڑھ ہی نہیں سکی تھی۔ اسے گلے

لگا ہی نہیں سکی تھی۔ کس بات نے اس کے قدم روک دیے تھے۔ صندل نے نظریں اٹھا کر اپنی چاند امی کو دیکھا تھا۔ اور چاند کا دل ہوک کر رہ گیا تھا۔

صندل کی آنکھیں صرف آنسوؤں سے ہی نہیں بلکہ بے انتہا دکھ سے بھی بھری ہوئی تھیں۔ دُکھ کی کوئی صورت ہوتی تو یقیناً صندل کی آنکھیں ہوتیں۔ ان میں پانی نہیں، زہر بھرا ہوا تھا۔ ہوا کا ایک جھونکا حویلی میں وارد ہوا تھا جس نے حویلی کی ساری قندیلوں کو بجھا دیا تھا۔ سیاہ رات مزید سیاہ ہوگئی تھی۔

"لیکن گھر لانے سے پہلے اسے پاک کرنا ضروری تھا۔ یہ گھر سے بھاگ گئی تھی نا...... اس لیے ناپاک ہوگئی تھی۔ گھر واپس لانے سے پہلے اس کو پاک کرنا ضروری تھا۔ جیسے بچپن میں کیا گیا تھا۔ یاد ہوگا تمہیں......"

بستامی نے کہا تھا اور پھر صندل کے سر سے سیاہ چادر کو ڈھلکا دیا تھا۔ ساتھ ہی صندل کے آنسو بھی ڈھلکے تھے۔

بے بسی کے آنسو......

بے چارگی کے آنسو......

اپنی بے عزتی کے آنسو......

اور چاند کا دل پھٹنے پر آ گیا تھا۔

"ہائے میرے اللہ!" بے ہوش ہو کر چاند زمین پر گری تھی۔

صندل کے سیاہ بال اس کے سر پر موجود نہ تھے۔ حویلی واپس لانے سے پہلے بستامی نے اسے سر سے گنجا کر دیا تھا۔



ناول **تاش گھر** ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **15** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 29

کہر نے دھرتی پر دھند کی چادر بچھانی شروع کر دی تھی۔ سرسبز ٹھنڈیانی سفید دھند میں گم ہونے لگا تھا۔ ایسے جیسے آج بہت کچھ ہو جانے والا ہو۔ کچھ ہمیشہ کے لیے چھپ جانے والا ہو۔ فضا میں سکوت تھا۔ جیسے کوئی چپ چاپ موت کی نیند سو گیا ہو۔ پرندوں نے بھی تو اپنی چہچہاہٹیں بند کی ہوئی تھیں۔ نجانے کیوں آج فضا سوگوار ہوئی جاتی تھی۔

میرزاد کو ٹھنڈیانی واپس آتے آتے بہت دیر ہو گئی تھی۔ اس نے فون کی درخواست تو بہت جلدی دے دی تھی، لیکن واپسی پر اسے بدترین ٹریفک کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ جس وجہ سے شام گہری ہونے لگی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ صندل کو شام میں اکیلے گھر میں رہنا پسند نہیں ہے۔ وہ بتاتی تو نہیں تھی لیکن وہ اکیلے میں ڈرتی تھی۔ اور یہ سوچ کر، میرزاد ہنس کر رہ جاتا تھا۔ بھلا اپنے گھر میں کون ڈرتا ہے۔ پھر اب تو صندل کے پاس باریشہ بھی تھی۔ اب تو اسے بالکل بھی نہیں ڈرنا چاہیے تھا۔ شاید صندل کی پرورش ہی ایک ایسے ماحول میں ہوئی تھی کہ اسے تنہا رہنے کی عادت نہیں رہی تھی۔ حویلی میں ہر وقت بہت سے افراد موجود رہتے تھے اور یہاں ٹھنڈیانی والے گھر میں صرف وہ دونوں ہوتے تھے۔ ملازم وغیرہ کام سے فارغ ہو جانے کے بعد اپنے اپنے گھروں کو چلے جایا کرتے تھے۔ اتنے بہت سے دنوں میں بھی صندل کو تنہائی کی عادت نہیں ہوئی تھی۔ خیر اب سب جلد ٹھیک ہو جانے والا تھا۔ صندل نے ہی بتایا تھا کہ چاند امی اسے کہتی ہیں کہ وہ بہت جلد حویلیاں میں ہو گی۔ تب تک فون پر بات چیت صندل کا تنہائی کا خوف کم کر سکتی تھی۔۔۔

وہ گھر تک آیا تو گھر کا دروازہ بند نہیں تھا۔ نہ صرف کنڈی نہیں لگی تھی بلکہ دروازے پوری طرح سے کھلے ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر میرزاد کو کچھ حیرت ہوئی تھی۔ صندل اتنی لاپروائی کا مظاہرہ کرنے کی عادی نہیں تھی۔ وہ ان معاملات میں میرزاد سے زیادہ احتیاط سے کام لیا کرتی تھی۔ ٹھنڈیانی کا ماحول پرامن تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ بے احتیاطی کی جائے۔ کھلے دروازے سے میرزاد اندر داخل ہوا تھا۔ سارے گھر میں خاموشی کا راج تھا۔ ایک مردہ خاموشی......

"صندل......صندل......!"

میرزاد نے صندل کو پکارا تھا۔ لیکن صندل کا کوئی جواب سنائی نہیں دیا تھا۔ میرزاد سیڑھیاں چڑھ کر اوپر اپنے کمرے میں گیا تھا۔ صندل وہاں نہیں تھی اور نہ ہی باریشہ اپنے جھولے میں موجود تھی۔ اس کی تشویش بڑھی تھی۔ گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ صندل کمرے میں نہیں تھی اور کچھ چیزیں بے ترتیب بھی تھیں۔ وہ جلدی جلدی سے گھر کے سارے کمرے دیکھنے لگا تھا۔ تمام کمرے خالی تھے۔ صندل کا کہیں کوئی سایہ بھی موجود نہیں تھا۔

عجلت بھرے انداز میں وہ گھر سے باہر نکل آیا تھا۔ اس نے پاس پڑوس سے پوچھا تھا کہ کیا صندل ان کی طرف ہے؟ سب نے انکار میں سر ہلایا تھا۔ بلکہ اتفاقیہ طور پر انہوں نے آج سارا دن صندل کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ گھبراہٹ کے عالم میں میرزاد واپس گھر کو ہوا تھا۔

"صندل! یہ کوئی مذاق ہے تو پلیز، اب بس کرو۔ سامنے آ جاؤ...... مجھے پریشانی ہونے لگی ہے۔" خالی گھر میں میرزاد نے بلند آواز سے کہا۔

لیکن صندل وہاں ہوتی تو اس کے سامنے آتی یا اسے کوئی جواب دیتی۔

"صندل......اب مذاق بس کرو یار......سامنے آؤ......" اس بار اس کی پکار میں پریشانی تھی۔

صندل اس کے ساتھ مذاق کر رہی تھی یہ اس کا خود کو وقتی دلاسا تھا۔ ورنہ وہ تو اندر سے بری طرح

سے پریشان ہو چکا تھا۔ کمرا کمرا دوبارہ دیکھتے ہوئے وہ پھر سے اپنے کمرے میں آیا اور بیڈ کی سائیڈ پر ایک خط پڑا دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسے خطوط کب لکھے جاتے ہیں۔ بیڈ کی سائیڈ پر پڑے ہوئے بے پردہ خطوط سب سے زیادہ جان لیوا ثابت ہوتے ہیں۔ میرزاد نے خط کو پکڑ لیا اور کھول کر پڑھنا شروع کیا۔

پیارے میرزاد!

جس وقت تمہیں یہ خط ملے گا میں تمہاری زندگی سے جا چکی ہوں گی۔ شاید ہمیشہ کے لیے...... تم سے شادی محبت سے زیادہ حکمت عملی کا نتیجہ تھی۔ ان دنوں حویلی کے معاشی حالات بہت خراب تھے۔ قرض پر قرض چڑھتا جا رہا تھا اور تنگ دستی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں چاندامی کے کہنے پر تمہارے قریب ہوئی تھی کیونکہ تمہاری چھان بین سے یہ بات پتا چلی تھی کہ تم کافی رئیس ہو۔ تم سے تعلق داری حویلی کو معاشی بدحالی سے نکال سکتی تھی۔ لیکن سب ویسا نہیں ہوا، جیسا میں نے اور چاندامی نے سوچا تھا۔ ہماری شادی نامساعد حالات میں ہوئی اور پھر ستم یہ کہ زویا آپی نے مجھے قبول نہیں کیا۔

یہ بات بعد میں معلوم ہوئی کہ تمہارے والد کا بزنس زوہیب دیکھتا ہے اور تم پر زویا کی تمہاری پرورش کرنے کا قرض اتنا چڑھ چکا ہے کہ تم اپنا حق طلب کرتے ہوئے بھی جھجکتے ہو۔ مجھے نہیں اندازہ تھا کہ تمہارے ساتھ زندگی اس قدر مشکل ہو جائے گی۔ میں نے انتظار کیا کہ زویا آپی مجھے قبول کر لیں۔ اس طرح تمہارے باپ کا حصہ تمہیں مل سکتا تھا۔ لیکن میرا انتظار رائیگاں گیا۔ اور ادھر ٹھنڈیانی میں بے تحاشا محنت کا بھی یہ ہی صلہ ملا کہ زندگی کچھ سہل ہوئی لیکن پر آسائش نہ ہو سکی۔

چاندامی نے ہی مجھے کہا ہے کہ میں سب کچھ چھوڑ کر حویلی واپس آ جاؤں۔ میں نے کافی دن اس بات پر سوچ بچار کی ہے۔ اور اب میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ میں اب مزید تنگ دستی کی زندگی نہیں جی سکتی ہوں۔ اس لیے میں واپس جا رہی ہوں۔ اس خط کے ساتھ تمہیں خلع کے پیپرز بھی مل جائیں گے۔

وہ دراز میں ہیں۔ان پر سائن کر کے حویلی بھیج دینا۔اور اگر مجھ سے ذرا سی بھی محبت کرتے ہو تو میرے فیصلے کا احترام کرنا...... میرے پیچھے مت آنا۔

صندل۔

میرزاد نے خط پڑھا اور دھپ سے بیڈ پر گر گیا۔یہ کیا لکھ دیا تھا صندل نے...... کیا یہ خط سچ تھا؟ نہیں...... یہ تو مسلسل جھوٹ تھا۔صندل اس سے محبت کرتی تھی اور وہ صندل سے محبت کرتا تھا۔دونوں ایک دوسرے کو خود سے بڑھ کر چاہتے تھے۔پھر صندل نے یہ سب کیا لکھ دیا تھا۔کیوں لکھ دیا تھا اور اب وہ واقعی ہی میں کہاں تھی؟ کیا وہ حویلیاں واپس جا چکی تھی؟ اپنی چاندامی کے پاس؟

ایسا نہیں ہو سکتا۔میرزاد اتنا مورکھ نہیں تھا کہ صندل کی سچی اور بناوٹی محبت میں فرق نہ کر پاتا۔ خط یقیناً کسی نے صندل سے زبردستی لکھوایا ہو گا۔یہ الفاظ صندل کے تھے ہی نہیں......

میرزاد اٹھ کر صندل کی وارڈروب تک گیا تھا۔اس نے دراز کھولا تھا۔جہاں صندل، چاندامی کے خط رکھا کرتی تھی۔میرزاد نے سب سے اوپر والا خط کھول کر پڑھنا شروع کیا تھا اور پھر جیسے جیسے وہ خط کو پڑھتا جا رہا تھا،اس کے چہرے پر چھائی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔چاندامی نے اسے خط میں واپس حویلیاں آجانے کو کہا تھا اور ساتھ میں یہ بھی لکھا تھا کہ وہ میرزاد کا گھر بیچ دے۔اس طرح صندل کے ہاتھ بہت سی رقم آسکتی ہے جو حویلی والوں کے کام آسکتی تھی۔چاندامی نے یہ بھی لکھا تھا کہ وہ اپنا ایک آدمی ٹھنڈیانی بھیج دیں گی۔گھر بک جائے گا اور میرزاد کو اس بات کی خبر بھی نہیں ہو گی۔چاندامی کا کہنا تھا کہ میرزاد نے اسے ویسی آسائشیں نہیں دی ہیں جس کی وہ مستحق تھی۔اس کی وراثت کی منتقلی کا انتظار کرتے کرتے باریشہ نے جنم لے لیا ہے۔بہتر ہے کہ اب صندل کوئی فیصلہ کر لے۔

میرزاد نے دوسرا خط کھولا۔اس میں بھی تقریباً ویسی ہی باتیں لکھی ہوئی تھیں۔خط کے متن سے ظاہر تھا کہ چاندامی صندل کی شادی میرزاد سے کر دینے کے بعد پچھتا رہی ہیں۔دراز میں صندل کے

خطوط موجود نہیں تھے، لیکن جو باتیں چاندامی اپنے خطوط میں لکھ رہی تھیں اس سے یہ ہی ظاہر ہو رہا تھا کہ دونوں ماں بیٹی میں کس نوعیت کی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔

سارے خطوط پڑھ لینے کے بعد بھی میرزاد کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی آنکھوں نے جو پڑھا ہے وہ سب سچ ہے۔ وہ اس سب کو جھوٹ سمجھتا، لیکن جھوٹ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ ے تب ہی گھر کا دروازہ زور زور سے بجنے لگا تھا۔ ایسے کیسے کوئی دروازے کو توڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔

☆......☆......☆

کمرے کی چھت پر لگے جالوں میں کوئی پروانہ اپنی بدقسمتی سے الجھ گیا تھا اور اب مکڑی اس پر تیزی سے جال بنتی جا رہی تھی۔ وہ اپنے شکار کو کسی صورت بھاگنے نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں تیزی تھی۔ جلد پروانہ بے بس ہو جانے والا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب موت نزدیک ہے۔ ہمت کے باوجود بھی وہ مکڑی کے نازک ترین جال میں سے نہیں نکل سکتا تھا۔

جال میں پروانے کو پھنسا ہوا دیکھ کر صندل کی بے قراری بڑھنے لگی تھی۔ نجانے کیوں وہ پروانے کی جگہ پر خود کو پھنسا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ اسے لگنے لگا تھا کہ کوئی بڑی دیوہیکل مکڑی اس پر اپنا جال بن رہی ہو۔ اور وہ لمحہ بہ لمحہ موت کے منہ میں جا رہی ہو۔

موت...... اس کی روح پچھلے کچھ وقت میں اس کا ذائقہ نجانے کتنی بار چکھ چکی تھی۔ جب اس نے میرزاد کے لیے خط لکھا تھا تب...... جب بستامی بابا نے دراز میں چاندامی کے حوالے سے جھوٹے خط رکھے تھے تب...... جب زبردستی گھر کی منتقلی کے پیپرز پر اس کے سائن کروائے گئے تھے تب...... جب اسے بے دردی سے پیٹا گیا تھا تب...... اور جب اس کے سر کے بال اتارے گئے تھے تب...... ان لمحوں میں اس نے بار بار موت کا ذائقہ محسوس کیا تھا اور خدا سے دعا کی تھی کہ اسے واقعی ہی میں موت آ جائے۔ اسے اس زندگی سے نفرت ہو چکی تھی۔

ارشادی بابا نے اس کا ماتھا پڑھتے ہوئے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ وہ ایک بار پھر سے بے ریلش کی جائے گی۔ تب اسے کہاں اندازہ تھا کہ ان کی بات سچ ثابت ہو گی۔ وہ تو انہیں ایک مجہول خیال کیے ہوئے تھے۔ نہیں جانتی تھی کہ ارشادی بابا نے واقعی ہی میں اس کا ماتھا پڑھ لیا تھا۔ انہوں نے اس کا مستقبل دیکھ لیا تھا۔

حاجی بوا کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں کھانے کی طشتری تھی۔ انہوں نے صندل کو بیڈ پر لیٹے ہوئے دیکھا تھا، پھر ان کی نظر صندل کے بنا بالوں والے سر پر گئی تو ان کا دل ہول کر رہ گیا تھا۔ بڑی مشکلوں سے انہوں نے خود کو سنبھالا تھا۔

”کچھ کھانا کھا لو صندل......تم کافی دیر سے بھوکی ہو۔“ انہوں نے کہا۔

صندل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ چھت کو گھورتی جا رہی تھی۔ جہاں مکڑی اب اپنے شکار سے اپنا پیٹ بھرنے میں مصروف تھی۔ حاجی بوا نے کھانے کی طشتری کو ایک طرف رکھا اور پھر صندل کے قریب بیٹھ گئیں۔ انہوں نے صندل کے آنسوؤں کی وہ لکیر صاف کی جو اس کے دائیں بائیں بہہ بہہ کر اب خشک ہو چکی تھی۔ جبکہ وہ جانتی تھیں کہ ان آنسوؤں کو صاف کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ پھر سے نکل آئیں گے۔

”حکیم صاحب چاند کو نیند کی دوا دے گئے ہیں۔ وہ تب سے نیچے سو رہی ہے۔ اس کی حالت بہت خراب تھی۔ حکیم صاحب نے کہا ہے کہ ایسے میں چاند کا سو جانا ہی بہتر ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ نیند سے جاگ جائے تو تم اپنی طرف سے اسے کچھ دلاسا دو......میں ساری زندگی چاند کے ساتھ رہی ہوں۔ اس نے اپنی طبیعت اتنی خراب کبھی نہیں کی۔ التمش کی موت پر بھی نہیں......میں اس کی اس حالت سے ڈر گئی ہوں۔ تم کچھ ہمت سے کام لو بچی......جو ہونا تھا ہو چکا ہے۔ اٹھو اور خود کے ساتھ ساتھ اپنی ماں کو بھی سنبھالو۔“

''میر زاد نے ان سب خطوط کو سچ مان لیا تو کیا ہوگا حاجی بوا؟'' وہ چھت کو گھورتے ہوئے بولی۔

''میں نے ارشادی کو بھیجا ہے وہاں...... فکر مت کرو...... کچھ نہیں ہوگا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''اس نے خلع کے پیپرز پر سائن کر دیے تو......؟''

''وہ ایسا ہر گز نہیں کرے گا۔ محبت کرنے والوں کو لاکھ پیچھے آنے سے روکا جائے، وہ پیچھے آ کر رہتے ہیں۔ وہ جلد ہی حویلی آئے گا۔ تم سے ملنے...... دوسرا ارشادی جاتے ہی میر زاد کو سب کچھ سچ بتا دے گا کہ یہ ساری کارستانی بستامی کی ہے۔''

صندل چپ رہی تھی۔ اس کے آنسو پھر سے جاری ہو گئے تھے۔

''کچھ کھانا کھا لو میری بچی......''

''کیا وہ مجھے اس حالت میں قبول کرے گا؟'' اس نے پوچھا۔ حاجی بوا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

''ہاں...... محبت روح سے ہوتی ہے۔ ظاہری شکل و صورت سے نہیں۔''

''اور اگر اس نے مجھے قبول نہ کیا تو......؟''

''تو میں اس کے پاؤں میں گر کر اسے منا لوں گی۔''

''حکیم صاحب کو بلوا دیجیے حاجی بوا...... ان سے کہیں کہ مجھے بھی نیند کی دوا دے دیں۔ ورنہ میرا دل درد سے پھٹ جائے گا۔'' وہ مسلسل چھت کو گھورتے ہوئے بولی۔ جہاں اب کسی پروانے کا نام و نشان تک باقی نہ رہا تھا۔



''کیا بات ہے، اتنی زور زور سے دروازہ کیوں بجا رہے ہو؟'' دروازہ کھول کر میر زاد نے غصے سے کہا تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ باہر تین بھاری بھر کم مرد کھڑے تھے۔

"واہ! الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے......" ان میں سے ایک نے دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ باقی دو مسکرائے تھے۔ پھر بڑک مارنے کے سے انداز میں وہ میرزاد سے بولا۔ "گھر خالی کر دو جلدی......اپنا جو جو سامان اندر ہے، فوراً اسے نکال لو۔"

"کیوں؟" میرزاد نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیونکہ اب یہ گھر میرا ہے۔"

"یہ کیا بکواس ہے؟"

"یہ تم اپنی بیوی سے پوچھو......" آدمی نے کہا اور جیب سے ایک پیپر نکال کر میرزاد کو دکھایا۔ وہ ایک اسٹامپ پیپر تھا۔ جس پر صندل کے سائن تھے۔ ٹھنڈیانی کا گھر میرزاد نے صندل کے نام لگایا ہوا تھا اور اب صندل وہ گھر ان لوگوں کو بیچ چکی تھی۔

"دیکھ لیے......تمہاری بیوی کے ہی سائن ہیں۔ سارے پیسے لے کر جا چکی ہے وہ......کوئی رقم بقایا نہیں رہتی......چلو اب جلدی سے گھر خالی کر دو۔"

"لیکن......ایسے کیسے......؟ یہ میرا گھر ہے۔"

"اب تمہارا نہیں رہا......چلو بھئی لڑکو......سامان اٹھا کر باہر پھینکو......یہ تو تمیز کی بات ہی نہیں سن رہا ہے۔" آدمی آگے کو ہوا۔ میرزاد نے اس کا راستہ روکا۔

"میں اپنے گھر کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگانے دوں گا۔"

"ایسے ہی ہاتھ نہیں لگانے دو گے۔ میں دیکھتا ہوں کون روکتا ہے مجھے......"

آدمی نے کہا اور راستہ روکے میرزاد کو ایک دھکا دیا۔ بات ہاتھا پائی تک جا پہنچی تھی۔ وہ تین تھے اور میرزاد ایک......تینوں آپس میں گتھم گتھا ہو چکے تھے۔ میرزاد ہی پٹ رہا تھا کیونکہ میرزاد اکیلا ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ میرزاد زمین پر گر گیا اور وہ تینوں اسے ٹھوکریں مارنے لگے۔ میرزاد کے منہ اور سر

سے خون بہنا شروع ہو گیا تھا۔ اس میں اپنا دفاع کرنے کی بھی طاقت نہیں رہی تھی۔ لیکن اس پر بھی وہ سب بس نہیں ہوئے تھے۔ وہ مسلسل میرزاد کو ٹھوکریں مارتے جا رہے تھے۔ جیسا کہ بستامی نے انہیں کرنے کو کہا تھا۔

پھر چند لمحوں کے بعد میرزاد ہر طرح کے درد سے جیسے آزاد ہو گیا۔ اس کے حواس اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ اور اب اسے بالکل بھی درد محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

☆......☆......☆

''زویا...... لے آؤ بھئی ناشتا، دیر ہو رہی ہے۔'' زوہیب نے ٹیبل پر بیٹھے بیٹھے آواز لگائی۔ وہ آفس جانے کے لیے تیار تھا اور سرسری انداز میں اخبار کو دیکھ رہا تھا۔ زویا کو پکارنے کے بعد وہ پھر سے اخبار میں گم ہو گیا تھا اس بات پر توجہ دیے بغیر کہ کچن کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ چند لمحے گزارنے کے بعد اس نے پھر سے زویا کو آواز لگائی۔

''زویا...... کہاں رہ گئی ہو بھئی......؟ ضامن نے بھی اسکول جانا ہے۔ ہم دونوں کو دیر ہو رہی ہے۔''

ضامن بھی اپنے کمرے سے یونیفارم پہنے ہوئے ٹیبل پر آکر بیٹھ گیا تھا۔ کچن کی طرف سے پھر کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ اخبار سائیڈ پر رکھ کر زوہیب کچن کی طرف گیا۔ سامنے کا منظر دیکھ کر وہ سکتے میں آ گیا۔ کچن کے فرش پر زویا بے ترتیبی سے گری ہوئی تھی۔

لندن کی ہوا میں خنکی اس روز کچھ مزید بڑھ گئی تھی۔ مسافر بات کرتے کرتے خاموش ہو جاتے تھے۔ پتے سرسراتے ہوئے ٹھہر جاتے تھے۔ خون کو منجمد کر دینے والی ہوا پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ زوہیب کا تو جیسے سانس بھی جمنے لگا تھا۔

''خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ سب نارمل ہے۔ میں نے انہیں نیند کا انجکشن لگا دیا ہے۔ کوشش کیجیے گا کہ انہیں ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ نیند ان کے اعصاب کے لیے بے حد ضروری ہے۔'' گھر

سے باہر نکلتے وقت ڈاکٹر نے زوہیب کو ہدایت دی تھی۔

''لیکن اسے ہوا کیا ہے؟'' زوہیب زویا کے حوالے سے پریشان تھا۔

''شاید آپ کی بیوی نے کسی بات کا اسٹریس لے لیا ہے۔''

''کس بات کا......؟''

''یہ تو آپ کو وہی بتا سکتی ہیں۔''

ڈاکٹر نے کہا۔ پھر چند لمحے زوہیب کے بولنے کا انتظار کرنے کے بعد وہ باہر کی طرف بڑھ گیا تھا۔ زوہیب پریشانی کی حالت میں کتنے لمحے وہاں ہی کھڑا رہا تھا۔

زویا اعصاب کی مضبوط عورت تھی۔ بخار، نزلے، زکام کو زیادہ اہمیت نہ دیا کرتی تھی۔ اس کی صحت کبھی بھی خراب نہیں رہی تھی۔ وہ ایک چاق و چوبند عورت تھی۔ زوہیب کو حیرت ہو رہی تھی کہ وہ کس بات کا اسٹریس لیتی رہی تھی کہ آج اس کی طبیعت اس قدر خراب ہو گئی تھی کہ وہ بے ہوش ہو کر گر گئی تھی۔ وہ خود کو لعنت ملامت کر رہا تھا کہ اس کے ساتھ رہتے ہوئے اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ کیوں نہیں ہو سکا تھا۔ کیا وہ اچھا شوہر ثابت نہیں ہو پا رہا تھا؟

دوپہر سے شام تک زوہیب زویا کو سوتا ہوا دیکھتا رہا اور اس بات پر سوچ بچار کرتا رہا کہ زویا کو آخر کس بات کی ٹینشن ہو گی۔ اس نے تو اتنے سال اولاد نہ ہونے کی بھی ٹینشن نہیں لی تھی اور ضامن کی پیدائش کے بعد ہی اس نے زوہیب سے کہہ دیا تھا کہ اسے مزید بچے نہیں چاہیئں۔ پھر وہ کیوں بے سکون تھی۔ کیا چل رہا تھا اس کے دماغ میں......؟

اسکول سے واپس آنے کے بعد ضامن، خیام کے گھر میں جا چکا تھا۔ زوہیب نے ہی اسے کہا تھا کہ وہاں چلا جائے۔ زویا کو فی الحال شور سے دور رکھنا تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق ایک بہتر نیند اس کے اعصاب کے لیے ضروری تھی۔

ملگجی شام ہوا کے ساتھ ساتھ شہر پر چھانے لگی تھی جب زویا کی آنکھ کھلی تھی۔ اس نے اپنے پاس بیٹھے زوہیب کو دیکھا اور اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ زویا ساری زندگی ذہنی طور پر اس قدر بیدار رہی تھی کہ وہ یہ بھی بتا سکتی تھی کہ اس کے بے ہوش ہونے کے بعد کیا کیا واقعات ہوئے ہوں گے۔ زویا کو نیند سے جاگتا دیکھ کر زوہیب جلدی سے زویا کے قریب ہوا۔ اس نے اپنی بیوی کو آج تک اتنا کمزور نہیں دیکھا تھا۔ زوہیب نے پیار سے اپنی بیوی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

"کیا ہوا ہے تمہیں مائی ڈیئر...... تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ تم کسی بات پر پریشان ہو۔" زوہیب نے پیار سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے پوچھا۔

زویا نے نظریں چرالیں۔ زوہیب کو تشویش ہوئی۔ کیا کوئی ایسی بات تھی جس سے وہ لاعلم تھا۔

"کیا ہوا ہے تمہیں زویا......؟ مجھے تو بتاؤ...... کیا چل رہا ہے تمہارے دماغ میں آج کل...... مجھے نہیں بتاؤ گی تو کس کو بتاؤ گی؟"

"تمہیں بھی کیسے بتاؤں زوہیب...... جس حوالے سے میں پریشان ہوں وہ تمہارے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا ہے۔"

زویا نے کہا اور زوہیب ساری بات سمجھ گیا۔ شک تو اسے پہلے سے ہی تھا۔ اب یقین ہو چکا تھا۔

"میر زاد......؟" نا چاہتے ہوئے بھی زوہیب کا انداز تیکھا تھا۔ دوسری طرف دیکھتے ہوئے زویا نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ "کیا تم میر زاد سے ملنا چاہتی ہو؟"

"پتا نہیں میں کیا چاہتی ہوں۔ میں اس سے بات نہیں کرنا چاہتی...... اس سے ملنا نہیں چاہتی...... لیکن میں میر کی خیریت سے غافل بھی نہیں رہ سکتی ہوں۔ وہ اکلوتا بھائی ہے میرا۔"

"لیکن تم نے خود اس کے لیے خط چھوڑا تھا کہ وہ تم سے رابطہ کرنے کی کوشش نہ کرے۔"

"لیکن میں تو کوشش کر سکتی ہوں نا زوہیب...... اگر تم میرا ساتھ دو تو......" زویا اٹھ کر بیڈ پر بیٹھ

گئی۔ وہ جانتی تھی کہ اس نے اپنے حساس شوہر کے دل میں اپنے لیے ہمدردی کیسے پیدا کرنی ہے۔

"تمہاری صحت سے بڑھ کر میرے لیے اور کچھ نہیں ہے۔ تم میر زاد سے ملنا چاہتی ہو تو مل لو...... اس سے بات کرنا چاہتی ہو تو کر لو...... مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"مجھے تمہاری ناراضی کا ڈر ہے زوہیب...... میں سمجھ سکتی ہوں کہ تمہیں میر زاد سے شکوے ہیں۔ لیکن تم مجھے بھی سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں بہن ہوں اس کی...... اس سے غافل نہیں رہ سکتی ہوں۔"

"میں تم سے کبھی ناراض نہیں ہوں گا۔" زوہیب نے پیار سے بیوی کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

"اور میں اس بات کا نہ تو امی کو پتا چلنے دوں گا اور نہ ہی تانیہ کو......" زوہیب کی بات پر زویا مسکرائی۔ اور اس کی ساری ٹینشن جیسے دُور ہو گئی تھی۔

میر زاد کو ڈھونڈنا فی الحال کچھ مشکل نظر آ رہا تھا۔ لندن میں بیٹھ کر زویا یہ کام نہیں کر سکتی تھی۔ جو خط اس نے کراچی والے گھر میں میر زاد کے لیے چھوڑا تھا، اگر تو وہ میر نے پڑھ لیا تو پھر میر کو ڈھونڈنا ناممکن تھا۔ زویا نے یہ ہی کنفرم کرنے کے لیے اپنے کراچی والے گھر میں فون کیا۔

"کیا میرا بھائی میر زاد وہاں آیا تھا؟"

"جی...... آپ کا بھائی اپنی بیوی اور بچی کے ساتھ آیا تھا۔ میں نے اسے آپ کا خط دے دیا تھا۔" آدمی نے بتایا۔

زویا کو بیک وقت خوشی اور دکھ ایک ساتھ لاحق ہوئے تھے۔ خوشی اس بات کی کہ میر کے گھر بیٹی نے جنم لیا تھا اور دکھ اس بات کا کہ وہ زویا کا تلخ خط پڑھ چکا تھا۔

"کیا وہ دوبارہ آئے؟" اس نے ایک آس میں پوچھا تھا۔

"نہیں...... دوبارہ تو نہیں آئے۔ لیکن آپ کے نام ایک خط چھوڑ گئے ہیں۔"

"وہ خط مجھے بھیج دیں۔ فوراً...... میں آپ کو ایڈریس لکھواتی ہوں۔"

زویا نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ یہ جانے بنا کہ خط میں کیا لکھا ہوگا۔ شاید خط میں میر نے بھی زویا ہی کی طرح کی زبان استعمال کی ہو اور زویا کے لیے لکھ دیا ہو کہ اب وہ بھی اس کے لیے مر چکا ہے اور وہ بھی اسے تلاش کرنے کی کوشش نہ کرے۔ لیکن زویا کو ایک موہوم سی امید تھی کہ اس کا بھائی اس سے مختلف ہے۔ وہ زویا کی طرح نہیں سوچتا تھا اور نہ ہی اس کی طرح سخت دلی سے فیصلے کرتا تھا۔

چند دنوں کے بے صبرے انتظار کے بعد زویا کو میر زاد کا خط مل گیا تھا۔ جسے اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ کھولا۔

پیاری آپی!

میں جانتا ہوں کہ آپ کے لیے باتیں بھول جانا مشکل ہوتا ہے۔ آپ کی طبیعت میں انا پرستی اور کینہ پروری موجود ہے۔ لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میں آپ کے لیے سب سے بڑھ کر ہوں۔ آپ نے خط میں لکھا ہے کہ میں دوبارہ آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش نہ کروں۔ لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ کسی نہ کسی روز آپ کو ہی میرا رابطہ سب سے بڑھ کر چاہیے ہوگا۔ تب میں نہیں چاہوں گا کہ بدلے میں آپ کو بھی ویسا ہی سخت خط پڑھنے کو ملے جیسا آپ میرے لیے چھوڑ کر گئی ہیں۔ میں چاہوں گا کہ آپ جب بھی مجھ سے ملنا چاہیں، میں آپ کو فوراً سے مل جاؤں۔

اس خط کے ساتھ اپنا ایڈریس لکھ رہا ہوں۔ یہ خط آپ کو تب ہی ملے گا جب آپ کو یہ چاہیے ہوگا۔

آپ کا منتظر...... میر زاد۔

زویا نے خط کے پیچھے لکھا ایڈریس پڑھا تھا اور پھر خوشی سے چلانے لگی۔

"پاکستان کی ٹکٹ بک کرواؤ زوہیب...... مجھے ٹھنڈیانی جانا ہے۔ میر زاد اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ ٹھنڈیانی میں ہے۔ میں جلد سے جلد وہاں جانا چاہتی ہوں۔"

☆......☆......☆

کوئلوں کی ڈار سیب کے باغ سے اڑ کر دور چلی گئی تھی کیونکہ باغ میں گدھ بسیرا کر چکے تھے۔ جو شکار کو کھانے سے زیادہ نوچتے ہیں۔ اسے اذیت پہنچاتے ہیں تا کہ وہ اپنی موت آپ مر جائے۔

''صندل کہاں ہے؟''

''وہ اپنے کمرے میں نہیں ہے۔''

''کہاں چلی گئی ہے وہ...... تلاش کریں اسے......''

حویلی کے صحن سے آوازیں اوپر چھت تک سنائی دے رہی تھیں۔ جہاں صندل مطمئن ہو کر بیٹھی تھی۔ آج کوئی اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس نے سیڑھیوں کا دروازہ بند کر لیا تھا۔

نیچے سیب کے باغ میں سے سیبوں کی خوشبو اوپر چھت تک آ رہی تھی۔ صندل کے بچپن کا بہت سا حصہ اسی باغ میں گزرا تھا۔ پھر جب وہ میرزاد کے ساتھ اس حویلی سے گئی تو اسی باغ میں اتری تھی۔ اور آج وہ اپنی ہستی کو اسی باغ میں ختم کر دینا چاہتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں خلع کے پیپرز تھے۔ میرزاد نے ان پیپرز پر سائن کر دیے تھے۔ ارشادی بابا نے بتایا تھا کہ وہ گھر چھوڑ کر جا چکا ہے۔ شاید وہ لندن چلا گیا ہے۔ اپنی بہن کے پاس...... کیوں کہ پاس پڑوس نے انہیں یہی بتایا تھا۔

''صندل! دروازہ کھولو......'' کسی کو شاید معلوم ہو چکا تھا کہ صندل چھت پر ہے۔ اور اب وہ چھت پر آ گیا تھا۔

دور افق پر کوئی تارا ٹوٹ کر گرا تھا۔ گم ہونے سے پہلے اس کی روشنی میں لمحاتی تیزی تھی۔ پھر وہ جیسے کسی اندھے کنویں میں گر گیا تھا۔ صندل بھی اپنے لیے ایسا ہی کوئی اندھا کنواں چاہتی تھی۔ جہاں وہ ہمیشہ کے لیے غرق ہو جائے۔ خلع کے پیپرز اس کی سانسیں بند کر رہے تھے۔

''تو یہ اہمیت تھی اس کی محبت کی......؟ وہ اتنے سال اس کے ساتھ رہی اور اس نے ایک خط پر یقین کر لیا اور خلع کے پیپرز پر سائن کر دیے۔ وہ ایک بار تو حویلی آتا۔ اس سے پوچھتا کہ کیا بات ہوئی

ہے۔ وہ ہر طرح کی غلطی کی تلافی کرنے کے لیے تیار ہے۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ کیا وہ اس تعلق سے تھک چکا تھا؟ اسے صندل کے لیے اپنی بہن کو چھوڑ دینے کا دکھ تھا۔ جس کا اظہار وہ اکثر کر چکا تھا۔ تب صندل کو گمان تک نہیں ہوا تھا کہ یہ دکھ اس قدر زیادہ ہے کہ اسے صندل سے شادی پر ہی پچھتاوا ہونے لگا ہے۔ شاید یہ صندل کی خوش فہمی تھی۔ میرزاد کو جیسے ہی موقع ملا اس نے فوراً اس کا فائدہ اٹھالیا۔

"صندل! دروازہ کھولو...... تم چھت پر کیا کر رہی ہو؟"

سیڑھیوں کا دروازہ بجایا گیا تھا۔ صندل دروازہ کھولنے کے لیے نہیں اٹھی۔ اور افق کی دھاروں کو دیکھنے لگی جو سیاہی سے گہری سیاہی میں تبدیل ہونے لگی تھیں۔

اس نے کس ہمت سے خلع کے پیپرز پر سائن کر دیے تھے۔ کم از کم وہ اپنی بیٹی سے ملنے ہی آ جاتا۔ کیا یہ بہانہ بھی اس کے لیے کم تھا۔

"صندل! دروازہ کھولو...... اتنی رات میں تم چھت پر کیا کر رہی ہو؟ دروازہ کیوں بند کیا ہوا ہے؟"

چاند کے ساتھ ساتھ اب پھپھو اور حاجی بوا کی آوازیں بھی سیڑھیوں کے دروازے کے پار سے آنے لگی تھیں۔ وہ سب مل کر دروازہ پیٹ رہے تھے۔ جلد ہی دروازہ توڑ دیا جانے والا تھا۔ وہ جانتی تھی۔ صندل نے نیچے سیب کے باغ میں جھانکا۔ جہاں اس نے بے فکری کے بہت سے دن گزارے تھے۔ وہ پھر سے انہی دنوں میں چلی جانا چاہتی تھی۔

"صندل! میری بیٹی دروازہ کھولو......"

چاند روتے ہوئے التجا کر رہی تھی۔ پھر دروازے کو دھکے مارے جانے لگے۔ صندل چھجے کی دیوار پر چڑھ گئی اور نیچے گہرائی میں دیکھنے لگی۔

"مجھے معاف کر دیجیے گا چاند امی...... مجھے معاف کر دیجیے گا۔" وہ زیر لب بولی۔

سیڑھیوں کا دروازہ دھکا مار کر کھولا گیا تھا۔ چاند سمیت سب صندل کی طرف لپکے۔ صندل نے

ایک آخری بار گردن موڑ کر ماں کو دیکھا۔

''صندل......!'' چاند کی چیخ فضا میں بلند ہوئی تھی۔

کوئی ستارہ ٹوٹ کر گہرائی میں گم ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

رات کی سیاہی دن میں پوری طرح ڈھل چکی تھی۔ سورج جوبن پر پہنچ رہا تھا اور دھرتی پھر سے سانسیں لیتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ شہر جاگ کر بھی جیسے ابھی جمائیاں لے رہا تھا۔ چھل پہل میں جھجک تھی۔ دکانوں کے شٹر اٹھائے جا رہے تھے اور اپنے اپنے تھڑوں کی صفائیاں کی جا رہی تھیں۔ پھر اس پرسکون منظر میں ایک شور شرابا بلند ہوا تھا۔

''بھاگ جاؤ......دجال اترنے والا ہے۔ وہ سب کو مار دے گا۔ سب کو...... بھاگ جاؤ......''

آمنہ کی آواز دور سے سنائی دے رہی تھی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بچوں کے ہنسنے اور شور کرنے کی آواز بھی......سالوں سے دیکھا ہوا تماشا پھر سے لگ رہا تھا۔

اپنی دکان میں ارشادی بابا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے تھے۔ اس آواز کا انہیں کئی ماہ سے انتظار تھا۔ آمنہ کی آواز کا......جب سے انہیں پتا چلا تھا کہ صندل آمنہ کی بیٹی ہے وہ تب سے ہی آمنہ کے انتظار میں تھے۔ لیکن آمنہ نجانے کہاں گم ہو گئی تھی۔ اس بار نجانے وہ کس شہر میں چلی گئی تھی جو حویلیاں کو بھلا ہی بیٹھی تھی۔ وہ اس کی واپسی کے حوالے سے مایوس ہونے لگے تھے جب آج مہینوں کے بعد وہ پھر سے حویلیاں واپس آ گئی تھی۔

ارشادی بابا جلدی سے دکان سے باہر نکلے۔ باہر حسب معمول وہی سماں تھا جو آمنہ کی آمد پر متوقع ہوتا تھا۔ بچے آمنہ کو تنگ کر رہے تھے۔ اس کے آگے پیچھے ہوتے ہوئے وہ کبھی آمنہ کا دوپٹا کھینچتے اور کبھی قمیص......اور بدلے میں وہ انہیں چھوٹے بڑے پتھر مار رہی تھی۔ آمنہ کو دیکھ کر ارشادی کو دکھ ہوا۔ اس کی ذہنی حالت پہلے سے زیادہ گر چکی تھی۔

"کالی کوئل کے گھر سفید بچہ پیدا ہوا ہے۔"

بچے ہنستے ہوئے گانے کے سے انداز میں اسی کی بات کہتے جا رہے تھے اور آمنہ کے جو ہاتھ میں آتا تھا پکڑ کر ان پر اچھال دیتی تھی۔

"دجال تم سب کو کھا جائے گا۔ کسی کو بھی نہیں چھوڑے گا۔ جیسے میری بیٹی کو کھا گیا۔ بھاگ جاؤ......"

لیکن چونکہ کوئی بھی پتھر آج تک کسی بچے کو لگا نہیں تھا اس لیے بچے اس سے بے خوف ہو چکے تھے۔ دور سے ہی وہ آمنہ پہ جھاڑ جھنکار اچھال رہے تھے۔

"آمنہ...... آمنہ! میری بات سنو......" آمنہ ارشادی کی دکان کے پاس پہنچی تو ارشادی نے اسے پکارا۔

بچوں پر پتھر اچھالتی آمنہ نے رک کر ارشادی کی طرف دیکھا۔

"تمہیں بہت ہی اہم بات بتانی ہے۔" ارشادی نے کہا۔

"تم قراقرم کے پہاڑوں پر جا رہے ہو گے۔" آمنہ نے طنز کیا۔ ارشادی شرمندہ ہو گیا۔

"سوامی جی نے کہا ہے کہ وہ بس مجرد لڑکوں کو تعلیم دیتے ہیں۔ جنہوں نے عورت کے جسم کو چھوا تک نہ ہو۔ ایسا ہی ہے نا...... کیا یہ بات بتانی ہے تمہیں......؟" وہ پوچھ رہی تھی۔ اور ارشادی نے اپنی گردن جھکا لی تھی۔

آمنہ کا دل کیا تھا کہ وہ اس کے چہرے پر تھوک دے یا کم از کم ایک تھپڑ ہی مار دے۔ لیکن یہ چہرہ اسے اس قدر عزیز تھا کہ وہ اسے کوئی گزند نہ پہنچا سکی تھی۔ اس لیے وہ آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ بس اس چہرے کو دیکھتی گئی۔



ارشادی بابا کی دکان میں دن نکلنے کے باوجود اندھیرا اترا ہوا تھا۔ پتا نہیں ارشادی بابا کو روشنی سے اتنی چڑ کیوں تھی۔ وہ اپنی دکان میں روشنی کا کوئی مناسب بندوبست کیوں نہیں کرتے تھے۔ دکان میں جو ایک واحد روشن دان تھا انہوں نے اس پر بھی اخبار چپکا رکھا تھا۔

''لو...... پانی پیو......'' انہوں نے کولر سے پانی کا گلاس بھر کر آمنہ کو دیا۔

آمنہ نے ایک ہی سانس میں پانی سے بھرے سارے گلاس کو خالی کر دیا۔ ایسے جیسے وہ نجانے کتنے دنوں سے پیاسی ہو۔ پھر اس نے شور پیدا کرتے ہوئے گلاس کو اسٹول پر زور سے پٹخا۔

''اور پانی دوں......؟'' ارشادی نے پوچھا۔

آمنہ نے انکار میں سر ہلایا۔ دیوار کے ساتھ لگے اسٹول پر بیٹھی وہ ارشادی کو گھورنے لگی کہ اسے جو اہم بات بتانی ہے جلدی بتا دے۔ ارشادی اسٹول پر آمنہ کے قریب بیٹھ گیا۔ نیم اندھیری دکان میں دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

''مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تمہاری بیٹی کہاں ہے؟'' ارشادی نے بتایا۔ آمنہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''ایک لڑکا تمہارے سابقہ شوہر کا پیغام لایا تھا کہ اس نے تمہاری بچی کو جان سے نہیں مارا تھا۔''

آمنہ کو اس بات پر اس قدر حیرت ہوئی تھی کہ وہ چند لمحے کچھ بول ہی نہیں سکی تھی۔ اس کی مردہ بیٹی زندہ تھی؟

''کیا سچ میں میری بیٹی زندہ ہے؟''

''ہاں...... تمہارے شوہر نے اسے کسی گھر کی دہلیز پر چھوڑ دیا تھا۔''

''کس گھر کی دہلیز پر......؟'' وہ جیسے مدتوں کے بعد بولی تھی۔

''میں تمہیں بتا دوں گا۔ لیکن پہلے تمہیں بتانا ہو گا کہ وہ بچی کس کی تھی؟'' ارشادی نے پوچھا۔

آمنہ خاموش رہی تھی۔ لیکن اس کی آنکھیں خاموش نہ رہی تھیں۔ ان میں آنسو بھر آئے تھے۔

"بولو آمنہ...... وہ بچی کس کی تھی؟"

"تمہاری...... تمہاری بچی تھی وہ ارشادی......" آمنہ جیسے پھٹ پڑی تھی۔ ارشادی نے اچنبھے سے اس کی طرف دیکھا۔

"جھوٹ مت بولو آمنہ...... وہ میری بچی کیسے ہو سکتی ہے۔ میں تو قراقرم کے پہاڑوں میں تھا۔ اور میں نے یہاں رہتے ہوئے کبھی تمہارے ہاتھ تک کو تھامنے کی کوشش نہیں کی تھی۔"

"تم نے میری روح کو چھوا تھا ارشادی......" آمنہ کے آنسو جاری تھے۔ "میں نے اپنے شوہر کے ساتھ بے وفائی کی......" آمنہ نے بتا دیا۔ ارشادی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "میں نے اپنا جسم تو اسے سونپ دیا، لیکن روح نہ سونپ سکی۔ وہ جب جب میرے پاس آتا تھا میں تمہیں سوچنے لگتی تھی۔ اس کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی میں نے ہر رات تمہارے ساتھ بتائی ہے۔ شادی کے بعد کوئی لمحہ ایسا نہیں گیا جب تم میرے پاس نہیں تھے۔ میں نے ہر وقت صرف تمہیں ہی سوچا ہے۔ وہ میری بچی کا باپ نہیں تھا۔ اس رات بھی تم میرے پاس تھے۔ میری سوچ میں، میرے دل میں، میرے کمرے میں...... پھر میری بچی مجھ پر کیسے جاتی، میرے شوہر پر کیسے جاتی...... اس کا چہرہ میرے محبوب سے ملنا، کوئی انہونی بات تو نہیں......"

آمنہ نے سالوں کے بعد آج اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا۔ ورنہ وہ تو تب بھی خاموش رہی تھی جب اس کی ساس نے بالوں سے پکڑ کر گھر سے باہر نکال دیا تھا۔

"دوبارہ اپنی شکل مت دکھانا بدکردار عورت......" آمنہ کی ساس نے اسے دہلیز سے باہر دھکا دیتے ہوئے کہا تھا۔

صندل کی پیدائش کے بعد کی درد سے تڑپتی آمنہ سڑک کنارے بیٹھی کتنی ہی دیر روتی رہی تھی۔

پھر جب اس کی ماں نے بھی اس سے پوچھا تھا کہ یہ بچی کس کی ہے تو اس نے تب بھی زبان نہیں کھولی تھی۔ وہ کسی کو کیا بتاتی کہ یہ اس کی سوچ کی بے وفائی سے پیدا ہونے والا بچہ ہے۔ اس کا تعلق ارشادی سے تو ہے۔ لیکن ارشادی اس میں پوری طرح سے بے قصور ہے۔ کون یقین کرتا اس کی ایسی بے سروپا بات پر...... اس لیے وہ اتنے سال کسی سے کچھ نہیں بولی تھی۔ اور آج اسی بے قصور کے سامنے اپنا قصور قبول کر رہی تھی۔

''میں اپنا وجود تمہارے علاوہ کسی اور کو کیسے سونپ سکتی تھی ارشادی...... وہ تمہاری بیٹی ہے۔ بس تم اس میں شریک نہیں......'' آمنہ آج ایسے بات کر رہی تھی جیسے کبھی پاگل نہ رہی ہو۔ وہ بہت ہوش مندی سے بات چیت کر رہی تھی۔

ارشادی کو شک گزرا کہ آمنہ اصل میں بالکل ٹھیک ہے۔ وہ جو پاگل پن کا مظاہرہ کرتی ہے تو وہ اصل میں ایک ڈھونگ ہے۔

''میری بچی کہاں ہے ارشادی......؟ میرے شوہر نے اسے کس گھر کی دہلیز پر چھوڑا......؟''

''دین حویلی......'' ارشادی نے بتایا۔

''دین حویلی......؟''

''ہاں...... دین حویلی میں ہے وہ...... صندل نام ہے اس کا...... چاند نے پرورش کی ہے اس کی اور میں نے نکاح......'' ارشادی نے ابھی بات مکمل بھی نہیں کی تھی جب اس نے دیکھا کہ آمنہ اٹھ کر باہر بھاگ گئی تھی۔

☆......☆......☆

''صندل میری بیٹی ہے...... صندل میری بیٹی ہے۔'' آمنہ دیوانوں کی طرح چلاتی ہوئی دین حویلی تک آئی تھی۔ اس کی دیوانگی میں جوش تھا۔ دل کو بے قابو کر دینے والی خوشی تھی۔ وہ مسرت سے اس قدر لبریز ہو چکی تھی کہ اصل معنوں میں پاگل دکھنے لگی تھی۔ وہ بیٹی جسے وہ سالوں مردہ خیال کیے ہوئے تھی

وہ زندہ تھی۔ اس کی زندگی میں کوئی اس کا اپنا نہیں رہا تھا۔ وہ تنہا تھی اور ایسے میں اس اچانک خبر نے کہ اس کی بیٹی زندہ ہے، اس کے اندر ایک نئی زندگی پھونک دی تھی۔

''صندل میری بیٹی ہے۔ سالوں پہلے میرے شوہر نے اسے اس حویلی کی دہلیز پر چھوڑا تھا۔''

وہ دیوانگی میں چلاتی جا رہی تھی۔ حویلی سے باہر مردوں کا رش لگا ہوا تھا۔ سب نے اسے چلاتے ہوئے دیکھا تھا لیکن نہ تو کسی نے اسے کچھ کہا تھا اور نہ ہی اسے روکا تھا۔ حویلی کا بڑا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ آمنہ حویلی کے اندر داخل ہو گئی تھی۔ صحن میں اسے بہت سی خواتین نظر آئی تھیں۔

''صندل میری بیٹی ہے۔ میں ماں ہوں اس کی...... وہ ناجائز خون نہیں ہے۔ آؤ میں تمہیں بتاتی ہوں کہ وہ کس کی بیٹی ہے۔''

آمنہ نے سب عورتوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اس کا جھریوں بھرا چہرہ پوری طرح سے دمک رہا تھا۔ سب عورتوں نے اس کی طرف دیکھا۔ لیکن کوئی کچھ نہیں بولا۔ کسی کو آمنہ کی بات میں دلچسپی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں۔ صندل میری بیٹی ہے اور وہ ناجائز خون نہیں ہے۔''

بوڑھی بولتی جا رہی تھی۔ آخر کوئی اس کی بات کا یقین کیوں نہیں کر رہا تھا؟ وہ حیرت کا اظہار کیوں نہیں کر رہے تھے؟ بوڑھی سے پوچھ کیوں نہیں رہے تھے کہ صندل کس کی بیٹی ہے؟ آمنہ تو آج ساری دنیا کو حقیقت بتا دینا چاہتی تھی۔

''چاند کہاں ہے؟'' بوڑھی آمنہ نے کسی سے پوچھا۔ ایک لڑکی نے اس طرف اشارہ کر دیا تھا جہاں چاند بیٹھی ہوئی تھی۔ آمنہ جلدی سے چاند کے پاس پہنچی۔

''صندل میری بیٹی ہے چاند...... قسم لے لو...... میں پاگل پن میں نہیں کہہ رہی ہوں۔ بالکل ہوش و حواس میں ہوں۔ صندل میری بیٹی ہے۔ اور وہ میری ناجائز بیٹی نہیں ہے۔ انہوں نے مجھ پر شک

کیا۔ الزام لگایا۔ صندل میرے شوہر کی ہی بیٹی ہے۔"

آمنہ کہتی جارہی تھی۔ چاند کچھ نہیں بولی تھی۔ آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ وہ آمنہ کو دیکھتی جارہی تھی۔

"تم نے اسے ماں بن کر پالا ہے۔ لیکن کچھ حق میرا بھی ہے۔ میں صندل کو تم سے نہیں چھینوں گی۔ قسم کھاتی ہوں۔ لیکن مجھے اس سے مل تو لینے دو۔"

بوڑھی بولتی جارہی تھی۔ لیکن یہاں کوئی کچھ بول کیوں نہیں رہا تھا۔ آمنہ کو غصہ آنے لگا۔ یہ لوگ اس کی خوشی کو آخر سمجھ کیوں نہیں رہے تھے۔

"صندل کہاں ہے چاند......؟" آمنہ نے پوچھا۔

چاند نے چارپائی کی طرف اشارہ کردیا۔ جہاں صندل لیٹی ہوئی تھی۔ آمنہ فوراً سے صندل کی طرف لپکی۔

"صندل...... صندل...... میں تمہاری ماں ہوں بیٹی...... تمہاری سگی ماں......" آمنہ نے صندل کے گال تھپتھپائے۔ صندل آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ "صندل! اٹھو میری جان...... تمہاری ماں آگئی ہے۔"

نجانے کیوں آمنہ پر پھر سے دیوانگی طاری ہونے لگی تھی۔ اب کے خوشی والی دیوانگی نہیں...... بلکہ جان نکال دینے والی دیوانگی تھی۔ اس کی چھٹی حس جو شاید مدتوں کی مردہ ہو چکی تھی، اب اس کے دل کی دھڑکن کو تباہ کن حد تک بڑھا رہی تھی۔

"یہ کچھ بول کیوں نہیں رہی ہے؟ کیا کیا ہے تم نے اس کے ساتھ چاند......" آمنہ نے غصے سے چاند سے پوچھا۔ چاند تب بھی کچھ نہیں بولی۔ وہ آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ آمنہ کو دیکھتی جارہی تھی۔

"بولو چاند...... یہ کچھ بول کیوں نہیں رہی ہے؟ کیا کیا ہے تم لوگوں نے اس کے ساتھ......؟" آمنہ چلائی۔

پھر اس نے آگے بڑھ کر چاند کو کندھوں سے جھنجھوڑا۔ "بولو چاند...... یہ کچھ بول کیوں نہیں رہی ہے؟"

''کیونکہ یہ مر چکی ہے اور مرے ہوئے لوگ بات نہیں کر سکتے۔''

تہمینہ پھپھو نے آمنہ کو بتایا۔ اور آمنہ ہونق بنی تہمینہ پھپھو کو دیکھنے لگی۔ وہ اس بات پر کیسے یقین کر لیتی۔ خدا اتنا ناانصاف نہیں ہو سکتا۔ سالوں اس نے صندل کو اس سے دور رکھا اور آج اس کی پہلی ملاقات پر وہ اس کی جان کیسے لے سکتا تھا؟

بے یقینی سے وہ دوبارہ سے صندل کے گال تھپتھپانے لگی۔

''صندل! میری بیٹی...... ! اٹھ جا...... تیری ماں آ گئی ہے۔ اٹھ مجھے دیکھ...... میری بیٹی...... میرے گلے سے لگ جا......''

آمنہ بولتے ہوئے رونے لگی۔ اس کا رونا دیکھ کر خاموش بیٹھی عورتیں ایک بار پھر سے رونے لگیں۔ ایک صرف چاند تھی جو رو نہیں رہی تھی۔ اس کی آنکھیں تو آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں لیکن وہ رو نہیں رہی تھی۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ اگر وہ ذرا سا بھی روئی تو اس کے دل میں سلگتی بدلے کی آگ بجھ جائے گی۔ جسے وہ اب ہر گز ہر گز بجھانا نہ چاہتی تھی۔ وہ کل رات سے سکتے کی سی حالت میں صندل کی میت کے سرہانے بیٹھی تھی، لیکن وہ نہیں روئی تھی۔ بالکل نہیں روئی تھی۔ پتھر وجود لیے وہ ساکت بیٹھی رہی تھی۔

''صندل...... میری بیٹی! اٹھ...... دیکھ تیری سگی ماں آ گئی ہے۔ صندل اٹھ جا...... تجھے خدا کا واسطہ ہے۔''

آمنہ روتے ہوئے چلاتی جا رہی تھی۔ دور فضا میں تیرتے پرندے اپنی بولیاں بھول کر آمنہ کو دیکھنے لگے تھے۔

دن ایک بار پھر رات سے جا لگا تھا۔

☆......☆......☆

سبزے سے ڈھکا ہوا ٹھنڈیانی کا پتا پتا دھند چھوڑتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ پہاڑوں کے سلسلے کی

شروعات کے پہاڑ کہر میں لپٹے ہوئے تھے۔ اور زویا کو آج کچھ بھی برا نہیں لگ رہا تھا۔ ایسے موسم سے اسے خاصی چڑ رہا کرتی تھی لیکن اسے آج سب اچھا، بلکہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں وہ خط تھا جس میں میر زاد نے اپنے گھر کا پتا لکھا ہوا تھا۔ زویا اور زوہیب دونوں لوگوں سے پوچھتے ہوئے اس پتے تک پہنچے تھے۔ پھر بالآخر انہیں مطلوبہ گھر مل گیا تھا۔

گھر کا دروازہ بند تھا۔ زوہیب نے آگے بڑھ کر دستک دی۔ زویا دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے کے کھل جانے کا انتظار کرنے لگی۔ وہ اپنے بھائی کو فوراً سے گلے لگا لینا چاہتی تھی۔ بس بہت ہوئے شکوے، بہت ہوئی ناراضی...... اب وہ سب ختم کر دینا چاہتی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ میر زاد کو اس بات پر آمادہ کرے گی کہ وہ صندل اور اپنی بیٹی کے ساتھ لندن شفٹ ہو جائے۔ پھر وہ سب وہاں پیار اور محبت سے رہیں گے۔ لیکن بے چاری زویا نہیں جانتی تھی کہ ٹھنڈا پانی آ کر اس کی ساری امیدوں پر پانی پھرنے والا ہے۔ یہاں ایسا کچھ اس کا منتظر نہیں تھا جس سے اسے خوش گواریت کا احساس ہوتا...... بلکہ یہاں اس کی ذہنی بربادی کے سارے اسباب اس کی آمد سے قبل ہی ترتیب پا چکے تھے۔

گھر کا دروازہ کھلا تھا اور پھر وہاں جو شخص ظاہر ہوا تھا وہ زویا کے لیے اجنبی تھا۔

”جی...... کون ہیں آپ......؟ اور کس سے ملنا ہے آپ کو......؟“

”میر زاد سے...... یہ میر زاد کا گھر ہے نا...... میں اس کی بہن ہوں۔“

”یہ ان کا گھر تھا...... اب نہیں ہے۔“

”مطلب......؟“

”مطلب...... یہ کہ یہ گھر اب میرا ہے۔ انہوں نے یہ گھر مجھے بیچ دیا تھا۔“ آدمی نے زویا کو بتایا۔

زویا اور زوہیب دونوں نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”وہ دونوں اب کہاں ہیں؟“

"میں کچھ زیادہ نہیں جانتا...... میں خود یہاں پر نیا ہوں۔ آپ پاس پڑوس سے پتا کرلیں۔"

زویا اور زوہیب کو تو چند لمحے سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ کیا کریں۔ آدمی چند لمحے دروازے پر کھڑا رہا پھر اس نے دروازہ بند کر لیا تھا۔ زویا اور زوہیب نے پھر ویسا ہی کیا جیسا کہ اس آدمی نے انہیں مشورہ دیا تھا۔ انہوں نے پاس پڑوس سے پتا کیا کہ میرزاد اور صندل دونوں اب کہاں ہیں۔ اور جو کچھ انہیں معلوم ہوا اس نے زویا کا سر چکرا کر رکھ دیا تھا۔

"صندل نے گھر بیچ دیا۔ وہ خود حویلیاں چلی گئی۔ اسی رات میرزاد کا کچھ آدمیوں سے جھگڑا ہو گیا۔ اور اب وہ ہسپتال میں زیر علاج ہے۔"

"وہ کس ہسپتال میں ہے؟"

"ایبٹ آباد کے ایک سرکاری ہسپتال میں......"

پڑوس والے گھر کے آدمی نے انہیں بتایا۔ زویا کو چکر آنے لگے۔ ایک دم سے اسے اتنی انہونی باتیں سننے کو مل گئیں کہ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس کس کی بابت دریافت کرے۔

"صندل کیوں حویلیاں چلی گئی...... وہ میرزاد کے ساتھ کیوں نہیں ہے۔ کیا دونوں میں کوئی جھگڑا ہوا تھا؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔ صندل کے گھر کا کوئی فرد آیا تھا۔ وہ میرزاد کی غیر موجودگی میں صندل کو اپنے ساتھ لے گیا اور جانے سے پہلے صندل نے گھر بیچ دیا۔"

"لیکن کیوں......؟" زویا بے چین تھی۔

"زویا......! میرے خیال سے ہمیں پہلے ہسپتال جا کر میر کی خیریت معلوم کرنا چاہیے۔" زوہیب نے اس سے کہا۔

زویا کو بھی اس بات کا احساس تھا لیکن جو باتیں اسے معلوم ہو رہی تھیں، وہ ان کے متعلق بھی

پوری طرح سے جان لینا چاہتی تھی۔

شام ہونے سے پہلے پہلے زوہیب اور زویا دونوں ایبٹ آباد کے سرکاری ہسپتال میں جا پہنچے تھے۔ میرزاد اسی ہسپتال میں زیر علاج تھا اور اس کی حالت دیکھ کر زویا بے ہوش ہو کر گرتے گرتے بچی تھی۔ وہ میر کی اس حالت کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی جیسی حالت میں وہ اس کے سامنے موجود تھا۔

''سر پر شدید چوٹ آئی ہے۔ کچھ کہہ نہیں سکتا کہ آپ کا بھائی کومے سے کب جاگے گا۔ ویسے...... اگر یہ جاگ بھی جائے تو اس کی ذہنی حالت کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ذہنی طور پر پہلے کی طرح تندرست نہ ہو۔'' ڈاکٹر نے زویا کو بتایا اور زویا زوہیب کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆......☆......☆

''کیا صندل جاتے وقت سارا سامان اپنے ساتھ لے گئی تھی؟'' زویا نے گھر کے نئے مالک سے پوچھا۔

''نہیں...... وہ لوگ کچھ بھی نہیں لے کر گئے ہیں۔ ان کا سارا سامان میں نے ایک کمرے میں رکھ دیا ہے۔''

''کیا میں اسے دیکھ سکتی ہوں؟''

''جی بالکل......!'' آدمی پیچھے کو ہوا۔ اس نے دونوں کو اندر آنے دیا۔

زویا اور زوہیب دونوں گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ آدمی انہیں ایک کمرے میں لے گیا۔

''یہاں ان کا سارا سامان موجود ہے۔ آپ کو جو چاہیے اپنے ساتھ لے کر جا سکتے ہیں۔''

آدمی دونوں کو کمرے میں چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ زویا سارے سامان کو دیکھنے لگی۔ باقی تو اسے کسی چیز سے کوئی غرض نہ تھی لیکن میرزاد کے استعمال کی چیزیں دیکھتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

کپڑے، جوتے، گھڑی، کف لنک...... وہ ایک ایک چیز کو محبت اور اپنائیت سے دیکھ رہی تھی۔

''خود کو سنبھالو زویا......''

''کیسے سنبھالوں میں خود کو زوہیب...... تم نے دیکھا نہیں میر کی کیا حالت ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ کوما سے جاگ جانے کے بعد بھی اس کی ذہنی حالت کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا ہے۔''

''خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو گا۔ میر زاد کو کچھ نہیں ہو گا۔''

زویا نے آنسو صاف کیے تھے اور پھر سے سامان کو دیکھنے لگی۔ وہاں صندل کی چیزیں بھی موجود تھیں۔ باریشہ کی بھی...... نجانے کیوں زویا کو ان چیزوں سے کوئی انسیت نہیں ہوئی تھی۔ کچھ جانے بنا ہی اسے صندل سے چڑ سی ہونے لگی تھی۔ کہیں اندر ہی اندر وہ اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ اس کے بھائی کی اس حالت کی ذمہ دار صندل ہے۔ اس نے دراز کھول کر چیزوں کو کھنگالنا شروع کر دیا۔

''تم کیا تلاش کر رہی ہو زویا......؟''

''پتا نہیں...... مجھے تو خود نہیں معلوم کہ میں کیا تلاش کر رہی ہوں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ کچھ نہ کچھ تو ایسا ضرور مل جائے گا جو باتوں کو سمجھنے میں میری مدد کرے۔ میں حویلیاں جا کر صندل اور چاند سے کچھ کہنے والی تو بنوں۔ ان سے باز پرس کرنے کے لیے میرے پاس کوئی سوال تو ہو۔'' زویا نے کہا۔

زوہیب ایک طرف بیٹھ گیا۔ اس نے زویا کو اس کا کام کرنے دیا۔ پھر زویا کی تلاش کا فائدہ ہوا۔ جب اسے صندل کا لکھا ہوا خط مل گیا۔ جو اس نے گھر سے جاتے وقت میر زاد کے لیے لکھا تھا۔ زویا نے خط پڑھا تھا اور ششدر رہ گئی تھی۔ خط میں صندل نے میر زاد سے خلع کا مطالبہ کیا تھا۔

''یہ...... یہ سب صندل کی وجہ سے ہوا ہے زوہیب......'' خط زویا کے ہاتھ میں کانپ رہا تھا۔ اسے خط پڑھ کر بھی جیسے اس کی تحریر پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ ''یہ سب صندل کی وجہ سے ہوا ہے۔''

زوہیب کو کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ زویا نے اسے خط دکھایا تھا۔ خط پڑھ کر زوہیب بھی حیران رہ

گیا تھا۔ صندل کا خلع کا مطالبہ کرنا اس کے لیے بھی حیرت کا باعث تھا۔

زویا مزید تن دہی سے سامان کی تلاشی لینے لگی تھی۔ اب کے اس کے ہاتھ چاند کے خطوط لگے تھے۔ صندل کو طلاق کے لیے اکسانے والے خطوط...... دونوں ماں بیٹی صندل کی شادی میرزاد سے ہو جانے پر پچھتاوے کا شکار تھیں اور چاند خطوط میں صندل کو گھر بیچ دینے کا کہہ رہی تھی۔

"اوہ میرے خدایا...... چاند اس قدر مکار عورت ہے۔ میں اسے سمجھ کیوں نہ سکی۔" زویا خط پڑھتی جاتی تھی اور حیران ہوتی جاتی تھی۔ زوہیب نے بھی خط پڑھے تو زویا کی ہی طرح وہ بھی حیران تھا۔

"مجھے حویلیاں لے چلو زوہیب...... ابھی اسی وقت...... میں چاند اور صندل کو جان سے مار دینا چاہتی ہوں۔"

"ریلیکس ہو جاؤ زویا......"

"ابھی بھی ریلیکس ہو جانے کا کہہ رہے ہو۔ تم خط پڑھ تو چکے ہو۔ دیکھو دونوں ماں بیٹی نے مل کر کیسے میرے بھائی کو اس نہج تک پہنچایا ہے۔" زویا رونے لگی۔ میرزاد کی موجودہ حالت اس کی آنکھوں سے جاتی نہ تھی۔

"ہاں...... لیکن تم اپنے اعصاب پر کنٹرول رکھو زویا......"

"نہیں زوہیب...... اب تو نہیں...... کیونکہ اب میں ان مکار ماں بیٹی کی ساری گیم سمجھ گئی ہوں۔ وہ نیچ لوگ تھے جنہیں میں خاندانی لوگ سمجھ بیٹھی تھی۔ وہ ناجائز لڑکی صندل میرے بھائی کے قابل ہی نہیں تھی۔ میرزاد ہی پاگل تھا جو اس کی محبت میں دیوانہ ہو گیا تھا۔ وہ بھی میری طرح انہیں نہ سمجھ سکا۔ دونوں ماں بیٹی خیال کیے ہوئے تھیں کہ وہ میرے بھائی کو جال میں پھنسا کر دولت حاصل کر لیں گی۔ لیکن یہ میں تھی جس نے صندل کو قبول نہیں کیا تھا۔ اور جب دولت ان کے ہاتھ نہ آئی تو صندل نے طلاق مانگ لی، گھر کو بیچ دیا اور سارے زیور موتی لے کر چلی گئی۔ دیکھو...... سامان میں کوئی بھی قیمتی چیز

موجود نہیں ہے۔ وہ نوادرات تک لے گئی ہے۔ اور چھوڑ گئی ہے یہ منحوس ستار......"

"لگ تو ایسا ہی رہا ہے کہ سب ایسا ہی ہوا ہے جیسا تم کہہ رہی ہو۔"

"ایسا ہی ہوا ہے۔ تم مجھے حویلیاں لے چلو...... ان دونوں ماں بیٹی کو تو میں خود دیکھ لوں گی۔ میں انہیں اپنے بھائی کی ایک بھی چیز ہتھیانے نہیں دوں گی۔" زویا نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔

☆......☆......☆

حویلیاں کی دھرتی پر آسمان سرخ ہو چکا تھا۔ کل رات اتنے تارے ٹوٹ کر گرے تھے کہ آج آسمان ان کا سوگ منا رہا تھا۔ لگتا تھا کہ دنیا کے سارے آتش فشاں کی راکھ فضا میں گھل مل گئی ہے۔ اب سورج تو طلوع ہو گا لیکن آنکھیں اندھی ہی رہیں گی۔ ان کو کبھی بینائی میسر نہ ہو گی۔ دنیا کے سارے مناظر پر جیسے کالک مل دی گئی تھی۔ اب کوئی خوش کن منظر دل کو کبھی نہیں بھانے والا تھا۔

سرخ آسمان کو دیکھتے ہوئے حاجی بوا کو ہول آ رہے تھے۔ اب مزید کیا ہونے والا تھا؟ آسمان کا سرخ رنگ تو ویسے بھی لوگوں کے نزدیک منحوس خیال کیا جاتا تھا۔ انہیں یاد تھا کہ کیسے ان کی والدہ سرخ آسمان کو دیکھتے ہی وضو کر کے مصلہ بچھا کر مختلف ورد کرنا شروع کر دیا کرتی تھیں۔ ان کا ماننا تھا کہ سرخ آسمان مصیبتوں کی پیشن گوئی کرتا ہے۔ ساری زندگی تو حاجی بوا کو اپنی ماں کی بات پر یقین نہ رہا تھا لیکن آج نجانے کیوں ان کا خود کا دل ڈولنے لگا تھا۔

خود کو جھوٹے سچے دلاسے دیتے ہوئے حاجی بوا نعمت خانے میں آئیں اور چاند کے لیے کھانا تیار کرنے لگی تھیں۔ چاند نے کل رات سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ نہ اس نے کچھ پیا تھا اور نہ ہی کچھ بولا تھا۔ وہ چپ تھی۔ ایسی چپ جیسے زندگی بھر اس نے کچھ نہ بولا ہو۔ اسے زبان کو جنبش دینا سکھایا ہی نہ گیا ہو یا وہ اب بھول گئی ہو۔ چاند کو دیکھتے ہوئے حاجی بوا کا دل ڈوبنے لگتا تھا۔ چاند کے علاوہ اب ان کا دنیا میں رہ ہی کون گیا تھا۔

کھانے کی طشتری لیے حاجی بوا چاند کے کمرے میں آئیں۔

"چاند...... کھانا کھا......" وہ بات مکمل نہیں کرسکی تھیں۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی انہیں اندازہ ہوگیا تھا چاند کمرے میں موجود نہیں ہے۔ بس ننھی باریشہ بیڈ پر لیٹی سو رہی تھی۔ حاجی بوا واپس نیچے اتریں۔

"تہمینہ! چاند کو دیکھا ہے؟"

"اپنے کمرے میں گئی تھی۔"

"وہاں نہیں ہے۔ ابھی میں کمرے سے ہی آرہی ہوں۔"

"پھر پتا نہیں کہاں ہے۔" تہمینہ کہہ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔ حاجی بوا ایک ایک کمرا دیکھنے لگیں۔

"روشانے...... کرن...... ! چاند کو دیکھا ہے تم نے......؟"

"نہیں حاجی بوا...... ہم تو بڑے کمرے میں تھے۔ گٹھلیاں پڑھ رہے تھے۔"

دونوں کے جواب سے حاجی بوا مزید پریشان ہوئیں۔

یہ چاند کہاں چلی گئی تھی ایک دم سے...... حویلی میں پے در پے اتنے عجیب واقعات ہوئے تھے کہ اب ذرا ذرا سی بات پر دل ڈرنے لگا تھا۔ انہوں نے سارے کمرے دیکھ لیے تھے لیکن چاند کسی میں بھی نہیں تھی۔ پھر کچھ خیال آنے پر وہ غسل خانوں کی طرف گئیں۔ ایک غسل خانے کا دروازہ بند تھا۔

"اندر تم ہو چاند......؟" دستک دیتے ہوئے انہوں نے پوچھا تھا۔ اندر سے کوئی جواب نہیں آیا تھا لیکن اندر کوئی موجود تھا۔ آہٹ سے انہیں اس بات کا اندازہ ہو رہا تھا۔

"چاند...... اندر تم ہو......؟"

حاجی بوا نے پھر سے دستک دی تھی اور تب ہی دروازہ کھل گیا تھا۔

اندر چاند ہی تھی جواب ان کے سامنے کھڑی تھی۔ حاجی بوا کی جان میں جان آئی۔

''میں تمہیں ساری حویلی میں تلاش......'' حاجی بوا بات مکمل نہ کر سکی تھیں۔ چاند کے نئے روپ پر ان کی نظر پڑی تو ان کی زبان گنگ رہ گئی تھی اور انہوں نے حیرت کے مارے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔

''یہ کیا کیا تم نے اپنے ساتھ چاند......؟ ہائے میرے اللہ...... یہ تم نے اپنے ساتھ کیا کر لیا ہے۔''

حاجی بوا اپنا سینہ پیٹنے لگیں۔

چاند اپنے سر کے سارے بال اتارے ان کے سامنے کھڑی تھی۔ اور چاند کا گنجا سر دیکھتے ہوئے حاجی بوا کو غش آ رہے تھے۔

''اپنی بیٹی کی موت کا بدلہ پورا ہو جانے تک میں اب ایسے ہی رہوں گی۔'' کل رات سے خاموش چاند نے اٹل انداز میں کہا۔



ناول **تاش گھر** ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **15** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 30

۲۰۰۳ء

رات کی سیاہی ذروں کی شکل میں زمین پر گر رہی تھی۔اور وہ تیز تیز بھاگ رہی تھی۔ایک جن زاد اس کے پیچھے لگا ہوا تھا جس نے خنجر تھام رکھا تھا۔اس کے ارادے بتاتے تھے کہ وہ باریشہ کی جان لے کر ہی دم لے گا۔اور تاریکی میں ڈوبے گھنے جنگل میں باریشہ بھٹکتی ہوئی اس جن زاد سے بچتی ہوئی بھاگ رہی تھی۔ناہموار زمین کے باعث اس کے پاؤں درد کرنے لگے تھے۔خاردار جھاڑیوں نے اس کا جسم چھلنی کر دیا تھا۔اس کا سانس پھولنے لگا تھا۔جن زاد خنجر تھامے اس کے پیچھے پیچھے تھا۔اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔

بے دم ہو کر رکنے سے پہلے ہی باریشہ ٹھوکر کھا کر گر چکی تھی۔اس کی ہمت جواب دے چکی تھی۔وہ اٹھ کر بھاگ نہیں سکتی تھی۔جن زاد اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔

''کیوں مارنا چاہتے ہو مجھے......؟''پھولی سانسوں اور خوف سے سہمی ہوئی باریشہ نے پوچھا۔

''بدلہ......!''جن زاد نے کہا۔اور پھر نوکیلا خنجر پوری طاقت سے باریشہ کے سینے میں گھونپ دیا۔

گھنے جنگل میں ایک دلدوز چیخ بلند ہوئی تھی۔

اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔اس کا سارا وجود پسینے سے تر ہو رہا تھا۔وہ اس قدر سہمی ہوئی تھی کہ آنکھ کھلنے کے بعد بھی اس کے حواس بحال نہیں ہو رہے تھے۔اس نے کمرے میں چاروں طرف نظر ڈالی تھی۔وہ پہاڑوں میں نہیں تھی۔اس کے ارد گرد کوئی درخت نہیں تھے۔اور وہاں کوئی ایسا وجود نہیں تھا جو

اسے دبوچنے کے لیے آگے بڑھ رہا تھا۔

لیکن یہ کون سی جگہ تھی؟

وہ پہلے خواب میں تھی یا اب کسی خواب میں چلی گئی تھی؟

کیا وہ جنگل میں حقیقی طور پر موجود تھی اور اب اپنی موت کے بعد پہلا خواب دیکھ رہی تھی؟

اس نے اپنے دائیں بائیں کا جائزہ لیا تھا۔ وہاں ہر چیز سفیدے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ درودیوار، اس کا بستر......سب کچھ سفید تھا۔ حتیٰ کہ اس کا لباس بھی......

کیا وہ مر چکی تھی اور یہ عالم برزخ کا منظر تھا؟

لیکن عالم برزخ میں تو کسی کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی جبکہ اس کا تو سارا جسم درد کر رہا تھا۔ اس کے جسم کا کوئی ایک بھی حصہ ایسا نہیں تھا جہاں تکلیف کا احساس نہ ہو رہا ہو۔ بہت سے لمحے تو اسے سمجھ میں ہی نہیں آسکا تھا کہ یہ تکلیف کس چیز کی ہے۔ پھر اس نے کچھ ہمت سے کام لیتے ہوئے اپنے حواس کو جگانے کی کوشش کی تھی۔ وہ اسپتال کے بستر پر تھی۔ اس کا سارا جسم سفید پٹیوں سے لپٹا ہوا تھا۔ جہاں پر کہیں کہیں خون کے دھبے بھی نظر آرہے تھے۔

کیا اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا؟ اس نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے یاد کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اسے کچھ یاد نہیں آیا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ وہ یہاں کیوں ہے، اور......اور......وہ کون ہے۔

"اچھی بات ہے کہ آپ کو ہوش آگیا۔" ایک نرس روم کے اندر داخل ہوئی اور اس نے باریشہ کو ہوش میں آتے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ باریشہ سے کچھ بولا نہیں گیا۔

"بہتر محسوس کر رہی ہیں آپ......؟" نرس نے اس کے قریب آتے ہوئے پیار سے پوچھا۔

"نہیں......! میرا پورا جسم درد کر رہا ہے۔"

"کوئی بات نہیں......سوجن کی وجہ سے ایسا محسوس ہو رہا ہے۔ ورنہ آپ کو بہت اچھے سے ٹریٹ

کر دیا گیا ہے۔ کیا آپ کو کچھ کھانے کی طلب ہے؟ سوپ...... یا کچھ بھی؟"

"نہیں......!"

"ٹھیک ہے۔ پھر میں ڈاکٹر کو بلا کر لاتی ہوں۔ انہوں نے کہا تھا کہ جیسے ہی آپ کو ہوش آ جائے میں انہیں بتا دوں۔" نرس کہہ کر باہر جانے کو ہوئی تھی۔

"بات سنیں......!" اس نے نرس کو روکا۔ نرس نے پلٹ کر سوالیہ انداز میں باریشہ کی طرف دیکھا۔

"ایک بات بتا سکتی ہیں۔ اگر آپ کو برا نہ لگے تو......؟"

"جی......؟"

"میرا نام کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔ اور نرس نے حیرت سے باریشہ کی طرف دیکھا۔

☆......☆......☆

سفید بادل روئی کے گالوں کی طرح آسمان پر دھرے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ایسے جیسے سارے عالم کو کسی نے سفیدے میں ڈھک دیا ہو۔ دور سورج ڈوب رہا تھا اور اس کے ڈوبنے کے جان لیوا رنگوں کی دھار کو دیکھتے ہوئے اسے نجانے کیوں ڈپریشن ہو رہا تھا۔ ایسے جیسے آج سورج ڈوب کر کل ہرگز نہ طلوع ہوگا۔

وہ کراچی واپس جا رہا تھا اپنی لڑائی میں فاتح بن کر......

خود جیت کر اور کسی کو ہرا کر...... یا شاید موت کے گھاٹ ہی اتار کر......

لیکن نجانے کیا بات ہوئی تھی۔ اس جیت نے اس کے دل پر ایک بوجھ سا ڈال دیا تھا۔ ایک پتھر کی سل تھی جو اس کے سینے پر دھر دی گئی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کا سانس گھٹنے لگا تھا۔ خیام کے گھر سے ایئر پورٹ کا سفر ایسے طے ہوا تھا جیسے وہ پاتال میں گر رہا ہو۔ لمحہ بہ لمحہ اس کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ وہ اسلام آباد کو جلد سے جلد چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ اس خاموش شہر نے اس پر جو بھی اثر ڈالنا تھا وہ جیسے آج ہی ڈال دیا تھا۔

جہاز کراچی کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود ضامن کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ پہاڑوں میں سانسیں لے رہا تھا۔ دھیان بدلنے کو اس نے پھر سے کھڑکی کا کور اوپر کر دیا تھا۔ باہر شام گہری ہونے لگی تھی۔ سفید بادل عجیب گدلے سے دکھنے لگے تھے۔ جیسے ان پر مٹی مل دی گئی ہو۔ پھر بھی وہ ہلکے پھلکے بادل ضامن کو خود سے بہتر محسوس ہوئے تھے۔ وہ بھی تو ان کی طرح ہلکا پھلکا ہونا چاہتا تھا۔ لیکن اب وہ اپنے ہی سیاہ پانی کا بوجھ خود میں بھرے واپس کراچی جا رہا تھا۔ جبکہ وہ ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو اپنی ماں کو خوش کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی ماں کو اس کی جوانی سے دن رات اپنے بھائی کے غم میں جلتے ہوئے دیکھا تھا۔

زویا جوانی میں ہی بھائی کی موت کے بعد کچھ نفسیاتی سی ہو گئی تھی۔ وہ نارمل انسان نہیں رہ گئی تھی۔ یا تو وہ غصہ کرتی رہتی تھی یا پھر پہروں خاموش رہتی تھی۔

''میں اپنے بھائی کے قاتلوں کو چین سے جینے نہیں دوں گی۔''

زویا اکثر کہتی تھی۔ ضامن اسے سنا کرتا تھا۔ وہ زویا سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اس کے ذہن میں کیا چل رہا تھا، جاننا چاہتا تھا۔ جلد ہی اسے معلوم ہو گیا تھا کہ جب جب وہ حویلیاں والوں کی بات کیا کرتا تھا، زویا نارمل ہونے لگتی تھی۔ حویلیاں والوں کے بارے میں بتاتے ہوئے زویا نفرت کا اظہار تو کرتی تھی، لیکن ایسی ہوش مندی سے باتیں کرتی تھی جیسے اسے کوئی ذہنی مسئلہ نہ ہو۔ ضامن خاموشی سے اپنی ماں کو سنا کرتا تھا۔

زوہیب کو اس بات پر کوئی تشویش نہیں ہوتی تھی کہ زویا ضامن کو ماضی کے بارے میں سب کچھ بتا رہی ہے اور نفرت سے بتا رہی ہے۔ وہ اپنے طور پر سمجھا ہوا تھا کہ اب اس کا پاکستان سے کیا تعلق رہ گیا ہے بھلا...... وہاں موجود ساری زمین جائیداد وہ بیچ چکے تھے۔ اور اب لندن میں ہی مستقل طور پر سیٹ تھے۔

لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ زویا کی باتوں کی وجہ سے جوان ہوتے ضامن کی ذہن سازی ہو چکی

ہے۔ وہ بھی اپنی ماں ہی کی طرح صندل اور چاندنا نو سے نفرت کرنے لگا تھا۔

''میں اس مکار عورت کو جان سے مار دینا چاہتی ہوں۔'' زویا اکثر کہا کرتی تھی۔

اور ضامن کو خود پتا نہ چل سکا کہ زویا کی بات کب اس کی زندگی کا بھی مقصد بن گئی۔ وہ اس سب میں اچھے برے کا فرق کرنا بھول گیا تھا۔ اسے بھی ایسا ہی محسوس ہونے لگا تھا کہ حویلیاں والوں نے اس کے خاندان کے ساتھ بہت برا کیا ہے۔ اور اسے اس بات کا بدلہ لینا چاہیے۔

جہاز بادلوں کو چیرتے ہوئے نیچے کی طرف اترنے لگا تھا۔ دھرتی جو اوجھل تھی اب واضح ہونے لگی تھی۔ یہ تو بس ضامن کی آنکھیں تھیں جن پر دھند چھاتی جا رہی تھی۔ ویسے ہی جیسے لندن میں سردیوں کی شاموں میں چھا جایا کرتی ہے۔

ٹیکسی لے کر وہ ایئر پورٹ سے سیدھا گھر آیا تو رات پوری طرح سے گہری ہو چکی تھی۔

''مام ڈیڈ کہاں ہیں؟''

''اپنے کمرے میں ہیں، سو رہے ہیں۔'' ملازمہ نے اسے بتایا تھا۔

ضامن نے سکون کا گہرا سانس چھوڑا تھا۔ یہ بہتر تھا کہ دونوں سو رہے تھے۔ وہ ابھی کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسی لیے وہ ٹیکسی میں آیا تھا۔ اس نے فون کر کے گھر سے ڈرائیور کو نہیں بلایا تھا۔

''میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ مجھے کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔'' اس نے کہا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

کمرے میں جا کر اس نے پہلا کام یہ کیا تھا کہ شاور فل اسپیڈ میں کھول کر خود اس کے نیچے کھڑا ہو گیا تھا۔ موسم گرم تو نہیں تھا۔ اور وہ تو ویسے بھی بہت دیر سے ایئر کنڈیشن ماحول میں تھا۔ پھر اسے گرمی کیوں لگ رہی تھی؟

''تم نے بہت برا کیا میرے ساتھ باریشہ...... بہت برا...... تمہیں خودکشی کر لینا چاہیے تھی۔

میرے ہاتھ گندے نہیں کرنا چاہیے تھے۔"

تیز پانی کے نیچے کھڑا وہ بہت دیر تک ایسی ہی باتیں سوچتا رہا تھا۔ پھر ایک لمبا شاور کے لینے کے بعد ٹاول سے اپنا جسم خشک کر کے وہ بیڈ پر دراز ہو گیا تھا۔ وہ سو جانا چاہتا تھا۔ اسے ویسے بھی غسل کرنے کے بعد جلدی نیند آ جایا کرتی تھی۔

لیکن آج اسے نیند نہیں آنے والی تھی۔ کہیں اندر ہی اندر وہ یہ بات جانتا تھا۔

☆......☆......☆

"آپ کے مریض کو ہوش آ چکا ہے۔ اب آپ ان سے مل سکتے ہیں۔" نرس نے خیام سے کہا۔

خیام جو کل سے اسپتال میں موجود تھا اور دل و جان سے باریشہ کے ہوش میں آ جانے کی دعا کر رہا تھا، نرس کی بات سن کر اس نے ایک اطمینان کا سانس لیا تھا۔

"کیا واقعی ہی میں......؟"

"جی......آپ ان سے مل سکتے ہیں۔" نرس کہہ کر آگے بڑھ گئی تھی۔

خیام جلدی سے باریشہ کے کمرے کی طرف بڑھا۔ اس نے آہستگی سے دروازہ کھولا۔ سامنے باریشہ اسپتال کے بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی دونوں ٹانگوں اور ایک بازو پر پلستر تھا۔ اور باقی کے جسم کا کافی حصہ بھی پٹیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کے سر پر تو شاید کافی گہری چوٹ آئی تھی۔ وہاں کی پٹی دیکھتے ہوئے خیام کو اس بات کا احساس ہوا تھا اور باریشہ کو دیکھتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

اس نے باریشہ کا چہرہ بہت بار پورٹریٹ کیا تھا۔ ہنستے ہوئے، مسکراتے ہوئے، سنجیدہ، ناراض، اداس......لیکن اس نے اس چہرے کو اس حالت میں دیکھنے کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

"باریشہ......کیسی ہو؟" خیام نے پیار سے پوچھا تھا۔

باریشہ نے خیام کی طرف دیکھا تھا۔ وہ جو کتنی دیر سے چھت کو گھور رہی تھی، اب ناسمجھی سے خیام کو

دیکھنے لگی تھی۔ یہ چہرہ کچھ جانا پہچانا سا تھا۔

''میں خیام ہوں باریشہ...... ضامن کا دوست......!'' خیام نے بتایا۔

باریشہ کے ذہن کے خلیوں میں کرنٹ دوڑنے لگا تھا۔ خیام، ضامن، کومل، بستامی بابا...... اسے آہستہ آہستہ کر کے سب یاد آنے لگا تھا۔ اسے یاد آنے لگا تھا کہ وہ کون تھی اور اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔

''تم جب پہلی بار کراچی میں گیت گانے آئی تھیں تو تمہاری چائے میں میں نے میڈیسن ڈلوا دی تھی۔ جس سے تمہارا گلا خراب ہو گیا تھا۔ اور تم وہاں گا نہیں سکی تھیں۔'' چیئر لفٹ پر اس کے ساتھ بیٹھے ضامن نے اسے بتایا تھا۔

باریشہ کا ذہن اس کے ماضی کا سب سے دردناک سین نکال کر اس کے سامنے لایا تھا۔

''ریمپ کے دوران تمہارا ڈریس میری وجہ سے بے ترتیب ہوا تھا۔ اس سازش کے پیچھے میں تھا۔ شیراز آفندی کے پاس تمہیں میں نے بھیجا تھا۔ تا کہ وہ تمہارا فائدہ اٹھا سکے۔ اس فارم ہاؤس میں کیمرے لگے ہوئے تھے۔ تمہاری نازیبا ویڈیو بنانے کے لیے...... تا کہ تمہاری بدنامی کی جا سکے۔ تمہارا ویڈیو کلپ بھی میں نے بنوایا تھا۔ تمہاری جگ ہنسائی کے لیے......''

''لیکن کیوں...... کیوں ضامن......؟''

''تا کہ تم ٹوٹ جاؤ، بکھر جاؤ...... لیکن تم ٹوٹ نہیں رہی تھیں باریشہ...... نجانے کس مٹی کی بنی ہو تم...... تم ٹوٹ ہی تو نہیں رہی تھیں۔ کتنا توڑنا چاہا میں نے تمہیں...... سوچا تھا اتنی انسلٹ کے بعد تم خودکشی کر لو گی۔ اور تمہاری چاندنا تو جیتے جی مر جائیں گی۔ لیکن نہیں...... ایسا نہیں ہوا۔ تم نے زندہ رہنے کو ترجیح دی۔ تم پھر سے کیسے کھڑی ہو جاتی تھیں؟ اتنی مضبوطی کہاں سے آ گئی تھی تمہارے اندر......؟ ہر بار تم نے مجھے ہرا دیا باریشہ...... ہر بار...... لیکن آج نہیں باریشہ...... آج نہیں...... آج تمہیں میر زاد کی موت کا بدلہ دینا ہو گا۔ آج ہر صورت میری جیت ہو گی باریشہ...... آج تمہیں ٹوٹنا ہو گا۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر

دینا۔" ضامن نے کہا اور پھر اگلے ہی پل اسے بازو سے پکڑ کر نیچے دھکا دے دیا تھا۔

"کیا ہوا باریشہ...... کچھ تو بولو......؟" خیام پیار سے کہہ رہا تھا۔

"دفع ہو جاؤ......!" باریشہ نے نفرت سے کہا۔

خیام نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"کیا......؟" جیسے وہ بات نہیں سمجھا تھا۔

"میں نے کہا دفع ہو جاؤ...... میں تمہاری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی ہوں۔"

"لیکن باریشہ......!"

"نرس...... ڈاکٹر......! کوئی ہے یہاں؟" وہ چلائی تھی۔

ایک نرس جلدی سے کمرے میں داخل ہوئی۔

"کیا ہوا ہے؟"

"اس آدمی کو یہاں سے باہر نکالیں پلیز......" اس نے نفرت سے تیز آواز میں کہا۔

"آپ پلیز باہر جائیں......" نرس نے خیام سے کہا۔

"لیکن میں تو......"

"پلیز سر...... ابھی آپ باہر جائیں۔" نرس نے سختی سے کہا۔

خیام باریشہ کو دیکھتے ہوئے باہر نکل گیا۔ باریشہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ وہ بے آواز رونے لگی۔

"رونا آپ کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔" نرس نے پیار سے کہا۔ لیکن باریشہ جیسے چاہ کر بھی اس کی بات نہیں مان سکتی تھی۔ "کیا آپ کسی کو یہاں پر بلوانا چاہتی ہیں؟"

"جی...... حاجی بوا کو......"

''ان کا رابطہ نمبر دے دیں۔''

''وہ خدا کے پاس ہیں۔'' کہہ کر وہ مزید تیزی سے رونے لگی تھی۔

☆......☆......☆

''ہائے ڈیڈ!'' کمرے سے نکل کر وہ باہر لان میں آیا تھا۔ جہاں زوہیب بیٹھا شام کی چائے کے ساتھ موسم کا لطف لے رہا تھا۔ اس نے خوش گوار انداز اپنانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔

''کیسے ہو مائی سن......؟'' زوہیب نے اٹھ کر ضامن کو اپنے گلے سے لگایا تھا۔ وہ اپنی اکلوتی اولاد کو بڑے دنوں کے بعد دیکھ رہا تھا۔

''ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں؟''

''ٹھیک ہوں میں بھی......'' زوہیب نے واپس اپنی چیئر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''ملازمہ نے بتایا تھا کہ تم واپس آچکے ہو۔ لیکن ابھی آرام کرنا چاہتے ہو۔ اس لیے تمہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔''

''جی...... میں بہت تھک گیا تھا۔'' وہ بھی زوہیب کے سامنے بیٹھ گیا۔

''لگتا ہے کہ تم نے اسلام آباد میں کافی کام کیا ہے۔''

''کچھ ایسا خاص نہیں......'' اسلام آباد کے نام پر جیسے اس کا خوف پھر سے اس پر غالب ہوا تھا۔ باپ سے باتیں کرتے ہوئے وہ خود میں گرم جوشی نہیں بھر پا رہا تھا۔ کل کی فتوحات کا اثر زائل نہیں ہو رہا تھا۔

''اپنی ماں سے ملے ہو؟''

''ابھی نہیں......ان کے کمرے کی طرف گیا تھا، وہ سو رہی تھیں۔''

''ڈاکٹر اسے انجکشن لگا کر گیا ہے۔ اب اس سے تمہاری ملاقات کل صبح ہی ہوگی۔'' زوہیب نے بتایا۔

ضامن نے مزید کوئی سوال نہیں پوچھا تھا۔ نجانے کیا بات ہوئی تھی کہ زویا کے حوالے سے وہ خود کو فکر مند نہیں دیکھ رہا تھا۔

''مجھے نہیں اندازہ تھا کہ تم پروڈکشن میں دلچسپی رکھتے ہو۔ مجھے ہمیشہ لگا تھا کہ تم کچھ اور کرنا چاہتے ہو۔''

''میری اس میں دلچسپی عارضی تھی، میں وہ کام چھوڑ چکا ہوں۔''

''ویسے ایک بات تو بتاؤ......اس کام کے لیے تم اسلام آباد ہی کیوں گئے تھے؟'' زوہیب نے کچھ کھوجنے کے سے انداز میں ضامن سے پوچھا تھا۔

نجانے کیوں ضامن گڑبڑا گیا تھا۔

''مجھے لگا کہ اسلام آباد میں اس کام کا زیادہ اسکوپ ہے۔''

''اپنے کام کے حوالے سے پہلے تمہیں ریسرچ ورک مکمل کرنا چاہیے تھا۔ اس کام کا اسکوپ کراچی میں بھی ہے۔''

''جی......ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ؟''

''ویل......کیسا رہا تجربہ......؟''

''کچھ ایسا خوش آئند نہیں......'' اس نے بجھے سے انداز میں کہا۔ زوہیب نے اپنی جوان اولاد کی طرف دیکھا تھا۔

''ایسا کیوں؟''

''ڈیڈ! کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے نا کہ جس کام کو آپ اپنی زندگی کا سب سے اہم کام سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ وہ جب ہو جاتا ہے تو آپ کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔'' ضامن نے پوچھا۔ زوہیب نے ایک گہرا سانس لیا۔

''تم اپنی ماں کی طرح باتیں کرنے لگے ہو ضامن...... یہ متضاد جذبات تمہاری ماں نے تمہارے اندر بھرے ہیں۔ شاید اس کے لیے میں بھی قصوروار ہوں۔ مجھے تمہاری تربیت پر پوری توجہ دینا چاہیے تھی۔''

''ایسے مت کہیں ڈیڈ...... مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔''

''ایک بات یاد رکھنا ضامن...... اپنی ماں کی باتوں کو زیادہ سنجیدگی سے مت لیا کرو......'' زوہیب نے کہا۔

ضامن نے چونک کر باپ کی طرف دیکھا۔

''مجھے زویا سے اتنی محبت ہے جتنی تمہیں ماں کی شکل میں بھی اس سے نہیں ہوگی۔ لیکن اس کے باوجود کہہ رہا ہوں کہ زویا بہت سی باتیں اپنے نقطۂ نظر سے بیان کرنے کی کوشش کرتی ہے۔''

''مطلب کس طرح کی باتوں کو......؟''

''جس میں وہ خود کو درست سمجھتی ہے، جبکہ حقیقت میں وہ وہاں غلط ہوتی ہے۔''

''وہ کہاں غلط ہوتی ہیں؟'' ضامن نے پوچھا تھا۔ اسے ماں کے متعلق تجسس ہوا تھا۔

زوہیب خاموش ہو کر رہ گیا تھا۔

''بولیں ڈیڈ......'' وہ بے چین ہونے لگا تھا۔

زوہیب نے آنکھیں بند کرتے ہوئے گہرا سانس چھوڑا تھا۔

☆......☆......☆

ضامن کے حوالے سے خیام کے دل میں اسی وقت شک نے جنم لے لیا تھا جس دن راول ڈیم کے کنارے بیٹھ کر اس نے کسی کو برباد کر دینے کی بات کی تھی۔ خیام نے بعد میں اس متعلق ضامن سے پوچھا تھا اور اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ اس نے تو ویسے ہی بات کی تھی۔ تب خیام نے اس کی بات پر یقین کر لیا تھا۔ لیکن کہیں اندر ہی اندر یہ یقین ادھورا تھا۔ اسے نجانے کیوں ضامن کی حرکتیں کچھ مشکوک محسوس ہونے لگی تھیں۔

وہ لندن سے کراچی شفٹ ہوا تھا۔ پھر ضامن کراچی سے اسلام آباد شفٹ ہو گیا تھا۔ وہ بزنس کی

اسٹڈی کر رہا تھا اور ایک دم سے ہی اس نے پروڈکشن ہاؤس کھول لیا تھا۔ جبکہ ضامن کو اس طرح کے کاموں میں بالکل بھی دلچسپی نہیں تھی۔ پھر اس نے جیسے جلدی میں پروڈکشن ہاؤس کھولا تھا ویسے ہی ایک دم سے بند بھی کر دیا تھا۔ اور وہ اب کراچی جا رہا تھا۔ خیام کو اس سب پر ایسا محسوس ہوا تھا جیسے اس کا دوست اس سے کچھ چھپا رہا ہے۔

بار یشہ کا ویڈیو کلپ آ جانے پر بھی اس نے کوئی فکر مندی ظاہر نہیں کی تھی۔ بار یشہ کو تو وہ جیسے بھول ہی گیا تھا۔ وہ اس سے الوداعی ملاقات کرنے کے لیے بھی بے چین نہیں تھا۔ پھر جس روز اس نے کراچی جانا تھا اس دن صبح ہی صبح وہ کہیں چلا گیا تھا۔ اس نے اپنے جانے کے متعلق کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ خیام کے جاگنے سے پہلے ہی وہ ملازم کو یہ کہہ کر جا چکا تھا کہ وہ چند گھنٹوں میں واپس آ جائے گا۔

اس ساری صورت حال پر خیام کو کچھ شک ہوا تھا۔ اس نے ڈرائیور کو فون کر کے پوچھ لیا تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ ڈرائیور نے اسے مری کا بتایا تھا۔ خیام بھی بنا کچھ سوچے مری کے لیے نکل پڑا تھا، اور وہاں جا کر پھر اس کی آنکھوں نے جو دیکھا وہ خواب میں بھی تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ضامن نے بار یشہ کو چیئر لفٹ سے نیچے دھکا دے دیا تھا۔ خیام نے سب اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اور جیسے اسے کتنے ہی لمحے اس پر یقین نہیں آیا تھا۔

"تو یہ ہی تھی وہ لڑکی جسے ضامن برباد کر دینا چاہتا تھا۔"

خیام نے کھائی میں بار یشہ کو تلاش کیا تھا۔ خون میں لت پت وہ جھاڑیوں پر اوندھی پڑی ہوئی تھی۔ خیام اسے جلدی سے اسپتال لے آیا تھا۔ اسے بالکل امید نہیں تھی کہ بار یشہ بچ جائے گی۔ جس قدر اونچائی سے وہ گری تھی، اس کے زندہ بچ جانے کے چانسز بہت کم تھے۔

"آپ انہیں بروقت اسپتال لے آئے ہیں۔ ورنہ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے ان کی موت بھی ہو سکتی تھی۔" ڈاکٹر نے اس سے کہا تھا۔

وہ شکر ادا کر رہا تھا کہ باریشہ اسے جلد ہی مل گئی اور قسمت سے اس کے پاس کار بھی تھی۔

اسپتال سے وہ گھر واپس آیا تو اسے پتا چلا کہ ضامن کراچی جا چکا ہے۔

''اس کی فلائٹ کا وقت ہو گیا تھا۔'' شائستہ نے اسے بتایا تھا۔ ''اس نے تمہیں کتنے فون کیے، تم نے اس کی کال اٹینڈ ہی نہیں کی...... کہاں چلے گئے تھے تم؟''

''میں جہاں تھا وہاں میرا ہونا بہت ضروری تھا می...... ورنہ آج کوئی موت کے منہ میں چلا جاتا۔''

خیام اگلے دن اسپتال گیا تھا تو اسے عجیب صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ باریشہ کو ہوش آ چکی تھی اور وہ خیام سے انتہائی نفرت سے بات کر رہی تھی۔ ضامن کا سفاک روپ دیکھ لینے کے بعد وہ خیام کو بھی اسی کا ساتھی سمجھ رہی تھی۔ اور اب اس سے کسی طرح کی کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''مجھے یہاں کون لایا تھا؟'' ایک دن باریشہ نے نرس سے پوچھا۔

''خیام...... وہ تمہارے ہوش میں نہ آنے تک بہت بے چین رہا ہے۔ وہ گھر جا کر بھی بار بار تمہاری حالت کے بارے میں پوچھتا رہا تھا۔ اسے تمہاری بہت فکر تھی۔'' نرس نے اسے بتایا تھا۔

باریشہ کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ خیام کے لیے کچھ ہمدردی محسوس کرتی۔ وہ کھائی سے گری تھی اور جیسے پاتال سے جا لگی تھی۔ اعتبار نام کی چیز اب زندگی بھر کے لیے اس کے لیے ختم ہو چکی تھی۔

''اب کہاں ہے خیام؟''

''باہر بیٹھا ہے۔''

''اسے بلا دیں۔''

''ٹھیک ہے......'' نرس کہہ کر باہر کو چلی گئی تھی۔

چند لمحوں کے بعد خیام کمرے میں داخل ہوا تھا۔

''کیسی ہو باریشہ......؟''

''مجھے مارنا چاہتے ہو؟'' باریشہ نے پوچھا۔ ''جو کام تمہارے دوست سے ادھورا رہ گیا ہے وہ تم مکمل کرنا چاہتے ہو؟''

''ایسا نہیں ہے باریشہ......'' خیام شرمندہ ہوا اور چاہتا تھا کہ باریشہ جلد سے جلد یقین کر لے کہ وہ ضامن جیسا کوئی ارادہ نہیں رکھتا ہے۔

''اگر مارنا چاہتے ہو تو میرے سامنے مجھے زہر کا انجکشن لگا سکتے ہو۔ میں اف تک نہیں کروں گی کیونکہ اب میرے پاس جینے کی کوئی ایک بھی وجہ باقی نہیں بچی ہے۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کمزور ظاہر ہونے لگی تھی۔

''ایسا کیوں کہہ رہی ہو باریشہ......؟'' خیام اس کے قریب بیٹھ گیا تھا۔

باریشہ کے دل میں اس کے لیے تھوڑی سی نرمی موجود تھی۔ اور وہ اس نرمی کو بڑھانا چاہتا تھا۔

''میرے اپنوں نے میرے ساتھ بہت برا کیا ہے۔ کچھ سے تو اب میں نفرت کرتی ہوں۔ اور کچھ اب مجھے قبول نہیں کریں گے۔ اور جس سے محبت تھی......'' وہ چپ ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں کے آنسو صاف کیے تھے۔ ''جس سے محبت تھی اس نے میری محبت کو بھی مجھ سمیت کھائی میں گرا دیا ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ میں اب خوشی سے موت کو گلے سے لگا لوں۔'' اس کی صاف کی گئی آنسوؤں کی لکیر پر پھر سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔

''میں نہیں جانتا کہ ضامن نے ایسا کیوں کیا......'' خیام نے کہا۔

باریشہ نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

''مجھ سے جس طرح کی مرضی قسم لے لو...... میں نہیں جانتا کہ ضامن نے تمہارے ساتھ ایسا کیوں کیا ہے۔ میں اس کے ارادوں سے بے خبر تھا۔''

''اگر بے خبر تھے تو مجھے یہاں کیسے لائے؟''

''اتفاق سمجھ لو...... میں ضامن کا پیچھا کر رہا تھا۔ مجھے اس پر شک تھا۔ اور میرا شک درست ثابت ہوا۔'' خیام نے جس لہجے میں بات کی تھی، باریشہ کو اس پر جھوٹ کا گمان نہیں ہوا تھا۔

وہ جو کہہ رہا تھا، سچ کہہ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے، تم سچ کہہ رہے ہو گے۔ تمہارا اسپتال کا جتنا بل بنا ہے، بتا دو...... میں بہت جلد تمہیں لوٹا دوں گی۔ اور دوبارہ مجھے اپنی شکل مت دکھانا۔ تمہارے احسان کا بہت بہت شکریہ......'' باریشہ نے کچھ غصے سے کہا۔

خیام نے باریشہ کو دیکھا۔ حقیقت بتا دینے کے بعد وہ باریشہ کے اس قدر تلخ رویے کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

''میں زندگی بھر تم دونوں دوستوں کی شکل تک نہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔''

اور اس سے پہلے کہ باریشہ پھر سے چلانے لگتی، خیام اٹھ کر باہر چلا گیا۔

☆......☆......☆

وہ موسم چمگادڑوں کی آمد کا موسم تھا۔ اندھی چمگادڑوں نے شہر پر اپنی یلغار کی ہوئی تھی۔ اپنے سیاہ وجود کے پر کھولے وہ سروں پر منڈلاتی رہتی تھیں اور باسیوں کو خوف زدہ کرتی رہتی تھیں۔ اسپتال کے بستر پر لیٹی باریشہ کو باہر سے چیخ و پکار کی صدائیں بلند ہوتی محسوس ہوتی تھیں۔ ایک جھکڑ تو اس کے اندر بھی چل رہا تھا۔ جس میں ایک ہی شور ہو رہا تھا۔ بدلہ بدلہ بدلہ...... اس کی محبت بدلے کی بھینٹ ہو گئی تھی۔

وہ دو عورتوں کے درمیان پرورش پا کر بڑی ہوئی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ مرد سے محبت ہو جانا زندگی میں کیا تبدیلی لاتا ہے۔ یہ اسے تب معلوم ہوا تھا جب ضامن اس کی زندگی میں آیا تھا۔ اس کی آمد اس طرح سے ہوئی تھی کہ باریشہ کو اس کے علاوہ جیسے کچھ بھی اور نظر آنا بند ہو گیا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ داسیاں اپنے دیوتا کو کیسے پوجا کرتی ہیں۔ ضامن کو دیکھتے ہوئے اسے احساس ہوا تھا کہ کسی کو کیوں پوجا

جاتا ہے اور کسی کو پوجنے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔

ضامن نے کبھی اس سے اظہار محبت نہیں کیا تھا۔ کیا تو باریشہ نے بھی نہیں تھا، اور وہ اپنے طور پر ہی سوچ کر بیٹھ گئی تھی کہ جیسی خاموش محبت وہ ضامن سے کرتی ہے، ویسی ہی ضامن بھی اس سے کرتا ہو گا۔ لیکن پھر ضامن کی خاموشی نے ایسا شور مچایا تھا کہ باریشہ جیسے بہری ہو گئی تھی۔ اسے اعتبار کے ٹوٹ جانے کا دکھ نہیں تھا، اسے اپنے زخمی ہو جانے کا بھی دکھ نہیں تھا۔ اسے تو یہ دکھ کھائے جا رہا تھا کہ اس کی محبت اب اسے کبھی نہ مل سکے گی۔ اسے ساری زندگی اپنی ادھوری محبت کے ساتھ گزارا کرنا ہو گا۔ یہ بات اندھی چمگادڑ کے جسم سے نکلنے والی گوند کی طرح اس کے ذہن پر چپک کر رہ گئی تھی اور اسے مزید نڈھال کر رہی تھی۔ ان دنوں وہ دو چیزوں سے نبرد آزما تھی۔ اپنے زخموں سے اور اپنے زخمی دل سے......

''گڈ مارننگ......!'' کمرے کا دروازہ ذرا سا کھول کر خیام اندر داخل ہوا۔ خیام کو پھر سے وہاں دیکھ کر باریشہ حیران ہوئی۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''تمہارے لیے سوپ لایا ہوں۔'' وہ ڈھٹائی سے بولا اور اس نے سوپ سے بھرا ہاٹ پاٹ سائیڈ پر رکھ دیا۔

باریشہ نے سخت نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''فکر مت کرو، میں اس کا بل بھی بڑے بل میں شامل کر دوں گا۔ صحت یاب ہو کر تم سارے پیسے کلیئر کر دینا۔''

وہ اب سوپ کو پیالے میں ڈال رہا تھا۔ باریشہ کے ایک ہاتھ میں پلستر تھا۔ وہ کسی صورت خود سے سوپ نہیں پی سکتی تھی۔ اس لیے خیام نے چمچہ بھر کر اس کے منہ کے قریب کیا تھا۔ باریشہ یک ٹک اس کو دیکھتی جا رہی تھی۔

وہ کیا کر رہا تھا۔ اور...... کیوں......؟

"کیوں کر رہے ہو ایسا......؟" اس نے پوچھا۔

خیام کیا جواب دیتا...... کہہ دیتا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ کیا یہ صحیح وقت تھا؟ کیا وہ اس کی محبت کو سمجھتی......؟ ہرگز نہیں...... ضامن کے دھوکے کے بعد خیام کی محبت خود سے ہی کھو کھلی ہو چکی تھی۔ کیونکہ جو بھی تھا وہ ضامن کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ اگر وہ اس وقت باریشہ کو کہہ دیتا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے تو عین ممکن تھا کہ وہ سوپ کا گرم پیالہ اس کے منہ پر اچھال دیتی۔

"پھر کسی دن بتاؤں گا۔ ابھی یہ سوپ پی لو۔" اس نے چمچہ باریشہ کے منہ کے قریب کیا تھا۔

"پلیز......!"

باریشہ نے سوپ پی لیا تھا۔ وہ اور کیا کرتی...... اسے بھوک لگ رہی تھی اور خیام کو نجانے کیوں وہ انکار نہیں کر سکتی تھی۔ خیام باریشہ کے قریب بیٹھ کر اپنے ہاتھوں سے اسے سوپ پلاتا رہا تھا۔ چند لمحے دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے تھے۔ پھر اس نے ایک ٹشو دیا تھا کہ وہ اپنے ہونٹ صاف کر لے۔ باریشہ نے اپنے ہونٹ صاف کر لیے تھے۔

"کیا تم اپنے گھر میں سے کسی کو بلانا نہیں چاہتی ہو؟"

"نہیں...... اور میں نہیں چاہتی کہ تم بھی انہیں کچھ بتاؤ...... شاید اسی طرح میرا اس گھر سے فرار ممکن تھا۔"

خیام نے ناسمجھی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"میرے ساتھ جو جو کچھ ہو چکا ہے، وہ تم نہیں سمجھ سکتے خیام...... میں بستامی بابا کے گھر واپس نہیں جانا چاہتی ہوں۔"

"کیا حویلیاں بھی جانا نہیں چاہتی ہو؟"

''وہاں تو ہرگز نہیں......''اس نے قطعیت سے کہا تھا۔''میرا جسم چیخ چیخ کر میری ہار کا بتا رہا ہے۔میں ہر طرف سے ہار چکی ہوں۔اس حالت میں حویلیاں واپس جانا اس قدر شرمندگی کا باعث ہوگا کہ اس شرمندگی سے بہتر ہے کہ میں موت کو گلے سے لگا لوں۔''

''پھر تم کہاں جاؤ گی باریشہ......ڈاکٹرز نے کہا ہے کہ تمہیں ایک دو دن تک ڈسچارج کر دیں گے۔''

''کسی دارالامان میں......کیا تم کسی دارالامان کو جانتے ہو؟''

''دارالامان کیا ہوتا ہے؟''

''جہاں لاوارث لڑکیوں کو پناہ دی جاتی ہے۔کیا تم ایسی پناہ گاہ کے بارے میں جانتے ہو۔''

''ہاں......ایک پناہ گاہ کو تو جانتا ہوں میں......تم وہاں جا کر دیکھ لو......اگر پسند نہ آئے تو پھر بے شک کہیں اور چلی جانا۔''

☆......☆......☆

گارڈز نے بتایا کہ وہ سب مری میں باریشہ کے ساتھ ہی موجود تھے کہ باریشہ چیئر لفٹ پر بیٹھ گئی اور پھر نجانے کیسے وہ چیئر لفٹ سے نیچے گر گئی۔یہ ایسی خبر تھی جس نے کومل اور بستامی کے اوسان خطا کر دیے تھے۔

''کیا مطلب وہ نیچے گر گئی......''کومل تو جیسے ایک دم سے ہی بوکھلا گئی تھی۔

''لائٹ چلی گئی تھی۔چیئر لفٹ درمیان میں جا کر بند ہوگئی۔اور باریشہ نیچے گر گئی۔ہم لوگوں نے اسے بہت تلاش کیا لیکن وہ نہیں ملی۔''

''کیسے نہیں ملی؟''

گارڈز اس بات کا کیا جواب دیتے،وہ چپ رہے تھے۔

''کیا وہ اکیلی بیٹھی تھی؟''

"جی......!" گارڈ نے جھوٹ بولا۔

"لیکن تم لوگوں نے اسے چیئر لفٹ میں بیٹھنے کیوں دیا تھا؟" بستامی غصے سے دھاڑا۔

"کومل بیگم نے بس اس کا دھیان رکھنے کو کہا تھا، باقی کسی چیز کے بارے میں کوئی ہدایت نہیں دی تھی۔

کومل اور بستامی دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے تھے۔ وقتی طور پر دونوں گھبرا گئے تھے۔

"تم دونوں یہاں سے ابھی دفع ہو جاؤ۔" بستامی نے دونوں سے کہا۔ دونوں گارڈ باہر چلے گئے۔

"کیا باریشہ نے خودکشی کی ہوگی؟" کومل نے بستامی سے پوچھا۔

"ہاں...... اپنی ماں کی طرح اس نے بھی لگتا ہے کہ خود کو ختم کر لیا ہے۔"

"اب کیا کریں گے؟ چاند کو کیا جواب دیں گے۔" کومل پریشان ہو رہی تھی۔

"چاند کو بتائے گا کون......؟"

"وہ کسی بھی دن باریشہ سے ملنے چلی آئے گی۔ جیسے پہلے آ گئی تھی۔ اور باریشہ کو نہ پا کر چاند غصے سے پاگل ہو جائے گی۔ میں بتا رہی ہوں بستامی...... پہلے تو وہ چپ رہی تھی لیکن اس بار ہمیں قتل کر دے گی۔"

"تم کسی کو کچھ مت بتاؤ کہ باریشہ کہاں چلی گئی ہے۔ ہم سب سے یہ ہی کہیں گے کہ باریشہ نے کام کرنا بند کر دیا ہے۔ میں اپنے آدمیوں سے کہہ دیتا ہوں وہ مری اسلام آباد کے اسپتالوں پر نظر رکھیں، کوئی بھی لاوارث لاش ملنے پر وہ سب سے پہلے مجھے بتائیں۔

"اور اگر اس کی لاش بھی نہ ملی تو......"

"گارڈ بتا رہے ہیں کہ جس جگہ وہ گری ہے اس کی لاش مل بھی گئی تو بہت بری حالت میں ملے گی۔ عین ممکن ہے کہ لاش ملنے تک اسے جنگلی جانور کھا جائیں۔"

"کیا کیا ہے اس بدبخت لڑکی نے...... کتنی انوسٹمنٹ کی تھی میں نے اس پر...... اب تو ساری انوسٹمنٹ وصول کرنے کا وقت آیا تھا اور اس نے خود کو ختم کر لیا ہے۔"

''کیا کیا جا سکتا ہے۔'' بستامی کو بھی انوسٹمنٹ کے ڈوب جانے کا دکھ تھا۔

''جاہل لڑکی......ہم سے ضد کے چکر میں اپنی جان لے بیٹھی۔''

وہ دونوں باتیں کر ہی رہے تھے کہ انہیں ڈرائنگ روم کے باہر کوئی شور سنائی دیا تھا۔ کسی کے گر جانے کا سا شور......

''یہ کیا ہوا؟'' بستامی اور کومل دونوں جلدی سے ڈرائنگ روم سے باہر نکلے تھے۔ اور باہر کے منظر نے انہیں مزید پریشان کر دیا تھا۔ سانول فرش پر گر کر بے ہوش ہو چکا تھا۔ وہ دونوں کی ساری بات چیت سن لینے کے بعد اپنے ہوش پر قابو نہ رکھ سکا تھا۔

بے چارہ سانول......اپنے باپ سے کس قدر مختلف تھا۔

اس کا باپ محبت میں کسی کی جان لے چکا تھا اور وہ اتنا کمزور دل تھا کہ اپنے حواس پر ہی قابو نہیں رکھ سکا تھا۔

اف......یہ محبت......

☆......☆......☆

وہ خیام کا گھر پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ وہ گھر بہت بڑا اور عالی شان تھا۔ اتنا عرصہ خیام کے ساتھ دوستی ہونے کے باوجود بھی وہ کبھی خیام کے گھر میں نہیں آئی تھی۔

کار پورچ میں داخل ہوئی تو خیام کی والدہ گھر کے اندر سے باہر آئی تھیں۔ وہ جیسے کب سے ان دونوں کا ہی انتظار کر رہی تھیں۔

''کیسی ہو باریشہ......؟'' وہ باریشہ سے ایسے ملی تھیں جیسے باریشہ وہاں نجانے کتنی بار آ چکی ہو۔

باریشہ بمشکل مسکرائی۔

''اسے اپنا ہی گھر سمجھو......آرام سے چلو۔ میں نے تمہارا کمرا تمہارے آنے سے پہلے ہی سیٹ

کروا دیا ہے۔" شائستہ اسے سہارا دیتے ہوئے اس کے کمرے تک لائیں۔

"یہاں آرام سے بیٹھ جاؤ۔" انہوں نے اسے بیڈ پر بٹھا دیا۔ باریشہ کی حیرت لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔

یہ کیسا رویہ تھا؟ وہ اتنے پیار سے کیوں بات کر رہی تھیں؟ کیا لگتی تھی وہ ان کی...... اور وہ کیوں چلی آئی تھی یہاں...... انجان گھر اور انجان لوگوں میں......؟ اسے خیام کی باتوں کا یقین ہو گیا تھا یا وہ بے یار و مددگار ہو گئی تھی۔ اس کے پاس کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اور وہ خیام کی بات مان کر اسی پر احسان کرتے ہوئے یہاں تک چلی آئی تھی۔

"کچھ لو گی باریشہ......؟"

"نہیں آنٹی...... ابھی کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ممی! آپ دودھ لا دیں۔ اس نے میڈیسن تو دودھ کے ساتھ ہی لینی ہے۔" خیام نے کہا۔

"ہاں...... یہ تو ہے۔ میں ابھی لاتی ہوں۔" شائستہ کہہ کر باہر کو چلی گئیں۔ خیام خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گیا۔

"پتا نہیں تم مجھے کیا سمجھ رہی ہو گی باریشہ...... لیکن میں حقیقی معنوں میں تمہاری مدد کرنا چاہتا تھا اس لیے تمہیں اپنے گھر لے آیا ہوں۔ تم چاہو تو جہاں دل کرے جا سکتی ہو۔ تم آزاد ہو۔ میں کون ہوتا ہوں تمہیں روکنے والا...... لیکن بس ایک بات...... میں تمہارے ساتھ مخلص ہوں۔ اس گھر کو اپنے گھر کی طرح ہی سمجھو۔ جب تک دل کرے تم یہاں رہ سکتی ہو۔"

"تم نے کہا تھا کہ تم بعد میں کبھی بتاؤ گے کہ تم میری مدد کیوں کر رہے ہو۔ تو اب بتا دو۔" باریشہ نے پوچھا۔

خیام سے چند لمحے تک کوئی جواب نہیں دیا گیا۔

''شاید انسان ہونے کے ناتے......اور ہم پہلے کسی حد تک دوست بھی تو تھے۔'' اس نے جلدی سے ٹیڑھا میڑھا سا جواب گھڑ لیا تھا۔

شائستہ دودھ لے آئیں تو وہ وہاں سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔

''ڈاکٹر نے کہا ہے کہ دو ماہ کے بعد تمہارا پلستر اتر جائے گا۔ دو ماہ تک تو تمہیں ہر صورت آرام کرنا ہے۔ پھر اس کے بعد کے لیے میں نے بہت سے پلان بنائے ہوئے ہیں۔'' شائستہ چہکتے ہوئے بولیں۔ ''ہم دونوں مل کر شاپنگ پر جائیں گے۔ پہاڑوں پر جائیں گے۔ گھومیں گے، پھریں گے، خوب مزے کریں گے۔'' شائستہ بولتی جا رہی تھیں۔ اور وہ شائستہ میں کومل کی پرچھائیں تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

کہیں وہ ایک نئی کومل بیگم سے تو نہیں مل رہی تھی۔ انہوں نے بھی شروع میں ایسا ہی اپنائیت بھرا رویہ اپنایا تھا اور پھر بعد میں......

نہیں......

اب کی بار ایسا کچھ نہیں تھا۔ وہ لوگ اس سے کوئی مفاد نہیں چاہتے تھے۔

''میری کوئی بیٹی نہیں ہے۔ مجھے بیٹی کی بہت کمی محسوس ہوتی تھی۔ دیکھو......اللہ نے اتنی بڑی بیٹی دے دی۔ میں تو اب تمہیں کہیں جانے نہیں دوں گی۔'' شائستہ خوش اخلاقی سے بولتی جا رہی تھیں۔

اور بہت دنوں کے بعد......یا شاید ایک عرصے کے بعد باریشہ کے لبوں پر سچی مسکراہٹ آئی تھی۔

☆......☆......☆

ضامن زویا کے کمرے میں آیا تھا۔ زویا دوائی کے زیر اثر بیڈ پر لیٹی سو رہی تھی۔ ضامن زویا کے پاس بیٹھ گیا۔ اس ماں کے لیے وہ بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے کر آ رہا تھا۔ بہت بڑا......جس نے اس کی ذات کو تہس نہس کر دیا تھا۔ اور یہ ماں سکون سے سو رہی تھی۔

زویا نے آنکھیں کھولی تھیں۔ یا تو اس کی نیند پوری ہو چکی تھی یا پھر وہ ضامن کی وہاں آمد کو محسوس کر چکی تھی۔

''تم کب آئے ضامن......؟'' زویا نے ضامن کو دیکھا تو مسکرائی تھی۔

''پرسوں رات میں آیا تھا۔ کل دیر تک سوتا رہا تھا۔ تب تک ڈاکٹر آپ کو انجکشن لگا کر جا چکا تھا۔ آپ سو رہی تھیں۔ اس لیے آپ کے پاس اب آیا ہوں۔''

''تمہارے ڈیڈ تو میری بہت ہی فکر کرتے ہیں۔ بات بات پہ ڈاکٹر کو بلا لیتے ہیں۔'' وہ اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ''اب تمہیں دیکھ لیا ہے تو میں اچھی ہو گئی ہوں۔ کیا تم مجھے سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کرو گے۔ میں کھڑکی کے پاس بیٹھنا چاہتی ہوں۔''

ضامن نے زویا کو سہارا دے کر بیڈ سے اٹھایا اور پھر کھڑکی کے پاس پڑی کرسی پر بٹھا دیا۔

''پردے پیچھے کر دو۔ میں کافی دنوں سے تاریکی میں بند ہوں۔ سورج کو دیکھنا چاہتی ہوں۔''

ضامن نے پردے پیچھے کر دیے۔ باہر کی تیز دھوپ کھڑکی کے راستے چھن کر اندر داخل ہوئی۔ زویا خوش گواریت سے دھوپ کو محسوس کرنے لگی۔ ضامن خود بھی ماں کے پاس بیٹھ گیا۔

''کیا آپ کی طبیعت سنبھل نہیں پا رہی ہے؟''

''میں بہتر ہوں اب......لیکن تمہارے ڈیڈ کی تسلی نہیں ہوتی۔''

''میرے پاس آپ کے لیے ایک گڈ نیوز ہے۔'' ضامن نے کچھ بجھے سے انداز میں ''گڈ نیوز'' کے الفاظ ادا کیے تھے۔

زویا نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''جو آپ چاہتی تھیں، میں نے وہ کر دیا ہے۔ آپ چاند کو تڑپانا چاہتی تھیں، میں نے جو کیا ہے، اس کے بعد چاند اگر پتھر کی بھی بنی ہوئی ہو گی تو تڑپ اٹھے گی۔''

"کیا سچ میں......؟" زویا نے بے یقینی سے پوچھا۔

"جی بالکل...... باریشہ اگر بچ بھی گئی تو عین ممکن ہے کہ اپاہج ہو جائے گی۔ اور چاندا سے دیکھ دیکھ کر روز مرے گی۔"

ضامن نے ماں کو بتایا تھا۔ زویا نے ایک گہرا سانس بھرا۔

اس سانس میں خوشی تھی، اطمینان تھا، سکون تھا، راحت تھی......

ساری زندگی کا بوجھ جیسے اتر گیا تھا۔

"تم نے میرا بیٹا ہونے کا حق ادا کر دیا ہے ضامن......" زویا نے فخر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ خبر واقعی ہی میں مجھے سکون فراہم کرے گی۔"

ضامن پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔ جو خبر اس کی ماں کو خوشی پہنچا رہی تھی، وہ اس کے دل کو چیر رہی تھی۔

"تم اس وقت کی شدت کو سمجھ نہیں سکتے جب میں نے اپنے بھائی کو اسپتال میں کومے کی حالت میں دیکھا تھا۔ اف! بہت برے لمحے تھے وہ...... بہت زیادہ...... پھر بعد میں جو جو ہوا...... وہ...... میں تو اس وقت کو یاد ہی کرتی ہوں تو جیسے سانس لینا بھول جاتی ہوں۔ اگر مجھے صندل اور چاند کے خط نہ ملتے تو مجھے تو پتا ہی نہ چلتا کہ میرے بھائی کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ میں تو یہی سمجھتی رہتی کہ صندل نے بس میرے بھائی سے طلاق لے لی ہے۔ صندل اور اس کی ماں چاند کی مکاری مجھے پتا ہی نہ چلنا تھی۔"

"کیا ان کے سامان میں سے آپ کو بس صندل اور چاند کے خط ملے تھے ممی...... کیا کچھ اور نہیں ملا تھا؟" ضامن نے کچھ تیکھے سے انداز میں پوچھا۔

زویا نے ضامن کی شکل دیکھی۔ وہ ضامن کی بات نہیں سمجھی تھی۔

"کیا مطلب؟"

''آپ نے مجھ سے ہمیشہ ان خطوط ہی کا ذکر کیا ہے جو چاند نے صندل کو لکھے تھے۔ جو صندل میرزاد کے لیے چھوڑ کر گئی تھی۔ لیکن آپ نے کبھی اس ڈائری کا ذکر کیوں نہیں کیا جو میرزاد ماموں لکھا کرتے تھے۔'' ضامن نے کہا۔

حیرت کے مارے زویا کی آنکھیں کھلتی چلی گئی تھیں۔

''کیونکہ اس ڈائری میں آپ غلط ثابت ہو رہی تھیں ممی...... اس لیے...... میرزاد ماموں ایک ایک صفحے پر آپ سے جدائی کی باتیں لکھتے رہے۔ آپ کی بے رخی انہیں اندر ہی اندر کھاتی رہی...... لیکن آپ اپنی انا پرستی میں ان سے دور رہیں...... آپ نے مجھے یہ سب کیوں نہیں بتایا ممی...... آپ کی کہانی ہمیشہ صندل اور چاند پر آ کر ہی ختم کیوں ہو جاتی تھی۔''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا اس ڈائری کا؟''

''ڈیڈ نے دکھائی تھی...... اور حیرت مجھے اس بات پر ہے کہ آپ نے میرزاد ماموں اور صندل کے بارے میں مجھے ایک ایک بات بتائی، لیکن وہ ڈائری کیوں نہ دکھائی۔'' ضامن پوچھ رہا تھا۔ زویا نظریں چرا گئی تھی۔ ضامن غصے سے کھڑا ہوا تھا۔

''میرزاد ماموں کے قاتلوں میں جہاں صندل اور چاند کا نام آتا ہے وہاں ہی آپ کا نام بھی آتا ہے ممی...... ان دونوں کو تو سزا مل چکی ہے، آپ اپنے لیے کسی سزا کو تجویز کر لیں۔'' ضامن نے کہا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

آنسوؤں کے باعث زویا کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ باہر سے آتی تیز دھوپ کے باوجود اسے کمرا اندھیرے میں ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

☆......☆......☆

حویلی کے سال خوردہ دروازے کو دیکھ کر وہ عورت چونکی تھی۔ دروازے کی وجاہت وقت نے چاٹ

لی تھی۔ سر اونچا کیے وہ کتنی ہی دیر تک دروازے کو دیکھتی رہی تھی۔ آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو اس نے صاف کیا تھا۔ پھر ہمت سے کام لیتے ہوئے دروازے پر دستک دی تھی۔ اندر شاید کوئی نہیں تھا یا اس کی دستک اس کی طرح کمزور ہو چکی تھی۔ اس نے پھر سے دستک دی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھل گیا تھا۔

''جی...... کس سے ملنا ہے؟'' بوڑھی آمنہ نے دروازہ کھولا تھا۔ سفید چادر میں لپٹی عورت نے اس کو پہچاننے کی کوشش کی تھی۔ ایک عرصہ گزر چکا تھا اسے حویلی والوں سے ملے ہوئے۔ وہ بوڑھی آمنہ کو نہیں پہچان سکی تھی۔

''چاند...... چاند سے ملنا ہے مجھے......''

''وہ اپنے کمرے میں ہے، میں اسے بلا کر لاتی ہوں۔'' بوڑھی آمنہ نے کہا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ چاند کو بلانے کے لیے وہاں سے جاتی...... عورت دہلیز پار کر کے حویلی کے اندر داخل ہو گئی تھی۔ اور حویلی کو دیکھنے لگی تھی۔ ایک گہرا سانس اس کے وجود سے برآمد ہوا تھا۔ اس سانس میں نجانے مایوسی تھی یا ماضی کی یادیں۔

''میں چاند کو بلا کر لاتی ہوں۔'' بوڑھی آمنہ کہہ کر وہاں سے چلی گئی تھی۔

عورت حویلی کو دیکھنے لگی تھی۔ جس کے در و دیوار ڈھے جانے کے قریب تھے۔ اینٹیں اپنی درزیں واضح کر رہی تھیں۔ فرش آدھا ادھورا سا ہو گیا تھا۔ سرخ رنگ کائی میں بدل چکا تھا۔ عورت کے دل میں جیسے کسی نے برچھی اتار دی تھی۔ آنکھیں بند کرتے ہوئے اس نے خود کے اندر ہمت اکٹھا کرنے کی کوشش کی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ابھی اسے یہاں آ کر نجانے کیا کیا سننا اور دیکھنا ہو گا۔

''کون ہو تم...... کیا کام ہے مجھ سے؟'' چاند وہاں آئی تھی۔ اور چاند کو دیکھ کر وہ عورت مزید دکھی ہو گئی تھی۔

چاند کی تو ساری عمر ہی نکل چکی تھی۔ یہ عورت کس قدر بوڑھی ہو چکی تھی۔ اور اس کے بال کیا

ہوئے۔ یہ گنجی کیوں ہوگئی تھی؟

''میں نے تمہیں پہچانا نہیں بیٹی......''

عورت نے چادر کو اپنے چہرے سے پوری طرح سے ہٹا دیا۔

''پہچانیں مجھے چاند امی......میں سارہ ہوں......''

سارہ نے کہا تھا اور پھر چاند کے گلے سے لگ کر پھوٹ کر رونے لگی۔

☆......☆......☆

موسم نکھر رہا تھا یا شاید باریشہ کی طبیعت میں بہتری آرہی تھی۔ اس کے بازو کا پلستر اتر چکا تھا۔ لیکن ابھی وہ اس ہاتھ سے زیادہ سخت کام لینے کے قابل نہیں تھی۔ اس کے جسم کے دوسرے حصوں کی پٹیاں بھی اتر چکی تھیں۔ وہ ان دنوں ہارڈ میڈیسن لے رہی تھی۔ جس سے اس کے زخم جلدی بھرنے میں مدد ملنے والی تھی۔ پھر شائستہ اس کا اس قدر خیال رکھتی تھیں کہ وہ دن بدن بہتر ہوتی چلی گئی تھی۔ لیکن ابھی اس کی ٹانگوں کا پلستر اترنے میں وقت تھا۔ اس لیے وہ چلنے پھرنے سے قاصر تھی۔ خیام نے اسے ایک جدید وہیل چیئر لا دی تھی، جس پر بیٹھ کر وہ گھر میں دائیں بائیں گھوم لیا کرتی تھی۔

''ایک کمرے میں بند ہوگی تو پاگل ہو جاؤ گی۔''

''میرا ذہن تنہائی کا اس قدر طلب گار ہے کہ ایک کمرا بھی مجھے بہت بڑا لگتا ہے۔'' وہ اداسی سے بولی۔

لیکن خیام نے اس کی ذہنی رو کی پروا نہ کرتے ہوئے ملازمہ سے کہہ دیا تھا کہ وہ باریشہ کو وہیل چیئر پر بٹھا کر گھر کے باغ میں سیر کروا دیا کریں۔ ملازمہ ایسا ہی کرنے لگی تھی۔ وہ روز باریشہ کو باغ میں لے جایا کرتی تھی۔

شروع شروع میں تو باریشہ کو کوفت ہوتی تھی لیکن پھر اسے سب اچھا لگنے لگا تھا۔ باغ میں تازہ پھول کھلنے کا منظر اسے دلکش لگا کرتا تھا۔ پتا نہیں کس کس دیس کے پرندے وہاں آکر اپنی بولیاں سنایا

کرتے تھے۔ باریشہ کی طبیعت میں بدلاؤ آنے لگا تھا۔

اس دن بھی وہ کافی وقت باغ میں گزار کر گھر کے لاؤنج میں آئی تھی۔ ملازمہ نے اسے سہارا دے کر وہیل چیئر سے صوفے پر بٹھا دیا تھا۔ وہ سائیڈ پر پڑے میگزین اٹھا کر دیکھنے لگی۔ وہ کافی دیر ان کی ورق گردانی کرتی رہی تھی جب ایک خبر نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ وہ خبر اس کی گمشدگی کے حوالے سے تھی۔ دوریاں ڈرامے کی مین لیڈ کی گمشدگی کی خبر......

باریشہ کو اس خبر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اگر وہ دنیا والوں کی نظر میں گم شدہ تھی تو وہ اب زندگی بھر گم شدہ ہی رہنا چاہتی تھی۔ بس وہ کسی طرح سے یہ جاننا چاہتی تھی کہ کومل اور بستامی اس کی گمشدگی کے بعد کیا سوچ رکھتے ہیں۔ لیکن فی الحال اسے اس گھر کی باتیں بتانے والا کوئی نہیں تھا۔ اس نے نفرت سے میگزین کو سائیڈ پر پٹخ دیا۔

گھر کے باہر گاڑی کا ہارن سنائی دیا تھا۔ پھر گیٹ کھلا تھا اور خیام کی گاڑی اندر داخل ہوئی تھی۔ شائستہ گھر کے اندر داخل ہوئی تھیں۔

''تم یہاں ہو باریشہ...... چلو اچھا ہوا تم یہاں ہی مل گئیں۔ دیکھو آج میں نے تمہارے لیے کیا خریدا ہے۔'' شائستہ نے کہا اور ہاتھ میں پکڑے بہت سے شاپنگ بیگز میں سے ایک کھول کر اندر سے ایک ڈریس نکالا اور باریشہ کو دکھایا۔

''یہ دیکھو...... یہ تم پر کیسا لگے گا؟''

''بہت اچھا ہے آنٹی......''

''مجھے معلوم تھا کہ تمہیں اس طرح کے ڈریس پسند آئیں گے۔ اس لیے میں نے ایسے بہت سے خرید لیے ہیں۔'' وہ اسے شاپنگ بیگ سے ڈریسز نکال نکال کر دکھانے لگیں۔

''اس سب کی کیا ضرورت تھی آنٹی......''

''ضرورت تو تھی۔ تمہاری طبیعت بہتر ہو رہی ہے تو بہتر ہے کہ تم کچھ کھلے کھلے رنگ پہنو۔ پھر موسم بھی تبدیل ہو رہا ہے اور تمہیں میرا اسائز تو آنے سے رہا۔'' وہ مسکرا رہی تھیں۔ باریشہ بھی مسکرائی تھی۔ ''ویسے ایک بات بتاؤں؟'' انہوں نے کچھ رازداری والے انداز میں کہا۔

باریشہ نے سوالیہ انداز میں ان کی طرف دیکھا۔

''یہ سب خیام نے پسند کیے ہیں۔'' کہہ کر وہ پھر سے خود ہی ہنسنے لگیں۔

باریشہ نے بمشکل اسمائل کی تھی۔ انگلی پر کیز گھماتا ہوا خیام وہاں آیا۔

''کیا باتیں ہو رہی ہیں؟''

''میں باریشہ کو ڈریسز دکھا رہی تھی۔''

''کیا اسے پسند آئے؟''

''ہاں...... بہت زیادہ......!'' شائستہ نے خیام کو معنی خیزی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر کپڑوں کو سمیٹ کر وہاں سے چلی گئیں۔ خیام باریشہ کے سامنے بیٹھ گیا۔

''کچھ بہتر محسوس کر رہی ہو؟''

''ہاں...... ظاہری طور پر تو ٹھیک ہو رہی ہوں۔ لیکن اندر بہت توڑ پھوڑ جاری ہے۔''

''ابھی اس سب کو کچھ وقت دو...... تم ذہنی ٹھیک نہ ہو سکیں تو جسمانی بھی نہیں ہو سکو گی۔''

''شاید میں خود بھی ٹھیک ہونا نہیں چاہتی ہوں۔ بلکہ میں تو چاہتی ہوں کہ میں ذہنی طور پر بہک جاؤں جیسے میری نانی بہک گئی تھی، یا میں اپنے باپ کی طرح کوما میں چلی جاؤں۔''

''کیا ہوا تھا تمہاری نانی کے ساتھ...... تمہارے باپ کے ساتھ...... کبھی تمہارے بارے میں جاننے کا موقع ہی نہیں ملا...... تم نے اپنے گھر والوں کے متعلق کبھی بات ہی نہیں کی۔''

''جاننے کو کچھ خاص ہے بھی نہیں خیام...... میری ماں، میری سگی نانی، چاند نانو...... ان سب کے بارے میں بتانے کے لیے ایک لفظ ہی کافی ہے۔ دکھوں کی ماری ہوئی عورتیں...... ان سب کو دکھا

گئے، یا شاید اپنوں کے ستم مار گئے۔ کچھ بھی کہہ لو تم...... میری سگی نانی کو ان کے اپنوں نے پاگل کر دیا۔ چاند نانو کو ان کی عاجزی نے دربدر کیا اور میری ماں نے اپنی کم ہمتی کی وجہ سے خود کو ختم کر لیا۔ اب نجانے میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ سب کچھ ہی اب میرے ساتھ ہو گا۔ پہلے میں پاگل ہو جاؤں گی پھر دربدر ہوں گی اور پھر کسی دن خود کو ختم کر لوں گی۔"

"پلیز باریشہ! ایسی باتیں مت کرو باریشہ...... تم مجھے اپنا دوست سمجھتی تھیں، خود سوچو تمہاری ان باتوں کی وجہ سے مجھے کتنی تکلیف ہوئی ہو گی۔" خیام نے کہا۔

اس بات کا بس اتنا ہی فائدہ ہوا تھا کہ باریشہ چپ ہو گئی تھی۔ لیکن اس کی آنکھیں خاموش نہیں رہ سکی تھیں۔ ان سے آنسو باہر نکلے تھے۔

اس کی آنکھیں رو رہی تھیں۔

اپنی تہی دامنی پر، اپنے ہار جانے پر...... اور اپنا سب کچھ کھو دینے پر...... جن میں سب سے اہم چیز محبت بھی شامل تھی۔

"کیا تم اب بھی کسی سے ملنا نہیں چاہتی ہو؟" خیام نے پوچھا تھا۔

باریشہ نے لمحے بھر کے لیے سوچا تھا کہ اسے کسی سے ملنا چاہیے یا نہیں......

"ہاں...... میں کسی سے ملنا تو چاہتی ہوں۔ کیا تم اسے یہاں بلوا سکتے ہو، لیکن یہ کام تمہیں رازداری سے کرنا ہو گا۔"

"ٹھیک ہے۔ بولو...... کس کو بلانا ہے؟"

"سانول کو......" باریشہ نے کہا تھا۔ صرف ایک سانول ہی تھا جو اس کی ادھوری کہانی کو پھر سے مکمل کر سکتا تھا۔



''مجھے یقین نہیں ہو رہا باریشہ کہ تم زندہ ہو۔'' سانول باریشہ کو دیکھ کر خوشی سے جیسے پاگل ہو گیا تھا۔ ''ہم سب سمجھے تھے کہ تم مر چکی ہو۔لیکن مجھے یقین تھا کہ ایک دن تم ضرور زندہ سلامت میرے پاس آ جاؤ گی۔اور دیکھو...... خدا نے میرے یقین کی لاج رکھ لی ہے۔تم میرے سامنے ہو۔''

سانول کی خوشی کے آگے باریشہ کچھ جھینپ سی گئی تھی۔یہ خوشی دوستی سے کچھ بڑھ کر تھی۔

''تم کم از کم مجھے تو فون کرتیں باریشہ......؟''

''اب کر تو دیا ہے۔''

''ہاں...... لیکن بہت دن گزر جانے کے بعد......''

''میں ذہنی طور پر ٹھیک نہیں ہوں سانول......'' باریشہ نے بات ٹالنے کی غرض سے کہا۔

''میں سمجھ سکتا ہوں۔'' وہ مسکرایا تھا۔معصوم لڑکا۔

''میں نے تم سے ایک خاص بات کہنے کے لیے بلایا ہے سانول......''

''ہاں...... بولو......'' وہ تو آج جیسے باریشہ کے لیے پہاڑ بھی کھود دینے کا کارنامہ سرانجام دے سکتا تھا۔

''تمہارے گھر کے پرانے سرونٹ کوارٹر میں ایک بوڑھی عورت تھی، جو اکثر چلاتی رہتی تھی۔''

''ہاں...... یاد ہے مجھے......''

''وہ اب کہاں ہے؟''

''تم کیوں اس کے بارے میں جاننا چاہتی ہو؟''

''کیونکہ وہ میرے بارے میں سب جانتی ہے سانول......'' باریشہ نے کہا۔سانول کچھ نہیں سمجھا تھا۔

''تم نہیں سمجھو گے سانول...... لیکن پلیز میرا کام کر دو۔مجھے اس سے ملوا دو۔''

''مجھے نہیں معلوم کہ اب وہ کہاں ہے۔بستامی بابا نے اسے کہیں اور رکھا ہوا ہے۔''

''تم معلوم کر سکتے ہو۔یہ کچھ اتنا مشکل نہیں ہے۔''

''ہاں...... کر تو سکتا ہوں۔''

''تو کرو پلیز...... میری خاطر......''

''تمہاری خاطر تو کچھ بھی کر سکتا ہوں باریشہ......'' وہ جذب سے بولا۔

باریشہ اس کی شکل دیکھنے لگی۔

''تم میری دوست جو ہو۔''

''یہ کہنے کی تو ضرورت نہیں کہ یہ بات کسی کو مت بتانا۔''

''ہرگز نہیں بتاؤں گا۔ لیکن ایک شرط پر...... تم اس گھر سے مجھے بتائے بنا کہیں مت جانا۔ تاکہ جب جب تم سے ملنے کو دل کیا کرے، میں یہاں آجایا کروں۔''

''نہیں جاؤں گی۔'' باریشہ نے مسکرا کر رضامندی دے دی تھی۔



۱۹۷۵ء

رینی کی کوک پورے حویلیاں پر چھائی ہوئی تھی۔ گہری خاموشی میں یہ کوک آج کچھ زیادہ ہی کوک رہی تھی۔ اپنے کمرے میں موجود چاند نے بہت دیر انتظار کیا تھا کہ اس کوک کے ساتھ شاید رحبانی کی سنکھ کی آواز بھی سنائی دے۔ اسے بہت شوق تھا رات کے پرندوں سے شرطیں باندھنے کا......

لیکن بہت دیر انتظار کے بعد بھی چاند کو سنکھ کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ تسلی ہو جانے کے بعد چاند اپنے کمرے سے باہر نکل کر دبے قدموں رحبانی کے کمرے میں داخل ہوئی۔

رحبانی اپنے بیڈ پر لیٹا گہری نیند سو رہا تھا۔ چاند نے نفرت سے رحبانی کو دیکھا۔ چالاک لومڑ اپنی ساری شیطانیاں کر چکنے کے بعد اب گہری نیند سو رہا تھا۔ حویلی پر جو کچھ ہو گزرا تھا اس بات کی اسے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ اسے چاند سے بدلہ لینا تھا جو وہ لے چکا تھا۔ جبکہ چاند نے اس کی کتنی منت کی تھی کہ وہ

صندل کے بارے میں بستامی کو کچھ نہ بتائے۔ لیکن یہ خبیث باز نہیں رہا تھا۔ اس نے اپنی فطرت کے مطابق کام کیا تھا۔

ٹاٹ کا پیوند بھی بھلا مخمل میں جچتا ہے۔

دین بابا ہی پاگل تھے جو رحبانی کو معصوم سمجھتے ہوئے اس حویلی کا فرد بنا بیٹھے تھے۔ ان پر رحبانی کی اصلیت کھلتی تو وہ خود رحبانی کو دھکے مار کر حویلی سے باہر نکال دیتے۔

دبے قدموں چاند مزید آگے بڑھی اور اس نے بیڈ پر پڑا دوسرا تکیہ پکڑ لیا۔

چند لمحے رحبانی کی شکل دیکھتے رہنے کے بعد چاند نے اس کے منہ پر تکیہ رکھ دیا اور پھر اپنی پوری طاقت لگاتے ہوئے اسے دبائے رکھا۔

رحبانی اگلے ہی پل نیند سے جاگا اور اب تکیے کے نیچے مچلنے لگا تھا۔

چاند اس بار کمزور نہیں پڑنے والی تھی۔

رحبانی اپنی پوری طاقت سے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔

چاند نے بھی اپنا پورا زور لگا رکھا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ بس تھوڑی دیر کی بات ہے۔ اسے تھوڑی دیر اپنا دل مضبوط کرنا تھا اور پھر اس شیطان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جان چھوٹ جانے والی تھی۔



ناول تاش گھر ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 15 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 31

رحبانی تکیے کے نیچے مچل رہا تھا اور چاند اپنی پوری طاقت سے اس کے منہ پر تکیہ رکھے ہوئے تھی۔اس سارے عمل میں چاند کے چہرے کی سختی بڑھتی جارہی تھی۔اس نے ساری زندگی ایسا مکروہ کام نہیں کیا تھا۔چاند نے تو شاید زندگی بھر کسی حشرات کو بھی نہ مارا ہوگا۔لیکن اب وہ اس شیطان کو جان سے ماردینا چاہتی تھی۔وہ ایک ایک سے اپنی بیٹی کی موت کا بدلہ لینا چاہتی تھی جو اس کے خیال میں صندل کی موت کا ذمے دار تھا۔

رفتہ رفتہ رحبانی کی طاقت کمزور پڑنے لگی تھی۔وہ جو زور آزمائی کررہا تھا اس میں کمی آگئی تھی۔ایسا لگنے لگا تھا کہ اس کے سانس پورے ہونے والے ہیں۔چاند خوش ہونے کی کوشش کررہی تھی۔وہ نفرت سے یہ کام کرتو رہی تھی لیکن اندر کہیں شر اور خیر کی جنگ جاری تھی۔اور تب ہی کسی نے چاند کو ایک زوردار دھکا دیا تھا۔

''یہ کیا کررہی ہو چاند......؟'' حاجی بوا بلند آواز میں بولیں۔

چاند لڑکھڑا کر پرے ہوئی۔رحبانی جھٹکے سے اٹھا اور اس نے جلدی جلدی میں گہرے سانس لیے۔اور بری طرح سے کھانسنے لگا۔حاجی بوا نے بتی جلادی۔اندھیرے میں جو چہرہ چھپا ہوا تھا وہ اب عیاں ہو چکا تھا۔

کھانستا ہوا رحبانی چاند کو دیکھنے لگا۔پہلے اس کے چہرے پر حیرت آئی تھی اور پھر دکھ......اسے

چاند کی اتنی جرأت کی توقع نہیں تھی۔ اور چاندا اپنے منصوبے کے ادھورے رہ جانے پر کبھی حاجی بوا کو دیکھ رہی تھی اور کبھی رحبانی کو......

"یہ کیا کر رہی تھیں تم چاند...... مجھے تو یقین نہیں آ رہا ہے۔ یہ کر کیا رہی تھیں تم...... تم رحبانی کو جان سے مار رہی تھیں۔" حاجی بوا کچھ غصے اور کچھ حیرت سے بولیں۔

"ہاں...... جان سے مار رہی تھی میں اس خبیث کو...... کیونکہ اس نے میری زندگی میں زہر گھول دیا ہے۔" چاند چلائی۔

رحبانی نے چاند کو دیکھا۔ اتنی نفرت کرنے لگی تھی چانداس سے...... دکھ کی پوری لہر نے رحبانی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ سانس بحال ہو کر ایک بار پھر سے اکھڑنے لگا تھا۔

"میں نے کیا کیا ہے چاند...... اب میں نے کیا کر دیا ہے۔"

"زیادہ معصوم بننے کی ضرورت نہیں ہے تجھے، شیطان انسان...... تو نے ہی بستامی کو صندل کے بارے میں بتایا تھا۔"

"میں نے نہیں بتایا......" رحبانی نے کہا۔ "اور......"

چاند نے استہزائیہ ہنکارا ابھرا تھا۔ بھلا چاند نے کب اس کی بات پر یقین کرنا تھا۔

"میں اپنے مرے ہوئے ماں باپ کی قسم کھانے کو تیار ہوں۔"

"تیری طرح تیری قسمیں بھی جھوٹی ہیں شیطان......"

"رحبانی نے کچھ نہیں بتایا چاند...... میں نے اس سے کہہ دیا تھا۔ بستامی کو کہیں اور سے پتا چلا ہو گا۔" حاجی بوا نے بھی رحبانی کی طرف داری کی۔

چاند حاجی بوا کو دیکھ کر رہ گئی تھی۔ انہوں نے کس قدر جلدی اپنی وفاداریاں بدل لی تھیں۔

"آپ کو تو اب اس منحوس کی ساری باتیں ہی اچھی لگیں گی۔ آپ نے بیٹا جو بنا لیا ہے اسے

اپنا......" چاند نے طنز کیا۔" آپ کو تو اب میں جھوٹی لگوں گی۔"

"ایسا کچھ نہیں ہے چاند......تم سے بڑھ کر عزیز مجھے کوئی نہیں ہے۔تم یہ بات جانتی ہو۔میں بس اتنا کہنا چاہ رہی ہوں کہ رحبانی نے بستامی کو کچھ نہیں بتایا ہے۔"

"تو پھر کس نے بتایا ہے؟" چاند نے چلاتے ہوئے پوچھا۔"بولیں......کس نے بتایا ہے پھر......؟"

رحبانی اور حاجی بوا نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔اور اس بات کا دونوں کے پاس ہی کوئی جواب نہیں تھا۔صندل ٹھنڈ پانی میں ہے، یہ بات صرف رحبانی ہی جانتا تھا۔اور اگر رحبانی نے یہ بات بستامی کو نہیں بتائی تھی تو پھر اسے کہاں سے معلوم ہو سکتی تھی۔سارا شک رحبانی پر جانا فطری تھا۔

"اسی شیطان نے بتایا ہے۔التمش کے قاتل نے......میں نے اس سے شادی کرنے سے انکار جو کر دیا تھا۔یہ اسی بات کا بدلہ اب تک لے رہا ہے۔" چاند کی آواز روہانسی ہو چکی تھی۔رحبانی کو اس پر ترس آیا تھا لیکن وہ چاند کو کیسے یقین دلاتا کہ اس نے بستامی کو کچھ نہیں بتایا ہے۔

"ٹھیک ہے تو نے جو کرنا تھا کر لیا ہے رحبانی......اب میں بھی روز خدا سے دعا کروں گی کہ تیرے انجام تک میری سانسیں بحال رہیں۔میں دیکھنا چاہوں گی کہ خدا تیرے ساتھ کیا کرتا ہے۔خدا التمش کے قتل اور میری بیٹی کی موت کا بدلہ کیسے لیتا ہے۔" چاند نے توقف کیا۔"پھر اس دن سنکھ میں بجاؤں گی۔"

چاند کہہ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔رحبانی اور حاجی بوا دونوں گم صم ہو چکے تھے۔

☆......☆......☆

ایک زوردار تھپڑ رحبانی نے ایمن کے منہ پر دے مارا تھا۔ایمن لڑکھڑا کر پرے ہوئی تھی اور اس کے ہاتھ میں پان کی گلوریوں سے بھری ہوئی تشتری بھی دور جا گری تھی جو وہ رحبانی کے لیے اپنے ہاتھوں سے بڑی چاہت سے بنا کر لائی تھی۔سبز اور نیلے قالین پر پان کی گلوریاں دور تک بکھر گئی تھیں اور اب وہاں بڑے بڑے تازہ سرخ دھبے نظر آنے لگے تھے۔ایمن نے حیرت سے رحبانی کی طرف دیکھا۔

اس نے آج تک رحبانی کو اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ اگر آج اس نے بنا کوئی بات پوچھے ایمن کے منہ پر تھپڑ مار دیا تھا تو یقیناً بات کچھ بڑی تھی۔

''بستامی کو تم نے ہی بتایا تھا نا کہ صندل ٹھنڈیانی میں ہے۔'' رحبانی نے پوچھا۔ اور اس کے لہجے سے عیاں تھا کہ وہ پوچھ نہیں رہا، بس تصدیق چاہ رہا ہے۔

ایمن کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ چند لمحے تو وہ قالین پر پڑے تازہ سرخ دھبے دیکھتی رہی۔ پھر رحبانی کے دوبارہ پوچھنے سے پہلے ہی بول پڑی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اگلی بار رحبانی پہلے سے زیادہ بری طرح سے پوچھے گا۔

''ہاں...... میں نے ہی بتایا تھا'' اس نے اعتراف کر لیا۔ اس جواب کی توقع ہونے کے باوجود رحبانی نے حیرت سے ایمن کو دیکھا۔

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ صندل وہاں رہ رہی ہے؟''

''وہاں ریسٹورنٹ میں میں تمہارے بدلے ہوئے رویے پر حیران ہوئی تھی۔ جب تم ہوٹل واپس آ کر سو گئے تو میں نے وہاں جا کر چھان بین کی تھی۔ اور مجھے ساری بات معلوم ہو گئی تھی۔ حویلی سے بھاگ جانے کے بعد صندل اپنے شوہر کے ساتھ وہاں رہ رہی تھی اور ان کی ایک بیٹی بھی تھی۔ میں نے بالکل دیر نہیں کی اور ساری بات بستامی کو بتا دی کیونکہ میں جانتی تھی کہ بستامی یہ سن کر بھڑک اٹھے گا۔ میرے مشورے پر اس نے ساری چال چلی۔ صندل کے گھر کو بیچ دیا۔ وہاں جھوٹے خطوط رکھے اور صندل کو گنجا کر کے گھر لے آیا۔ یہ سب میرا ہی مشورہ تھا'' ایمن ساری تفصیل بتا کر چپ ہو گئی۔ رحبانی ایمن کو ایسے دیکھنے لگا جیسے ابھی اس کی گردن دبوچ لے گا۔

''لیکن کیوں بدبخت عورت...... کیوں کیا تم نے ایسا......؟ تمہارا کیا مفاد تھا اس سب میں؟''

''کیونکہ میں چاہتی تھی کہ چاند کو دکھ ملے...... کوئی ایسا بڑا دکھ جو اس کی جان ہی لے لے اور وہ مر

جائے۔" ایمن نے بلند آواز میں کہا۔ ایسے جیسے اس کے اندر کا کوئی جوار بھاٹا ابل پڑا ہو۔ سالوں سے اس نے نفرت کے اس جذبے کو چھپا کر رکھا تھا اور اب عیاں کر رہی تھی تو پوری طرح سے کر رہی تھی۔

رحبانی جیسے ابھی بھی ساری بات نہیں سمجھا تھا۔ وہ حیرت سے ایمن کو دیکھتا جا رہا تھا۔

"میں چاہتی تھی کہ صندل کا دکھ لے کر چاند مر جائے اور ہماری زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلی جائے۔"

محبت کے ہاتھوں مجبور عورت نے دل کی بات کہہ دی تھی۔ آنسوؤں کے باعث اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔ رحبانی کو نا چاہتے ہوئے بھی اس پر ترس آیا۔

"وہ ہماری زندگی میں کہاں ہے پاگل عورت؟"

"تم تو یہ بات مت کہو رحبانی...... تم تو یہ جھوٹ نہ ہی بولو...... تمہاری تو شاید ایک ایک سانس میں ہے وہ...... تمہیں معلوم ہی نہیں کہ تم کتنی ہی بار سوتے میں اس کا نام پکارتے ہو۔ تم کتنی ہی بار اندھیرے میں مجھے چاند کہہ چکے ہو۔ کیوں بجاتے ہو سنکھ...... کیوں اندر کا غبار سنکھ کے رستے نکالتے ہو۔ اور کیوں لائے تھے میرے لیے چوڑی دار پاجامہ، کرتا اور پازیبیں...... کیا میں نہیں جانتی کہ تم مجھے اس لباس میں کیوں دیکھنا چاہتے تھے۔ مجھ میں چاند کی شبیہ تلاش کرنا چاہتے ہو۔ نہیں...... میں چاند نہیں ہو رحبانی...... میں ایمن ہوں ایمن......" ایمن بری طرح سے رونے لگی۔ رحبانی ایمن کو دیکھے گیا۔ اسے ایمن پر بے تحاشا ترس آیا۔ وہ اس کی خطاؤں کو نجانے کب سے معاف کرتی چلی آ رہی تھی۔

"ٹھنڈیانی میں بھی تم نے رات کو مجھے اپنی آغوش میں بھرتے ہوئے چاند کا نام پکارا تھا۔ اور میں نے تب ہی تہیہ کر لیا تھا کہ اب تو ہر صورت چاند کو اپنی زندگی سے نکال کر رہوں گی۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔"

رحبانی دھپ سے بیڈ پر بیٹھا۔ تو یہ تھی اس کی حقیقت...... وہ چاند کو کبھی اپنے دل سے نکال ہی نہیں پایا تھا۔ اس سے نفرت کا سوانگ بھرنے کے باوجود بھی......

چاند نہیں مری...... اور اب میں بھی ہار چکی ہوں۔ اس لیے آج تمہیں فیصلہ کرنا ہوگا رحبانی...... یا میں یا چاند...... تم کس کو اپنے دل میں رکھنا چاہتے ہو۔ اور اگر تم نے چاند کا نام لیا تو میں کھڑکی سے کود کر خودکشی کر لوں گی۔" ایمن نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ رحبانی کچھ نہیں بول سکا۔ ایمن اس کی شکل دیکھتی رہ گئی۔

"بولو رحبانی...... وعدہ کرو کہ تم آج کے بعد چاند کو سوچو گے بھی نہیں......"

رحبانی نے نظریں جھکا لی تھیں۔ وہ قالین پر پڑے دھبوں کو دیکھنے لگا۔ ایمن کی آنکھوں میں غضبناکی جھلکی تھی۔ رحبانی کی خاموشی اس کی چاند سے محبت کی گواہی تھی اور ایمن کی توہین...... ایمن کا تنفس تیز ہونے لگا۔

"میں آخری بار پوچھ رہی ہوں رحبانی...... تم چاند کو فراموش کرو گے یا نہیں......"

رحبانی تب بھی چپ رہا۔ ایمن کا جیسے غصے سے برا حال ہوگیا۔ رحبانی کو تو وہ جان سے مار نہیں سکتی تھی۔ اس لیے اپنا دوپٹا گلے سے اتار کر اس نے پرے پھینکا اور کمرے کی کھڑکی کی طرف بھاگی۔ بے دردی سے پردے پیچھے کر کے عجلت میں اس نے کھڑکی کے پٹ کھولے اور اس سے پہلے کہ وہ کھڑکی سے کود جاتی...... رحبانی نے اسے آدبوچا۔

"کیا کر رہی ہو ایمن......؟ پاگل تو نہیں ہوگئی تم......"

"ہاں...... پاگل ہوگئی ہوں میں...... تم چھوڑ دو مجھے...... مر جانے دو۔" ایمن اس کے بازوؤں میں مچلی۔

"خود کو ہوش میں لاؤ پاگل لڑکی......"

"یہ تم مجھے کہہ رہے ہو۔ ہوش میں تم آؤ رحبانی...... تمہارے دل میں کوئی اور ہے اور آغوش میں کسی اور کو بھرتے ہو۔ شرم کرو۔ اتنی منافقت تو عورت پر بھی نہیں جچتی۔ تم مرد ہو کر کرتے ہو......"

"بس کر دو...... خدا کے لیے بس کر دو۔"

''نہیں ...... آج فیصلہ ہو کر رہے گا۔ بلکہ ہو گیا ہے۔ میں آج خود کو ختم کر لوں گی۔ تمہیں چاند کو سوچنے میں مرنے تک کی آزادی مل جائے گی۔'' ایمن رحبانی کے ساتھ زور آزمائی کرنے لگی۔ اس کے ارادے بتا رہے تھے کہ وہ آج خود کو ختم کر کے ہی رہے گی۔

''میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں چاند کو بھلا دوں گا۔'' رحبانی نے کہا۔

رحبانی سے زور آزمائی کرتی ہوئی ایمن پل بھر میں تھم سی گئی تھی اور بے یقینی سے رحبانی کو دیکھنے لگی تھی۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

''اس کے متعلق سوچو گے بھی نہیں......'' ایمن کی تسلی اتنی جلدی نہیں ہونے والی تھی۔

''نہیں سوچوں گا۔'' نظریں جھکائے جیسے مجبوری میں رحبانی نے وعدہ دے دیا تھا۔ ایمن آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ مسکرائی۔ محبت میں جیت اس نے زندگی کی بازی لگا دینے کے بعد حاصل کی تھی۔ یہ سودا موجودہ وقت کے مطابق منافع بخش معلوم ہو رہا تھا لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ توجہ زبردستی سے نہیں لی جا سکتی۔ محبت مانگ کر حاصل نہیں کی جا سکتی۔ یہ گداگری کی سب سے تذلیل آمیز قسم ہے۔ یہ بات جاننے میں اسے ایک عمر درکار تھی۔ شاید بڑھاپے میں وہ بھی اس بات کو سمجھ جانے والی تھی۔ لیکن ابھی وہ خوش تھی۔ بہت خوش......اور اس خوشی میں رحبانی کے وجود میں اپنا وجود گم کر لینا چاہتی تھی۔

دن کے پرندے جیسے رات میں بے وقت جاگ اٹھے تھے۔ اور اب اپنی اپنی بولیوں سے حویلیاں کو پر ترنم بنا رہے تھے۔ مینا گلی آج جیسے کچھ زیادہ ہی مہک اٹھی تھی اور روشن بیگم کا کوٹھا کچھ زیادہ روشن تھا۔ ایمن آج ساری روشنیوں کو اپنی مٹھی میں بھر لینا چاہتی تھی۔ وہ ان روشنیوں کو کبھی خود سے جدا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ روشنی تو ریت سے بھی زیادہ بے اعتباری ہوتی ہے۔ روشنی کو تو ڈھنگ سے چھوا بھی نہیں جا سکتا۔ کجا اکٹھا کر لینا۔ پگلی نے انہی روشنیوں کو اکٹھا کرتے کرتے ساری رات بتا دی تھی۔

روشنی کی ایک الگ قسم تو رحبانی بھی دیکھ رہا تھا۔ سلوٹ زدہ مخملی بستر پر اپنے سر کے نیچے بازو رکھے وہ چھت پر لگے فانوس کو گھور رہا تھا۔ یہ فانوس پچھلے ہی دنوں لگا تھا۔ ایمن نے کہیں موم بتیوں والا فانوس دیکھ لیا تھا اور اس کے اصرار پر ہی اس کے کمرے میں موم بتیوں والا فانوس لگا دیا گیا تھا۔ اب فانوس پر لگی ساری موم بتیاں اپنے اختتامی سروں تک پہنچ چکی تھیں۔ ان کی لو مدھم ہونے لگی تھی۔ لیکن یہ مدھم لو بھی اتنی بھڑکی ہوئی تھی کہ اس پورے کوٹھے کو آگ لگا سکتی تھی۔ رحبانی نے سوچا محبت کی چنگاری بھی شاید ایسی ہی ہوتی ہے۔ راکھ میں دبی ہوئی ہی کیوں نہ ہو، بھڑک اٹھے تو پورا وجود خاکستر کر سکتی ہے۔ اب رحبانی کو اس چنگاری پر اپنے آنسوؤں کا پانی ڈالنا تھا۔ اسے اس چنگاری کو تہس نہس کرنا تھا تاکہ وہ اس کا وجود تہس نہس نہ کر سکے۔ اور دوسرا یہ کہ وہ ایمن کو وعدہ دے چکا تھا۔

کروٹ بدلتے ہوئے ایمن اس کے قریب ہوئی تھی۔ اور پھر رحبانی کے کان کے پاس آ کر اس نے ایک سرگوشی کی تھی۔

"ہمارے گھر لڑکا پیدا ہوا تو ہم اس کا نام سانول رکھیں گے۔ مجھے یہ نام بہت پسند ہے۔"

رحبانی خالی نظروں سے مدھم ہوتے فانوس کو گھورتا جا رہا تھا۔ جس کی لو اب بجھ ہی جانی چاہیے تھی۔



حاجی بوا باریشہ کو گود میں اٹھائے سلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ جب چاند نے کمرے میں داخل ہو کر ان کے ہاتھ سے باریشہ کو چھین لیا تھا۔ حاجی بوا نے حیرت سے چاند کو دیکھا۔

"چھوڑ دیں آپ اسے...... مت کیا کریں میرے کام...... آپ کی وفاداریاں اب بدل گئی ہیں۔ آپ بس رحبان کے کام کیا کریں۔" چاند غصے میں بولتی چلی گئی تھی۔ حاجی بوا اس کی شکل دیکھنے لگیں۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو چاند......"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں میں...... رحبانی کو بیٹا بنا لیا ہے آپ نے...... تو بہتر ہے کہ مجھ سے تعلق ختم

کرلیں۔ آگ اور پانی کا سنگم نہیں ہوسکتا۔ ''ہاں'' اور ''نہیں'' ایک ہی سطر میں نہیں ہوتے ہیں۔''

''تمہیں کس بات پر غصہ ہے چاند......؟''

''آپ جانتی ہیں کہ مجھے کس کس بات پر غصہ ہے۔ میرا دل غم سے پھٹا جارہا ہے۔ لیکن میں رونا نہیں چاہتی ہوں۔ میں اپنے غم کو کبھی بھی آنسوؤں کے ذریعے ہلکا نہیں کروں گی۔''

''اس سب میں میرا کیا قصور ہے۔ میں نے تو ہمیشہ تمہارا بھلا چاہا ہے۔''

''ہاں......تب تک جب تک آپ نے رحبانی کو اپنا بیٹا نہیں بنالیا تھا۔''

''تم سے بڑھ کر کون ہوگا میرے لیے چاند......میری تو ساری عمر تمہارے ساتھ نکل گئی ہے۔ میں قسم کھاتی ہوں کہ میں نے رحبانی کو اپنے سر کی قسم دی تھی اور رحبانی جھوٹ نہیں بول رہا ہے، یہ میرا دل کہتا ہے۔'' حاجی بوا نے کہا۔

چاند نے کچھ غصے سے حاجی بوا کو دیکھا۔ اسے حاجی بوا کا آخری جملہ سخت ناپسند آیا تھا۔

''بہت ہی کم عرصے میں آپ کا دل اس کے لیے سچی گواہی دینے لگا ہے۔'' چاند نے طنزیہ کہا۔

''مت بھولیں کہ اس نے میرے ساتھ کیا کیا ہے۔ اس نے التمش کا قتل کیا ہے۔ قاتل ہے وہ......اور آپ ایک قاتل کی منہ بولی ماں......''

چاند جو روپ آج دکھا رہی تھی وہ حاجی بوا نے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہوا تھا۔ چاند نے کبھی کسی پر اس قدر غصہ نہیں کیا تھا۔ وہ تیز آواز میں بات نہیں کرتی تھی۔ اگر اب وہ یہ سب کررہی تھی تو یہ اس کا حق تھا۔ اس کی بیٹی اس کی آنکھوں کے سامنے مرگئی تھی۔ پہلے وہ بیوہ ہوئی تھی اور اب جیسے لاوارث ہوگئی تھی۔ حویلی کی بربادی کا آغاز ہوچکا تھا۔ لیکن چاند یہ نہیں سمجھ رہی تھی کہ اس سب کا اصل مجرم کون ہے۔

''آج تو آپ نے مجھے روک لیا ہے۔ لیکن یاد رکھیے گا حاجی بوا......میں اپنی بیٹی کی موت کا بدلہ لے کر رہوں گی۔''

''موت کا بدلہ لینا ہے تو بستامی سے لو...... رحبانی کا کیا قصور ہے؟'' حاجی بوا بھی صاف صاف بات کرنے پر آ گئی تھیں۔ ''ویسے تو اس نے میری قسم کھائی ہے کہ اس نے بستامی کو صندل کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے۔ لیکن اگر بتایا بھی ہے تو اس کا قصور بستامی سے کہیں کم ہے۔ رحبانی کو تو تم جان سے مار دینے والی تھیں۔ اپنے بھائی کے بارے میں کیا کہو گی؟ جس نے صندل کو گنجا کیا۔ وہاں جھوٹے خطوط رکھے۔ میر زادے سے خلع کا مطالبہ کیا۔ اس کے گھر کو بیچ دیا اور اب غائب ہے۔ کہاں چھپ کر بیٹھے ہیں دونوں میاں بیوی...... حویلی واپس کیوں نہیں آ رہے ہیں۔ کیونکہ ان کے دل میں چور ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ انہوں نے غلط کیا ہے۔ وہ تمہارا غصہ ٹھنڈا ہو جانے کے بعد آئیں گے۔ تب تم ان کے ساتھ کیا کرو گی چاند...... کیا اپنے بھائی کو بھی جان سے مار دو گی؟ یا اس کا غصہ بھی رحبانی پر نکال کر اسے کچھ رعایت دینا چاہتی ہو۔ کیونکہ وہ تمہارا ماں جایا جو ہے۔''

حاجی بوا کی بات سنتے ہوئے چاند کا چہرہ سرد ہوتا چلا جا رہا تھا۔ چاند کو بھی جیسے ابھی ادراک ہوا تھا کہ اس نے اس بارے میں تو سوچا ہی نہیں ہے کہ اس نے بستامی کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے؟ اپنے سگے بھائی کے ساتھ...... اپنے ماں جائے کے ساتھ...... جو اس کی خوشیوں کے قتل کا اہم سرغنہ تھا۔

دونوں میاں بیوی اتنے دنوں سے کہاں غائب تھے۔ کیا وہ حویلی چھوڑ چکے تھے؟ نہیں...... لالچی بستامی حویلی سے اپنا حصہ لیے بنا کہیں نہیں جا سکتا ہے۔ اتنا تو چاند اپنے بھائی کو جانتی تھی۔

☆......☆......☆

افشیں کا شوہر مر گیا تھا۔ اور افشیں اپنی جوانی میں ہی بیوہ ہو گئی تھی۔ ویسے اس کی جوانی اس کے نکاح کے وقت ہی ڈھل چکی تھی۔ یہ جوانی اس وقت مزید ختم ہو گئی تھی جب اس نے عادل کی خودکشی کے بارے میں سنا تھا۔ اب بیوہ ہو جانا اس کے لیے کچھ ایسی انوکھی بات نہیں تھی۔ یہ ایسا نقصان تھا جس کا افشیں کو نہ تو کوئی دکھ تھا اور نہ ہی افسوس...... وہ خود کو اسی دن سے بیوہ سمجھے ہوئے تھے جس دن عادل نے

خودکشی کر لی تھی۔ وہ اپنے بوڑھے شوہر کے ساتھ تو پتا نہیں کس رشتے سے رہ رہی تھی۔ یہ بات وہ اتنے سالوں میں خود نہیں سمجھ سکی تھی۔ اب جب کہ وہ بیوہ ہو چکی تھی تو اسے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ اس کا شوہر زندہ اور مردہ اس کے لیے برابر تھا۔ وہ شوہر اچھا تو بہت تھا لیکن اسے قربت کی گرمائش دینے سے قاصر تھا۔ افشیں اس کے لیے نوادرات کا ایک ایسا ٹکڑا تھی جسے انسان اپنے شوق کے لیے کم اور دوسروں کو مرعوب کرنے کے لیے زیادہ خریدتا ہے۔ اس کے باوجود چونکہ افشیں اس کے نکاح میں تھی تو اس نے اپنے بوڑھے شوہر کی بہت خدمت کی تھی۔

شوہر کے مرنے کے بعد تین دن سوگ میں گزرے تھے۔ اور پھر تیسرے دن وکیل نے سب کے سامنے مرحوم کی وصیت پڑھ کر سنا دی تھی۔ جس کے تحت ساری جائیداد افشیں کے نام تھی۔ بوڑھے شوہر کے جوان بچے تو ویسے ہی اپنے باپ کے مرنے کے انتظار میں تھے۔ انہیں جلد از جلد جائیداد چاہیے تھی۔ وہ افشیں کو اس کے منہ پر کہہ دیتے تھے کہ وہ افشیں کو جائیداد میں سے ایک پھوٹی کوڑی نہیں لینے دیں گے۔ ایسے میں سب کچھ افشیں کو مل جانا ان کے لیے کسی شاک سے کم نہیں تھا۔ وکیل کے وصیت سنا دینے کے بعد سب سر جوڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ نجانے ان میں کیا طے پایا تھا۔ افشیں کو زہر دے دینے سے بھی مسئلہ حل نہیں ہو پا رہا تھا۔ اس لیے رات میں وہ سب افشیں کے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

"کیا کام ہے؟" افشیں نے ان سب کو دیکھ کر پوچھا تھا۔ جو گدھوں کی طرح اس کر گرد منڈلانے لگے تھے۔

"اس پیپر پر سائن کر دو۔ اور دس لاکھ لے کر یہاں سے چلی جاؤ...... ہم تمہیں اس سے زیادہ نہیں دے سکتے ہیں۔" بڑے بیٹے نے کہا۔ افشیں اس کی شکل دیکھنے لگی۔ ابھی تو ان کے مرحوم باپ کا کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا۔ اور وہ سب سودے بازی پر اتر آئے تھے۔

"تمہاری اس گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ تم بس چند ماہ ہمارے باپ کے نکاح میں رہی ہو۔ لیکن

ہم تمہیں سوتیلی ماں کا بھی درجہ نہیں دے سکتے ہیں۔ اس لیے اپنے باپ کی جائیداد ہم تمہیں لینے نہیں دیں گے۔ ہمارے پاس بہت سے اور طریقے بھی ہیں جائیداد واپس لینے کے...... یہ سب سے آسان اور مہذب طریقہ ہے۔ تمہارے لیے بھی اور ہمارے لیے بھی......"

افشیں کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے...... اس کا مرحوم شوہر سب کچھ اس کے نام لگا کر گیا تھا۔ یہ سب اس کی خواہش تھی۔ اس کا فیصلہ تھا۔ ورنہ افشیں تو چاہتی تھی کہ وہ اپنی زندگی میں سب اپنے بچوں کے نام کر دے۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اب افشیں نے اس کے فیصلے کا احترام کرنا تھا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ ایسا نہیں کر سکے گی۔ اس کے پانچ بچوں کے آگے وہ بے بس تھی۔

"یہ لو......" بڑی بیٹی نے دس لاکھ کی گڈیاں افشیں کے آگے رکھیں۔ "میرے خیال سے یہ تمہارے لیے بہت ہونا چاہیے۔ تم نے اور تمہارے گھر والوں نے جو سوچ کر میرے باپ سے شادی کی تھی اس کی بہت ہی مناسب قیمت ہے۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی ہے۔"

افشیں کیا بولتی...... وہ تو سوچ میں گم تھی۔

"کیا میں گھر میں سے کسی کو بلا لوں؟"

"نہیں...... اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم معاملے کو طول دینا نہیں چاہتے۔ تم سائن کرو اور یہاں سے چلی جاؤ۔"

"میں اکیلی حویلیاں نہیں جا سکتی ہوں۔"

"فکر مت کرو...... گھر کا ڈرائیور تمہیں بحفاظت حویلیاں چھوڑ کر آئے گا۔"

افشیں جانتی تھی کہ اسے بچوں کی ماننا پڑے گی۔ ان کے چہروں پر لکھا تھا کہ وہ ہر صورت جائیداد لے کر رہیں گے۔ چاہے اس کے بدلے میں انہیں افشیں کو جان سے ہی کیوں نہ مارنا پڑے۔ اور افشیں اب کسی نئی مصیبت میں نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ وہ جلد سے جلد حویلیاں واپس جانا چاہتی تھی۔ اپنی ماں اور

کزنوں سے ملنا چاہتی تھی۔ اسے دس لاکھ تو نہیں چاہیے تھے۔ لیکن پھر اس نے سوچا کہ اس کا بھی کچھ حق ہے۔ اگر وہ یہ پیسے لے جا کر اپنی ماں کو دیتی ہے تو روشانے کی شادی پر کام آ سکتے ہیں۔

''زیادہ مت سوچو...... ان پیپرز پر سائن کر دو۔ ہم دونوں کے لیے یہ بہت مناسب سودا ہے۔''

بڑے بیٹے نے پھر سے کہا تھا۔

افشیں نے پیپر پکڑ لیے تھے اور پین بھی...... پانچوں بچے مسکرانے لگے۔ ان کا کام آسانی سے ہونے جا رہا تھا۔

افشیں پیپر پر سائن کرنے ہی والی تھی کہ وہاں کسی کی رعب دار آواز گونجی۔

''کیا ہو رہا ہے یہاں......؟'' افشیں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے سامنے بستامی کھڑا تھا۔

افشیں کاغذ پین وہیں چھوڑ کر بستامی بابا کے پاس گئی اور ان کے گلے سے لگ گئی تھی۔

''میں بیوہ ہو گئی بستامی بابا...... میں بیوہ ہو گئی ہوں۔'' ان کے سینے سے لگ کر وہ رونے لگی۔

''جانتا ہوں میں......'' بستامی نے کہا تھا اور پھر پیار سے افشیں کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا تھا۔

''سب جانتا ہوں۔ اسی لیے تو یہاں آیا ہوں۔'' افشیں کو سینے سے لگائے بستامی پانچوں بہن بھائیوں کو خونخوار نظروں سے دیکھنے لگا تھا۔

پانچوں بہن بھائی سمجھ چکے تھے کہ ان کا آسان کام اب مشکل ہو چکا ہے۔

☆......☆......☆

''میں چاند اور صندل کو جان سے مار دوں گی زوہیب...... میں بتا رہی ہوں۔ میں ایسا ہی کروں گی۔'' ہوٹل پہنچ کر زویا غصے سے بے قابو ہو چکی تھی۔

''پلیز زویا...... ریلیکس ہو جاؤ......''

''نہیں...... میں ریلیکس نہیں ہو سکتی ہوں۔ میں تم سے کہہ رہی ہوں کہ تم مجھے حویلیاں لے

جاؤ...... تم مجھے ہوٹل لے کر آ گئے ہو۔ اگر تم مجھے وہاں لے کر نہیں گئے تو میں اکیلی چلی جاؤں گی۔''

''میں تمہیں لے جاؤں گا زویا...... لیکن تم بہت غصے میں ہو۔ پہلے تھوڑا ریلیکس ہو جاؤ...... اس طرح وہاں جانا معاملات کو بگاڑ سکتا ہے۔''

''معاملات سنبھالنے کو اب رہ ہی کیا گیا ہے۔ تم نے دیکھا نہیں صندل نے طلاق مانگ لی ہے۔ وہ چالاک لڑکی تو اپنی طرف سے قصہ ہی ختم کر چکی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ تم میرے کہنے پر کچھ دیر انتظار کرو۔ ہم کل صبح وہاں جائیں گے۔ وعدہ...... تب تک تم کچھ نارمل ہو چکی ہو گی۔''

''نہیں...... مجھے آج ہی وہاں جانا ہے زوہیب...... اور ابھی جانا ہے۔'' زویا نے ضدی پن سے کہا۔ ''اور اگر تم مجھے ابھی حویلیاں نہ لے کر گئے تو میں خود ہی چلی جاؤں گی۔ میں خود ان ماں بیٹی سے بات کروں گی۔''

زوہیب زویا کے آگے بے بس ہوتا جا رہا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ تم ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھوؤ...... اس سے بھی تمہاری طبیعت میں فرق پڑے گا۔ اب اتنا تو کر ہی سکتی ہو نا میرے کہنے پر...... پھر ہم ابھی حویلیاں چلتے ہیں۔''

زوہیب نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔ اس کا مطالبہ معمولی تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ زویا پر گراں گزر رہا تھا۔

کیونکہ وہ ایک لمحہ ضائع کیے بنا حویلیاں پہنچ کر چاند اور صندل کی گردنوں کو دبوچ لینا چاہتی تھی۔ لیکن زوہیب کی درخواست پر انکار بھی ممکن نہیں تھا۔ اس لیے زویا چار و ناچار اٹھ کر غسل خانے میں چلی گئی۔ اور اپنے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھپاکے مارنے لگی۔

کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ زوہیب نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے ہوٹل کا

ملازم لڑکا کھڑا تھا۔

''ہسپتال سے فون آیا ہے۔ وہ لوگ آپ سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نیچے آ جائیں وہ دو منٹ بعد دوبارہ کال کریں گے۔'' ملازم نے کہا۔

زوہیب اس کے ساتھ ہی نیچے استقبالیہ پر گیا تھا۔ دو تین منٹ کے وقفے کے بعد ہسپتال سے ڈاکٹر کا فون آ گیا تھا۔ جہاں وہ ہوٹل کا نمبر دے آئے تھے۔

''جی بولیے ڈاکٹر صاحب......''

''آپ لوگ فوراً سے ہسپتال آ جائیں۔ آپ کے مریض کی حالت زیادہ بہتر نہیں ہے۔'' ڈاکٹر نے زوہیب کو بتایا تھا۔

خود پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارنے کے بعد زویا غسل خانے سے باہر نکل آئی تھی۔ اس عمل نے اس کے غصے میں ذرہ برابر فرق ہی ڈالا تھا۔ اندر بھڑکتی غصے کی آگ ٹھنڈی ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔

''ٹھیک ہے؟ اب چلو......'' زویا نے کہا۔ لیکن زوہیب تو کمرے میں موجود ہی نہیں تھا۔ زویا دائیں بائیں دیکھنے لگی۔ چند لمحوں کے بعد زوہیب کمرے میں داخل ہوا۔

''تم کہاں چلے گئے تھے؟'' زویا نے پوچھا۔ زوہیب سرد چہرے کے ساتھ زویا کو دیکھنے لگا۔ اس کے دیکھنے میں ایسا کچھ تھا کہ زویا کا دل ڈوبنے لگا تھا۔

☆......☆......☆

رات گہری سے بھی کہیں آگے نکل گئی تھی۔ نجانے رات کا کون سا پہر چل رہا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے دھرتی پر کوئی ذی روح موجود نہیں ہے۔ ازلوں سے یہ درخت ہی ہیں جو دھرتی پر ایستادہ ہیں۔

چلتے چلتے چاند کے پاؤں شل ہو چکے تھے۔ وہ نجانے کب سے تو پیدل چل رہی تھی۔ اس نے جوتی پہنی ہوئی تھی لیکن اونچی نیچی زمین نے اس کے پاؤں میں دکھن پیدا کر دی تھی۔ ایک تو یہ بنسواڑی کا

علاقہ بھی آج نجانے کہاں رہ گیا تھا۔ وہ پہلے تو اتنی دور نہیں ہوا کرتا تھا۔ آج تو وہ جیسے سرحد پار چلا گیا تھا۔ چلتے چلتے چاند تھک چکی تھی۔ پھر جیسے اللہ اللہ کر کے بنسواڑی کا علاقہ آیا تھا۔ جہاں سارے میں بانس کی بنسلوچن کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ دائیں بائیں دیکھتے ہوئے چاند بانسوں کے جنگل میں گم ہو گئی تھی۔

چودھویں کا چاند بانس کے سروں پر چمک رہا تھا۔ لمبے بانس چاندنی کی روشنی کو سمو کر خودکشی کر رہے تھے۔ یہ ان کے اندر کی بنسلوچن کے تیار ہونے کا وقت تھا۔ ایسے میں ایک گنجی عورت جو سفید لباس میں لپٹی ہوئی تھی، نجانے کیوں ان کے کام میں خلل ڈالنے چلی آئی تھی۔ پودوں، پتوں کو بے دردی سے پیچھے کرتے ہوئے وہ نجانے کیا تلاش کر رہی تھی۔

چاند بہت دیر تک اس علاقے میں گھومتی رہی۔ اس نے بہت دنوں آج کی رات کا انتظار کیا تھا۔ چودھویں کی رات کا...... جب وہ کھمبی بوٹی سنجیونی بوٹی کی طرح چمکتی ہے۔ چاند زمین کو کھوجتی ہوئی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر ایک جگہ پہنچ کر وہ رکی۔ ایک کھمبی چمک رہی تھی۔ جس کے بارے میں ایک بار اسے دین بابا نے بتایا تھا کہ اسے کھانے سے انسان کی موت ہو جاتی ہے۔ سارا علاقہ گھوم کر چاند نے بہت سی کھمبیوں کو اکٹھا کر لیا تھا۔ اور اپنے دوپٹے کے پلو میں باندھ لیا تھا۔

واپسی کا سفر ہرگز تھکا دینے والا نہیں تھا۔ کیونکہ اسے جو چاہیے تھا وہ اسے مل گیا تھا۔ رازداری سے وہ حویلی کے اندر داخل ہوئی تھی۔ وہ کسی کو کچھ نہیں بتانا چاہتی تھی کہ وہ کیا کرنے والی ہے۔

اگلے چند دنوں میں اس نے ان کھمبیوں کو دھوپ میں سکھا لیا تھا۔ اور پھر دین بابا کا لوہے کا ہاون دستہ درگا مورتی والے کمرے سے نکالا۔ یہ ہاون دستہ دین بابا کبھی کبھی ہی استعمال کیا کرتے تھے۔ جب انہیں اپنے لیے گھر پر کوئی دوا بنانا ہوتی تھی۔

چاند نے سوکھی کھمبیوں کو ہاون دستے میں ڈالا تھا اور پھر دستے کی کاری ضرب ہاون پر ماری۔ یہ ضرب اتنی گونج دار تھی کہ رحمانی کی سنکھ کی سو آوازیں مل کر بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔

چہرے پر نفرت لیے، اور دل کو سخت کیے چاند مضبوط ہاون پر وزنی دستہ مارتی جا رہی تھی۔

☆......☆......☆

"بستامی بابا! یہ آپ مجھے کہاں لے آئے ہیں؟ مجھے تو حویلیاں جانا تھا۔ اپنی ماں سے ملنا تھا۔" افشیں نے بے قراری سے کہا۔ بیوہ ہو جانے کے بعد وہ بے چاری اپنے گھر جانا چاہتی تھی۔ اپنی ماں کے گلے سے لگ کر سالوں کا رونا رونا چاہتی تھی اور بستامی اسے نجانے کہاں لے آیا تھا۔

"میں تمہیں یہاں کسی مصلحت کے تحت ہی لایا ہوں افشیں......" بستامی نے پیار سے کہا۔

افشیں نے سوالیہ انداز میں بستامی کو دیکھا۔

"تمہاری ماں کی طبیعت ان دنوں کچھ خراب ہے۔ تم وہاں جاؤ گی اور تہمینہ پھپھو کو پتا چلے گا کہ تم بیوہ ہو چکی ہو تو وہ مزید پریشان ہو جائیں گی۔ ان کی طبیعت مزید خراب ہو جائے گی۔ اس لیے تم چند دن یہاں رہ لو...... پھر حویلیاں چلی جانا۔"

"کیا ہوا ہے امی کو......؟" افشیں گھبرا گئی تھی۔

"زیادہ کچھ نہیں...... گھبرانے والی کوئی بات نہیں ہے۔ موسمی بخار ہے بس...... لیکن تمہاری بیوگی کا سن کر وہ مزید بیمار ہو سکتی ہیں۔"

"جی کہہ تو آپ ٹھیک رہے ہیں۔"

"تم نہیں جانتیں کہ تمہارے پیچھے حویلی میں کیا کیا ہوا ہے۔" بستامی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

افشیں مزید پریشان ہو گئی۔ بستامی کا لہجہ ایسا تھا جیسے کچھ بہت ہی برا ہو چکا ہو۔

"کیا...... کیا ہوا ہے؟"

"صندل اس لڑکے میرزاد کے ساتھ عین نکاح والے دن گھر سے بھاگ گئی تھی۔ وہ دونوں ٹھنڈیانی میں جا کر رہنے لگے تھے۔ جس جگہ صندل کی شادی ہونا تھی، وہاں تعبیر کی شادی کر دی گئی۔ اور

شادی کے محض دو ماہ بعد ہی تعبیر وہاں سیڑھیوں سے گر گئی اور اس کی موت ہو گئی۔"

"کیا......؟ تعبیر مر گئی ہے؟"

"ہاں......وہ مر گئی۔ قسمت کو یہی منظور تھا۔ اس کی موت کے بعد زہرہ پھپھو بہت مشکل سے سنبھلی ہیں۔ تم حویلیاں جاؤ گی تو زہرہ پھپھو کے سامنے زیادہ مت رونا......ان کا غم پھر سے تازہ ہو جائے گا۔"

افشیں کے آنسو جاری ہو چکے تھے۔ تعبیر کی موت اس کے لیے اپنے بیوہ ہو جانے سے بھی بڑا صدمہ تھا۔

"اور بھی اس کے علاوہ بہت کچھ ہوا ہے۔ جو میں تمہیں ابھی نہیں بتا سکتا ہوں۔ تمہیں خود حویلیاں جا کر معلوم ہو جائے گا۔"

"اس سے برا کیا ہو گا۔ میری پیاری کزن تعبیر مر گئی۔" افشیں پچھلے کچھ دنوں اتنا روئی تھی کہ اب اس سے ٹھیک سے رویا بھی نہیں جا رہا تھا۔ "اور صندل......وہ اب کیسی ہے؟"

"اسے میں حویلی واپس لے آیا تھا، اس کی بیٹی باریشہ کے ساتھ......تم حویلی جاؤ گی تو اس سے مل لینا۔ تہمینہ پھپھو کی طبیعت کچھ سنبھل جائے گی تو پھر میں تمہیں حویلیاں لے جاؤں گا۔" بستامی کہہ کر اٹھا تھا اور پھر وہاں سے باہر چلا گیا۔

افشیں کتنی ہی دیر بنا آواز کے تعبیر کی موت پر آنسو بہاتی رہی تھی۔ اللہ......زندگی سے کس قدر بھرپور تھی اس کی کزن......موت کے فرشتے نے کیسے اس کی جان قبض کی ہو گی۔

افشیں جہاں رہ رہی تھی وہ اسلام آباد کا ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ جس کے بارے میں بستامی نے اسے بتایا تھا کہ وہ گھر اس کے ایک دوست کا ہے اور وہاں وہ سکون سے رہ سکتی ہے۔ افشیں وہاں سکون سے ہی رہ رہی تھی۔ گھر میں ہر سہولت موجود تھی۔ کھانے پینے کا سارا سامان بھی موجود تھا۔ افشیں کو کسی قسم کی کوئی دقت نہیں تھی۔ بستامی اکثر وہاں آجاتا تھا۔ اور اس کے ساتھ کومل بھی ہوتی تھی۔ بستامی نے

اسے بتا دیا تھا کہ اس نے کومل سے شادی کر لی ہے اور یہ شادی چاند نے ہی کروائی ہے۔ اسی نسبت سے افشیں کومل کو کومل آنٹی کہنے لگی تھی۔

افشیں ایک ایک دن گنتے ہوئے وہاں رہ رہی تھی۔ وہ جلد سے جلد حویلیاں جانا چاہتی تھی اپنی ماں سے ملنا چاہتی تھی لیکن بستامی اسے حویلیاں لے کر ہی نہیں جا رہا تھا۔ کبھی وہ کوئی پیپر لے آتا تھا کبھی کوئی...... کبھی کسی پر افشیں کے سائن اور کبھی کسی پر......

''آپ یہ جائیداد ان بچوں کو دے دیں بستامی بابا...... مجھے کچھ نہیں چاہیے۔''

''تم پاگل ہو افشیں...... اپنا حصہ کون چھوڑتا ہے۔'' بستامی اسے جھڑکتا۔ کومل بھی اس کے ساتھ مل جاتی۔

''تمہارا شوہر مرنے سے پہلے سب کچھ تمہارے نام کر کے گیا ہے۔ وہ سب تمہارا ہے۔ بچے تو ویسے بھی باپ کے ساتھ مخلص نہیں تھے۔ بہتر ہے کہ انہیں کچھ نہ ہی ملے۔'' کومل نے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔

ان دونوں کے آگے افشیں بے بس ہو جاتی تھی۔ وہ تو ویسے بھی ساری زندگی چھوئی موئی بنی رہی تھی۔ بستامی بے شک اس کا کزن تھا لیکن عمر میں اس سے کافی بڑا تھا۔ اس لیے بستامی کی شخصیت کا بہت زیادہ رعب تھا۔ دوسری کومل تھی۔ جو سگریٹ پیتے ہوئے، نائٹی میں گھومتے ہوئے افشیں کو کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگا کرتی تھی۔

''چاند امی نے کیا سوچ کر بستامی بابا کی شادی کومل سے کروا دی۔'' دونوں کو دیکھتے ہوئے وہ اکثر سوچا کرتی تھی۔ اور ویسا ہی کرتی جا رہی تھی جیسا کہ بستامی اسے کرنے کو کہہ رہا تھا۔ ساری جائیداد قانونی طور پر افشیں کے نام ہو چکی تھی۔ جواب دن بدن بک رہی تھی۔ افشیں دل سے ایسا نہیں چاہتی تھی۔ وہ تصور ہی تصور میں اپنے بوڑھے شوہر کی اولاد کو دن بدن کنگال ہوتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ وہ سمجھ سکتی

تھی کہ ان بچوں کے ساتھ کیا بیت رہی ہوگی۔ وہ باپ کے ساتھ مخلص تھے یا نہیں لیکن باپ کی جائیداد کے سوا ان کے پاس اور کچھ نہ تھا۔ وہ یقیناً سڑکوں پر آ گئے ہوں گے۔ اور چھوٹی موئی سی افشیں اتنی حیثیت ہی کہاں رکھتی تھی کہ اپنے حق میں یا ان بچوں کے حق میں کوئی بات کر سکتی۔ رفتہ رفتہ ساری جائیداد بک گئی تھی۔ بستامی نے جس جس پیپر پر سائن کروانے تھے وہ کروا چکا تھا۔ افشیں بستامی کے ساتھ لاہور کے پتا نہیں کس کس دفتر میں گئی تھی۔ اور جو جو بستامی اسے کرنے کو کہتا جاتا تھا، وہ کرتی جاتی تھی۔ اور جب سب بک گیا تھا تو افشیں نے ایک سکون کا سانس لیا تھا۔ اب وہ اپنی ماں سے ملنے جا سکتی تھی۔ اتنے بہت سے دنوں میں وہ اتنی بات تو سمجھ ہی گئی تھی کہ بستامی نے اسے اس کی ماں کی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے یہاں نہیں روکا ہوا، بلکہ جائیداد کے لیے روکا ہوا ہے۔

''شاید بستامی بابا کے دل میں یہ ڈر ہو کہ میں جائیداد میں سے کچھ حصہ بچوں کو نہ دے دوں۔''

بے چاری افشیں کی طرح اس کی سوچ بھی چھوٹی موئی تھی۔

''کل میں تمہیں حویلیاں لے جاؤں گا افشیں ...... شام میں تیار رہنا۔'' بستامی نے اس سے کہا تھا۔ خوشی سے افشیں کا چہرہ دمکنے لگا تھا۔ اسی خوشی کی وجہ سے اسے اس رات میں بھوک ہی نہیں لگی تھی۔ وہ اپنی ماں سے ملنے جا رہی تھی۔ اپنی کزنوں سے، چاند امی سے...... اور صندل اور اس کی بیٹی باریشہ سے...... پتا نہیں کیسی ہوگی صندل کی بیٹی...... یقیناً اسی کی طرح کی ہوگی۔ خوب صورت اور معصوم......

رات کے کسی پہر افشیں کو بھوک کا احساس ہوا۔ اور پھر یہ احساس بڑھتا ہی چلا گیا۔ افشیں نے کل دن میں اپنے لیے دال چاول بنائے تھے۔ اسے یاد تھا کہ کچھ تھوڑے سے اس نے فریج میں رکھے تھے۔ جو یقیناً وہاں ہی ہوں گے۔ کیونکہ کومل کو اس کے ہاتھ کا کھانا پسند نہیں تھا، وہ اپنے لیے باہر سے کھانا منگواتی تھی۔

خود پر چادر اوڑھ کر وہ کمرے سے باہر چلی آئی تھی۔ کچن کی طرف جاتے ہوئے وہ لاؤنج کے

آگے سے گزر رہی تھی جب اندر سے اسے بستامی اور کومل کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ ناچاہتے ہوئے بھی افشیں دونوں کی بات چیت سننے لگی۔

''میں تم سے کہہ رہی ہوں بستامی کہ یہ سارے پیسے بہت کم ہیں۔ میرے خوابوں کے آگے تو بہت ہی کم ہیں۔ میں اسلام آباد میں ایک عالی شان گھر خریدنا چاہتی ہوں۔''

''افشیں کے شوہر کی ساری جائیداد بک گئی ہے۔ صندل کے گھر کے سارے پیسے بھی تمہیں دے چکا ہوں۔ مزید پیسے کہاں سے لاؤں۔''

''کچھ کرو بستامی...... تم بات کو سمجھ نہیں رہے ہو۔ میں کب سے تمہیں کہہ رہی تھی کہ دارالحکومت بن جانے کے بعد اسلام آباد اب پہاڑی علاقہ نہیں رہ جائے گا۔ یہاں زمین کی قیمت دنوں میں بڑھے گی۔ اور دیکھو...... ایسا ہی ہوا ہے۔ جو ریٹ سال پہلے تھا، اب اس سے دوگنا ہو چکا ہے۔ پھر بھی ابھی سب پہنچ میں ہے۔ آنے والے وقت میں یہ پاکستان کا سب سے مہنگا شہر ہوگا۔ ہمیں کسی بھی طرح کر کے یہاں زیادہ سے زیادہ جگہ لینا ہوگی۔''

''لیکن کیسے؟''

''ایسا کرو...... تم حویلی بیچ دو۔''

''نہیں بیچ سکتا۔ اس میں چاند کا بھی حصہ ہے۔ اور چاند تو ہرگز حویلی نہ بیچے گی۔ اور اب جب صندل مر چکی ہے، اور وہ ہمیں صندل کا قاتل سمجھ رہی ہے، اب تو وہ میری بات کبھی نہیں مانے گی۔''

لاؤنج کے باہر کھڑی افشیں کو چکر آیا تھا۔

''صندل مر چکی ہے۔''

''ملازم بتا رہا تھا کہ چاند کی آنکھوں میں خون اترا ہوا ہے۔ وہ ہمارے حویلیاں پہنچنے کے انتظار میں ہے۔ وہ مجھے جان سے مارنے کی پوری تیاری کر کے بیٹھی ہوئی ہے۔''

''چاند کو تو میں خود دیکھ لوں گی۔ صندل نے خودکشی کی ہے، میں نے یا تم نے اسے جان سے نہیں مارا ہے۔''

''ہاں......لیکن اس کی خودکشی میں میں شریک ہوں۔''

''ویسے تم سے کس نے کہا تھا بستامی کہ صندل کو گنجا کر کے حویلی میں لاؤ......گھر بیچ دینے تک تو بات ٹھیک تھی۔ میرزاد کے لیے جھوٹے خطوط رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہمیں کیا لینا دینا کہ میرزاد اور صندل ساتھ میں رہتے ہیں یا ان میں طلاق ہو جاتی ہے۔ پھر تم نے غنڈوں کے ذریعے میرزاد کی پٹائی بھی کروائی۔ اسے زخمی کروایا۔''

''میں نے ایسا ایمن کے کہنے پر کیا تھا۔''

''ایمن تو بالکل پاگل ہے۔ رحبانی کی محبت میں وہ چاند کو تڑپانا چاہتی تھی اور کچھ نہیں......خیر چھوڑو یہ سب باتیں......جہنم میں جائے حویلی اور حویلی والے......تم ایسا کرو کہ کسی بھی طرح پیسوں کا بندوبست کرو۔''

''تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں......سارہ کی بھی وہ قیمت نہیں مل سکی جو سوچا تھا۔ تعبیر کے گاہک نے تو ایک ہی بار میں سب دے دیا ہے۔ وہ تو ایک پیسہ بھی نہیں دے گا۔ اب آگے زارا، روشانے اور کرن ہیں۔ ان کی کیا قیمت ملتی ہے، کون جانتا ہے۔''

''روشانے کے لیے میں نے ایک بڑی اونچی آسامی پھنسا رکھی ہے۔ اسے روشانے کی تصویر بھی دکھا دی ہے۔ وہ ایک بڑی رقم دینے کو تیار ہو گیا ہے۔ زارا کچھ موٹی اور بھدی ہے اس کے حوالے سے تو میں مایوس ہی ہوں۔ لیکن کرن کی اچھی رقم مل سکتی ہے۔ روشن بیگم نے کہا تھا کہ وہ اسے دہلی بھجوا سکتی ہیں۔ اگر تم رضامندی دو تو......''

''مجھے کیا اعتراض ہوگا بھلا......''

"ٹھیک ہے۔ پھر یہ کام جلد سے جلد کرنا ہے۔ اب تو افشیں بھی ہمارے ہاتھ لگ چکی ہے۔ اس کی پھر سے کسی بوڑھے سے شادی کی جاسکتی ہے۔ مجھے اسلام آباد میں ایک بہت بڑا گھر چاہیے۔ سوئمنگ پول والا اور بڑے سے لان والا......" کومل بتاتی جارہی تھی اور بستامی چپ سا ہوگیا تھا۔ اس کے چہرے پر جیسے سردی اتر آئی تھی۔ پھر کومل نے وہاں دیکھا تھا جہاں دیکھتے ہوئے بستامی برف بن گیا تھا۔ وہاں افشیں کھڑی تھی۔ اور اس کے چہرے پر صاف لکھا تھا کہ وہ دونوں کی ساری گفتگو سن چکی ہے۔

☆......☆......☆

"آپ کے بھائی کی حالت بہت خراب ہو چکی ہے۔ آپ کو ہر بات کے لیے اپنا ذہن بنا لینا چاہیے۔" ڈاکٹر نے نرم مزاجی میں بہت بڑی بات کہہ دی تھی۔

"کس...... کس طرح کا ذہن...... کیا میرزاد کی موت کا ذہن......؟" زویا نے کپکپاتے لہجے میں پوچھا۔

ڈاکٹر خاموش رہا۔ اس کی خاموشی اس بات کی طرف اشارہ تھی کہ زویا کے سوال کا جواب "ہاں" میں ہے۔

"یہ...... یہ ڈاکٹر کیا کہہ رہے ہیں زوہیب...... کیا میرزاد مرنے والا ہے؟ میرا بھائی مرنے والا ہے؟" زویا کے لہجے کے ساتھ ساتھ پورا وجود کانپنے لگا تھا۔

"خود کو سنبھالو زویا...... پلیز خود کو سنبھالو...... میں اکیلا یہ سب نہیں سنبھال سکوں گا۔" زوہیب بری طرح سے پریشان ہو چکا تھا۔

"ایسا کیا ہو گیا ہے میرے بھائی کے ساتھ ڈاکٹر...... اس کا کوئی ایکسیڈنٹ نہیں ہوا، وہ کہیں اونچائی سے گرا نہیں ہے۔ کوئی موذی مرض نہیں ہے اسے...... ایک لڑائی جھگڑے کی چوٹ ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ وہ ٹھیک نہیں ہو سکتا ہے۔"

''چوٹ دماغ پر آئی ہے۔ ایسے جیسے کسی نے جان بوجھ کر دماغ کے اس حصے کو زخمی کیا ہے۔ پورے ایبٹ آباد میں دماغ کا کوئی ایک بھی ہسپتال نہیں ہے۔ آپ اپنے بھائی کو لے کر لاہور یا کراچی کے کسی بڑے ہسپتال چلی جائیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہاں پر اس علاج کی بہتر سہولیات موجود ہوں۔''

''اور اگر وہاں پر بھی نہ ہوئیں تو...... وہاں پر بھی میرے بھائی کا علاج نہ ہو سکا تو......'' زویا رو دینے کو تھی۔ یا شاید وہ رو ہی رہی تھی۔ بس ظاہری طور پر اس کے آنسو نہیں گر رہے تھے۔

''کیا ہم اسے لندن لے کر جا سکتے ہیں؟'' زوہیب نے اچانک سے پوچھا۔ یہ خیال ابھی ابھی اس کے ذہن میں آیا تھا۔

''ہاں...... کیوں نہیں...... وہاں پر تو یقیناً علاج کی بہت بہتر سہولیات ہوں گی۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

زویا اور زوہیب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

آنے والے چند دن بہت مصروفیت لیے ہوئے تھے۔ زوہیب میرزاد کو لندن لے جانے کے حوالے سے سارے انتظامات مکمل کروا رہا تھا۔ اور زویا پل بھر کے لیے بھی اپنے بھائی سے جدا نہیں ہو رہی تھی۔ وہ میرزاد کے بیڈ کے پاس بیٹھی رہتی تھی اور اس کے سانسوں کی روانی کو پرکھنے کے لیے اس کے پیٹ کو اوپر نیچے ہوتا ہوا دیکھتی رہتی تھی۔ اس کے دل میں ڈر سا بیٹھ گیا تھا کہ اگر وہ پل بھر کے لیے بھی اپنی نظریں ادھر ادھر کرے گی تو میرزاد کی سانسوں کی روانی رک جائے گی۔ وہ ان دنوں کچھ کھا نہیں رہی تھی۔ بھوک تو دور اسے تو پیاس بھی نہیں لگ رہی تھی۔ اب اس کے ذہن میں لندن سوار تھا۔ وہ جلد سے جلد اپنے بھائی کو لندن لے کر چلے جانا چاہتی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ لندن پہنچتے ہی میرزاد پہلے کی طرح کا ہو جائے گا۔ ہشاش بشاش...... جوانی سے بھرپور...... لیکن ایسا کچھ نہیں ہونے والا تھا۔ اور یہ بات بھلا زویا کہاں جانتی تھی۔

میرزاد کا پاسپورٹ نہیں بنا ہوا تھا۔ لیکن زوہیب اور ڈاکٹر کی کوششوں کے بعد بہت سے ناممکن

کام ممکن ہوئے تھے۔ مریض کی حالت کے پیش نظر اسے خصوصی اجازت مل گئی تھی اور زویا اور زوہیب اسے لے کر لندن جانے والے تھے۔

ان کی فلائٹ اسلام آباد سے تھی۔ ایبٹ آباد سے اسلام آباد وہ لوگ ایمبولینس میں میرزاد کو لے جا رہے تھے۔ ایمبولینس جب حویلیاں سے گزر رہی تھی تو زویا کے چہرے کی سختی اور دل کی نفرت بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے بہت دور سے ہی دین حویلی کی عمارت نظر آنے لگی تھی۔ یا شاید یہ اس کی نظر کا دھوکا تھا۔ اسے ہر گھر دین حویلی کی طرح کا دکھنے لگا تھا۔

''قسم کھاتی ہوں چاند...... تم سے اپنے بھائی کی اس حالت کا بدلہ ضرور لوں گی۔'' حویلیاں کی طرف دیکھتے ہوئے زویا نے دل میں پختہ ارادہ کیا تھا۔

☆......☆......☆

کومل اور بستامی حویلی میں ایسے داخل ہوئے تھے جیسے وہاں چوری کرنے آئے ہوں۔ بستامی تو کچھ زیادہ ہی ڈرا ہوا تھا جبکہ کومل کچھ مطمئن تھی۔ وہ چاند کی بہادری اور بغاوت کو بہت اچھے سے جانتی تھی۔ اس کا غصہ بستامی کے بال کھینچ لینے کی ہمت ہی کر سکتا تھا۔ وہ ابھی اتنی بہادر نہیں ہوئی تھی کہ بستامی پر گولی چلا سکتی یا اسے زہر دے سکتی۔ اس لیے کومل پر سکون تھی۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ اس نے کس کس بات کا کیا کیا جواب دینا ہے۔ وہ چاند پر ہی چڑھائی کرنے کا سوچ کر آئی تھی۔ روشن بیگم کی تربیت لیے کومل ہر طرح سے چاند کو غلط ثابت کر سکتی تھی۔

لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا جیسا کومل اور بستامی نے سوچا تھا۔ وہ دونوں حویلی میں داخل ہوئے تو سامنے کا صحن خالی تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ زہرہ اور شکیلہ پھپھو دالان میں بیٹھی کچھ کام کر رہی تھیں۔ ان دونوں کو دیکھ کر وہ خاموشی سے اٹھیں اور وہاں سے اندر چلی گئی تھیں۔ یہ ان کی ناراضی کی واضح نشانی تھی۔

''دیکھو ذرا...... ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والے...... ہمیں ہی تیور دکھا رہے ہیں۔ ہم اتنے دنوں

کے بعد حویلی آئے ہیں۔اور کسی نے حال پوچھنا گوارا نہیں کیا۔'' کومل نے منہ چڑھا کر کہا۔

''یہ سب باتیں کمرے میں جا کر کرنا۔''

''تم ڈروان سے...... میں تو نہیں ڈرنے والی......''

وہ دونوں اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے جب چاند سیڑھیوں سے اتر کر وہاں آئی تھی۔ چاند نے دونوں کو دیکھا۔اور دونوں نے بھی چاند کو دیکھا۔ چاند کے چہرے پر سرد مہری تھی۔لب ایسے بند تھے جیسے کبھی بات تک نہ کی ہو......

''ک...... کیسی ہو چاند......؟'' کومل نے نارمل سے انداز میں مسکرا کر پوچھا۔ چاند نے کومل کو دیکھا اور پھر بستامی کو...... چند لمحے وہ دونوں کو اسی طرح دیکھتی رہی تھی۔

''ہم ایک ضروری کام کے سلسلے میں شہر سے باہر تھے۔'' اس نے خود ہی بتایا۔وہ ماحول کو نارمل کرنا چاہتی تھی۔

''مجھے صندل کی موت کا بہت افسوس......'' کومل کی بات مکمل نہیں ہو سکی تھی۔ چانداس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہاں سے چلی گئی تھی۔

''میں نے کہا تھا نا کہ یہ کچھ نہیں کرنے والی...... تم ایسے ہی پریشان ہو رہے تھے۔'' کومل نے کہا اور پھر دونوں کمرے میں داخل ہو گئے۔بستامی نے سکون کا سانس لیا تھا۔

کپڑے تبدیل کرنے کے بعد کومل صوفے پر بیٹھ گئی تھی اور ٹیبل پر تاش کے پتوں سے ایک اونچی تکون بنانے کی کوشش کرنے لگی۔ پچھلے کچھ دنوں سے اسے بھی یہ کھیل پسند آنے لگا تھا۔ساتھ ساتھ وہ بستامی سے مستقبل کی باتیں بھی کرتی جا رہی تھی کہ انہیں اسلام آباد میں کس جگہ پر گھر لینا چاہیے۔ کتنا بڑا لینا اور انہیں مستقبل میں کیا کام کرنا ہے جو انہیں فائدہ دے گا۔

دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ بستامی کا ملازم سلمان بستامی کا حقہ لیے اندر داخل ہوا۔

''بہت اچھے وقت پر لائے ہو سلمان...... مجھے اس کی ہی طلب ہو رہی تھی۔''

سلمان مسکرایا۔ اس نے حقہ بستامی کے آگے رکھ دیا اور پھر کمرے سے باہر چلا گیا۔ بستامی حقہ پینے لگا اور کومل پھر سے تاش کی تکون کو مکمل کرتے ہوئے اسلام آباد میں اپنی رہائش اور بہتر زندگی کی باتیں کرنے لگی۔ وہ تو جیسے ایک ایک چیز کی پلاننگ کر کے بیٹھی ہوئی تھی۔ ذہن ہی ذہن میں اس نے ہر چیز پلان کر لی تھی۔ وہ بستامی کو بتا رہی تھی کہ کون کون سے کام انہیں فائدہ دیں گے۔ اور کیسے وہ دن بدن امیر سے امیر ہوتے چلے جائیں گے۔

''لو...... باتوں کے دوران میرا تاش گھر بھی بن گیا۔'' اس نے کہا اور پھر بستامی کی طرف دیکھا۔ جو کافی دیر سے خاموش ہی بیٹھا تھا۔ کومل کو احساس ہوا کہ بستامی نے کتنی دیر سے اس کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اور اب وہ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے ایسے بیٹھا تھا جیسے گہری نیند میں چلا گیا ہو۔

''بستامی......!'' کومل نے اسے پکارا۔ بستامی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کومل جلدی سے اس کے قریب ہوئی۔ اور اس نے بستامی کو ہلایا۔ تب ہی بستامی کا وجود ایک طرف کو ڈھلک گیا اور ساتھ ہی ایک خون کی رال اس کے منہ سے نکلی تھی۔

''بستامی......!'' کومل کی چیخ بلند ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

۲۰۰۳ء

دستک دینے کے بعد زوہیب ضامن کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ ضامن بیڈ پر لیٹا سو رہا تھا۔ زوہیب نے لائٹ آن کی تھی۔ اور پھر کھڑکی کے پردے پیچھے کر دیے تھے۔ ضامن پر روشنی کا کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ شاید گہری نیند میں تھا۔ زوہیب نے وال کلاک میں وقت دیکھا۔ ضامن اتنی دیر تک سونے کا عادی نہیں تھا۔

"ضامن!" زوہیب نے پیار سے اسے پکارا۔ ضامن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ زوہیب بیڈ پر ضامن کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے ضامن کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ شدید گرمی کا احساس زوہیب کے اندر اترا۔ ضامن گرم کوئلے کی طرح تپ رہا تھا۔

زوہیب کے ہاتھ کے لمس کو محسوس کرتے ہوئے ضامن نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ نجانے کیوں زوہیب کو لگا کہ اصل میں ضامن جاگ ہی رہا تھا۔ اور آنکھیں بند کیے سونے کی اداکاری کر رہا تھا۔ لیکن وہ ایسا کیوں کرے گا۔

"تمہیں بخار ہو رہا ہے ضامن...... کب سے ہے تمہیں بخار......؟"

"جب سے کراچی آیا ہوں۔ شاید تب سے......" وہ کمزور سے لہجے میں بولا۔

"تم نے میڈیسن لی؟" زوہیب نے پوچھا۔ ضامن نے انکار میں سر ہلایا۔

"اتنی غفلت نہیں کرتے میرے شہزادے...... میڈیسن تو لے لینا تھی۔ میں ابھی لاتا ہوں۔" زوہیب کہہ کر وہاں سے اٹھنے لگا تھا جب ضامن نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ زوہیب نے ناسمجھی سے ضامن کو دیکھا۔

"ڈیڈ...... ایک بات کہوں۔"

"کہو میری جان......"

"مجھے اپنے سینے سے لگا لیں پلیز......" ضامن نے جس طرح سے کہا تھا زوہیب تو پگھل کر رہ گیا تھا۔ واپس بیڈ پر بیٹھ کر اس نے ضامن کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ ضامن نے اپنے باپ کو سختی سے بھینچ لیا۔

"بخار نے شاید تمہیں حساس......" زوہیب کا فقرہ مکمل نہیں ہو سکا تھا۔ اس کے سینے سے لگتے ہی ضامن رونے لگا۔ زوہیب کی تو جیسے جان ہی نکل کر رہ گئی تھی۔

"مجھے بچا لیں ڈیڈ...... مجھے بچا لیں۔" وہ بچوں کی طرح روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

☆......☆......☆

''ہم کہاں جا رہے ہیں سانول......؟'' باریشہ نے سانول سے پوچھا جو بہت ہی بے ڈھنگے سے انداز میں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔شاید اس نے نئی نئی کار چلانا سیکھی تھی۔

''زیادہ دور نہیں ہے۔بس یہیں پاس میں ہی ہے۔''

''تم پچھلے ایک گھنٹے سے یہی کہہ رہے ہو۔''

''فکر مت کرو، تمہیں اغوا نہیں کروں گا۔'' اس نے باریشہ کی طرف دیکھتے ہوئے پیار سے کہا۔شاید وہ کل رات کوئی رومانٹک مووی دیکھ بیٹھا تھا۔یا اسے باریشہ کے زندہ ہونے کی حد سے زیادہ خوشی تھی۔

''اب کتنی دور رہ گیا ہے؟''

''اب تو واقعی ہی میں پاس ہی ہے۔اسلام آباد میں ایک پرانا گھر ہے ہمارا......وہ بوڑھی عورت وہاں موجود ہے۔''

''تمہیں یقین ہے ناں؟''

''ہاں......مت پوچھو کہ میں نے کتنی مشکل سے اس کا پتا کروایا ہے۔صرف تمہارے لیے......'' ڈرائیونگ کرتے ہوئے اس نے پھر سے مسکرا کر باریشہ کو دیکھا۔

''تمہارا بہت بہت شکریہ......لیکن آگے دیکھ کر ڈرائیونگ کرو۔لگتا ہے کہ تم نے کار چلانا آج ہی سیکھا ہے۔''

''ہاں......میں یہ کام کسی ملازم کو اعتماد میں لے کر نہیں کر سکتا تھا۔میں نہیں چاہتا کہ کسی کو معلوم ہو کہ تم زندہ ہو۔''

باریشہ نے دل ہی دل میں اس کی احتیاط کی داد دی تھی۔

کار اب سڑکوں سے اتر کر چوڑی گلیوں میں داخل ہو چکی تھی۔اور پھر وہاں سے وہ نجانے کس طرف سناٹے میں جا رہی تھی۔

''میں نے اس گھر کے ملازم سے بات کرلی ہے، وہ کسی سے کچھ نہیں بولے گا۔ لیکن پھر بھی بہتر ہے کہ تم پردہ کرلو۔ میں اسے تمہارے حوالے سے کوئی بھی جھوٹ بول دوں گا۔ کہہ دوں گا کہ میری دوست ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' باریشہ نے سانول کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اپنے دوپٹے سے اپنا منہ چھپالیا۔

سانول کی تقلید میں وہ ایک پرانی سی وضع کے گھر میں داخل ہوئی تھی اور اس گھر کے اندر بھی اندر سے اندر والے کمرے میں وہ اور سانول داخل ہوئے تھے۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ سانول نے لائٹ آن کی تھی۔ اور باریشہ نے اپنے سامنے پھر سے اس بوڑھی عورت کو دیکھا تھا اور شاکڈ رہ گئی تھی۔ وہ بوڑھی مزید بوڑھی ہو چکی تھی۔ ایسے جیسے مرنے کے قریب ہو۔ کمزور اور بہت جلد اپنا وجود گم کر لینے والی۔

''کیسی ہیں آپ؟'' باریشہ نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا تھا۔ بوڑھی نے اسے دیکھا تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں جوت سی چمکی تھی۔

''تم......تم باریشہ ہونا......صندل کی بیٹی......'' اس نے پوچھا۔ باریشہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''مجھے یقین تھا کہ تم تو مجھے ملنے ضرور ہی آؤ گی۔ خون میں بہت اثر ہوتا ہے۔ صندل کی بیٹی مجھے ملنے کیسے نہ آتی......''

''آپ میری ماں کو کیسے جانتی ہیں؟''

''میں تو وہ بھی جانتی ہوں جو تم نہیں جانتیں......''

''کیا......؟''

''تم سن نہیں سکو گی......بہت تلخ حقیقتیں ہیں۔''

''کچھ تلخ حقیقتیں تو جانتی ہوں میں......بس اتنا نہیں جانتی کہ میرا باپ کیسے مرا تھا۔ میری ماں کی موت کیسے ہوئی تھی۔ ایسا کیا کیا تھا میری ماں نے، میرے باپ کے ساتھ کہ وہ لوگ مجھ سے، میری ماں سے اور چاندنا نو سے ابھی تک نفرت کرتے ہیں۔''

''کسی نے کچھ نہیں کیا......جو کیا تھا سب بستامی نے کیا تھا۔''

"کیا کیا تھا بستامی بابا نے......" باریشہ نے پوچھا تھا۔ بوڑھی عورت باریشہ کو دیکھنے لگی۔

"میں تمہیں بتادوں گی، سب بتادوں گی۔ اگر تم بستامی کو زہر دے کر میرے پاس آؤ گی تو میں تمہیں سب بتادوں گی۔"

باریشہ نے تھوک نگلا تھا۔ بوڑھی اس سے شفقت سے پیش آرہی تھی۔ لیکن اس کا ذہنی توازن ابھی بھی درست نہیں تھا۔

"میں چند دنوں میں حویلیاں جانے والی ہوں۔ آپ نے چندنا نو کو کوئی پیغام دینا ہے؟"

"وہ زندہ ہے؟" بوڑھی عورت نے حیرت سے پوچھا تھا۔ "رحبانی نے تو کہا تھا کہ چاند مرچکی ہے۔"

"نہیں......وہ زندہ ہیں۔"

"یہ......یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔ اسے کہنا بستامی کو زہر دے دے۔"

"آپ کا نام جان سکتی ہوں؟ چاندنا نو سے کیا کہوں گی کہ یہ پیغام کس نے دیا ہے۔" باریشہ بڑی احتیاط کے ساتھ بات کو آگے بڑھا رہی تھی۔ بوڑھی نے چند لمحوں تک خالی نظروں سے اسے دیکھا۔ جیسے وہ خود بھی بھول چکی ہو کہ اس کا کیا نام ہے۔ قید خانے کی زندگی نے اس سے اس کی شناخت ہی تو چھین لی تھی۔

"یاد کریں......آپ کا نام کیا ہے؟"

ذہن پہ زور ڈالنے سے بوڑھی کو جیسے اپنا نام یاد آگیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں روشنی سی بھری تھی۔

"افشیں......افشیں نام ہے میرا......" بوڑھی افشیں نے جوش سے چلاتے ہوئے کہا۔



ناول **تاش گھر** ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **15** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 32

بستامی اور کومل کے ہاتھوں اپنے اغوا کے بعد سارا پہلے ملتان بھیجی گئی تھی اور پھر وہاں سے بنگلا دیش...... بنگلا دیش میں ایک قحبہ خانے میں سارا کا سودا پہلے سے ہی طے کیا جا چکا تھا۔ سارا کے ساتھ ساتھ بہت سی دوسری لڑکیوں کو بھی اسی قحبہ خانے پر لایا گیا تھا۔ سارا کی حالت باقی لڑکیوں سے مختلف تھی۔ وہ لڑکیاں رو رہی تھیں۔ اپنی قسمت کو کوس رہی تھیں۔ لیکن سارا خاموش تھی۔ وہ نہ تو رو رہی تھی اور نہ ہی اپنی قسمت کو کوس رہی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ان دونوں باتوں کا کوئی فائدہ نہیں نکلنے والا...... اسے اب یہاں ہی رہنا تھا۔ اس نے فلموں میں دیکھا ہوا تھا کہ ان لوگوں کے پاس لڑکیوں سے کام کروانے کے کیا کیا طریقے ہوتے ہیں۔ لڑکیوں کے پاس دو ہی راستے بچ جاتے ہیں۔ یا تو ان لوگوں کی بات مانیں...... یا پھر خودکشی کر لیں۔ سارا خود کو ختم نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے ابھی جینا تھا۔ اپنی ماں سے دوبارہ ملنا تھا۔ اپنی بہن سے...... اور اپنی دھرتی پہ واپس جانا تھا۔

جیسے کٹی پتنگ خود کو ہوا کے دوش پر چھوڑ دیتی ہے۔ ایسے ہی سارا نے بھی خود کو اپنی قسمت کے سپرد چھوڑ دیا تھا۔ اس نے اپنے جسم کو آلودہ ہو جانے دیا تھا لیکن اپنے ذہن کو نہیں...... اس نے ہر دن خود کو مضبوط اور پرسکون رکھنے کی کوشش کی تھی۔ ہر رات کے بعد اس نے اپنے عزم کو سرے سے یاد کیا تھا۔ لیکن اس چنگل سے نجات حاصل کرنا کچھ ایسا آسان بھی نہیں تھا جیسا سارا سوچ رہی تھی۔ پولیس، ادارے، سب لوگ ان لوگوں کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ وہ کس کے پاس اپنی درخواست لے کر جاتی۔ جلد ہی اسے احساس ہو گیا تھا کہ اسے جو کرنا ہے، خود کے بل بوتے پر کرنا ہے۔

پھر ایک عرصے کے بعد قسمت سارا پر مہربان ہوئی تھی۔ جب اس کے کمرے میں ایک مصنف داخل ہوا تھا۔ وہ کوئی ناول لکھ رہا تھا۔ اور اپنے ناول میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے وہ قحبہ خانہ کی لڑکیوں سے خود آ کر بات چیت کرنا چاہتا تھا۔ سارا نے اپنی ساری کہانی اسے سنا دی تھی۔ وہ مصنف بھلا مانس تھا۔ اسے ناول سے زیادہ یہاں کی لڑکیوں کی پرواہ ہونے لگی تھی۔ غیر ملکی لڑکیوں کو وہاں سے آزادی دلانے کے لیے اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا۔

اور یوں تیس سالوں کے بعد......

سارا ایک اذیت بھگت کر حویلیاں واپس پہنچی تھی۔

اس نے سوچا تھا کہ زندگی کے امتحان ختم ہو چکے ہیں۔ لیکن حویلیاں واپس پہنچ کر اسے اندازہ ہوا تھا کہ وہ ایک آزمائش سے نکال کر دوسری میں داخل کر دی گئی ہے۔

☆......☆......☆

''مجھے بتایئے چاندامی! میرے پیچھے کیا کیا ہوا ہے اس حویلی میں...... میری خالہ، میری ماں کے ساتھ کیا بیتی......؟ میری کزنز کہاں ہیں؟'' سارا نے پوچھا۔ چاند کے چہرے کی اداسی بڑھ گئی تھی۔ اس کے پاس سارا کو بتانے کے لیے کوئی ایک بھی خوش کن بات نہیں تھی۔ بہت سے لمحے اسی خاموشی کی نظر ہوئے تھے۔

''آپ چپ کیوں ہیں؟ کچھ بولتی کیوں نہیں چاندامی......''

''تم پہلے کھانا کھا لو سارا...... تم جب سے آئی ہو، تم نے کچھ بھی نہیں کھایا ہے۔''

''آپ کیا سمجھتی ہیں کہ اپنوں کے بارے میں کچھ جانے بنا مجھ سے کھانا کھایا جا سکے گا۔ اس حویلی کا اجاڑپن مجھے مار رہا ہے۔ میں نے تو تصور میں بھی ایسا نہیں سوچا تھا۔ کیا ہوا ہے یہاں...... مجھے بتایئے خدا کے لیے...... کہاں ہیں باقی لوگ...... میرا دل وسوسوں سے پھٹا جا رہا ہے۔''

''کیا کیا سنو گی سارا...... تم تیس سالوں کا حساب مانگ رہی ہو۔ میں اتنی جلدی تمہیں اتنا سب کچھ کیسے بتا سکتی ہوں۔''

''میری ماں کے بارے میں بتایئے۔ میرے اغوا کے بعد ان کی کیا حالت تھی؟''

''شکیلہ پھپھو بہت بیمار رہیں۔ ان کا بخار اترنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ بہت سے حکیموں کو دکھایا گیا لیکن ان کی طبیعت سنبھلنے میں نہیں آ رہی تھی۔ پھر ہم سب نے مل کر سوچا کہ یہ کہہ دیا جائے کہ لاہور کے سرد خانے سے تمہاری لاش ملی ہے۔ اور ہم نے ایسا ہی کیا...... تمہیں مردہ بتا کر انہیں لاہور کے ایک قبرستان لے گئے۔ شکیلہ پھپھو کو اپنی آخری سانس تک یہ نہیں پتا چلا کہ تم زندہ ہو۔'' چاند امی نے کہا۔ سارا کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔

''میری ماں کی قبر کہاں ہے چاند امی......؟''

''میں...... میں تمہیں وہاں لے جاؤں گی سارا...... تم فکر مت کرو، لیکن ابھی اس سب کے بارے میں کچھ مت پوچھو...... تم خود بھی پریشان ہو رہی ہو اور مجھے بھی کر رہی ہو میری جان۔''

''میری بہن زارا...... اس کے بارے میں تو کچھ بولیے چاند امی...... وہ کہاں ہے اس وقت؟ وہ زندہ تو ہے نا؟'' سارا نے بے قراری سے پوچھا تھا، چاند پھر سے خاموش ہو گئی۔ وہ کیا بتاتی کہ زارا اس وقت کہاں ہے۔ وہ تو خود اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔

''تمہاری آمد سے قبل تک میں تمہارے بارے میں بھی لاعلم تھی سارا...... کہ تم کہاں ہو، کیسی ہو؟ کوئی مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھتا کہ تم کہاں ہو تو میرے پاس بتانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ بس یہی سمجھ لو کہ میں زارا کے بارے میں بھی تمہاری ہی طرح لاعلم ہوں کہ وہ کہاں ہے، کیسی ہے۔''

''تو کیا بستامی بابا نے اسے بھی......'' سارا نے فقرہ ادھورا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ جو پوچھنا چاہ رہی تھی چاند سمجھ گئی تھی۔ چاند خلاؤں میں دیکھنے لگی۔ سارا سمجھ گئی کہ اس کی بہن بھی اس وقت کسی زندان میں

ہوگی۔ جہاں سے وہ تو بھاگ آئی ہے لیکن زارا ابھی تک وہاں ہی ہے۔ اسے دکھ ہوا تھا۔ لیکن پھر اس سوچ نے اسے تسلی دی تھی کہ شاید وہ جہاں بھی ہوگی، زندہ ہوگی۔ دنیا میں اس کا ایک تو خون کا رشتہ موجود ہوگا۔

''آپ کے پاس میرے لیے کوئی اچھی خبر ہے چاندامی......؟''

''ہاں......ایک ہے۔ وہ یہ کہ تم جلد ہی اپنی کزن تعبیر سے مل سکتی ہو۔''

''تعبیر زندہ ہے؟'' سارا کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔

''ہاں......وہ زندہ ہے۔ ہم ایک عرصہ اسے مردہ خیال کرتے رہے۔ حاجی بوا تو قرآن پڑھ کر اسے بخشواتی بھی رہی تھیں۔ لیکن وہ زندہ ہے۔''

''وہ کہاں ہے اس وقت......میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''وہ جیل میں ہے۔ اس کی سزا ختم ہونے والی ہے۔ جلد ہی وہ جیل سے باہر آجائے گی۔ اور حویلی میں ہوگی۔''

چاند نے بتایا اور سارا کے چہرے پر تعبیر کے زندہ ہونے سے بھی زیادہ اس بات کی حیرت پھیلی کہ اس کی کزن جیل میں ہے......؟

☆......☆......☆

اس بوڑھی عورت (افشیں) سے ملاقات زیادہ فائدہ مند ثابت نہیں ہوئی تھی۔ باریشہ اپنی الجھنیں سلجھانے کے لیے اس کے پاس گئی تھی۔ لیکن وہاں سے مزید الجھ کر واپس آئی تھی۔ وہ افشیں سے پہلی بار ملی تھی۔ اسے یاد تھا کہ حاجی بوا اکثر سب کزنوں کے ساتھ افشیں کا نام بھی لیا کرتی تھیں۔ لیکن یہ ذکر ویسا ہی ہوا کرتا تھا جیسا دوسری بہت ساری باتوں کا ذکر......جن میں سے آدھی باتوں کو تو باریشہ جھوٹ ہی سمجھتی رہی تھی۔ اسے لگتا تھا حاجی بوا اس کو خوش کرنے کے لیے ایسی جھوٹی سچی کہانیاں سناتی رہتی ہیں۔

پھر کومل بیگم نے بھی حویلی کا ماضی بتاتے ہوئے افشیں کا ذکر کیا تھا۔ کومل بیگم نے تو اسے یہ ہی بتایا

تھا کہ افشیں نے اپنے مرحوم شوہر کو زہر دے کر اس کی جائیداد ہڑپ لی تھی۔ اس کے بچوں کو لاوارث کر کے خود اپنے پرانے آشنا کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ لیکن اب افشیں کو زندان میں دیکھ کر باریشہ کو دکھ ہوا تھا۔

کومل بیگم نے اس سے باقی سب کون سا سچ کہا تھا جو یہ سچ کہا ہوگا۔ لیکن تب اسے کومل بیگم کی ساری باتیں سچ لگا کرتی تھیں۔ وہ کچھ ایسی باتوں ہی کی تلاش میں تھی، جن کو بنیاد بنا کر وہ چاند نانو سے مزید نفرت کر سکے۔ ان کے مزید خلاف جا سکے اور موقع ملنے پر ان کو کھری کھری سنا سکے۔ تب اگر وہ اپنی خواہشات کی غلامی میں نہ ہوتی تو یقیناً افشیں کی کچھ خبر گیری کرتی...... افشیں نے ایک ملاقات میں اسے صندل کی بیٹی کہا تھا۔ کیا یہ اشارہ کافی نہیں تھا کہ وہ افشیں سے بات چیت کرے۔ اپنی ماں کے بارے میں جاننے کی کوشش کرے لیکن تب اسے صرف کامیابی چاہیے تھی۔ ایسی کامیابی جس سے اب اسے نفرت ہو چکی تھی۔

سانول کے ساتھ واپسی کا سفر اسی ادھیڑ بن میں گزرا تھا۔ خود سانول بھی خاموشی سے ڈرائیونگ کرتا رہا تھا کیونکہ بوڑھی عورت نے اس کے ماں باپ کا ذکر اچھے الفاظ میں نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود سانول کے لیے یہ صورتِ حال قابل قبول تھی۔ اپنے ماں باپ کے ماضی کے متعلق کوئی بھی بات اس کے لیے باعث حیرت نہیں بن سکتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ دونوں نے بہت سے ایسے کام کیے ہیں جو گناہ یا بداخلاقی کے زمرے میں آتے ہیں۔ گھر میں کیا کیا ہوتا تھا، وہ بھی اس سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ ہاں بس یہ تھا کہ وہ کسی برائی کے کام میں ملوث نہیں تھا۔ اور یہ ہی بات اس کے دل کی تسلی کے لیے بہت تھی۔ ویسے بھی وہ اتنا خود مختار نہیں ہوا تھا کہ اس گھر سے الگ رہ سکتا۔ دوسرا وہ عمر کے جس دور سے گزر رہا تھا اس دور میں انسان غیرت کے بدلے آسائشوں کو ترجیح دیتا ہے۔ آسائشوں کو ٹھکرا کر کوئی حتمی فیصلہ لینا اس عمر میں مشکل ہوتا ہے۔

باریشہ دل میں بے چینی لیے اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ شائستہ آنٹی شاید سو رہی تھیں۔ خیام بھی نجانے کہاں تھا۔ اچھا ہی تھا...... وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔

بیڈ پر بیٹھ کر وہ پھر سے افشیں کے متعلق سوچنے لگی۔ افشیں نے آج اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ باریشہ جانتی تھی کہ وہ اتنی جلدی اس سے مانوس نہیں ہوگی۔ اور اعتبار تو ہرگز نہیں کرے گی۔ دوسرا کافی عرصے سے قید میں ہونے کی وجہ سے افشیں کا ذہنی توازن نارمل نہیں رہ گیا تھا۔ وہ آدھی بات ہوش میں کر رہی تھی اور آدھی دیوانگی میں...... باریشہ کو خود اس کی باتوں کو چھلنی کرنا پڑ رہا تھا کہ کون سی بات سچ ہو گی اور کون سی افشیں کے ذہن نے خود ہی تخلیق کر لی ہوگی۔ شاید وہ اگلی ملاقات پر باریشہ کو کچھ بتا دے کہ صندل کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ میر زاد کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اور میر زاد کے گھر والے کیوں حویلی والوں کے لیے اپنے دل میں نفرت رکھتے ہیں۔ نفرت بھی ایسی جو جان لینے پر بھی ختم نہیں ہونے والی...... کیا اس کی ماں نے اس کے باپ کے ساتھ بے وفائی کی تھی؟ کیا یہ تھے وہ راز جو چاند نانو اور حاجی بوا آج تک اسے نہیں بتا سکی۔

ان ساری باتوں سے الگ باریشہ کو تب سب سے زیادہ تکلیف کا سامنا کرنا پڑا تھا جب وہ افشیں کو اسی زندان میں چھوڑ کر چلی آئی تھی۔ وہ بے بس تھی۔ افشیں کے لیے وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ کومل بیگم اور بستامی بابا کے لیے وہ مر چکی تھی۔ اور افشیں کو قید سے رہائی دلانے کے بعد وہ ان دونوں سے چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ افشیں کو ڈھونڈنے کے چکر میں وہ ان کے ہاتھ لگ سکتی تھی اس لیے خود غرضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے باریشہ نے اپنی آزادی کے بدلے افشیں کو قید میں ہی رہنے دیا تھا۔ اور یہ صورت حال اس کی راتوں کی نیند حرام کر دینے والی ہرگز نہیں تھی۔ وہ برج سرطان کی پیدائش تھی۔ پتا نہیں اس نے اس برج سے کیا لیا تھا۔ لیکن علامتی شبیہ...... کیکڑے کی ساری خصوصیات لے لی تھیں۔

اس کے خیالات کا سلسلہ خیام کی باتوں کی آواز نے توڑا۔ وہ فون پر کسی سے باتیں کرتا ہوا باریشہ کے کمرے کی کھڑکی کے پاس آ گیا تھا۔ شاید اسے اندازہ نہیں تھا کہ باریشہ گھر واپس آ چکی ہے۔ ورنہ وہ جس سے بات کر رہا تھا، احتیاط ضرور برتتا۔

"میرے جگر کیا ہوا ہے تجھے...... تو کب سے بخار وخار کو اہمیت دینے لگا...... تیری طبیعت زیادہ خراب ہے تو زوہیب انکل نے مجھے فون کر کے بتایا ہے نا...... وہ تیری طبیعت کے حوالے سے کبھی اتنے فکر مند نہیں ہوئے۔ انہوں نے کچھ اور بھی بتایا ہے۔ کہ تو سائیکاٹرسٹ کے پاس جا رہا ہے۔ لیکن کیوں......؟ کیا ہوا ہے؟ ٹھیک ہے۔ میں...... میں کراچی آ رہا ہوں۔ نہیں...... مجھے تیری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ میں کراچی آ رہا ہوں۔ ٹھیک ہے۔ میں بس دو دن مزید دیکھوں گا۔ اگر زوہیب انکل نے کہا کہ تیری طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی تو پھر میں وہاں آ جاؤں گا۔"

خیام نے فون بند نہیں کیا تھا۔ وہ باتیں کرتا ہوا شاید دوسری طرف چلا گیا تھا۔ باریشہ نے ایک گہرا سانس بھرا۔ اس سانس میں دکھ تھا، افسوس تھا، ایک گہرا صدمہ تھا، ایک تازہ زخم تھا، زندگی بھر چلنے والا ایک رنج تھا۔ ایک وہ وقت بھی تھا جب وہ ضامن کی آواز سننے کے لیے تڑپا کرتی تھی۔ اسے دیکھے بنا اسے چین نہیں آیا کرتا تھا۔ وہ شوٹ سے چھٹی والے دن بھی ضامن سے ملنے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ ہی لیا کرتی تھی۔ اور اب صورت حال کس قدر بدل چکی تھی۔ صرف یہ سوچ کر کے خیام ضامن سے بات کر رہا ہے، اسے خیام سے بھی نفرت سی محسوس ہوئی تھی۔

وہ بیڈ سے اٹھی اور واش روم میں جا کر اس نے اپنے چہرے پر پانی کے چھپکے مارے تھے۔ نجانے کیا بات ہوئی تھی۔ اس کا جسم حدت پکڑتا جا رہا تھا۔ کچھ اور سمجھ میں نہ آیا تو اس نے شاور کھول دیا اور خود اس کے نیچے کھڑی ہوگئی۔ جبکہ ابھی اس کے زخم ٹھیک سے نہیں بھرے تھے۔ وہ ایک عرصے سے ٹاول باتھ لے رہی تھی۔

پانی کی تیز دھار کے نیچے کھڑے اسے خیام کا لہجہ یاد آ رہا تھا۔ ضامن سے بات کرتے ہوئے اس کا انداز اس قدر دوستانہ تھا جیسے کچھ ہوا ہی تو نہ ہو۔ جیسے خیام کو معلوم ہی تو نہ ہو کہ اس کے دوست نے کتنا بڑا جرم کیا ہے۔ باریشہ نے خود پر افسوس کیا۔ اس نے یہ کیسے سوچ لیا کہ خیام اس کی وجہ سے اپنے

دوست سے دوستی ختم کرلے گا۔ دوست کو ویسے بھی دوست کا گناہ، گناہ نہیں لگتا ہے۔ دوست یا تو دوست کے ہر گناہ میں شریک ہوتا ہے یا اس کے گناہ کا دفاع کرتا ہے۔ اور خیام اور ضامن تو بچپن کے دوست تھے۔ خیام بھلا باریشہ کے لیے اپنے بچپن کے دوست کو کیوں چھوڑتا۔ ایک وہ ہی تو تھی جو سب کچھ بھول کر یہاں چلی آئی تھی۔ اس کے پاس رہنے کو کوئی جگہ نہیں تھی اور اس نے بے غیرت بنتے ہوئے اسی شخص کے گھر میں پناہ لے لی تھی جس کے دوست نے اسے جان سے مارنے کی کوشش کی تھی۔

☆......☆......☆

ٹاول سے منہ صاف کرتا ہوا سانول واش روم سے باہر نکلا۔ چہرے کو اس نے رگڑ رگڑ کر ٹاول سے خشک کیا اور پھر ٹاول کو سائیڈ پر ڈال کر خود ڈریسنگ کے سامنے کھڑا ہو کر خود کو دیکھتے ہوئے مسکرانے لگا۔

''تم کل کہاں گئے تھے سانول......؟'' ایمن نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔ اور پھر اگلی نظر ہی اس کی سانول کے چہرے پر پڑی تھی۔ اس کا چہرہ ضرورت سے زیادہ صاف دکھ رہا تھا۔ اور گال کچھ زیادہ ہی سرخ ہو رہے تھے۔

''تم نے کلین شیو کی ہے؟''

''جی...... آج پہلی بار کی ہے۔'' وہ مسکرایا۔ ''کیسی لگ رہی ہے؟''

''یہ تم اس سے پوچھنا جس کے لیے تم نے یہ سب کیا ہے۔'' ایمن نے مسکراتے ہوئے کہا اور بیڈ پر بیٹھ کر وہ بغور اپنے جوان بیٹے کو دیکھنے لگی۔ جو ماں کی بات کے بعد کچھ شرما سا گیا تھا۔

''ایسا کچھ نہیں ہے ممی......''

''مجھ سے تو مت چھپاؤ...... آخر مجھے ہی تو بتاؤ گے۔ ظاہر ہے کہ تمہارا رشتہ لے کر میں ہی تو وہاں جاؤں گی۔''

ایمن آج موڈ میں تھی۔ سانول مسکرایا۔ اس نے آئینے میں خود کو دیکھا۔ اس نے خود کو بڑا اور سمجھ

دار ظاہر کرنے کے لیے کلین شیو کی تھی۔ بہتر تھا کہ اب وہ اپنے مزاج میں بھی کچھ سمجھداری کا مظاہرہ کرتا۔

''ادھر بیٹھو میرے پاس...... بتاؤ...... کون ہے وہ......'' ایمن آج پوچھ کر ہی رہنے والی تھی۔

سانول ماں کے پاس بیٹھ گیا۔

''باریشہ......'' سانول نے انکشاف کیا۔ اور ایمن کے چہرے پر حیرت پھیل گئی۔

''باریشہ زندہ ہے؟''

''جی...... لیکن یہ بات آپ کسی کو نہیں بتائیں گی۔ آپ کو میری قسم......'' سانول نے جلدی سے احتیاطی تدبیر کر لی تھی۔

''ک...... کہاں ہے وہ......؟''

''بس...... ہے اپنے کسی جاننے والے کے پاس۔ میں جانتا ہوں اس جگہ کو...... میں کل اسی سے ملنے گیا تھا۔'' سانول نے بتایا۔ ایمن کے چہرے پر چھائی حیرت چھٹنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ باریشہ زندہ تھی، جبکہ وہ تو کئی ہفتوں سے اسے مردہ خیال کیے ہوئے تھے۔

''آپ کو باریشہ کیسی لگتی ہے؟''

''اچھی ہے۔ بہت اچھی ہے لیکن...... وہ تم سے محبت نہیں کرتی سانول......''

''جانتا ہوں۔'' سانول افسردہ ہو گیا۔

''جانتے ہو تو پھر اس حقیقت کو قبول کر لو۔ محبت والی حقیقت کو قبول کر لینا بہت ضروری ہوتا ہے میری جان...... یہ سب سے اہم حقیقت ہے۔ کیونکہ اس کے ساتھ ہمارے دکھ اور سکھ جڑے ہوتے ہیں۔ زندگی گزارنے کے بعد میں اتنا تو سمجھ ہی چکی ہوں۔'' ایمن کے ہر بار کی طرح اپنے ہی دکھ ہرے ہو گئے تھے۔ ''جو آپ سے محبت نہ کرے اس کو زبردستی محبت کرنے پر مجبور نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ لاکھ کوشش کے باوجود بھی ایسا ہوتا ہی نہیں ہے۔''

"آپ یہ باتیں کس تجربے کو ذہن میں رکھتے ہوئے کر رہی ہیں ممی؟" سانول نے پوچھا۔ ایک دکھ سا ایمن کے چہرے پر آ کر رک گیا تھا۔

"تمہارا باپ ایک لڑکی کو چاہتا تھا۔ شاید اب بھی چاہتا ہو۔ میں کون سا اس کے دل میں گھسی ہوئی ہوں۔ میں نے زبردستی تمہارے باپ کے دل کو اپنی طرف موڑا۔ اور ابھی تک اس کی سزا بھگت رہی ہوں۔"

"اس لڑکی کا نام چاند تھا نا...... باریشہ کی نانو...... جو اب بوڑھی ہو چکی ہیں۔" سانول نے پوچھا۔

ایمن نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"میں سب جانتا ہوں۔"

"تمہیں کس نے بتایا؟"

"بس...... بتا دیا کسی نے......"

"لیکن میرے گناہ کے بارے میں نہیں بتایا ہو گا۔" ایمن نے گہرا سانس بھرا۔ "وہ بہت بڑا گناہ تھا۔ میری وجہ سے ایک لڑکی کی جان چلی گئی۔ اور...... اور بھی نجانے کیا کیا ہو گیا۔"

"جو ہونا تھا ہو چکا ہے ممی...... ان باتوں کو عرصے بیت چکے ہیں، بھول جائیں سب کچھ۔"

"بھول جاؤں گی۔ لیکن بس تمہیں وارن کرنا چاہتی ہوں کہ کبھی بھی محبت کو پانے کے لیے حد سے نہ گزرنا۔"

"حد سے گزرنا کیا ہوتا ہے؟"

"محبت التجا سے نہ ملے تو مکاری سے حاصل کرنا حد سے گزرنا ہوتا ہے۔ وعدہ کرو سانول...... اگر باریشہ نے تمہاری محبت کو ٹھکرا دیا تو اسے مجبور نہیں کرو گے کہ وہ تمہیں چاہے۔"

"وعدہ کرتا ہوں۔ اس کی محبت کو التجا کے علاوہ کسی اور حربے سے حاصل کرنے کی کوشش نہیں کروں گا۔"

☆......☆......☆

باریشہ کو کافی دن ہو گئے تھے خیام کے گھر میں رہتے ہوئے۔اس نے ذہن پر زور ڈالا تو اسے یاد آیا کہ وہ دو ماہ سے اس گھر میں رہ رہی ہے۔ان دو ماہ میں خیام کے خلوص اور شائستہ آنٹی کی مہمان نوازی میں بالکل بھی فرق نہیں آیا تھا۔لیکن پھر بھی باریشہ کو اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ وہ ان لوگوں پر بوجھ بن چکی ہے۔ٹھیک ہے اگر وہ بوجھ نہیں بھی بنی تھی تو پھر بھی وہ یہاں کتنے دن رہ سکتی تھی۔ایک نہ ایک دن تو اسے اس گھر سے جانا ہی تھا۔لیکن اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی اگلی جائے پناہ کون سی ہو گی۔کیا کوئی دارالامان...... ظاہر ہے کہ خیام اور اس کی والدہ باریشہ کو کسی دارالامان میں تو جانے نہیں دیں گے۔اور حویلیاں وہ جا نہیں سکتی تھی۔اس کے اندر چاندنا نو کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

اس گھر میں رہتے ہوئے غیرت کا مظاہرہ کرنا بھی تھوڑا مشکل تھا۔وہ کوئی جاب نہیں کر سکتی تھی۔ گھر سے غیر ضروری باہر جانا اسے خطرے سے دو چار کر سکتا تھا۔اور گھر پر بیٹھ کر کیے جانے والے کاموں میں اسے کچھ زیادہ مہارت نہیں تھی۔ پھر وہ ایسا کیا کر سکتی تھی جو اس کی غیرت کو کچھ تو بحال کر پاتا۔وہ انہی سوچوں میں گم تھی جب کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔

”یس......“

ملازمہ کمرے میں داخل ہوئی۔

”آپ ناشتے میں کیا لیں گی باریشہ بی بی......؟ کافی دیر ہو گئی آپ کمرے سے باہر نہیں آئیں تو میں نے سوچا کہ پوچھ لوں۔شائستہ بیگم نے کہا تھا کہ ان کی غیر موجودگی میں آپ کا خیال رکھوں۔“

”شائستہ آنٹی کہاں ہیں؟“

”وہ اپنی کسی سہیلی سے ملنے گئی ہیں۔شام تک آ جائیں گی۔“

”اور خیام؟“

”وہ بھی گھر پر نہیں ہیں۔“

"ٹھیک ہے، میرے لیے سینڈوچ بنا دیں پھر آپ......"

"جی ٹھیک ہے۔" ملازمہ کہہ کر باہر چلی گئی۔ باریشہ کسل مندی سے اٹھی اور واش روم میں چلی گئی۔

دن کافی اجلا اجلا سا تھا۔ صبح کو بے دار ہوئے کافی وقت ہو چکا تھا۔ لاؤنج میں بیٹھ کر باہر تیز دھوپ کو دیکھتے ہوئے باریشہ کو حویلیاں کی دھوپ یاد آگئی تھی۔ لمبے سرد موسم کے بعد جب حویلیاں پر بھی بہار آتی تھی تو وہ خطہ دنیا کا خوب صورت ترین خطہ لگا کرتا تھا۔

سینڈوچ اور چائے سے ناشتا کرنے کے بعد وہ باقی ماندہ بچی ہوئی چائے کو پیتے ہوئے سنڈے میگزین کو دیکھنے لگی۔ بہت دیر تک وہ میگزین کے ان درمیانی صفحات کو دیکھتی رہی جہاں ماڈل نے مختلف طرز کے کپڑے پہن کر ماڈلنگ کی تھی۔ پھر بے مقصد صفحات پلٹتے ہوئے اس کی نظر ایک آرٹیکل پر گئی۔ وہ آرٹیکل نئے ابھرتے ہوئے مصوروں پر تھا۔ جس میں خیام کا بھی ذکر تھا۔ باریشہ جانتی تو تھی کہ خیام پینٹنگ کرتا ہے۔ لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ پاکستان میں کچھ شہرت بھی رکھتا ہے۔ یا اس کی کبھی کوئی نمائش بھی ہو چکی ہے۔ آرٹیکل میں خیام کی پینٹنگ کی ایک چھوٹی سی تصویر بھی شائع کی گئی تھی جو بلاشبہ بہت عمدہ تھی۔ باریشہ فن مصوری کے بارے میں زیادہ تو نہیں جانتی تھی لیکن اتنا تو بتا ہی سکتی تھی کہ کسی تصویر کو بنانے میں کس قدر حقیقت پسندی سے کام لیا گیا ہے۔

ابھی آرٹیکل مکمل نہیں ہوا تھا جب باریشہ کے ذہن میں ایک خیال آیا تھا۔ میگزین کو سائیڈ پر رکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اتنے عرصے سے اس گھر میں رہ رہی تھی اور خیام نے ابھی تک اسے اپنی پینٹنگز ہی نہیں دکھائی تھیں۔ کیوں نہ اس کام کو خود ہی کر لیا جائے۔ وہ کچھ بور بھی ہو رہی تھی تو اس نے سوچا کہ اس طرح اچھا وقت گزر جائے گا۔

وہ خیام کے اسٹڈیو تک چلی آئی۔ اسٹوڈیو لاک نہیں تھا۔ باریشہ نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔ پہلی نظر میں اس کی آنکھوں کے سامنے بہت سے رنگ گھوم گئے تھے۔ دوسری نظر میں کچھ شبیہ

ابھری تھیں اور پھر تیسری نظر میں وہ دھک سے رہ گئی تھی۔ اسے لگا تھا کہ وہ کسی پینٹنگ کے اسٹوڈیو میں نہیں بلکہ کسی نگار خانے میں داخل ہوگئی ہے جہاں ہر جگہ شیشے ہی شیشے ہیں۔ اتنے شیشے کہ اسے ہر طرف اپنی ہی شکل نظر آرہی ہے۔ وہ حیرت سے شدید حیرت میں مبتلا ہوتی چلی گئی تھی۔ وہاں موجود ہر پینٹنگ میں باریشہ کا چہرہ تھا۔ ہنستے ہوئے، مسکراتے ہوئے، خاموش، اداس، دل کش، دل نشین...... اس کا چہرہ اتنا خوب صورت تو نہیں تھا۔ پھر اس نئے مصور نے اس کے چہرے کو اس قدر اہمیت کیوں دی تھی کہ اس نے اپنے ہر چھوٹے بڑے کینوس پر اس کا چہرہ اتار دیا تھا۔ اتنی خوب صورتی سے بنایا تھا اور بار بار بنایا تھا۔ کیوں......؟ کیا خیام کو اس چہرے سے محبت ہوگئی تھی؟

اپنے خود کے چہرے کے ہی مختلف زاویے دیکھتے ہوئے باریشہ کا سر چکرانے لگا تھا۔ تو یہ وجہ تھی ہر وقت ضامن کے ساتھ سیٹ پر آنے کی، باریشہ کے ساتھ ساتھ رہنے کی اور کیا یہ ہی وجہ تھی باریشہ کو گھر لانے کی......؟

باریشہ کو یاد آیا تھا کہ اس نے خیام سے پوچھا تھا کہ وہ اپنے دیرینہ دوست کے خلاف جاتے ہوئے اس کی مدد کیوں کر رہا ہے؟ تب خیام نے کچھ خاطر خواہ جواب نہیں دیا تھا۔ وہ نہیں بتا سکا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ اس کی مدد بھی کرنا چاہتا ہے اور اس میں ایک اور مقصد بھی پوشیدہ ہے۔ وہ یہ کہ وہ اسے اپنی نظروں کے سامنے رکھنا چاہتا ہے۔

"تم کس قدر بدقسمت ہو خیام...... تم نے ایک عرصہ مجھ سے خاموش محبت کی...... اور اب بنا کسی جرم کے اس محبت کو حاصل نہیں کر سکو گے۔ پہلی بات تو یہ کہ میں ہی تمہیں قبول نہیں کروں گی۔ میں ضامن کے دوست کو اپنی زندگی میں کیوں شامل کروں گی۔ اور دوسرا یہ کہ تم مجھ سے بھی زیادہ مجھ سے دور رہنا چاہو گے۔ ایک طرف تمہارا دوست ہے اور دوسری طرف تمہاری محبت...... ظاہر ہے کہ تم دوستی کا انتخاب کرو گے۔ اور اس دوستی کے ساتھ اس کمرے کا...... جہاں تم دنیا والوں سے چھپ کر میری تصویریں بنا سکو۔"

☆......☆......☆

سورج ابھی مغرب کی طرف گامزن تھا۔اور اندھیرا عشاء سے بڑھ کر پھیل چکا تھا۔ایسے لگتا تھا کہ لمحے بھر بعد تہجد کا وقت ہو جائے گا اور پھر وہ وقت کبھی نہیں ٹلے گا۔روحِ انسان کو روزِ محشر تک اسی اندھیرے سے ٹکریں مارنا ہوں گی۔

صحن سے اونچے دالان پر بیٹھی ہوئی سارا کے گالوں پر اس کے اپنے ہی آنسوؤں کی لکیر ثبت ہو چکی تھی۔ یہ اندھیرا جیسے کسی نے برچھیوں کے ذریعے اس کی آنکھوں میں اتار دیا تھا۔ چاند نے بھی موٹے ستون کے ساتھ کمر لگالی تھی۔وہ بولتے بولتے تھک چکی تھی۔تیس سالوں کی کتھا سنا کر وہ اس قدر تھک چکی تھی جیسے دنیا کے دوسرے سرے سے چل کر آ رہی ہو۔ماضی کی اس کہانی میں بار ہا اس کا فشار خون بلند ہوا تھا کہ اسے لگنے لگا تھا کہ آج اس کی موت کا دن ہے۔لیکن اس کی موت کا دن شاید دور تھا۔جبکہ وہ تو کئی بار اپنے مرنے کی دعا کر چکی تھی۔

سب سن لینے کے بعد سارا جیسے ٹوٹ کر رہ گئی تھی۔اتنا تو وہ اپنی بے حرمتی پر نہیں ٹوٹی تھی جتنا اب کرچی کرچی ہو رہی تھی۔چاندامی نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔جو وہ اتنے دنوں سے پوچھ رہی تھی کہ اس کے اغوا ہو جانے کے بعد اس حویلی میں کیا کیا ہوا تھا۔کس کس کی سازش نے سرخ حویلی کو سیاہ کر دیا۔کس کس نے دین بابا کی قبر پر تھوکا......اور کس کس نے حویلی کے مکینوں کو دیوانہ بنا دیا۔

”جب نقب لگانے والے اپنے ہوں تو کس سے گلہ کریں چاندامی......“

”تب صرف قسمت سے ہی گلہ کیا جا سکتا ہے سارا......“ چاند خود بھی روتے روتے چپ ہو گئی تھی۔”میں اسی لیے تمہیں کچھ بتا نہیں رہی تھی میری جان...... برسوں بعد میری آنکھوں نے ماضی کے کسی انسان کو دیکھا ہے۔تم نہیں جانتی ہو کہ تمہیں دیکھ کر میں ایک دم سے کتنی جوان ہو گئی ہوں۔کتنی طاقت آ گئی ہے میرے اندر......اب چند ہفتوں کے بعد تعبیر بھی آ جائے گی تو میری آنکھوں کو سکون ملے گا۔“

”اور افشین کا کیا چاندامی......روشانے،کرن،زارا......میں انہیں کہاں تلاش کروں گی؟“

"ان کے لیے دعا کرو، جیسے میں کر رہی ہوں۔"

"نہیں چاند امی...... میں اپنی پوری کوشش کے بعد دعا کی قبولیت پر یقین رکھتی ہوں۔ پاکستان واپس آجانا میرے لیے میری ذات کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ میں اسے اپنی ذات کی فتح سمجھتی ہوں۔ پھر سے پست نہیں ہو سکتی۔"

"تم کیا کرنا چاہتی ہو سارا......؟"

"میں اپنی ساری کزنوں کو پھر سے حویلی میں لانا چاہتی ہوں چاند امی...... صندل تو اب اس دنیا میں نہیں رہی...... اس پر میں صابر ہوں۔ لیکن اگر میری باقی کزنز زندہ ہیں تو میں انہیں حویلی لاؤں گی۔"

"تم کیا سمجھتی ہو کہ میں نے انہیں نہیں ڈھونڈا ہوگا۔"

"مجھے بھی تلاش کرنے دیں۔"

"لیکن تم انہیں کہاں تلاش کرو گی سارا؟"

"پتا نہیں...... لیکن خدا نے چاہا تو کوئی نہ کوئی سرا تو ہاتھ میں آہی جائے گا نا چاند امی......"

"میں تمہیں نہیں روکوں گی سارا...... تم جو کرنا چاہتی ہو کرو۔"

سارا اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

مغرب کی اذان کا وقت ہو چکا تھا۔ مسجد سے پہلے اسپیکر کو درست کیا گیا تھا پھر اذان کی آواز سارے حویلیاں میں گونجنے لگی تھی۔ چاند خاموشی سے اذان کو سنتی رہی تھی۔ اذان کے ختم ہونے کے بعد سارا اپنے کمرے سے نکل کر وہاں آئی، اس کے ہاتھ میں اس کے چند ایک کپڑے تھے۔

"مجھے اجازت دیں چاند امی......"

"تم کہاں جا رہی ہو سارا؟" چاند فکرمند ہوئی۔

"بتایا تو ہے، اپنی کزنز کی تلاش میں......"

''لیکن......''

''فکر مت کریں چاند امی...... میں جس دلدل سے نکل کر آ رہی ہوں۔ اس سے بڑی دلدل سے سامنا نہیں ہو سکتا اب میرا...... مجھے دعا دیں۔ خدا نے چاہا تو کامیاب ہو کر لوٹوں گی۔''

''خدا تمہیں کامیاب کرے سارا...... میری آنکھوں ہر پل تمہارا رستہ دیکھیں گی۔''

''جلد ملاقات ہوتی ہے۔''

سارا نے اپنے سر پر چاند سے پیار لیا اور پھر حویلی کے صدر دروازے سے باہر نکل گئی تھی۔

چاند بہت دیر تک حویلی کے صدر دروازے کو دیکھتی رہی تھی۔ پھر اچانک سے اسے خیال آیا کہ اس نے درگا مورتی والے کمرے میں موجود سانپ کو آج سارا دن دودھ نہیں دیا تھا۔ چاند جلدی سے اٹھی تھی۔ رسوئی میں جا کر اس نے ایک کٹوری میں دودھ ڈالا تھا اور پھر وہ درگا مورتی والے کمرے میں آ گئی۔

دودھ سے بھری کٹوری کو اس نے فرش پر رکھ دیا۔

درگا مورتی کی ٹانگ سے لپٹا سانپ اپنی جگہ سے الگ ہوتا ہوا کٹوری کی طرف بڑھا تھا۔

☆......☆......☆

آئینے میں نظر آتے اپنے عکس پر باریشہ کی نظریں جمی ہوئی تھیں۔ شائستہ آنٹی اس کے لیے ایک سفید لباس لے کر آئی تھیں۔ جس پر نارنجی، گلابی پھول اور سبز پتیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ ان کا کہنا تھا کہ ایسا خوش نما لباس اس کی طبیعت پر بہت اچھا اثر ڈالے گا۔ اب خود کو دیکھتے ہوئے باریشہ مسکرا رہی تھی۔ بہت دنوں کے بعد وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ یہ لباس اس کی پسند کا نہ بھی ہوتا تو اس نے شائستہ آنٹی کی خوشی کے لیے پہن لینا تھا۔ وہ باریشہ سے ایک سگی ماں کی طرح کی محبت کرتی تھیں اور باریشہ یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہوتی رہتی تھی کہ ایک دن اسے ان پیار کرنے والے لوگوں سے دور جانا ہے۔ کیا تب وہ خوشی سے جی پائے گی؟

''کیا کر رہی ہو باریشہ......؟'' خیام اس کے کمرے میں آیا۔

''شائستہ آنٹی میرے لیے یہ ڈریس لائی ہیں۔ بس وہی پہن کر دیکھ رہی ہوں۔ کیسا لگ رہا ہے؟''

''اچھا لگ رہا ہے۔'' خیام نے کچھ پھیکا سا مسکراتے ہوئے کہا۔ باریشہ اس کی مسکراہٹ کے پھیکے پن کو سمجھ نہیں سکی۔

''تم سے ملنے کوئی آیا ہے۔''

''کون......؟ سانول؟''

''نہیں......کوئی اور ہے۔ تم باہر آجاؤ۔'' خیام کہہ کر باہر چلا گیا۔

باریشہ نے ڈریس تبدیل کرنا چاہا لیکن پھر اس نے سوچا کہ اس میں تو وقت لگ جائے گا۔ اور خیام نام بتائے بنا تجسس پیدا کر گیا تھا۔ بھلا اس گھر میں اس سے ملنے کون آسکتا تھا۔ وہ بنا ڈریس تبدیل کیے ہی باہر آگئی تھی۔ ڈرائنگ روم میں خاموشی تھی۔ دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوگئی۔

وہ جو خاموشی سے سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا باریشہ کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ باریشہ کے چہرے پر حیرت پھیلتی چلی گئی تھی۔ کمرے سے باہر تو دن نکلا ہوا تھا لیکن نجانے کیوں باریشہ کی آنکھوں میں اندھیرا اترنے لگا تھا۔ اسے لگنے لگا تھا جیسے پورے کمرے میں کسی نے تارکول پھیر دیا ہو یا اس کی آنکھوں میں...... وہ اندھی ہو جانے کے قریب تھی۔ وہ یقین نہیں کر پا رہی تھی کہ اس کے سامنے وہ کھڑا ہے۔

''کیسی ہو باریشہ؟'' ضامن نے نرم لہجے میں پوچھا۔

باریشہ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ حیرت کے سمندر سے نکلتی تو کوئی جواب دیتی۔

''پتا نہیں تم کیسی ہو باریشہ...... لیکن میں...... میں ٹھیک نہیں ہوں۔ میں نے ایک لمبا وقت اذیت میں گزارا ہے۔ ذہنی اذیت میں...... میں ایک کرب میں مبتلا رہا ہوں۔ تم...... تم میری باتوں کا یقین تو نہیں کرو گی لیکن میں شرمندہ ہوں باریشہ...... سخت شرمندہ ہوں۔'' وہ بول رہا تھا اور باریشہ یک ٹک اس کی شکل دیکھے جا رہی تھی۔ ''میرے گناہ کے سامنے معافی کا لفظ بہت چھوٹا ہے لیکن پھر بھی مجھے

معافی تو مانگنا ہی ہے نا...... مجھے معاف کر دو باریشہ......" ضامن نے سر جھکائے ہوئے کہا تھا۔

پہلی بار باریشہ کے وجود میں کوئی حرکت ہوئی۔ اس کے دل کی کھال سکڑی اور شدت سے اس کا دل چاہا کہ ایک زوردار تھپڑ ضامن کے منہ پر دے مارے۔ لیکن وہ اپنی جگہ پر ساکت کھڑی رہی۔

"آئی ایم سوری...... ساری بات بتانے کے لیے بہت وقت درکار ہے۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ شروع سے لے کر آخر تک سب کچھ...... لیکن شروعات اس لفظ سے کرنا ہے۔ سوری سے......"

باریشہ کچھ نہیں بولی۔ وہ کیا بولتی۔ ضامن کی وہاں آمد اس کے لیے حد درجہ غیر متوقع تھی اور پھر اس کا معافی مانگنا...... اس نے ایسا تو سوچا ہی نہیں تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ضامن اس کو جان سے مارنے کی کوشش کرنے کے بعد شرمندہ ہوگا۔ چند لمحے تو اسے سمجھ میں نہ آسکا کہ وہ کیا ردعمل دے۔ سچ میں اسے بالکل سمجھ میں نہ آسکا کہ وہ کیا کرے۔ وہ ضامن کے منہ پر تھپڑ مار دے۔ اس کی معافی کو قبول کر لے۔ اسے گالیاں دے۔ یا رونا شروع کر دے۔ پھر اس نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ وہاں ضامن کے لیے محبت نہیں تھی بلکہ نفرت ہی نفرت تھی۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ اس نے کبھی ضامن سے محبت کی تھی۔ ذہن پر بہت زور ڈالنے پر بھی باریشہ کو یاد نہیں آرہا تھا کہ ضامن سے محبت کے دنوں میں اس کے کیا جذبات ہوا کرتے تھے۔ اس کے دل کی کیا کیفیت ہوا کرتی تھی۔ اسے وہ وقت یاد آنے ہی نہیں والا تھا۔ اسے لگا وہ پیدائش سے ہی ضامن سے نفرت کرتی چلی آرہی ہے۔ اور اس سے محبت کرنا اس کی زندگی کی سب سے بڑی بے وقوفی تھی۔

"کچھ بولو باریشہ...... کچھ تو کہو۔ مجھے برا بھلا کہو۔ گالی ہی دے دو۔ اس طرح چپ تو نہ کھڑی رہو" ضامن نے کہا۔

باریشہ نے لمحہ بھر اسے دیکھا اور پھر تیزی سے وہاں سے پلٹ گئی۔

"باریشہ...... باریشہ......" ضامن پیچھے سے اسے پکارتا رہ گیا تھا اور باریشہ تیزی سے وہاں سے

چلی گئی تھی۔

وہ اپنے کمرے میں آئی۔ چند لمحے اس نے خود کو دیے کہ اس کے حواس نارمل ہو جائیں اور غصے کی حدت کچھ کم ہو۔ اس نے چند ایک گہرے سانس لیے۔ پھر وارڈ روب سے اپنے سارے سوٹ نکالے۔ ایک سوٹ کیس پکڑ کر وہ سارے سوٹ اس میں ڈالتی چلی جا رہی تھی جب اسے یاد آیا تھا کہ اس میں سے ایک بھی سوٹ اس نے خود سے نہیں خریدا تھا۔ وہ سب کے سب شائستہ آنٹی کی طرف سے تھے۔ گھر چھوڑتے وقت وہ انہیں اپنے ساتھ لے کر نہیں جا سکتی تھی۔ اس نے اپنا ہینڈ بیگ اور کچھ نقدی پکڑنے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ نقدی اس کے لیے ضروری تھی۔ یہاں سے نکل کر نجانے اسے مزید کتنے برے حالات کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا۔ بیگ کے بعد وہ اپنا موبائل پکڑ کر کمرے سے باہر نکل ہی رہی تھی جب خیام وہاں آیا۔

''کہاں جا رہی ہو باریشہ......؟''

''اس گھر سے دور...... تم سے دور...... کیونکہ تم بھی اپنے دوست کی طرح ہو۔ دھوکے باز...... میں نے کیسے سوچ لیا کہ تم ضامن سے مختلف نکلو گے۔ تم دونوں کی تو شکلیں بھی ملتی ہیں، حرکتیں ملنا کچھ انوکھا نہیں......'' غصے سے وہ بولتی چلی گئی۔

''کیا دھوکا دیا ہے میں نے تمہیں باریشہ......؟''

''تم نے وعدہ دیا تھا کہ تم کسی کو نہیں بتاؤ گے کہ میں یہاں ہوں۔ لیکن تم نے اپنے دوست کو بتا دیا۔'' باریشہ نے کہا۔

خیام کے چہرے پر شرمندگی ظاہر ہوئی۔ اسے واقعی ہی میں ایسا کام نہیں کرنا چاہیے تھا۔ لیکن اس نے اپنی دوستی کی خاطر باریشہ کے ساتھ کیا وعدہ توڑ دیا تھا۔

''تم دونوں ایک جیسے ہو۔ بالکل ایک جیسے......''

خیام کے چہرے پر چھائی شرمندگی دیکھ کر باریشہ کو مزید غصہ آیا۔ وہ کمرے سے باہر جانے لگی تھی۔ خیام نے اسے بازو سے تھام لیا۔

"تم اس کی بات تو سن لو باریشہ......"

"مجھے اس کی کوئی بات نہیں سننا ہے اور نہ ہی تمہاری......" اس نے جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا۔

"وہ شرمندہ ہے۔"

"مجھے اس کی شرمندگی سے کچھ لینا دینا نہیں...... جو کچھ اس نے میرے ساتھ کیا، وہ بھلایا نہیں جاسکتا۔"

"معاف تو کیا جاسکتا ہے......"

"اچھا...... کیا واقعی......؟" اس نے طنز کیا۔ "تو بتاؤ...... اگر یہی سب کچھ اس نے تمہاری بہن یا بیوی کے ساتھ کیا ہوتا تو تم اسے معاف کر دیتے؟" باریشہ نے پوچھا۔

خیام چپ سا ہو گیا۔

"تمہاری خاموشی تمہارا جواب ہے۔ اب مجھے یہاں سے جانے دو۔" کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔ خیام اس کے پیچھے پیچھے گیا۔ باریشہ تیزی سے آگے جاتی جا رہی تھی۔ خیام اس کا نام پکارتا ہوا اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ لاؤنج میں آ کر اس نے پھر سے اسے بازو سے تھام لیا۔

"پلیز باریشہ......! اتنا غصہ مت کرو یار۔"

"دور ہو جاؤ مجھ سے خیام......" وہ نفرت سے چلائی تھی۔ تب ہی شائستہ وہاں آئیں۔

"کیا ہو رہا ہے؟" وہ حیرت سے دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔ خیام اور باریشہ چپ ہو گئے۔

"بولو بھی...... کیا ہو رہا ہے تم دونوں کے بیچ؟"

خیام باریشہ کی طرف التجا آمیز نظروں سے دیکھنے لگا کہ وہ اس کی ماں کے سامنے اس کا بھرم رکھ لے۔

"کچھ نہیں...... ہم باہر جارہے ہیں ذرا...... آؤٹنگ کے لیے...... میں، ضامن اور باریشہ......"

"لیکن ضامن تو جاچکا ہے۔ میں نے اسے گیٹ سے باہر جاتے دیکھا ہے۔"

"کہاں گیا ہے وہ......؟" خیام کہہ کر جلدی سے کمرے سے باہر بھاگا۔ شائستہ باریشہ کی شکل دیکھنے لگیں۔ جو جھوٹ ابھی ابھی خیام نے بولا تھا وہ باریشہ کے تپے ہوئے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا۔

"باریشہ......! تم میرے کمرے میں آؤ ذرا...... تم سے کچھ ضروری بات کرنا ہے۔" شائستہ کہتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

☆......☆......☆

"کون ہو اماں...... اور کس سے ملنا ہے؟" بستامی کے گیٹ کیپر نے اس بوڑھی عورت سے پوچھا تھا جس نے دروازے پر دستک دی تھی۔

"کام کی تلاش میں ہوں۔ سنا ہے یہاں کام والی کی ضرورت ہے۔"

"نہیں......! ایسا کچھ نہیں ہے۔ یہاں کے ملازم کمپنی سے آتے ہیں۔ ایسے ہی کسی ایرے غیرے کو نوکری نہیں ملتی یہاں...... کہیں اور سے پتا کرلو۔"

"پتا کر چکی ہوں بیٹا...... سارے گھروں میں کام والیاں موجود ہیں۔ مجبور ہوں۔ آگے پیچھے کوئی نہیں۔ اندر سے پوچھ لو، شاید کوئی بات بن جائے۔"

"میں کہہ تو رہا ہوں کہ یہاں پر کمپنی سے ملازم رکھے جاتے ہیں۔ تمہاری اندر بات نہیں بنے گی اماں۔"

"تم ایک بار پوچھو تو سہی......"

"کون ہے؟" ایمن گیٹ تک آئی تھی تو اس نے دیکھا کہ گیٹ کیپر کسی بوڑھی عورت سے الجھ رہا تھا۔

"یہ اماں کام کی تلاش میں ہے۔ میں اسے بتا چکا ہوں کہ یہاں پر ملازم کمپنی سے رکھے جاتے ہیں۔"

"مجبور ہوں بیٹی...... کام اور پناہ کی تلاش میں ہوں۔ رکھ لو تو دعائیں دوں گی۔ خدا تیرے شوہر

کا دل تیری محبت سے بھرا رکھے۔اسے تیرے سوا کوئی نظر نہ آئے۔''

بوڑھی کی دعا پر ایمن کا تو جیسے دل ہی مٹھی میں آ گیا تھا۔عمر کے اس حصے میں اسے محبت کی نجانے کون سی گرمائش درکار تھی کہ بوڑھی کی دعا پر اس نے بے اختیار ہو کر ''آمین'' کہا۔

''اندر آ جائیں اماں جی......'' ایمن نے مائی کو گھر کے اندر بلا لیا۔''کہاں سے آئی ہیں آپ......اس عمر میں کام کیوں کرنا چاہتی ہیں؟''

''سیلاب میں سب ختم ہو گیا ہے بیٹی......کوئی اپنا نہیں بچا۔مجبور اور بے بس ہوں۔''

''آج سے آپ یہاں ہی رہیں گی۔میرے کام آج کے بعد آپ کیا کریں گی۔مجھے ویسے بھی اپنے لیے ایک خاص ملازمہ کی تلاش تھی۔یہاں آپ کو رہائش بھی ملے گی اور کھانا بھی......

بہت بڑا گھر ہے یہ...... یہاں تو ملازموں کی پوری فوج ہے۔آپ کو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔'' ایمن نے خوش دلی سے کہا۔

''جیتی رہو بیٹی......خدا تجھے سہاگن رکھے۔''

''آمین......!''

بوڑھی کو جلد ہی اس کے رہنے کی جگہ دکھا دی گئی تھی۔اور کام بھی سمجھا دیا گیا تھا۔وہ سارا دن اسی سب میں گزرا تھا۔رات میں جب سب کا سونے کا وقت ہوا تو اپنے چھوٹے سے کمرے میں آ کر سارا نے سکھ کا سانس لیا۔سارا دن میدانی علاقے کے باسی ہونے کی اداکاری کرتے کرتے وہ تھک گئی تھی۔ لیکن یہ تو شروعات تھی۔ابھی تو بہت سے مشکل مرحلے باقی تھے۔اور اسے سب میں کامیاب ہونا تھا۔ دین حویلی میں اپنی ساری کزنز کو پھر سے اکٹھا کرنا تھا۔

☆......☆......☆

موسم بدل رہا تھا۔اور بہار آنے کے باوجود بے رونق ہو رہا تھا۔اس بار بہار شاید اپنے ساتھ

خزاں کو سہیلی بنا کر لائی تھی۔ یا شاید یہ باریشہ کے اندر کا موسم تھا۔ جس سے وہ ساری زندگی جوجھتی رہی تھی۔ اسے ہر دور میں کسی نہ کسی سے نفرت رہی تھی۔ کبھی چاند نانو سے، کبھی آمنہ سے، کبھی حویلی سے......اور کبھی خود سے......اسے زندگی بھر سمجھ میں ہی نہیں آ سکا تھا کہ وہ چاہتی کیا ہے۔ اور اس کی خوشی اصل میں کس کے ساتھ منسلک ہے۔

''باریشہ......'' دستک دینے کے بعد خیام نے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ باریشہ نے کھڑکی کے پاس سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔

''ہاں......بولو خیام......''

خیام آہستگی سے چلتا ہوا اس کے پاس آیا۔

''تم سے کچھ ضروری بات کرنا ہے۔''

''یقیناً ضامن کے حوالے سے ہوگی۔'' نا چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں طنز ظاہر ہوا تھا۔

''ہاں......'' بنا وقت برباد کیے اس نے کہہ دیا تھا۔ ''میرے خیال سے مجھے کہنے کی بھی ضرورت نہیں......تم میرے کہے بنا ہی میری بات جانتی ہو۔ میں ضامن کی طرف سے سفارش لے کر آیا ہوں۔ اپنے دوست کی طرف سے......تم اسے معاف کر دو باریشہ......وہ بہت شرمندہ ہے۔ وہ کبھی بھی اس قدر اذیت پسند نہیں رہا۔ نجانے اس سے یہ سب کیسے ہو گیا۔ وہ ذہنی کرب سے گزر رہا ہے۔ پلیز! تم اسے معاف کر دو باریشہ......''

باریشہ خاموش رہی تھی۔ اس کا اس موضوع پر بات کرنے کا بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ دل ہی دل میں اس نے سوچ لیا تھا کہ خیام جب اپنی کہہ کر تھک جائے گا تو خود ہی کمرے سے چلا جائے گا۔ ضامن بھی پچھلے کئی دنوں سے ایسا ہی کر رہا تھا۔ وہ باریشہ کے پاس آتا تھا۔ اس سے معافی مانگتا تھا اور جب لاکھ منت کے بعد بھی باریشہ کچھ نہیں بولتی تھی تو وہ خود ہی کمرے سے باہر چلا جاتا تھا۔

"تم نے ایک بار کہا تھا نا کہ میرا ایک احسان ہے تم پر...... کہ میں نے تمہاری زندگی بچائی...... تمہیں اپنے گھر میں پناہ دی۔ تمہارا ہر طرح سے خیال رکھا۔"

"ہاں...... یاد ہے مجھے۔"

"تو پھر اس احسان کو اتار دو۔ ضامن کو معاف کر دو۔"

"کیسے دوست ہو تم خیام...... کیسے دوست ہو تم...... تمہیں یہ دوستی اس قدر ہی عزیز ہے کہ اس کے لیے تم اپنی محبت کو فراموش کرنے جا رہے ہو۔" باریشہ کا ضبط جیسے جواب دے گیا تھا۔ خیام نے ناسمجھی سے باریشہ کی طرف دیکھا تھا۔

"میں تمہارے اسٹوڈیو میں اپنے لاتعداد پورٹریٹ دیکھ چکی ہوں۔" باریشہ نے کہا۔

خیام کے چہرے پر حیرت آئی۔

"میں جانتی ہوں کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو خیام...... شاید پہلی ملاقات سے...... کیونکہ میں نے وہ والا پورٹریٹ بھی دیکھا ہے۔"

خیام تو جیسے سانس لینا ہی بھول گیا تھا۔ باریشہ نے کھڑکی سے باہر دیکھا جہاں پھولوں کو شام کی تتلیوں نے گھیرے میں لے لیا تھا۔

"میری جان بچانا، مجھے اپنے گھر لانا...... یہ سب اتفاق نہیں تھا۔ اور نہ ہی یہ انسانیت کی وجہ سے تھا۔ یہ محبت تھی۔ جس کا اظہار تم آج تک نہیں کر سکے۔" باریشہ بولتی جا رہی تھی اور خیام حیرت زدہ چپ کھڑا تھا۔

"اس دوستی میں اپنی محبت کیوں بھلا بیٹھے ہو خیام...... اپنے جذبات کی اگر خود قدر نہیں کرو گے تو پھر کوئی بھی نہیں کرے گا۔ اپنی محبت کی بے قدری مت کرو۔ اسے اہمیت دو...... بہت زیادہ اہمیت دو۔ یہ وہ جذبہ ہے جو ذرا سی بے قدری سے روٹھ جاتا ہے اور پھر انسان کے پاس پچھتاوے چھوڑ جاتا ہے۔"

"میری محبت کا اظہار لا حاصل ہے باریشہ...... میں جانتا ہوں کہ تم ضامن کو چاہتی ہو۔"

"زندگی میں کچھ حادثے صرف زخمی ہی نہیں کرتے خیام...... وہ انسان میں ایک نئی روح پھونک جاتے ہیں۔ میں نے اپنے دل کو بہت پرکھا ہے۔ بہت کریدا ہے۔ نجانے کیوں اس میں اب ضامن نہیں ہے۔ میں نے چند ماہ میں ہی اس سے اس قدر شدید نفرت کرلی ہے کہ اب اس کے لیے محبت پیدا کرنے میں مجھے پوری زندگی لگ جائے گی۔" باریشہ نے کہا۔

خیام باریشہ کو دیکھتا جارہا تھا۔ وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی؟

"مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کرو خیام...... مجھ سے کہو کہ تم مجھے چاہتے ہو۔ مجھ سے محبت کرتے ہو۔ میں نے زندگی میں بہت سی غلطیاں کی ہیں۔ میری جلد بازی نے بہت سے کام خراب کیے ہیں۔ اب میں کوئی جلد بازی نہیں کرنا چاہتی۔ میں اپنے لیے ایسے مضبوط ہاتھ چاہتی ہوں جو ہر حالت میں مجھے سہارا دیں۔ نہ کہ دھکا...... مجھے خاموش محبت درکار ہے خیام...... جو کسی چٹان کی طرح مضبوط ہو۔ مجھ سے محبت کا اظہار کرو خیام...... مجھے بتاؤ کہ تم مجھے چاہتے ہو۔ اور بتاؤ کہ کس قدر چاہتے ہو۔"

"میں تمہیں بہت چاہتا ہوں باریشہ...... بہت زیادہ۔" خیام جذب سے بولا تھا۔ "میں پہلی نظر میں ہی تمہاری محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ پھر میں نے ہر لمحہ خود کو تمہاری گرفت میں پایا۔ قید ہو جانا کسے کہتے ہیں یہ میں نے تم سے ملنے کے بعد جانا ہے۔ میں تمہاری محبت میں قید ہوں باریشہ...... کیا تم اس خاموش محبت کو قبول کرو گی؟"

"ہاں...... بالکل کروں گی۔" باریشہ نے کہنے میں ایک سیکنڈ کی دیر بھی نہیں کی تھی۔ بہت سے لمحے تو خیام کو یقین ہی نہیں آیا تھا کہ یہ خواب نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ پھر جب آیا تو اس نے محبت سے باریشہ کا ہاتھ تھام لیا۔ باریشہ نے بھی جھجک کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ خیام کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی جہاں اس کے لیے محبت ہی محبت لکھی ہوئی تھی۔



پرندوں کی مدھم چہکار ساری فضا میں پھیلنے لگی تھی۔ آسمان پر کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ پرندے اپنے اپنے گھونسلوں میں جا رہے تھے۔ متوقع بارش لمحوں میں ہی شروع ہو چکی تھی۔ پھر تیز بوندوں کا شور ہر شور پر غالب آ گیا۔

ہوٹل کے کمرے کی کھڑکیاں، دروازہ بند تھا۔ لیکن پھر بھی بارش کا شور کمرے میں اترا ہوا تھا۔ ضامن پر اس بارش نے کوئی اثر نہیں کیا۔ وہ بیڈ پر لیٹا بس چھت کو گھورتا جا رہا تھا۔

''کیا خیام اسے منا لے گا؟ کیا باریشہ مجھے معاف کر دے گی؟'' وہ خود سے سوال کر رہا تھا۔

''خیام نے کہا تو ہے کہ وہ باریشہ کو راضی کر لے گا۔ اور کل تک اسے میرے پاس لے آئے گا۔ ہاں خیام ایسا کر لے گا۔ میں جانتا ہوں اسے...... وہ بہت سلیقے سے کام کرنے کا عادی ہے۔ وہ باریشہ کو راضی کر لے گا۔ باریشہ مجھے معاف کر دے گی۔ اور پھر...... میں بالکل دیر نہیں کروں گا۔ فوراً سے باریشہ کو پرو پوز کر دوں گا۔ خیام نے بتایا تھا کہ وہ مجھے چاہتی ہے۔ اور اب...... اب تو میں بھی اسے چاہنے لگا ہوں۔ میں اسے ساری حقیقتیں بتا دوں گا۔ اور کچھ حقیقتیں تو اس کے پاس بھی ہوں گی۔ ان حقیقتوں کو ہمیں سمجھنا ہوگا۔ قبول کرنا ہوگا۔ آخر کو ہم کزن ہیں۔ ہمارا خون کا رشتہ ہے۔ ہم ایک دوسرے کو سمجھ جائیں گے۔''

وہ اپنے طور پر ہی سب کچھ سوچ کر بیٹھا ہوا تھا۔ پھر یہ سب سوچتے سوچتے اس کے ذہن میں زویا کا خیال آیا تھا۔

''مام کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے کہ باریشہ میری زندگی میں شامل ہونے جا رہی ہے۔ اب تو وہ بھی احساس جرم سے گزر رہی ہیں۔ ہاں...... نہیں ہوگا۔ ہوگا بھی تو ڈیڈ انہیں راضی کر لیں گے۔ بس باریشہ تم...... تم راضی ہو جانا...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب کچھ...... میں وعدہ کرتا ہوں تم سے......''

وہ نہیں جانتا تھا کہ اب سب پہلے سے بھی زیادہ خراب ہونے والا تھا۔

☆......☆......☆

۱۹۷۵ء

کومل کی چیخ پوری حویلی میں گونجی تھی۔ سب اپنے اپنے کام چھوڑ کر بستامی کے کمرے کی طرف بھاگے تھے۔

''کیا ہوا ہے؟'' تہمینہ پھپھو نے بدحواسی سے پوچھا۔ پھر کمرے کے منظر نے سب کو سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ کومل بستامی کے سرہانے بیٹھی رو رہی تھی اور بستامی بیڈ پر ترچھا گرا ہوا تھا۔ ایسے جیسے مر گیا ہو۔ اور اس کے منہ پر خون ہی خون تھا۔

''ہائے میرے اللہ...... یہ کیا ہوا ہے کومل؟''

''مجھے کچھ نہیں پتا...... کوئی جلدی سے ڈاکٹر کو بلا لائے۔''

ڈاکٹر نے بستامی کو دیکھتے ہی ہاتھ کھڑے کر دیے تھے۔

''مجھے بلانا بے وقوفی تھی۔ مریض کو ہسپتال لے کر جانے کی ضرورت ہے۔ اسے جلد سے جلد ہسپتال لے کر جائیں۔''

سلمان نے جلدی سے گاڑی تیار کی۔ شکر کہ رحبانی گھر پر تھا اور سارے ملازم بھی...... بستامی کو جلدی سے گاڑی میں ڈال کر ایبٹ آباد کے ہسپتال لے کر جایا گیا۔

حویلی میں کسی فرد کو اس رات نیند نہیں آ سکی تھی۔ ہسپتال سے کوئی واپس نہیں لوٹا تھا جو انہیں بتاتا کہ بستامی اب کیسا ہے۔ سب وسوسوں کا شکار تھے۔ وہ سب بے شک بستامی سے ناراض تھے۔ اس سے نفرت کرنے لگے تھے۔ لیکن کوئی بھی بستامی کو مرا ہوا نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

''اللہ! میرے بھائی کی نشانی کو سلامت رکھنا۔ اس حویلی نے مزید اور کیا کیا دیکھنا ہے ابھی......'' تہمینہ پھپھو روتے ہوئے دعا کر رہی تھیں۔ ایک صرف چاند تھی جو مطمئن تھی۔ اس نے نہ تو بستامی کے لیے کوئی فکر ظاہر کی تھی اور نہ ہی اس کی خیریت کی دعا کے لیے جھوٹے ہی ہاتھ اٹھائے تھے۔ حاجی بوا نے چاند کو تاڑ لیا تھا۔

''تم اپنے بھائی کی حالت پر پریشان نہیں ہو چاند...... کیوں......؟''

''پتا نہیں...... لیکن میں بستامی کے حوالے سے دل میں کوئی جذبات نہیں رکھتی ہوں۔ وہ مرتا ہے یا جیتا ہے، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔'' چاند نے سرد مہری سے کہا۔ چاند کے جواب پر حاجی بوا کو حیرت نہیں ہوئی۔

''چند دن پہلے تم رات کے وقت کہاں گئی تھی؟''

''اپنے کسی کام سے گئی تھی۔''

''اتنی رات کو......؟''

''جی...... کیوں...... رات میں کام نہیں پڑ سکتا کیا؟''

''پھر تم نے ہاون دستے میں کیا پیسا ہے۔ درگا مورتی والے کمرے میں بند ہو کر......؟''

''میرے مطلب کی کوئی چیز تھی۔''

''تم نے بستامی کو زہر دیا ہے؟'' حاجی بوا نے پوچھا۔ چاند نے انہیں دیکھا۔ چاند کے دیکھنے سے ہی حاجی بوا کے شک کی تصدیق ہو گئی کہ چاند نے ایسا ہی کیا ہے۔

''تمہیں کیا ہو گیا ہے چاند...... تم ایسی تو نہ تھیں۔'' حاجی بوا کی حیرت جانے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

''وقت ایک جیسا نہیں رہتا حاجی بوا...... تو اس وقت میں بہتا ہوا انسان کیسے ایک جیسا رہ سکتا ہے؟''

''تم نے اپنے بھائی کی جان لینے کی کوشش کی۔''

''دین بابا کی موت کی ذمے داری تو ویسے ہی سب نے مجھ پر ڈالی ہوئی ہے۔ اگر سب مجھے بستامی کی موت کا ذمہ دار بھی سمجھنے لگیں گے تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' چاند نے دو ٹوک کہا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ حاجی بوا آنکھوں میں حیرت لیے اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی تھیں۔

☆......☆......☆

تہمینہ پھپھو نے بستامی کی صحت یابی کے لیے گھر میں قرآن خوانی رکھوائی تھی۔ صحن میں چاندنیاں بچھا کر حویلی کے سارے افراد اور ملازم قرآن پاک پڑھ رہے تھے۔ شکیلہ اور زہرہ پھپھو نعمت خانے میں تھیں۔ وہ قرآن پڑھے جانے کے بعد دینے والی نیاز بنا رہی تھیں کیونکہ حویلی میں نیاز ملازموں سے نہیں بنوائی جاتی تھی۔

بڑے صحن میں بیٹھے سب افراد ہاتھوں میں سپارے لیے خاموشی سے پڑھ رہے تھے۔ اس خاموشی کو صدر دروازے کے زوردار جھٹکا کھانے کی آواز نے توڑا تھا۔ سب نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ چہرے پر غضب ناکی لیے کومل اندر داخل ہوئی۔ سب جو قرآن پڑھ رہے تھے، اپنا اپنا پڑھنا بھول چکے تھے کیونکہ کومل کے پیچھے پولیس کی بہت بڑی تعداد بھی اندر داخل ہوئی تھی۔ ملازم اور سب افراد اپنے سپارے ہاتھوں میں پکڑے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''کہاں ہے چاند......؟'' کومل نے غصے سے چلاتے ہوئے پوچھا۔ زہرہ اور شکیلہ پھپھو بھی نعمت خانے سے باہر نکل آئیں۔

''کیا ہوا ہے کومل؟ پولیس کو کیوں لائی ہو تم اس حویلی میں......؟'' تہمینہ پھپھو نے پوچھا۔

''یہ پولیس چاند کو پکڑنے کے لیے آئی ہے۔ ایک قاتلہ کو......''

''کیا کہہ رہی ہو تم......؟''

''چاند نے بستامی کو زہر دیا ہے۔'' کومل نے بتایا تھا اور کومل کی بات سن کر کچھ نے حیرت سے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا اور کچھ نے خاموشی سے جیسے اس بات کو تسلیم کر لیا تھا۔

''تم ہوش میں تو ہو کومل......؟'' زہرہ پھپھو غصے سے بولیں۔

''جی...... ہوش میں ہوں میں...... چاند نے زہر دیا ہے اپنے بھائی کو۔ ٹیسٹ کی رپورٹ آج ہی آئی ہے۔ میرے شوہر کو زہر دیا گیا ہے۔ اس کے حقے میں زہر ڈالا گیا تھا۔''

''تم نے چاند کو ڈالتے دیکھا تھا زہر......اور چاند کیوں کرے گی ایسا۔''

''وہ صندل کی موت کا ذمہ دار بستامی کو سمجھتی ہے۔ایک ناجائز خون کے بدلے وہ اپنے سگے بھائی کو قتل کرنا چاہتی ہے۔''

''زبان سنبھال کر بات کرو کومل......صندل ناجائز نہیں تھی۔آمنہ سگی ماں ہے اس کی۔'' چاند کی آواز گونجی......سیڑھیاں اتر کر وہ وہاں آئی تھی۔

''اور ارشادی ناجائز باپ......'' کومل نے طنز کیا تھا۔''جس پر اس کے شوہر نے یقین نہیں کیا، اس پر حویلی والوں نے یقین کر لیا ہے۔لیکن میں تو ہرگز نہیں کروں گی۔میرے لیے تو صندل ہمیشہ ناجائز ہی رہے گی۔''

''بات تو ایسے کر رہی ہو جیسے روشن بیگم کا نکاح ہم سب کے سامنے ہوا تھا۔اور پھر تم پیدا ہوئی تھیں۔'' چاند نے طنز کیا۔کومل اس کی شکل دیکھتی رہ گئی۔پھر اس نے نفرت سے چہرے کا رخ بدلا اور لیڈی پولیس سے مخاطب ہوئی۔

''یہ ہی ہے چاند......گرفتار کر لیں اسے۔''

''رک جاؤ یہاں ہی......'' شکیلہ پھپھو نے بڑک ماری۔''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے تو ہمارا ہونے پر مجبور مت کرو کومل......ہم نے سینتالیس کی جنگ دیکھی ہوئی ہے۔اس پولیس کو کچھ نہیں سمجھتی میں......گھر کی لڑکی کو میں ان کے حوالے نہیں کروں گی۔چاند پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے انہیں میری لاش پر سے گزرنا ہوگا۔'' شکیلہ پھپھو نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا تھا۔پولیس کے اہلکار ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔''چلے جاؤ سب کے سب یہاں سے......کومل کو مقدمہ بازی کرنا ہے تو بے شک کرے۔چاند اگر مجرم ہوئی تو عدالت میں بات ہوگی۔لیکن ابھی تم اس کے بال کو بھی ہاتھ نہیں لگا سکتے۔''

''مت بھولیں شکیلہ پھپھو کہ آپ اس گھر میں میری وجہ سے رہ رہی ہیں اور میں اس گھر کی مالکن ہوں۔''

"یہ حویلی صرف بستامی کی نہیں ہے۔ چاند بھی مالکن ہے۔"

"چاند کا حصہ بستامی سے کم ہے۔"

"تو پھر سوچو کہ اگر بستامی مر گیا تو بیوہ ہونے کی حیثیت سے تمہیں کیا ملے گا؟ میرے خیال سے تمہارے حصے میں حویلی کے غسل خانے آئیں گے۔ کیونکہ بستامی کی کوئی اولاد تو......" زہرہ پھپھو نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ کومل غصہ سے انہیں دیکھنے لگی۔

"سب بیٹھ کر قرآن ختم کرو۔ کچھ نہیں ہوا......" زہرہ پھپھو نے سب سے کہا۔

سب واپس اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تھے۔ پولیس کومل کو دیکھنے لگی اور کومل کا سب کو دیکھتے ہوئے دل چاہ رہا تھا کہ وہ ان سب کو جان سے مار دے۔ چاند بے خوفی سے واپس اپنے کمرے کی طرف جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اسے کسی کا کوئی خوف نہیں تھا۔ وہ بے خوف ہو چکی تھی۔

☆......☆......☆

تاریک آسمان میں چودھویں کا چاند چمک رہا تھا۔ آج چاند کے گرد روشنی کا ہالہ تھا۔ جسے بڑے بزرگ ہمیشہ سے منحوس خیال کرتے آئے ہیں۔ اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹی تعبیر کھڑکی سے چاند کو اور چاند کے گرد روشنی کے ہالے کو دیکھ رہی تھی۔ کمرے میں نیم اندھیرا تھا۔ صرف سائیڈ لیمپ روشن تھے۔ ایسے میں چاند کی روشنی تعبیر کو اپنی آنکھوں میں اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ آج ویسے بھی اس کی آنکھیں ضرورت سے زیادہ چمک رہی تھیں۔

تتری کا شور فضا میں گونج رہا تھا اور ساتھ ہی گیدڑوں کا بھی...... لگتا تھا کہ دونوں نے شور کرنے میں ایک دوسرے سے شرط لگائی ہوئی ہے۔ ایسے میں دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کا شور بھی تعبیر کے کانوں میں گرم سیسے کی طرح اترا تھا۔ کمال کمرے میں داخل ہوا تھا۔ وہ ایک ہفتہ اپنے بیوی بچوں کے پاس رہ کر آیا تھا۔ اس لیے تعبیر جانتی تھی کہ آج وہ ضرور اس کے پاس آئے گا۔ کمال نے دروازہ لاک کر دیا تھا اور اب بیڈ پر آ کر لیٹ گیا تھا۔

"سو گئی ہو کیا......؟" بیڈ پر لیٹتے ہوئے کمال نے پوچھا۔ تعبیر نے کوئی جواب نہیں دیا۔

کمال جانتا تھا کہ تعبیر سونے کی اداکاری کر رہی ہے اور ویسے بھی اگر تعبیر سونے کی اداکاری نہ بھی کر رہی ہوتی تو اسے کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا۔ وہ تعبیر سے ایک زر خرید لونڈی جیسا سلوک کیا کرتا تھا۔

اس کے ہاتھ کا لمس تعبیر نے اپنے جسم پر محسوس کیا تو وہ سسکاری بھر کر رہ گئی۔ تکیے کے نیچے چھپائے خنجر پر اس نے اپنی گرفت مزید مضبوط کر لی تھی۔

"میری طرف رخ کرو......" کمال نے کہا۔

تعبیر نے کروٹ بدلتے ہوئے رخ کمال کی طرف کیا اور ساتھ ہی دوسرے ہاتھ میں تھاما ہوا خنجر پوری طاقت سے کمال کی گردن میں گھونپ دیا۔ بند کمرے میں کمال کی ایک دل خراش آہ بلند ہوئی تھی۔ تعبیر نے بالکل دیر نہیں کی۔ وہ فوراً سے کمال کے سینے پر چڑھ بیٹھی اور پھر اس نے پوری طاقت سے دوسرا وار کیا۔ پھر تیسرا اور پھر چوتھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ خنجر کمال کے چہرے پر کہاں کہاں گھستا جا رہا ہے۔ وہ بس پوری شدت سے اپنا کام جاری رکھے رہی۔ جلد ہی کمال بے دم ہو گیا تھا لیکن تعبیر پھر بھی خنجر کے پے در پے وار کرتی رہی۔ کمال کے خون کی چھینٹیں تعبیر کے چہرے پر پھیل چکی تھیں۔ تکیہ اور بستر خون سے بھر چکا تھا۔ تعبیر کا لباس بھی خون سے تر ہو چکا تھا۔ لیکن پھر بھی تعبیر رکی نہیں تھی۔ اور جب کمال کی شکل اس قدر بگڑ گئی کہ اس کی پہچان ہی ختم ہو گئی تو تعبیر کا غصہ جیسے ٹھنڈا ہو گیا۔ اس نے شدید ترین نفرت سے کمال کو دیکھا۔

کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ پہلے ہلکی اور پھر تیز تیز...... تعبیر نے دستک کو جیسے سنا ہی نہیں تھا۔

وہ نفرت سے کمال کے بگڑے چہرے کو دیکھتی جا رہی تھی۔

"تعبیر......!" کمرے کے باہر سے ملازمہ کی آواز آئی تھی۔

کسی ٹرانس کی سی کیفیت میں وہ کمال کے سینے سے اتری تھی اور پھر خون سے تر خنجر ہاتھ میں پکڑے اس نے دروازہ کھولا تھا۔ اس کے سامنے گھر کی ملازمہ رقیہ اور حاجرہ کھڑی تھیں۔

''کام ہو گیا؟''

حاجرہ نے پوچھا اور پھر تعبیر کی حالت کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں خون سے تر خنجر اور خون سے بھیگا لباس بتا رہا تھا کہ کام ہو گیا ہے۔ دونوں نے بستر کی طرف دیکھا۔ جہاں کمال کی لاش خون سے لت پت پڑی تھی۔ تعبیر نے کمال کے چہرے کا اس قدر برا حال کر دیا تھا کہ صورت حال متوقع ہو جانے کے باوجود بھی حاجرہ اور رقیہ کو جھرجھری آ گئی تھی۔

''باہر رقیہ کا لڑکا کھڑا ہے۔ وہ تمہیں یہاں سے بہت دور لے جائے گا۔ ابھی چند دن کشمیر سے نکلنے کی کوشش مت کرنا۔ پولیس کافی دنوں تک کشمیر سے باہر جانے والے راستوں پر پہرا دے گی۔''

حاجرہ نے تعبیر سے کہا اور تعبیر جیسے کچھ سن نہیں پا رہی تھی۔

''خنجر اس کمرے میں ہی چھوڑ دو۔''

تعبیر نے خنجر کو چھوڑ دیا۔ جو فرش پر شور کرنے کے بعد ٹھہر گیا تھا۔

''رقیہ! اسے لے کر باہر جاؤ...... یہ ہوش میں نہیں ہے۔ اس کا جلد سے جلد یہاں سے چلے جانا بہتر ہے۔ میں تھوڑی دیر کے بعد بڑے صاحب کو فون کر دوں گی۔'' حاجرہ نے کہا تو رقیہ بت بنی تعبیر کو ہاتھ سے پکڑ کر وہاں سے لے کر چلی گئی۔

اوجھل ہو جانے سے پہلے تعبیر نے ایک آخری بار پلٹ کر کمال کی لاش کو نفرت سے دیکھا تھا۔



ناول **تاش گھر** ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **15** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔